شش ماہی

علمی و تحقیقی مجلہ

معیار

جلد: ۴ جولائی۔دسمبر ۲۰۱۰ء شمارہ: ۴

۴

شعبۂ اردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد، پاکستان

مقالہ نگاروں کے لیے ہدایات

مقالہ ارسال کرتے ہوئے درج ذیل اصولوں کو ملحوظ رکھا جائے، جو آج کل ترقی یافتہ علمی دنیا میں بالعموم رائج ہیں اور جن پر یہ مجلہ عمل کے لیے کوشاں ہے:

☆ مقالہ A4 جسامت کے کاغذ پر ایک ہی جانب کمپوز کروا کر بھیجا جائے جس کے متن کا مسطر ۸×۵ انچ میں رکھا جائے۔ حروف کی جسامت ۱۲ پوائنٹ ہو۔ مقالہ کاغذ کی ایک ہی جانب لکھا جائے اور مقالے کے ساتھ انگریزی زبان میں اس کا خلاصہ ضرور شامل کیا جائے جو زیادہ سے زیادہ ۱۵ سطروں پر مشتمل ہو۔ مقالے کی CD بھی ساتھ ضرور ارسال فرمائیں یعنی مقالے کی "ہارڈ" اور "سوفٹ" کاپی دونوں ارسال کی جائیں۔

☆ اگر کسی تصنیف پر تبصراتی مقالہ (Review Article) تحریر کیا گیا ہے تو اس میں تصنیف کا مکمل عنوان، مصنف کا نام، ناشر، شہر، سنِ اشاعت، صفحات کی تعداد ضرور درج کی جائے۔

☆ متن میں حوالوں کا اندراج یا ماخذ کا حوالہ اگر بین السطور دیا جائے تو حوالے کے لیے مصنف کے نام کا آخری جزو، سنِ اشاعت اور صفحہ نمبر، جہاں ضروری ہو، درج کیا جائے۔ اگر اسی حوالے کو دوبارہ دیا ہو تو اسی صورت میں درج کیا جائے۔ بین السطور حوالہ درج کرتے ہوئے "ایضاً" اور "تصنیف مذکور" سے گریز کیا جائے۔ مثالیں درج ذیل ہیں:

[اقبال، ۱۹۳۲ء، ۳۰] ، [قریشی، ۱۹۹۰ء الف، ۱۲-۱۳] جہاں الف اس لیے ہے کہ اس مصنف کا کوئی اور ماخذ بھی اسی سال چھپا ہے اور اس کا حوالہ بھی فہرستِ اسنادِ محولہ / کتابیات میں شامل ہے۔ [داؤدی، ۲۰۰۸ء، ۳۰] ، [چیدام] [عبداللہ، ۱۹۶۱ء، ۲۳] [فاروقی، ۱۹۳۵ء، ۵۶]

☆ حاشیے میں بھی ماخذ کا حوالہ درج بالا اشاروں کے مطابق ہی ہونا چاہیے لیکن ضرورتاً "ایضاً" یا "تصنیف مذکور" بھی تحریر کیے جائیں۔

☆ کتابوں کے نام اور مقالات کے عنوانات، حواشی میں آئیں یا کتابیات / فہرستِ اسنادِ محولہ میں، بہر صورت متن میں کمپوز کیے جائیں۔

☆ مقالہ چاہے تحقیقی ہو لیکن آخر میں تمام ماخذ یا حوالوں کی فہرست "فہرستِ اسنادِ محولہ" (یا کتابیات) شامل کی جائے۔ اس کا اصول یہ ہونا چاہیے:

<u>الف۔ اگر کتابوں کا اندراج کرنا ہو تو:</u>

احمد، ظہور الدین، ۱۹۹۰ء، "پاکستان میں فارسی ادب" جلد پنجم، لاہور، ادارہ تحقیقاتِ پاکستان

<u>ب۔ اگر مجموعۂ مقالات کا اندراج کرنا ہو تو:</u>

عبدالرحمن، سید صباح الدین، ۱۹۸۸ء، "تجدیدِ فکرِ اسلامی کی تشکیل میں تصوف کا حصہ" مشمولہ: "فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید" مرتبہ ضیاء الحسن فاروقی اور مشیر الحق، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ، ص ص ۱۵۹-۱۶۳

<u>ج۔ اگر کسی مجلے / جریدے یا رسالے میں شامل مقالے کا حوالہ درج کرنا ہو تو:</u>

نیر، ناصر عباس، ۲۰۰۸ء، "جدیدیت کی فکری اساس" مشمولہ: "بازیافت" شمارہ ۱۱-۱۲، جولائی تا دسمبر، لاہور، شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی، ص ص ۱۵۳-۱۸۰

<u>د۔ اگر ترجمے کا اندراج کرنا ہو تو:</u>

سعید، ایڈورڈ (Said, Edward)، ۱۹۸۱ء، "اسلام اور مغربی ذرائع" (Covering Islam)، مترجم: جاوید ظہیر، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان

<u>ہ۔ اگر اخبار کی کسی خبر کا اندراج کرنا ہو تو:</u>

قریشی، سلیم الدین، ۲۰۰۸ء (۲۳ مئی)، "ہم نے کیا کھویا کیا پایا" مشمولہ: "جنگ" (کراچی) ص ۷

<u>و۔ اگر ریکارڈز / ذخیرے کا اندراج کرنا ہو تو:</u>

F.262/100 فائل نمبر Descriptive Catalogue of Quaid-e-Azam Papers جلد ۳، ص ۲۸، (۲۱ جولائی ۱۹۴۲ء)

<u>ز۔ اگر انٹرنیٹ / آن لائن دستاویز کا اندراج کرنا ہو تو:</u>

Social Watch.http://www.chasque.apc.org/socwatch/index.htm (مورخہ ۱۵ جنوری ۲۰۰۹ء)

رابطے کے لیے: شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ایچ۔۱۰، اسلام آباد

ٹیلی فون: ۰۵۱-۹۰۱۹۵۲۷ ، ۰۵۱-۹۰۱۹۳۰۳ برقی پتا: meyar@iiu.edu.pk

ملنے کا پتہ: بک سینٹر: ادارہ تحقیقات اسلامی، فیصل مسجد کیمپس، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

ٹیلی فون: ۰۵۱ - ۹۲۶۱۷۶۱-۵ توسیع: ۳۰۷

ترتیب و تزئین: عاصمہ نذیر **سرورق:** زاہدہ احمد

ISSN: 2074-675X

ترتیب

استدراکات:

گوشۂ نوادر (اُردو)

حصہ انگریزی

گوشۂ نوادر (انگریزی)

معروضات

تحقیق کا حسن

تحقیق کا معیار جانچنے اور متعین کرنے کے لیے جہاں متعدد ضوابط بروئے کار آ سکتے ہیں، یہاں ان سب سے قطع نظر تحقیق کے منہاج اور اس کے موضوعات کی اہمیت ان سب پر مقدم کہی جا سکتی ہے۔ منہاج تحقیق میں وہ سب کچھ شامل ہے جس کا تعلق مآخذ و مصادر کے تعین، ان کی جستجو، ان کے مناسب استعمال اور ان کے ایک متوازن تجزیے اور اخذ نتائج سے ہے۔ پھر یہ بھی لازم ہے کہ ان سب کے لیے ایک جامع اور شائستہ اسلوب، معیاری زبان اور سائنٹی فک رسمیات (حوالے و حواشی اور تعلیقات و کتابیات کی ترتیب) کی پابندیوں کا لحاظ بھی رکھا جائے۔۔۔ ان سب کے لیے جس شعور، سائنسی نقطۂ نظر اور احتیاط کی ضرورت ہے، وہ ابھی تک ہمارے تحقیقی مقالات، خصوصاً اردو زبان میں اور معاشرتی علوم میں لکھے جانے والے مقالات میں، عام نہیں۔ پاکستان کی جامعات میں تحقیقات کا ایک تسلسل ہے جو حالیہ برسوں میں جامعات کے شعبوں اور اداروں اور اساتذہ میں دیکھنے میں تو آیا ہے اور HEC کوششوں کے باوصف یہ عام بھی ہوا ہے لیکن جو تحقیقات اردو زبان میں اور معاشرتی علوم و ادبیات میں یہاں انجام پا رہی ہیں ان میں بالعموم مآخذ اور دستاویزات کے حوالے دینے، حواشی لکھنے اور کتابیات ترتیب دینے کے اصولوں میں کوئی سائنسی ضابطہ اور منطقی لحاظ نظر نہیں آتا۔ ہر شخص اپنی مرضی کو مقدم سمجھتا ہے۔ اس طرح اس معاملے میں یکسانیت کے بجائے انتشار زیادہ نظر آتا ہے اور لوگ ابھی تک فرسودگی اور از کار رفتہ روایات کے کنویں میں پھنسے ہوئے ہیں اور ان میں سے اکثر نکلنا بھی نہیں چاہتے، بلکہ نکلنے کا احساس اور شعور بھی نہیں رکھتے۔ ایسے افراد یہ نہیں دیکھتے کہ آج کی جدید ترقی یافتہ علمی دنیا میں تحقیق کا معیار، اس کے موضوعات اور اس کے منہاج و اصول کیا صورت اختیار کر چکے ہیں اور ان میں کیا کیا خوبیاں، کیسی کیسی سہولتیں اور کس قدر جامعیت پیدا ہو چکی ہے اور انھیں اختیار کرنے میں ساری ترقی یافتہ علمی دنیا نہ صرف ہم خیال ہے بلکہ ایک بڑی حد تک اس میں اشتراکِ عمل اور یکسانیت بھی کارفرما ہے۔ جب کہ ہم ہیں کہ ہمارے ہاں محققین میں منہاج اور رسمیات کے لحاظ سے ایک انتشار اور نفسا نفسی عام ہے۔ کوئی کتابیات کسی طرح مرتب کرتا ہے کوئی کسی طرح۔ کہیں یہ عنوان کے اعتبار سے مرتب ہوتی ہے کہیں مصنف وار۔ پھر اندراجات کی ترتیب کا اہتمام بھی یکساں نہیں ہوتا۔ کوئی شہر کا نام پہلے درج کرتا ہے، کوئی ناشر کا نام اور کوئی تو ناشر کا نام ہی درج نہیں کرتا۔ کوئی سنِ اشاعت، مصنف وار ترتیب میں، عنوان سے پہلے دیتا ہے کوئی بالکل آخر میں اور کوئی تو سنِ اشاعت کے اندراج کو اہمیت ہی نہیں دیتا۔ ان سب سے بڑھ کر مسئلہ مصنف وار کتابیات میں ناموں کے درج کرنے کا ہے۔ کوئی پورا نام کسی تبدیلی کے بغیر درج کر دیتا ہے کوئی معروف نام کو پہلے اور کوئی نام کے آخری جز کو پہلے۔ غرض کوئی ایک معیاری ضابطہ اور اصول نہیں جس پر سب اتفاق کریں۔ یہی بد نظمی اقتباس دینے یا نہ دینے یا اسے درج کرنے کے طریقۂ کار اور اصولوں میں بھی عام ہے۔ ستم اور افسوس یہ ہے کہ ایک ہی جامعہ میں مختلف شعبوں میں لکھے جانے والے مقالات میں بھی باہم دیگر انتشار کی حالت عام ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ایک ہی شعبے میں لکھے جانے والے مقالات میں بھی ان اصولوں کے معاملے میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔

انسانی معاشرہ عالمی سطح پر آئے دن نئی سے نئی اور بہتر سے بہتر تبدیلیوں سے ہم کنار ہو رہا ہے اور انسان ان تبدیلیوں سے، ان کے فوائد و اثرات سے، ہر ہر شعبۂ زندگی میں مفید نتائج حاصل کر رہا ہے اور ہر صورت فائدے میں ہے۔ علمی فضا میں، تحقیق اور مطالعات کے زمرے میں، رسمیاتِ تحقیق بھی جامعیت، سہولت اور معیار کے لحاظ سے ہر طرح اور ہر ایک کے لیے افادیت کی حامل بن گئی ہیں۔ اب یہ ہم پر ہے کہ ہم کس حد تک اور کس طرح ان جدید اصولوں اور طریقوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور تحقیق کے اسلوب اور پیش کش کو سلیقے، عمدگی، نفاست، نظم و ضبط اور متعینہ طریق کاری کے ساتھ مزین کرتے یا تحقیق کو ایک جامعیت اور شائستگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہ عمل نہ صرف عالمی معیار

بندی کے نقطۂ نظر سے بلکہ اشتراکِ عمل کے طور پر بھی افادیت کا حامل ہے، جسے اگر عمومی طور پر ملحوظ رکھا جائے اور اختیار کیا جائے تو اسلوب اور اصولِ تحقیق میں ایک عالمی نوعیت اور ہم آہنگی سے ہم دور نہ رہیں گے اور جامعیت اور افادیت سے بھی بہرہ مند ہوں گے۔

HEC نے جامعات میں تحقیق کے فروغ اور معیار میں بہتری کی جو مثبت و مناسب کوششیں کی ہیں ان میں رسمیاتِ تحقیق (Research Methodology) میں معیار اور جامعیت کے تعلق سے اس نے کوئی واضح اور مؤثر اقدام ظاہر نہیں کیا۔ اس کی اہمیت اور ضرورت معاشرتی علوم میں نسبتاً زیادہ ہے جہاں اس ضمن میں ایک عمومی انتشار، بے نیازی بلکہ بے شعوری عام ہے۔ یہ HEC کے لیے کوئی بہت بڑا مسئلہ نہ تھا۔ اگرچہ اس نے تحقیق کے فروغ کے لیے مناسب اور ضروری اقدامات کیے ہیں اور اس کے معیار اور اس کی طبع زادیت (Orign ality) کو بھی اہمیت دی ہے لیکن رسمیاتِ تحقیق میں معیار بندی اور اس کے لیے اصول و ضوابط کے تعین اور ان کے نفاذ یا رواج کی جانب کوئی توجہ ظاہر نہیں کی۔ اگر اس نے اس بارے میں مناسب و معیاری اصولوں و ضوابط کی یا تو نشاندہی کی ہوتی یا عالمی علمی ضرورتوں کے مطابق معیاری اصول و ضوابط مقرر کر کے جامعات کے لیے ان کی پیروی و تکمیل کی خود سفارش کی ہوتی بلکہ انھیں لازم قرار دیا ہوتا تو اس باب میں موجود بد نظمی و انتشار یا عدم معیار باقی نہ رہتا۔

یہ کام HEC کی جانب سے اب بھی ہو سکتا ہے جس کا مثبت نتیجہ بڑی حد تک یقینی ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ اور معاملہ ہے جسے خاطر خواہ اہمیت دیے جانے کو لازمی سمجھا جانا چاہیے۔ کیوں کہ عالمی تحقیقی معیار میں اسناد و دستاویزات اور مآخذ و مصادر کے درست حوالوں اور ان کے لیے جامع اور سائنٹفک اصولوں کی پیروی کی اہمیت مسلّم ہے جو ہمارے ہاں موجود نہیں۔ یہ دراصل تحقیق کا ظاہری حسن ہوتا ہے جس کے نہ ہونے سے تحقیق بد وضع، بے سلیقہ اور بھونڈی بھی لگتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ تحقیق کے موضوعات کی عمدگی سے تحقیق کا باطنی معیار اور رسمیاتِ تحقیق سے تحقیق کی شان و شکل اور اس کا حسن نمایاں ہوتا ہے اور حسن بہر حال پُرکشش اور مؤثر ہوتا ہے۔

ہمارے اکثر قارئین نے معیار، شمارہ ۳ میں شامل ''مطالعاتِ تخصیص'' کے گوشے کی شمولیت کو بے حد سراہا ہے اور مزید اسی طرح سنجیدہ گوشہ نشین محققین کی موضوعاتی تحقیقات و مطالعات کو شامل کرتے رہنے پر اصرار کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ملک و اطراف عالم سے معیار میں اپنے مقالات کی اشاعت کے لیے اصحابِ علم اور محققین جس طرح دلچسپی لے رہے ہیں اور دراصل یوں ہماری حوصلہ افزائی فرما رہے ہیں، ہم ایسے تمام کرم فرماؤں کے شکر گزار ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ معیار میں ہم بالخصوص ان مقالات کو شائع کریں جو نہ صرف ہمارے متعینہ معیار کے مطابق ہوں بلکہ نئے موضوعات یا یکسر نئے تحقیقی، تجزیاتی اور عالمانہ نکات پر مبنی ہوں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں کسی بھی قسم کی نظریاتی اور تہذیبی و معاشرتی عصبیت یا تحفظات سے بالاتر ہو کر محض علمی حوالے سے تحقیق و مطالعے کا حق ادا کرنا چاہیے تا کہ صحیح علمی و فکری نتائج حاصل ہو سکیں۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے صرف اردو زبان و ادب ہی پر نہیں جنوبی ایشیا کی دیگر متعدد زبانوں کے ادب کو بھی متاثر کیا ہے اور نوعیت کے لحاظ سے ادب و معاشرت میں ایسی ہی چھوٹی بڑی دیگر ادبی و معاشرتی اور نظریاتی تحریکوں کو روبہ عمل لانے کا سبب بنی ہے جس کی ایک انتہا نظریاتی سطح پر اسلامی ادب کی تحریک بھی ہے جو پاکستان و بھارت میں ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد کی تین چار دہائیوں کے عرصے میں سرگرم رہی ہے۔ ترقی پسند تحریک کی معاصر تحریکات میں ایسی ہی ایک ''تلنگانہ تحریک'' بھی تھی جس نے عہدِ برطانیہ کے ایامِ آخر میں بالخصوص جنوبی ہند کے علاقے تلنگانہ میں چند سالوں تک سیاست و معاشرت کے ساتھ ساتھ ادب بلکہ اردو ادب کو بھی متاثر کیا۔ افسوس کہ اس تحریک پر اردو زبان میں کوئی معیاری اور تحقیقی مطالعہ نہیں ہوا، جب کہ انگریزی زبان میں بھی بہت قابلِ ذکر مطالعات منظرِ عام پر نہیں آئے۔ لہٰذا زیرِ نظر شمارے میں ہم سید مظہر جمیل صاحب کے ایک غیر مطبوعہ مقالے کا خلاصہ شائع کر رہے ہیں۔

مدیر اعلیٰ

معیار: علمی و تحقیقی مجلہ، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد [illegible]، شمارہ [illegible]، جولائی۔دسمبر [illegible]

یادداشتہائے ڈاکٹر محمد ایوب قادری:
مصنفین بدایوں اور ان کی تصانیف

مؤلف: محمد ایوب قادری*

تقدیم و ترتیب و تحشیہ: ابرار عبدالسلام**

[ڈاکٹر محمد ایوب قادری (متوفی ۱۹۸۳ء) اپنے وقت کے معروف، معتبر اور باوقار محقق و مصنف تھے جن کی متنوع اور متعدد تصانیف اپنے تحقیقی مزاج و معیار اور تاریخ اور علم و ادب کے موضوعات پر کتبِ حوالہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا کتب خانہ بھی خصوصاً تاریخ کے حوالے سے، نہایت نادر و نایاب، مطبوعہ و قلمی ذخائر پر مشتمل تھا۔ قدیم فارسی متون کے ترجمے مع حواشی و تعلیقات اور دورافتادہ علمی موضوعات پر ان کی تحقیقات و تصنیفات کو ناگزیر تحقیقی مآخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ بدایوں ان کا مقام پیدائش تھا اور وہ خصوصاً تاریخ اور رجال پر وہاں کے تعلق سے ایک استناد کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے بیشتر تحقیقی کام بھی اس خطے کی تاریخ اور شخصیات پر مشتمل تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے برعظیم پاک و ہند کے متعدد اہم اور معروف کتب خانوں سے استفادہ کیا تھا۔ اس ضمن میں ان کا ایک معمول یہ تھا کہ وہ جس نادر اور کمیاب کتاب کا مطالعہ کرتے، تو مفید مطلب مواد کی یادداشتیں تحریر کر لیتے تھے، جن میں سے کچھ ان کے ذخیرہ تالیف و تحریر میں دیگر ذخیرے میں محفوظ ہیں۔ اس طرح کی یادداشتوں کی جمع آوری اور ترتیب کی ایک خاصی اہم اور مفید روایت علوم شرقیہ کے محققین نے فروغ دی ہے جس کی مثال ایران میں ایرج افشار، ذبیح اللہ صفا، مجتبیٰ مینوی وغیرہ کے ہاں اور یہاں پاکستان میں مولوی محمد شفیع اور حافظ محمود شیرانی کے ہاں نظر آتی ہے، جو مطبوعہ بھی ہے۔

---

* (۱۹۲۳ء۔۱۹۸۳ء) معروف ماہر [illegible]، محقق، مصنف و سابق صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، کراچی

** استاد، شعبۂ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، [illegible]

ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم کی ایسی کچھ خود نوشت اور غیر مرتب یادداشتیں معیار کی مجلسی ادارت کے ذخیرے میں، ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم کی لطفاً عطا کردہ، محفوظ ہیں، جن میں سے کچھ نذرِ قارئین ہیں:

تقدیم: ☆

یوپی کے علاقے روہیل کھنڈ کے مشہور تاریخی قصبے آنولہ میں ۲۸ جولائی ۱۹۲۶ء بمطابق ۱۷ ذی الحج ۱۳۴۴ھ بروز بدھ پیدا ہونے والا بچہ برعظیم کی تہذیب و تاریخ کا ایک ایسا نام بن کر ابھرا جسے ہماری تاریخ، تہذیب اور تحقیق کی تاریخ کسی طور پر بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ یہ بچہ جس کا نام محمد ایوب اور تاریخی نام چراغ علم رکھا گیا، حقیقت میں علم کا چراغ ثابت ہوا اور اس چراغ نے ہندو پاک کی تاریخ کے کئی تاریک گوشے منور کیے۔ مولوی مشیت اللہ کے صاحبزادے محمد ایوب نے عربی اور فارسی کی تعلیم اپنے قصبے میں حاصل کی۔ یہیں پر انگریزی اور مڈل کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کا امتحان ۱۹۴۲ء میں قصبہ اوجھیانی ضلع بدایوں سے پاس کیا۔ ننھیالی خاندان بدایوں میں قیام پذیر تھا۔ یہیں سے ۱۹۵۰ء میں ہجرت کیا اور اپریل ۱۹۵۰ء میں پاکستان آ گئے۔ چند ماہ دادو میں قیام کرنے کے بعد کراچی کی طرف رخت سفر باندھا اور اسی شہر میں بقیہ زندگی تصنیف و تالیف اور تحقیق و تدریس میں گزار دی۔ کراچی آنے کے بعد وزارت صنعت کے دفتر میں سپلائی اینڈ ڈویلپمنٹ میں ملازمت اختیار کی۔ دوران ملازمت ۱۹۵۶ء میں اردو کالج سے بی۔ اے کیا۔

مطالعے کا شوق اور تحقیق کا شغف بچپن ہی سے موجود تھا۔ ۱۹۵۷ء میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی طرف سے ملازمت کی پیش کش ہوئی تو اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل اسی ادارے سے وابستگی میں نظر آئی چنانچہ بطور لٹریری اسسٹنٹ اس ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ ایک علمی خانوادے میں پیدا ہونے کے سبب کتاب سے محبت فطری عمل تھا۔ بدایوں ہی میں کتابیں جمع کرنے کا شوق جنم لے چکا تھا جس کی تربیت وہ تمام عمر کرتے رہے۔ اسی شوق کی تکمیل میں اندرون ملک اور بیرون ملک کے سفر کیے۔ سرکاری اور نجی کتاب خانے کھنگال ڈالے اور جگہ جگہ سے نادر و نایاب کتب جمع کیں۔ اسی مقدس دیوانگی کے باعث آپ ایسا کتاب خانہ بنانے میں کامیاب ہو گئے جس پر محققانِ علم بجا طور پر رشک کر سکتے ہیں۔ ان کا ذاتی کتاب خانہ کئی ہزار کتابوں اور قلمی نسخوں پر مشتمل تھا جس سے وہ نہ صرف اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے بلکہ تشنگانِ علم کو سیراب بھی کرتے تھے۔

دوران ملازمت اساتذہ اور دوست احباب کے اصرار پر تعلیم جاری رکھی۔ ۱۹۶۲ء میں جامعہ کراچی سے ایم۔ اے اردو کیا۔ ۹ جنوری ۱۹۶۲ء تا ۴ مارچ ۱۹۶۳ء تک تقریباً چودہ ماہ اردو کالج میں جز وقتی استاد کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ۵ مارچ ۱۹۶۳ء سے اردو کالج میں باقاعدہ ملازمت اختیار کی۔ شعبہ اردو جامعہ کراچی میں جز وقتی استاد کی حیثیت سے بھی منسلک رہے۔ 'اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ شمالی ہند میں ۱۸۵۷ء تک' کے موضوع پر تحقیقی کام کو جامعہ کراچی میں پیش کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ملک اور بیرون ملک کے کئی موقر جرائد اور مجلات میں وقیع مقالات شائع ہوئے۔ اردو کالج کے مشہور زمانہ مجلہ 'برگ گل' کے ایک عرصہ تک نگران رہے۔ کئی علمی اور

☆ مقدمے کی بیشتر تفصیلات 'یادگارِ ایوب قادری' سے ماخوذ ہیں۔

غیر ملکی کانفرنسوں میں مندوب کی حیثیت سے شرکت کی۔ ۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء بروز جمعہ کار ایکسیڈنٹ میں کراچی میں وفات پائی۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری ایک محقق، مؤلف، مترجم اور شریف النفس انسان تھے۔ برِعظیم پاک و ہند کی اسلامی تاریخ، علمائے پاک و ہند کی مستند سوانح، اسماء الرجال اور ادب ان کی دلچسپی کے خاص موضوعات تھے۔ انھیں علمائے ہند اور ہندوستان کی مذہبی و اسلامی تحریکات پر استناد کا درجہ حاصل تھا۔ ایک انٹرویو میں انھوں نے اپنے تحقیقی دائرہ کار سے متعلق ان الفاظ میں وضاحت کی ہے: ''میرے تالیفی کام کا مقصد صوفیائے کرام و علمائے کرام کی تعمیری کوششوں کا ذکر اور مسلمانوں خصوصاً مغلوں کے تہذیبی، ثقافتی، علمی پس منظر کو اجاگر کرنا اور تحریکِ آزادی میں عوام نے جو مؤثر کردار ادا کیا اسے پیش کرنا ہے۔ میر اترجمہ 'مآثر الامراء' میں مغلیہ حکومت کی تہذیبی، ثقافتی، ادبی اور جنگی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں اور یہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ جس سے ہماری نئی نسل کا واقف ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ وہ قومیں کبھی ترقی نہیں کرتیں جو اپنے اسلاف کے کارناموں کو بھلا دیں۔''[۱]

ڈاکٹر محمد ایوب قادری اپنی تحقیق کے ذریعے ہمارے ان مسلم اکابرین کے کارناموں اور تصانیف کو سامنے لائے جنھیں اربابِ علم نظر انداز کر چکے تھے۔ انھوں نے ہماری علمی تاریخ کی بعض اہم کتابوں کو مرتب کر کے حواشی اور ترجمہ کے ذریعے اردو دنیا کو متعارف کرایا۔ ان کی محبت، لگن، جستجوئے تحقیق، دقتِ نظری اور خلوص ان کی زندگی کے ہر عمل اور ان کی تحریروں کی سطر سطر سے ظاہر ہوتا ہے۔ انھی اوصاف کی بنا پر مرحوم مشفق خواجہ صاحب نے ان کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا تھا: ''ان کی علمی لگن کو دیکھ کر وہ علمائے سلف یاد آتے ہیں جنھوں نے ہر طرح کی آسائشوں سے بے نیاز ہو کر خدمتِ علم ہی کو اپنا اصل کام سمجھا۔''[۲]

برِعظیم کی صدیوں پرانی تاریخ پر نظر ڈالیے بدایوں ایک تہذیب و ثقافت، علم و فضل اور بزرگانِ دین کی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ اسی وجہ سے اس سرزمین کو 'مدینۃ العلم' اور 'قبۃ الاسلام' بھی کہا گیا۔[۳] اس سرزمین سے بڑی قد آور شخصیات وابستہ رہیں۔ عبد القادر بدایونی، شاہ عبد القادر، عبد الماجد بدایونی، عبد الحامد بدایونی، فضل رسول بدایونی، علی احمد خان اسیر، ضیا احمد بدایونی، سلامت اللہ کشفی بدایونی، احمد یار خان نعیمی، مولوی اعجاز حسین، انوار حسین تسلیم، دبی پرشاد سحر، مذاق بدایونی، فانی بدایونی، افضل علی ضو، آلِ احمد سرور، اور حنیف نقوی جیسے ادبا، شعرا، محققین، علما اور فضلا نے اپنے علم و فضل سے ایک دنیا کو سیراب کیا۔ انھیں سرزمین ضلع بدایوں کے درخشندہ ستارے کہا جا سکتا ہے۔ ایوب قادری اگرچہ بدایوں میں پیدا نہیں ہوئے لیکن ننھیالی تعلق اور چار سالہ قیام بدایوں کے دوران انھیں اس سرزمین سے عشق ہو گیا تھا۔ عامر حسین صدیقی ان کے بدایوں کے حوالے سے قلبی تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ایوب قادری اپنے مختصر قیام کے دوران مکمل طور پر بدایونی بن چکے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے بڑی محنت کی تھی۔ انھوں نے قدیم تاریخِ بدایوں پر فکر انگیز تحقیق کی تھی اور اس کے نہایت اہم گوشے سامنے لائے تھے۔

انھوں نے بدایونی تہذیب، ثقافت، رسوم حتیٰ کہ وہاں کے خاندانوں کے شجروں تک سے واقفیت حاصل کر لی تھی۔ یہ واقفیت حیرت انگیز تھی۔ ان کو بدایوں کی سرزمین سے عشق تھا۔ بعض اوقات بڑی حسرت سے کہتے تھے کہ کاش میں آنولہ کی بجائے بدایوں میں پیدا ہوا ہوتا تاکہ اپنے نام کے ساتھ بدایونی لکھ سکتا۔''[۱]

۱۔ صدیقی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۵۔۱۴　　۲۔ صدیقی، ۱۹۸۶ء، ص ۲۱　　۳۔ بدایونی، ۱۹۸۱ء، ص ۱۱

ڈاکٹر محمد ایوب قادری کا تحریری کام بہت وسیع اور گراں قدر ہے۔ آپ کا شمار ان علمی شخصیات میں ہوتا ہے جنھوں نے تصنیف و تالیف کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہوا تھا۔ آپ نے ہماری تہذیبی، ثقافتی، تاریخی نوعیت کی کئی کتابوں کو مرتب کیا اور ان پر مفید حواشی بھی تحریر کیے۔ انھی موضوعات سے متعلق فارسی کتب کو ترجمے کے زیور سے آراستہ بھی کیا۔ کچھ کتابوں میں شریک مؤلف بھی رہے۔ ان مستقل تصانیف و تالیفات کے علاوہ کم و بیش اخلاقی، سوشل، علمی، تاریخی، اور تحقیقی مقالات تحریر کیے جو ہندو پاک کے رسائل اور جرائد میں شائع ہوئے۔

ایوب قادری بدایوں میں پیدا ہونے کا شرف تو حاصل نہیں کر سکے لیکن بدایوں کے حوالے سے ان کے علمی کارناموں اور جستجوئے تحقیق کے باعث بدایوں کی سرزمین ان پر بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ بدایوں کے اہل علم اور ان کے علمی کارناموں سے متعارف کرانے کے لیے ان کی سب سے پہلی تصنیف بھی بدایوں کے ایک عظیم سپوت اور جنگ آزادی کے ایک ہیرو مولانا فیض احمد بدایونی پر تھی۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔ انھوں نے 'تذکرہ شعرائے بدایوں' کے نام سے بھی ایک تذکرہ مرتب کیا تھا لیکن وہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔[۱] اسی طرح وہ 'مصنفین ضلع بدایوں' کا بھی ایک تذکرہ مرتب کرنا چاہتے تھے۔ اس کام کا انھوں نے آغاز کر دیا تھا اور اس حوالے سے نوٹس لینا شروع کر دیے تھے۔ انھوں نے یہ نوٹس چھوٹے بڑے سائز کے مختلف کاغذوں پر لیے ہوئے ہیں۔ ان کاغذوں میں دفتر حاضری، مختلف افراد کے خطوط، ڈائری کے صفحات اور دیگر اوراق شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مسودے کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ وہ اول اول صرف مصنفین بدایوں کے نام، ولدیت، سنہ پیدائش و وفات اور تصانیف کے نام جمع کر رہے تھے۔ جیسے جیسے انھیں تصانیف کے موضوعات اور اشاعتوں سے آگاہی ہوتی جاتی انھیں بھی مسودے میں نقل کرتے جاتے تھے تاکہ بدایوں کے مصنفین کی ایک جامع فہرست تیار ہو جائے۔ اس حوالے سے مختلف تذکرے اور تاریخیں بھی ان کے مطالعے میں رہیں۔ ان تصانیف میں ایک اہم تصنیف رحمان علی کی 'تذکرہ علمائے ہند' بھی ہے۔ (اس تذکرے کو انھوں نے مفید حواشی کے ساتھ مرتب کر کے شائع بھی کروا دیا ہے۔) اس تذکرے سے بھی انھوں نے مصنفین بدایوں اور ان کی تصانیف کے بارے میں نوٹس لیے ہیں۔ شہادت میں صرف دو مثالیں درج کی جاتی ہیں۔ رحمان علی نے مولانا سلامت اللہ کشفی بدایونی کی تصانیف کے حوالے سے یہ بیان تحریر کیا ہے۔

''ازاں جملہ کتب مستند تحفۃ الاحباب و معرکۃ الآرا و برق خاطف در مناظرہ اہل سنت و شیعہ و تحریر الشہادتین شرح سر الشہادتین و شہاب ثاقب در حقوق کواکب و حقائق احمدیہ در علم حقائق و کنز التوحید در بیان شطحیات اولیاء اللہ و اسرار العاشقین در حل اقوال و اشعار عربیہ و فارسیہ بطریق صوفیہ کرام و رسالہ کشفیہ بجواب ایرادات بعض جہلہ کہ بوجہ ناواقفیت از اصطلاحات حافظ شیرازی بر چند اشعار حافظیہ وارد نمودہ اند و ترجمہ دو رسالہ شیخ محی الدین بن العربی در بیان لطائف [illegible] مکاشفات صوفیہ و مکاشفات قدسیہ و رسالہ نفحات حالات و رسالہ اشباع الکلام فی اثبات المولد والقیام و رقعات کشفی و شرح مثنوی گل کشتی و رسالہ الوان در بیان جواز و عدم جواز الوان و رسالہ در تحقیق جواز مصافحہ و معانقہ عیدین و رسالہ مجموعہ منتخبا کہ راجع بہ ہر یک خود تحریر فرمودہ اند و رسالۃ الاسناد در بیان کیفیت تحصیل علوم مختلفہ خود و اتصال اسناد علوم از اساتذہ''[۲] ذیل میں ڈاکٹر ایوب قادری صاحب کا مندرج سلامت اللہ کشفی کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔

<u>مولانا سلامت اللہ کشفی (ف ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء) ولد شیخ برکت اللہ [illegible]</u>

۱۔ تحفۃ الاحباب ۲۔ معرکۃ الآرا (مناظرہ شیعہ و سنی) ۳۔ برق خاطف

۱۔ صدیقی، ۱۹۸۶ء، ص ۸۲   ۲۔ بدایونی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۹۶

۴۔ تحریر الشہادتین (شرح سر الشہادتین)　۵۔ حقائق احمدیہ (علم حقائق)　۶۔ رقعات کشفی
۷۔ اشباع الکلام فی اثبات المولد والقیام　۸۔ دیوان کشفی　۹۔ خدا کی رحمت
۱۰۔ رسالہ شہاب ثاقب (منظوم کواکب)　۱۱۔ کنز التوحید (بیان شطحیات)　۱۲۔ اسرار العاشقین
۱۳۔ ترجمہ رسالہ شیخ محی الدین ابن العربی　۱۴۔ رسالہ کشفیہ　۱۵۔ مکاشفات قدسیہ
۱۶۔ رسالہ نکات حالات　۱۷۔ شرح مثنوی گل کشتی　۱۸۔ رسالہ الوان
۱۹۔ رسالہ در تحقیق جواز مصافحہ و معانقہ عیدین　۲۰۔ رسالہ مجموعہ استفتا　۲۱۔ رسالۃ الاستاذ

رحمان علی کی درج کردہ تصانیف کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے کسی اور تصنیف کا اضافہ نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کشفی بدایونی کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کا ماخذ "تذکرہ علمائے ہند" ہی ہے۔ مزید یہ کہ رحمان علی نے سن وفات ۳ رجب ۱۲۸۱ھ درج کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تقویم کو دیکھ کر سال عیسوی بھی درج کر دیا ہے۔ کیونکہ ۳ رجب ۱۲۸۱ھ ۲ دسمبر ۱۸۶۴ء کے مطابق ہے۔

مولانا ثناء الدین احمد کے حوالے سے تفصیلات بھی اسی تذکرے سے ماخوذ ہیں۔ رحمان علی نے مولانا کا ترجمہ ان الفاظ میں درج کیا ہے: "مولوی ثناء الدین احمد بدایونی ابن مولوی محمد شفیع بن مولانا عبدالحمید ابن مولانا محمد شریف ابن مولانا محمد شفیع بدایونی۔ ولادت وے در سال دوازدہ صد و نوزدہ ہجری ظہور رسیدہ۔۔۔ فوائد معتقدہ در نحو و حاشیہ قاموس در لغت و دیگر مسودات عربیہ از تالیفات ایشان یادگار ماند۔۔۔ بماہ محرم سال دوازدہ صد و ہفتاد و ہشت ہجری رحلت فرمودہ"[2]

۸۹۔　__مولوی ثناء الدین (۱۲۱۹ھ۔۱۸۰۴ء/ ۱۲۷۸ھ۔۱۸۶۱ء) ولد مولانا محمد شفیع (بن) مولانا شیخ عبدالحمید عثمانی__

۱۔ فوائد معتقدہ (نحو)　۲۔ حاشیہ قاموس (لغت)　۳۔

اس کی مزید شہادت اس سے بھی ملتی ہے کہ رحمان علی نے شیخ عبداللہ بدایونی استاد عبدالقادر بدایونی کے ترجمہ میں ان کی کسی کتاب کی نشان دہی نہیں کی۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب نے اپنے مسودے میں ان کا نام شامل نہیں کیا۔[3] ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر ایوب قادری صاحب نے بدایوں کی صرف ایک خاتون مصنفہ کا نام فہرست میں شامل کیا ہے۔ اگر وہ اس کام کو مکمل کر لیتے تو کئی خواتین مصنفین اور ان کے کام سے آگاہی ہو سکتی تھی۔

مسودے کا نام 'مصنفین بدایوں کی تصانیف' ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے اس مسودے میں صرف ان مصنفین کے تراجم اور تصانیف شامل کی ہیں جن کی حیثیت صرف شاعر کی نہیں، لیکن مسودے کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے ایسے افراد کے تراجم بھی اس مسودے میں نقل ہوئے ہیں جن کی حیثیت صرف شاعر کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مؤلف کی نظر میں شاعری کے علاوہ بھی ان کے اور تصنیفی کارنامے بھی ہوں گے یا ان کے تصنیفی زندگی کا امکان ہوگا۔ چونکہ وہ اس منصوبے پر کام کر رہے تھے اور انھوں نے اسے مکمل نہیں کیا تھا اس لیے ان پر اعتراض کرنا بے جا ہوگا۔

مؤلف نے مصنفین کے تراجم کا اندراج حروف تہجی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا ہے لیکن پورے مسودے میں وہ اس کی پابندی نہیں کر

۱۔ علی ص ۹۷　۲۔ علی ص ۸۱　۳۔ علی ص ۱۰۲

سکے۔ مثال کے طور پر کئی مصنفین کے تراجم اس اصول کے برخلاف درج ہو گئے ہیں۔ مولانا محمد ابراہیم قادری، مفتی محمد ابراہیم فریدی، مولوی محمد اسحاق سنبھلی، مولوی شیخ محمد افضل کو انھوں نے حرف 'م' کے تحت درج کیا ہے لیکن حقیقت میں ان کی جگہ حرف 'الف' کے تحت آتی ہے۔ نواب محمد زکریا خان زکی، شیخ محمد سلیمان بدایونی، قاضی محمد نبی سوز، شیخ محمد واصل عباسی اور مولوی محمد یعقوب حسین ضیاء القادری کے تراجم بھی حرف 'م' کے تحت درج ہوئے ہیں۔ ان مصنفین کے تراجم کا اندراج بالترتیب حرف ز، س، ن، و اور ی کے تحت ہونا چاہیے تھا۔

مؤلف نے مصنفین کے بعض ناموں کے ساتھ ان کی تاریخ پیدائش، بعض کے ساتھ وفات اور کچھ کے ساتھ دونوں سنین درج کیے ہیں۔ بہت سے مصنفین ایسے بھی ہیں جن کے نام کے ساتھ کوئی سنہ درج نہیں ہوا۔ سنین کے اندراج کے ساتھ جہاں 'و' تحریر ہے اس کا مطلب ولادت ہے اور جہاں 'ف' تحریر ہے اس کا مطلب فوت (وفات) ہے۔ بعض سنین کے ساتھ کوئی حرف نہیں، جس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ سنہ پیدائش ہے یا وفات۔ اگر اس مذکورہ مقام پر دو سنہ تحریر ہیں اور ان دونوں سنین میں زمانی فصل ہے تو پہلا سنہ ولادت اور دوسرا وفات کا ہے۔ مثلاً مولوی ابرار الحق کیف کے نام کے بعد (۱۲۷۷ھ ۲۴ شعبان ۱۳۲۱ھ) تحریر ہے، جس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اول الذکر سنہ پیدائش ہے اور ثانی الذکر سنہ وفات اور اگر صرف ایک سنہ تحریر ہے تو بعض اوقات مؤلف نے سنہ پیدائش اور بعض اوقات سنہ وفات درج کیا ہے۔ اس کے لیے راقم السطور نے بریکٹ میں پیدائش و وفات سے متعلق حروف لکھ دیے ہیں تاکہ قاری کو سنین کے متعلق سمجھنے میں دقت نہ ہو۔

'مصنفین بدایوں کی تصانیف' کا یہ مسودہ استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کے کتاب خانے میں موجود ہے اور انھی کی کرم فرمائی کی بدولت مجھے حاصل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کے مشورے پر ہی اسے مرتب کیا گیا ہے۔ ترتیب کا طریق کار یہ رکھا گیا ہے کہ مقدمہ کے بعد 'مصنفین بدایوں کی تصانیف' کے مسودے کو جدید ترتیب دے دیا گیا ہے۔ جہاں کہیں ان کی تحریر صحیح پڑھنے میں نہیں آتی اسے دیگر تصانیف سے حل کیا گیا ہے۔ ایوب قادری نے کتاب کے نام کے اندراج کے بعد جہاں کہیں 'ف' کا حرف درج کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب فارسی میں ہے۔ بعض مصنفین کے نام کے بعد کسی کتاب کا نام نقل نہیں ہوا اور صرف نمبر لکھا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی ان کی کسی کتاب کی اشاعت نہیں ہو سکی۔ بعض کتابوں کے بعد خالی نمبر لگا ہوا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی ان کے علاوہ اور کتابیں بھی ہیں جن کی اشاعت ہونا باقی ہے۔ ڈاکٹر ایوب قادری صاحب کے مسودے کی ترتیب کے بعد ضمیمہ ہے۔ اس میں بدایوں کے ان مصنفین کے حالات و تصانیف درج ہیں جن کا ذکر مسودے میں نہیں آ سکا۔ اس کے بعد حواشی لکھے گئے ہیں۔ حواشی قائم کرنے کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ مسودے میں موجود مصنفین کی ترتیب کو مدنظر رکھتے ہوئے مصنفین کے مختصر دستیاب شدہ حالات درج کیے گئے ہیں تاکہ اس مصنف کی سماجی اور علمی حیثیت کا تعین کیا جا سکے۔ اس کے بعد مسودے میں درج کتابیات میں سے جن تصانیف کی اشاعتوں، مطابع اور سنین اشاعت درج نہیں، ان میں سے جن کی سنہ اشاعت، مطبع اور صفحات وغیرہ کی معلومات دستیاب ہو گئی ہیں ان کا اندراج کر دیا گیا ہے۔ جو کتابیں میری دسترس میں آ سکیں ان کے صفحات بھی نقل کر دیے ہیں۔ کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جو میری دسترس میں آئیں لیکن مذکورہ طریقہ کار بعد میں اختیار کرنے کی وجہ سے ان کے صفحات درج نہیں ہو سکے۔ اس کے بعد ستارہ کا علامتی نشان (٭) کے تحت وہ کتابیات درج ہیں جن کا ذکر مسودے میں نہیں۔ اس کا مقصد ڈاکٹر ایوب قادری صاحب کے مسودے کو مزید مفید بنانا ہے۔ وقت کی کمی اور مجلّہ 'معیار' کی اشاعت کے وقت قریب آنے کے باعث اس پر کام کو مزید بہتر نہیں بنایا جا سکا لیکن جلد ہی اس کام کو مزید بہتر بنا کر کتابی صورت میں شائع کروا دیا جائے گا تاکہ اہل علم کے لیے یہ مسودہ کام آ سکے۔

۱۔ عقیل، ص ۱۰۲

۱۔ <u>مولوی ابرار حسین قادری (۲۰؍دسمبر ۱۹۳۹ء) ولد مولوی زوار حسین بدایونی</u>

۱۔ حیات شیخ شاہی

۲۔ اصطلاحات جغرافیہ　　(انجمن ترقی اردو)

۲۔ <u>ابرار علی ولد اخیار علی ولد مولوی نثار علی ولد مولوی ولدار علی مذاق میاں حمیدی</u>

۱۔ آئینہ دلدار　　(کراچی ۱۹۰۶ء)

۲۔ شام انتخاب (بارہ مشاعرے)　　(اسلام آباد ۱۹۷۵ء)

۳۔ <u>مولوی ابرار الحق کیف (۱۲۷۷ھ۔۳؍شعبان ۱۳۳۱) ولد حکیم سراج الحق عثمانی</u>

۱۔ دیوان کیف (اول)　　۲۔ دیوان کیف (دوم)

۳۔ دیوان کیف (سوم)　　۴۔ دیوان کیف (چہارم)

۵۔ رسالہ تذکیر و تانیث　　۶۔ رسالہ محاورات

۷۔ دیگر کتب طب

۴۔ <u>مولوی ابوظفر خان</u>

۱۔ سرمایہ ظفر (منظومات)　　۲۔ مضامین ظفر

۳۔ ---

۵۔ <u>مولوی ابوالحسن (۱۱؍ربیع الثانی ۱۲۶۸ھ) ولد مولوی عزیز الدین قریشی</u>

۱۔ اعجاز القرآن　　(شمس پریس آگرہ ۱۹۰۷ء)

۲۔ تنقید لسان الغیب　　(نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۴ء)

۶۔ <u>ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ولد مظفر علی منصرم</u>

۱۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری　　۲۔ تذکرہ حالی

۳۔ انتخاب نثر اردو (لاہور ۱۹۵۵ء)

۴۔ اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ　(کراچی ۱۹۷۱ء)

۵۔ جرأت (کراچی ۱۹۵۲ء)　　۶۔ مصحفی اور ان کا کلام

۷۔ <u>مولوی حافظ احسان اللہ شیریں (۱۸۵۰ء۔۱۹۱۶ء) ولد ملا سعد اللہ</u>

۱۔ ارمغان شیریں　　(فارسی مکتوبات منظوم)

۸۔ <u>مولانا مولوی احسان الکریم ولد مولوی امام الدین ولد شیخ نور الدین</u>

۱۔ رسالہ ناسخ و منسوخ　　(سید المطابع دہلی ۱۳۰۷ھ)

۲۔ انشائے گلزار ہند (مجموعۂ مکاتیب مولوی امام الدین مع ترتیب و تہذیب مولوی احسان الکریم)

۹۔ <u>مولوی حسن اللہ (ف ۱۲۹۹ھ) ولد علی ولی اللہ حمیدی</u>

۱۔ تحفۃ الاخیار (رد شیعہ)

۱۰۔ <u>احمد بخش آبرا حسنی (و۔۱۸۹۸ء، ف۔۔۔) ولد شیخ نبی بخش ساکن گنور ضلع بدایوں</u>

۱۔ اصلاح الاصلاح (رامپور ۱۹۵۱ء) ۲۔ میری اصلاحیں (دو حصے)

۳۔ سفینے (نظمیات) (رامپور ۱۹۵۱ء) ۴۔ نگینے (غزلیات) (رامپور ۱۹۵۴ء)

۵۔ تجربے (جالندھر ۱۹۶۳ء) ۶۔ شمیمے (منقبت)

۷۔ دیوان (غیر مطبوعہ)

۱۱۔ <u>حافظ احمد حسن (و۔۱۸۸۶ء) ولد مولوی احسان اللہ حمیدی</u>

1. My Pilgrimage to Kaba (London - 1868)

۱۲۔ <u>مفتی احمد یار خاں (۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء۔۔۔) ولد مولانا محمد یار خاں ساکن قصبہ اوجھیانی ضلع بدایوں</u>

۱۔ تفسیر نعیمی (۱۱ سپارے)

۲۔ نعیم الباری فی انشراح البخاری (حاشیہ عربی)

۳۔ مرآۃ شرح مشکوٰۃ (اردو) آٹھ جلد

۴۔ نور العرفان فی حاشیۃ القرآن (مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے ترجمہ پر تفسیری حواشی)

۵۔ جاء الحق ۶۔ علم المیراث

۷۔ شان حبیب الرحمٰن ۸۔ اسلامی زندگی

۹۔ سلطنت مصطفےٰ ۱۰۔ دیوان سالک

۱۱۔ علم القرآن ۱۲۔ رسالہ نور

۱۳۔ رحمت خدا بوسیلہ اولیا ۱۴۔ مواعظ نعیمیہ

۱۵۔ نئی تقریریں ۱۶۔ امیر معاویہؓ

۱۳۔ <u>احید الدین نظامی ولد مولوی نظام الدین حسین نظامی متولی</u>

۱۔ ---

۱۴۔ <u>اخلاق حسین قریشی ولد چودھری اشتیاق حسین سہسوانی</u>

۱۔ آخری راستہ (اول) ۲۔ آگ اور پھول

۱۵۔ <u>ارشد علی ضیا (۱۲۶۳ھ۔۱۸۹۰ء) حمیدی</u>

۱۔ دیوان ۲۔ مجموعہ مراثی

۱۶۔ اشرف علی نفیس (م ۱۲۷۳ھ) ولد نجف علی حمیدی

۱۔ دیوان نفیس (عربی) — ۲۔ دیوان نفیس (فارسی)

۳۔ دیوان نفیس (اردو) — ۴۔ انتخاب دبیر (۱۲۶۳ھ) تذکرہ شعرائے بدایوں

۱۷۔ چودھری علی اصغر علی ضابطؔ (م ۱۲۵۷ھ۔ ۱۸۹۱ء) ولد چودھری افضل حسین (کچہ بزرگ)

۱۔ دیوان ضابطؔ

۱۸۔ سید اعجاز احمد ولد شاہ ظہیر احمد سہسوانی

۱۔ شاہ نصیر الدین (حالات)

۱۹۔ مولوی اعجاز حسین ولد مولوی جعفر حسین ولد علی حسین حمیدی (شیعی)

۱۔ ہدیہ جعفریہ (ترجمہ اعتقادیہ صدوق)

۲۔ ایضاح الفرائض — ۳۔ معراج النحو

۴۔ ذخیرۃ الصرف — ۵۔ حل لغات نہج البلاغۃ

۶۔ حاشیہ سیوطی — ۷۔ شرح الفیہ ابن مالک عربی

۸۔ تاریخ التواریخ (اردو ترجمہ جلد اول) — ۹۔ مصائب اہل بیت

۱۰۔ نجم الہدایہ — ۱۱۔ تذکرہ محمدیہ (حالات محمد بن ابی بکرؓ) مطبوعہ لکھنؤ

۲۰۔ اعجاز الدین زور ۔۔۔ متوفی

۱۔ مدحت خواجہ بزرگ

۲۱۔ اعلیٰ حسین اعلیٰ ولد مولوی الہام اللہ حمیدی

۱۔ دیوان

۲۲۔ حاجی افتخار الدین شورؔ بدایونی وکیل

۱۔ دیوان شور (مطبوعہ)

۲۳۔ افضل الدین قیسؔ (۸۰۔۱۲۷۹ھ) ولد محمد یوسف عباسی

۱۔ دیوان قیس (اردو)

۲۴۔ افضل علی تمسؔو ولد ہادی (۱۲۶۸ھ۔۔۔)

۱۔ رد الموازنہ — ۲۔ سعید الاخبار بدایوں (ایڈیٹر)

۳۔ بدایوں گزٹ (ایڈیٹر) — ۴۔ ''نیر روزہ'' لکھنؤ (ایڈیٹر)

۲۵۔ مولوی اقتدار احمد بن مولوی آل محمد سہسوانی

۱۔ ملہم تاریخ ؟ — ۲۔ تجانہ سحر (دیوان)

۲۶۔ مفتی اکرام احمد لطفؔ (۱۲۹۳ھ/ ۱۸۷۶ء۔ ۱۳۴۲ھ/ ۱۹۲۳ء) ولد حافظ غلام جیلانی ولد ظفر علی حمیدی

ا۔ دیوان لطف (اوّل) (قلمی، بہاریہ عشقیہ)

۲۔ دیوان لطف (دوم) (قلمی، بہاریہ عشقیہ)

۳۔ دیوان لطف (سوم) (قلمی، بہاریہ عشقیہ)

۴۔ دیوان لطف (چہارم) (نعت و منقبت)

۲۷۔ اکرام اللہ محشر (ف ۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵ء) ولد شیخ غلام مصطفےٰ متولی

ا۔ روضہ صفا (قلمی) ۲۔ دیوان محشر (فارسی۔ قلمی)

۲۸۔ اکرام عالم (ف ۷/ ستمبر ۱۹۳۲ء) ولد شیخ کریم عالم حمیدی

ا۔ حقیقت رام پور ۲۔ مشیر شوہر

۳۔ ---

۲۹۔ حکیم التفات حسین کششؔ ولد مصلح الدین فرشوری

ا۔ دیوان کشش

۳۰۔ آل احمد اوجؔ (پ ۱۸/ ستمبر ۱۹۱۰ء) ولد حکیم محمد یٰسین حمیدی

ا۔ ---

۳۱۔ آل احمد سرور

ا۔ نئے اور پرانے چراغ

۲۔ انتخاب جدید (۱۹۱۴۔۱۹۴۳) شریک مرتب عزیز احمد (انجمن ترقی اردو ۱۹۴۵ء)

۳۔ تنقید کیا ہے۔ (دہلی ۱۹۴۷ء)

۳۲۔ مولانا مولوی امام الدین ولد شیخ نورالدین

ا۔ انشائے گلزار ہند (ف) (مجموعہ مکاتیب) مرتبہ مولانا احسان کریم

۳۳۔ مولوی امانت حسین (ف ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۷ء) ولد مولوی محبوب عالم

ا۔ تاریخ شیخ شاہی (فارسی، قلمی) ۲۔ رسالہ رد شیعہ

۳۔ قصیدہ در مدح شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

۳۴۔ میر امتیاز علی

ا۔ دیوان (اوّل) ۲۔ دیوان (دوم) غیر منقوط

۳۵۔ امیر احمد امیرؔ

ا۔ دیوان

۳۶۔ شمس العلماء مولوی امیر احمد (ف ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۵ء ۔ ۱۳۰۲ھ/۸۹ ۔ ۱۸۸۸ء) ولد مولوی امیر حسن سہسوانی

ا۔ نقض الاباطیل فی الذب عن الشیخ اسماعیل (رد مولانا فضل حق خیر آبادی)

۳۷۔ ڈاکٹر امیر حسن (ف ۱۹۷۱ء) ولد چودھری صادق علی ساکن موضع ڈگریا (بدایوں)

ا۔ خلافت و سلطنت

۳۸۔ حافظ امیر الدین

ا۔ دیوان امیر (فارسی)

۳۹۔ منشی انشاء اللہ ولد شیخ عطاء اللہ عباس حمیدی

ا۔ تاریخ بنی حمید

۴۰۔ انصار حسین زلالی

ا۔ دیوان زلالی (غیر مطبوعہ)

۴۱۔ انوار حسین انور و تسلیم (۱۲۳۰ھ ۔ ۱۲ شوال ۱۳۰۹ھ) سہسوانی

ا۔ زٹل نامہ ۲۔ مثنوی سعدین

۳۔ تاج المدائح ۴۔ تاج الکلام (مثنوی)

۵۔ دیوان تسلیم

۴۲۔ مولوی انوار الحق

ا۔ طوالع الانوار

۴۳۔ ایثار علی بیتاب بدایونی

ا۔ تحفۂ ظریف (مجموعہ کلام)

۴۴۔ قاری بشیر الدین چشتی ولد منشی

ا۔ تاریخ ہندی قرون وسطیٰ (جلد دوم) (علی گڑھ ۱۹۳۹ء)

۴۵۔ پرتاب نرائن ویبہ چند صراف

ا۔ بدایوں کا پراچین اتہاس (بدایوں کی قدیم تاریخ) سنسکرت (مطبوعہ ۱۹۲۸ء)

۴۶۔ مولوی تسلیم احمد خاں

ا۔ ---

۴۷۔ تقی رضا بدایونی (شیعی) ولد رضا عباس ولد امیر اعظم ولد متقی حسن

ا۔ جعفری گلدستۂ تقویٰ (طبع ۱۹۷۸ء)

۲۔ تجلیات ناز (طبع ۱۹۷۶ء)

۴۸۔ <u>تولا حسین تولاؔ ولد مولوی الہام اللہ حمیدی</u>

۱۔ انجاب　　۲۔ دیوان تولا

۳۔ مکافات عمل

۴۹۔ <u>ثقلین احمد منورؔ (پ ۲ دسمبر ۱۹۰۹ء) ولد حکیم حسنین احمد معراج متولی</u>

۱۔ منور نفیس　　۲۔ منور نولیس

۵۰۔ <u>مولوی جلال الدین باقرؔ (ف ۱۲۶۹ھ/۵۳-۱۸۵۲ء) ولد شیخ مستجاب الدین ولد وہاب الدین موحدؔ متولی</u>

۱۔ جواہر المواعظ (یادگار باقری)

۵۱۔ <u>مولوی جمال الدین حسن (ف ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء) ولد شیخ مستجاب الدین ولد وہاب الدین موحدؔ متولی</u>

۱۔ حلیہ احمدی (سراپائے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

۵۲۔ <u>مولوی جمیل احمد سہوانی (۱۲۷۶ھ ۔۔) ولد امتیاز علی</u>

۱۔ ثمرۂ فصاحت (۱۳۴۳ھ بھوپال) (مجموعہ خمسہ جات)

۲۔ دیوان اول (غزلیات)　　۳۔ دیوان دوم (قصائد)

۴۔ حلیۃ الابرار (مثنوی)

۵۳۔ <u>جمیل الدین ڈپٹی کلکٹر (ف ۔۔) ولد حاجی وزیر الدین</u>

۱۔ جدید دنیائے اسلام (اردو ترجمہ The New World of Islam)

۵۴۔ <u>مفتی حافظ بخش بدایونی (ف ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء) ولد شیخ خدا بخش ساکن آنولہ</u>

۱۔ تنبیہ الجہال بالہام الباسط المتعال (اسم تاریخی ۱۲۹۱ھ) مطبوعہ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء

۲۔ فتاوائے حافظیہ (غیر مطبوعہ)

۳۔ بیاض (قلمی)

۵۵۔ <u>مفتی حبیب الرحمٰن بدایونی</u>

آیات خلافت　　صفحات ۱۵ مطبوعہ دار التصنیف بدایوں

۵۶۔ <u>خاں بہادر مولوی حامد بخش (ف ۱۹۰۶ء) ولد مولوی محمد بخش سب جج</u>

۱۔ گلزار نظم حامد (مطبع نسیم سحر بدایوں ۱۳۰۱ھ)

۵۷۔ <u>حسن سجزی</u>

۱۔ فوائد الفواد (ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاء)

۵۸۔ <u>مولوی حفظ اللہ (ف ۱۲۷۷ھ) ولد شیخ کرامت اللہ عباسی</u>

۱۔ شرح سہ نثر ظہوری　　۲۔ آداب الصبیان

۳۔ انشائے فیض رساں　　۴۔ مثنوی معراج (اردو)

۵۔ بیت المعرفت (حالات شاہ بلاقی مراد آبادی)

۵۹۔ <u>حمزہ دانشمند بدایونی</u>

۱۔ میزان الصرف

۶۰۔ <u>حافظ حمید الدین (ف ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء) ولد مولوی سعید الدین دانشمندی</u>

۱۔ عمدۃ التحقیق فی آل سیدنا صدیق

۶۱۔ <u>صوفی خلیل الرحمن خاں اشرفی</u>

۱۔ ---

۶۲۔ <u>قاضی خورشید علی ولد قاضی ضیا علی حمیدی</u>

۱۔ لمعان خورشید　　(نظامی پریس بدایوں)

۶۳۔ <u>ٹھاکر کل تھمس سنگھ ڈپٹی کلکٹر ساکن موضع بھٹونی تحصیل داتا گنج ضلع بدایوں</u> (ف ۱۹۱۲ء)

۱۔ کل تھمس (راجپوتوں کی تاریخ)　　(طبع ۱۹۰۱ء)

۶۴۔ <u>مولوی ولدار علی مذاق بدایونی (۱۸۱۹ء ـــ) ولد حافظ نثار علی حمیدی</u>

۱۔ کلام ولدار علی مذاق　　(کلیات)

۲۔ حلیہ مبارک سرور عالم　　(مطبوعہ مرادآباد ۱۲۹۵ھ)

۳۔ مولود کی دھوم دھام　　(مرادآباد ۱۲۹۶ھ)

۴۔ محامد خمسہ　　(مطبع نسیم سحر بدایوں ـــ)

۵۔ فضائل غوثیہ　　(" " ۱۲۹۳ھ)

۶۔ پاکیزہ ترجیع بند نعتیہ　　(گوالیار ۱۲۹۷ھ)

۷۔ میلاد مصطفوی بہر تقوی　　(مرادآباد ۱۸۸۰ء)

۸۔ رسالہ مجموعہ دعائے خیرات　　(مرادآباد ۱۲۹۸ھ)

۹۔ مثنوی مدح الرسول فی قدح الجہول　　(لاہور ۱۹۲۹ء)

۱۰۔ قصیدہ سلطان جی و شاہ ولایت بدایونی　　(بدایوں ۱۳۰۸ھ)

۱۱۔ کنز الشہادتین　　(غیر مطبوعہ)

۱۲۔ مولود رسول (نثر) (غیر مطبوعہ)

۶۵۔ <u>منشی دیبی پرشاد سحر (و۔ ۱۸۴۰ء۔۔۔۔) ولد منشی چنی لال تحکر</u>

۱۔ خلاصۃ المنطق (مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۹۶ء)
۲۔ معیار البلاغت (۱۸۶۶ء) (عروض)
۳۔ معیار الاملا (۱۸۶۷ء)
۴۔ سحر سامری (دیوان اول) (۱۸۹۳ء)
۵۔ ارژنگ چین (۱۸۷۳ء)
۶۔ نظم پروین (۱۸۷۲ء)
۷۔ تحریر عشق (واسوخت)
۸۔ تقریر عشق (واسوخت)
۹۔ محیط المساحت
۱۰۔ تکمیل المساحت
۱۱۔ بے نظیر (ناول)
۱۲۔ مرآۃ العلوم
۱۳۔ کاز الفیض
۱۴۔ گلدستہ ادب
۱۵۔ دیوان سحر (دوم)
۱۶۔ مجموعہ واسوخت
۱۷۔ مراۃ الصفا
۱۸۔ خلاصہ جغرافیہ

۶۶۔ <u>ذکاء اللہ ذکی (پ ۲۳۔ جولائی ۱۹۲۳ء) ولد چودھری ضیاء اللہ ساکن نال گاؤں ضلع بدایوں</u>

۱۔ نقوش سحر (دیوان)

۶۷۔ <u>منشی رام سہائے تسلیم بدایونی</u>

۱۔ غنچہ مراد (دیوان)
۲۔ دیوان تسلیم مطبوعہ

۶۸۔ <u>رضی احمد رضی (۔۔۔۔ ۱۹۳۹ء) ولد مولوی رفیع احمد عالی</u>

۱۔ لمعات (مجموعہ کلام) (مجموعہ کلام) مرتبہ مولوی ضیاء احمد بدایونی
۲۔ واسوخت

۶۹۔ <u>مولوی رضی الدین بسمل فرشوری (ف ۱۹۲۵ء) ولد حکیم سعید الدین کامل</u>

۱۔ تذکرۃ الواصلین
۲۔ کنز التاریخ (تاریخ بدایوں)
۳۔ انساب شیوخ فرشوری بدایوں

۷۰۔ <u>رضی الدین تنویر ولد ۔۔۔۔ متوفی</u>

۱۔ شجرۃ الصدیق (نظامی پریس بدایوں ۱۳۲۱ھ)

۷۱۔ <u>مولوی رفیع احمد عالی (۱۸۵۷ء۔۔۔۔) بن کمال احمد</u>

۱۔ فصیح اللغات
۲۔ رسالہ عروض (غیر مطبوعہ)
۳۔ عروس نظم (دیوان)
۴۔ یادگار عالی (منتخب کلام) مرتبہ مولوی ضیاء احمد

۷۲۔ رفیق احمد میکش ولد پروفیسر ضیا احمد بدایونی

۱۔ سنگ گوہر

۷۳۔ مولوی ریاض الدین سہسوانی

۱۔ گلشن ابرار

۷۴۔ مولوی سبطین احمد ولد مولوی رضا احمد متوفی

۱۔ خس و خاشاک ۲۔ انحطاط (اعظم گڑھ ۱۹۳۹ء)

۷۵۔ سخاوت حسین

۱۔ ---

۷۶۔ شیخ سخاوت حسین تسخیر متوفی

۱۔ دیوان تسخیر (اول) ۲۔ دیوان تسخیر (دوم)

۳۔ دیگر کتب

۷۷۔ مولوی سدید الدین شائق ۔۔۔ عباسی

۱۔ آفتاب عالم (اخبار) اجرا ۱۸۹۴ء

۲۔ مختلف کتب قانون

۷۸۔ مولوی سراج احمد (۱۲۳۱ھ/۱۸۱۵ء۔۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء) ۔۔۔ سہسوانی

۱۔ سراج الایمان (تائید تقویۃ الایمان)

۷۹۔ مولوی سراج الحق (۱۲۴۶ھ/۳۱۔۱۸۳۰ء۔۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) ولد مولانا فیض احمد بدایونی عثمانی

۱۔ رسالہ سراج الحکمۃ (فلسفہ) ۲۔ شرح رسائل معمیات بہاء الدین عاملی (معمیات)؟

۳۔ شرح میزان منطق ۴۔ حاشیہ مقصود المقصود (شرح؟)

۵۔ دیوان عربی ۶۔ رسائل طبیہ

۷۔ دیوان فارسی

۸۰۔ ملا سراج الدین ولد وہاب الدین ساکن قصبہ اوجھیانی ضلع بدایوں

۱۔ ---

۸۱۔ مولوی سعد الدین عثمانی (ق ۱۲۸۳ھ/۶۷۔۱۸۶۶ء) ابن مولوی نصیر الدین بدایونی

۱۔ سعادت دارین (۱۲۵۰ھ/۳۵۔۱۸۳۴ء)

۲۔ رفاہ المسلمین (۱۲۵۶ھ/۴۱۔۱۸۴۰ء)

۸۲۔ <u>سعید احمد ولد پروفیسر ظفر احمد صدیقی</u>

۱۔ ہم کیوں بھولتے ہیں　　۲۔ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

۳۔ لو ایک کہانی سنو

۸۳۔ <u>سعید الدین ولد ۔۔۔ فریدی</u>

۱۔ حیات فانی

۸۴۔ <u>چودھری سعید الدین ولد چودھری تفضل حسین (محلہ وبزرگ) بدایوں</u>

۱۔ سدس زراعت　　۲۔ دیوان لطیفہ

۳۔ مفید المزارعین　　۴۔ وہابیان گستاخ

۵۔ سعید الاخبار　　۶۔ دیگر کتب

۸۵۔ <u>سعید الزماں ولد وحید الرحمن عباسی</u>

۱۔ آب رنگ

۸۶۔ <u>مولانا سلامت اللہ کشفی (ف ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء) ولد شیخ برکت اللہ متولی</u>

۱۔ تحفۃ الاحباب　　۲۔ معرکۃ الآراء (مناظرہ شیعہ وسنی)

۳۔ برق خاطف　　۴۔ تحریر الشہادتین　　(شرح سر الشہادتین)

۵۔ رسالہ شہاب ثاقب (منظوم کوکب) ۶۔ اشباع الکلام فی اثبات المولد والقیام

۷۔ دیوان کشفی　　۸۔ خدا کی رحمت

۹۔ حقائق احمدیہ (علم حقائق) ۱۰۔ بحر التوحید　　(بیان شطحیات)

۱۱۔ اسرار العاشقین　　۱۲۔ رسالہ کشفیہ

۱۳۔ ترجمہ رسالہ شیخ محی الدین ابن العربی ۱۴۔ مکاشفات قدسیہ

۱۵۔ رسالہ نفحات حالات　　۱۶۔ رقعات کشفی

۱۷۔ شرح مثنوی گل کشتی　　۱۸۔ رسالہ الوان

۱۹۔ رسالہ در تحقیق جواز مصافحہ ومعانقہ عیدین

۲۰۔ رسالہ مجموعہ استفتا　　۲۱۔ رسالہ الاستاد

۸۷۔ <u>سلطان حیدر جوش (ف ۱۹۵۳ء) ولد شیخ نذیر الدین فریدی (شیخوپور)</u>

۱۔ ثواب فریب　　۲۔ ہوائی

۳۔ ---

۸۸۔ مولوی سلیم اللہ (ف ۱۹۲۳ء)

ا۔ سوزِ کوثر　　۲۔ چشمۂ کوثر

۳۔ سلسبیل کوثر

۸۹۔ مولوی ثناء الدین (۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء۔ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۲ء) ولد مولانا محمد شفیع (بن) مولانا شیخ عبدالحمید عثمانی

ا۔ فوائد معتمدہ (نحو)　　۲۔ حاشیۂ قاموس (لغت)

۳۔ ---

۹۰۔ مفتی سید احمد ولد سید کرامت علی مشہدی

ا۔ مناجات سید (شائع کردہ حامد پریس الاسلام ۱۹۱۳ء)

۹۱۔ محوی، شبیر الحسنین ولد مولوی اعجاز حسین ۔ میں بدایوں میں پیدا ہوئے

ا۔ جواہر اثنا عشرہ کا مذہب

۹۲۔ شوق، شجاعت اللہ صدیقی ولد عبادت اللہ، بدایوں میں ۔ میں پیدا ہوئے

ا۔ شعلۂ سنگ　　(مجموعہ کلام)

۲۔ اشکِ یتیم　　(مجموعہ کلام)

۹۳۔ مولوی شجاعت اللہ (ف ۱۲۸۸ھ) ولد شیخ سخاوت اللہ حمیدی

ا۔ مطلع منظوم

۹۴۔ مولوی شفیع احمد محو ولد کمال احمد بدایونی

ا۔ دیوان محو　(اول)　　۲۔ دیوان محو　(دوم)

۳۔ دیوان محو　(سوم)

۹۵۔ شفیقا ہمشیرہ کریم اللہ (محلہ سوتہ) بدایونی

ا۔ مولود کی خوشی (زنانہ مولود) مطبوعہ ۱۳۳۶ (امیر الاقبال پریس بدایوں)

۹۶۔ شکیل احمد شکیل بدایونی (ف ۔۔) ولد مولوی جمیل احمد قادری ولد منشی ہدایت اللہ

ا۔ رعنائیاں

۹۷۔ فانی بدایونی، شوکت علی خاں ولد ۔۔۔

ا۔ دیوان فانی　(نقیب پریس بدایوں ۱۹۲۱ء)

۲۔ باقیات فانی　(مطبع عزیزی آگرہ ۱۹۲۶ء)

۳۔ عرفانیات فانی　(لطیفی پریس دہلی ۱۹۳۹ء)

۴۔ وجدانیات فانی　(مطبع دار الکتاب حیدرآباد دکن ۱۹۴۰ء)

۵۔ کلیات فائق (حیدرآباد دکن ۱۹۳۶ء)

۹۸۔ <u>سید شہید حسین ولد سید حسین</u>

۱۔ شام سحر (مجموعہ کلام) (کراچی ۱۹۷۹ء)

۹۹۔ <u>شیدا علی ولد سید حمزہ علی ساکن اوجھیانی ضلع بدایوں</u>

۱۔ ---

۱۰۰۔ <u>صابر حسین صبا ولد منشی احتشام الدین سہسوانی</u>

۱۔ شوکت خسروی (مثنوی فارسی در مدح نواب کلب علی خاں رئیس رام پور)

۱۰۱۔ <u>مولانا ضیاء احمد بدایونی (۲۰ ربیع الاول ۱۳۱۴ھ/۲۱ ستمبر ۱۸۹۶ء ف ۸ جولائی ۱۹۷۳ء) ولد مولوی رفیع احمد عالی</u>

۱۔ دیوان مومن (مع شرح) (مقدمہ ترتیب و تہذیب) طبع الہ آباد ۱۹۳۲ء

۲۔ تذکار سلف (منظومات) طبع ۱۹۲۸ء علی گڑھ

۳۔ قصائد مومن (شرح) طبع لکھنؤ ۱۹۲۵ء

۴۔ مباحث و مسائل (اردو مضامین) طبع دہلی ۱۹۶۸ء

۵۔ سخن زار (انتخاب شعرائے فارسی سے اردو ترجمہ مع مقدمہ)

۶۔ لمعات (کلام رضی بدایونی) مقدمہ و ترتیب

۷۔ تجلیات (قطعات و منظومات) ۸۔ مکتوبات (بنام مولانا ضیاء احمد بدایونی)

۹۔ قول سدید (رد محمود احمد عباسی) ۱۰۔ مناہج و منازل (فارسی مضامین)

۱۱۔ آئینہ حق نما (مذہبی مضامین)

۱۰۲۔ <u>ضیاء الدین نخشبی (ف ۷۵۱ھ)</u>

۱۔ طوطی نامہ ۲۔ سلک السلوک

۳۔ شرح اخلاقی تجربی (مطبوعہ ۱۳۲۳ھ الہ آباد)

۴۔ چہل ناموس ۵۔ گلریز

۶۔ لذات النساء ۷۔ عشرہ مبشرہ

۸۔ کلیات و جزئیات

۱۰۳۔ <u>ضیائے عباس (۲۶ محرم ۱۳۰۴ھ/۲۵ اکتوبر ۱۸۸۶ء ف ۳۱ دسمبر ۱۹۶۶ء) ولد نور الدین عباسی</u>

۱۔ دیوان ۲۔ مجموعہ مضامین (غیر مطبوعہ)

۱۰۴۔ <u>ضیا علی خان (پ ۱۷ فروری ۱۹۱۳ء) ولد منشی ناظم علی خاں</u>

۱۔ کلیاں اور کانٹے (۱۹۶۳ء) ۲۔ زندگی اور آدمی

۳۔ اردو افسانہ کا فنی ارتقا ۔ ۴۔ مردانِ خدا (حالات بزرگان بدایوں)

۱۰۵۔ طالب بدایونی

۱۔ جانِ غزل (مجموعہ کلام)

۱۰۶۔ منشی طفیل احمد ولد اعجاز احمد

۱۔ برکات مارہرہ ۔ ۲۔ باقیات الصالحات (شجرہ متولیاں)

۳۔ ہدیہ طفیل ۔ ۴۔ خلیفہ ثانی

۵۔ تاریخ نبی خانہ (بدایوں) ۶۔ مشیر سلطنت (بدایوں) ایڈیٹر

۱۰۷۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ولد اقبال احمد

۱۔ حی ابن یقظان (ترجمہ) ۔ ۲۔ فلسفہ حی ابن یقظان

۳۔ حکمت کلیسی (منظوم پکس چہار کرد)

۴۔ Dialectical Materialism and other Essays

۵۔ Philosophy of Ibn-i- Tufail

۶۔ Readings in Philosophy

۱۰۸۔ ظہور اللہ خاں نوا (ف ۱۳۳۶ھ) ولد شیخ وکیل اللہ حمیدی

۱۔ وامق و عذرا (مطبوعہ) ۲۔ دیوانِ نوا (اردو)

۳۔ مکتوبات ظہور اللہ خاں نوا (خطی) ۴۔ شاہنامہ (ناتمام)

۵۔ دیوانِ نوا (فارسی) ۶۔ قصائد نوا (فارسی)

۱۰۹۔ شاہ ظہیر احمد ظہیر العلماء (ف ۱۳۷۱ھ) ولد حافظ فتح اللہ سہسوانی

۱۔ البدر (حالات جنگ بدر) ۲۔ تاریخ دوازدہ امام

۱۱۰۔ ڈاکٹر ظہیر احمد (پ ۱۹۲۹ء) ولد پروفیسر ضیا احمد بدایونی

۱۔ تحقیق مطالعہ انیس ۔ ۲۔ مثنوی سحر البیان (مقدمہ و ترتیب)

۳۔ دیوانِ درد (مقدمہ و ترتیب) ۔ ۴۔ شرح قصائد مومن

۵۔ فانی کی شاعری ۔ ۶۔ تحقیقی مطالعہ حالی

۷۔ مثنوی گلزار نسیم (ترتیب و مقدمہ) ۔ ۸۔ جذبات رضی

۹۔ شرح انتخاب دیوان مومن ۱۰۔ علی گڑھ میگزین (طنز و مزاح نمبر)

۱۱۔ دلی کالج میگزین (دلی کا دبستان شاعری نمبر)

۱۲۔ مومن حیات اور شاعری
۱۳۔ انشائے مومن (فارسی خطوط مع اردو ترجمہ)
۱۴۔ فکری زاویے (مجموعہ مضامین)
۱۵۔ انتخاب کلیات غالب فارسی (مع اردو ترجمہ)

۱۱۱۔ <u>عابد حسین ولد غضنفر حسین سہسوانی</u>

۱۔ دیوان عابد

۱۱۲۔ <u>عابد سعید خاں (۱۹۰۵ء) ولد عبدالحمید خاں لودی</u>

۱۔ ---

۱۱۳۔ <u>عبادت اللہ صدیقی</u>

۱۔ پھٹا جتا

۱۱۴۔ <u>مولوی عبدالباری (۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء۔۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء) ولد مولوی سراج احمد سہسوانی</u>

۱۔ اعلام الاخیار

۱۱۵۔ <u>عبدالباقی ولد سید سراج احمد سہسوانی</u>

۱۔ حیات العلماء
۲۔ قلعہ رائے سین

۱۱۶۔ <u>حاجی عبدالجامع جامیؔ (۱۸۸۰ء۔۱۹۶۵ء) ولد حاجی عبدالقدیر</u>

۱۔ دیوان جامی (اول) غزلیات
۲۔ دیوان جامی (دوم) غزلیات
۳۔ مجموعہ رباعیات
۴۔ دیوان جامی (نعتیہ)

۱۱۷۔ <u>مولانا عبدالحامد بدایونی (۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء۔۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء) ولد حکیم عبدالقیوم ولد محمد مرید جیلانی ولد مولوی محی الدین ولد مولانا فضل رسول</u>

۱۔ مشیر الحجاج
۲۔ تاثرات روس
۳۔ تاثرات چین
۴۔ فلسفہ عبادات اسلامی
۵۔ تصحیح العقائد
۶۔ نظام عمل (کراچی ۱۹۵۷ء)
۷۔ کتاب وسنت غیروں کی نظر میں
۸۔ اسلام کا زراعتی نظام
۹۔ اسلام کا معاشی نظام
۱۰۔ مرقع کانگریس (مطبوعہ ۱۹۳۸ء)
۱۱۔ مشرقی کا ماضی وحال
۱۲۔ انتخابات کے ضروری پہلو
۱۳۔ الجواب المشکور (عربی)
۱۴۔ Islamic Prayers
۱۵۔ حرمت سود
۱۶۔ دعوت عمل (حیدرآباد دکن ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء)

۱۱۸۔ <u>قاضی عبدالحق ولد قاضی الطاف علی حمیدی</u>

۱۔ تعلیم الصبیان (رسالہ قرات) (مطبوعہ ۱۲۸۵ھ مطبع صدیقی بریلی)

۲۔ مظہر علم (مطبوعہ ۱۸۶۹ء لکھنؤ)

۱۱۹۔ صوفی عبدالحمید اشرفی ولد شیخ نعیم الدین ساکن قصبہ اوجھیانی ضلع بدایوں

۱۔ ---

۱۲۰۔ مولوی عبدالحی صفا وکیل (ف ۱۹۱۴ء) ولد شیخ فقیہ الدین

۱۔ مرأت تاریخ نما (تاریخ بدایوں تالیف ۱۸۷۱ء)

۲۔ عمدۃ التاریخ (تاریخ بدایوں تالیف ۱۸۷۹ء)

۳۔ تذکرہ شمیم سخن (حصہ اول شعراء)

۴۔ تذکرہ شمیم سخن (حصہ دوم شاعرات) (لکھنؤ ۱۸۹۱ء)

۵۔ احسن التواریخ ۶۔ خیر الکلام فی احوال العرب والاسلام

۷۔ تعلیم الاخوان (۱۲۸۸ھ) ۸۔ گلزار صفا (مثنوی)

۹۔ ذوق مشتاق (مثنوی)

۱۲۱۔ مولوی عبدالحی بیخود (پ ۱۲۶۷ھ) ولد غلام سرور

۱۔ دیوان بیخود

۱۲۲۔ مولوی عبدالرحمن حیا ولد مولوی احمد حسن شاہ حمیدی بدایونی

۱۔ مخزن تصوف (طبع ۱۳۵۶ھ)

۱۲۳۔ قاضی عبدالسلام (۱۲۰۱ھ/۸۷-۱۷۸۶ء۔ ۱۲۸۹ھ/۷۳-۱۸۷۲ء) بن عطاء الحق ۔۔۔ عباسی

۱۔ اخبار الابرار (فارسی، تصوف) ۲۔ شرح دلائل الخیرات (فارسی)

۳۔ رسالہ علم الفرائض (فارسی) ۴۔ طوفان عشق (فارسی، قلمی)

۵۔ تکبیر زاد الآخرت (منظوم چار جلد) ۶۔ انشراحات العالیہ (شرح ستار)

۱۲۴۔ مولوی عبدالصمد (۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء۔ ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء) ولد غالب حسین سہوانی

۱۔ ارغام الشیاطین فی تردید معتقد العیسیین ۲۔ افادات صمدیہ

۳۔ حق الیقین فی بحث مولد اہل الیقین ۴۔ نصر المتین علی احزاب المبتدعین

۵۔ طوارق صمدیہ ۶۔ ---

۱۲۵۔ ملا عبدالصمد مقتدری (ف ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء) ولد شیخ غلام حامد حمیدی

۱۔ قصیدہ چراغ انس (مولانا احمد رضا خاں) (مقدمہ و ترتیب و حواشی)

۲۔ سوانح مولانا عبدالقدیر بدایونی (غیر مطبوعہ)

۳۔ الحمید　　(رپورٹ حمیدیہ سوسائٹی ۱۹۶۲ء)

۴۔ الحمید　　(رپورٹ حمیدیہ سوسائٹی ۱۹۶۳ء)

۱۲۶۔ مولوی حافظ عبدالصمد قادری نوری (ف ۱۹۶۲ء) ولد مولوی مقصود حسین ولد حاجی امیر علی بدایونی

۱۔ میلاد صمدیہ (قلمی)　　۲۔ میلاد شریف (مکمل) (قلمی)

۳۔ مجموعہ عملیات مشائخ قادریہ

۱۲۷۔ ملا عبدالقادر بدایونی (ف ۱۰۰۴ھ) ولد ملوک شاہ فاروقی

۱۔ منتخب التواریخ　　۲۔ ---

۱۲۸۔ مولانا شاہ عبدالقادر (ف ۱۳۱۹ھ) ولد مولانا شاہ فضل رسول عثمانی بدایونی

۱۔ تاریخ بدایوں　　(فارسی تالیف ۱۲۹۲ھ)

۲۔ تحفۂ فیض　　(حالات مولانا فیض احمد بدایونی)

۳۔ احسن الکلام فی تحقیق عقائد الاسلام　　(عربی)

۴۔ سیف الاسلام المسلول علی المناع بعمل المولد والقیام (فارسی) رد بشیر الدین قنوجی

۵۔ تصحیح الاعتقاد علی طریق اہل السنۃ والجماعۃ (رد نذیر حسین)

۶۔ شفاء السائل بتحقیق المسائل　　۷۔ دیوان عربی (نعت)

۹۔ دیوان فارسی　　۱۰۔ الجواب الفاصل بین الحق والباطل

۱۱۔ بہارستان منقبت　　(حیدرآباد دکن ۱۳۱۱ھ)

۱۲۹۔ حاجی عبدالقادر (ف ۱۹۲۷ء) ولد شیخ ظہیر الدین

۱۔ سفرنامہ حجاز

۱۳۰۔ حکیم عبدالقیوم (۱۲۸۳ھ ۔ ف ۱۳۱۸ھ) ولد حافظ محمد سعید جیلانی ولد مولوی محی الدین

۱۔ رسالہ شفاعت　　۲۔ رسالہ فضائل الشہور

۳۔ رسالہ علم مفروض　　۴۔ رسالہ غربت اسلام

۵۔ مطبوعہ رد خرافات ارباب دارالندوہ　　۶۔ رسالہ سماع موتی

۷۔ رسالہ احکام و اسرار صلوات　　۸۔ رسالہ تدابیر معالجات مرضی

۹۔ رسالہ رد جواب ”امہات المومنین“ (ناتمام)

۱۰۔ شرح سبعہ معلقہ (پانچ قصائد)

۱۱۔ مجموعہ مضامین　　۱۲۔ مجموعہ قصائد و غزلیات　　(عربی، فارسی، اردو)

۱۳۱۔ مولانا عبدالماجد قادری بدایونی (۱۵ دسمبر ۱۹۳۱ء) ولد حکیم عبدالقیوم ولد عبدالقادر ولد مولانا فضل رسول

۱۔ تعلیمی مقالات (شائع کردہ عبدالحامد بدایونی)

۲۔ مکتوب سفرنامہ (مطبوعہ)   ۳۔ درس خلافت (مطبوعہ)

۴۔ الاظہار (مطبوعہ)   ۵۔ جذبات الصداقت (مطبوعہ)

۶۔ فصل الخطاب (مطبوعہ)

۷۔ جذبات جوہر (منتخب کلام مولانا محمد علی جوہر) ترتیب و مقدمہ

۸۔ فلاح الدارین باتباع سید الکونین (مطبوعہ) ترتیب و مقدمہ

۹۔ عورت اور قرآن (مطبوعہ) ترتیب و مقدمہ

۱۰۔ دربار علم (مطبوعہ) ترتیب و مقدمہ

۱۱۔ خلاصۃ العقائد   ۱۲۔ خلاصۃ المنطق

۱۳۔ خطبات عربیہ جمعہ و عیدین   ۱۴۔ خلافت النبیہ

۱۵۔ خلافت بنوامیہ   ۱۶۔ المکتوب

۱۷۔ اعلان حق   ۱۸۔ سمرنا کی خونی داستان

۱۹۔ رپورٹ مالابار

۱۳۲۔ مولوی عبدالمجید قادری (ف ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۶ء) ولد عبدالحمید عثمانی

۱۔ نجات المومنین

۲۔ محافل الخوارق احوال سید الابرار (تالیف ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء غیر مطبوعہ)

۳۔ ہدایت الاسلام

۴۔ مواہب المنان شرح جواہر البیان (ملفوظات غوثیہ) (ف)

۵۔ رسالہ رد روافض (ف)   ۶۔ کتاب الصلوٰۃ (ف)

۷۔ دیگر رسائل

۱۳۳۔ حافظ عبدالمجید شاداںؔ (پ ۱۵/جنوری ۱۹۲۸ء) ولد حاجی رضوان احمد

۱۔ گلگشت زعفران (ظریفانہ کلام)   کافری آوند

۱۳۴۔ مولانا عبدالواحد عثمانی (ف ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء) ولد مولانا عبدالماجد قادری بدایونی

۱۔ اسلامی مساوات

۱۳۵۔ مولوی عبدالوالی (ف ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء) ولد مولوی عبدالباقی

۱۔ باقیات الصالحات

۱۳۶۔　<u>عزیز ہیجان ساکن بسولی ضلع بدایوں</u>

۱۔　دیوان ہیجان

۱۳۷۔　<u>مفتی عزیز احمد قادری بدایونی ولد مولوی علاء الدین ولد حافظ جمیل الدین</u>

۱۔　احکام روزہ　　　　۲۔　احکام قربانی

۳۔　فضیحۃ المسامع　　　　۴۔　احکام جنازہ

۵۔　اکرام الٰہی (رد قادیانی وہابی)　　　　۶۔　حقوق الزوجین

۷۔　چہل حدیث　　　　۸۔　شیخ بابو لال حسین

۹۔　صلوٰۃ المتقین فی قرآن مبین　　　　۱۰۔　ترجمہ قرآن کریم

۱۳۸۔　<u>عزیز احمد خان ـــ ساکن اوجھیانی ضلع بدایوں</u>

۱۔　ـــ

۱۳۹۔　<u>مولانا علی احمد خان اسیرؔ (ف ۲۰ جولائی ۱۹۴۷ء) ابن جنگ باز خاں</u>

۱۔　آئینہ حدود اقلیدس　　　(مطبوعہ)

۲۔　قواعد اردو　　　(مطبوعہ)

۳۔　شجرہ خاندان نقشبندیہ (منظوم)　　　(مطبوعہ)

۴۔　نظم جہاں افروز　　　(مطبوعہ عثمانی پریس بدایوں ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء)

۵۔　نظم المعراج　　　(مطبوعہ ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء)

۶۔　منقبت خواجہ ولی ہند (۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء) (مطبوعہ ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء عثمانی پریس بدایوں)

۷۔　مثنوی شیریں خسرو (مقدمہ و ترتیب) مطبوعہ علی گڑھ

۸۔　سیرت سیدنا ابو العلا اکبر آبادی　　　بالاقساط اخبار "دربار" آگرہ میں شائع ہوئی

۹۔　سیرت نعمان اکبر آبادی　　　(غیر مطبوعہ)

۱۰۔　حیات شیخ محی الدین اکبر　　(غیر مطبوعہ)

۱۱۔　حیات ملا عبدالقادر بدایونی　　(غیر مطبوعہ)

۱۲۔　دیوان اسیرؔ　　　(غیر مطبوعہ)

۱۳۔　اولیائے بدایوں　　　(مسودہ)

۱۴۔　خلوت گاہ ناز (مولانا عبدالقادر بدایونی (ف ۱۳۱۹ھ) کے وصال پر کہی ہوئی قطعات تاریخ کا مجموعہ) (مطبوعہ)

۱۵۔　قصیدہ نور　　　مطبوعہ

۱۶۔ مجموعہ کلام (غیر مطبوعہ)

۱۷۔ مشرقستان اقدس (مولوی نواب سلطان احمد خاں بریلوی کے نام سے شائع ہوئی)

۱۴۰۔ قاضی علی احمد محمود اللہ شاہ مذنب مذاقی (ف ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء) ولد حافظ اسد اللہ حمیدی

۱۔ عین الانسان

۱۴۱۔ مولوی علی امجد حسین (ف ۱۹۲۰ء) ولد فضل حسن حمیدی (شیعی)

۱۔ دیوان امجد (اول) (طبع ۱۹۱۲ء بدایوں)

۲۔ دیوان امجد (دوم) (طبع ۱۹۱۳ء بدایوں)

۳۔ دیوان امجد (سوم) (طبع ۱۹۱۲ء علی گڑھ)

۴۔ نقشِ بہار　　۵۔ ذرِ مکنون

۱۴۲۔ مولوی علی بخش شرر (۱۲۳۷ھ/۲۲-۱۸۲۱ء۔ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء) ولد سلطان بخش بدایونی

۱۔ شہاب ثاقب　　۲۔ تائید الاسلام

۳۔ تنقیح المسائل　　۴۔ برق خاطف

۵۔ دیوان (مطبع اسعد الاخبار آگرہ ۱۲۹۶ھ)

۶۔ دیوان (غیر منقوطہ)

۱۴۳۔ علی حاتم صدیقی آزاد

۱۔ طوفانِ ترقی (قطعات)

۱۴۴۔ مولوی حکیم علی حسین عرف محمد انعام اللہ ولد حافظ حیات اللہ ولد شیخ امین اللہ حمیدی

۱۔ چمن دستہ حسینیہ (قلمی مخزونہ رضا لائبریری رام پور)

۱۴۵۔ مولوی علی صفی اللہ (۱۲۵۰ھ) ولد علی ارشد حمیدی

۱۔ دیوان صفی

۱۴۶۔ منشی علی محمد خاں کل ولد نجو خاں بدایونی (محلہ براہم پور)

۱۔ باغ مرادوفی میلاد خیر العباد

۱۴۷۔ مولوی سید عنایت احمد حیرت (۱۲۷۹ھ) ولد مطیع احمد

۱۔ حواشی بر کتب چند

۱۴۸۔ مولوی غلام شبر حمیدی (ف ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء) ولد غلام حیدر ڈپٹی کلکٹر حمیدی

۱۔ نور مدائح حضور (حالات مشائخ مارہرہ)

۲۔ تذکرہ نوری (حالات شاہ ابوالحسین نوری میاں مارہروی)

۳۔ تکملۃ فی الاخبار سلطان مدینہ ۴۔ انساب نامہ

۱۴۹۔ مولانا غلام قطب الدین برہم چاری (ف ۱۳۵۰ھ) ولد حکیم سخاوت حسین انصاری سہسوانی

۱۔ ---

۱۵۰۔ غلام محمد خاں فرحتؔ ولد سرفراز خاں ساکن نگرالہ ضلع بدایوں

۱۔ فرحت المومنین عزیز المسلمین (مطبوعہ سید المطابع دہلی ۱۲۸۷ھ)

۱۵۱۔ قاضی فدا حسین (ف ۱۹۲۵ء) ولد قاضی احمد حسین حمیدی

۱۔ سیرۃ الحمید فی احوال السعید

۱۵۲۔ فدا حسین واثقؔ (۱۱ر جنوری ۱۸۹۷ء۔ ۱۱ر نومبر ۱۹۶۸ء) ولد غلام حسین مہرؔ حمیدی

۱۔ سیاسی جھلک ۲۔ مضامین واثق

۱۵۳۔ خان بہادر فصیح الدین (و ۱۹۳۸ء) ولد مولوی رضی الدین بسملؔ فرشوری

۱۔ ---

۱۵۴۔ حافظ فضل اکرم (۱۹۱۲ء) ولد مولوی یمین الدین فرشوری

۱۔ آثار بدایوں

۱۵۵۔ فضل الرحمن ماہرؔ بدایونی

۱۔ بہار بوستان منقبت (قیصر ہند پریس بدایوں ۱۳۱۹ھ)

۱۵۶۔ مولانا فضل رسول عثمانی (۱۲۱۳ھ/۹۹-۱۷۹۸ء۔ ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) ولد مولوی عبدالمجید بدایونی

۱۔ البوارق المحمدیہ ۲۔ فصیح المسائل

۳۔ المعتقد المنتقد ۴۔ احقاق الحق و ابطال الباطل

۵۔ سیف الجبار المسلول علی الاعداء الابرار ۶۔ فوز المبین

۷۔ تلخیص الحق ۸۔ شرح فصوص الحکم

۹۔ رسالہ طریقت ۱۰۔ حاشیہ میر زاہد

۱۱۔ حاشیہ ملا جلال ۱۲۔ طب الغریب

۱۳۔ دیگر رسائل ۱۴۔ مولود منظوم مع قصائد

۱۵۷۔ مولانا فیض احمد رسواؔ (۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء۔ ۱۲۷۴ھ کے بعد) ولد حافظ غلام احمد ولد مولوی شمس الدین عثمانی

۱۔ تعلیم الجاہل (فارسی) ۲۔ حاشیہ شرح ہدایۃ الحکمۃ (عربی)

۳۔ تعلیقات علی فصوص الفارابی (عربی)   ۴۔ ہدیۂ ادبیہ (مجموعہ نثر و قصائد عربیہ)

۵۔ دیوان فارسی   ۶۔ دیوان اردو

۱۵۸۔ مولانا قدیر بخش بدایونی (ف ۱۳ نومبر ۱۹۵۲ء) بن مفتی حافظ بخش بن شیخ خدا بخش

۱۔ کتاب النکاح والطلاق (مطبوعہ حیدرآباد دکن)

۲۔ رسالہ علم الفرائض (غیر مطبوعہ)

۱۵۹۔ قمر الحسن قمر بدایونی (۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء۔ یکم جولائی ۱۹۳۱ء) ولد محسن علی حمیدی

۱۔ آئینہ جذبات   ۲۔ مصور جذبات

۳۔ رسالہ فن قوالی

۱۶۰۔ قمر الدین احمد بدایونی۔۔۔ فرشوری (ف ۱۹۸۰ء)

۱۔ بزم اکبر (انجمن ترقی اردو ۱۹۴۴ء)

۱۶۱۔ کشفی بدایونی

۱۔ دیوان کشفی

۱۶۲۔ گوہری بدایونی کا نسخہ

۱۔ دیوان گوہری

۱۶۳۔ منشی گیندن لال گوہر (پ ۱۲۵۲ھ) ولد منشی رام دیال رسا

۱۔ متعدد کتابیں

۱۶۴۔ مادھو رام ہاتف بدایونی

۱۔ دیوان مہذب ظریف

۱۶۵۔ مبشر علی۔۔۔ حمیدی

۱۔ ---

۱۶۶۔ حافظ مجاہد الدین ذاکر عرف حافظ گجی (۱۲ ذی الحجہ ۱۲۵۱ھ۔ ۲۸ صفر ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء) ولد مبارز الدین متولی

۱۔ تحفہ الخلائق   اردو ترجمہ مع اضافات (۱۲۷۴ھ)

۲۔ تنویر المحافل   معجزات نبوی منظوم (۱۳۰۳ھ)

۳۔ تحفہ قریشی   نسب نامہ متولیان (۱۳۰۵ھ)

۴۔ ذریعہ نجات (دیوان اول) (۱۳۰۷ھ)

۵۔ تہذیب المحافل   آداب و طریق محافل میلاد شریف (۱۳۰۷ھ)

۶۔ بیاض الحکمت (ذاتی تجربات) ۱۳۱۲ھ

۷۔ مظہر الاسلام (حالات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم و تاریخ عرب و حالات اولیائے بدایوں ۱۳۱۶ھ)

۸۔ دیوان ثانی ۱۳۲۲ھ (نعت و منقبت)

۱۶۷۔ <u>مجتہد الدین عیش ولد انجم الدین متولی</u>

۱۔ مولود پیغمبر (نظامی پریس بدایوں ۱۳۱۰ھ)

۲۔ مدح ابن پیغمبر امیر الاقبال پریس بدایوں ۱۳۵۹

۳۔ گلستان ستائش ۴۔ شہنشاہ نامہ جلد اول

۵۔ شہنشاہ نامہ جلد دوم

۱۶۸۔ <u>مولانا محب احمد قادری (ف ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء) ولد نامن حمیدی</u>

۱۔ حدوث و قدوم (رد آریہ)

۲۔ التاریخ (نظامی پریس بدایوں)

۱۶۹۔ <u>سید محفوظ علی (ف ۱۹۳۳ء) ولد سید کاظم علی بدایونی</u>

۱۔ مضامین میر محفوظ علی (انجمن ترقی اردو ۱۹۵۶ء)

۲۔ خطاب از ملائی ۳۔ نظریات و مقالات

۱۷۰۔ <u>مولانا محمد ابراہیم قادری (ف ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء) ولد مولانا محب احمد قادری حمیدی</u>

۱۔ ---

۱۷۱۔ <u>مفتی محمد ابراہیم فریدی (پ ۱۹۱۰ء) ولد مولوی جعفر علی فریدی سمستی پوری</u>

۱۔ احکام النکاح ۲۔ تعلیم المنطق (خلاصہ مرقات مولانا فضل امام خیرآبادی)

۳۔ تذکار مطیب ۴۔ مفید الطالب (تربیت سلوک)

۵۔ تذکرہ مآب (حالات شیخ ابوالحسن شاذلی)

۱۷۲۔ <u>مولوی محمد اسحاق متولی (۱۲۹۷ھ/۸۰-۱۸۷۹ء)</u>

۱۔ ہدیۃ البرکات فی فضل لیلۃ البرکات ۲۔ منازل البرکات (عربی)

۳۔ فضائل رمضان المبارک

۱۷۳۔ <u>مولوی شیخ محمد افضل (ف ۱۲۵۹ھ) ولد شیخ تاج الدین</u>

۱۔ بدیع الاخلاق (غیر مطبوعہ)

۱۷۴۔ <u>مولوی محمد حسین</u>

۱۔ تحفۃ المستورین (منظوم)

۱۷۵۔ **مولوی محمد حسین (پ ۲۸/جون ۱۸۶۲ء) ولد سید بخشش علی ساکن قصبہ سید پور ضلع بدایوں**

۱۔ مظہر العلماء فی تراجم العلماء والکملاء (قلمی)

۲۔ مرآۃ المشہور (طبع بمبئی ۱۳۱۴ھ)

۱۷۶۔ **نواب محمد زکریا خاں زکی (۱۸۳۹ء۔۱۹۰۳ء) ولد سید محمود خاں دہلوی**

۱۔ دیوان زکی

۱۷۷۔ **شیخ محمد سلیمان بدایونی (ف یکم جون ۱۹۲۳ء) ولد وزیر الدین بن شیخ علیم الدین بن تاور بخش بن رمضانی**

۱۔ بدایوں ۱۸۵۷ء میں　　۲۔ بدایوں ۱۹۴۷ء میں

۳۔ مقالات سلیمانی (غیر مطبوعہ)

۴۔ بدایوں کے اہل تشیع (سائکلو اسٹائل) (کراچی ۱۹۶۹ء)

۱۷۸۔ **محمد صالح شاد ولد کلیم الدین ساکن نگرالہ ضلع بدایوں**

۱۔ راز حیات (دیوان) مطبوعہ

۱۷۹۔ **محمد فائق (پ ۱۹۳۷ء) ولد مولوی علی عباس بدایونی**

۱۔ نفسیات　　۲۔ مسائل نفسیات

۳۔ اختیاری نفسیات　　۴۔ سماجی نفسیات

۵۔ نفسیات کے اختیاری مسائل　　۶۔ ابتدائی شماریات

۷۔ عملی نفسیات　　۸۔ Problems of Psychology

۹۔ Experimental Psyclology

۱۸۰۔ **منشی محمد مبین نازش ورا سخ (کذا)**

۱۔ ناول　　۲۔ دیگر کتب

۳۔ دیوان نازش

۱۸۱۔ **قاضی محمد نبی سوز (۱۸۷۸ء۔ ۱۳۶۶ھ/۱۰/اگست ۱۹۴۷ء)**

۱۔ شاخ نبات ۱۳۵۴ھ (حمد ونعت ومنقبت) (فارسی)

۲۔ دیوان سوز (قلمی)

۱۸۲۔ **شیخ محمد واصل عباسی (۱۲۰۸ھ) ولد شیخ شفاعت اللہ عباسی**

۱۔ دیوان واصل (فارسی)

۱۸۳۔ **مولوی محمد یعقوب حسین ضیا القادری (و ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء، ف ۱۹۷۰ء) ولد شیخ ناد حسین**

۱۔ تاج مضامین　　۲۔ اکمل التاریخ (دو جلد)

۳۔ کرامات غوث احمد ۴۔ ستارہ چشت

۵۔ مرقع یادگار شہادت ۶۔ دیار نبی

۷۔ جوار غوث الوریٰ ۸۔ تجلیات نعت

۹۔ خزینہ بہشت ۱۰۔ نغمہ ربانی

۱۱۔ تاریخ اولیائے حق ۱۲۔ چراغ شمع جمال

۱۳۔ تذکرہ طیبہ ۱۴۔ خطبہ مؤثر (منظوم)

۱۵۔ نغمہ ربانی ۱۶۔ نغمہ ہائے مبارک

۱۷۔ روداد فغاں (مثنوی) (مولانا امیر بدایونی کے سفر حجاز و انتقال کے حالات)

۱۸۴۔ شاہ محمدی بیدار (ف ۱۲۱۰ھ) ولد شیخ معین الدین فریدی فاروقی

۱۔ دیوان بیدار (فارسی)

۲۔ دیوان بیدار (اردو)

۱۸۵۔ مولوی محمود الحسن (ف ۱۹۷۵ء) ولد شیخ سلامت اللہ بدایونی

۱۔ خورشید زمیندار ۲۔ وہابی کی پہچان

۳۔ کھلونوں کی کتاب (کراچی ۱۹۷۹ء)

۴۔ شاہی لباس ۵۔ تاریخ پارچہ بافی

۶۔ بلاغت ۷۔ معیار شرافت

۸۔ بچوں کے گیت (مطبوعہ دہلی ۱۳۵۰ھ)

۹۔ صور بیداری (منظومات) ۱۰۔ ملا جمراتی (کراچی ۱۹۶۷ء)

۱۸۶۔ مولوی محی الدین (۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء – ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۵ء) ابن مولانا فضل رسول قادری بن مولوی عبدالمجید قادری عثمانی

۱۔ حاشیہ میر زاہد ۲۔ حاشیہ کلیات قانون بوعلی سینا

۳۔ حسن البیان (رد تقویۃ الایمان)

۱۸۷۔ محی الدین نکہت ولد مولوی کلیم الدین بدایونی

۱۔ مقالات نظریات (کراچی ۱۹۷۱ء)

۱۸۸۔ حکیم مختار احمد ولد مولوی ظہیر احمد ظہیر العلما سہوانی

۱۔ فانی کے مقطعے ۲۔ التجائیں

۳۔ قانون طب منظوم

۱۸۹۔ <u>مظفر علی حمیدی ولد مفتی محمد علی حمیدی</u>

۱۔ مروج الفیوض فی البدایوں

۱۹۰۔ <u>مظفر علی</u>

۱۔ ---

۱۹۱۔ <u>سید منظور علی (ف ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) ولد سید برکات علی</u>

۱۔ کلام منظور اولیاء (قصیدہ مع حواشی) ۲۔ آثار اولیائے شہر بدایوں

۱۹۲۔ <u>ناطق بدایونی</u>

۱۔ جواہر ریزے

۱۹۳۔ <u>ملا نصیر ملتانی</u>

۱۔ طبقات اولیاء

۱۹۴۔ <u>مولوی نذیر احمد (۱۲۳۱ھ۔۱۲۷۰ھ) مولوی ضیاء الدین احمد</u>

۱۔ حواشی بر چند کتب

۱۹۵۔ <u>مولوی نظام الدین نظامی (ف ۱۹۴۷ء) ولد شیخ فخر الدین متوفی</u>

۱۔ قاموس المشاہیر (دو جلد)　　۲۔ بدایوں قدیم وجدید

۳۔ سیاحت ولی عہد　　۴۔ انقلاب دہلی

۵۔ سیرت الحمید　　(حالات مولوی حمید الدین ڈپٹی کلکٹر)

۶۔ تجلیات سخن

۷۔ رنگین وانشا　مرتبہ نظامی بدایونی　　(نظامی پریس بدایوں)

۸۔ دیوان جان صاحب　　مرتبہ نظامی بدایونی (نظامی پریس بدایوں، ۱۹۲۳ء)

۹۔ انسانی اوہام　　(لاہور ۱۹۰۸ء)

۱۹۶۔ <u>مولوی نظام الدین ناطق (ف ۱۲۸۵ھ) ولد صدر الدین عباسی</u>

۱۔ دیوان ناطق　　۲۔ کاموا کام (مثنوی)

۳۔ خواب وخیال (افسانہ)　۴۔ مولود شریف منظوم

۱۹۷۔ <u>مولوی نظر احمد افسوں (ف ۱۹۶۰ء)</u>

۱۔ تحفۃ الانساب　　(بدایوں ۱۹۵۹ء)

۱۹۸۔ <u>نفیس الدین فریدی</u>

۱۔ پاکستانی بڑے لڑکیا

۱۹۹۔ نورالدین ولد قطب الدین عباسی

ا۔ شجر طوبیٰ　　　(نسب نامہ عباسیاں)

۲۰۰۔ نیاز احمد نیازؔ (پ ۱۹۳۵ء) ولد مولوی سلمان احمد ہلالیؔ

ا۔ غم فروزاں　　　۲۔ ---

۲۰۱۔ نیاز احمد خاں۔۔۔ساکن اوجھیانی ضلع بدایوں

ا۔ ---

۲۰۲۔ حافظ واحد یار خاں (محلہ براہم پور)

ا۔ چمنستان رحمت الٰہی　　　(حالات شیخ عبداللہ بنجاب فاروقی)

۲۰۳۔ وحید احمد (مسعود) (ف ۱۸/مارچ ۱۸۹۳ء) ولد شیخ امیر احمد ولد شیخ شرف الدین فریدی فاروقی (شیخوپور)

ا۔ مشرق میں اسلام　　　۲۔ تصوف اور اس کی حقیقت

۳۔ جمال کبیری　　　۴۔ گرد راہ　(مجموعہ مقالات)

۲۰۴۔ حکیم وحید اللہ ولد حکیم سعید اللہ حمیدی

ا۔ حکومت المسلمین　　　۲۔ تاریخ بھرت پور

۳۔ تاریخ آئینہ جہاں نما　　　۴۔ دیوان وحید

۲۰۵۔ وصی احمد ولد سید علی احمد ساکن بسولی ضلع بدایوں

ا۔ ---

۲۰۶۔ منشی ہدایت اللہ خاں ساکن قصبہ اوجھیانی ضلع بدایوں

ا۔ تفریح ادب　　　(امیر الاقبال پریس بدایوں ۱۹۳۸ء)

ضمیمہ:

ا۔ سید ابو احمد صدر سہسوانی بدایونی۔

اوائل عمری میں مشرع سکول میں انگریزوں کو اردو کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ انھوں نے انگریزی اردو کی لغت ترتیب دی تھی۔ جو طبع نہ ہو سکی۔ آخری عمر میں دماغی عارضہ میں مبتلا ہو گئے تھے اور اسی عالم میں ۶۲ سال کی عمر میں سہسوان میں وفات پائی۔ شاعر بھی تھے۔ صدرؔ تخلص کرتے تھے۔

(بدایونی دوم ص ۲۲)

۲۔ ابوالحسن صدیقی بصیر بدایونی:

ابوالحسن صدیقی بن چودھری حاجی احمد حسین صدیقی طغلؔ۔ ۳۰ ستمبر ۱۸۸۸ء میں عارف پور نولہ ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ۲۳ نومبر ۱۹۵۴ء کو وفات پائی۔ دو تصانیف ان سے یادگار ہیں۔ ا۔ حامد عذرا (ناول) ۲۔ لمعات بصیر　　　(خان ۲۰۰۰ء ص ۱۳۹)

۳۔ ابوالفضل صدیقی بدایونی

ابوالفضل صدیقی بدایونی بن چودھری ابوالحسن صدیقی بھتیجے بدایونی۔ ۴ ستمبر ۱۹۰۸ء میں عارف پور نوادہ بدایوں کے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ فارسی، اردو اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ پھر مسوری کانونٹ اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ پہلا مضمون ہفت روزہ 'ریاست' دہلی میں لکھا۔ پہلا افسانہ 'سماج کا شکار' ادبی دنیا لاہور میں ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔ ان کے افسانے 'چڑھتا سورج' پر ۱۹۵۵ء ان کو یونیسکو کا بین الاقوامی انعام دیا گیا۔ 'گل زمیں کی تلاش میں' ناولٹ پر ۱۹۸۳ء میں نقوش صدارتی ایوارڈ دیا گیا اور ناول 'ترنگ' پر نیشنل بک کونسل ایوارڈ برائے ۱۹۸۹ء دیا گیا۔ ان کے افسانوں کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۸۷ء مطابق ۲۲ محرم ۱۴۰۸ھ بعارضہ قلب و فالج کراچی میں وفات ہوئی اور پاپوش نگر کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ تصانیف

۱۔ ابرام (افسانوی مجموعہ) ۲۔ تصویر (ناول) ۳۔ دوزبا خیالی ۴۔ سرور (ناول)
۵۔ چار ناولٹ (ناولٹ کا مجموعہ) ۶۔ جارج آرویل کے ناول 'انیس سو چوراسی' کا ترجمہ ۷۔ جوالا مکھی، آئینہ، انصاف (افسانوی مجموعہ) ۸۔ ترنگ (ناول) ۹۔ گلاب خاص (افسانوی مجموعہ) ۱۰۔ دن ڈھلے (افسانوی مجموعہ) ۱۱۔ عہد ساز لوگ (شخصی خاکوں کا مجموعہ) ۱۲۔ ستاروں کی چال (افسانوی مجموعہ) ۱۳۔ زخم دل (ناول) ۱۴۔ شکی (افسانوی مجموعہ ۲۰۰۰ء)۔

((۱) خان ۲۰۰۰ء ص ۱۳ (۲) راہی ۱۹۹۱ء ص ۱۳ (۳) صدیقی ۲۰۰۳ء ص ۱۵۔۱۳)

۴۔ احمد رضا حمیدی۔

بدایوں کے حمیدی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۳۰۵ھ میں فوت ہوئے۔ بدایوں کی تاریخ باسم تاریخی 'صحیح اسیر فی کوائف الخلد' ۱۲۷۹ھ میں لکھی۔ اس کا قلمی نسخہ بدایوں میں محفوظ ہے۔ اس کتاب کا تفصیلی تعارف 'ذوالقرنین' بدایوں میں شائع ہوا تھا۔ (قادری ۱۹۸۲ء ص ۱۸۶)

۵۔ سید احمد فوق۔

سید احمد فوق بن حکیم مفتی محمد یٰسین۔ ساکن محلہ فرشوری ٹولہ بدایوں۔ ۲۵ صفر ۱۳۲۲ھ میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مکمل کر کے ۱۹۲۵ء میں مڈل اسلامیہ سکول بدایوں سے پاس کیا۔ یہیں سے ہائی سکول کا امتحان پاس کیا اور طب کی طرف متوجہ ہوئے۔ والد سے اس فن میں دستگاہ حاصل کی۔ مولوی ابوالحسن صدیقی سے فن عروض سیکھا۔ آبائی پیشہ طب کو ذریعہ معاش بنایا۔ ۹ جنوری ۱۹۵۳ء کو سردی کا عارضہ ہوا اور ۲۵ فروری کو اسی حالت میں فوت ہوئے۔ خاندانی شاعر تھے۔ اس لیے کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔ شاگردوں کا حلقہ وسیع تھا۔ ان کے شاگردوں میں حکیم ظہور محمد انجم فوقی، شمس الدین شمس بدایونی اور اوج بدایونی کے نام مشہور ہیں۔ فن عروض کے ماہر تھے۔ اکثر رسالہ نیرنگ رام پور، رہنمائے تعلیم لاہور اور 'شاعر' آگرہ میں ان کے مضامین شائع ہوئے۔ آخری عمر میں دس سال کی مدت میں انھوں نے ایک لغت 'فوق اللغات' کے نام سے مرتب کی لیکن شائع نہ ہو سکی۔ ڈرامہ نگاری سے بھی شغف تھا۔ ان کے کچھ ڈرامے اور ناول غیر مطبوعہ رہ گئے۔ ۲۵ فروری ۱۹۵۳ء کی درمیانی شب کو انتقال ہوا۔ ان کی حیات میں درج ذیل کتابیں شائع ہوئیں۔

۱۔ تصویر عصمت، امیر الاقبال پریس، بدایوں، ۱۹۳۸ء، ص ۱۳۶
۲۔ خون محبت، مدنی پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۲ء، ص ۱۱

۳۔نقوش آذر (شعری مجموعہ) عثمانی پریس بدایوں ۱۹۳۸ء ص ۱۳۶

۴۔جذبات ذوق (نظمیں) امیر الاقبال پریس بدایوں ۱۹۳۲ء ص ۱۶

۵۔باب عروض، امیر الاقبال پریس، بدایوں، س۔ن، ص ۱۰۸

۶۔ذوق اللغات　　　　(غیر مطبوعہ)

۷۔شہید بدایونی کے خیال میں شعرائے بدایوں کا ایک تذکرہ بھی مرتب کیا تھا۔ (بدایونی دوم ص ۱۳۸)

۶۔ڈاکٹر اختر انصاری

اختر انصاری بدایونی ثم دہلوی بن ڈاکٹر محمد محفوظ اللہ۔ شہید بدایونی نے نام محمد محفوظ الحق تحریر کیا ہے۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ والد کی ملازمت دہلی میں تھی اس لیے مستقل سکونت دہلی میں اختیار کی اور تعلیم و تربیت بھی یہیں ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں ہائی سکول کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۹ء میں دہلی یونیورسٹی سے بی۔اے آنرز کیا۔ ۱۹۳۱ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے۔ والد کی اچانک وفات کی وجہ سے تعلیم چھوڑ کر واپس آ گئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پہلے بی۔ٹی اور پھر ایم۔اے کیا۔ پہلے یونیورسٹی کے ایک سیکنڈری سکول میں پھر شعبۂ اردو میں اور آخر میں شعبۂ تعلیمات میں استاد رہے۔ ۱۹۷۱ء میں ریٹائر ہوئے اور علی گڑھ میں قیام کیا۔ ۱۹۲۸ء کے لگ بھگ شعر گوئی کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۴ء میں پہلا مجموعہ نغمۂ روح چھپا۔ ۱۹۶۸ء تک تقریباً دس شعری مجموعے اشاعت پذیر ہوئے۔ ۱۹۷۱ء میں ان دس مجموعہ ہائے کلام کا ایک جامع و ضخیم انتخاب 'دہانِ زخم' کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا۔ ۱۹۷۷ء میں طویل نظم 'وقت کی بانسری' لکھی۔ یہ نظم ۱۹۷۹ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ گذشتہ چند سال کا کلام (نظمیں، غزلیں اور رباعیات) 'ایک قدم اور سہی' کے عنوان سے طباعت کے لیے تیار تھا۔ معلوم نہیں ہو سکا شائع ہوا یا نہیں۔

شعر گوئی کے ساتھ افسانہ نگاری کا بھی شغف رہا۔ افسانوں کے بھی کئی مجموعے شائع ہوئے۔ تنقید میں مارکسی زاویۂ نظر کے مسلک سے وابستہ تھے۔ اس سلسلے میں ○ افادی ادب (۱) ایک ادبی ڈائری (۲) مطالعہ و تنقید (۳) دہانِ زخم ۱۹۷۲ء (۴) غزل اور غزل کی تعلیم ۱۹۷۹ء (۵) اردو زبان و ادب کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۷۶ء شائع ہوئیں۔ نثا بیے بھی لکھے۔ تعلیم و تعلّم سے متعلق اردو اور انگریزی میں بھی چند تالیفات پیش کیں۔ غالب کے بعض رباعیات کو انگریزی میں منتقل کیا۔ اپنی کچھ کہانیوں کو بھی انگریزی کا جامہ پہنایا۔ ۵، اکتوبر ۱۹۸۸ء کو بروز جمعہ علی گڑھ میں وفات پائی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ تصانیف

۱۔مطالعہ و تنقید فرینڈز بک ہاؤس علی گڑھ، اول ۱۹۶۵ء ص ۳۱۷

۲۔غزل اور درس غزل ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، اول ۱۹۵۹ء، دوم ۱۹۷۷ء ص ۱۳۳،

۳۔افادی ادب، دلی پرنٹنگ ورکس دہلی، اول ۱۹۴۱ء، دوم ۱۹۶۲ء ص ۱۰۳، حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی، اول ۱۹۴۱ء، دوم ۱۹۴۲ء ص ۱۰۳

۴۔ایک ادبی ڈائری ناشر ایم ثناءاللہ خان، لاہور، اول ۱۹۴۲ء ص ۲۲۳

۵۔حالی اور نیا تنقیدی شعور، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، اول س۔ن، ص ۹۱

۶۔ نغمۂ روح (پہلا مجموعہ کلام) مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، اول ۱۹۳۲ء ص ۸۸

۷۔ اندھی دنیا (افسانے) ۸۔ آب گینے (قطعات) ۹۔ پرطاؤس (قطعات)

۱۰۔ ایک قدم اور سہی (تازہ مجموعہ کلام) ۱۱۔ لیزگی زمین ۱۲۔ خونناب (غزلوں کا مجموعہ)

۱۳۔ خونی (افسانے) ۱۴۔ نغمۂ سحر (رومانی نظموں کا مجموعہ) ۱۵۔ درد و داغ (مثنوی)

۱۶۔ دہانِ زخم ۱۷۔ روحِ ادب ۱۸۔ روحِ عصر (ترقی پسند شاعری کا مجموعہ)

۱۹۔ سرودِ جاں (غزلوں کا مجموعہ) ۲۰۔ شعلۂ جام ۲۱۔ سازو (افسانے)

۲۲۔ شعلہ بہ کف ۲۳۔ وقت کی بانہوں میں (طویل نظم) ۲۴۔ انتخاب کلام اختر انصاری

۲۵۔ تعلیم اور سماج (اردو ترجمہ) ۲۶۔ اردو فکشن اور اس کے بنیادی و تکنیکی عناصر چند نظمیں ۲۷۔ غزل کی سرگزشت

۲۸۔ لو ایک قصہ سنو (افسانوی مجموعہ) ۲۹۔ یہ زندگی (افسانوی مجموعہ)

تفصیل کے لیے دیکھیے: (۱) اکادمیس ص ۵۲-۵۳ (۲) رام ۱۹۹۲ء ص ۴۴ (۳) خان ۲۰۰۰ء ص ۳۶-۳۵ (۴) انجم ص ۱۰-۱۱)

۷۔ اخلاق احمد سہسوانی۔

اخلاق حسین قریشی ولد چودھری چودھری اشتیاق حسین، ساکن قصبہ سہسوان، بسلسلہ ملازمت بدایوں میں مقیم رہے۔ شاعری بھی کی۔ اخلاق تخلص اختیار کیا۔ شہید بدایونی نے 'آخری رات' ناول کا ذکر کیا ہے۔ جب کہ فاطمہ رابعہ نے اسے ناولٹ تحریر کیا ہے اور اس کا نام 'آخری رات' تحریر کیا ہے۔ شہید نے 'آگ اور پھول' ناول کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اس وقت اسے زیر طبع بتایا ہے۔ افسانے بھی لکھے۔ (بدایونی اول ص ۶۹)

ا۔ آخری رات، (ناولٹ) ادبی دنیا، اردو بازار دہلی، صفحات ۱۴۴ (رابعہ ص ۴۹)

۸۔ (ابو الکمال حکیم) سید اعجاز احمد معجز سہسوانی بن سید عبدالباری سہسوانی۔

ولادت ۸ مارچ ۱۸۷۷ء وفات ۷ جنوری ۱۹۶۳ء والد مرحوم کے زمانہ قیام بھوپال میں ان کے ساتھ تھے۔ ۱۳۰۳ھ میں ان کا انتقال ہو گیا تو سہسوان آ گئے۔ بھوپال اور سہسوان میں علوم متداولہ کی تکمیل کی۔ حکیم سید محمود عالم سہسوانی سے فن طب حاصل کیا۔ سائی پریس لکھنؤ سے ملازمت کی ابتدا کی۔ بعد ازاں جانسن کالجیٹ اسکول آگرہ، مدرسہ بسولی (ضلع بدایوں)، ہسٹلی اسلامیہ ہائی سکول بدایوں اور وثیقہ عربک کالج فیض آباد میں عربی و فارسی کے استاد رہے۔ تدریس کے ساتھ ساتھ مطب کا بھی سلسلہ جاری رہا۔ اسلامیہ ہائی سکول بدایوں میں ملازمت کے دوران منشی فاضل اور مولوی فاضل کے امتحانات پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پاس کیے۔ عمر کا بہترین حصہ (۱۹۰۹ء تا ۱۹۳۶ء) فیض آباد میں بسر ہوا۔ درسی کتابیں حکیم محمود عالم سہسوانی اور سید عبدالحسیب سے پڑھیں۔ پھر بھوپال جا کر محمد بشیر سہسوانی (متوفی ۱۳۲۳ھ) اور قاضی عبدالحق کابلی بھوپالی اور شیخ محمد یحییٰ شہری سے دینیات کی تکمیل کی اور سہسوان آ گئے۔ حدیث شیخ حسین عرب یمنی سے پڑھی۔ بسولی میں درس کے ساتھ مطب بھی شروع کر دیا۔ بدایوں کے مدرسے میں عربی و فارسی کے استاد مقرر ہو گئے۔ آخر میں فیض آباد کے کالج میں نائب پرنسپل ہو گئے اور پنشن لے کر وطن آ گئے اور مطالعہ کتب و تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ شاعر بھی تھے۔ معجز تخلص کرتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں

زبانوں میں قصائد اور غزلیات کہتے تھے۔ تاریخ گوئی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ۱۳۸۲ھ میں انتقال ہوا۔ من جملہ دیگر تصانیف فارابی کی نصوص الحکم کی شرح، رشحات الکرم کے نام سے لکھی۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ فیض آباد کے زمانہ قیام میں مختلف محافل و مجالس میں شریک ہوتے رہے۔ اردو میں بہ کثرت قصیدے کہے۔ چنانچہ مکمل دیوان قصائد موجود ہے۔ آخری دور میں اردو قصیدہ نگار کی حیثیت سے جن اساتذہ نے شہرت پائی ان میں تجمّل کا پایہ بلند ہے۔ تمام قصائد، نعت و منقبت میں ہیں۔ کسی رئیس کی مداحی نہیں کی۔ تصانیف درج ذیل ہیں۔

۱۔ رشحات الکرم فی شرح فصوص الحکم (عربی)

۲۔ توقیع الفرید فی تذکار ادباء الہند (عربی تذکرہ ادبائے ہند)

۳۔ برہان التحقیق مسئلہ اجتہاد و تقلید (عربی)

۴۔ تسلیۃ الفواد (ترجمہ قصیدہ بانت سعاد بزبان فارسی)

۵۔ تعلیقات علی الحماسیات (عربی) ۶۔ کتاب المفردات (فارسی)

۷۔ مومن و غالب، سرفراز پریس، لکھنؤ، ۱۳۵۰ھ ص ۷۰ ۸۔ اتمام الحجۃ علی من اوجب الزیارۃ (فقہ)

تفصیل کے لیے دیکھیے:: (۱) نوشہروی ۱۹۳۸ء ص ۲۶۰۔۲۵۹ (۲) نوشہروی ۱۳۹۱ھ ص ۷۶، ۷۷، ۸۱، ۹۰، ۹۹ (۳) زبیری ۱۹۹۶ء ص ۲۸۸ (۴) عبدالسلام مقالہ ص ۴۹۰)

۹۔ ڈاکٹر افتخار بیگم۔

ڈاکٹر افتخار بیگم بنت مولوی اقبال احمد، اہلیہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، تخلص افتخار۔ جون ۱۹۳۷ء میں محلہ شیخ پٹی بدایوں میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ تقسیم ہند کے بعد خاندان علی گڑھ منتقل ہوا تو وہاں آگئیں۔ پرائیویٹ طور پر میٹرک، ایف۔ اے اور بی۔ اے کیا۔ ۱۹۵۴ء میں علی گڑھ ویمن کالج میں بطور لیکچرر تقرر ہوا۔ دوران ملازمت ۱۹۷۷ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی اور اسی سال سے ذاکر حسین کالج، دہلی سے بہ حیثیت استاد منسلک ہو گئیں۔ بچپن سے طبیعت موزوں تھی۔ شاعری میں حقیقی بھائیوں پروفیسر ظفر احمد صدیقی اور قمر کمالی سے مشورہ سخن کیا۔ افسانے بھی لکھے۔ دو کتابیں ایک نفسیات اور دوسری بچوں کے ادب پر شائع ہوئیں۔ شرح کلیات فانی بھی لکھی۔ معلوم نہیں شائع ہوئی بھی یا نہیں۔ (بدایوں اول ص ۱۳۶۔۱۳۵)

۱۰۔ مولوی محمد افضل۔

مولوی محمد افضل بن مولوی تاج الدین صدیقی سنبھل ضلع مراد آباد کے علما و رؤسا میں شمار کیے جاتے تھے۔ شاہان وقت کے ہاں ان کے بزرگ قدر و منزلت اور جاہ و منصب سے سرفراز رہے۔ ان کے بزرگوں میں مولانا وجیہ الدین بارھویں صدی ہجری میں قصبہ سنبھل کی سکونت ترک کر کے بدایوں تشریف لائے اور محلہ شیخ پٹی میں بود و باش اختیار کی۔ ان کے پوتے محمد افضل بدایوں میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پا کر علوم معقول و منقول کی تعلیم مولوی عبدالحق عثمانی سے حاصل کی۔ فارسی انشا پردازی میں کمال حاصل تھا۔ ہدایت الخلوق کے نام سے اپنے پیرو مرشد کے حالات و کرامات فارسی زبان میں قلم بند کیے۔ اس کتاب کو اردو ترجمہ حکیم مجاہد الدین متوی نے کی۔ خوش نویسی میں کمال حاصل تھا۔

۲۹ ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء میں وفات پائی۔ (بدایونی اول ص ۱۰۱۔۱۰۲)

۱۱۔ شیخ افضل محمد۔

یہ خاندان حمیدی کے بزرگ تھے۔ ان کا انتقال ۹۶۶ھ میں ہوا۔ تصانیف۔

۱۔ حاشیہ تفسیر بحر مواج۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی (ف ۸۴۹ھ مطابق ۱۴۴۵ء) کی تفسیر پر حاشیہ لکھا۔

۲۔ جذب البیان فی علوم القرآن۔　　دیکھیے: (قادری ۱۹۸۲ء ص ۱۸۳)

۱۲۔ امیر حسن بن لیاقت علی سہسوانی۔

۱۲۴۳ھ میں پیدا ہوئے۔ امداد صابری نے تاریخ پیدائش ۱۲۴۳ تحریر کی ہے۔ سہسوان کے رہنے والے تھے۔ فضل وکمال میں مشاہیر علما میں شمار تھا۔ کچھ کتابیں عبدالجلیل کوئلی (متوفی ۱۲۷۳ھ) سے اور کچھ قاضی بشیر الدین قنوجی، عبدالجلیل مجاہد اسرائیلی، شاہ سید نذیر حسین، مفتی صدرالدین آزردہ، شیخ عبدالحق بنارسی، شاہ عبدالغنی دہلوی، مفتی سعداللہ رامپوری، شیخ تراب علی لکھنوی اور سراج احمد سنبھلی سے تعلیم حاصل کی۔ حدیث سید نذیر حسین دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ) سے حاصل کی۔ عالم شباب کے وقت طلب علم کے لیے کمربستہ ہوئے۔ چند سالوں میں ان کا شمار متبحر علما اور وسیع النظیر علما میں ہونے لگا۔ کچھ عرصہ اپنے وطن میں درس دیا۔ دہلی اور میرٹھ میں بھی تدریس کی۔ مرادآباد کے مدرسہ امدادیہ میں پڑھایا۔ شاگردوں میں مولانا سید عبدالباری سہسوانی، مولانا سید سبط احمد سہسوانی، مولانا سید محمد نذیر سہسوانی، سید امیر احمد سہسوانی صاحبزادہ موصوف (متوفی ۱۳۰۶ھ) مولانا محمد تراب علی مرشدآبادی اور قاضی محمد احتشام الدین مرادآبادی شامل ہیں۔ مسلکاً اہل حدیث تھے۔ ردبدعات اور حمایت سنت میں کئی رسالے لکھے۔ ایک شیعہ عالم کے رد میں لکھا اور ایک رسالہ اثبات حق کے نام سے تحریر کیا۔ طبعیات شفا پر تعلیقات سپرد قلم کیں۔ سید نذیر حسین دہلوی کی تصنیف 'معیار الحق' کے جواب میں 'براہین اثنا عشر' لکھی۔ دوشنبہ ۱۱ صفر ۱۲۹۱ھ مطابق ۳۰ مارچ ۱۸۷۴ء میں ۶۸ سال کی عمر میں علی گڑھ میں وفات پائی۔ سید اعجاز احمد نے آیت پاک 'ورحمۃ ربک خیر' سے تاریخ نکالی۔ غیر معمولی حافظہ تھا۔ پادری ہاسکنس نصاریٰ کے مشہور عالم مشنری تھے، سے مناظرے کیے۔ حیدرآباد سے بھی دعوت ملی لیکن وہاں نہیں گئے۔ نہایت قانع بزرگ تھے۔ من جملہ دیگر تصنیفات شیخ کی شفا کے طبعیات پر حواشی لکھے۔ 'براہین اثنا عشر' ارشاد حسین رامپوری کی تصنیف 'انتصار الحق' کے جواب میں لکھی۔ یہ کتاب مطبوعہ ہے۔

تفصیل: ((۱) خان ۱۹۹۶ء ص (۲) نوشہروی ص ۱۹۳۸ء ۲۲۱۔۲۲۹ (۳) نوشہروی ۱۳۹۱ھ ص ۱۲۶ (۴) صابری ص ۲۰۷۔۲۰۶ (۵) بھٹی سوم ص ۳۲۲۔۳۱۸ء))

۱۳۔ مولوی الٰہی بخش۔

۱۔ رد رسالہ قانون شریعت (مولوی امیر حسن سہسوانی کے رد میں)

۱۴۔ انجم فوقی بدایونی

حکیم مولانا ظہور محمد بن مولوی نور محمد۔ ۱۱ جنوری ۱۹۱۱ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ طبیہ کالج علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۵۷ء سے کراچی میں مقیم ہو گئے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں ماہنامہ 'سنگم' کانپور سے جاری کیا۔ آپ ہی اس کے مدیر تھے۔ کئی اور ماہناموں کے مدیر

رہے۔ شاعری میں فوق بزرواری کے شاگرد تھے۔ ۱۱، اگست ۱۹۹۵ء میں کراچی میں فوت ہوئے۔ آپ کی تصانیف میں درج ذیل یادگار ہیں۔

۱۔ آتش نم (رباعیات وقطعات،)　　۲۔ اجالے (غزلوں کا مجموعہ)　　۳۔ رد کہکشاں

۴۔ سنگ پرویں اور کیمیا (ڈرامہ)　　۵۔ مہر و ماہ (مجموعہ غزلیات)　　۷۔ فکر وفن (عروضی اصطلاحات)

۸۔ مکاشفات، ملاحظات اور وژن (تینوں اردو کتابوں کا انگریزی ترجمہ) پہلی چار بدایوں سے اور باقی پاکستان سے شائع ہوئیں۔　　((۱) صاحب ربت ص ۲۹۵ (۲) نشان ۲۰۰۰ء ص ۹۵)

۱۵۔ اولاد احمد بن آل احمد سہوانی۔

مشاہیر علما میں شمار تھا۔ سہوان مولد ومنشا تھا۔ رامپور میں مفتی شرف الدین کی شاگردی اختیار کی۔ پھر لکھنؤ میں شیخ تراب علی اور اسماعیل لندنی سے تکمیل کی اور یہیں قرآن مجید حفظ کیا اور درس وافادہ میں مصروف ہوگئے۔ ان کی تصنیفات میں ضابطہ تہذیب کی شرح ہے جو اپنے بھائی سراج احمد (متوفی ۱۲۷۹ھ) کے لیے لکھی تھی۔ پچاسی سال کی عمر میں ۱۲۸۱ھ میں وفات پائی۔ (عبدالسلام خاں ص)

۱۶۔ ابرار محمد عبداللہ مہر۔

ابرار محمد عبداللہ خلف مولوی نور محمد تخلص مہر۔ حکیم مولانا انجم فوقی کے برادر خورد۔ ۱۹۳۷ء میں بدایوں کے محلہ مولوی ٹولہ میں پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اس کے بعد اسلامیہ کالج بدایوں سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۵۷ء میں مستقل طور پر پاکستان آگئے اور شعبہ درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے۔ شاعری میں انجم فوقی کی شاگردی اختیار کی۔

۱۔ مہر اللغات (تالیف)　(بدایوں دوم ص ۱۲۷۹)

۱۷۔ آل احمد شاہ بن سید شاہ نظر محمد نقوی۔

سید آل احمد سہوانی بن نظر محمد بن ابو محمد حسینی نقوی سہوانی، نیک سیرت علما میں سے تھے۔ سہوان میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ بچپن ہی سے اپنے والد گرامی سید نظر محمد سہوانی سے منسلک رہے اور ان سے حصول علم کیا۔ تصوف وطریقت میں بھی ان سے فیض یاب ہوئے۔ والد کی وفات کے بعد ان کی مسند مشیخت پر متمکن ہوئے۔ پرہیزگار اور فقیہ تھے۔ وحدت الوجود کے قائل اور ابن عربی سے متاثر تھے۔ چنانچہ ابن عربی کی 'فصوص الحکم' کی شرح سپرد قلم کی۔ جسے 'البیان المرصوص فی شرح الفصوص' کے نام سے موسوم کیا۔ ان کے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کی بنا پر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ان کی بہت تکریم کیا کرتے تھے۔ مرادآباد، رامپور، بریلی، سنبھل اور دہلی بھیت وغیرہ شہروں میں ان کے بہت سے ارادت مند تھے جو حاضر خدمت ہوتے اور استفادہ واستفاضہ کرتے۔ ۸۰ سال کی عمر پا کر ۱۲۵۹ھ میں فوت ہوئے۔ آپ کی علمیت وفضیلت کا سکہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں تھا۔ ہزاروں علمائے ہند نے آپ سے تلمذ حاصل کیا۔ آپ کی تمام عمر درس وتدریس میں گزری۔ آپ کی تصانیف میں 'فصوص الحکم مع شرح شیخ محب اللہ الہ آبادی'، 'نقد الفصوص'، 'مولانا جامی کی شرح بزبان عربی البیان المرصوص' ہیں۔ دیکھیے: ((۱) صاحب ربی ص ۲۰۸ (۲) بجلی اول ص ۵۰۔۴۹)

۱۸۔ قاضی بدرالدین بدایونی۔

بدایوں کے حمیدی خاندان کے فرد تھے۔ انھوں نے 'صدرا' پر حاشیہ لکھا جو ان کے نام کی مناسبت سے 'بدرا' مشہور ہوا۔

(قادری ۱۹۸۲ء ص ۱۸۳)

۱۹۔ مولانا محمد بدر عالم میرٹھی۔

۱۹۰۱ء میں بدایوں ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ شہید بدایونی نے پیدائش ۱۸۹۸ء تحریر کی ہے۔ والد کا نام حاجی تہور علی تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ مولانا اشرف علی تھانوی کا وعظ سن کر سکول کی تعلیم چھوڑ کر مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیا۔ مولانا خلیل احمد سے دورہ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔ اسی مدرسے میں تدریس پر مامور ہوئے۔ دو سال بعد دارالعلوم دیوبند میں مولانا انور شاہ کشمیری سے دورہ حدیث کی دوسری سند حاصل کی۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستانی قومیت اختیار کی۔ ٹنڈو الہ یار کے مدرسہ میں ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے درس حدیث میں مشغول رہے۔ ۱۳۷۲ھ میں یہاں سے مدینہ منورہ چلے گئے اور وہیں اقامت اختیار کر لی۔ سلسلہ بیعت اور ارشاد کے لیے افریقی ممالک کے سفر بھی کیے۔ ۵ رجب ۱۳۸۵ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو شب جمعہ وفات پائی اور جنت البقیع میں دفنائے گئے۔ تصانیف۔

۱۔ فیض الباری شرح بخاری (عربی) مطبوعہ مصر

۲۔ ترجمان السنۃ (چار جلدیں، علم حدیث میں) تین جلدیں، دوسری تیسری اور چوتھی جلد ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئیں۔

۳۔ مستزاد الحقیر، شیخ ابن ہمام کی تصنیف زاد الفقیر پر حاشیہ

۴۔ خلاصہ زبدۃ المناسک، اس کے انگریزی اور گجراتی ترجمے بھی ہوئے۔

۵۔ الحزب الاعظم، اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی ہوا۔

۶۔ نزول عیسیٰ، اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی ہوا۔

۷۔ جواہر الحکم (تین جلدیں) اس کے گجراتی اور فرانسیسی زبان میں ترجمے بھی ہوئے۔

۸۔ آواز حق　۹۔ شان حضور　۱۰۔ قسمت کا ستارہ　۱۱۔ عزیزوں کے نام ایک مکتوب

۱۲۔ فریاد مظہر　۱۳۔ مجوب الارث

دیکھیے: (۱) حنیف الرحمٰن ص ۱۱۳۔۱۱۱ (۲) بدایونی اول ص ۱۵۵۔۱۵۳)

۲۰۔ محمد بشیر فاروقی بن حکیم محمد بدر الدین۔

لگ بھگ ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کو علم طب میں وسعت نظر کے باعث شاہان اودھ کی طرف سے 'خان' کا خطاب ملا تھا۔ سلسلہ نسب فاروق اعظم تک پہنچتا ہے۔ ۱۰ برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ لکھنؤ سے واپس سہسوان آ گئے اور مولوی سید امیر حسن، مولانا ہدایت اللہ خان رام پوری، حضرت میاں صاحب، علامہ شیخ حسین عرب یمنی، شیخ احمد شرقی، مولانا محمد صاحب سہارنپوری اور علمائے فرنگی محل سے کسب علم کیا۔ عرصہ تک سینٹ جانس کالج آگرہ میں مدرس (فارسی و عربی) رہے۔ حجاز مقدس سے لوٹ کر آئے تو نواب شاہ جہاں بیگم نے بھوپال بلوا لیا۔ ۵ محرم ۱۲۹۵ھ کو آپ کو عہدہ افسری مدارس ریاست تفویض ہوا۔ یہاں بھی حدیث و تفسیر کے درس دیتے اور مسند افتا پر فائز بھی تھے۔ بھوپال میں میر روشن کا تاج محل میں آپ کا وعظ ہوتا جس میں نواب شاہ جہاں بیگم اور دیگر بیگمات محل شریک ہوتیں۔ نواب شاہ جہاں بیگم کے انتقال کے بعد دہلی آئے اور مسجد حوض والی میں ۱۶ سال تک درس حدیث و تفسیر و اشاعت افتا فرماتے رہے۔

خلف امام فاتحہ پڑھنے کے حوالے سے تین ماہ تک روزانہ صبح درس دیتے رہے۔ یہ درس آپ کے شاگرد مولانا احمد اللہ دہلوی نے "برہان العجاب فی فرضیۃ ام الکتاب" کے نام سے شائع کی۔ مرزا غلام احمد قادیانی سے بھی تحریری مناظرہ کیا۔ زمانہ قیام دہلی میں بیمار ہوئے۔ ۲۹ جمادی الاولی ۱۳۲۶ھ مطابق ۲۹ جون ۱۹۰۸ء کو وفات پائی۔ سید اعجاز احمد عجز نے لفظ "مغفور" سے مادہ تاریخ وفات حاصل کیا۔ تصانیف

۱۔ صیانۃ الانسان عن وسوسۃ الشیخ دحلان۔ (شیخ دحلان (مکہ) کے رد میں عربی زبان میں تحریر کی۔

اسے علمائے نجد نے کئی مرتبہ چھپوایا۔)

۲۔ القول المحمود فی رد جواز سود

۳۔ الحق الصحیح فی اثبات حیاۃ المسیح (پیر فاروقی صاحب اور مرزا غلام احمد قادیانی کے درمیان مناظرہ کی مکمل کیفیت) مطبوعہ

۴۔ القول المحقق المحکم فی زیارۃ قبر الحبیب الاکرام (مطبوعہ)

۵۔ القول المنصور　　　　(عبدالحی لکھنوی کی "الکلام المبرور" کا جواب)

قربانی کے لیے لازم عمر حیوانی کو مختلف نہیں سمجھتے تھے۔ اس حوالے سے علماء سے بحثیں ہوئیں۔ اس پر بھی ایک رسالہ لکھا جس میں مخالفین کے دعاوی کی تردید کی۔ اس کے علاوہ اور بھی تصانیف تحریر کیں جن کی نشان دہی نہیں ہو سکی۔ دیکھیے: (۱) نوشہروی ۱۹۳۸ء ص ۲۴۹۔۲۵۶ (۲) نوشہروی ۱۳۹۱ھ ص ۹۹،۱۲)

۲۱۔ ڈاکٹر توصیف تبسم۔

محمد احمد توصیف خلف محمد عبداللطیف صدیقی، توصیف تخلص۔ ساکن قصبہ سہسوان، بدایوں۔ ۳، اگست ۱۹۳۸ء کو سہسوان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سہسوان اور دہلی میں ہوئی۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے اور راولپنڈی میں رہائش اختیار کی۔ ملٹری انجینئرنگ سروس کی ملازمت اختیار کی۔ دوران ملازمت تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ۱۹۶۲ء میں گورڈن کالج راولپنڈی سے ایم۔اے کیا۔ اسی کالج میں لیکچرر متعین ہوئے۔ شاعر بھی تھے۔ مجموعہ کلام "سمندر" اور "آئینہ" شائع ہوا۔ انھیں معلوم نہیں ہو سکا۔ مثنویات دہلی کا تہذیبی و معاشرتی مطالعہ کے موضوع پر مقالہ تحریر کیا۔ جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ (بدایونی اول ص ۲۱۸)

۲۲۔ ثاقب بدایونی

نجم الدین احمد بن مولانا جمیل الدین احمد (عالم، شاعر، ادیب، دانشور) ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام غلام حیدر (۱۲۹۳ھ) تھا۔ شاعری میں داغ دہلوی کے شاگرد رہے۔ ماہنامہ "سومن" بدایوں کے مدیر تھے۔ ۱۹۲۵ء میں بدایوں میں وفات پائی۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ درج ذیل تصانیف ان سے یادگار ہیں۔

۱۔ اخلاق کریمی　　۲۔ آئینہ عبرت　　۳۔ بہارستان سخن　　۴۔ چراغ مدعا　　۵۔ دہلی کا مہمان

۶۔ روئداد ریاست بڑودہ　　۷۔ ریاض شاداب　　۸۔ سیر دکن　　۹۔ کلام ثاقب

۱۰۔ معراج حضور　　دیکھیے: (خان ۲۰۰۰ء ص ۱۷۷)

۲۳۔ مفتی حافظ بخش بدایونی۔

۱۔ تنبیہ الجہال بالہام الباسط المتعال (مناظرہ احمدیہ کے رد میں) لکھنؤ ۱۸۷۳ء

۲۴۔ مولوی حفیظ اللہ بند بدایونی ثم رام پوری:

مولوی حفیظ اللہ بن مولوی کرامت اللہ عباسی ۱۸۱۲ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ (شاعر، ادیب) فارسی میں حفیظ تخلص تھا۔ تلمیذ غلام جیلانی رفعت رام پوری اور مولوی رستم علی اور مولوی سلیم اللہ فخر رام پوری۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں صاحب دیوان تھے۔ حصول ملازمت کے لیے بلاس پور ریاست رام پور چلے گئے۔ ۲۲ جمادی الثانی ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں موضع ستورہ رام پور میں وفات پائی۔ بشارت نے وفات کی تاریخ جنوری ۱۸۶۱ء تحریر کی ہے۔ درج ذیل تصانیف ان سے یادگار ہیں۔

۱۔ انشائے فیض رساں ۲۔ آداب الصبیان ۳۔ پارہ ملمہ ۴۔ راقیات ۵۔ بیت المعرفت (مثنوی) ۶۔ دیوان غزلیات ۷۔ شرح ظہوری ۸۔ مولوی خیرالورٰی

دیکھیے: (۱) بدایونی اول ص ۱۷۱ (۲) خان ۲۰۰۰ء ص ۱۲۲)

۲۵۔ علامہ سید حسن حیرت بدایونی:

علامہ سید حسن خلف محمد حسن ۲۲، اگست ۱۸۹۶ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ان کے جد اعلیٰ قاضی محمد جلیس اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت میں ایران کے قصبہ سبزوار سے دلی آئے اور عہد عالمگیر میں خدمت قضا پر فائز ہوئے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جنھوں نے فتاویٰ عالمگیری ترتیب دی اور اس زمانے کے تمام علما نے اس پر دستخط کیے بعد میں یہ خاندان دلی سے بدایوں منتقل ہو گیا تھا۔ حیرت شاعر بھی تھے۔ تقریباً ۶۰ سال شاعری کی۔ بہت لکھا لیکن طبیعت کی لاپرواہی کی وجہ سے کچھ سنبھال کر نہیں رکھا۔ صرف ایک فارسی مجموعہ اور ایک اردو مجموعہ ’آئینۂ یادگار‘ چھوڑا۔ نثر میں بچوں کے لیے کچھ کتابیں لکھیں۔ یہی ان کا کل سرمایہ ہے۔ اخباروں میں مزاحیہ کالم بھی لکھے۔ انتقال سے قبل تک وہ ادبی کاموں میں مصروف رہے۔ آخیر عمر میں ڈپریشن کا شکار ہو گئے تھے۔ زیادہ کام نہیں ہوتا تھا۔ تاہم ’امیر خسرو کی فارسی شاعری‘ نامی کتاب پر کام جاری تھا۔ ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد آئے اور یہیں ۱۵ فروری ۱۹۷۵ء میں شام ۷ بجے ان کا انتقال ہوا۔ مدفن بھی یہی سرزمین بنی۔ ۳ بجے تک دیوان خانہ میں بے حس الہ آبادی کے ساتھ بیٹھے رہے اور ادبی گفتگو کرتے رہے۔ (۱) رشید الدین، ص ۲۱۔ ۱۷ (۲) بدایونی اول ص ۲۹۱)

۱۔ شمس دکن اردو اکیڈمی حیدرآباد ۱۹۷۲ء ص ۲۸

۲۔ جنگل کانفرنس، دکن اردو اکیڈمی، حیدرآباد ۱۹۳۵ء ص ۲۵، ۱۹۵۶ء ص ۲۷

۲۶۔ حسین احمد فریدی۔

حسین احمد فریدی خلف فرید احمد مسعود فریدی، ورکس شیخوپورہ بدایوں۔ ۱۶ جون ۱۹۵۶ء میں خاندان فریدی کے باعزت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ خاندان میں شاعری کا چرچا تھا۔ اسلامیہ کالج بدایوں میں بھی رہا اور دلدار اور محمد شفیع پیام بدایونی سے تعلق رہا۔ ماہنامہ ’رہنمائیاں‘ کی مجلس مشاورت میں شریک رہے۔ کئی کتابیں تصنیف و تالیف کیں جو غیر مطبوعہ رہیں۔ ’تذکرہ شعرائے بدایوں پاکستان میں‘ کی ترتیب بھی شروع کی تھی معلوم نہیں مکمل ہوئی یا نہیں۔

دیکھیے: (بدایونی اول ص ۲۵۲)

۴۷۔ مولوی حشمت علی۔

بریلی محلہ گڑھیا میں رہتے تھے۔ خاندان حمیدی کے فرد تھے۔ مدرسہ منظر الاسلام سے فارغ التحصیل ہوئے۔ فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خان نے مشاہیر علما و مشائخ کے جلسہ میں دستار فضیلت باندھی۔ تمام عمر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ رہا۔ ان کی کتاب 'نصرۃ الواعظین' (دو جلد) بہت مقبول ہوئی۔ اس کے علاوہ یہ کتاب بھی ان سے یادگار ہے۔

۱۔ شجرہ خاندان عالیہ مجیدیہ حلیمیہ، یوسفی پریس بریلی ۲۹ صفر ۱۳۴۲ھ (قادری ۱۹۸۴ء ص ۱۸۵، ۱۸۷)

۴۸۔ ڈاکٹر حنیف نقوی

اردو کے ممتاز محقق اور نقاد ڈاکٹر حنیف نقوی کا پورا نام حنیف احمد نقوی ہے۔ ان کی ولادت ۱۷/ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں سہسوان ضلع بدایوں (یو۔پی) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم سہسوان میں پائی اور اسی شہر سے ۱۹۵۵ء میں امتیازی نمبروں کے ساتھ ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ وکرم یونیورسٹی سے ۱۹۵۹ء میں بی۔اے، ۱۹۶۱ء اردو میں ایم۔اے ۱۹۶۸ء میں 'شعرائے اردو کے تذکرے' کے موضوع پر پروفیسر ابو محمد سحر کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ لکھا۔ جس پر وکرم یونیورسٹی اجین سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری دی گئی۔ ۱۹۷۳ء میں بنارس ہندو یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے کیا۔

نقوی صاحب کی ملازمت کا آغاز دسمبر ۱۹۶۱ء میں سیفیہ انٹر کالج میں استاد کی حیثیت سے ہوا۔ ۱۴ جون ۱۹۶۲ء کو فضل الرحمن اسلامیہ انٹر کالج بریلی میں لیکچرر منتخب ہوئے اور ۱۳/ دسمبر ۱۹۶۳ء تک یہاں تدریسی فرائض سرانجام دیے۔ ۱۶/ دسمبر ۱۹۶۳ء تا ۱۵/ دسمبر ۱۹۶۶ء جونیئر ریسرچ فیلو (یو۔جی۔سی) گورنمنٹ حمیدیہ کالج بھوپال رہے۔ یکم فروری ۱۹۶۸ء تا ۳۱ جولائی ۱۹۶۹ء شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ریسرچ اسسٹنٹ رہے اور علی گڑھ تاریخ ادب اردو پر نظر ثانی کی۔ ۳ فروری ۱۹۷۰ء تا ۲ فروری ۱۹۸۴ء شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی میں لیکچرر رہے۔ ۳ فروری ۱۹۸۴ء تا ۲ فروری ۱۹۹۰ء تک ریڈر رہے۔ ۳ فروری ۱۹۹۰ء کو یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر ترقی ہوئی۔ یکم مارچ ۱۹۹۱ء میں صدر شعبہ اردو بنے۔ ۳۱ دسمبر ۲۰۰۰ء کو ریٹائر ہوئے۔ مختلف اکیڈمیوں اور اداروں نے کئی انعامات سے نوازا ہے۔ راقم الحروف پر بہت کرم فرمائی فرماتے ہیں۔

۱۔ غالب احوال و آثار، نصرت پبلشرز لکھنؤ، ۱۹۹۰ء ص ۳۳۲، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، دوم ۲۰۰۷ء ص ۳۳۹

۲۔ غالب کی چند فارسی تصانیف، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، دوم ۲۰۰۵ء ص ۱۵۲

۳۔ مرزا غالب کے پنج آہنگ کا قدیم ترین قلمی نسخہ، مقدمہ حنیف نقوی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۱۹۹۷ء

۴۔ غالب کی چند فارسی تصانیف، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، دوم ۲۰۰۵ء

۵۔ شعرائے اردو کے تذکرے، نسیم بک ڈپو، اول جون ۱۹۷۶ء، دوم اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۹۸ء ص ۱۷

۶۔ رجب علی بیگ سرور، چند تحقیقی مباحث، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی، ۱۹۹۱ء ص ۱۰۸

۷۔ آثار غالب (غالب کی کمیاب نظم و نثر کا مجموعہ) مرتبہ قاضی عبد الودود، تصحیح و ترتیب جدید، حنیف نقوی

اول پٹنہ ۱۹۴۹ء، دوم پٹنہ، سوم ادارہ یادگار غالب کراچی، ۲۰۰۰ء ص ۲۵۶

۸۔دیوان ناسخ عکسی ایڈیشن تقدیم وحدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۱۹۹۷ء ص ۱۶۸

۹۔انتخاب کرنل کنھا ۱۰۔رائے بینی نرائن دہلوی۔ سوانح اور ادبی خدمات

۱۱۔میر و مصحفی (تحقیقی مضامین) ناشر مصنف بنارس ۲۰۰۳ء ص ۱۵۶

دیکھیے: (۱) نقوی ۲۰۰۳ء طباعت (۲) نقوی ۱۹۹۹ء طباعت)

۲۹۔ روشن بدایونی۔

عنایت اللہ بن حبیب اللہ (ادیب، شاعر) تلمیذ عزیز بریلوی و امیر مینائی۔ ولادت ۲۱ فروری ۱۹۰۹ء بدایوں۔ وفات ۷ دسمبر ۱۹۲۵ء بدایوں۔ تصانیف (۱) تعلیم فارسی　(۲) خورشید روشن　(۳) دیوان روشن　(۴) قصہ راجا بلوان ول و چترسین

(خان ۲۰۰۰ء ص ۲۸۹)

۳۰۔ دلاور فگار۔

دلاور فگار بن شاکر حسین۔ ۸ جولائی ۱۹۲۹ء میں حمیدی صدیقی خاندان میں محلہ بیدوں ٹولہ بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں ہائی سکول پاس کیا اور بدایوں ہی میں ڈاک خانے میں ملازم ہو گئے لیکن ایک سال بعد ہی اس ملازمت کو خیرباد کہہ دیا۔ چار سال بعد بریلی کالج میں انٹرمیڈیٹ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخل ہوئے۔ یہاں سے معلمی کا ڈپلومہ حاصل کیا۔ ۱۹۵۰ء میں اسلامیہ کالج میں بحیثیت لیکچرر تقرر ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں بی۔ اے کیا اور پھر معاشیات میں ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۶۶ء میں ایم۔ اے اردو کیا۔ اس کے سال ڈیڑھ سال بعد پاکستان آ گئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ۱۹۴۱ء میں غزل گوئی سے شاعری کا آغاز کیا۔ ابتدا میں شباب تخلص کرتے تھے لیکن طبیعت کو مزاح سے مناسبت تھی اس لیے ۱۹۵۱ء میں فگار تخلص اختیار کر کے مزاحیہ شاعری کا آغاز کیا۔ جون ۱۹۵۸ء سے روزنامہ "نئی دنیا" دہلی میں قطعات و منظومات کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ ابتدا میں جامی بدایونی، سلطان احمد، آفتاب احمد جوہر اور جام نوائی سے مشورہ سخن کیا۔ تصانیف۔

۱۔ حادثے (مجموعہ غزلیات) مرتب الیاس انجم، نظامی پریس بدایوں ۱۹۵۶ء

۲۔ انگلیوں کی ایسری (مزاحیہ نظم) نظامی پریس بدایوں ۱۹۵۳ء

۳۔ ستم ظریفیاں (مزاحیہ کلام) گولڈن جبلی کیشنز بدایوں، جنوری ۱۹۶۱ء

۴۔ شامت اعمال بریلی الیکٹرک پریس، بریلی، ۱۹۶۸ء، دوم ستارہ جبلی کیشنز دہلی، ۱۹۶۸ء

۵۔ آداب عرض، ستارہ پاکٹ سیریز دہلی۔ ۱۹۶۹ء

۶۔ غالب کو برا کیوں کہو، ڈیسنٹ پریس، کراچی، ۱۹۶۹ء

۷۔ انر بر نو (مزاحیہ انتخاب) کوہ نور پرنٹنگ پریس، دہلی، جنوری ۱۹۷۷ء

۸۔ خوشبو کا سفر (انگریزی نظموں کے تراجم) مکتبہ ادب آداب کراچی۔ ۱۹۷۶ء

۹۔ خوب تر کہاں (صدر امریکہ جمی کارٹر کی سوانح کا اردو ترجمہ) ۱۹۷۵ء

۱۰۔ انٹرویو (منظوم) فنکاران عہد جدید بدایوں، ص ۸

۱۱۔ انگلیاں فگار اپنی، مکتبہ ادب آداب، کراچی، ۱۹۷۱ء

۱۲۔ مطلع عرض ہے، اردو محل کراچی، ۱۹۷۹ء

۱۳۔ آبنا رنو، (قرآن کریم کی منظوم تفسیر کے سلسلے کی قسط اول) ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان ۱۹۸۸ء

دیکھیے: (بدایونی، ۱۹۸۱ء ص ۱۴۷۔۱۹۳)

۳۱۔ راشد سہسوانی۔

کچھ ہاؤس، (اول) تاج آفس، دہلی، ۱۹۸۵ء ص ۲۴۶ (راہ ص ۹۱)

۳۲۔ منشی رائے کشن سہائے فرحت

ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ان کے والد ٹھاکر دوارہ وغیرہ کے علاقے میں تحصیل دار کے عہدے پر فائز تھے۔ بعد میں ان کی خدمات کے سلسلے میں ان کے بیٹے رائے کشن سہائے فرحت کو تحصیل دار کا عہدہ ملا اور شاہ جہان پور وغیرہ میں ایک مدت ملازم سرکار رہے۔ فرحت نواب غلام حسین خاں کے شاگرد تھے۔ آپ نے کئی کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ 'قصہ لیلاوتی' کو فارسی میں نظم کیا۔ 'فسانہ گل بکاؤلی' کو مثنوی میر حسن کی بحر میں نظم کر کے 'رموز عشق' نام رکھا۔ یہ شائع بھی ہوئیں۔ (بدایونی دوم ص ۱۰۳۔۱۰۴)

۳۳۔ محمد زاہد کریم بدایونی۔

لے جغرافیہ دکن، سراجی پریس، ۱۳۲۳ھ ص ۹۲ (صدیقی ۱۹۸۱ء ص ۱۴۹)

۳۴۔ سید سبط حسن بن سید اولاد احمد۔

۱۲۶۷ھ میں پیدا ہوئے۔ سید امیر حسن سہسوانی سے تعلیم حاصل کی۔ بدایوں اور شیخوپورہ میں کچھ مدت تدریس کی۔ علمائے احناف بدایوں نے نواب صدیق حسن خان کے رسالہ 'اعلاء الحق' فارسی میں شائع کیا۔ اس پر نواب صاحب نے آپ کو بھوپال بلا لیا۔ بقیہ عمر وہیں بسر کی۔ علوم متداولہ کے ساتھ فرائض میں بھی زیادہ نظر تھی۔ ۴۳ سال کی عمر میں ۱۳۰۷ھ میں مقام چاود ضلع آمود بھوپال میں وفات پائی۔ سید اعجاز احمد معجز سہسوانی نے 'قد فاز فوزاً عظیماً' سے تاریخ وفات نکالی۔ بھوپال ہی میں دفن ہوئے۔ (نوشہروی ۱۹۳۸ء ص ۴۳۷)

۳۵۔ سخاوت حسین مدہوش۔

خان بہادر منشی سخاوت حسین مدہوش بن شیخ محمد عنایت حسین۔ ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی، فقہ و حدیث و قرآن کی تحصیل حکیم سعید الدین کامل فرشوری سے کی۔ بعد میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۵۷ء میں شاہ جہاں پور میں وکالت شروع کر دی۔ خوب پذیرائی ملی اور چند برس بعد میونسپل بورڈ شاہ جہاں پور کے وائس چیئرمین اور مجسٹریٹ بنے۔ کانگریس کی بنیاد ڈالنے والوں میں شامل تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے پہلے اجلاس میں شرکت کی۔ ہندو مسلم اتحاد بورڈ کے کچھ عرصہ صدر بھی رہے۔ انگریزی میں اچھی دستگاہ بھی رکھتے تھے اس لیے اس لیے انگریزوں کے مترجم کا کام عدالتوں اور پبلک جلسوں میں بخوبی انجام دیتے تھے۔ بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ اردو فارسی نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ تصانیف

لے 'رقعات مدہوش' مسمیٰ بہ شراب الکوثر مطبع افضل المطابع و سعید الاخبار، اول ۱۸۷۹ء، دوم نظامی پریس

بدایوں، ۱۹۶۳ء　　۳۔ رسالہ تعلیم مسلمانان　((۱) بدایونی ۱۹۸۱ء ص ۳۹۔۴۲ (۲) بدایونی دوم ۳۹۔۳۸)

۳۶۔ منشی سکھ لال طپاں۔

منشی سکھ لال ولد منشی مہاراج، تخلص طپاں۔ ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی کے اعلیٰ درجے کے نثر نگار تھے۔ ان کا ایک فارسی مقالہ لندن لائبریری میں محفوظ ہے۔ (بدایونی دوم ص ۳۶۷)

۳۷۔ مولوی محمد شاکر حسین نکہت سہسوانی۔

۱۔ قانون شریعت محمدی (فقہ، اردو)　　(نوشہروی ۱۳۹۱ھ ص ۶۳)

۳۸۔ شاکر حسین صدیقی سہسوانی۔

۱۔ خیر الکلام (ابن قیم کی تصنیف جلاء الافہام کا اردو ترجمہ) مدینہ پریس بجنور، اول ۲۹ ذی قعدہ ۱۳۲۷ھ ص ۲۵۶

۳۹۔ شرر بدایونی۔

۱۔ فریاد، وکٹوریہ پریس بدایوں، ۱۳۳۵ھ ص ۱۶

۴۰۔ مفتی شرف علی حمیدی۔

حمیدی خان کے فرد تھے۔ خاندان حمیدی کے مشاہیر کے حالات فارسی زبان میں 'تاریخ بنی حمید' کے نام سے لکھے۔ یہ کتاب ۱۳۰۷ھ میں شروع ہو کر ۱۳۴۲ھ میں مکمل ہوئی۔ اس کا قلمی نسخہ اوج بدایونی کے پاس ہے۔ (قادری ۱۹۸۲ء ص ۱۸۶)

۴۱۔ شمس بدایونی۔

۱۔ دید و دریافت، (حصہ اول) ناشر روشن جیل کیشنز بدایوں، اگست ۱۹۸۱ء ص ۲۳۲

۲۔ نقد و اثر، اردو بک ریویو، دہلی، ناشر مصنف، اول جنوری ۲۰۰۲ء ص ۲۹۸

۳۔ شعری ضرب الامثال، (اول) ۱۹۸۴ء　　۴۔ از خاک بدایوں، ۱۹۸۵ء

۵۔ حقائق و بصائر ۱۹۸۶ء　　۶۔ مکاتیب شمیم ۱۹۸۷ء

۷۔ شعرائے بدایوں: دیار رسول میں ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۷ء　۸۔ شعری ضرب الامثال (دوم) ۱۹۸۸ء

۹۔ اردو نعت کا شرعی محاسبہ ۱۹۸۸ء　　۱۰۔ اختر انصاری دہلوی، دہلی، ۱۹۸۹ء

۱۱۔ نظامی بدایونی اور نظامی بدایونی کی ادبی خدمات ۱۹۹۵ء

۱۲۔ تلخیص مآثر ۲۰۰۲ء　　۱۳۔ ــــــــ ہندی ۱۹۸۸ء (بدایونی ۲۰۰۲ء فلیپ)

۴۲۔ ضمیر علی بدایونی:

اصل نام ضمیر علی، قلمی نام ضمیر علی بدایونی۔ ۲۰ جون ۱۹۴۱ء میں پیدا ہوئے۔ بدایوں کے علمی و ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم بمبئی کے مشہور کالج ST.XAVIER حاصل کی۔ بی اے، ایل ایل بی کیا۔ بعد ازاں کراچی آ گئے۔ ۱۹۶۹ء میں ریڈیو پاکستان سے بحیثیت پروڈیوسر ملازمت کا آغاز کیا۔ وہ ایک طویل عرصے تک ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے۔ ۲۰۰۱ء میں بحیثیت کنٹرولر ریڈیو

پاکستان کراچی سے ریٹائرمنٹ لی۔ جدیدیت فلسفیانہ اور ادبی تحریکوں پر جرائد میں مضامین لکھے۔ انھوں نے ادب اور فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا اور خاص طور پر جدیدیت کی ادبی تحریک کے تناظر میں انھوں نے کئی تنقیدی مضامین کا مجموعہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت (ایک ادبی و فلسفیانہ تناظر) ۱۹۹۹ء میں کراچی سے شائع کیا۔ اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے سال کی بہترین اردو ادب و تنقید کی کتاب کا ایوارڈ مولوی عبدالحق ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ضمیر علی بدایونی کا انتقال ۲۸، اکتوبر ۲۰۰۳ء میں ہوا۔ تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ انھوں نے مرتب کرلیا تھا لیکن ان کی زندگی میں شائع نہ ہوسکا۔ اس کتاب کی اشاعت مرحوم مصنف کے اہلِ خانہ کی دلچسپی کی بدولت ہوئی۔

۱۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت (ایک ادبی و فلسفیانہ تناظر) کراچی، ۱۹۹۹ء

۲۔ مابعد جدیدیت کا دوسرا رخ، شہرزاد کراچی، ۲۰۰۶ء　　(قلیب، کتاب نمبر ۱)

۴۳۔ ضیاء القادری بدایونی۔

اسنا ریخ اولیائے حق، ضیاء القادری بدایونی، مشہور پریس کراچی، ۱۳۷۷ھ ص ۱۲۲۔ اس تذکرے کے تین نام ہیں۔ تذکرہ دوام تاریخ اولیائے حق، اور تصور خواجگان۔ تینوں تاریخی نام ہیں۔ (قاموس الکتب، دوم ص ۲۵۷) اول الذکر سے ۱۳۷۶ھ حاصل ہوتے ہیں ممکن ہے ایک کمی کی جائز رکھی ہو۔ باقی دو سے ۱۳۷۷ھ حاصل ہوتے ہیں۔

۴۴۔ طفیل احمد صدیقی بدایونی۔

۱۔ برکات مارہرہ (مارہرہ کے بزرگوں کے حالات) نول کشور پریس لکھنؤ، س ن، ص ۴۱۲

۴۵۔ طیب بدایونی۔

محمد طیب بخش قادری بن مولوی یعقوب بخش راغب بدایونی (ادیب، محقق)۔ ولادت ۱۹۲۷ء میں بدایوں میں ہوئی۔ وفات ۱۹۹۴ء میں ہوئی۔ تصانیف

۱۔ ایمان و ایقان　　۲۔ اعتقادات　　۳۔ انتخاب کلام نازش　　۴۔ ظریف شعرائے بدایوں

۵۔ کلیات راغب　　۶۔ نقوش قلم　(خان ۲۰۰۰ء، ص ۳۰۱)

۴۶۔ مولانا حکیم ظہور محمد۔

مولانا حکیم ظہور محمد خلف نور محمد ساکن محلہ فرشوری ٹولہ بدایوں، تخلص انجم، شاگرد سید احمد شوق سبزواری بدایونی، ۱۱ جنوری ۱۹۱۱ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ طب کی تعلیم بھی حاصل کی۔ شاگردوں کی کثیر تعداد رکھتے تھے۔ تصانیف

۱۔ اجالے (پہلا مجموعہ کلام) نظامی پریس، بدایوں ۱۹۵۳ء　　۷۔ ملاحظات　(مکتوبات)

۲۔ مہر و ماہ (دوسرا مجموعہ کلام) جنگ پریس راولپنڈی ۱۹۸۹ء　　۸۔ وزن (مکتوبات اور مکتوبات کا انگریزی ترجمہ)

۳۔ رازِ گلستاں (چند غیر معروف شعرا کا تذکرہ)　　۹۔ آتش نم (رباعیات و قطعات)

۴۔ سالکِ پرویں (چند غیر معروف شعرا کا تذکرہ)　　۱۰۔ کیمیا (ڈرامہ)

۵۔ نظامیات (مکتوبات)　　۱۱۔ فکر و فن (عروضی اصطلاحات پر مفصل کتاب)

۶۔ مکاشفات (مکتوبات) (بدایونی اول ص ۱۱۷۔۱۱۹)

۴۷۔ مولانا عبدالصمد سہسوانی۔

۱۔ افادات صمدیہ (مولانا فضل حق کے رسالے امتناع النظیر کا رد) مطبوعہ (بدایونی ۲۰۰۷ء)

۴۸۔ منشی عبدالعزیز اعجاز سہسوانی:

محمد عبدالعزیز خلف محمد صالح سہسوانی بدایونی۔ ۱۲۵۲ھ میں سہسوان میں پیدا ہوئے۔ آغا میرزا دیگی نام ہے۔ کم عمری میں والد کے ہمراہ لکھنؤ آگئے اور یہیں علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ منشی کاکا پرشاد موجد سے فن خوش نویسی حاصل کیا۔ خوش نویسی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ واجد علی شاہ نے 'اعجاز رقم' کے خطاب سے سرفراز کیا۔ انتزاع سلطنت اودھ کے بعد کچھ دنوں رام پور رہے پھر بھوپال آگئے اور وہاں ۱۵ سال رہے۔ ۲۱ برس گوالیار میں ملازمت کی۔ آخر عمر میں بھوپال واپس آگئے تھے اور نواب محمد یٰسین محمد خان کی سرکار میں ملازم ہوگئے تھے۔ ابتدا میں الٰہی بخش نازش خیرآبادی پھر امیر لکھنوی، اور امیر جلالؔ سے مشورہ سخن کیا۔ تمام اصناف سخن پر قادر تھے۔ فارسی میں مولانا عباس رفعت بھوپالی کے شاگرد تھے۔ چہارشنبہ ۷ جمادی الاول ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۳ ستمبر ۱۸۹۹ء کو وہیں وفات پائی۔ مرنے سے قبل خود تاریخ کہی 'اعجاز رقم خاں مرد' جس سے ۱۳۱۷ھ تاریخ وفات حاصل ہوتی ہے۔ بھوپال میں دفن ہوئے۔ تصانیف

۱۔ واقعات سفر شاہجہانی (قلمی) مرتبہ اعجاز رقم

تفصیل کے لیے دیکھیے: ((۱) رام اول ص ۳۳۳۔۳۳۴ (۲) خمخانہ ص ۹۲ (۳) رام ۱۹۹۶ء ص ۳۹ (۴) بدایونی اول ص ۸۹ (۵) زیدی ص ۱۔۹۲ (۶) خان ۲۰۰۰ء ص)

۴۹۔ عروج زیدی بدایونی ثم رام پوری۔

سید فیاض علی بن سید نوشہ علی۔ (شاعر، ادیب) تلمیذ بہ احسنی، احسن مارہروی۔ ولادت ۲۵ ستمبر ۱۹۱۲ء باپوڑ ضلع غازی آباد۔ وفات ۳ فروری ۱۹۸۷ء رام پور۔ تصانیف

۱۔ جھلکیاں ۲۔ ختم المرسلین ۳۔ دل لخت لخت ۴۔ زندہ کتبے ۵۔ سفینۂ غزل

۶۔ شمع فروزاں ۷۔ عروج کے سو شعر ۸۔ متاع فکر (خان ۲۰۰۰ء ص ۳۳۵)

۵۰۔ عبدالغنی بن مفتی درویش محمد عثمانی۔

علوم حکمیہ کے مشہور فضلا میں تھے۔ بدایوں مولد و منشا تھا۔ درس و افادہ میں زندگی گزاری۔ قطبیہ کے حاشیہ میر زاہد پر اور دوانی کے شرح تہذیب کے حاشیہ میر زاہد پر حواشی لکھے۔ (خاں ۱۹۹۶ء ص ۲۵۲)

۵۱۔ عبدالحکیم بن کرامت حسین شیخوپوری۔

منطق، کلام اور اصول وفقہ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ۱۲۵۹ھ میں وفات پائی۔ (خاں ۱۹۹۶ء ص ۲۷۷)

۵۲۔ عرفان احمد عرفان۔

عرفان احمد خلف مولوی سلطان احمد بلالی ایڈووکیٹ، ساکن محلہ سوتھہ بدایوں۔ ۱۹۳۸ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اردو

فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ پھر بی۔ اے تک کی تعلیم حاصل کی اور ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ اطلاعات، اتر پردیش ہوگئے۔ ادبی زندگی کا آغاز ناول نگاری سے کیا۔ تنقید سے بھی خاص شغف رہا۔ بحیثیت صحافت نگار پہلی تصنیف 'رابطہ عامہ' جامعہ ملیہ دہلی نے شائع کی۔ پہلا شعری مجموعہ 'کیپسولس' کے نام سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ شاعر بھی تھے۔ (بدایونی دوم ص ۲۷)

۵۳۔ عزیز احمد منظر ایوبی۔

عزیز احمد ایوبی خلف علی احمد ایوبی ابن مولوی علی بخش ایوبی۔ ۳، اگست ۱۹۳۲ء مطابق یکم ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ۳ مئی ۱۹۵۱ء میں بدایوں سے ہجرت کرکے پاکستان آئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ بی۔ کام اور ایم۔ اے کی تعلیم حاصل کرکے مرکزی حکومت کے سیکرٹریٹ میں ملازم ہوگئے۔ ۱۹۶۱ء میں بحیثیت پروفیسر محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوگئے۔ ماہنامہ 'ہم قلم' پاکستان رائٹرز گلڈ، کراچی کے اعزازی نائب مدیر رہے۔ شاعر بھی تھے۔ منظر تخلص کرتے تھے۔ حکیم انجم فوقی سے استفادہ سخن کرنے کی روایت ملتی ہے۔

تصانیف

ا۔ تکلم (شاعری) مطبوعہ　۲۔ شناخت (شاعری) مطبوعہ

شہید بدایونی نے درج ذیل کتب کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ زیر ترتیب ہیں۔

ا۔ اردو شاعری میں نئے موضوعات کی تلاش (زیر طبع)　۲۔ اردو شاعری میں انقلابی شعور (زیر ترتیب)

۳۔ یادداشت (شخصیات) (زیر ترتیب) ۴۔ جھوٹ کے پاؤں کہاں (ڈراموں کا مجموعہ) (زیر ترتیب)

۵۔ لہر لہر سنگیت (گیتوں کا مجموعہ) (زیر ترتیب)　۶۔ ستار مجھ لیوی (ل ہوتی نغمے) (زیر ترتیب)

۷۔ کراچی کا دبستان شاعری (زیر ترتیب)　(بدایونی دوم ص ۲۲۹۔۲۲۸)

۵۴۔ عزیز بدایونی۔

ا۔ ایک دل ہزار غم (ناول) بک ڈپو دہلی ۱۹۵۹ء ص ۳۲۷ (رضیہ ص ۹۲)

۵۵۔ محمد عظیم اللہ خاں مسکین۔

محمد عظیم اللہ خاں خلف الفت خاں، تخلص مسکین، ساکن محلہ قاضی ٹولہ، بدایوں۔ ۱۹ محرم ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸، اکتوبر ۱۸۸۶ء۔ تصانیف

ا۔ بحر المصادر (مصادر کا بیان منظوم) مطبع افضل المطابع بدایوں، ۱۲۹۶ھ ص ۳۲

۲۔ گوہر منظوم (غیر مطبوعہ) (بدایونی دوم ص ۲۲۶۔۲۲۵)

۵۶۔ عماد علی بدایونی۔

علوم حکمیہ کے ماہر تھے۔ بدایوں مولد و منشا تھا۔ مختلف اساتذہ سے درسیات پڑھے۔ آخر میں بحر العلوم کی شاہجہاں پور میں شاگردی اختیار کی اور درس و افادہ میں مشغول ہوگئے۔ (خاں ۱۹۹۶ء ص ۲۸۱)

۵۷۔ مولوی عنایت اللہ روشن۔

مولوی عنایت اللہ روشن خلف مولوی حبیب اللہ بدایونی (تخلص روشن) ۱۳ فروری ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے چچا مولانا شہاب الدین سے اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ۲۵ سال تک مشن ہائی سکول بدایوں میں ہیڈ مولوی رہے۔ شاعری میں نواب عبدالعزیز خاں بریلوی اور امیر

جیلانی سے مشورہ سخن کیا۔ ۵ دسمبر ۱۹۳۵ء میں انتقال ہوا۔

۱۔ دیوان روشن (مجموعہ کلام) نشاط پریس بدایوں ۱۹۳۶ء

۲۔ خورشید روشن (مثنوی) مطبع منشی نول کشور لکھنؤ ۱۸۹۴ء دوم مع غزلیات ۱۹۰۳ء ص ۱۶

۳۔ قصہ رنج بلران الی وجتر سین، مطبع نامی پریس لکھنؤ ۱۹۰۳ء

۴۔ تعلیم فارسی، مطبع نامی پریس لکھنؤ ۱۸۹۶ء	(بدایونی اول ص ۳۳۹)

۵۸۔ سید عنایت احمد نقوی حیرت بدایونی۔

سید عنایت احمد نقوی بن مولوی سید مطیع احمد ساکن محلہ فرشی ٹولہ بدایوں۔ ۲۷ رجب ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۵۹ء میں لشکر گوالیار میں پیدا ہوئے۔ شاعری میں اپنے چچا مولانا دلدار علی مذاق، داغ دہلوی سے اصلاح لی۔ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی صدر اعظم حیدرآباد دکن نے علامہ ابن الہیثم کی نادر و نایاب شہرہ آفاق تصنیف "کتاب المرایا والمناظر" کے قلمی نسخے کو مرتب کرنے کے لیے انتخاب فرمایا۔ کتاب مذکور کے صرف تین نسخے دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ یہ نسخے حیدرآباد، پٹنہ اور رام پور میں ہیں۔ حیرت صاحب نے تینوں نسخوں سے موازنہ و مقابلہ کے بعد مذکورہ تصنیف کو مرتب کیا۔ یہ کتاب سلسلہ آصفیہ حیدرآباد دکن کے زیر اہتمام ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ آپ ریاست گوالیار میں ایک مدت تک پانچ زہ میں مجسٹریٹ رہے۔ پولیس کمشنری کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ آپ کا دیوان مولوی محمد ابرار صدیقی بدایونی نے ڈاکٹر سید آل محمد نقوی (صاحبزادہ) کی خواہش پر مرتب کیا جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ لالہ سری رام نے لکھا ہے "سنا ہے آپ نے چند لکی کتابوں پر حواشی اور شرحیں بھی لکھی ہیں جو اردو کے لیے نہایت مفید ہیں لیکن افسوس ہے وہ ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہیں۔" آپ کا انتقال ۸۰ برس کی عمر میں ۹ نومبر ۱۹۳۹ء میں بدایوں میں ہوا۔ بشارت نے تاریخ ۹ نومبر تحریر کی ہے۔ (۱) برام، دوم ۵۵۰۔۵۲۸ (۲) خان ۲۰۰۰ء ص ۳۳۶ (۳) بدایونی اول ص ۲۹۵)

۵۹۔ ڈپٹی سید غلام جیلانی ہاشمی بن مولوی حکیم سید اشفاق حسین۔

عربی کی تعلیم مولوی ہدایت علی تلمیذ فضل حق خیر آبادی اور مولانا محمد احسن نانوتوی سے حاصل کی۔ بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہو کر لوٹے تو انگریزی میں مشق بہم پہنچائی اور ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ مطالعہ اچھا تھا۔ نواب علیا بیگم حضرت سلطان جہاں بیگم نے شہرت سنی تو طلب فرمایا۔ بھوپال گئے۔ عہدہ منتظم بندوبست ممالک محروسہ پیش ہوا جسے قبول نہ کیا اور واپس سہسوان لوٹ آئے۔ ۱۳۲۵ھ میں بریلی میں وفات پائی۔ (نوشہروی ۱۹۳۸ء ص ۲۳۸)

۵۵۔ غلام حامد حیدر آذر نایاب۔

غلام حیدر آذر نایاب ولد اقبال حسین صدیقی، آذر تخلص۔ ۱۹۲۸ء میں محلہ قاضی ٹولہ میں پیدا ہوئے۔ مولوی تمنا حسین سے گھر پر درسی کتابیں پڑھیں۔ شاعری میں مولوی تمنا حسین، خوشتر ولی الحق، نظر یاب حسین جام نوائی، حافظ ظہور احمد اختر فکری اور امیر احمد امیر ٹونک والا سے مشورہ سخن کرتے رہے۔ اردو، فارسی اور سندھی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ آگرہ یونیورسٹی سے بی۔اے کیا۔ ایم۔اے انگریزی سندھ یونیورسٹی اور بی۔ٹی کراچی سے کیا۔ ایل۔ایل۔بی بھی کراچی سے کیا۔ محکمہ تعلیم حکومت سندھ سے وابستہ رہے۔ ۱۹۷۸ء سندھی کلام کا مجموعہ

جھنگیون ٹیمپرمن پرمعز دنکھر سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ تین درسی کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ انگریزی میں 'Training in modem of Teaching English" بھی تحریر کی۔ (بدایونی اول ص ۵۷۔۵۶)

۶۰۔ قاری فراست اللہ فراست۔

قاری فراست اللہ بن ریاست اللہ دانشمندی، تخلص فراست، ساکن محلہ مولوی ٹولہ بدایوں۔ ولادت ۱۲ شوال ۱۳۲۶ھ کو ہوئی۔ شاگرد مولوی لیاقت علی نانا۔ یہ نانا رشتے میں ان کے نانا تھے۔ ان کے بعد آفتاب احمد جوہر بدایونی سے اصلاح لی۔ مذہبی تعلیم حافظ عبدالکریم بریلوی اور ایوب علی متولی سے فارسی پڑھی۔ اسلامیہ انٹر کالج اور چندوسی انٹر کالج سے تعلیم حاصل کی۔ مولانا عبدالقدیر صاحب سے بیعت کی اور حضرت مجتبیٰ اشرفی سے خلافت لی۔ ۱۹۵۰ء میں بدایوں سے ہجرت کر کے کراچی آ گئے۔ ۱۹۶۰ء میں لندن چلے گئے اور وہیں مستقل اقامت اختیار کر لی۔

ا۔ اسلام اور اس کے مطالبات، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۷۹ء (بدایونی دوم ص ۳۵۶)

۶۱۔ مولوی فصیح الدین بدایونی۔

ا۔ قول فصیح (تحذیر الناس کے جواب میں) میرٹھ، ۱۸۷۵ء

۶۲۔ مولانا فضل مجید بدایونی۔

ا۔ تحقیقات محمدیہ حل اوہام نجدیہ (مناظرہ احمدیہ کے رد میں) مطبع الٰہی، آگرہ، ۱۸۷۲ء (بدایونی ۲۰۰۷ء)

۶۳۔ فکر بدایونی۔

حاجی سید حسین بن سید حامد بدایونی۔ (شاعر، ادیب) ولادت ۱۸۸۳ء بدایوں۔ وفات ۱۳، اکتوبر ۱۹۲۷ء کو۔ مختصر تصانیف

ا۔ افکار دیکھیے: (خان ۲۰۰۹ء ص ۲۷۶)

۶۴۔ فوق سبزواری بدایونی۔

سید احمد بن حکیم مفتی محمد یٰسین۔ (ماہر لسانیات، ادیب، ڈرامہ نگار)۔ ولادت ۲۱، اپریل ۱۹۰۳ء۔ وفات ۲۵ فروری ۱۹۵۳ء بدایوں۔ تصانیف

ا۔ اسباب عروض (نکات عروض) ۲۔ تصویر عصمت (ڈرامہ) ۳۔ جذبات فوق ۴۔ خون محبت ۵۔ نقوش آذر (خان ۲۰۰۹ء ص ۲۷۸)

۶۵۔ شیخ کبیر الدین متولی۔

ا۔ کلمہ باقی، بدایوں ۱۹۳۷ء (بدایونی ۲۰۰۴ء ص ۲۳۶)

۶۶۔ محمد قوی الاسلام عباسی بدایونی۔

ا۔ قواعد عثمانیہ (اردو قلمی) تالیف ۱۳۳۸ھ۔ اردو صرف و نحو و عروض پر مبسوط کتاب۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد میں موجود ہے۔ (زور، دوم ص ۱۷۹۔۱۷۸)

۶۷۔ محفوظ علی ورود ی بن شیخ محمد اسماعیل۔

۱۲۳۷ھ میں فوت ہوئے۔ سلامت اللہ کشفی کے شاگرد تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کا فارسی دیوان نامکمل رہا۔ (قادری ۱۹۸۲ء ص ۱۹۹)

۶۸۔ محمود عالم بن الٰہی بخش سہسوانی۔

علوم حکمیہ میں اعلیٰ درجہ تھا۔ سہسوان مولد وطن تھا۔ تحصیل علم کے لیے رامپور آئے اور مولانا عبدالحق خیرآبادی اور دیگر علمائے عصر سے تحصیل علوم کی۔ حدیث کی سند میاں محمد شاہ محدث رامپوری (متوفی ۱۳۲۸ھ) سے لی۔ وطن آکر پڑھانے میں مصروف ہوگئے۔ ۱۳۳۱ھ میں وطن میں وفات پائی۔ (خاں ۱۹۹۶ء ص ۳۱۵)

۶۹۔ مسرت اللہ خاں اشرفی مسرت۔

مسرت اللہ خاں اشرفی خلف منشی حکمت اللہ خاں، ساکن محلہ جالندھری سرائے بدایوں۔ یکم نومبر ۱۹۳۶ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ آگرہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ ایڈ کیا۔ ۱۹۶۷ء میں گورنمنٹ کالج امروہہ ضلع مرادآباد میں اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۱ء میں تبدیل ہوکر بدایوں آگئے۔ گورنمنٹ انٹر کالج بدایوں میں لیکچرر بھی رہے۔ مولانا سید شاہ مختار اشرف سجادہ نشین کچھوچھا شریف سے بیعت ہونے کی مناسبت سے اشرفی لکھتے رہے۔ شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا۔ کالج میگزین میں غزلیں شائع ہوئیں۔ آل انڈیا لکھنؤ سے کلام نشر ہوتا رہا۔ تنقیدی مضامین، افسانے اور ڈرامے بھارت کے مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ غیر مطبوعہ تصانیف یہ ہیں۔

۱۔ حیات فانی ۲۔ چند شعرائے بدایوں ۳۔ حرف ناتمام (مجموعہ کلام) ۴۔ روح کائنات (افسانوں کا مجموعہ) (بدایونی دوم ص ۳۳۲)

۷۰۔ مظفر علی برق

مظفر علی برق، ساکن محلہ سوتھہ بدایوں۔ ۱۸۷۳ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فارغ ہوکر سرکاری ملازمت اختیار کی۔ نجی خفیفہ آگرہ میں منصرم تھے۔ آپ کی دوسری بیوی سے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی پیدا ہوئے۔ ریٹائرمنٹ سے چند سال قبل ۱۹۳۳ء میں انتقال ہوا۔ نعش آگرہ سے بدایوں لائی گئی اور قاضی حوض کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ دوسری بیوی کے لیے کچھ مضامین ہدایت کے طور پر لکھے تھے۔ یہ مضامین کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے۔ شاعر بھی تھے۔ ستار بجانا بھی جانتے تھے۔ (۱) جشنیم ص ۷۳ (۲) بدایونی اول ص ۱۵۸۔۱۵۷)

۷۱۔ سید محمد تراب علی۔

سید محمد تراب علی ولد سید امیر علی، ساکن محلہ میراں سرائے بدایوں۔ تخلص تراب۔ ۲۹ رمضان ۱۳۲۱ھ کو انتقال ہوا۔

۱۔ تراب اللغات (مکمل ہونے اور اشاعت کا علم نہیں ہوسکا)

۲۔ تذکرۃ الشمس (؟)، مطبع جوہر ہند دہلی۔ (بدایونی اول ص ۲۱۷)

۷۲۔ حکیم مظہر علی بن حکیم بدرالدین۔

درسیات نظامی اپنے برادر مکرم مولانا محمد بشیر سے پڑھیں۔ حدیث، اصول فقہ، کلام اور طب پر اچھی نظر رکھتے تھے۔ گوالیار میں مطب کرتے تھے۔ دربار میں رسوخ تھا۔ دیوان وزیر اعظم سر دنکر راؤ آپ کی تکریم کرتے تھے۔ ۱۳۱۲ھ میں فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے مع اہل وعیال حجاز گئے اور مکہ معظمہ میں وفات پائی۔ تصانیف

۱۔مظہر البیان (تفسیر)　　　　(نوشہروی ۱۹۳۸ء، ص ۳۲۹)

۴۳۔ مولانا معین الدین انصاری سہسوانی۔

ان کے اسلاف جہاں گیر کے عہد سے سہسوان کی جامع مسجد میں امامت وخطابت کے فرائض سر انجام دیتے آرہے ہیں۔ علم ومعرفت اور تقویٰ میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ انصاری صاحب کو تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور دیگر علوم مروجہ میں خاص درک تھا۔ تیرہویں صدی کے اوائل میں پیدا ہوئے اور اپنے شہر سہسوان ہی میں نشوونما پائی۔ متداولہ علوم وفنون کی تحصیل کے لیے پہلے رام پور گئے پھر عازم لکھنؤ اور دہلی ہوئے۔ وہاں سے مولانا محمد اسماعیل دہلوی، مولانا عبدالحی بڈھانوی اور شاہ محمد اسحاق دہلوی کے درس میں شامل ہوئے۔ علوم سے فارغ ہو کر سہسوان آئے اور درس کے ساتھ ساتھ تبلیغ شروع کی۔ آخر عمر میں ضلع بلند شہر کے ایک قصبے 'ڈبائی' میں قیام کرنے لگے تھے۔ وہیں ایک شقی القلب نے ان کے کھانے میں زہر ملا دیا تھا۔ اس سے انتقال ہوا۔ یہ حادثہ ۱۲۷۰ھ کے اوائل میں ہوا۔ پہلے جنازہ ڈبائی میں اور پھر میت سہسوان لا کر وہاں جنازہ پڑھا گیا اور وہیں دفن کیے گئے۔　　　　دیکھیے: (تجلی سوم ص ۳۳۴_۳۱۸)

۴۴۔ محشر بدایونی۔

فاروق احمد بن حسین احمد۔ ادیب سہیل اور احمد حسین صدیقی نے ان کے والد کا نام حسنین احمد تحریر کیا ہے۔ جو درست نہیں۔ قلمی نام محشر بدایونی ہے۔ ۴ مئی ۱۹۲۲ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ اصل نام فاروق احمد اور ادبی نام محشر بدایونی ہے۔ ادیب سہیل اور بینا رت نے ان کی پیدائش ۱۹۲۲ء تحریر کی ہے۔ لیکن ان کی تصنیف 'شاعرنامہ' میں ان کی پیدائش ۱۹۲۶ء تحریر ہے۔ یہ کتاب ان کی زندگی ہی میں شائع ہوئی۔ اس لیے سال پیدائش ۱۹۲۶ء ہی درست قرار پاتا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں گورنمنٹ ہائی سکول بدایوں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد انھوں نے بدایوں میونسپل لائبریری میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک دہلی میں رہے۔ ۱۹۴۷ء میں لاہور آگئے اور ایک ماہ قیام کے بعد اکتوبر میں کراچی آگئے۔ محکمہ سپلائی اینڈ ڈویلپمنٹ کے محکمے سے وابستہ ہوگئے اور ۱۹۵۰ء تک اسی محکمے سے وابستہ رہے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۶ء تک ریڈیو پاکستان کے رسالہ 'آہنگ' کے نائب مدیر رہے۔ ۱۹۵۲ء میں اردو کالج میں داخلہ لیا اور پھر یہیں سے انٹر کیا۔ بچوں کے لیے نظمیں بھی لکھیں جو پندرہ سال سے زائد عرصہ تک ریڈیو پاکستان کے اسٹیشنوں پر نشر کی جاتی اور رسالوں میں چھپتی رہیں۔ ۱۹۸۲ء میں جب کہ ملازمت کو چار سال باقی تھے، ریٹائرمنٹ لے لی۔ شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۸ء میں کیا اور پہلی نظم 'سوچ رنگین' ۱۹۳۹ء میں ماہنامہ 'نیرنگ خیال' لاہور میں شائع ہوئی۔ پہلی مشہور نظم 'تاج محل' ماہنامہ 'مشہور' دہلی میں شائع ہوئی۔ مختار اجمیری نے 'آہ شمع خاموش محشر بدایونی' اور دقیق نعیم 'فاروق احمد محشر بدایونی' سے تاریخ وفات ۱۹۹۴ء نکالی۔ درج ذیل تصانیف ان سے یادگار ہیں۔

۱۔ تین باجے، (بچوں کے لیے نظمیں) مکتبہ خاتون پاکستان، کراچی، اگست ۱۹۶۱ء، ص ۱۱۲

۲۔ سائنس نامہ (بچوں کے لیے) مکتبہ اشاعت گھر، کراچی ۱۹۶۲ء

۳۔شاعر نامہ، (حالات شعرا کی منظوم سوانح) رو پیکا پبلی کیشنز، کراچی، اول دسمبر ۱۹۶۲ء ص ۱۲۹

۴۔شہر نو۔ (پہلا مجموعہ غزلیں) مکتبہ ماحول کراچی، اول فروری ۱۹۶۲ء ص ۱۴۴

۵۔غزل دریا (دوسرا مجموعہ) آدم جی انعام یافتہ ۱۹۷۸ء ۶۔گردش کوزہ (تیسرا مجموعہ) ۱۹۸۲ء

۷۔چراغ میرے ہم نوا (چوتھا مجموعہ غزل) ۱۹۸۹ء

۸۔فصل فردا (پانچواں مجموعہ غزل) ۱۹۹۱ء ۹۔حرف ثنا (نعتیہ مجموعہ کلام) ۱۹۸۶ء

۱۰۔جگ مگ تارے ۱۹۸۶ء

دیکھیے: ((۱) خان ۲۰۰۰ء ص ۵۳۵ (۲) تکیل، ص ۱۷۔۱۳ (۳) شاعر نامہ صفحۂ آخر (۴) صدیقی ۲۰۰۳ء ص ۳۹۳۔۳۹۴)

۷۵۔محی الدین بن عبد القادر بدایونی۔

اپنے والد سے تحصیل کی۔ مصنفات میں میر زاہد رسالہ پر حاشیہ ہے۔ ۱۲۷۰ھ میں وفات پائی۔

دیکھیے: (خان ۱۹۹۶ء ص ۲۸۴۔۲۸۵)

۷۶۔حافظ حکیم مجاہد الدین ذاکر بدایونی۔

حاجی حافظ حکیم مجاہد الدین بن مولوی مبارک الدین (شاعر) تلمیذ مصطفیٰ خان شیفتہ۔ ولادت مارچ ۱۸۳۶ء۔ وفات ۶ جنوری ۱۹۱۶ء۔ تصانیف

(۱) تنویر مجالس (۲) ذریعہ نجات دیکھیے: (خان ۲۰۰۰ء ص ۲۵۱)

۷۷۔نذر احمد افسوں۔

نذر احمد نام تخلص افسوں، کنیت ابو العلا سہسوانی بدایونی۔ تعلیم مدرسہ عالیہ رامپور میں شروع ہوئی اور علوم شرقیہ کی تکمیل مولانا سید عبد اللہ عرب بھوپالی سے کی۔ عربی، فارسی اور تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ شاہ مسعود کو قصیدہ بھیجا جس کے صلہ میں شاہ نے خلعت مرحمت فرمایا۔ کئی رسالے دینیات پر بھی لکھے۔ ان کے علاوہ

۱۔تحفۃ الانساب، (سہسوان کے اہل سادات کا نسب نامہ) مطبوعہ

۲۔لامات العرب (عربی کلام کا مجموعہ)

۳۔ریز بہار یہ مطبوعہ (بدایونی اول ص ۱۰)

۷۸۔سید محمد نذیر بن سید نوازش علی فاضل۔

۱۲۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ سید امیر حسن سہسوانی سے میرٹھ میں پڑھا اور کچھ مدت آگرہ اور دہلی میں بھی تعلیم حاصل کی۔ آگرہ میور کالج میں باضابطہ دستار بندی ہوئی۔ عربی ادب پر خاص دسترس تھی۔ انشا، فارسی اور عربی دونوں بے تکلف لکھتے تھے۔ سید امیر حسن سہسوانی کے رسالے ایراد ابن اثنا عشر کا جواب مولوی عبد الحق خیر آبادی نے لکھا۔ اس کا جواب آپ نے فارسی میں تحریر کیا اور آگرہ سے شائع کروایا۔ مسئلہ امکان و امتناع نظیر میں سید امیر احمد سہسوانی اور مولوی عبد القادر بن مولوی فضل رسول بدایونی کے مابین ایک تحریری مناظرہ ہوا تھا۔ اس

مناظرے کو آپ نے 'مناظرہ احمدیہ' کے نام سے شائع کروایا۔ ۳۲ سال کی عمر کی بیماری دیکھ کر باغِ دنیا سے رخصت ہوئے۔ دیکھیے: (نوشہروی ۱۹۳۸ء، ص ۲۳۲)

۷۹۔ مفتی نور احمد سسوانی۔

والد مفتی نظر محمد اور جد امجد کا نام مفتی ابو محمد تھا۔ مغل دور میں اس خاندان کے علما اپنے شہر سسوان کے مفتی تھے۔ یہ سلسلہ اخیر عہد مغلیہ تک جاری رہا۔ مفتی نور احمد بھی افتا کے عہدہ معالی پر متمکن تھے۔ اپنے وقت کے شیخ وعالم اور فقیہ تھے۔ ۱۱۸۰ھ کے لگ بھگ سسوان میں پیدا ہوئے۔ وہیں نشو ونما پائی۔ پھر حصولِ علم کے لیے مراد آباد، رام پور اور لکھنؤ کا سفر کیا اور وہاں کے علما سے تحصیل علم کیا۔ عبد العلی انصاری فرنگی محلی سے بھی استفادہ کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے والد مفتی نظر محمد کی جگہ سسوان کے مفتی مقرر ہوئے۔ فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ 'یوسف زلیخا' کی طرز پر فارسی میں 'گلشن عشق' مثنوی لکھی۔ زمانہ طالب علمی ہی سے حواشی وتعلیقات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور اس کے لیے درسیات کی مشکل ترین کتابوں کا انتخاب کیا۔ مثلاً قاضی مبارک کی 'شرح سلم' پر تعلیقات سپردِ قلم کیں۔ ملا محمود جون پوری کی 'شمس البازغہ' پر بھی حواشی و تعلیقات تحریر کیں۔ ۱۲۴۰ھ کے قریب سسوان میں انتقال ہوا۔ دیکھیے: (بجنی سوم ص ۲۹۷۔ ۲۹۶)

۸۰۔ سید محمد نذیر سسوانی۔

ا۔ اعلام الاحبار والاعلام ان الدین　　　　(نوشہروی ۱۳۹۱ھ، ص ۲۶)

۸۱۔ سید ابو العلا ناظر احمد سسوانی۔

ا۔ کشف النقاب عن وجہ المشابہ الحجاب　　　　(نوشہروی ۱۳۹۱ھ، ص ۲۷)

۸۲۔ مفتی نور احمد بن نظر محمد سسوانی۔

سسوان مولد ومنشا تھا۔ تحصیل علم کے لیے مراد آباد، رامپور اور لکھنؤ کا سفر کیا اور معاصر علما سے خصوصاً بحر العلوم سے درسیات کی تکمیل کی اور سسوان کی خدمت افتا سپرد ہوئی۔ قاضی مبارک کی 'شرح مسلم' اور 'شمس بازغہ' پر حواشی لکھے۔ ۱۲۴۰ھ میں انتقال ہوا۔ (خاں ۱۹۹۶ء، ص ۴۸۶)

۸۳۔ وہاب الدین خاں عاجز۔

وہاب الدین خاں عاجز خلف عبد الغنی خاں، ساکن قصبہ گنگرالہ ضلع بدایوں۔ گنگرالہ میں ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ اردو سکول میں تعلیم پائی۔ مراد آباد سے نارمل سکول کا امتحان پاس کیا۔ یہیں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد محکمہ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ ترقی کر کے ہیڈ ماسٹر مڈل سکول ہوئے۔ پھر سب ڈپٹی انسپکٹر سکول ہوئے۔ جولائی ۱۹۷۷ء میں گنگرالہ میں انتقال ہوا۔ ۹۲ سال کی عمر پائی۔ مختلف کتابوں کے مصنف تھے۔ جن میں دو کے نام ملتے ہیں۔

ا۔ تقدیم البیان　　　۲۔ تقدیم الحساب۔　　　　دیکھیے: (بدایونی دوم ص ۹۳)

۸۴۔ محمد یعقوب بخش راغب قادری بدایونی۔

مولوی محمد یعقوب بخش، بیرہ مولوی علی بخش خاں شرر بدایونی ۱۲ ربیع الاول ۱۳۰۵ھ میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ۱۳ سال کی عمر

میں والد کا انتقال ہوگیا تو چچا حامد بخش حامدؔ نے تعلیم پر توجہ دی۔ درس نظامی کے اسباق مولانا رفاقت اللہ اور مولانا فضل احمد بدایونی سے پڑھے۔ چند سبق حمد کا عبدالمقتدر بدایونی سے بھی پڑھے۔ حدیث میں سلسلۂ تلمذ مولانا سید یونس علی (متوفی ۱۳۵۹ھ) بدایونی کے شاگرد رشید نذیر حسین دہلوی کے واسطے سے خاندان ولی اللّٰہی تک اور معقولات میں مولانا محب احمد بدایونی (متوفی ۱۳۳۵ھ) کی شاگردی حاصل کی۔ بیعت مولانا عبدالقادر بدایونی سے کی۔ حنفی مسلک سے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات میں مقرر ہو کر علی گڑھ منتقل ہوگئے۔ اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اردو شاعری میں شیخ احمد علی شوق لکھنوی اور جلال لکھنوی کے شاگرد رہے۔ عربی میں قصیدے لکھے جو زیور طبع سے آراستہ ہوئے۔ محقق طوسی اور دوسرے مسلمان علمائے ہیئت کے قدیم رسالوں کو، جو ان کے کتاب خانے میں تھے، تصحیح کر کے 'الانجم الطوالع' کے نام سے شائع کیا۔ سر شاہ سلیمان کے ایما سے علامہ بیرونی کی قانون مسعودی کے کچھ اجزا کا ترجمہ کیا۔ ۱۴ فروری ۱۹۴۷ء کو علی گڑھ میں تقریباً ۶۰ برس کی عمر میں وفات پائی۔ جنازہ علی گڑھ سے بدایوں لے جایا گیا اور وہاں درگاہ قادریہ میں سپرد خاک ہوئے۔

۱۔ الانجم الطوالع، قطار بن لوقا کے عربی رسالہ (قلمی) کا اردو میں ترجمہ مع حواشی

۲۔ گلستان سعدی کی شرح مع مقدمہ

۳۔ ارکان دینیہ

۴۔ بہار بوستان (انتخاب بوستان مع مقدمہ)

۵۔ القصیدۃ الکوکبیہ فی المناقب العلویہ

۶۔ قصائد

۷۔ اسلامیہ وغیرہا

۸۔ اردو میں ایک دیوان بھی یادگار ہے۔

دیکھیے: (ندوی ۱۹۸۲ء ص ۳۶۸۔۳۶۹ (۲) بدایونی اول ص ۳۱۷۔۳۱۹)

حواشی

۱۔ شہید بدایونی نے ان کا نام احمد ارحسن تحریر کیا ہے۔ (بدایونی ص ۸)

۱۔ حیات شیخ شاہی، مطبع نظامی پریس بدایوں، ۱۹۳۰ء ص ۲۔ (یہ حضرت سلطان العارفین شیخ شاہی سید حسن رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی پر مشتمل کتاب ہے۔ اس کا تاریخی نام 'تذکرہ مبارک' ہے جس سے ۱۳۴۸ھ برآمد ہوتے ہیں۔)

مندرجہ ذیل کتب بھی ان سے یادگار ہیں۔

☆۔ اصطلاحات جغرافیہ، لطیفی پریس دہلی، ۱۹۲۶ء ص ۸۔ ۲۔ انجمن ترقی اردو کراچی، س۔ن۔ صفحات ۹۴

☆۔ فرہنگ اصطلاحات (طبعیات)، انجمن ترقی اردو کراچی، س۔ن (صدیقی، ۱۹۸۲ء ص ۱۳)

☆۔ فرہنگ اصطلاحات (ہیئت)، انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۳۹ء (ایضاً ص ۱۴۴)

☆۔ فرہنگ اصطلاحات (فلکیات)، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۴۸ء (ایضاً)

☆۔ فرہنگ اصطلاحات (کیمیا)، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۳۹ء (ایضاً)

☆۔ فرہنگ اصطلاحات (حیاتیات)، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۴۰ء (ایضاً ص ۳۲۵)

☆ ۔ایشیا ۔ عام ،مطبوعہ علی گڑھ ،اکتوبر ۱۹۲۹ء ص ۹۹ ۔اس کا ایک ایڈیشن نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۲۶ء میں بھی شائع ہوا ۔(اردو ، دوم ص ۲۹۳)

☆ ۔ مرقع افغان، نیشنل پرنٹنگ پریس کمپنی علی گڑھ ۱۹۵۳ء ص ۲۰۰

۲۔ تخلص نام و ولدیت مولوی محمد عبدالعلی صدیقی بن مولوی محمد اسرار علی صدیقی ۔ جون ۱۹۲۲ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ مذاق بدایونی کے ابن الصغیر ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی۔ اے کیا اور علی گڑھ میں شعر و سخن میں زور و شور سے حصہ لیا۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان آ گئے۔ اسلام آباد میں سرکاری ملازم رہے۔ ۱۹۷۶ء میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو گئے اور کراچی میں آ کر مقیم ہو گئے۔ یہاں ادبی اور ادارتی خدمات میں مصروفیت اختیار کر لی۔ (بدایونی اول ص ۲۷)

ا ۔ آئینہ دلدار (شاہ محمد دلدار علی مذاق بدایونی کے حالات) انجمن پریس، کراچی، ۱۹۵۲ء ص ۲۵۶

۳۔ تخلص نام و ولدیت مولوی محمد اسحاق قادری محب الرسول بن مولوی انوار الحق عثمانی ہے۔ ساکن محلہ مولوی ٹولہ بدایوں ۔ ۱۲۷۷ھ میں پیدا ہوئے۔ طب کی تعلیم حکیم سراج الحق سے حاصل کی۔ شاعری میں داغ دہلوی کے شاگرد رہے۔ چار دیوان بہاریہ کلام کے مرتب کیے تھے، جو شائع نہ ہو سکے۔ آخر میں نعت و منقبت کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ درگاہ قادریہ کے عرسوں میں مہمانوں کے قیام کا انتظام آپ ہی کے سپرد ہوتا تھا۔ آپ نے تذکیر و تانیث میں ایک رسالہ تالیف کیا تھا، جس میں تمام اساتذہ کے کلام سے سند لی گئی تھی۔ ایک رسالہ محاورات کے سلسلہ میں بھی اسی طرح مرتب کیا تھا۔ فن طب میں بھی چند مفید رسائل تحریر کیے تھے لیکن شائع نہ ہو سکے۔ ۲ شعبان ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۱ جولائی ۱۹۱۳ء کو وفات پائی۔ (بدایونی ۱۹۸۷ء، دوم ص ۹۱۷)

۵۔ ابوالحسن صدیقی ولد عزیز الدین عزیز وصادق، سرسید کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ ۱۲۶۸ھ میں پیدا ہوئے۔

۲۔ یہ کتاب شرح دیوان حافظ پر تنقید ہے۔

☆ شمس بدایونی نے مقدمہ دیوان حافظ کتاب کی نشاندہی بھی کی ہے۔ (بدایونی ص ۴۲)

۶۔ ان کا وطن بدایوں ہے لیکن ان کی پیدائش ۱۲/ ۱۵ فروری ۱۹۱۲ء میں آگرہ میں ہوئی۔ جلالت نے تاریخ ۱۵ جون تحریر کی ہے۔ ان کے والد مظفر علی شاعر تھے اور فرز تخلص کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم وکٹوریہ ہائی سکول آگرہ، مشن سکول بدایوں اور اسلامیہ ہائی سکول بدایوں میں ہوئی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں آنرز کی کلاسیں شروع ہوئیں تو پہلے بیچ میں داخلہ لیا۔ اردو میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پہلے پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ سے اعلیٰ تعلیمی اسناد حاصل کیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں استاد کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۹ء تک شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں رہے۔ پھر لسانیات کی تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔ وہاں سے واپس لاہور آئے اور ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی میں استاد رہے۔ ۱۹۵۲ء میں کراچی یونیورسٹی سے منسلک ہوئے اور ۱۹۷۶ء میں یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۰ء تک کولمبیا یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر اپنی خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۳ء تک ریسرچ سکالر شعبہ لسانی سٹڈیز امریکہ رہے۔ ان کی خدمات کے سلسلے میں انھیں پروفیسر آف ایمریطس بنا دیا گیا تھا۔ ۷ ستمبر ۱۹۹۲ء کو کراچی میں وفات پائی۔

۴۔ یہ ان کے پی ایچ ڈی کا مقالہ تھا۔ یہ مقالہ پہلی بار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔

۵۔ جرأت ان کا عہد اور شاعری، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۵۲ء، صفحات ۱۴۲

۶۔ مصحفی اور ان کا کلام، شیخ مبارک علی لاہور، س۔ن، صفحات ۲۴۰

درج ذیل تصانیف بھی ان سے یادگار ہیں۔ تصانیف

☆۔ جدید اردو ادبیات، مرتبہ (منتخب اردو نظم و نثر برائے بی اے/بی ایس سی سال دوم)، فیروز سنز کراچی ۱۹۷۱ء ص ۳۲۸

☆۔ آج کا اردو ادب، قمر کتاب گھر کراچی، ۱۹۸۲ء، دوم ص ۲۱۲، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے بھی شائع ہوئی۔

☆۔ تجربے اور روایت، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، اول ۱۹۵۹ء، صفحات ۲۱۵

☆۔ غزل اور متغزلین، اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۵۲ء، صفحات ۳۲۸

☆۔ نظیر اکبرآبادی اور ان کا عہد اور شاعری، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۵۷ء، صفحات ۲۴۰

☆۔ امتیاز علی تاج (نوآموز طالبوں کے لیے) مکتبہ جامعہ تعلیمی کراچی۔ ص ۳۲

☆۔ سر سید احمد خان، ایضاً

☆۔ اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ، مقتدرہ قومی زبان، کراچی، ۱۹۸۱ء، اول ص

☆۔ تذکرۂ حالی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، س۔ن، ص ۴۰

☆۔ اسباب بغاوت ہند از سر سید احمد خان، مرتبہ ابو اللیث صدیقی، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، اول ۱۹۵۷ء، ص ۲۰۸

☆۔ ادبی روایت اور بغاوت		☆۔ ادب و لسانیات		☆۔ تجربے اور روایات

☆۔ تنقید، تبصرہ، مراد جان ادا		☆۔ غزل اور متغزلین		☆۔ طبقات الشعرا

☆۔ میر حسن اور ان کا غیر مطبوعہ کلام		☆۔ اردو الفاظ کی سرگزشت		☆۔ لسانیات		☆۔ انیسویں صدی میں اردو

صراحت: (۱) خان، ۲۰۰۰ء ص ۱۳ (۲) ہمایوں، ۲۰۰۰ء، دوم ص ۳۵۹ (۳) صدیقی، ۲۰۰۳ء، ص ۱۸۔۱۴)

۱۰۔ ابر احسنی گنوری، گنور ضلع بدایوں میں ۳ مئی ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا انتقال ان کی کم سنی ہی میں ہو گیا تھا۔ تعلیم و تربیت والدہ محبوب النساء نے کی۔ ابتدائی تعلیم گنور ہی میں کسی مکتب میں ہوئی۔ پھر مڈل اسکول گنور سے ۱۹۱۲ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔ امتحان پاس کرنے کے بعد جوتا سازی سیکھنے کے شوق میں کانپور میں چلے گئے۔ گنور واپس آ کر اپنا جوتا بنانے کا کارخانہ شروع کیا، جو ایک سال بھی نہ چل سکا۔ کارخانہ بند کر کے اسٹرکٹ بورڈ کے مدرسہ میں مدرسی اختیار کر لی۔ پھر اپنے پیشے کے مدنظر ۱۹۲۳ء میں ٹریننگ، ۱۹۲۴ء میں ایڈوانس اردو، ۱۹۲۷ء میں منشی اور ۱۹۲۸ء میں کامل کا امتحان پاس کیا اور تا حیات پیشۂ معلمی سے وابستہ رہے۔

۱۹۱۵ء میں شعر کہنا شروع کیا۔ قیام کانپور کے دوران حضرت شاہجہان پوری کے شاگرد ہو گئے اور کلام پر اصلاح لی۔ کچھ عرصہ بعد احسن مارہروی سے اصلاح لینے لگے اور تا حیات ان کے سلسلۂ تلامذہ میں منسلک رہے۔ ایک زمانہ مسلسل ملازمت محکمہ تعلیم بدایوں میں قیام رہا۔ تقسیم ہندوستان کے بعد رام پور چلے گئے اور اورینٹل کالج مدرسہ عالیہ رام پور سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۵۳ء میں ریٹائر ہوئے۔ رام پور سے استاد

احسن مارہروی کی یاد میں ایک ماہنامہ 'احسن' جاری کیا۔ فن اصلاح پر 'اصلاح الاصلاح' نامی کتاب ۱۹۵۰ء میں شائع کی۔ ۱۹۵۲ء میں 'سفینے' کے نام سے اپنا مجموعہ کلام شائع کیا۔ نعتیہ دیوان اور دوسرا بہاریہ دیوان ترتیب دیا، جو شائع نہ ہو سکا۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد کافی تھی۔ آخری عمر میں لوگوں کا کہنا ہے کہ بھائی ہو گئے تھے۔ حکومت اتر پردیش کی طرف سے چھ سو روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ ۸۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۶۳ء کی درمیانی شب کو گھر میں آپ کو کسی نے قتل کر دیا۔ شاعری میں شاہ جہاں پوری اور احسن مارہروی کی شاگردی حاصل کی۔ مدفن خاندانی قبرستان 'گلستان جاوید' پشت پرانی سرائے، گنور۔

۱۔ سیماب اکبرآبادی کی کتاب 'دستور الاصلاح' کے جواب میں ۱۹۴۹ء میں تحریر کی۔

۲۔ جلد اول ۱۹۵۲ء میں اور جلد دوم ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی۔ اس میں اپنے تلامذہ کے کلام پر طریقہ اصلاح ہے۔

۳۔ بشارت فروغ نے اس کا سنہ ۱۹۵۲ء تحریر کیا ہے۔

۴۔ بشارت فروغ نے اس کا موضوع کلام نعت و حمد تحریر کیا ہے اور سال ۱۹۲۸ء لکھا ہے۔

۸۔ بشارت فروغ نے ان تصانیف کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ☆ قرینے (مجموعہ نظمیں و غزلیں ۱۹۶۱ء)

☆ قرینے (کلام غزلیات ۱۹۶۳ء)   دیکھیے: (خان ۲۰۰۰ء ص ۹۔ رام ۱۹۹۱ء ص ۱۳)

۳۔ شان حبیب الرحمن من آیات القرآن، اسلامک بک، کراچی، ۱۴۲۵ھ، ص ۱۵۶

۴۔ ایضاً تذکرۃ المقربین سوانحات بدایوں، عاقل، فروری ۱۹۶۹ء (رام ۱۹۹۱ء ص ۲۲)

۵۔ مولوی ارشد علی خلف مولوی اشرف علی تمیں، ساکن محلہ قاضی ٹولہ بدایوں۔ ۱۲۲۲ھ میں پیدا ہوئے۔ میر خورشید علی نفیس لکھنوی اور منیر شکوہ کے شاگردوں میں تھے۔ مذہباً شیعہ تھے۔ شاہجہان پور میں وکالت کرتے تھے۔ علم عروض کے ماہر تھے۔ ۲ فروری ۱۸۹۱ء میں فوت ہوئے۔ مسجد المومنین قاضی ٹولہ بدایوں میں دفن کیے گئے۔

۱۔ دیوان۔ قلمی مملوکہ شیخ سلمان احمد   دیکھیے: (بدایوں ی دوم ص ۴۳۔۴۴)

۶۔ مولوی اشرف علی تمیں ولد مولوی نجف علی منتظر، ساکن محلہ قاضی ٹولہ بدایوں۔ ایک ذی علم اور ذی وقار خاندان میں ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے اساتذہ میں مولانا فیض احمد رسوا بدایونی اور مولانا فضل حق خیرآبادی کے نام شامل ہیں۔ اپنے وقت کے قادر الکلام شاعر اور مصنف تھے۔ مؤلف 'تاریخ ہی حمید' نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ "تصانیف کثیرہ عربی و فارسی و اردو ہیں" فن شعر میں نواب ظہور اللہ خاں نوا بدایونی سے تلمذ تھا۔ فروغ نے فضل رسول حسرت کو بھی استاد لکھا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور ریاست رام پور میں تحصیل دار کے عہدے پر فائز رہے۔ نواب رام پور نے آپ کو 'اشرف العلماء' اور 'فضل العلماء' کے خطابات سے نوازا۔ خان بہادر خاں کی تحریک پر، پرگنہ اسلام نگر تحصیل اسولی کے نائب تحصیلدار ہو گئے۔ ۲۷ اپریل کو گرفتار اور اسولی کی فیصلہ کن جنگوں کے بعد انگریزوں سے بغاوت کے جرم میں ۲۰ ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق ۳ جون ۱۸۵۸ء کو پھانسی کا نشانہ بنائے گئے۔ حسرت بدایونی نے تاریخ کہی۔

۔ تاریخ وفات حسرت گفتا   بدا شرف شاعران دنیا (۱۲۷۴ھ)

۲۔ انتخاب دیوان ریختی نام ہے۔ جس سے ۱۲۴۳ھ برآمد ہوتے ہیں۔ یہ تذکرہ ۱۲۲۷ء۔ ۱۸۲۶ء میں شروع ہو کر ۲۹۔۱۸۲۸ء میں مکمل ہوا۔

شہید بدایونی نے ان کی ایک کتاب کا نام "مجاہد آزادی" بھی تحریر کیا ہے۔

دیکھیے: (۱) خان، ۲۰۰۰ء، ص ۱۷ (۲) بدایونی ۱۹۸۱ء، ص ۱۱۳ (۳) بدایونی ۲۰۰۲ء، ص ۸۲، ۱۹۲، ۱۹۷ (۴) بدایونی دوم ص ۳۰۲-۳۰۰)

۱۷۔ چودھری اصغر علی خان بن چودھری افضل حسن خان رئیس بگھرہ بزرگ بدایوں۔ شہید بدایونی نے پورا نام چودھری محمد اصغر علی تحریر کیا ہے۔ ولادت ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں بدایوں میں ہوئی۔ آپ مصطفیٰ خان یک رنگ کے پوتے تھے۔ آپ کے بزرگ شاہی زمانے میں سرفراز اور دربار میں ممتاز رہے۔ آپ کا شمار رؤسائے شہر میں ہوتا تھا۔ ضلع بدایوں میں ۱۲ گاؤں ان کے خاندان کی زمینداری میں شامل تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ غزنی سے سلطان محمود کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ علوم دینیہ کی تحصیل کے ساتھ ساتھ علما و فضلا کی صحبت سے مستفید بھی رہے۔ ایک مدت تک آنریری مجسٹریٹ رہے۔ غالب کے دوستوں میں سے تھے اور انہی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ شاداب تخلص تھا۔ آپ کا انتقال ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں لکھنؤ میں ہوا۔ جنازہ لکھنؤ سے بدایوں لایا گیا اور اپنی کوٹھی کے سامنے ایک مسجد تعمیر کرائی تھی اس میں دفن کیے گئے۔

دیکھیے: (۱) خان، ۲۰۰۰ء، ص ۳۸۱ (۲) بدایونی دوم ص ۳۴۳-۳۴۲)

۱۸۔ شہید بدایونی نے اسے مطبوعہ بتلایا ہے اور سال اشاعت ۱۹۰۱ء تحریر کیا ہے۔

۲۴۔ میر افضل علی ضو ابن بابا علی، متوطن بدایوں۔ شہید نے والد کا نام بابا علی تحریر کیا ہے جو درست نہیں۔ نواب ظہور اللہ خاں نواؔ آپ کے اساتذہ میں سے تھے۔ شاگرد رسید اسمٰعیل حسین منیر، مرزا اوج اور محمد ارشد علی ضیا۔ اکار حکیم نے تصنیف کے وقت عمر تقریباً ۴۰ برس کی لکھی ہے۔ ڈاکٹر توصیف تبسم نے وفات ۲ ستمبر ۱۹۳۰ء مطابق ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۴۹ھ تحریر کی ہے۔ انگریزی اور فارسی میں اچھی لیاقت رکھتے تھے۔ وہ ایک ریاستوں سے وظیفہ ملتا تھا۔ کئی برس تک بدایوں سے 'سعید الاخبار' و 'بدایوں گزٹ' نکالتے رہے۔ 'گلدستہ بدایوں' بھی جاری کیا کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر دہلی کو چھوڑ کر لکھنؤ میں قیام کیا۔ وہاں سے ایک پرچہ 'نیر روزہ' کے نام سے جاری کیا۔ بدقسمتی سے وہ بھی نہیں چلا۔ انشا کی قابلیت اچھی تھی۔ کبھی کسی ادارے کے مجبور رہے کبھی کسی کارخانے کے مہتمم اور کبھی انگریزی کے فیصلہ جات کے تراجم کرتے رہے۔ افضل علی ضو مطبع افضل المطابع کے مالک تھے۔ یہ مطبع محلہ بگھرہ بزرگ میں تھا۔ اس کے مہتمم محمد مظفر مہتمم شیخ الدین اور کاتب محمد حسن تھے۔ اس کا اجرا ۱۸۷۸ء میں ہوا۔

تفصیل کے لیے دیکھیے: (۱) حکیم ص ۲۲۹ (۲) منیر ص ۴۲-۴۴ (۳) لکھنوی ص ۵۷ (۴) ارم مجم ص ۲۷۹ (۵) تبسم، ص ۳۰۱ (۶) بدایونی دوم ص ۳۵-۳۶ (۷) خان، ۱۹۹۰ء، ص ۵۷)

۳۔ درالموازنہ (شبلی کی موازنہ انیس و دبیر کا جواب) مطبع تصویر عالم لکھنؤ، ۱۳۲۰ھ تالیف ۱۳۲۵ھ ص ۷۲

۲۵۔ مفتی سید اقتدار حسین بن مولوی سید آل محمد شاہ (شاعر مارہرہ) ۱۸۸۹ء/۱۳۰۶ھ سہسوان میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام منظور علی ہے۔ سید اعجاز احمد معجز کے شاگرد تھے۔ سید نظر احمد معجز کے چھوٹے بھائی ہیں اور سہسوان ضلع بدایوں کے سادات کرام سے ہیں۔ ۱۳۰۶ھ میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام منظور علی ہے۔ مولوی حکیم سید محمود عالم سہسوانی، سید ذوالفقار احمد، مفتی عبداللہ ٹونکی اور ڈاکٹر نذیر احمد سے علوم معقول و منقول پڑھے۔ عرصہ دراز تک دہلی، لکھنؤ اور رام پور وغیرہ میں مقیم رہے اور اکتساب علم کرتے رہے۔ علم حدیث، فقہ، منطق اور ادب میں مہارت حاصل تھی۔

عروض و قوافی اور معانی و بیان میں کافی دستگاہ تھی۔ بعض کتابیں (اپنی نذیر احمد سے بھی پڑھیں۔ مسلم یونیورسٹی اسکول علی گڑھ میں مدرس فارسی تھے۔ انجمن اہل حدیث علی گڑھ کے صدر بھی تھے۔ شاعر بھی تھے۔ شاعری میں اپنے بھائی سید اعجاز احمد سے اصلاح لیتے تھے۔ تاریخ گوئی سے بھی خاص شغف تھا۔ ابو یحییٰ امام خان نوشہروی کی تصنیف تراجم علمائے حدیث ہند کا تاریخی نام بھی آپ کا تجویز کردہ ہے۔ کتب خانہ حمیدیہ ریاست بھوپال میں ملازم رہے۔ ضعیفی میں وطن واپس آگئے تھے۔ کراچی میں ۹۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ تصانیف۔

ا۔ علم تاریخ (تلخیص تسہیل مصنفہ انور حسین تسلیم کا اردو ترجمہ) مطبع مطلع العلوم مراد آباد، دسمبر ۱۹۱۲ء ص ۱۱۸

اس کے علاوہ یہ کتاب بھی ان سے یادگار ہے۔

☆۔ نگارنہ سحر　　☆۔ ازالۃ الحجر وفی صرف ابی ہریرۃ (رسالہ)

تفصیل کے لیے دیکھیے: (ا) راہم چہارم ص ۱۲ (۲) بدایوانی اول ص ۳۰۹-۳۱۰ (۳) خان، ۲۰۰۰ء ص ۲۹۳)

۲۶۔ ساکن سوتھہ بدایوں۔ ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ بدایوں کے مشہور خاندان بو حمید کے فرد تھے۔ مدرسہ قادریہ سے علوم مروجہ کی تعلیم مکمل کی۔ زندگی کی بسر اوقات گرانی جائیداد پر تھی۔ آخری وقت میں نابینا ہو گئے تھے۔ مرنے سے ایک سال قبل گردن میں بڑا سخت کاربنکل نکل آیا تھا۔ اسی مرض میں ۱۹ شعبان ۱۳۴۳ھ مطابق ۲۱ اگست ۱۹۲۴ء میں بروز جمعرات ۴ بجے انتقال ہوا۔ درگاہ قادری مجیدی میں دفن ہوئے۔ ابتدا میں کچھ غزلیں عبدالمقتدر نقشبند قادری کو دکھائیں پھر عبدالرحمن راسخ دہلوی سے مشورہ سخن کیا۔ (بدایوانی دوم ص ۱۸۵_۱۸۷)

۲۷۔ بدایوں کے باشندے اور مشاہیر وقت میں سے تھے۔ محشر نے اپنے والد محترم اور دیگر بزرگ افراد خاندان سے علوم مروجہ دینیہ حاصل کیے۔ بچپن ہی سے بزرگ صاحب دل حضرات اور اہل نظر کی صحبتوں سے فیضیاب ہوتے رہے۔ ۱۳۲۰ھ میں انتقال فرمایا۔ خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔ آپ کی تصانیف ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں تلف ہو گئیں۔ بیشتر کلام بھی تلف ہو گیا۔ تجربہ ۱۹۲۵ء کراچی میں دستیاب ہے۔ (ا) بدایوانی دوم ص ۲۰۲_۲۰۵)

ا۔ شہید بدایونی نے اس کا سنہ ۱۳۰۲ھ تحریر کیا ہے اور اسے غیر مطبوعہ لکھا ہے۔

۲۸۔ اکرام عالم نے مسلم لیگ کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ وکیل تھے۔ انھوں نے ملا عبدالقادر بدایونی کے مختصر حالات بھی لکھے تھے جو شائع نہ ہو سکے۔ (قادری ۱۹۸۲ء ص ۱۸۸)

۲۹۔ پیر شرف علی حیدری کی فارسی تصنیف تاریخ غنی حمید کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ۱۳۳۳ھ میں شائع ہوئی۔

۳۰۔ آل احمد اوج سبزواری بن حکیم مولوی محمد یٰسین شوق سبزواری بن مفتی شرف علی سبزواری (ف ۱۹۱۱ء) ۱۸ ستمبر ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ اوج کے والد نے مفتی شرف علی کے مسودات کی تصحیح و تخریج کر کے بصورت کتاب محفوظ کیا اور بعض نسخوں کی نقالی بھی کیں۔ اس طرح والد اور دادا کا ذخیرہ اولاً اوج کے بڑے بھائی سید احمد فوق سبزواری (ف ۱۹۵۳ء) اور ان کے بعد اوج کی دسترس میں آگیا۔ اوج ۱۹۴۸ء کے آس پاس ہجرت کر کے پاکستان آگئے تھے اور یہیں ۲۲ ستمبر ۱۹۹۲ء میں فوت ہوئے۔

دیکھیے: بدایوانی ۲۰۰۰ء ص ۱۹۷)

۳۱۔ ۱۵ رمضان ۱۳۲۹ھ مطابق ۹ ستمبر ۱۹۱۱ دوسری روایت کے مطابق اگست ۱۹۱۱ء اور تیسری روایت کے مطابق ۷ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ محلہ سوتھہ بدایوں کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام کرم احمد تھا۔ مکتب کی تعلیم بدایوں ہی میں حاصل کی۔ قرآن شریف اور عربی فارسی کی تعلیم بھی یہیں حاصل کی۔ والد کی ملازمت ڈاکخانے کے محکمہ میں تھی اس لیے ان کے تبادلے کے باعث تعلیم کا سلسلہ بھی مختلف مقامات پر رہا۔ میٹرک وکٹوریہ ہائی سکول غازی پور سے ۱۹۲۸ء میں، ایف ایس سی سینٹ جانس کالج آگرہ سے ۱۹۳۰ء میں، بی ایس سی اسی کالج سے ۱۹۳۲ء میں، ایم اے انگریزی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۳۴ء اور ایم اے اردو اسی یونیورسٹی سے ۱۹۳۶ء میں کیا۔ عمر کا بیشتر حصہ شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور لکھنؤ یونیورسٹی میں بطور مدرس گزارا۔ پرنسپل رضا انٹرمیڈیٹ کالج رامپور میں ۱۹۴۶ء میں رہے۔ ۱۹۴۶ء میں ریڈر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی اور ۱۹۵۵ء میں سید حسین ریڈر چیئر پروفیسر شعبہ اردو علی گڑھ یونیورسٹی مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں وزیٹنگ پروفیسر شکاگو یونیورسٹی امریکہ متعین ہوئے۔ (اکتوبر تا مارچ ۱۹۷۰ء) ۱۹۷۷ء میں کشمیر یونیورسٹی میں اقبال چیئر پر تقرر ہوا۔ ۱۹۹۰ء میں شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر ایمریطس مقرر ہوئے۔ فروری ۲۰۰۲ء دہلی میں انتقال ہوا۔ تدفین علی گڑھ میں ہوئی۔

۱۔ نئے اور پرانے چراغ، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۴۶ء ص ۲۰۸، ۱۹۵۵ء، حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی اول ۱۹۴۶ء ص ۳۰۸

۲۔ تنقید کیا ہے اور دوسرے مضامین، کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی، اول ۱۹۴۷ء ص ۱۹۷

مندرجہ ذیل تصانیف بھی ان سے یادگار ہیں۔

شعری مجموعے

☆۔ خواب اور خلش، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، ۱۹۹۱ء ص ۱۲۸

☆۔ ذوقِ جنوں، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۵ء ص ۱۵

☆۔ سلسبیل، انجمن اردوئے معلی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۳۵ء ص ۱۲

☆۔ لفظ ۲۰۰۱ء

تنقیدی مجموعے

☆۔ تنقیدی اشارے، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۴۲ء ناشر مصنف بذریعہ نگار بک ایجنسی لکھنؤ ۱۹۳۹ء دوم ص ۲۳۲

☆۔ تنقید کیا ہے۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی طبع چہارم ۱۹۵۹ء

☆۔ ادب اور نظریہ، سرفراز پریس لکھنؤ، ۱۹۵۴ء ص ۲۹۲

☆۔ نظر اور نظریے، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، اگست ۱۹۷۳ء اول ص ۲۷۱

☆۔ مسرت سے بصیرت تک، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۷۴ء ص ۲۹۵

☆۔ عرفانِ اقبال، مرتبہ زہرہ معین، نگارشات لاہور طبع اول ۱۹۷۷ء ص ۲۷۲، دوم ۱۹۸۳ء

☆۔ اقبال اور ان کا فلسفہ، مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۷۷ء

☆۔ اقبال نظریہ اور شاعری، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی ۱۹۷۸ء ص ۹۲

☆۔ انتخاب پروفیسر آل احمد سرور، مرتبہ فقیر احمد، فیصل اکیڈمی لاہور ۱۹۷۳ء

☆۔سرسید ایک تعارف، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۷۳ء

☆۔عرفان اقبال (سرور صاحب کے مضامین) مرتبہ مضامین، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۷۷ء

☆۔اقبال کی معنویت، ۱۹۸۵ء

☆۔مجموعہ تنقیدات سرور، مرتبہ عاصمہ وقار، الوقار پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۲ء ص ۱۰۱۲

☆۔کچھ خطبے کچھ مقالے، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۲ء ص ۲۲۹

☆۔دانشور اقبال، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۴ء ص ۲۸۵

☆۔فکر روشن، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۵ء ص ۲۴۰

☆۔پہچان اور پرکھ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، ۱۹۹۰ء

☆۔اردو تحریک، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۹ء ص ۲۵۲

☆۔افکار کے دیے، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۰۰ء

☆ مجموعہ تنقیدات، مرتبہ عاصمہ وقار، الوقار پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۳ء ص ۱۰۱۲

مرتبہ کتابیں۔

☆۔مقالات یوم اقبال، رضا انٹر کالج رامپور، ۱۹۴۵ء

☆۔عرفان غالب، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۷۱ء، ۱۹۷۳ء ص ۲۹۹

☆۔عکس غالب، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۳ء ص ۳۰۴

☆۔انتخاب مضامین سرسید، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۰ء ص ۱۳۸

☆۔ہمارا ادب (ہائی سکولوں کی جماعتوں کے لیے نثر کا انتخاب)، پبلشر رام پرشاد اینڈ سنز آگرہ، ۱۹۴۲ء ص ۳۲۸

☆۔تنقید کے بنیادی مسائل، شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۷ء ص ۱۷۲

☆۔جدیدیت اور ادب، شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۹ء ص ۲۸۸

☆۔اردو فکشن، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۷۳ء ص ۲۷۲

☆۔اقبال اور تصوف، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، ۱۹۸۰ء ص ۲۵۵

☆۔اقبال اور مغرب، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، ۱۹۸۱ء ص ۲۴۳

☆۔تشخص کی تلاش اور اقبال، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، ۱۹۸۲ء

☆۔جدیدیت اور اقبال، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، ۱۹۸۰ء ص ۲۵۵

☆۔اقبال اور اردو نظم، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، ۱۹۸۲ء ص ۱۳

☆۔ہندوستان میں تصوف، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء ص ۱۰۱

☆۔اردو شعریات، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء ص ۲۸۰

☆۔جدید دنیا میں اسلام، مسائل اور امکانات، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء

☆۔خطوط عبد الحق بنام آل احمد سرور، ۱۹۹۸ء

☆۔رشید احمد صدیقی کے خطوط، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۲ء ص ۳۳۳

☆۔Islamic Resurgence modernityand Iqbal ,qbal institute srinagar , page

☆۔Islam in the modern world : problems and prospects , Iqbal institute srinagar , page 231.

☆۔Literature: The Question and the Answer, New Delhi, Sahitya Akademi, 2991 u page 43

☆۔Modernity and Iqbal,New Delhi, Sahitya Akademi,1985 page 88

خطبات

☆۔مجیب صاحب اور ہندوستانی مسلمان، مجیب میموریل لیکچر ۱۹۸۹ء

☆۔ہندوستان کدھر؟ غلام السیدین میموریل لیکچر ۱۹۸۳ء

☆۔اردو اور ہندوستانی تہذیب، فخر الدین علی احمد میموریل لیکچر ۱۹۸۶ء

☆۔اردو میں دانشوری کی روایت، سید عابد حسین میموریل لیکچر ۱۹۸۱ء

☆۔اقبال، فیض اور ہم، فیض میموریل لیکچر، اردو مرکز لندن ۱۹۸۸ء

☆۔اقبال کے مطالعے کے تناظرات، اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر، کشمیر یونیورسٹی ۱۹۷۸ء

☆۔ہماری تعلیمی صورت حال، شیخ عبداللہ میموریل لیکچر ۱۹۸۲ء

آپ بیتی۔

☆۔حروف سرور، مرتبہ زبیر احسن، طبع اول ۱۹۸۱ء

☆۔خواب باقی ہیں، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۱ء ص ۳۲۵

دیگر کتابیں۔

☆۔ہم رسٹ کی داستان اور ناٹکبریت، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، ۱۹۳۲ء

ان کے علاوہ کئی مضامین مختلف کتابوں اور رسائل میں شائع ہوئے۔

تفصیل: (۱) خازن ص ۹۲ ۔ ۱۸۸ (۲) معین الرحمٰن مشمولہ ۵ (۳) سرور، آخری صفحہ (۴) [illegible] اول ص ۲۱ (۵) انصاری ص ۳۲ ۔ ۱

۴۳۔　　ا۔ شہید بدایونی نے سال ولادت ۱۸۹۷ء تحریر کیا ہے۔ (اول ص ۸)

۳۸۔ زمانۂ طفولیت میں ہی اپنے والد کے ہمراہ دہلی اور میرٹھ پڑھتے رہے۔ حضرت میاں صاحب سے بھی اجازت اور سند حاصل کی۔ والد نے میرٹھ سے قطع تعلق کیا تو دہلی، ٹونک، آگرہ، بریلی، بدایوں اور لکھنؤ میں بسلسلۂ تعلیم قیام رہا۔ مدرسہ عربی میں صدر المدرسین رہے۔ مناظر تھے۔ علما سے مناظرے کیے۔ تلامذہ میں مولوی محمد اسحاق خاں بریلوی، مولوی عبدالکریم پنجابی، مولوی حشمت اللہ، اور مسٹر ا... قابل ذکر ہیں۔ مرض اسہال میں وفات پائی۔

۲۔ تقلیل الطیل فی الذب عن الشیخ اسمٰعیل۔ (مولانا فضل حق کی تصنیف کے رد میں)

۳۔ زوال الجہل فی حکم الصلوٰۃ علی الجہل۔ (مفتی سعد اللہ رام پوری کے فتوے کے جواب میں لکھی مگر مکمل نہ ہو سکی)

دیکھیے: (۱) نزہۃ الخواطر، ۱۹۲۸ء ص ۲۴۲-۲۴۵ (۲) نزہۃ الخواطر ۱۳۹۱ھ ص ۸۲)

۳۹۔ اسمار التجلی حمید (اردو) مطبوعہ مطبع الاقبال پریس بدایوں ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۷ء

۴۰۔ مولوی انصار حسین خلف مولوی نذیر حسین وکیل عدالت دیوانی، بدایوں ساکن محلہ سوتھا بدایوں۔ ۲۵ مئی ۱۸۵۷ء بروز عیدالفطر پیدا ہوئے۔ ان کے والد بدایوں کی عدالت دیوانی میں اہلکار تھے۔ مولانا بدایوں کی عدالت دیوانی میں تقریباً چالیس سال تک وکالت کے پیشہ سے وابستہ رہے۔ بدایوں کے رؤسا میں شمار ہوتا تھا۔ پہلے وحشت بدایونی اور پھر حالی سے مشورہ سخن کیا۔ شاگردوں میں نظر بدایونی، حسین جام نوائی بدایونی مشہور ہیں۔ حضرت نصیر الدین خلف اصغر حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی کے مرید تھے۔ ۲ جولائی ۱۹۲۵ء میں بدایوں میں ۷۰ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ (بدایونی، اول ص ۲۷۰-۲۷۱)

۴۱۔ منشی انوار حسین خلف منشی احتشام حسین ساکن سوتھا بدایوں۔ جون ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ شہید بدایونی نے ولادت ۱۲ رجب ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۵ء تحریر کی ہے۔ ان کے والد مراد آباد میں وکالت کے پیشہ سے وابستہ تھے اس سے قبل وہ عہدہ منصفی پر بھی فائز رہ چکے تھے۔ تسلیم نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ بعد میں مختلف اساتذہ سے فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں آپ کا عقد آپ کے عم حقیقی قیام الدین مرحوم کی صاحبزادی سے ہو گیا۔ چچا نے مراد آباد پہنچ کر عدالت دیوانی میں امین کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ ۱۸۸۵ء میں آپ کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا تو واپس دہلی آ گئے۔ ۱۸۷۲-۷۳ء میں لکھنؤ پہنچے اور اودھ اخبار سے وابستہ ہو گئے۔ یہ تعلق مارچ ۱۸۷۹ء تک رہا۔ یہی ملازمت ادبی شہرت کا باعث بنی۔ جنوری ۱۸۸۱ء میں پھر مراد آباد پہنچ کر اخبار نیر اعظم سے وابستہ ہو گئے۔ جامع الحیثیات مصنف تھے۔ بیشتر رائج الوقت اصناف ادب پر فارسی اور اردو زبان میں استادانہ دسترس رکھتے تھے۔ پہلے انور اور پھر بعد میں تسلیم تخلص کرنے لگے۔ نظم میں غزل اور مثنوی اور نثر میں تقریظ، انشائیہ، افسانہ، تذکرہ نویسی، مضمون نگاری، لغت اور صحافت ان کی دلچسپی کے وہ خاص موضوعات تھے جن پر ساٹھ سال سے زیادہ عرصے تک لکھتے رہے۔ مولوی منشی نول کشور سے وابستہ رہے۔ ۲ شوال ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۰ مئی ۱۸۹۳ء میں وفات پائی۔

۲۔ سعدین (مثنوی) مطبع منشی نول کشور لکھنؤ، جنوری ۱۸۷۱ء / ذی قعدہ ۱۲۸۷ھ ص

۳۔ منہاج المدارج (صنائع بدائع اور چند انشائیوں پر مشتمل فارسی نثر)

ان کے علاوہ درج ذیل تصانیف بھی ان سے یادگار ہیں۔

☆۔ خالد بھائی کی عرائی، مطبع منشی نول کشور کانپور ۱۸۸۸ء میں۔۔ یہ مثنوی سعدین کے ساتھ بھی شائع ہوئی۔

☆ شہید بدایونی نے نشاندہی کی ہے کہ آپ نے شعرا کا ایک تذکرہ بھی مرتب کیا تھا۔

تفصیل کے لیے دیکھیے: (۱) قادری ۲۰۰۷ء، ص ۳ (۲) بدایونی، اول، ص ۲۰۳۔۲۰۱)

۴۸۔ مولانا انوار الحق خلف مولانا ظہور احمد ۱۲۷۶ھ میں پیدا ہوئے۔ مظہر محمدی تاریخی نام رکھا گیا۔ درسیات کی تکمیل اپنے پھوپھی زاد بھائی مولانا نذیر احمد صاحب سے کی۔ شرف بیعت حضرت سیف اللہ المسلول سے حاصل تھا۔ درس و تدریس سے وابستہ تھے۔ شاعر بھی تھے۔ نعت اور منقبت کہا کرتے تھے اور اپنے زمانے کے رسالے مثلاً 'ماہ وابان' اور 'ذوق معرفت' وغیرہ میں شائع ہوا تھا۔ ۱۵ جمادی الاول ۱۳۰۲ھ میں وفات پائی۔ (۱) رام دوم، ص ۱۷ (۲) بدایونی، اول، ص ۱۳۳)

۱۔ طوالع الانوار (اپنے پیر سیف اللہ المسلول کی سوانح) ۱۲۸۹ھ مطبوعہ

۴۹۔ بشارت فروغ نے ولادت الہام حسین تحریر کی ہے جو درست معلوم نہیں ہوتی۔ پیدائش ۱۸۷۲ء بدایوں۔ ساکن محلہ مولوی ٹولہ، بدایوں۔ ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی کے جید عالم تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ لالہ کے ماموں مولوی انصار حسین زلالی بدایونی معاصی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ لالہ چھ سات سال ریاست گوالیار کے محکمہ پولیس میں ملازم رہے۔ پھر استعفیٰ دے کر گھر آ گئے اور عمر عزیز شعر کے گیسو سنوارنے میں گزار دی۔ بعض قدردانوں نے بدایوں سے باہر بلانا چاہا لیکن وطن سے قدم باہر نہ رکھا۔ مختصر سی خاندانی جائیداد پر قناعت کی۔ شاعر بھی تھے۔ شاعری میں ذکی بدایونی شاگرد غالب کے شاگردوں میں سے تھے۔ بیشتر کلام ضائع ہو گیا۔ بہت سا کلام لوگوں نے اپنے نام سے شائع کروا لیا۔ صوفی خاندان اور شاعر گھرانے سے تعلق تھا۔ تلامذہ کی کثیر تعداد تھی۔ ۱۹۳۲ء میں بدایوں میں انتقال ہوا۔

۱۔ انجاب (نثر) الامان برقی پریس، ۱۳۵۰ھ ۱۹۳۲ء صفحات ۲۸

درج ذیل تصانیف کا بھی پتہ چلتا ہے۔

۱۔ پارہ ہائے جگر (مرثیہ) ادبی پریس، نوشی روڈ لکھنؤ۔ ۱۲ صفحات

۲۔ نظم ونعت (شاعری) الامان برقی پریس، دہلی ۱۹۳۳ء۔ ۲۸ صفحات

۳۔ سوز گداز (سلام مخمسات) نظامی پریس بدایوں، ۱۹۲۰ء۔ ۳۲ صفحات

۴۔ قصیدہ نعت شریف مع مخمس، نسیم پریس بدایوں، ۱۹۲۰ء۔ ۸ صفحات

ان کے علاوہ ☆ 'غنچہ نوبہار'، ☆ 'دعوت فاطمہ' اور ☆ 'تحرانہ قریب' کے نام بھی ملتے ہیں۔ دیکھیے: (۱) خان ۲۰۰۰ء، ص ۱۷۳ (۲) خان ۲۰۰۰ء، ص ۱۷۳ (۳) بدایونی اول، ص ۲۰۹۔۲۰۲ (۴) بدایونی، ۱۹۸۱ء، ص ۱۱۵۔۱۰۲ (۵) زبیری، ص ۱۳۴)

۵۰۔ ساکن محلہ سوتھہ بدایوں۔ ان کے دادا باب الدین سوختہ (ف ۱۲۳۵ھ ۱۸۲۰ء) اپنے دور کے ممتاز شاعر تھے۔ باقر کے تلامذہ میں ان کے برادر خورد جلال الدین حسن مصنف 'شبیہ احمدی یعنی سراپائے رسول اکرم ﷺ' (التجانی ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۶ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شاعر بھی تھے۔ فارسی اور اردو میں شعر بھی کہتے تھے۔ عبد العزیز محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ باقر تخلص تھا۔ ان کا انتقال ۱۲۶۹ھ (۵۳۔۱۸۵۲ء) میں ہوا۔ شہید بدایونی نے وفات ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۵ء تحریر کی ہے۔ بدایوں میں اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔

۵۹۔ الحاج عبدالرزاق بن مولوی فضل الرزاق (شاعر) تلمیذ عطا بدایونی۔ ولادت ستمبر ۱۸۹۸ء وفات ۱۵ جون ۱۹۷۳ء (خان ۲۰۰۰ء ص ۲۲۹)

۶۰۔ ڈاکٹر ظفر اقبال نے ان کا پورا نام مع ولدیت حافظ محمد حمید الدین بن مولوی محمد سعید الدین دانشمندی فاروقی ابوالبرکاتی الحسینی بدایونی تحریر کیا ہے۔

ا۔ مطبع وکٹوریہ پریس بدایوں ۱۳۳۲ھ صفحات ۲۰ (قاموس الکتب حصہ دوم ص ۳۰۴)۔ اس رسالے کا قلمی نسخہ کتاب گھر کراچی میں موجود ہے۔ یہ رسالہ مصنف نے مولوی محمد حکمت اللہ دانشمندی فاروقی محمدی فضل رحمانی بدایونی کی فرمائش پر تحریر کیا۔ اس میں عبدالرحمانی کی مجلس دانشمندی کی مختصر سوانح و بدایوں کے شیخ صدیقی خاندان کے نسب نامے وغیرہ بیان کیے گئے ہیں۔ (اقبال ص ۲۰۱۔۲۰۳)

۶۳۔ ا۔ شہید بدایونی نے ۱۹۱۲ء مطبوعہ بتایا ہے۔ (ص ۸)

۶۴۔ مولانا شاہ محمد دلدار علی ولد شیخ حافظ نثار علی صدیقی ولد مولوی غلام قطب الدین۔ شیخ حمید الدین کنبوری کی اولاد میں سے تھے۔ ۱۲ ربیع الاول مطابق ۱۸۱۹ء کو محلہ قاضی ٹولہ بدایوں میں پیدا ہوئے۔ آٹھ سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ ابتدا میں ماما سید عبدالعلی نقوی سے عربی و فارسی اور خوش نویسی کی تعلیم حاصل کی پھر رام پور جا کر ملا محمد غفران آخوند فقیہ و محدث سے شرح وقایہ تک پڑھی۔ دہلی اور لکھنؤ کے علما سے استفادہ کیا۔ شاعری میں ذوق کی شاگردی اختیار کی۔ مذاق نے تخلص ترک کرتے وقت یہ قطعہ فی البدیہہ کہا تھا۔

کیا کہوں عرض اشتیاق اپنا　　　　شعر کہنا غرض ہے شاق اپنا
ذوق تھا پہلے سے تخلص کا　　　　کر تخلص کیا مذاق اپنا

ماما کے علاوہ شاہ نصیر الدین حیدری اور سید شاہ فضل غوث ساقی بریلوی سے خلافت لی۔ سلسلہ چشتیہ نظامیہ میں بیعت شاہ جی عبدالرحیم شاہ جہان پوری سے کی۔ رئیس جاورہ نواب محمد اسمٰعیل خان آپ کے مرید ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۱ اکتوبر ۱۸۹۴ء کو محلہ قاضی ٹولہ میں بروز چہارشنبہ مغرب کے وقت بعارضہ فالج ہوا۔ مزار باغ سید عبدالعلی میں ہے۔ ابتدا میں اشرف علی تمنّا سے اصلاح لیتے تھے اور عیار تخلص کرتے تھے۔ انتقال سے ۳۰ سال قبل عاشقانہ شعر کہنا چھوڑ دیے تھے۔ صرف نعت و منقبت لکھا کرتے تھے۔ دیوان مرتب کرنے کی طرف توجہ نہ دی۔ زمانہ شباب کا عاشقانہ کلام ضائع ہوگیا۔ انتقال کے بعد بعض شاگردوں نے آپ کے کلام کا ایک مجموعہ مرتب کیا جس میں ہر قسم کا کلام تھا۔ کتاب کلام دلدار علی مذاق کے نام سے بدایوں سے شائع ہوئی۔

بشارت نے دو اور تصانیف کی نشاندہی کی ہے۔

☆ مناقب چشتیہ نظامیہ　　　　☆ مخمسات مذاق (قلمی مخزونہ رضا لائبریری رام پور)

تفصیل کے لیے دیکھیے: (۱) مسعود ص ۱۳۲ (۲) بدایونی، دوم ص ۲۲۲۔۲۲۳ (۳) خان ۲۰۰۰ء ص ۲۵۵ (۴) کامل ص ۲۵۰۔۲۴۷ (۵) اشرفی ص ۲۲۳۔۲۱۹)

۶۵۔ پیدائش ۲۲ دسمبر ۱۸۲۰ء بدایوں وفات ۱۹۰۲ء بدایوں۔ فارسی اور اردو میں اچھی دستگاہ تھی۔ شاعری میں اپنے والد کے شاگرد رہے۔ محکمہ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ ایک طویل عرصہ تک بدایوں میں تعینات رہے۔ علم عروض میں بھی اچھی دسترس رکھتے تھے۔ شمس بدایونی نے تصانیف کی تعداد ۳۳ اور بشارت فروغ نے ۴۳ تحریر کی ہے۔

ا۔ خلاصۃ المنطق۔ اردو میں علم منطق کے حوالے سے ۱۲ صفحات کی یہ کتاب ۱۸۶۵ء میں لکھی گئی اور ۱۸۷۲ء میں مطبع منشی نول کشور سے شائع

ہوئی۔(بدایونی،۱۹۸۱ء،ص ۷)

۲۔معیار البلاغت۔۱۸۷۲ء میں تحریر ہوئی۔ پہلا ایڈیشن ۱۸۸۵ء میں منشی نول کشور سے شائع ہوا۔ ۱۹۳۳ء میں اردو فاضل قابلیت کے نصاب میں شامل تھی۔(بدایونی،۱۹۸۱ء،ص ۷)

۳۔معیار الاغلاط۔ قواعد الاملا و رسم الخط پر یہ اہم کتاب ہے۔ تقریباً ہزار غلط مستعمل الفاظ کی صحت بھی کی گئی ہے۔(بدایونی،۱۹۸۱ء،ص ۷) 'معیار الاغلاط' کا ایک ایڈیشن مطبع نظامی کانپور سے ۱۲۸۲ھ میں شائع ہوا۔ صفحات ۱۴۔

۵۔ارژنگ چین۔ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ ۱۸۸۴ء صفحات ۴۲۔

۶۔نظم پروین۔ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۸۰ء صفحات ۲۵۰۔ ایک اور ایڈیشن ۱۹۰۱ء صفحات ۲۵۶ پر مشتمل شائع ہوا۔

بشارت فروغ نے درج ذیل کتابوں کی فہرست بھی دی ہے۔ ☆۔بوحلا پاسہ　　☆۔بروج احسن

☆۔تعلیم الاطفال　　☆۔تلخیص الحساب　　☆۔تماثیل ہندی　　☆۔ترجمہ سحر

☆۔جغرافیہ ضلع بدایوں　　☆۔افسون سحر　　☆۔حل رسالہ معمائے جامی منظوم ☆۔خمسہ متحیرہ

☆۔دیوان قیصر　　☆۔دلائل الشائقین　　☆۔ذخائر جبر و مقابلہ　　☆۔رسالہ قافیہ

☆۔سحر سامری　　☆۔سراج المنیر　　☆۔سفینۂ سحر ☆۔غواص الحساب ☆۔قصائد سحر مطبوعہ ۱۸۸۸ء

☆۔کلیات سحر　　☆۔گلدستۂ ادب　　☆۔لغات سحر　　☆۔لطائف ہندی

☆۔موجز التاریخ

دیکھیے:(۱) رام چہارم ص ۱۱۹۔۱۱۸ (۲) بدایونی اول ص ۳۰۵،۳۰۴ (۳) بدایونی ۱۹۸۱ء ص ۳۰۳۔۳۰۲)

۴۶۔ ذکاءاللہ صدیقی ابن ضیاءاللہ ساکن موضع ڈالی گاؤں ضلع بدایوں۔ ۲۵ اپریل ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ مروجہ علم اردو، ہندی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ شاعری بھی کی۔ امیر احسنی گنوری کی شاگردی اختیار کی۔ چار ماہ کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ عزیزوں کی بے رخی کا سامنا ہو گیا۔ نواب ویل ڈویژن میں ایک معزز عہدہ پر فائز تھے۔ علم نجوم پر آپ کی دو کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ (۱) کارآمد رمل (۲) علوم نجوم اور انسانی زندگی (بدایونی اول ص ۳۸۷)

۴۷۔ منشی رام سہائے تسلیم قوم کائستھ سکسینہ شاگرد مرزا حاتم علی بیگ مہر۔ آپ کے دو دیوان 'غنچہ مہر' اور 'نقش و آرزو' طبع ہوئے۔ آپ نے عالم ضعیفی انتقال کیا۔ دیوان 'غنچہ مہر' ۱۳۰۳ھ میں بدایوں سے شائع ہوا۔ ایک مدت تک علی گڑھ میں (ڈپٹی کلکٹر) رہے۔ نگارندہ جاوید جلد دوم میں ان کے تذکرے کی شمولیت کے وقت ان کی عمر ۷۵ سال تھی۔ دیکھیے:(۱) رام دوم ص ۸۱ (۲) بدایونی اول ص ۲۰۲)

۴۸۔ رضی احمد صدیقی خلف مولوی رفیع احمد عالی وکیل بدایوں۔ یہ اور پروفیسر ضیا احمد ضیا اور آفتاب احمد جوہر بدایونی ساکن محلہ مولوی ٹولہ بدایوں۔ ۱۲ ستمبر ۱۸۷۸ء مطابق ۱۲۹۸ھ بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں محکمہ پولیس میں سب انسپکٹر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ قیام شاہجہاں پور کے دوران شاعری کا شوق ہوا۔ ۲۸ سال ملازمت کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔ ۶۱ سال کی عمر میں ۲۸ جون ۱۹۳۹ء میں بدایوں میں انتقال ہوا۔ شاعری میں کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔ پہلے کچھ روز قمر، بعد ازاں رضی تخلص اختیار کیا۔(۱) رام چہارم ص

۲۔یادگارِ رضائی بدایوں

خمخانۂ حیرت (دوسرا دیوان) ۱۹۱۴ء میں مرتب ہوا لیکن انقلاباتِ زندگی کے نتیجے میں ضائع ہو گیا۔

بشارت غلام، ضوابطِ عروض تصانیف کی بھی نشاندہی کی ہے۔ (۱) خان ۲۰۰۰ء ص ۲۳ (۲) بدایونی اول ص ۲۰۲)

۷۴۔ سبطین احمد بن رضا احمد ساکن محلہ سوتھہ بدایوں، شعبہ تدریس سے وابستہ تھے۔ اپنی زندگی کے چالیس سال اسلامیہ سکول یا اسلامیہ انٹر کالج میں گزارے۔ ۲۵ اگست ۱۹۷۱ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔

۱۔خس و خاشاک (نعت، منقبت، سہرے اور متفرق کلام) نظامی پریس بدایوں، جون ۱۹۵۹ء ص ۱۷

درج ذیل تصانیف آپ سے یادگار ہیں۔

☆اردو قواعد		☆انگلستان کی کہانی معاصرین کی زبانی		☆خس و خاشاک

☆ہندوستانی تہذیب میں اسلام کا حصہ		☆سیرت النبی جلد دوم کا اردو ترجمہ

دیکھیے: (۱) خان ۲۰۰۰ء ص ۳۰ (۲) بدایونی اول ۹۵۔۳۹۴)

۷۵۔ سخاوت حسین کے نام کے تین افراد ملتے ہیں۔ (۱) منشی سخاوت حسین بدایونی شاگرد رعنا بدایونی (۲) سخاوت حسین ابن نواب حسین ساکن غنیم پور بدایونی۔ ۱۹۲۹ء میں غنیم پور میں پیدا ہوئے۔ شاد جیلانی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ اسلامی درسگاہ میں مدرسی کی خدمات انجام دیتے تھے۔ (۳) خان بہادر سخاوت حسین ابن عنایت حسین بدایونی۔ تخلص مدہوش۔ مدہوش کے بزرگ شاہ التمش کے دورِ حکومت میں بدایوں آئے۔ مدہوش بدایونی کی عمر کا بڑا حصہ شاہجہاں پور میں گزرا۔ وہ وکیل عدالت دیوانی بھی تھے۔ انھوں نے شاہجہاں پور کی عوامی زندگی میں بڑا نام پایا۔ آپ وہاں کے آنریری مجسٹریٹ بھی رہے اور میونسپلٹی کے وائس چیئرمین بھی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تحریک میں سر سید احمد خان کے زبردست حامی تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے پہلے اجلاس میں شریک بھی ہوئے اور کانگریس کے ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ شاید یہی سخاوت حسین مراد ہوں گے۔ تصانیف

☆رسالہ تعلیم مسلمانان

☆رقعاتِ مدہوش		دیکھیے: (بدایونی اول ص ۲۰۴، دوم ص ۲۱۹۔۲۱۸)

۷۶۔ منشی محمد سخاوت حسین خلف شیخ امان اللہ، ساکن محلہ شہباز پور بدایوں۔ ۲۸ رمضان ۱۳۳۶ھ میں بدایوں میں انتقال ہوا۔

☆نغمۂ تکبیر (مناجات) وکٹوریہ پریس، بدایوں، س۔ن، ص ۱۲

۷۷۔ سدید الدین احمد عباسی شائق بن مولوی صبیح الدین احمد عباسی ساکن محلہ چاہ میر بدایوں ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۴۰ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ افضل علی خان افضل کے شاگرد تھے۔ وکالت کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔ وکالت کی سند ضبط ہو جانے کے بعد مختلف قانون کی کتابیں لکھیں۔ ۱۸۹۳ء میں اخبار 'آفتاب عالم' جاری کیا جو تھوڑے دن تک چل سکا۔ ۱۷ رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۷ ستمبر ۱۹۰۵ء کو ۶۸ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ☆ "نظم رعنا" بھی ان کی کتاب ہے۔

دیکھیے: (۱) رام بابو ص ۴۵۹ (۲) زیدی ص ۲۰۲۔۲۰۱ (۳) بدایونی اول ص ۲۴۳ (۴) خان ۲۰۰۰ء ص ۲۳۷)

۷۸۔ پورا نام سید سراج احمد حسینی نقوی اور والد کا نام آل احمد حسینی سہسوانی ہے۔ اکثر کتب والد ماجد سے پڑھیں۔ علوم کی تکمیل خالو نور احمد بدایونی سے حاصل کی۔ بیعت شاہ فضل رسول بدایونی سے کی۔ اس کے علاوہ مفتی شرف الدین رام پوری، مولانا تراب علی لکھنوی، مولانا مفتی محمد اسماعیل مرادآبادی لندنی، مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی، شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی سے بھی استفادہ کیا۔ مولانا فضل رسول بدایونی نے 'تقویۃ الایمان' کے رد میں 'احقاق الحق' لکھی تو ایک نشست میں اس کا جواب 'سراج الایمان' کے نام سے کتاب کی صورت میں لکھا اور لکھنؤ سے شائع کرایا۔ ۱۹ شوال ۱۲۷۹ھ میں ۴۸۔۴۷ سال کی عمر پا کر سہسوان میں وفات پائی اور اپنے جد امجد اور والد گرامی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ (۱) علی ص ۷۵ (۲) بجلی ص ۲۸۱۔۲۸۲)

۱۔ سراج الایمان (احقاق الحق کا رد) مطبع بیت السلطنت لکھنؤ (بدایونی ص ۳۰۷)

۷۹۔ سراج الحق بن فیض احمد عثمانی بدایونی۔ ۲ رمضان ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام 'ظہار الحق' ہے۔ علوم عقلیہ و نقلیہ اپنے والد اور اپنے ماموں نور احمد بدایونی (متوفی ۱۳۰۲ھ) سے حاصل کیے۔ مشہور فضلا میں تھے۔ طب میں کمال خصوصی تھا۔ اکثر رؤسائے دان پور اور رام پور کی ملازمت میں رہے۔ ۲۸ ذی قعدہ ۱۳۳۳ھ میں ۷۰ برس کی عمر میں دان پور میں انتقال ہوا۔ شہید بدایونی نے تاریخ '۲۸ ذی القعدہ تحریر' کی ہے۔ فارسی، عربی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ صاحب تصنیف تھے۔ تصنیفات میں حکمت طبعیہ میں سراج الحکمہ، میزان منطق کی شرح اور ابوحفص عمر بن محمد نسفی متوفی ۵۳۷ھ کی عقائد کی شرح عقائد از شرف الدین اسماعیل بن ابراہیم گیلانی پر حاشیہ ہے۔ شرح بہاء الدین عاملی مطبوعہ ہے۔ عربی نظم میں اپنے والد کے مثل تھے۔ صاحب درس تھے۔ آپ کے شاگردوں میں مطیع احمد نقوی قنائی بدایونی، مولانا عاشق حسین بدایونی، مولوی باقر علی بدایونی، مولوی میر نذیر علی بدایونی، مولوی تفضل حسین کوٹ ڈپٹی کلکٹر، مولوی محمد حسین سوہاروی، حکیم محمد حسین سہسوانی، سید داؤد حسین، حکیم قصور علی اکبرآبادی، مولوی مقبول حسین مشہور مفسر مذہب امامیہ، مولوی محمد حسین بناری، مولوی جمال الدین بخاری اور سید عبداللہ کابلی وغیرہ مشہور ہیں۔

دیکھیے: (۱) خان ۱۹۹۲ء ص ۲۹۵ (۲) قادری ۱۹۷۶ء ص ۵۲۔۵۵۹ (۳) علی ص ۷۱۔۷۲ (۴) بدایونی اول ص ۳۰۷)

۸۰۔ ۱۔ رسالہ در بحث امکان نظیر خاتم النبیین، مطبع احتشامیہ مرادآباد، س ن صفحات ۲۴

۲۔ سیف اللہ المسلول علی اعداء جناب الرسول، مطبع شوکت الاسلام حیدرآباد ۱۳۰۲ھ صفحات ۲۰

۳۔ لب اللباب العطاء، مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۰ھ صفحات ۵۲　(صدیقی ۱۹۹۳ء ص ۱۲۶)

۸۱۔ بدایوں کے مشہور عثمانی خاندان کے نامور عالم تھے۔ اپنے زمانے کے بدایوں کے علما سے تحصیل علوم کی۔ اساتذہ میں مولوی عبدالمجید قادری (ف ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ فقہ فرائض میں تبحر کامل رکھتے تھے۔ انھوں نے بدایوں میں شاہ اسماعیل اور شاہ اسحاق دہلوی کے افکار و خیالات کی اشاعت کی۔ ۱۲۸۳ھ میں انتقال ہوا۔

۱۔ سعادت دارین، تالیف ۱۲۵۰ھ (۳۵۔۱۸۳۴ء) مطبع صدیقی بریلی ۱۲۹۰ھ

۲۔ بقاء المسلمین فی شرح مسائل اربعین (شاہ محمد اسحاق دہلوی کے رسالہ 'مسائل اربعین' کا اردو ترجمہ وحواشی و شرح) تالیف ۱۲۷۰ھ ذی الحج ۱۲۵۷ھ مطبوعہ مطبع جریر بند دہلی، جنوری ۱۸۴۱ء ۱۳۰۸ھ (اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ ص ۳۸۸)

۸۲۔ سعید احمد صدیقی خلف پروفیسر ظفر احمد صدیقی، ساکن محلہ شیخ پٹی، بدایوں۔ ۱۳۵۵ھ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کا زمانہ علی گڑھ میں گزرا۔ ۱۹۵۸ء میں نفسیات میں ایم۔ اے کیا اور کئی سال علی گڑھ یونیورسٹی سے منسلک رہے۔ ڈائرکٹوریٹ آف ایجوکیشن میں کونسلر بھی رہے۔ نقاشی، مصوری، مجسمہ سازی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ شاعر بھی تھے سعید تخلص کرتے تھے۔

۱۔ ہم کیوں بھولتے ہیں۔ مطبوعہ　　　　۲۔ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی، مطبوعہ

۳۔ لڑکے کہانی سنو، مطبوعہ　(بدایونی اول ص ۴۲)

۸۳۔ چودھری محمد سعید الدین حسین عرف میاں جان ابن چودھری تفضل حسین رئیس اعظم گھیرہ بزرگ، بدایوں۔

ولادت ۲ جولائی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ شہید بدایونی نے ۱۲۷۴ھ تاریخ پیدائش تحریر کی ہے۔ والد کا آپ کی کم سنی میں انتقال ہو گیا تو ایک مدت تک ان کی زمینداری کا علاقہ کورٹ آف وارڈز کے سپرد رہا۔ سیاحت کا بہت شوق تھا چنانچہ ملک کے اکثر بڑے بڑے شہروں کی سیاحت کی۔ فن زراعت سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ آپ نے ضلع بدایوں میں زرعی نمائش کی بنیاد ڈالی اور اس کے فروغ میں بڑی دلچسپی لی۔ تذکرہ والد داراں میں سعید کو مذاق کا شاگرد لکھا ہے۔ لیکن انھوں نے اپنی خود نوشت میں اپنے آپ کو اپنے عم محترم چودھری اصغر علی خاں آبا کا شاگرد لکھا ہے۔ خاں آبا کے حج بیت اللہ کو چلے جانے کے بعد مولوی ارشد علی ضیا بدایونی سے مشورہ سخن کرنے لگے تھے۔ پچاس سال کی عمر میں ۲۱ جون ۱۹۰۷ء میں انتقال ہوا۔ شاعر بھی تھے۔ بدایوں کے جاگیرداروں میں اہم اور ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ علمی و ادبی سرپرستیوں کے علاوہ انھوں نے بعض علمی کام بھی کیے۔ مطبع نظام المطابع قائم کیا۔ اخبار جاری کیے۔ درج ذیل کتب بھی ان سے یادگار ہیں۔ ☆ کرامت اولیائے حق بدایوں ۱۸۸۵ء ☆ گلدستہ سعید (اخبار) ☆ مسدس سعید مطبوعہ ۱۸۹۱ء ☆ ہدیہ سعید بدایوں ۱۸۸۵ء سعید الاخبار (ہفتہ وار) اجرا جنوری ۱۸۹۵ء دیکھیے: (ا) خان: ۲۰۰۰ء ص ۲۱۲ (۲) بدایونی ج ۲، ۲۰۰۰ء ص ۱۹۹)

۸۵۔ ساکن محلہ چاہ میر، بدایوں۔ یکم اگست ۱۹۲۳ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ حکومت پاکستان محکمہ تعمیرات عامہ شعبہ طباعت کراچی سے وابستہ تھے۔ شاعری بھی کی۔ سعید تخلص کرتے تھے۔ (بدایونی اول ص ۲۱۲)

۸۶۔ بدایوں کے مشہور عثمانی خاندان میں ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۸۹ء محلہ سوتھہ بدایوں میں پیدا ہوئے۔ وفات ۳ رجب ۱۲۸۱ھ۔ ابتدا میں مولانا ابوالمعالی بدایونی سے پڑھا۔ مولوی ولی اللہ، مولانا نا ... جونپوری، مولوی عبدالغنی عثمانی، سید محمد الدین شاہ جہاں پوری عرف مدن، عبدالمجید قادری بدایونی سے بھی استفادہ کیا۔ احادیث و تفسیر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور شاہ رفیع الدین سے پڑھی۔ تصوف و طریقت کا درس سید آل احمد عرف اچھے میاں مارہروی سے لیا۔ ان کے مرید و خلیفہ بھی تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، کلام اور تصوف وغیرہ تمام علوم پر ماہرانہ نظر تھی۔ کم و بیش پچاس کتابیں تصنیف کیں۔ عشقی تخلص کرتے تھے۔ گھریلو جھگڑے کی وجہ سے کانپور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں ۷۸ برس کی عمر میں ۳ رجب ۱۲۸۱ھ مطابق ۲ دسمبر ۱۸۶۴ء کانپور میں بروز شنبہ انتقال ہوا اور اندرون احاطہ مسجد ... (محلہ ... گھر) کانپور میں مدفون ہوئے۔ یوم ہفتم سوم از ماہ رجب شد زجہاں مادہ تاریخ وفات ہے۔ شاعری میں قتیل کے شاگرد تھے۔ عشقی تخلص کرتے تھے۔

۱۔ یہ کتاب اہل سنت کی تائید و رشیعہ کی تردید میں ہے۔

۴۔ یہ حضرت امام حسین کی شہادت کے بارے میں ہے۔

۸۔ یہ خدا کی رحمت، نول کشور پریس کانپور ۱۸۸۲ء۔ میلاد سے متعلق ہے۔

۱۱۔ اس میں عربی، فارسی اقوال و اشعار کو صوفیا کے طریقے پر حل کیا گیا ہے۔

۱۴۔ یہ رسالہ حافظ کی شعری اصطلاحات پر کیے گئے اعتراضات کے جواب میں ہے۔

۱۸۔ اس کا پورا نام رسالہ الوان در بیان جواز و عدم جواز الوان ہے۔

تفصیل کے لیے دیکھیے: (۱) علی ص ۸۰۔ ۷۹ (۲) بجلی، اول ص ۲۹۳۔ ۲۹۱ (۳) قادری ۱۹۸۸ ص ۲۰۳۔ ۲۰۲ (۴) کامل، ص ۲۷۸۔ ۲۲۲ (۵) اشرفی، ص ۳۳۵۔ ۳۳۳ (۶) بدایونی، دوم ص ۱۷۵۔ ۱۷۲)

۸۷۔ شیخوپور ضلع بدایوں ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ صابر دت نے پیدائش دہلی تحریر کی ہے۔ جو کہ درست نہیں لگتی۔ بچپن دہلی میں گزرا۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم وہیں پائی۔ انٹرنس کا امتحان اینگلو عربک اسکول دہلی سے پاس کیا۔ ۱۹۱۲ء میں تحصیلداری سے ملازمت کی ابتدا کی۔ ترقی کرتے ہوئے ڈپٹی کلکٹر کے منصب تک پہنچے۔ ۱۹۴۲ء میں پنشن پائی اور علی گڑھ میں سکونت اختیار کی۔ وہیں ۱۸ مئی ۱۹۵۲ء میں وفات پائی۔ شاعری کا ذوق اور ادب سے دلچسپی بچپن ہی سے تھی۔ زمانہ طالب علمی ہی میں وہ اپنا ایک ناول لکھ کر شائع کر چکے تھے۔ ان کی ابتدائی تحریریں رسالہ مخزن میں شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ 'تمدن' اور مولانا شوکت علی کے 'اخبار ہمدرد' میں بھی ان کے بہت سے افسانے اور مضامین شائع ہوئے۔

ادب فرید (یادِ شیخوپور۔ نواب محتشم خاں فرید کی سوانح عمری) مطبع نظامی پریس بدایوں ۱۹۱۷ء ص ۲۱۷

اس کے علاوہ درج ذیل تصانیف بھی ان سے یادگار ہیں۔

☆ ساحر مسلم (ناول) نظامی پریس بدایوں ۱۹۱۵ء طبع اول، نقیب پریس بدایوں ۱۹۴۳ء طبع دوم

☆۔ نقش و نگار (افسانوں کا مجموعہ)　☆۔ فسانہ جوش (منتخب افسانوں کا مجموعہ)　☆۔ فکر جوش (مضامین کا مجموعہ)

☆۔ میری ڈائری　☆۔ مساوات　☆۔ انقلاب زمانہ

دیکھیے: (۱) خاوران، ص ۲۰۱۔ ۲۰۲ (۲) حسین، ص ۱۷۲ (۴) خان ۲۰۰۰ء ص ۱۹۲ (۵) صابر دت، ص ۲۱۹)

۸۸۔ مولوی سلیم اللہ ولد حبیب اللہ۔ ولادت ۱۸۵۹ء۔ شاعر بھی تھے۔ تلمیذ دہشت بدایونی۔ فارسی میں اچھی استعداد تھی۔ مطب کے ذریعے بسر اوقات کرتے تھے۔ سلام اور رباعیات کہنے کا شوق تھا۔ ۱۹۲۳ء میں ۶۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔ "آب کوثر" بھی ان کی کتاب ہے۔

دیکھیے: (۱) رام بابو ص ۲۲۱ (۲) بدایونی اول ص ۲۲۵ (۳) خان ۲۰۰۰ء ص ۲۱۸)

۸۹۔ ظہور حق 'نادر' نام ہے۔ تحصیل علوم مولانا فضل امام خیرآبادی اور شاہ عبدالعزیز اور دیگر اساتذہ سے حاصل کی۔ بیعت اپنے چچا مولانا عبدالمجید سے ہوئے۔ کئی کتابوں کے مصنف اور محشی تھے۔ علم نحو کی بعض درسی کتابوں پر حواشی و تعلیقات سپرد قلم کیں۔ لغت کی مشہور کتاب 'قاموس' کا حاشیہ لکھا۔ عربی میں متعدد ایضاحات اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ محرم ۱۲۷۸ھ کو فوت ہوئے۔ تفصیل دیکھیے: (۱) علی ص ۸۱ (۲) بجلی، جلد اول ص ۲۹۵)

۹۲۔ ۱۹۲۲ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے اور ایل ایل بی کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم اے کیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر کچھ دن تک وکالت کرتے رہے۔ یہ پیشہ پسند نہ آیا تو وکالت چھوڑ کر سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان آ گئے۔ ابتدا کچھ روز ایک کالج میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۴۲ء سے ملک کے مشہور انگریزی روزنامہ 'ڈان' کی مجلس ادارت میں شامل رہے۔ شاعر بھی تھے۔ درج ذیل کتب بھی ان سے یادگار ہیں۔

☆مشرق وسطیٰ ☆ہارون رشید ☆امام شافعی ☆حضرت عثمان

☆اشتہار اور اس کا فن ((۱) رام بھجن ص ۱۷۵ (۲) بدایوں اول ص ۲۹۲)

۹۳۔ ساکن محلہ قاضی ٹولہ بدایوں۔ شیخ کفایت اللہ حیدری کے بھائی تھے۔ پیشہ کے اعتبار سے وکیل تھے۔ نواب ظہور اللہ نوا بدایونی کے شاگرد تھے۔ اپنے وقت کے شعرا میں مشہور تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور کی داستان 'فسانہ عجائب' کو مثنوی کی صورت میں نظم کیا تھا۔ آپ کا انتقال ۸۵ برس کی عمر میں ۱۷ جمادی الثانی ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۱ء میں بدایوں میں ہوا۔

اسیر بدایونی نے اس کا نام منظوم طلسم تحریر کیا ہے۔ یہ نعتوں اور منقبت کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ نایاب ہے۔ درج ذیل کتاب بھی ان سے یادگار ہے۔

☆خزانہ غیب (فسانہ عجائب کا منظوم ترجمہ)

۹۴۔ شیخ احمد والد مولوی کمال احمد صدیقی، ساکن محلہ قاضی ٹولہ بدایوں۔ شاعری میں امیر مینائی سے اصلاح لی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وکالت کے پیشہ سے منسلک ہو گئے۔ شہر کے کامیاب وکلا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تین دیوان مرتب کیے تھے۔ تینوں یکے بعد دیگرے چوری ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء میں تقریباً اسی (۸۰) برس کی عمر میں وفات پائی اور اپنے خاندانی قبرستان میں نزد قاضی حوض میں دفن ہوئے۔ (بدایوں، دوم ص ۲۰۱)

۹۵۔ نانا کا نام بھی یہی تھا۔ کریم اللہ کی بہن تھیں جو محلہ چوکی پولیس سوتھہ، بدایوں کے رہنے والے تھے۔ ۲ ربیع الاول کو ان کے یہاں ہمیشہ محفل میلاد منعقد ہوتی تھی۔ حج بیت اللہ سے مشرف بھی ہوئی تھیں۔ (بدایوں اول ص ۲۷۹)

۹۶۔ اصل نام شکیل احمد، جب کہ تاریخی نام غفار احمد ہے۔ ۳ اگست ۱۹۱۲ء مطابق ۳ شوال ۱۳۳۰ھ میں بدایوں میں بروز جمعرات پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا جمیل احمد قادری سوختہ بڑے پایہ کے عالم اور واعظ تھے۔ بمبئی میں خوجہ جماعت کی مسجد میں تقریباً ۳۰ سال خطیب کے عہدے پر فائز رہے اور وہیں ۳۰ جولائی ۱۹۳۹ء میں انتقال کیا۔ ابتدائی تعلیم منشی ہائی سکول بدایوں سے حاصل کی۔ ۱۹۲۸ء میں چوتھے درجے میں داخل ہوئے۔ دوران ملازمت بمبئی میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۲ء میں بدایوں ہی سے ہائی سکول پاس کیا۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۲ء تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں رہے۔ ۱۹۴۲ء میں علی گڑھ سے بی اے کیا۔ اسی سال جولائی میں گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمہ سپلائی میں ملازمت مل گئی۔ ترقی کر کے ایک سیکشن کے انچارج بن گئے۔ شاعری میں ضیا بدایونی اور جگر مرادآبادی کے شاگرد رہے۔

وفات ۲۰ اپریل ۱۹۷۰ء عارضہ کینسر و عارضہ قلب بمبئی میں ہوئی۔ تصانیف

۱۔ رعنائیاں کتب خانہ تاج آفس بمبئی، ۱۹۵۰ء بار دوم۔ مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۵۰ء صفحات ۲۰۸

درج ذیل تصانیف بھی ان سے یادگار ہیں۔

☆۔ انتخاب کلام عالی (مرتب شاہد علی خان) دہلی پبلشنگ ہاؤس، س۔ن

☆۔ گلدستۂ عالی (انتخاب کلام عالی مرتبہ شفیق رضوی) بھوپال ۱۹۲۳ء

☆۔ عالی نظم نو، نگار، لاہور ۱۹۲۱ء

دیکھیے: (۱) بدایوں ۱۹۸۱ء ص ۲۱۹۔۲۱۷ (۲) اصحاب درست ص ۲۹۸ (۳) دستور ص ۲۹۱ (۴) بدایونی دوم ص ۹۴۔۹۲)

۹۸۔ سید شہید حسین عرف صوفی میاں خلف اکبر حاجی سید حسین اکبر۔ ۲۲ فروری ۱۹۱۶ء میں اپنے آبائی مکان حسین منزل بیرا سرائے بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اردو اور فارسی گھر پر ہوئی۔ انگریزی تعلیم کے لیے سکول میں داخلہ لیا۔ ۱۹۳۵ء ۱۹۳۴ء میں ہائی سکول کا امتحان پاس کیا۔ ساتویں یا آٹھویں جماعت میں تھے کہ شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ شاعری میں مولانا عبدالباری آسی الدنی (میرٹھ) کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۹۴۸ء میں بدایوں سے ہجرت کر کے کراچی آ گئے۔ کلام کا انتخاب ۱۹۷۸ء شام وسحر کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۹۷۸ء تذکرہ شعراے بدایوں مرتب کرنا شروع کیا۔ دو تین کتابوں پر کام جاری تھا۔ معلوم نہیں وہ تکمیل کو پہنچیں یا نہیں۔ (بدایونی اول ص ۲۹۵۔۲۹۳)

☆ تذکرہ شعراے بدایوں (دو جلد) ناشر مصنف، کراچی، ۱۹۸۷ء ص اول ۲۹۸ء ص دوم ص ۳۰۹

۱۰۰۔ محمد صابر حسین صدیقی بن محمد احتشام الدین صدیقی۔ (شاعر) تلمیذ مولوی ایوب علی خان گلشن آبادی اور علی بخش بیمار ۱۸۳۷ء میں ... ان میں پیدا ہوئے۔ ۲۲ فروری ۱۸۹۶ء میں وفات پائی۔ (۱) بہارستان ص ۴۷ (۲) قصیدہ نگاران ص ۲۲۱)

۱۰۱۔ ضیا احمد بدایونی ولد رفیع احمد عالی۔ ایوب قادری نے عالی تحریر کیا ہے جو درست معلوم نہیں ہوتا۔ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ پیشہ وکالت تھا۔ ۲ ربیع الاول ۱۳۱۴ھ مطابق ۲۱ ستمبر ۱۸۹۶ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ساکن محلہ قاضی ٹولہ بدایوں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد عربی کی تحصیل کے لیے مدرسہ شمس العلوم بدایوں میں داخل ہوئے۔ میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول بدایوں، انٹرمیڈیٹ اور گریجویشن بریلی کالج سے کیا۔ ۱۹۲۳ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور جلد ہی مسلم یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کالج میں استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں دہلی کالج کی ملازمت اختیار کی۔ تقریباً سال بعد مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لیکچرر کے عہدے پر تقرر ہوا۔ شعبہ فارسی میں بھی رہے۔ ۱۹۵۹ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے امیر خسرو پر تحقیقی کام کے لیے وظیفہ دیا۔ ۱۹۶۲ء میں انجمن ترقی اردو ہند میں اردو لغت کی تدوین وترتیب کے کام پر مامور ہوئے۔ اسی کام کے سلسلے میں ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۱ء تک دہلی یونیورسٹی میں رہے۔ شعر وسخن کا بھی شوق تھا۔ شاعری میں اپنے بڑے بھائی رضی بدایونی کے شاگرد رہے۔ ابتدا غزل گوئی، بعد میں نظم گوئی کی جانب متوجہ ہوئے۔ ۷ جمادی الثانی ۱۳۹۳ھ مطابق ۸ جولائی ۱۹۷۳ء بروز اتوار علی گڑھ میں وفات پائی۔ (شہید بدایونی نے وفات کی تاریخ ۱۸۔۷۔۱۹۷۳ء جلالی تحریر کی ہے) اور یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ تصانیف:

۱۔ کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے؟ علی گڑھ ۱۹۲۸ء　　۲۔ تجلیات (مجموعہ نظم) دہلی ۱۹۵۳ء

۳۔ سیار گاہ عالی (والد رفیع احمد عالی کا کلام) بدایوں　　۴۔ لمعات (بڑے بھائی رضی بدایونی کا کلام) علی گڑھ

۵۔ قول سدید (محمود احمد عباسی امروہوی کی کتاب خلافت معاویہ ویزید کا جواب) ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۶۰ء

۶۔ گنج زار (فارسی شاعری کا انتخاب مع اردو ترجمہ) ساہتیہ اکادمی نئی دہلی ۱۹۶۸ء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، اول ۱۹۶۸ء، سوم

۱۹۹۴ء ص ۳۲		۷۔ مکتوبات، دہلی، ۱۹۲۷ء

۸۔ جلوۂ حقیقت (مذہبی مضامین کا مجموعہ) ناشر ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، اول ۱۹۷۱ء ص ۲۵۲ دہلی سے بھی ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔

۹۔ مسالک و منازل (مجموعۂ مقالات) دہلی، ۱۹۷۵ء

دیکھیے: (۱) خازن، ص ۲۳۱۔۲۲۸ (۲) اثر فی حاشیہ ص ۳۵۵)

۱۰۳۔ ضیاء الدین نام اور نخشبی تخلص تھا۔ نخشب میں پیدا ہوئے۔ کم سنی میں والد کے ہمراہ بدایوں آ گئے تھے۔ والد بدایوں کے علما سے تعلیم حاصل کی پھر دمشق جا کر حکیم ابوالفضل بن عبدالکریم سجزی کی شاگردی اختیار کی۔ طب اور ریاضی کی تحصیل کے بعد بدایوں واپس چلے آئے اور شیخ شہاب الدین مہمرہ کی صحبت اختیار کی تھی۔ تصوف کی بہت سی کتابیں ان سے پڑھی تھیں۔ پیر طریقت کی تلاش میں ناگور جا کر شیخ فرید الدین چشتی ناگوری کے مرید ہوئے۔ تمام عمر فقر و فاقہ میں رہ کر بحالت تفرید و تجرید بسر کی۔ شاعری میں خاصہ درک تھا۔ آپ کے قطعات رباعیات اور قصائد 'سلک السلوک' میں موجود ہیں۔ ۵ ربیع الاول ۷۵۱ھ میں انتقال ہوا۔ مادہ تاریخ 'مجذوب' ہے۔ مزار بیرون شہر جانب غرب اپنے استاد شیخ شہاب الدین مہمرہ کے پائیں پتھر واقع ہے۔ نہایت اچھے عالم فاضل اور صاحب نسبت تھے۔ علم طب و موسیقی میں آگاہی رکھتے تھے۔ زیادہ زندگی گوشہ گیر رہ کر تصنیف و تالیف میں گزاری۔

۱۔ یہ کتاب ۷۳۰ھ میں تالیف کی۔ ۱۹۲۰ء میں مسٹر جی ایل نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

۲۔ یہ بھی معرفت و سلوک کی کتاب ہے۔ اس کے قلمی نسخے ہندو پاک کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ اس کے دو نسخے کتب خانہ ادارہ ادبیات حیدرآباد دکن، ایک جامعہ ملیہ اور ایک اسلامک سنٹر یونی دہلی میں موجود ہے۔ (دوم ص ۴۳،۳۹)

۳۔ اس کا نام جگل ناسوس اکبر بھی ہے۔ اس کتاب کا مخطوطہ کتب خانہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ، خدا بخش لائبریری پٹنہ اور رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔ (پٹنہ ۷۔۲۹، ۱۹۹۴ء ص ۱۰۲)

۴۔ اس کا مکمل نام کتاب جزئیات و کلیات ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ میں موجود ہے۔ (پٹنہ ۷۔۲۹، ۱۹۹۴ء ص ۵۷)

نخشبی کی کتب کے درج ذیل مخطوطات بھی ملتے ہیں۔

☆۔ عشقیہ		رضا لائبریری رامپور (پٹنہ ۷۔۲۹، ۱۹۹۴ء ص ۷۰)

☆۔ پنج مجلس		خانقاہ معمریہ گیا۔ (پٹنہ ۷۔۲۹، ۱۹۹۴ء ص ۱۳۹)

☆۔ انیس العاشقین		پاکستان (پٹنہ ۷۔۲۹، ۱۹۹۴ء ص ۲۰۰)

☆۔ رسالہ عربانی۔		پاکستان (پٹنہ ۷۔۲۹، ۱۹۹۴ء ص ۲۱۰)

☆۔ شرح قصیدہ سریانی		پاکستان (پٹنہ ۷۔۲۹، ۱۹۹۴ء ص ۲۱۴)

☆۔ شرح قصیدہ بردہ		پاکستان (پٹنہ ۷۔۲۹، ۱۹۹۴ء ص ۲۱۴)

☆۔ شرح دعائے سریانی		پاکستان (پٹنہ ۷۔۲۹، ۱۹۹۴ء ص ۲۱۴)

۱۰۶۔ طالب تخلص کے چار بدایونی شعرا کا علم ہوا ہے۔(۱) منشی گنگا دیال ابن منشی کشن لال (۲) محمد وہاب الدین احمد ولد مولوی عزیز الدین صادق بدایونی (۳) ابوظفر قدرت علی انصاری (۴) طالب انصاری ولد شیخ برکت اللہ۔ شاید چوتھے شاعر طالب بدایونی مراد ہیں۔ یہ قصبہ ککراڑ ضلع بدایوں کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ عربی تعلیم مولوی محمد یوسف بیزاروی سے حاصل کی۔ سیاق علم کی طلب و تنگی تھوڑی پوری کی۔ ۱۹۲۰ء میں تلاش معاش میں لاہور پہنچے۔ یہیں منشی فاضل اور میٹرک کیا اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ مجموعہ کلام 'ثمرۂ حیات' کے نام سے چھپ گیا ہے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول مغلپورہ لاہور میں مدرس تھے۔ ۷ نومبر ۱۹۶۷ء میں لاہور میں وفات پائی۔ نثری تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔

دیکھیے: (۱) خان۔۔۔۲۰۰۰ء، ص ۳۹۴ (۲) بدایونی، دوم ص۔ ۵۸۔ ۴۷)

۱۰۷۔ عقیل بدایونی، ایڈیٹر 'مشیر سلطنت' بدایوں۔ مالک آر۔ ایف پریس، بدایوں۔ شاگرد انصار حسین زولی، بدایوں۔ (بدایونی، دوم ص ۵۱۔ ۵۰)

۱۔ برکات مارہرہ، نول کشور پریس لکھنؤ۔ س۔ن ص ۲۱۲ (مارہرہ کے بزرگوں کے حالات)

۲۔ باقیات الصالحات، (متعلق خاندان متولی) بدایوں

۳۔ حکمت کلیسی، یونیورسٹی پبلشرز علی گڑھ ۱۹۵۵ء صفحات ۱۱۹ (صدیقی، دوم ص ۸۰)

۱۰۸۔ بدایوں کے خاندان شیوخ صدیقی سے تھے۔ آبائی مکان واقع محلہ قاضی ٹولہ بدایوں میں ۱۱۷۷ھ مطابق ۶۴۔۱۷۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ بدایوں سے علم حاصل کر کے لکھنؤ آئے اور سرکار اودھ کے متوسلین میں داخل ہو گئے۔ لکھنؤ چھوڑ کر الٰہ آباد چلے گئے اور وہاں چند سے قیام کرنے کے بعد عجم کی سیر کو روانہ ہو گئے۔ ایک مدت تک وہاں کے علما و فضلا سے فارسی زبان سیکھی۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں ۱۲۴۱ء میں ایران سے واپس ہندوستان آئے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ عطاء اللہ خان عطا کے شاگرد تھے۔ جہاندار شاہ نے 'خوش فکر خاں' کا لقب دیا۔ 'خاقانی' کا خطاب شاہزادہ جہاں بخت کی سرکار سے ملا۔ جرأت سے شاعری کے سلسلے میں مکابرہ ہوا اور طرفین سے ہجوگوئی ہوئی۔ اردو میں ایک مختصر ردیف وار دیوان غیر مطبوعہ اور ایک مثنوی وامق وعذرا نا تمام چھوڑی۔ اس کا ایک نسخہ ریاست بھرت پور میں اور ایک نسخہ مولوی محمد سلیمان کے کتب خانے میں بھی ہے۔ یہ مثنوی شائع بھی ہوئی۔ کلام کا بیشتر حصہ فارسی میں ہے۔ فارسی کا دیوان بھی ردیف وار ہے اس میں تقریباً دو ہزار ایک سو چالیس اشعار ہیں۔ ان کے علاوہ ایک مثنوی خالص مذہبی رنگ میں ہے اور چند قصائد بھی ائمہ کی مدح میں ہیں۔ رباعیات بھی ہیں۔ ہجویات بھی کہیں۔ عمر کا بیشتر حصہ ایران، لکھنؤ اور حیدرآباد میں گزرا۔ حج بھی کیا۔ مقامات مقدسہ کی زیارتیں بھی کیں۔ آخر میں وطن آ کر ۱۲۴۴ھ مطابق ۳۰۔۱۸۲۹ء میں قاضی ٹولہ بدایوں میں فوت ہوئے۔ شہر سے جانب غرب قاضی حوض پر دفن ہوئے۔ دیکھیے: (۱) چمن، ۸۳۔۸۱، ص ۲۱۲ (۲) زبیدی، ص ۳۲۷ (۳) بدایونی، دوم ص ۱۲۔۱۳۔ ۳۷)

۱۰۹۔ ضیا علی خان اشرفی نے ان کا نام ظہیر الدین اور والد کا نام شیخ محمد تحریر کیا ہے۔ علی جواد زیدی نے ان کا نام (ظہیر العلما شاہ) ظہیر اللہ سہسوانی اور تخلص ظہیر تحریر کیا ہے۔ ۱۸۲۲ء میں سہسوان میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام غلام جہاز ہے۔ مذاق بدایونی کے شاگرد، مرید، خلیفہ اور جید عالم تھے۔ ادب، نجوم، طب اور علوم دین سے متعلق ۲۰۰ سے زائد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

قصیدے سے خاص شغف تھا۔ سر سید احمد خان کے شریک کار تھے اور قیام علی گڑھ کالج کی کوششوں میں پیش پیش تھے۔ ندوۃ العلما لکھنؤ اور طبیہ کالج دہلی کی روئیدادوں میں آپ کا ذکر موجود ہے۔ ۱۳ ربیع الاول ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۱ء میں وفات پائی۔ ضیاء القادری نے ظہیری معرفت آگاہ سے سال وفات عیسوی ۱۹۲۲ء نکالی ہے۔ درج ذیل کتب بھی ان سے یادگار ہیں۔

☆۔ قصیدہ ظہیری، میور پریس دہلی۔ ☆۔ قصیدہ نعت، وکٹوریہ پریس بدایوں۔

☆۔ منتخب قصائد، اردو گائیڈ کلکتہ۔ ☆۔ قصائد ظہیری، اسلامیہ پریس لاہور۔

☆۔ بہارستان منقبت یا دیوان ظہیری، مطبوعہ ☆۔ گلشن لطائف، مطبوعہ

☆۔ بہاریہ کلام کا مجموعہ۔ یہ درگاہ اجمیر شریف کے کتاب خانے میں موجود ہے۔

☆۔ انسان کامل حصہ اول یعنی الانسان الکامل مصنفہ سید عبدالکریم مترجمہ مولوی ظہیر احمد ظہیر سہسوانی، مطبع فیض بخش سٹیم پریس فیروزپور، اول ۱۹۰۸ء، ص ۱۹۱

☆۔ سیر الصدور المعروف بہ ظہیر الابرار (حصہ اول) (سید بدیع الدین المدار مکن پوری کا تذکرہ) مطبع منشی نول کشور لکھنؤ، ۱۹۰۰ء ص ۱۸۲۔

دیکھیے: (۱) زبیری، ص ۲۲۷ (۲) خان، ۲۰۰۰ء ص ۲۰۵ (۳) اشرفی، ص ۳۲۲۔۳۱۹ (۴) بدایونی دوم ص ۲)

۱۰۔ پیدائش ۱۰ جولائی ۱۹۲۹ء بدایوں۔ ساکن مولوی ٹولہ بدایوں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ تعلیم کا زمانہ بھی یہیں گزارا۔ ۱۹۵۳ء میں اردو میں ایم اے کیا۔ یہیں عارضی طور پر لیکچرر رہے۔ ۱۹۵۴ء میں دہلی میں سینٹ اسٹیفنس کالج اور اس کے بعد دہلی کالج سے وابستہ ہوئے۔ دہلی کالج کی ملازمت کے دوران ۱۹۵۹ء میں علی گڑھ سے فارسی میں ایم اے کیا۔ ۱۹۶۴ء میں مومن شخصیت اور فن کے موضوع پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس مقالے کو یونیورسٹی نے شائع بھی کیا۔ ۱۹۷۱ء میں ریڈر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ چار سال قائم مقام اور تین سال مستقل صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے کام کیا۔ تصنیفات و تالیفات میں سترہ کتابیں شائع ہوئیں۔ یونیورسٹی طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر رہے اور پھر دہلی کالج میگزین کے نگران اعلیٰ مقرر ہوئے۔ مختلف انجمنوں میں عہدہ دار اور ممبر کی حیثیت سے کام کیا۔

۱۔ مومن شخصیت اور فن، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ناشر دہلی یونیورسٹی، دہلی فروری ۱۹۷۲ء، طبع اول ص ۲۸۳

۲۔ مجموعۂ نظم حالی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

۳۔ ادب اور جمالیاتی اقدار، ایک مطالعہ، مکتبہ الفاظ علی گڑھ، اول ۱۹۷۹ء، ص ۱۲۸

۴۔ تحقیقی مطالعے، حالی کی زندگی اور ادبی کارناموں پر جائزہ، مفصل بحث، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۵ء، ص ۲۱۷

☆۔ نقش ہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزلیات و مثنویات کا انتخاب و ترجمہ) شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی، ۱۹۷۰ء، اول ص ۲۱۵

☆۔ مطالعہ کیجیے: (۱) دستاویز ص ۲۱ (۲) شہید بدایونی دوم ص ۸۵۔۸۷)

۱۱۔ عابد سعید خان لودھی خلف عبدالحمید خاں تحصیلدار، ساکن محلہ ناگران، بدایوں۔ عبدالحمید خاں، فانی کے چچا زاد بھائی تھے۔ ۱۹۰۵ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد سکول میں داخل ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۲۹ء میں بی اے کیا

اور سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ سب رجسٹرار ہو گئے۔ ۳ نومبر ۱۹۱۷ء میں بدایوں میں انتقال ہوا۔ شاعری میں فانی بدایونی سے اصلاح لی۔ فانی رشتے کے چچا تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی اور بیخود بدایونی سے بھی مشورہ سخن کیا۔ ان کے حقیقی دادا خان بہادر سخاوت حسین مدہوش غالب کے شاگرد رہے۔ بدایوں میں 'انجمن تنظیم الشعرا' اور 'بزم جلالی' کے صدر بھی تھے۔ درج ذیل کتاب بھی ان سے یادگار ہے۔

ا۔ رنگارنگ (مجموعہ کلام) نظامی پریس بدایوں ۱۹۵۹ء۔ دیکھیے: (۱) بدایونی ۱۹۸۱ء ص ۷۵تا ۱۲۹ (۲) بدایونی ۱۱ء ص ۱۳۱۔۱۳۲)

۸۴۔ سید محمد عبدالباری بن سید سراج احمد فاضلی ۱۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۲ سال کی عمر تک ابتدائی صرف و نحو، منطق، بعض کتب فلسفہ و ادب پڑھ چکے تھے کہ سایہ پدری سے محروم ہو گئے۔ اور مولوی سید امیر حسن سہسوانی آپ کو بغرض تعلیم ہمراہ لے آئے جہاں درسی نصاب ختم کیا۔ طب حکیم محمد انور علی سے، حضرت میاں صاحب سے کتب صحاح کی سند لی۔ آگرہ کے مدرسہ عربی میں ادب و حساب کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ صاحب 'حیاۃ العلماء' نے آپ کے لیے خطاب 'شیخ المناظرین و امام المتکلمین' لکھا ہے۔ سرسید کی تفسیر سورہ فیل کا جواب لکھا جسے سرسید نے 'تہذیب الاخلاق' میں فراخ دلی سے چھاپا۔ دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ سرسید نے کالج علی گڑھ کا عہدہ پروفیسر (عربی و فارسی) پیش کیا جسے انھوں نے انکار کر دیا۔ جسمانی صحت اچھی تھی اس لیے علیا حضرت نواب شاہجہاں بیگم آپ کو شیر دربار کے خطاب سے یاد فرماتیں۔ مناظر بھی تھے۔ ہندؤں اور عیسائیوں سے مناظرے کیے۔ کتب نصاریٰ پر نظر وسیع تھی اور ان کے مضامین پر مکمل عبور تھا۔ اس حوالے سے زبردست شہرت دی گئی۔ حساب، ہندسہ و ہیئات میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ ترک سلطنت کی امداد کے لیے وعظ کیے۔ دورے کیے۔ لوگوں کو امداد کی ترغیب دی اور کثیر چندہ ترکی بھیجا۔ مجاہدین کا حصہ بھی کیا۔ منشی نول کشور نے آپ کو مطبع میں تصحیح کتب عربی و فارسی کی نگرانی کے لیے مقرر کیا۔ ۱۲۹۵ھ میں نواب بھوپال نے آپ کو اپنا متوسل و مشیر و ندیم اور معتمد ریاست مقرر کیا۔ ہر دو تاریخ شعبہ ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۰۳ھ میں تپ محرقہ کے باعث انتقال ہوا۔ حافظ سید محمد سوتی نے فی البدیہہ حدیث 'ادخل الجنۃ بلا حساب' سے ایک عدد کی تخرج کے ساتھ تاریخ وفات نکالی۔

ا۔ اس کتاب کا پورا نام 'اعلام الاخیار و الاعلام ان الدین عند اللہ الاسلام' ہے۔ یہ کتاب ایجوکیشن پریس آگرہ سے ۱۲۹۳ھ میں شائع ہوئی۔ کل صفحات ۱۹۷ ہیں۔ زمانہ قیام آگرہ میں لکھی۔ ضخیم کتاب جس میں تمام مذاہب کے مقابلے میں اسلام کی برتری ثابت کی۔ کتاب کی اشاعت میں نواب صدیق حسن خاں نے اعانت کی۔ درج ذیل تصانیف بھی ان سے یادگار ہیں۔

☆ ہدایۃ المبتدعین (در شرک) ☆ اتفاق کرائی الحنفا کا ترجمہ

☆ حامد انصاری نے ایک اور رسالہ 'ہدم الاوثر' یں ملقب بہ 'شیخ المکین علی ہدم اساس الدین' مطبوعہ آگرہ ۱۲۹۱ھ کی نشاندہی بھی کی ہے۔ یہ پادری عماد الدین سے مناظرے کے حوالے سے ہے۔

دیکھیے: (۱) نوشہروی ۱۳۹۱ھ ص ۹۹ (۲) خان ۱۹۹۲ء ص ۲۹۸)

۸۵۔ ۱۲۷۳ھ میں سہسوان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کتب گھر پر پڑھیں پھر مولوی سید امیر حسن، مولانا محمد بشیر اور مولوی امیر احمد سے کسب علم کیا۔ ۱۲۹۴ھ میں بھوپال تشریف لے گئے۔ وہاں شیخ حسین عرب اور شیخ قاضی محمد مچھلی شہری سے حدیث پڑھی اور سند لی۔ طب مولوی حکیم معز الدین پٹیالوی سے پڑھی۔ بسلسلہ معاش قصبہ رہٹسیں ریاست بھوپال میں قیام رہا۔ شاعر بھی تھے۔ دو تین منظوم تصانیف بھی ہیں۔ فیض

شاگردوں میں نظامی بدایونی، مولوی رضا حسین بیدل بدایونی اور منشی جمیر پرشاد افقر مشہور ہیں۔ نومبر ۱۹۱۲ء مطابق ۱۳۳۱ھ میں ۵۵ سال کی عمر میں انتقال ہوا اور بیرون درگاہ حضرت خواجہ سید احمد مدفون ہوئے۔ تصانیف کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔

۱۔ مرآۃ الخیال مطبع مستنصر پریس دہلی، ۱۹۱۰ء

۲۔ مہر و کلیب کی لوٹ (خمسہ ۲۸ بند) مطبع نسیم سحر بدایوں ۱۳۲۷ھ

۳۔ ہوس و فتنہ کی لوٹ (طویل مخمس) مطبع نسیم سحر بدایوں۔ یہ دونوں مخمس دیوان میں بھی موجود ہیں۔ شہید بدایونی نے مخمس کا نام ہوش و خرد کی دکان تحریر کیا ہے جو درست معلوم نہیں ہوتا۔

۴۔ فسانۂ جنون (مسدس ۱۳۴ بند) مطبع صحیح بدایوں　　　　۵۔ نامہ ننگ (ناول)

((ا) رام دول ص ۲۵۶ ـ ۲۵۲ (۲) مسدس ص ۱۸۲ (۳) بدایونی ادوال ص ۸ تا ۷۷ (۴) بدایونی ۱۹۸۱ء ص ۹ ـ ۷۷)

۲۲۔ عبدالرحمن نام حیا تخلص ریلوے میں ملازم تھے اس لیے لوگ انھیں بابو حیا کہتے تھے۔ والد کا نام مولوی احمد حسین تھا۔ نسلاً شیخ صدیقی تھے۔ بدایوں کے معروف خاندان بنی حمید سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۲۷۷ھ میں محلہ قاضی ٹولہ بدایوں میں پیدا ہوئے۔ مولوی محمود حسین اور سید عبدالکریم سے فارسی اور عربی پڑھی۔ خواجہ اللہ بخش تونسوی کے مرید ہوئے۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد درویشی اختیار کر لی تھی۔ زیادہ قیام نظام الدین اولیا کی درگاہ میں رہا تھا۔ ۳ جمادی الاول ۱۳۴۰ھ کو انتقال ہوا۔ خواب گاہ گھر یٹہ مہرولی در درگاہ حوض خاص کالونی دہلی میں ہے۔

۱۔ ضیا علی خان اشرفی نے سال اشاعت ۱۲۵۳ھ تحریر کیا ہے۔ (اشرفی ص ۱۵۵ ـ ۱۵۴)

۲۳۔ ۱۲۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس کی اولاد سے تھے۔ تحصیل علوم اپنے عم محترم قاضی بہاء الحق سے حاصل کی۔ متقی عالم تھے۔ مرید و خلیفہ حضرت آل احمد صاحب عرف اچھے میاں مارہروی کے تھے۔ ریاست رامپور سے آپ کو عہدہ قضا عطا ہوا تھا۔ آپ کی وفات ۱۵ رجب ۱۲۸۹ھ میں ہوئی۔ آپ کی وفات کی تاریخ ۳ عدد کے تخرجہ کے ساتھ قاضی عبدالسلام عباسی سے حاصل کی گئی۔ (اکمل ص ۲۵۳ ـ ۲۵۱)

۱۔ ۱۸۳۱ء (بدایونی ۲۰۰۷ء)　　　　۲۔ مثنوی ہے۔

۵۔ اردو میں قرآن مجید کی منظوم تفسیر ہے جس میں تقریباً دو لاکھ کے قریب شعر ہیں۔ ۱۲۴۲ھ میں تصنیف کی 'نزل الاقرآن' سے سال تالیف نکلتا ہے۔ گنج کا نام بھی یہی ہے۔ ۱۸۳۸ء مطابق ۱۲۵۵ھ میں فوت ہوئے۔ ((ا) بدایونی ۲۰۰۷ء (۲) علی ص ۲)

۲۴۔ ۲۔ فارسی مصدر (مولانا فضل حق کے رسالے انتزاع العلم کا رد) مطبوعہ ص ن

۲۵۔ عبدالقادر بن ملوک شاہ ۹۴۷ھ میں جے پور (راجستھان) کے قصبہ ٹوڈا بھیم کے مقام پر شیر شاہ سوری کے عہد حکومت میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بساور میں حاصل کی۔ ۱۸ رجب ۹۶۹ھ میں والد اور نانا کے یکے بعد دیگرے انتقال ہونے سے فکر معاش دامن گیر ہوئی۔ ۹۷۳ھ میں چناپال کے جاگیردار حسین خان کی ملازمت میں رہے۔ ۹۸۱ھ میں کسی بات پر اختلاف ہوا اور بدایوں چلے آئے۔ یہاں سے آگرہ آگئے اور جلال خاں کے توسط سے دربار میں پہنچے اور اس کی سفارش سے اکبری منصب داروں میں شامل ہو گئے۔ اکبر قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

دورِ اکبری کے مشاہیر علما میں شمار تھا۔ تاریخ و رجال، شعر و انشا اور فنونِ حکمیہ کے ماہر تھے۔ حدیث و فقہ میں بھی دسترس تھی۔ سید محمد مکی، مخدوم اشرف، حاتم سنبھلی، سعد اللہ نحوی بیانوی، قاضی ابو المعالی بخاری، مفتی ابو الفتح بن عبد الغفور تھانیسری، ملا مبارک ناگوری، میر تقی بن فاضل شیرازی سمرقندی، سے استفادہ کیا۔ سلسلۂ قادریہ میں شیخ داؤد کرمانی جھنی وال کے مرید ہو کر خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ امیر حسین خان والیِ اودھ کی ملازمت میں بھی رہے۔ کئی کتابوں کی تالیف میں بھی شریک رہے۔ شاعر بھی تھے۔ قادری تخلص تھا۔ تاریخ گوئی میں بھی مہارت تھی۔ ۱۰۰۴ھ میں ستاون برس کی عمر میں وفات پائی۔ بدایوں میں دفن ہوئے۔ حسین قلی خان نے ایک عدد کے تخرجہ کے ساتھ 'قادری آنکہ انتقال نمود' سے تاریخ وفات نکالی ہے۔ اگر 'آ' کے دو عدد شمار کیے جائیں تو تخرجہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

ا۔ منتخب التواریخ۔ ۹۹۹ھ۔ ۱۵۹۱ء میں شروع کی اور ۲۳ جمادی الاخریٰ ۱۰۰۴ھ۔ ۱۵۹۵ء میں مکمل کی۔

درج ذیل کتب بھی ان سے یادگار ہیں۔

☆۔ 'نجات الرشید' (تکمیل ۹۹۹ھ ۱۵۹۱-۱۵۹۰ء) عبدالقادر بدایونی کی تصنیف ہے جس کا ایک خطی نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں موجود ہے۔ اس تصنیف کو سید معین الحق نے ادارہ تحقیقات پاکستان پنجاب یونیورسٹی لاہور سے نومبر ۱۹۷۲ء میں شائع کر دیا ہے۔ صفحات کی تعداد ۲۰۷ ہے۔ 'نجات الرشید' تاریخی نام ہے۔ جس سے ۹۹۹ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اس کا ایک قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ لاہور میں عجلت میں لکھی گئی۔

☆۔ تاریخ الفی (مرتبہ ۱۰۰۰ھ۔ ۱۵۹۲ء)

☆۔ رشید الدین کی 'جامع التواریخ' کا تلخیص ترجمہ (۱۰۰۰ھ۔ ۱۵۹۲ء)

☆۔ یاقوت کی 'معجم البلدان' کا جزوی ترجمہ

☆۔ نامۂ خرد افزا: 'سنگھاسن بتیسی' کا ترجمہ (۹۹۸ھ۔ ۱۵۸۱ء) بادشاہ کے حکم سے لکھی۔ 'خرد افزا' تاریخی نام ہے۔ جس سے ۹۹۳ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ تالیف بھی یہی ہے۔ نفیس مظہر صاحب نے ۹۹۸ھ شاید غلط درج کیا ہے۔

☆۔ 'رزم نامہ': 'مہابھارت' کا ترجمہ (۹۹۰ھ۔ ۱۵۸۲ء مابعد)

☆۔ ترجمہ رامائن (۹۹۳ھ۔ ۱۵۸۴ء تا ۹۹۷ھ۔ ۱۵۸۹ء) چار سال میں ترجمہ کیا۔

☆۔ بحر الاسمار: سنسکرت 'کتھا سرت ساگر' کا ترجمہ (۱۰۰۳ھ۔ ۱۵۹۵ء) تقریباً ساٹھ جزو کے ترجمہ کیا۔

☆۔ 'اتھروید' کا مکمل ترجمہ۔ شیخ بھاون برہمن دکنی کے ساتھ مل کر کیا۔ یہ کتاب ویدِ اہلِ ہنود کی چوتھی کتاب ہے۔

☆۔ کتاب الاحادیث (۹۸۲ھ۔ ۱۵۷۴ء) ☆۔ انتخاب جامع رشیدی۔ عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

☆۔ انتخاب تاریخ کشمیری۔ اس کا کوئی قدیم ترجمہ شاہ محمد شاہ آبادی نے فارسی میں کیا تھا اس کو نفیس عبارت میں ترجمہ کیا۔

☆ کشف الغطا فی احوال الصفا (تذکرہ اولیا اور صوفیا کے احوال میں) عربی پانچ جلدیں، غیر مطبوعہ۔ اس کے فارسی اور انگریزی ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

دیکھیے: (ا) نقوش ۲۰۷ء۔ ۲۹، ۱۹۹۲ء ص ۱۵۷ (۲) صدیقی ۲۰۰۰ء ص ۱۷۱۔ ۱۵۸ (۳) بجلی، جہارم، حصہ دوم ص ۱۸۲۔ ۲۰ (۴) معین

الحق ۲ ۱۹۶۷ء ص ۷۸۔ لب (۴) تکمل، ص ۲۱۳۔۱۹۲ (۵) اشرفی، ص ۲۲۸۔۲۲۵ (۶) بدایونی ۲۰۰۸ء ص ۲۲۸۔۲۳۳ (۷) بدایونی دوم ص ۱۲۶۔۱۲۱)

۲۹۔ آپ حضرت عثمان غنیؓ کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کا خاندان بدایوں کے ذی علم عالی نسب اور باوقار خاندانوں میں سے ایک ہے۔ ۱۷ رجب ۱۲۵۳ھ / ۱۷ اکتوبر ۱۸۳۷ء کو مولوی محلہ بدایوں میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام 'مظہر حق' رکھا گیا۔ بدایوں میں نور احمد عثمانی سے تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں مولانا فضل حق خیرآبادی کی شاگردی حاصل کی۔ مکہ سے امام المحدثین حضرت مولانا جمال عمر مکی سے حدیث کی سند حاصل کی۔ خانوادہ قادریہ میں اپنے والد ماجد کے مرید و خلیفہ تھے۔ مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی سے خصوصی تعلقات تھے۔ انھوں نے انھیں مارہرہ شریف لے جا کر شاہ آل رسول کا مرید کروایا تھا۔ ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب 'تذکرہ' میں لکھا ہے کہ میرے والد عقائد میں شدید تھے۔ ان کے سامنے اگر کوئی مسئلہ پیش ہوتا تھا تو پوچھتے تھے، مولانا عبدالقادر بدایونی کا اس مسئلہ میں کیا خیال ہے۔ علما میں یہی ایک ہستی تھی جسے وہ مستند تسلیم کرتے تھے۔ جن دنوں ندوۃ العلما کی تحریک زوروں پر تھی آپ نے اپنی پوری قوت سے اس تحریک کی مخالفت کی۔ جس کے باعث آپ کو ہندوستان میں خاص شہرت حاصل ہوئی۔ تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا۔ کئی کتابیں اردو و عربی میں لکھی تھیں۔ شاعر بھی تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ 'قتیل' تخلص کرتے تھے۔ ۱۷ جمادی الاول ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں وصال ہوا۔ جگل مانک پوری نے 'کامل عصر قطب جنت شد' سے تاریخ وفات ۱۳۱۹ھ نکالی ہے۔

ا۔ شہید بدایونی نے اسے غیر مطبوعہ لکھا ہے۔ (ص ۸۰) درج ذیل کتب بھی یادگار ہیں۔

☆۔ منقبت حضرت غوث اعظم، مطبع نسیم سحر بدایوں ۱۳۱۱ھ صفحات ۱۲

☆۔ دیوان اول منقبت سید الابرار جناب محبوب سبحانی، مطبع جماعت تجارت حنفیہ اسلامیہ میرٹھ، ۱۳۰۰ھ صفحات ۵۶

☆۔ دیوان ثانی در مدح اکمل اولیا جناب محبوب سبحانی، مطبع نسیم سحر بدایوں ۱۳۰۳ھ صفحات ۳۲

☆۔ دیوان منقبت، مطبع [illegible] حیدرآباد دکن ۱۳۰۹ھ

☆۔ بہارستان منقبت (تیسرا دیوان)　　☆۔ گنجینہ مظہر حق (چوتھا دیوان)

دیکھیے: (۱) مہران ضیا، ص ۲۲۷۔۲۳۳ (۲) بدایونی دوم ص ۱۱۲)

۳۰۔ آپ عالم بھی تھے اور طبیب بھی۔ (تکمل، ص ۲۴۳)

۳۱۔ ۴ شعبان ۱۳۰۰ھ مطابق ۲۸ اپریل ۱۸۸۳ء کو مولوی محلہ بدایوں میں ولادت ہوئی۔ 'منصور حق' تاریخی نام ہے۔ شہید بدایونی نے تاریخی نام منصور الحق تحریر کیا ہے جو درست نہیں۔ چودہ سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا۔ مولانا شاہ عبدالقادر محب رسول، مولوی عبدالمجید آنولوی، شاہ عبدالمقتدر قادری، مولانا محب احمد قادری اور مولوی محمد ابراہیم بدایونی سے علوم مروجہ کی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں دہلی جا کر حکیم غلام رضا خان اور حکیم عبدالرشید سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ شاہ عبدالمقتدر قادری سے خلافت بھی لی۔ ملی اور ملکی تحریکات میں سرگرم رہے تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو، حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی جوہر اور مہاتما گاندھی سے اچھے تعلقات تھے۔ خلافت کمیٹی اور آل انڈیا نیشنل کانگریس کے ممتاز رکن رہے تھے۔ مدرسہ شمس العلوم کی بنیاد ڈالی۔ پریذیڈنٹ آل انڈیا خلافت کانفرنس کلکتہ، صدر جمیعت علمائے ہند و

پریذیڈنٹ مجلس خلافت صوبہ جات متحدہ۔ شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی۔ منظور تخلص تھا۔ نثر و نظم دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ ۱۳۵۰ھ میں آل انڈیا مسلم کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لکھنؤ گئے۔ وہیں طبیعت خراب ہوئی اور ۳ شعبان ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۹۳۱ء کی نصف شب لکھنؤ میں وفات پائی اور درگاہ قادری بدایوں میں دفن کیے گئے۔

۱۰۔ دربار علم، اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور، دوم ۱۹۳۳ء، ص ۱۸۲

۱۲۔ پورا نام یہ ہے 'تاریخ خلافت موسوم بہ خلافت اسلامیہ' نظامی پریس بدایوں، بی۔ن، ص ۲۲۸

۱۳۔ المکتوب، ہاشمی پریس میرٹھ، ۱۹۱۸ء، ص ۳۲ (صدیقی، سوم ۸۱)

دیکھیے: (۱) اشرفی، ص ۳۴۔۳۴ (۲) خان، ۲۰۰۰، ص ۷۶۔۷۵، (۳) ندوی، ص ۱۳۱۔۱۳۹، (۴) بدایونی، دوم، ص ۲۵۰۔۲۵۱)

۳۳۔ ۲۹ رمضان ۱۱۷۷ھ مطابق ۲ اپریل ۱۷۶۴ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام 'ظہور اللہ' ہے۔ متوسطات تک کی تعلیم اپنے پھوپھا مولوی محمد علی عثمانی بدایونی (ف ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء) سے حاصل کی۔ ان کے انتقال کے بعد مولانا نظام الدین سہالوی، مولوی ذوالفقار علی ساکن دیوہ (تلمیذ ملا نظام الدین فرنگی محلی) سے علوم متداولہ کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۲۰۵ھ (۹۱۔۱۷۹۰ء) میں اس زمانے کے مشہور شیخ طریقت شاہ آل احمد عرف اچھے میاں مارہروی (ف ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء) کے مرید ہوئے اور لقب شاہ عین الحق ملا۔ بعد ازاں اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔ ۷۰ سال کی عمر میں زیارت حرمین شریفین سے مستفید ہوئے۔ اساتذہ میں مولانا شاہ سلامت اللہ بدایونی، مولوی سعد الدین عثمانی، حافظ حسن علی، مولانا سید شاہ آل رسول مارہروی قابل ذکر ہیں۔ تلامذہ میں عبداللہ شاہ فاروقی، مولوی فضل مجید، قاضی شمس الاسلام عباسی، مولوی محمد حسین، مولوی علی بخش خان، مولوی محمد بخش خان، منشی عظمت علی، مولوی حافظ علی اسد اللہ وغیرہ شامل ہیں۔ بدایوں میں سجادہ قائم کیا۔ ۸۷ سال کی عمر میں ۱۷ محرم ۱۲۶۳ھ مطابق ۵ جنوری ۱۸۴۷ء کو انتقال ہوا۔ رضی الدین بسمل نے تاریخ وفات 'گر دیدہ اصل پہ غلط پریں' لکھا ہے۔ جس سے ۱۲۵۸ھ برآمد ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں 'گر دیدہ' ہوگا کیونکہ 'گردیدہ' کی 'ی' کے پانچ عدد شامل کرنے سے مطلوبہ سال برآمد ہوتا ہے۔ شاعر بھی تھے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔

۱۔ ہندی (اردو) میں لکھا ہوا یہ قلمی نسخہ کتب خانہ مدرسہ قادریہ بدایوں میں موجود ہے۔ ڈاکٹر شیخ سلیم الدین نے ۱۹۴۰ء سے قبل مدرسہ عزیز العلوم کلکتہ سے شائع کرا دیا ہے۔ (قادری ۱۹۸۸ء ص ۳۴۹)

۲۔ اردو میں لکھی ہوئی یہ تصنیف ۱۲۳۱ھ/۱۷۔۱۸۱۵ء میں تالیف ہوئی۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ قادریہ بدایوں میں موجود ہے۔ (قادری ۱۹۸۸ء، ص ۳۵۳)

۳۔ شاہ اسمٰعیل کی زندگی ہی میں 'تقویۃ الایمان' کے رد میں 'ہدایت الاسلام' کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ (اکمل التاریخ جلد ۱، ص ۱۱) یہ رسالہ شائع ہو چکا ہے۔ حامد اللہ ندوی نے اس کے قلمی نسخے کا تعارف اردو مخطوطات بمبئی ۱۹۵۶ء ص ۳۶ میں کرا دیا ہے۔ لیکن فہرست نگار نے غلطی سے مصنف کا نام عبدالمجید بدایونی تحریر کر دیا ہے۔ اس رسالہ کے جواب میں مولوی عبداللہ بنارسی نے 'تجیر الکلام فی دفع الاتہام' کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا۔ دونوں رسالے شائع ہو چکے ہیں۔ رضی الدین بسمل نے ایک رسالہ رد وہابیہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ شاید وہ یہی ہے۔ ضیاء علی خان اشرفی صاحب مردان خدا نے فارسی میں قرآن مجید کی تفسیر کی بھی نشاندہی کی ہے۔

تفصیل کے لیے دیکھیے: (۱) کسل، ص ۲۳۷-۲۳۴، (۲) اشرفی، ص ۲۹۲-۲۹۱، (۳) ندوی، ۱۹۹۰، ص ۹۵-۹۶)

۱۳۴۔ ساکن محلہ چاہ میر، بدایوں۔ ۲۷ جنوری ۱۹۲۸ء میں آبائی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اولاً قرآن مجید حفظ کیا اس کے بعد دینی تعلیم حاصل کی۔ مدرسہ شمس العلوم میں داخلہ لیا۔ مولوی اور منشی کے امتحانات الہ آباد بورڈ اور ادیب کا امتحان جامعہ علی گڑھ سے پاس کیا۔ شاعر بھی تھے۔ شاعری میں کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔ (بدایونی اول، ص ۲۱۵-۲۱۴)

۱۳۵۔ ۱۲۱۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۰۳ھ میں وفات پائی۔

یہ ملا نصیر ملتانی کی کتاب 'طبقات الاولیا' کی فارسی زبان میں شرح ہے۔ اس کتاب کے دو ایک قلمی نسخے تقسیم ہند سے قبل بدایوں میں تھے۔

شہید بدایونی نے سال تالیف ۱۳۰۲ھ تحریر کیا ہے۔ (۱) قادری ۱۹۸۲، ص ۱۸۹ (۲) بدایونی اول، ص ۷)

۱۳۹۔ آپ کے بزرگ قبائلی علاقے سے ہجرت کر کے حافظ الملک حافظ رحمت خان کے زمانے میں بریلی محلہ پور گنج نصیر خان میں آباد ہوئے۔ مولانا امیر کے والد بریلی سے بدایوں منتقل ہو گئے تھے اور مستقل سکونت بھی یہیں اختیار کر لی۔ امیر ۱۸۵۲ء مطابق ۱۲۶۸ھ میں بریلی میں پیدا ہوئے۔ علوم معقول و منقول مولانا عبدالقادر بدایونی سے اور علم حدیث مولوی حسن بن اسرائیل سنبھلی اور مولانا فضل رسول سے حاصل کیا۔ منطق و فلسفہ کی تکمیل مولانا عبدالحق خیرآبادی سے کی۔ ۱۸۷۸ء میں امتیاز احمد شیری کی شرکت میں بدایوں میں مطبع نسیم سحر بدایوں کا قائم کیا اور اسی نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالا۔ ۱۸۸۱ء میں محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ مطبع بھی چند دن جاری رہ کر ۱۸۹۵ء میں بند ہو گیا۔ ۱۹۱۳ء میں ملازمت سے پنشن لی اور اسی سال ان کا تقرر سینٹ جانس کالج آگرہ میں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے ہو گیا۔ امیر، شاہ عظیم الدین غزنوی عرف عاشق احمد بدایونی سے سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت تھے۔ فریضہ حج ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ پہنچے اور وہیں ۲ جولائی ۱۹۲۷ء مطابق ۲ محرم ۱۳۴۶ھ میں بروز جمعہ مدینہ منورہ میں انتقال کیا۔ ضیاء القادری نے 'خاتمہ بالخیر ہوا ہے جواب' سے تاریخ وفات ۱۹۲۷ء نکالی۔ تصانیف۔

۱۔ شہید بدایونی نے کتاب کا نام حیات شیخ محی الدین ابن العربی تحریر کیا ہے۔

۹۔ شہید بدایونی نے کتاب کا نام سیرت نعمانی تحریر کیا ہے۔

دیکھیے: (۱) خان، ۲۰۰۰ء، ص ۷۵، (۲) خان، ۱۹۹۱ء، ص ۳۷، (۳) زبیر القادری، ص ۱۷، (۴) راہی ۱۹۹۴، ص ۳۳، (۵) بدایونی اول، ص ۸۲-۸۳)

۱۴۰۔ ۱۸ دسمبر ۱۸۵۵ء مطابق ۱۲۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ ایوب قادری نے 'بدایوں کے حیدری خان ان کی علمی و ادبی روایات' میں ان کی ولادت علی اسد اللہ تحریر کی ہے (ص ۱۸۲)۔ میاں مذاق کے شاگرد تھے۔ انہی سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ طب ذریعہ معاش تھا۔ تاریخ کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ندوۃ العلما کی تحریک میں زور و شور سے حصہ لیا۔ خاندان حیدری سے تعلق رکھتے تھے۔ تاریخ، تذکرہ نویسی اور علوم اسلامیہ سے دلچسپی تھی۔ ۱۹ شعبان ۱۳۲۹ھ میں وفات پائی۔ متعدد کتب لکھیں۔

۱۔ یمین الاوثان ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء، وکٹوریہ پریس بدایوں سے فارسی کی یہ کتاب ان علما و مشائخ کے بارے میں ہے جن سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے۔

☆ مورخ التاریخ بجلیہ ۱۲۹۸ھ تا ۱۸۸۱ء (مطبوعہ)

☆ تاریخ شعرائے بدایوں (غیر مطبوعہ) دیکھیے: (۱) بدایونی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۹۵، ۱۹۸ (۲) قادری ۱۹۸۲، ص ۱۸۲)

۱۴۱۔ ا۔ دیوان امجد، وکٹوریہ پریس بدایوں، ۱۳۳۰ھ، صفحات ۲۶

۱۴۲۔ مولوی علی بخش خاں خلف سلطان بخش، رہائش محلہ سوتھہ بدایوں۔ ۱۲۲۷ھ میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ گھر پر دینی علوم مروجہ کا اکتساب کیا۔ کچھ عرصہ علم جفر، رمل اور نجوم کا بھی شوق رہا پھر اس شغل کو شرع اسلامیہ کے خلاف سمجھ کر ترک کر دیا۔ سرکاری ملازمت کی اور عہدہ صدر الصدور کے عہدے تک ترقی کی۔ مولوی فیض احمد بدایونی کے شاگرد اور شاہ عبدالمجید عین الحق بدایونی سے بیعت تھے۔ سر سید احمد خان کے ہم عمر اور دوست تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تعمیر کے زمانے میں ان کے معاون و مددگار رہے لیکن سر سید کے دینی اعتقادات سے اختلاف تھا۔ یہاں تک کہ سر سید کے رد میں "تائید الاسلام" اور "مؤید الاسلام" تحریر کر کے طبع کرائے۔ سر سید نے ان کے دونوں رسالوں کے جواب میں "ازالۃ البہتان" لکھی۔ ایک ماہنامہ دیوان مطبع اسعد الاخبار آگرہ سے شائع ہوا تھا۔ آخری عمر میں مشغلۂ شعر گوئی سے متنفر ہو گئے تھے۔ شرر تخلص تھا۔ مولوی محمد یعقوب بخش ان کے قابل ذکر شاگرد رہے۔ انھوں نے شرر کا کلام لالہ سری رام کو "خمخانۂ جاوید" میں شامل کرنے کے لیے بھجوایا تھا۔ پنشن لینے کے بعد حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء میں انتقال ہوا۔ سر سید کے معاصر تھے۔ اکثر مذہبی معاملات میں ان سے جھگڑا رہا کرتا تھا۔ سر سید کے بعض مذہبی عقائد کی تردید میں دو رسالے "تائید الاسلام" اور "شہاب ثاقب" لکھ کر اس زمانے میں خوب شہرت حاصل کی۔ وفات ۱۸۸۵ء لکھنؤ میں ہوئی۔

ا۔ ۱۸۵۲ء کی رپورٹ مطبع اسعد الاخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان شرر کی ۵۰۰ جلدیں اسی مطبع سے شائع ہوئیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (۱) رام، چہارم، ص ۲۹۸ (۲) قادری ۱۹۶۲ء، ص ۳۳۰ (۳) بدایونی، اول، ص ۲۹۸-۳۴۷ (۴) خان ۱۹۹۰ء، ص ۳۳۸ (۵) خان ۲۰۰۰ء، ص ۳۴۴ (۶) بدایونی ۱۹۸۸، ص ۱۸)

۱۴۳۔ مولوی علی حاتم صدیقی ابن تقی حسن، رہائش محلہ قاضی ٹولہ بدایوں۔ بشارت نے ولدیت تقی صدیقی تحریر کی ہے۔ ۱۸۷۵ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ زود گو شاعر تھے۔ اکبر کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں بدایوں میں وفات پائی۔

ا۔ طوفان نازی، نظامی پریس بدایوں، ۱۹۳۲ء؛ ایضاً عثمانی پریس بدایوں، ۱۹۳۷ء

دیکھیے: (۱) بدایونی ۱۹۸۸، ص ۱۲ (۲) خان ۲۰۰۰ء، ص ۲۰۲ (۳) بدایونی، اول، ص ۲۰۲-۱۵۷)

۱۴۴۔ بدایوں کے عیدی خاندان کے ممتاز رکن تھے۔ تلامذہ و روساء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ابتدائی تعلیم بدایوں میں حاصل کی۔ تعلیم کی تکمیل دہلی میں کی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے علم حدیث کی تحصیل کی۔ علم طب میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ نواب احمد علی خان کے عہد میں رامپور میں قیام رہا اور ان کی رئیسانہ نوازشوں سے بھی مستفیض ہوئے۔ بدایوں میں بلا ولد فوت ہوئے۔

ا۔ بیاض اردو میں ہے اور مصنف کا مکتوبہ نسخہ ہے۔ سالِ تالیف ۱۲۵۴ھ (قادری ۱۹۸۸ء، ص ۲۶۱)

۱۴۵۔ غلام شبیر ۱۲۷۵ھ میں پیدا ہوئے۔ (قادری ۱۹۸۲ء، ص ۱۸۷)

ا۔ یہ شاہ ابو الحسین نوری میاں مارہروی (ف ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء) کے ملفوظات پر مستقل تصنیف ہے۔ اس کی پہلی جلد "نور دیدۂ حضور" کے نام سے ۱۳۳۲ھ میں مطبع اقبال پریس بدایوں سے شائع ہوئی۔ دوسری جلد "تذکرۂ نوری" کے نام سے ایوب قادری نے سنی دار الاشاعت لائل پور سے شائع کی۔

۱۵۱ـ ایوب قادری نے اپنے مقالے "بدایوں کے حمیدی خاندان کی علمی اور ادبی روایات" میں ان کا مختصر ذکر حسین تحریر کیا ہے اور یہی درست ہے۔

۱۔ سیرۃ الحمیدی فی احوال السعید، مطبوعہ نظامی پریس، بدایوں، ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء۔ حمیدی خاندان کے بزرگ شیخ حمید الدین مخلص کتوری سبزواری (ف ۱۱۱۷ھ مطابق ۱۷۰۴ء) کے احوال میں لکھی گئی کتاب (بدایونی ۲۰۰۲ء ص ۲۳۳) یہ "اکمل التاریخ" مؤلفہ محمد یعقوب حسین ضیاء القادری پر ایک تنقیدی تبصرہ ہے۔ (قادری ۱۹۸۲ء ص ۱۸۷)

۱۵۲ـ ۱۔ سیاسی جھگڑ، مطبع نظامی بدایوں، ۱۳۳۳ھ ص ۳۲ (محمد یعقوب بدایونی کی تاریخ "اکمل التاریخ" میں قاضی سعد الدین کے حالات میں غلط بیانیوں کی تردید اور صحیح حالات)

۱۵۳ـ محمد فضل اکرم فرشوری خاندان شیوخ فرشوری کے ممتاز فرد تھے۔ ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ پیشہ وکالت تھا۔ چاندپور ضلع مرادآباد میں ایک طویل عرصہ تک وکالت کرتے رہے۔ تصنیف و تالیف سے بھی خاص شغف تھا۔ ایک زمانے میں ماہنامہ انجمن علمی (اجرا ۲۰، اگست ۱۸۸۲ء جو ان کے والد شیخ محمد معین الدین فرشوری (ف ۱۹۰۲ء) کی کوشش سے جاری ہوا تھا) کے سکریٹری رہے۔ اس رسالہ کے مالک اختر الدولہ سید محمد اشرف نقوی (ف ۱۹۲۹ء) مؤلف اختر شہنشاہی (لکھنؤ ۱۸۸۸ء) تھے اور یہ اختر پریس لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔ چند متفرق رسائل بھی لکھے جو اب نایاب ہیں۔ قانون سے متعلق نظائر کا مجموعہ شرع محمدی (MOHAMMADAN LAW) کا مع نظائر کے خلاصہ مقبول ہوا۔ تاریخ میں ان کی ایک کتاب "آثار بدایوں" (بدایوں ۱۹۱۵ء) یادگار ہے۔ تعلیمی اور قومی کاموں میں ان کی قابل ذکر خدمات ہیں۔ جب ندوۃ العلماء، مسلم یونیورسٹی (۱۹۱۱ء) اسلامیہ کالج بدایوں (۱۹۱۴ء) کے قیام کے سلسلہ میں تحریری و علمی کوششیں شروع ہوئیں اس میں انھوں نے بھی حصہ لیا اور فراہمی زر اور عوام میں اس تحریک کو مشتہر کرنے میں قابل ذکر خدمات انجام دیں۔ ۲۹ نومبر ۱۹۱۲ء میں وفات پائی۔ (بدایونی ۲۰۰۲ء ص ۱۸۸)

۱۔ آثار بدایوں، مطبوعہ کنز پریس بدایوں باہتمام رحمان علی اعجازی نمبر ۱۹۱۵ء ص ۱۳۵

☆۔ شہید بدایونی نے "آثار بدایوں" مطبوعہ کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

۱۵۴ـ سید احمد مولانا عبد الحمید صفر ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ء میں بدایوں میں محلہ مولوی ٹولہ میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام "ظہور محمدی" ہے۔ ابتدائی تعلیم بدایوں میں حاصل کی۔ اس کے بعد مولانا نور الحق فرنگی محلی، حکیم میر علی موہانی، شیخ عابد مدنی، شیخ عبداللہ سراج مکی، سید سلیمان، سے تحصیل علوم حاصل کی۔ طب کی تعلیم حکیم سید میر علی سے حاصل کی۔ مرید و خلیفہ اپنے پیر و مامائی کے تھے۔ ۱۲۳۵ھ میں بدایوں آئے۔ گوالیار دربار میں ملازمت کی کوشش کی اور پھر اودے پور ایک سال (۲ ص ۱۲۳۵ھ) ملازم رہے۔ پھر بدایوں آکر مدرسہ قادریہ میں درس و تدریس کا مشغلہ شروع کیا۔ جب اکتوبر ۱۸۲۳ء (۱۲۳۹ھ) میں بدایوں ضلع قرار پایا تو پہلے سرکار انگریزی کی طرف سے مفتی اور پھر کلکٹر بدایوں کے سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ یہ تعلق تقریباً چار سال رہا۔ ۱۲۵۷ھ میں حجاز مقدس میں تھے۔ ۱۲۵۹ھ تا ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۳ء تا ۱۸۴۶ء) کے دوران کچھ مدت دہلی میں مطب کیا۔ ۱۲۶۷ھ میں دوسری بار حج کے لیے گئے اور اپنے والد ماجد سے خلافت پائی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں جب بدایوں سے انگریزی نظم و نسق اٹھ گیا تو مولوی فضل رسول نے جان پر کھیل کر چند روز بدایوں کا انتظام کیا اور سرکاری خزانے کی حفاظت کی۔ جنگ آزادی کے بعد حجاز کا سفر کیا۔ خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالمجید (۱۲۵۵ھ تا ۱۲۷۷ھ۔ ۱۸۳۹ء تا

☆۔شہید بدایونی نے شرح عوارف' تذکرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

☆۔'مقولات عشر' بھی ان کی تصنیف ہے۔اس کے جواب میں مولانا حیدر علی رام پوری نے 'منتہی الکلام فی ردّ الاسلام' کے نام سے شاہ اسمٰعیل کی تائید میں لکھی۔(اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ ص ۱۲۳)

☆۔مکتوب بنام مولوی رحیم اللہ خان مع جواب آں، خطی ،مرکزی لائبریری ص ۲۲۸

دیکھیے : ((ا) قادری ۱۹۸۸ء ص ۲۱۳۔۲۱۴ (۲) خان ۲۰۰۰ء ص ۵۵۵ (۳) کل ص ۲۱۵۔۲۳۸ (۴) اشرافی ص ۳۰۵۔۳۰۳ (۵) بجلی سوم ص ۱۳۲۔۱۳۳ (۶) ۱۹۹۱ء خان ص ۲۸۳ (۷) بدایونی دوم ص ۲۲۹۔۲۲۷)

۱۵۸۔ مولانا فیض احمد بن حکیم غلام احمد ساکن مولوی محلہ شہر بدایوں میں ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ تین سال کی عمر ہوگی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔والدہ اور ماموں مولانا فضل رسول بدایونی نے ان کی تربیت کی۔علوم منقول و معقول اپنے ماموں سے حاصل کیے اور دوسرے فنون مروجہ مثلاً شاعری، خطاطی میں بھی کمال حاصل کیا۔مسند تدریس پر بھی فائز رہے۔بدایوں کے مقامی تلامذہ میں مولوی شیخ الدین عباسی، قاضی شمس الاسلام، مولوی دولت علی نقوی جلالی، مولوی حکیم غلام صفدر، مولوی محمد اسحٰق صدیقی، مولوی عنایت اللہ خلیفہ غلام حسین، مولوی نذیر احمد، مولوی نور محمد اور بدایوں سے باہر کے تلامذہ میں مولوی احمد حسن عرشی قنوجی، مولوی عبدالصمد قنوجی، مولوی فضل احمد فرخ آبادی، مولوی سراج احمد، مولوی اولاد احمد سہسوانی، مولوی امداد علی اکبر آبادی اور مولوی اسمٰعیل کے نام ملتے ہیں۔آغاز ملازمت کا حال نہیں کھلتا۔صدر نظامت آگرہ میں پہلے دوسل خواں رہے پھر پیشکار ہوئے اور آخر میں بورڈ آف ریونیو میں سررشتہ دار ہو گئے۔مناظرے بھی کیے۔انقلاب ۱۸۵۷ء میں شرکت کی اور جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد روپوشی اختیار کر لی۔

شاعری کا بھی شوق تھا۔رسا تخلص کرتے تھے۔عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں نظم و نثر میں اظہار کرتے تھے۔تصانیف کثیرہ کے مالک تھے۔طبیعت میں استغنا بدرجہ کمال تھا۔اکثر مسودات تحریرات شاگرد لے گئے اور ان کی واپسی نہ ہوئی۔بعض مسودات ۱۸۵۷ء میں ضائع ہو گئے۔آپ کی تصانیف سے علم کلام میں رسالہ 'تعلیم الجاہل' ہے جو تیر الدین قنوجی کی کتاب 'تفہیم المسائل' کے جواب میں لکھا گیا ہے۔'حاشیہ شرح ہدایۃ الحکمۃ' صدرا، شیرازی پر تعلیقات متعلق فصوص الفارابی ہیں۔اس کے علاوہ ایک جز اردو سوگیارہ اشعار عربی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی منقبت میں ہیں۔'بہار بے خار' کی طباعت کے بعد بعض حضرات کے مقدمے اور حاشیے کے ساتھ ۱۳۰۳ھ میں مطبع نسیم سحر بدایوں سے شائع ہوا۔ 'بہار بے خار' مولانا عبدالمقتدر بدایونی کے اصرار پر مولانا عبدالقادر بدایونی نے ان کے حالات میں 'تحفہ فیض' مرتب کی۔یہ کتاب تحفۃ الصلاح میرٹھ سے شائع ہوئی۔دوران ملازمت بدایت نامہ مال گزاری جلد دوم کا ترجمہ سر ولیم میور کے ہمراہ انگریزی سے اردو میں کیا۔

دیکھیے (۱) قادری ۱۹۶۷ء ص ۵۰۲۔۵۲۳ (۲) بدایونی اول ص ۲۲۲۔۲۲۳)

۳۔یہ مناقب حضرت غوث الاعظم پر مشتمل ہے۔

۱۵۹۔ مولوی قمر الحسن قمر خلف مولوی محسن علی ارشد عیدی، تخلص قمر، ۲ صفر ۱۲۹۳ھ مطابق یکم مارچ ۱۸۷۶ء میں محلہ قاضی ٹولہ بدایوں میں پیدا ہوئے۔ شاعری میں عبدالرحمٰن راسخ دہلوی سے اصلاح لی۔قمر کے شاگردوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔عروض اور بیان پر قدرت کاملہ حاصل تھی۔

محشر علی صدیقی نے انھیں روزمرہ اور محاوروں کا جادوگر کہا ہے۔ یکم جولائی ۱۹۲۱ء میں وفات پائی۔ تصانیف۔ درج ذیل تصانیف مطبوعہ ہیں۔

۱۔ داستان دوست حصہ اول و دوم ۲۔ بزم ۳۔ فرسکھا لاسفر ۴۔ مصور جذبات (دیوان اول)

۵۔ آئینہ جذبات (دیوان دوم) ۶۔ شان فاروق (سوانح حضرت فاروق اعظم)۔ درج ذیل کتب غیر مطبوعہ ہیں۔

۱۔ محاورات مومن خان مومن ۲۔ نوادرات داغ ۳۔ رسالہ قافیہ ۴۔ سچے موتی ۵۔ تصویر تمدن

۶۔ مرقع جذبات (دیوان سوم) ۷۔ ایمان گلی ۸۔ تصویر تمدن

۹۔ تصحیح القوافی (قافیہ کی بحث) ۱۰۔ مضامین (تحقیقی، تنقیدی اور اصلاحی) ۱۱۔ مضامین طنز و مزاح

۱۲۔ رسالہ ڈکیرونا سیٹ (بدایونی دوم ص ۱۴۔ ۱۵۸)

۱۴۰۔ ولادت ضیاء الدین قمر تخلص ہے۔ ۲۰ جولائی ۱۸۹۱ء میں فرشوری ٹولہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بہ سلسلہ ملازمت اکثر باہر رہا کرتے تھے۔ اس لیے آپ کی تعلیم و تربیت آپ کی والدہ کی زیر نگرانی ہوئی۔ نویں جماعت تک بدایوں گورنمنٹ ہائی سکول میں تعلیم پائی۔ میٹرک شاہجہان پور سے کیا۔ ایف۔ اے بریلی سے اور بی۔ اے علی گڑھ سے کیا۔ بی۔ اے کرنے کے بعد ہائی کورٹ میں مترجم ہو گئے۔ چند سال مدرسہ آصفیہ میں بطور ہیڈ ماسٹر کام کرتے رہے۔ پھر مہوبہ کے شہوہ پور گورنمنٹ ہائی سکول کے پرنسپل تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وطن واپس آ گئے۔ ضلع بدایوں میں چند تعلیمی اداروں سے منسلک رہے۔ پھر پروفیسر ضیاء احمد کی معیت میں لغت اردو کا کام کرنے کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔ تا آنکہ یہ کام حکومت کی طرف سے بند کر دیا گیا۔ آپ نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ کثیر التصانیف ادیب تھے۔ اکثر مسودات اشاعت کی منزل تک پہنچنے سے قبل ہی ضائع ہو گئے۔ آپ کا انتقال ۲۳ ستمبر ۱۹۷۶ء کو اچانک دل کا دورہ پڑنے سے ہوا۔ (بدایونی دوم ص ۱۵۲۔ ۱۵۳)

وفات ۲۳ ستمبر ۱۹۷۶ء۔ تصانیف۔

☆۔ گلِ عزیز (حیات مولوی عزیز مرزا) انتظامی پریس حیدرآباد ۱۹۵۱ء حصہ اول، دوم شائع نہ ہو سکا۔

غیر مطبوعہ

☆۔ سوانح معین الدین دی بائیوگرافی آف معین الدین مصنفہ ایم۔ آئی۔ حسن کا ترجمہ

☆۔ وفاداری پٹیرہ استواری۔ اے ٹیکل آف ٹرسٹیز کا اردو ترجمہ

☆۔ تاریخ تعلیم (یورپین تعلیم کی تاریخ) ☆۔ تنقیدات قمر ☆۔ شعرائے بدایوں (تنقید)

☆۔ لمعاتِ قمر (شاعری) ☆۔ انتخاب عزیز (عزیز الدین عزیز صادق کے کلام کا انتخاب)

☆۔ انتخاب قدوہ (قدوہ کے کلام کا انتخاب) ☆۔ انتخاب حاتم (اکبر علی حاتم کے قطعات کا انتخاب)

☆۔ کشکول قمر (اردو فارسی اشعار کا ضخیم انتخاب) ☆۔ اکبر و اقبال

اس کے علاوہ بہت سے مضامین رسائل میں شائع ہوئے۔ (بدایونی ۱۹۸۱ء ص ۱۵۹۔ ۱۶۲)

۱۴۱۔ بدایوں کے رہنے والے تھے۔ میر گنجیز کے نام سے مشہور تھے۔ (بدایونی دوم ص ۱۶۷)

وفات ۲ جنوری ۱۹۱۲ء۔ شاعری میں خواجہ فراق لکھنوی اور شیفتہ دہلوی کے شاگرد تھے۔ تین ضخیم نعتیہ دیوان، ایک ضخیم قلمی دیوان مدرسہ شمس
بدایونی کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔ اس میں بارہ نعتیہ قصیدے بھی ہیں۔ (زبیری ص ۱۲۲)

۱۲۷۔ علی جواد زیدی نے ان کا نام مجید الدین اللہ بدایونی اور بشارت نے مجید الدین احمد اور شہید بدایونی نے مجید الدین تحریر کیا ہے۔ تخلص عیش، ساکن محلہ سوتھہ بدایوں۔ ۸ شعبان ۱۲۸۷ھ کو بدایوں کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ ترقی کر کے قانون گو ہو گئے لیکن ملازمت سے بیزار ہو کر ملازمت چھوڑ کر گھر آ گئے اور باقی عمر اپنی زمینداری پر قناعت کر کے گزاری۔ امیر مینائی کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔ غزل، قصیدہ اور مثنوی پر یکساں عبور تھا۔ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ 'شاہنامہ اسلام' ان کی مشہور مثنوی ہے۔ بشارت نے ان کی تصنیف 'سوز تحسین' کی بھی نشاندہی کی ہے۔

دیکھیے: (۱) زبیری ص ۲۳۹ (۲) خان۔ ۲۰۰۰ء ص ۲۵۳ (۳) بدایونی دوم ص ۸۹)

۱۲۸۔ عبدالرسول محب احمد پورا نام تھا۔ شیخ حمید الدین گنوری کی اولاد میں نسلاً شیخ صدیقی تھے۔ بدایوں میں پیدا ہوئے اور مولانا شاہ عبدالقادر اور مولانا نور احمد عثمانی سے تحصیل علم کی۔ مولانا شاہ ابوالحسین احمد نوری مارہروی سے بھی اکتساب کیا تھا۔ مولانا شاہ فضل رسول کے مرید تھے۔ تحریک رد وہابیت میں اپنے استاد کے شانہ بشانہ رہے۔ اردو اور فارسی میں متعدد کتابیں لکھیں۔ ابتدا جامعہ برکاتیہ مارہرہ میں درس دیا بعد میں مدرسہ شمس العلوم بدایوں میں شیخ الحدیث رہے۔ ۱۰ محرم/ ۱۱ اکتوبر ۱۳۲۱ھ کو وفات پائی۔ مدفن درگاہ قادری کے احاطے میں ہے۔

((۱) اشرفی ص ۳۲۷۔ ۳۳۶ (۲) قادری، ۱۹۸۲ء)

۱۲۹۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۳ء فالج کے مرض میں انتقال کیا۔ 'علی گڑھ منتھلی'، 'دائرہ'، 'دکن ریویو'، 'تہذیب' اور 'ہمدرد' کے ادوار کے ممتاز لکھنے والوں میں تھے۔ ((۱) زبیری ص ۱۲۷۔ ۲۲۹ (۲) خان۔ ۲۰۰۰ء ص ۵۳۹)

۱۳۰۔ علمائے سلف کی یادگار تھے۔ انھوں نے شیخ عبدالقادر جیلانی کے مواعظ و خطبات کا اردو میں ترجمہ کیا جو 'سیف ربانی' کے نام سے چار جلدوں میں بمبئی سے شائع ہوا۔ (قادری، ۱۹۸۲ء ص ۱۸۵)

۱۳۲۔ بدایوں کے مشہور عثمانی خاندان کے رکن تھے۔ علوم متداولہ کی تحصیل مولانا فیض احمد بدایونی سے کی۔ مراد آباد اور دہلی کے علما سے بھی استفادہ کیا۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی سے عقیدت و ارادت رکھتے تھے۔ مولانا کفایت علی کافی مراد آبادی سے بھی خاص تعلق تھا۔ مولانا کافی مراد آبادی نے مولوی محمد اسحاق کے ایک رسالے کی بنیاد پر اپنا ایک رسالہ 'داستان' نظم کیا۔ عربی میں 'منازل البرکات' لکھی۔ ۱۲۹۷ھ (۸۰۔۱۸۷۹ء) میں انتقال ہوا۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ تصانیف

۱۔ ہدیۃ البرکات فی فضل لیلۃ البرات۔ تالیف ۱۲۶۷ھ مطبع حسنی شیخ گڑھ ۱۲۹۰ھ

☆۔ سراج اہاج فی لیلۃ المعراج (تفصیل: قادری، ۱۹۸۸ء ص ۵۱۳۔ ۵۱۴)

۱۳۳۔ مولوی محمد افضل ولد مولوی محمد تاج الدین بن مولانا وجیہ الدین بن حافظ محمد افضل نسلاً شیخ صدیقی تھے۔ ابوبکر صدیق کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کے آبا و اجداد سنبھل ضلع مراد آباد کے علما و روسا میں شمار کیے جاتے تھے اور شاہان وقت سے جاہ و منصب سے سرفراز کیے گئے۔ آپ

کے دوا بارھویں صدی ہجری میں قصبہ سنبھل کی سکونت ترک کر کے بدایوں آ گئے تھے۔ مولوی افضل بھی بدایوں میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مولوی عبدالغنی عثمانی سے حاصل کی۔ علوم و فنون میں اچھی دست گاہ رکھتے تھے۔ فارسی انشاپردازی میں کمال حاصل تھا۔ سید شاہ آل احمد مارہروی عرف اچھے میاں کے مخصوص مریدوں میں تھے۔ خلافت سے بھی سرفراز ہوئے۔ شعر و سخن سے بھی رغبت تھی۔ افضل تخلص تھا۔ خوشنویسی میں مہارت حاصل تھی۔ آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید خطاطی کے بہترین نمونوں میں شمار ہوتا ہے۔ ۲۹ ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ مطابق ۹ جنوری ۱۸۴۵ء کو وصال ہوا تھا۔ مزار گاؤں وہیں ان شہر جانب غرب متصل قاضی حوض ہے۔ (اشرفی، ص ۲۹۔۲۸۹)

ا۔ سید شاہ آل احمد مارہروی کے حالات اور کرامات کو فارسی میں قلمبند کر کے ہدایت الخلق نام رکھا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ حکیم حاجی الدین متولی نے صحیفۂ الخلق کے نام سے کیا تھا۔ (ایضاً)

۱۷۵۔　ا۔ یہ نسخہ کتب خانہ قادریہ بدایوں میں محفوظ ہے۔ (قادری ۱۹۷۶ء، ص ۲۷۶)

۱۷۶۔　سید محمد زکریا خان نبیرہ نواب معظم الدولہ میر محمد خان سرور دہلوی اور سید محمود خان محمود کے صاحب زادے تھے۔ والد صاحب دیوان شاعر تھے۔ سادات کشمیر سے تھے۔ ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم دہلی میں ہوئی۔ فارسی، عربی، منطق، ریاضی وغیرہ علوم غالب، صہبائی اور پنڈت رام کشن آنگل سے حاصل کیے۔ حافظ قرآن بھی تھے۔ فن طب، حدیث، فقہ، تصوف، نجوم وغیرہ میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ موسیقی اور خوشنویسی سے بھی لگاؤ تھا۔ ۱۸۵۷ء میں دہلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ محکمۂ تعلیم کی ملازمت اختیار کی اور بتدریج ترقی کر کے صوبہ یوپی کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے تک پہنچے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بدایوں ہی کو مستقل جائے قیام بنایا۔ شاگردوں میں مولوی حشمت اللہ حشمت، پنڈت جوہرا تھ کول ساقی، سید احمد دہلوی اور ڈاکٹر تصدق حسین قابل ذکر ہیں۔ ان کو مرزا نے اپنی تحریر میں جوذکی کے مطبوعہ دیوان میں شامل ہے اچھا شعر کہنے والا اور اپنا شاگرد لکھا ہے۔ الٰہ آباد، دہلی، گورکھپور اور آخر عمر میں بدایوں میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے ہوا ہیں ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء میں وفات پائی اور حضرت سید احمد صاحب والد نظام الدین اولیا کی درگاہ میں دفن ہوئے۔

دیکھیے: (۱) مسعود، ص ۱۲۸ (۲) خان ۲۰۰۰ء، ص ۲۸۹ (۳) یو ایم پی ۱۹۸۱ء، ص ۵۵۔۵۲ (۴) یو ایم پی اول، ص ۳۲۹۔

۱۸۰۔　والدیت شیخ محمد تحسین۔ ولادت ۱۸۷۵ء بدایوں (شاعر، ناول نگار، ادیب) تلمیذ محمد زکریا خان ذکی۔ وفات ۲۱ جولائی ۱۹۳۴ء بدایوں۔

تصانیف

☆۔ خون ناحق　　☆۔ رئیس الطالب　　☆۔ لال بی بی (ناول)　　☆۔ مرزا چوں چوں بیگ (ناول)

☆۔ معرکہ ماہ عزیز (خان ۲۰۰۰ء، ص ۵۹۱)

۱۸۲۔　مولوی محمد یعقوب بن یار حسین۔ ۲۴ رجب ۱۳۰۰ھ مطابق ۳ جون ۱۸۸۳ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام محمد فضل رحمٰن ہے۔ جس سے ۱۳۰۰ھ برآمد ہوتے ہیں۔ بشارت نے محمد فضل الرحمٰن تحریر کیا ہے جو درست نہیں۔ چار سال کی عمر میں والد فوت ہو گئے۔ ان کے بعد خالو مولانا احمد علی خان اسیر بدایونی نے انتظام کیا۔ مولانا ضیاء کے مورث اعلیٰ خواجہ عبداللہ چشتی بدایوں کے ممتاز عالم اور مشہور محدث اور مفسر تھے۔ ضیاء نے قرآن، فقہ، حدیث، تفسیر کی تعلیم حاصل کی۔ دس سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ ۳۵ سال سرکاری ملازمت سے منسلک رہے۔ شکیل بدایونی، مظفر صابری، ماہر القادری، طالب انصاری، بشر بدایونی، سحر اکبر آبادی اور رضا قریشی کے نام ممتاز شاگردوں

میں شمار ہوتے ہیں۔ نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ ان کی نظمیں اور مضامین علمی حلقوں میں پسند کیے جاتے تھے۔ ۱۳۶۷ھ میں حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس سفر کے حالات نظم میں مرتب کیے۔ (شاعر، ادیب، مورخ، عالم دین) شاعری میں اپنے خالو امیر بدایونی کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۵ اگست، ۱۹۶۷ء کراچی میں ہوئی۔

۲۔ اکمل التاریخ، مطبع قادری پریس بدایوں، ۱۹۱۵ء ص ۱۳۲ جلد اول

۲۔ اکمل التاریخ، مطبع قادری پریس بدایوں، ۱۹۱۲ء ص ۲۳۸ جلد دوم

۳۔ بشارت نے اس کتاب کا نام مجموعہ حالات احمد تحریر کیا ہے۔

۵۔ بشارت نے اس کتاب کا نام مرقع شہادت تحریر کیا ہے۔

۸۔ تجلیات نعت یا مجموعہ اوصاف خیر الوریٰ ﷺ، ستارہ بک ڈپو دہلی، دوم جولائی ۱۹۵۵ء ص ۲۲۴

بشارت نے درج ذیل دو کتابوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔

☆ آثار بے خودی ☆ شب حضوری دیکھیے: (۱) خان، ۲۰۰۰ء ص ۱۳۹ (۲) مقدمہ مزامیر قادری ص ۸-۷)

۱۸۴۔ شیخ نظام الدین میر محمدی نام اور بیدار تخلص۔ ۱۱۳۲ھ میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ معین الدین تھا۔ جن کا سلسلہ نسب چودہ واسطوں سے حضرت گنج شکر سے ملتا ہے۔ کم سنی ہی میں تعلیم کی غرض سے دہلی آ گئے تھے۔ نوجوانی ہی میں لباس درویشی اختیار کر لیا۔ اپنے مرشد مولانا فخر الدین کے ارشاد پر دہلی سے اکبرآباد (آگرہ) جا کر شیخ سلیم چشتی کے سجادہ و مزار کے زینت بخش اور وہیں وفات پائی۔

۳ جولائی ۱۷۹۳ء میں آگرہ میں فوت ہوئے۔ مرتبہ نجیب احسن مارہروی نے وفات ۱۲۰۹ھ۔ ۱۷۹۴ء تحریر کی ہے۔ (صاحب دیوان، ص ۵۵)

ا۔ دیوان بیدار، مخطی مکتوبہ ۱۲۲۱ھ از نجیب احسن مارہروی ص ۱۷ دو نسخے (ص ۱۷، ۱۵۸)

۱۸۶۔ والد کا نام عبد القادر اور دادا کا نام فضل رسول تھا۔ مشاہیر فقہائے احناف میں شمار ہوتا تھا۔ اصل مشغلہ تصنیف و تالیف اور فتویٰ نویسی تھا۔ اس میں نام پیدا کیا۔ ۔۔۔۔ کی خاص نقطہ نظر سے وضاحت کی۔ بعض کتابوں پر حواشی تحریر کیے۔ ۱۲۴۳ھ میں پیدا ہوئے۔ مظہر حق تاریخی نام ہے۔ کتب درسیہ معقول و منقول والد صاحب سے پڑھیں۔ شرف بیعت اپنے جد امجد سے ہوئے اور خلافت والد ماجد سے حاصل کی۔ ۱۹ ذی قعدہ ۱۲۷۰ھ مطابق ۳۱ جولائی ۱۸۵۴ء میں سہارن پور میں انتقال فرمایا اور جوار شاہ نور صاحب مدفون ہوئے۔ رضی الدین بسمل نے 'رسالہ شمس الایمان' بھی نام تحریر کیا ہے ممکن ہے اس کا دوسرا نام 'شمس الایمان' بھی ہو۔ دیکھیے: (۱) بسمل، ص ۲۴۳ (۲) بجلی، سوم ص (۲۸۷-۲۸۸)

۱۸۷۔ ساکن بدایوں۔ ۱۹۳۲ء میں ماہر کنتوری کی شاگردی اختیار کی۔ سرکاری ملازمت میں کراچی میں رہے۔ (بدایوں، ص ۳۱۵)

۱۸۸۔ حکیم مختار احمد سبزواری خلف مولانا حکیم حافظ احمد ظہیری بدایونی۔ ۱۲ فروری ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۷ جولائی ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۳ء میں اردو فاضل کا امتحان پاس کیا۔ پھر عربی کی تعلیم مولانا حبیب الرحمن قادری، حکیم اعجاز احمد مجددی سہوانی سے حاصل کی۔ ابھی درس نظامی کی تکمیل باقی تھی کہ کلکٹری بدایوں میں تقرر ہو گیا۔ بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ ۱۹۱۸ء میں فانی بدایونی کی شاگردی اختیار کی۔ حکیم حاذق اور شمس الاطبا کے امتحان پاس کیے۔ اس کے بعد ملازمت ترک کر کے طب کے پیشے سے وابستہ ہو گئے اور نہایت کامیاب مطب کیا۔ ۱۹۶۷ء

میں ایک حادثہ میں ٹانگ ٹوٹ گئی۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، تصانیف یہ ہیں۔

☆۔ واقعات آزادی ہند۔ اس کتاب پر سررشتہ تعلیم متحدہ گورنمنٹ یو۔پی نے نظر ثانی کی۔

☆۔ طب یونانی کا اردو ترجمہ: ۱۹۳۰ء ☆۔ حیات فانی ☆۔ سیار نگار قیصری (بدایونی) (دوم ص ۲۱۱)

۱۹۴۔ ا۔ شہید بدایونی نے اسے ۱۳۲۸ھ مطبوعہ بتلایا ہے۔ (ص ۷)

۱۹۵۔ مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی۔ ساکن محلہ سوتھہ بدایوں۔ ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ سر راس مسعود نے ۱۲۹۶ھ ۔ ۱۸۸۰ء ۔ ۱۸۷۹ء بھی تاریخ تحریر کی ہے۔ اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔ ۱۸۹۲ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور انگلش کے محکمے میں ملازمت اختیار کر لی۔ سات آٹھ سال بعد ملازمت سے استعفا دے دیا۔ مہاراجی بیخود بدایونی کے توجہ دلانے سے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ پہلے بیخود موہانی اور پھر حالی سے اصلاح لی۔ زمانہ طالب علمی ہی سے اخبارات میں لکھتے تھے۔ قومی تعلیم کے مسئلہ پر بھی خامہ فرسائی کی۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جوائنٹ سکریٹری رہے۔ سنٹرل ہائی سکول، سٹی جنرل بورڈ اوقاف کے لیے کام کیا۔ ۱۹۰۳ء میں بدایوں سے اخبار ذوالقرنین نکالا۔ ۱۹۱۲ء میں کلیات شیفتہ مرتب کیا۔ اور بسیط مقدمہ لکھا۔ یہ کلیات شیفتہ کے صاحبزادے نواب محمد اسحاق خاں کے ایما سے نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا۔ ۱۸۹۲ء میں ایک مثنوی 'صبح میلاد' کہی اور اصلاح کے لیے حالی کے پاس بھیجی۔ حالی نے انھیں قومی اور اصلاحی نظمیں لکھنے کا مشورہ دیا۔ غزل گوئی ترک کر کے نعت، منقبت اور اخلاقی نظمیں کہنی شروع کیں۔ ۵۵ سال کی عمر میں ۸ جون ۱۹۲۷ء کو بدایوں میں وفات پائی۔ (تذکرہ ص ۲۲۸۔۲۳۲)

۲۔ تجلیات سخن، نظامی پریس بدایوں، ۱۹۳۰ء

درج ذیل کتب بھی ان سے یادگار ہیں۔

☆۔ شرح دیوان غالب، نظامی پریس بدایوں، ۱۹۱۷ء

☆۔ دیوان غالب، مرتبہ نظام الدین حسین نظامی، ۱۹۱۵ء ص ۲۰۴۔ ۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۷ء تک چھ ایڈیشن شائع ہوئے۔

☆۔ ایضاً، دوم (مع دیباچہ و شرح) ۱۹۱۸ء ص ۲۰۸

☆۔ ایضاً، سوم (۔ ایضاً و مقدمہ محمود) ۱۹۲۰ء ۱۴۸ / ۲۵۶

☆۔ ایضاً، چہارم (۔ ایضاً) ۱۹۲۲ء ص ۳۳۳

☆۔ ایضاً، پنجم (۔ ایضاً) ۱۹۲۳ء ص ۳۳۳

☆۔ لائبریری ایڈیشن (مع دیباچہ و خود نوشت سوانح عمری و فرہنگ، مقدمہ سے عاری) ۱۹۲۳ء ص ۱۲۸

☆۔ ایضاً، ششم (مع دیباچہ، مقدمہ و شرح) ۱۹۲۷ء ۴۰ / ۲۷۲

☆۔ نکات غالب، نظامی پریس بدایوں بار اول ۱۹۲۰ء، دوم ۱۹۲۲ء، سوم ۱۹۲۷ء، چہارم ۱۹۵۷ء، پنجم ۱۹۵۹ء

☆۔ نکات غالب مع نکات لطائف و ظرائف، بعد نظر ثانی و اضافہ جات مولوی احمد الدین نظامی، نظامی پریس

بدایوں بار سوم ۱۹۵۹ء بار سوم

تھا۔ ایک عرصہ کونسل کے ممبر رہے۔ کانگریس کی حکومت میں صوبہ متحدہ کے کئی سال تک پارلیمنٹری سیکریٹری برائے وزارت انڈسٹری رہے۔ ۱۰ جنوری ۱۹۶۷ء کی شب ۲ بجے وفات پائی۔ مفرد تاریخ نے وفات کی تاریخ ۱۱ جنوری تحریر کی ہے۔ تقریباً سترہ کتابیں تحریر کیں۔ شاعر بھی تھے۔ تصانیف

۱۔ تذکرہ حکومت السلطین (فارسی) تاریخ روہیل کھنڈ قلمی نسخہ مخزونہ رضا لائبریری رامپور۔ (بدایونی ۲۰۰۷ء ص ۱۱۲)

۲۔ آئینہ جہاں نما (فارسی) بلاد و امصار کے بیان میں مخزونہ ذاتی کتاب خانہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری

۱۔ اسلام مشرق میں، ادارہ اشاعت، کراچی

۲۔ تصوف کی اصلیت، نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۸ء۔ شہید بدایونی نے کتاب کا نام تصوف اور اس کی اصلیت تحریر کیا ہے۔

۳۔ جمال صابر کلیری، نظامی پریس بدایوں ۱۹۱۷ء

۴۔ گرداب (سیاسی و ادبی مضامین) نامی پریس لکھنؤ ۱۹۲۸ء یہی کتاب نیا نذیر پریس لکھنؤ سے بھی شائع ہوئی۔

درج ذیل کتابیں بھی ان سے یادگار ہیں۔

☆۔ تصوف (امام شعرانی کے دیباچہ کا ترجمہ) اشتیاق پریس بدایوں ۱۳۲۹ھ ☆۔ منصوری، مجیب پریس بدایوں ۱۹۱۲ء

☆۔ محبت کی پابندیاں (ڈرامہ) نظامی پریس بدایوں ۱۹۱۵ء ☆۔ سوانح خواجہ معین الدین، سلیمان اکیڈمی کراچی ۱۹۶۱ء

☆۔ نشہ کا انجام (ڈرامہ) نظامی پریس بدایوں ۱۹۱۷ء ☆۔ سید احمد شہید رائے بریلی کی صحیح تصویر، مکتبہ مسعود لاہور ۱۹۲۷ء بار دوم

☆۔ آنریری مجسٹریٹ (ظریفانہ) ☆۔ بخاری (تعارف درگاہ حضرت بابا فرید الدین) ۱۹۵۴ء

☆۔ انتخاب رسالہ ترغیب، ناظر ایجنسی لکھنؤ ☆۔ مختصر سیر ہندوستان (فارسی ۱۸۸۵ء۔ ۱۸۵۰ء) کا مہر ہند کے ذکر میں مخزونہ

ڈاکٹر ایوب قادری

درج ذیل کتب غیر مطبوعہ ہیں۔

☆۔ صابری تعلیمات ☆۔ سواد السبیل ☆۔ ام پر چھائیں ☆۔ عقل و عقیدہ

دیکھیے: (۱) بدایونی ۲۰۰۷ء ص ۱۱۲ (۲) بدایونی ۱۹۸۱ء ص ۱۲۸۔ ۱۴۰

۲۰۴۔ آپ کا تعلق بدایوں کے حمیدی خاندان سے ہے۔

۱۔ تذکرہ حکومت السلطین (فارسی) تاریخ روہیل کھنڈ قلمی نسخہ مخزونہ رضا لائبریری رامپور (بدایونی ۲۰۰۷ء)

۲۔ آئینہ جہاں نما (فارسی) بلاد و امصار کے بیان میں مخزونہ ذاتی کتب خانہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری

اس کے علاوہ "مختصر سیر ہندوستان" (فارسی ۱۸۸۵ء۔ ۱۸۵۰ء) کا مہر ہند کے ذکر میں مخزونہ ایضاً

فہرست اسناد محولہ

۱۔ اردو انجمن ترقی، ۱۹۸۱ء، مرتبہ، قاموس الکتب، جلد دوم، دینیات، کراچی، انجمن ترقی اردو، اول۔

۲۔ اشرفی، ضیا علی خان، ۱۹۷۶ء، 'مردانِ خدا'، نامی پریس لکھنؤ

۳۔ اکادمی، اترپردیش اردو، ۱۹۸۳ء، مرتب، 'دستاویز'، لکھنؤ، اترپردیش اردو اکادمی، اول۔

۴۔ اقبال، ڈاکٹر ظفر، ۱۹۹۸ء، 'فہرست مخطوطات اردو قومی عجائب گھر پاکستان کراچی'، کراچی، ادارہ کتابیات، اول۔

۵۔ امروہوی، سید محمود حسین قیصر، مرتب، ۱۹۸۳ء، 'فہرست مخطوطات مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ذخیرہ احسن مارہروی'، علی گڑھ، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

۶۔ انجم، ڈاکٹر خلیق، ۱۹۹۰ء، مرتب، 'اختر انصاری: شخص اور شاعر'، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو۔

۷۔ انصاری، ڈاکٹر محمد ضیاء الدین، ۲۰۰۳ء، مرتب، 'آثار آل احمد سرور'، پٹنہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔

۸۔ بدایونی، محشر، دسمبر ۱۹۶۲ء، 'شاعر نامہ'، کراچی، روپیکا پبلی کیشنز، اول۔

۹۔ بدایونی، شمس، اگست ۱۹۸۱ء، 'دید و دریافت'، بدایوں، روشن پبلی کیشنز۔

۱۰۔ ـــــ، شمس، جنوری ۲۰۰۱ء، 'نقد و اثر'، نئی دہلی، اردو بک ریویو، ناشر مصنف، اول

۱۱۔ ـــــ، ستمبر ۱۹۹۸ء، 'نظامی بدایونی اور نظامی پریس'، کراچی، مشمولہ نگار۔

۱۲۔ ـــــ، ۲۰۰۷ء، 'عہد غالب کا بدایوں'، دہلی، مشمولہ فکر و تحقیق۔

۱۳۔ بدایونی، سید شہید حسین شہید، ۱۹۸۷ء، 'تذکرہ شعرائے بدایوں' جلد اول، دوم، کراچی، مطبوعات بدایوں اکیڈمی، سلسلہ ۲

۱۴۔ بدایونی، ضمیر علی، ۲۰۰۶ء، 'مابعد جدیدیت کا دوسرا رخ'، کراچی، شہرزاد۔

۱۵۔ بسمل، رضی الدین، ۱۹۰۷ء، 'تذکرۃ الواصلین'، بدایوں

۱۶۔ بھٹی، محمد اسحاق، ۱۹۸۲ء، 'فقہائے ہند، تیرھویں صدی' جلد اول، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، اول۔

۱۷۔ ـــــ، ۱۹۷۵ء، 'فقہائے ہند، چودھویں صدی' جلد دوم، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ۔

۱۸۔ ـــــ، ۱۹۸۹ء، 'فقہائے ہند، چودھویں صدی' جلد سوم، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ۔

۱۹۔ پٹنہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۳ء، 'خدا بخش جرنل'، پٹنہ، جرنل ۷۲۔۶۹۔

۲۰۔ تبسم، ڈاکٹر توصیف، اکتوبر ۲۰۰۹ء، 'مجاہد شاعر حسرت موہانی'، لاہور، مجلس ترقی ادب۔

۲۱۔ جوہر، مرزا احمد شاہ بیگ، ۱۸۹۳ء، 'مددگار نظم معروف بہ تاریخ سخن'، مرادآباد، ایس ایم علی، اخبار نیر اعظم۔

۲۲۔ حسین، زوار، 'مصنفین اردو'، دہلی، حالی پبلشنگ ہاؤس۔

۲۳۔ حفیظ الرحمن، ڈاکٹر قاری، س۔ن، 'مشاہیر علما'، لاہور، فرنٹیئر پبلشنگ کمپنی، اول۔

۲۴۔ خاتون، ڈاکٹر حمیدہ، ۲۰۰۳ء، 'بیسویں صدی کے اردو مصنفین'، دہلی، بھارت آفسیٹ، اول۔

۲۵۔ خان، محمد بشارت علی، ۲۰۰۰ء، 'وفیات مشاہیر اردو' (حصہ اول)، نئی دہلی، گلکشتا آفسیٹ پریس۔

۲۶۔ خان، نادر علی، ۱۹۹۰ء، 'ہندوستانی پریس'، لکھنؤ، اترپردیش اردو اکادمی۔

۲۷۔ خاں، عبدالسلام، ۱۹۹۶ء، 'برصغیر کے علمائے معقولات اور ان کی تصنیفات'، پٹنہ، مشمولہ خدا بخش جرنل، (۱۰۳)۔

۲۸۔ خورشید، ڈاکٹر عطا، ۱۹۹۵ء، 'علی گڑھ مسلم لائبریری کے مخطوطات کی توضیحی فہرست'، پٹنہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔

۲۹۔ رابعہ فاطمہ، نومبر ۱۹۷۵ء، 'اردو فکشن کی وضاحتی فہرست'، دہلی، کوہ نور پریس۔

۳۰۔ رام، لالہ سری، ۱۹۰۸ء، 'خمخانۂ جاوید'، جلد اول، لاہور، ہمدرد پریس۔

۳۱۔ ـــــ، ۱۹۱۱ء، 'خمخانۂ جاوید'، جلد دوم، لاہور، رائے گلاب سنگھ پریس۔

۳۲۔ ـــــ، ۱۹۱۷ء، 'خمخانۂ جاوید'، جلد سوم، دہلی، دلی پرنٹنگ پریس۔

۳۳۔ ـــــ، ۱۹۲۶ء، 'خمخانۂ جاوید'، جلد چہارم، دہلی، ہمدرد پریس، دہلی۔

۳۴۔ ـــــ، ۱۹۴۰ء، 'خمخانۂ جاوید'، جلد پنجم، دہلی، [illegible] پریس، دہلی۔

۳۵۔ رام، مالک، ۱۹۹۱ء، 'تذکرۂ ماہ و سال'، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔

۳۶۔ رشید الدین، مارچ ۱۹۸۸ء، 'ذکرِ رفتگاں'، حیدرآباد، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔

۳۷۔ زاہد القادری، جولائی ۱۹۵۵ء، تقدیم، 'تجلیات نعت'، مصنف ضیاء القادری، دہلی، آستانہ بک ڈپو، دوم۔

۳۸۔ زور، ڈاکٹر محی الدین قادری، ۱۹۸۳ء، 'تذکرہ مخطوطات اردو'، جلد اول، دوم، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو۔

۳۹۔ زیدی، ڈاکٹر علی جواد، ۱۹۸۳ء، 'قصیدہ نگاران اتر پردیش'، لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکادمی، دوم۔

۴۰۔ سرور، آل احمد، ۱۹۹۱ء، 'خواب باقی ہیں'، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس۔

۴۱۔ سہیل، ادیب، دسمبر ۱۹۹۳ء، 'محشر بدایونی'، کراچی، قومی زبان۔

۴۲۔ صابر دت، (مرتب)، ۱۹۹۴ء، 'کوائف نمبر، فن اور شخصیت'، بمبئی، ساحر پبلشنگ ہاؤس۔

۴۳۔ صابری، امداد، ۱۹۷۹ء، 'فرنگیوں کا جال'، دہلی، دوم۔

۴۴۔ صدیقی، احمد حسین، ۲۰۰۳ء، 'دبستانوں کا دبستان' کراچی، جلد اول، کراچی، احمد حسین اکیڈمی۔

۴۵۔ صدیقی، شاہ الحق، شمس الدین احمد حنفی، مرتب، ۱۹۸۶ء، 'یادگار ایوب قادری'، کراچی، ایجوکیشنل پریس۔

۴۶۔ صدیقی، محمد اکبر الدین، دسمبر ۱۹۵۹ء، مرتب، 'فہرست کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو'، جلد دوم، حیدرآباد، مطبع ابراہیمیہ۔

۴۷۔ ـــــ، دسمبر ۱۹۶۳ء، مرتب، 'فہرست کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو'، جلد سوم، حیدرآباد، سلسلہ ادارہ ادبیات اردو نمبر ۲۹۰۔

۴۸۔ صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، ۱۹۸۱ء، 'اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ'، کراچی، مقتدرہ قومی زبان، اول۔

۴۹۔ صدیقی، ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر، دسمبر ۲۰۰۰ء، 'عہد اکبری کی کتاب نقد'، پٹنہ، مشمولہ خدا بخش جرنل (۲۲)۔

۵۰۔ صفا، عبدالحی، ۱۸۹۱ء، 'تذکرۂ شمیم سخن'، اول، لکھنؤ، مطبع منشی نول کشور، دوم۔

۵۱۔ ـــــ، ۱۲۹۸ھ، 'تذکرۂ شمیم سخن'، دوم، مراد آباد، مطبع امداد الہند و محسن الاخبار۔

۵۲۔ ضیغم، محمد عبداللہ خاں، ۱۸۸۵ء، 'یادگار ضیغم'، حیدرآباد، مطبع گلزار دکن۔

۵۳۔ علی، رحمان، نومبر ۱۹۱۴ء، 'تذکرۂ علمائے ہند'، لکھنؤ، مطبع منشی نول کشور، دوم۔

۵۴۔ غزالی، ڈاکٹر عمر، ۲۰۰۵ء، 'مرشد آباد لائبریری کے اردو مخطوطات کی توضیحی فرہنگ'، کلکتہ، ناشر ایاز غزالی۔

۵۵۔ قادری، ڈاکٹر محمد ایوب، ۱۹۷۶ء، 'جنگ آزادی ۱۸۵۷ء واقعات اور شخصیات'، کراچی، پاک اکیڈمی۔

۵۶۔ ـــ، 'مصنفین بدایوں کی تصانیف'، قلمی مسودہ محفوظ کردہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، اسلام آباد۔

۵۷۔ ـــ، ۱۹۸۸ء، 'اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ'، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، اول۔

۵۸۔ ـــ، مارچ ۸۲ء، 'بدایوں کے حمیدی خاندان کی علمی و ادبی روایات'، اعظم گڑھ، معارف۔

۵۸۔ لکھنوی، سید افضل حسین ثابت، ۱۹۱۵ء، 'حیات دبیر'، لاہور، جارج سٹیم پریس، اول۔

۵۹۔ مسعود، ڈاکٹر راس، ۱۹۲۶ء، 'انتخاب زرین'، بدایوں، مطبوعہ نظامی پریس، دوم۔

۶۰۔ معین الحق، سید، ۱۹۷۲ء، مرتب، 'منتخبات الرشید مصنفہ عبدالقادر بدایونی'، لاہور، ادارہ تحقیقات پاکستان، پنجاب یونیورسٹی۔

۶۱۔ معین الرحمن، ڈاکٹر سید، مئی ۲۰۰۲ء، 'سرور بدایونی'، لاہور، ماہنامہ چٹک۔

۶۲۔ منیر، سید اسمٰعیل حسین، ۱۸۷۹ء، 'کلیات منیر'، لکھنؤ، مطبع ثمر ہند۔

۶۳۔ ندوی، ڈاکٹر حامد اللہ، ۱۹۹۰ء، 'کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے اردو مخطوطات'، نئی دہلی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔

۶۴۔ ندوی، سید سلیمان، ـــ، 'اردو نقشاں'، کراچی۔

۶۵۔ نقوی، ڈاکٹر حنیف، جون ۲۰۰۷ء، 'محاکمہ تسلیم سہسوانی بہ مقدمہ جدید و انیس'، کراچی، قومی زبان۔

۶۶۔ ـــ، ۲۰۰۳ء، 'میر و مصحفی'، بنارس، ناشر مصنف۔

۶۷۔ ـــ، ۱۹۹۹ء، 'رجب علی بیگ سرور، چند تحقیقی مباحث'، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو۔

۶۸۔ نوشہروی، ابو یحییٰ امام خاں، ۱۹۳۸ء، 'تراجم علمائے حدیث ہند'، دہلی، جید برقی پریس، اول۔

۶۹۔ ـــ، ۱۳۹۱ھ، 'ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات'، جمع و ترتیب حنیف یزدانی، چیچہ وطنی، مکتبہ نذیریہ ۳۹ ج ب۔

۷۰۔ ہاشمی، نصیر الدین، ۱۹۶۱ء، 'کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات' (جلد اول)، حیدرآباد، مطبع ابراہیمیہ، اول۔

۷۱۔ ـــ، ۱۹۶۱ء، 'کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات' (جلد دوم)، حیدرآباد، مطبع اعجاز مشین پریس، حصہ اول۔

Abstract

Badayon is known as one of the oldest cities in Hindustan which has been the center of scholors, jurisprudents, mystics, literary figures and poets. This city gave birth to many well known

personalities and was called "Madinatul awliya and Ka'batul Islam. Many "Tazkaras" have been written on the celebrated people of Badayon. These "Tazkaras" were either about the saints and mystics or the poets. Hardly any "Tazkara" is available on the prose writers of the region. Dr. Muhammad Ayyub Qadri had stepped forward to compile a "Tazkara" of the writers of Badayon. In this regard, he had started taking notes from several texts of histories, relevant tazkirahs and indirect sources. But his sudden death did not permit him to complete this work. These notes have been compiled and edited in the present article. Notes and annotations have enhanced the academic quality and contents of the article. This Tazkara throws lights on the academic, religious and literary history of the writers of Badayon and becomes a primary source for researchers.

معیار: علمی و تحقیقی مجلہ، شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد ۲، شمارہ ۲، جولائی-دسمبر ۲۰۰۹ء

مکاتیب گیان چند بنام رفیع الدین ہاشمی

ترتیب و تحشیہ: ارشد محمود ناشاد*

[۱]

ڈاکٹر گیان چند جین محقق، نقاد، ماہرِ لسانیات، شاعر، ادیب اور ادبیاتِ اُردو کے استاد تھے۔ ان کی تدریسی اور تصنیفی و تالیفی زندگی پچاس سال کے طویل عرصے پر پھیلی ہوئی ہے۔ گیان چند جین ۱۹؍ ستمبر ۱۹۲۳ء کو سیوہارہ ضلع بجنور [یوپی] میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام لالہ بہال سنگھ تھا۔ ڈاکٹر جین نے ۱۹۳۷ء میں ہدرت ہائی سکول سیوہارہ سے مڈل، ۱۹۳۹ء میں مشن ہائی سکول مراد آباد سے میٹرک، ۱۹۴۱ء میں گورنمنٹ انٹر کالج مراد آباد سے ایف اے اور ۱۹۴۳ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کے امتحانات پاس کیے۔ ۱۹۴۵ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے اُردو اور ۱۹۵۷ء میں آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے سوشیالوجی کا امتحان پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے پاس کیا۔ ۱۹۴۸ء میں ''اُردو کی نثری داستانیں'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر الہ آباد یونیورسٹی سے ڈی فل کی ڈگری حاصل کی۔ ڈی فل میں ان کے نگرانِ مقالہ پروفیسر سید ضامن علی تھے۔ ۱۹۶۰ء میں آگرہ یونیورسٹی سے ''اُردو مثنوی شمالی ہند میں'' کے موضوع پر گراں قدر مقالہ لکھ کر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر جین نے تدریسی زندگی کا آغاز ۱۹۵۰ء میں حمیدیہ کالج بھوپال سے بطور لیکچرر کیا۔ وہ پندرہ برس اس ادارے سے وابستہ رہے اور پروفیسر و صدر شعبہ کے منصب تک پہنچے۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں جموں یونیورسٹی چلے گئے وہاں دس سال تک شعبۂ اُردو میں خدمات انجام دیں۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں الہ آباد یونیورسٹی اور بعد ازاں مارچ ۱۹۷۹ء میں سینٹرل یونیورسٹی، حیدر آباد میں اُردو کی تدریس کا فریضہ ادا کیا۔ فروری ۱۹۸۷ء میں مدتِ ملازمت پوری ہوئی مگر یونیورسٹی نے ان کی ملازمت میں چودہ ماہ کی توسیع کی۔ اس طرح وہ اپریل ۱۹۸۹ء تک یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد انھوں نے لکھنؤ میں اپنا گھر بنوایا اور بقیہ زندگی وہیں بسر کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ ۱۹۹۰ء میں لکھنؤ چلے گئے مگر چھے سات سال وہاں رہنے کے بعد اولاد کی خواہش پر ۲۲؍ دسمبر ۱۹۹۷ء کو وہ مستقلاً امریکا چلے گئے۔ ۱۲؍ اگست ۲۰۰۷ء کو وہیں ایک اولڈ ہوم میں انتقال کیا۔

ڈاکٹر گیان چند عمر بھر درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف میں منہمک رہے۔ انھوں نے بعض موضوعات پر پہلی بار داد تحقیق دی اور اپنے معیاری اور اعلا کام کے باعث اُردو دنیا میں سزاوارِ تحسین ٹھہرے۔ انھیں ہندوستان بھر کے مختلف علمی اداروں نے علمی اور تصنیفی خدمات کے باعث مختلف اعزازات سے نوازا۔ اعزازات کی تفصیل یہ ہے:

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

☆۱۹۷۳ء میں تفسیرِ غالب پر غالب انسٹی ٹیوٹ آف نئی دہلی کا پہلا غالب انعام۔

☆یوپی اُردو اکادمی سے اُردو مثنوی شمالی ہند میں، تفسیرِ غالب، لسانی مطالعے اور حقائق پر اعلیٰ انعامات۔

☆تجزیے پر جموں کشمیر اکادمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز انعام۔

☆ آل انڈیا میر اکادمی لکھنؤ کا امتیازِ میر ایوارڈ، ۱۹۷۷ء۔

☆ آل انڈیا میر اکادمی لکھنؤ کا سب سے بڑا ایوارڈ ''اعزازِ میر''، ۱۹۸۵ء۔

☆۱۹۸۲ء میں مرکزی ساہتیہ اکادمی کا ذکر و فکر پر انعام۔

ڈاکٹر جین مختلف علمی و ادبی اداروں کے رکن اور سرپرست رہے۔ انھوں نے پی ایچ ڈی اور ایم فل کے کئی سکالرز کی نگرانی اور رہنمائی کا فرض خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ ہندوستانی جامعات کے علاوہ وہ پاکستانی جامعات کے اعلیٰ درجوں کے بھی ممتحن رہے۔ ڈاکٹر گیان چند کے سرمایۂ علمی کی تفصیل درج ذیل ہے:

☆ اُردو کی نثری داستانیں؛ انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، طبع اول ۱۹۵۴ء۔

☆ تحریریں [مجموعہ مضامین] فروغِ اُردو لکھنؤ، ۱۹۶۴ء۔

☆اُردو مثنوی شمالی ہند میں [مقالہ ڈی لٹ]، انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۹ء۔

☆ تفسیرِ غالب [غالب کے منسوخ کلام کی شرح]، جموں کشمیر اکادمی آف آرٹ، سری نگر، ۱۹۷۱ء۔

☆تجزیے [مجموعہ مضامین]، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۷۳ء۔

☆ لسانی مطالعے [مضامین کا مجموعہ] نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی ۱۹۷۳ء۔

☆ رموزِ غالب، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۷۶ء

☆ حقائق [تحقیقی مضامین کا مجموعہ] ناشر خود، الٰہ آباد ۱۹۷۸ء۔

☆ ذکر و فکر [ادبی مضامین کا مجموعہ] ناشر خود، الٰہ آباد ۱۹۸۱ء۔

☆عام لسانیات [لسانیات] ترقی اُردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۵ء۔

☆ ابتدائی کلامِ اقبال بہ ترتیب مہ و سال-۱۹۰۸ء تک، اُردو ریسرچ سنٹر، حیدرآباد دکن، ۱۹۸۸ء۔

☆ کھوج [تحقیقی مضامین]، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۰ء۔

☆ تحقیق کا فن، یوپی اُردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء۔

☆ پرکھ اور پہچان [تحقیقی و تنقیدی مضامین]، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۰ء۔

☆ مقدمے اور تبصرے، انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی، ۱۹۹۰ء۔

☆ ادبی اصناف، گجرات اُردو اکادمی، احمد آباد، ۱۹۹۰ء۔

☆ اُردو کا اپنا عروض، انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی، ۱۹۹۰ء۔

☆ اُردو ادب کی تاریخ، ۱۷۰۰ تک: بہ اشتراک ڈاکٹر سیدہ جعفر؛ ترقی اُردو بیورو، دہلی، ۱۹۹۰ء۔

☆ کچے بول [شاعری]، ۱۹۹۱ء

☆ قاضی عبدالودود بحیثیت مرتب متن، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۰ء

☆ ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۵ء۔

زندگی کے آخری دنوں میں وہ اُردو تحقیق کی تاریخ لکھنے کے خواہش مند تھے، معلوم نہیں کہ ان کا یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا یا نہیں؟ رسائل و جرائد میں ان کے بیسیوں مضامین ہنوز غیر مرتب ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند کے علمی، ادبی اور تحقیقی کام کی جہاں ستائش ہوئی وہاں ان کی بعض کتابیں اپنے مندرجات کے باعث ہدفِ تنقید بھی ٹھہریں۔ خاص طور پر ابتدائی کلامِ اقبال بہ ترتیبِ مہ و سال، اُردو کا اپنا عروض، اُردو ادب کی تاریخ (بہ اشتراک)، قاضی عبدالودود بحیثیت مرتبِ متن اور ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب؛ آخرالذکر کتاب کے مندرجات پر ہندوستان، پاکستان بلکہ پوری اُردو دنیا میں احتجاج کیا گیا اور اس کے رد میں مضامین، تبصرے، کتابچے اور کتابیں لکھی گئیں۔

[۳]

ہندوستان، پاکستان اور اُردو دنیا کے ممتاز اور معتبر اہلِ قلم کے ساتھ ڈاکٹر گیان چند کے گہرے علمی اور دوستانہ روابط رہے۔ ملاقاتوں اور ٹیلی فونک گفتگوؤں کے علاوہ ان کے ساتھ ان کا سلسلۂ مراسلت بھی قائم رہا۔ ڈاکٹر گیان چند کے مکاتیب کی جمع آوری کا کام ابھی بڑے پیمانے پر نہیں ہوا۔ ان کی فکر، نظریات اور ان کے احوال و آثار کی مکمل اور صحیح تفہیم کے لیے ان کے خطوط بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون کے ذریعے معروف اقبال شناس ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے نام ان کے تیس خطوط حواشی و تعلیقات کے ساتھ پیش کیے جا رہے ہیں۔

زیرِ نظر مکاتیب کا دورانیہ ۵ مئی ۱۹۸۶ء سے ۱۲/ اپریل ۲۰۰۱ء کو محیط ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اپریل ۱۹۸۶ء میں اقبال اکیڈمی حیدر آباد دکن کے پانچ روزہ عالمی اقبال سیمینار میں شریک ہوئے تو وہاں ان کی ڈاکٹر گیان چند کے ساتھ پہلی ملاقات ہوئی۔ اس پانچ روزہ اقبال سیمینار کی ایک نشست میں ڈاکٹر گیان چند اپنا مقالہ پڑھنے کے لیے شریک ہوئے۔ ڈاکٹر ہاشمی ان سے طویل ملاقات کے خواہش مند تھے مگر ان کی رہائش گاہ شہر سے فاصلے پر تھی اس لیے یہ ملاقات نہ ہو پائی۔ ہاشمی صاحب نے انھیں پہلی بار وہیں سے ایک خط لکھا۔ ان کا محبت آمیز جواب آنے پر یہ سلسلۂ خط کتابت جاری ہوا۔ ان خطوں میں ڈاکٹر گیان چند کی تدریسی زندگی کے آخری برسوں کی جھلکیاں موجود ہیں اور ان کے روز و شب کا احوال بھی۔ وہ پاکستان کے متعدد جرائد و رسائل میں اپنے مضامین و مقالات اور پاکستان کے مختلف علمی اداروں سے اپنی بعض کتابوں کی اشاعت کے لیے متفکر تھے۔ زیرِ نظر مکاتیب میں اس بے قراری کا رنگ پوری طرح موجود ہے۔ وہ ڈاکٹر جمیل جالبی، مشفق خواجہ، خواجہ حمید الدین شاہد اور ڈاکٹر ہاشمی کے ذریعے مختلف کتب اور مضامین کی اشاعت میں کامیاب رہے۔ ان مکاتیب میں انھوں نے اپنے بعض علمی منصوبوں کا ذکر بھی کیا۔ وہ اُردو تحقیق کی تاریخ مرتب کرنا چاہتے تھے اور اس کا پورا خاکہ بھی انھوں نے بنا لیا تھا۔ پاکستان کے محققین کے حوالے سے وہ معلومات و مآخذ کی جمع آوری کے لیے پاکستان کا طویل دورہ کرنے کے آرزو مند تھے۔ انتظامی دشواریوں، بیماریوں

اور امریکا میں مستقلاً سکونت اختیار کر لینے کے باعث ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ وہ اپنے منتخب مضامین کو پانچ جلدوں میں شائع کرنے کے آرزومند تھے، افسوس کہ ان کی یہ آرزو بھی پوری نہ ہو سکی۔

زیرِ نظر مکاتیب میں انھوں نے ڈاکٹر ہاشمی کے ایک سوال کے جواب میں اپنے مذہب اور عقیدے کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا۔ اگرچہ وہ علمی معاملات میں مذہب یا عقیدے کے ذکر کو اچھا نہیں جانتے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر ہاشمی کو لکھا:

> ''آپ کہاں سے میرے عقائد کے چکر میں پڑ گئے۔ میں جین مذہب کا فرد ہوں۔ قاعدہ ہے کہ انسان جس مذہبی گروہ میں پیدا ہوتا ہے اسی پر عقیدہ رکھتا ہے۔ خاندان اور ماحول کی وجہ سے اس پر اتنا Suggestion اور Brain washing ہوتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کو عقل کی رو سے مکمل ترین سمجھنے لگتا ہے۔ کسی کو اپنے مذہب میں خامی نہیں دکھائی دیتی جب کہ دوسرے مذاہب کی خام خیالیاں بلکہ لغویت خوب دکھائی دیتی ہیں۔ نفسیاتی شعبدہ بازی کا یہی اثر ہے۔ آپ اسلام کو بہترین مذہب سمجھتے ہیں، میں جین دھرم کو۔ میں اپنے مذہب میں عقیدہ رکھتا ہوں لیکن تعقل پرستی کی وجہ سے محض ۵۰ فی صد۔ بقیہ بہت سی روایات کو ناپسندیدہ اور اساطیر کو بے اصل جانتا ہوں۔ بہرحال میں غیبی طاقتوں کو مانتا ہوں۔ یہ یقین ہے کہ اس دنیا کے علاوہ اور بھی کوئی دنیا ہے۔ حیاتِ قبلِ ولادت اور حیات بعد ممات کا قائل ہوں۔ یہ مانتا ہوں کہ انسان کا ازدواجی رشتہ اور انسان کی موت پہلے سے طے شدہ ہے جس میں ہماری کوشش کوئی دخل نہیں دے سکتی لیکن حقیقت کیا ہے؟ اس کا علم نہیں۔ تناسخِ ارواح یعنی آواگون یعنی انسان کے بار بار جنم لینے کا معتقد ہوں۔ پھر بھی یہ واضح کرنا چاہوں گا کہ جین دھرم ایک خدا کو نہیں مانتا۔ میں بھی اسی عقیدے پر قائم ہوں یعنی موحد نہیں ہوں، مشکک ہوں۔'' (خط نمبر ۷)

وہ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد مذہب کے مطالعے میں وقت گزارنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ گیتا، بائبل اور قرآن حکیم کے مطالعے کی بھی آرزو تھی۔ وہ ایک خط میں اپنے اس ارادے کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''رفیع الدین فاروقی حیدرآباد والے نے قرآن کریم کا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا اردو ترجمہ مرحمت فرمایا۔ میں اس سے بہت خوش ہوں۔ کیا حسین اتفاق ہے کہ اسی ڈاک سے ایک صاحب کا گیتا کا اردو ترجمہ موصول ہوا۔ اب میں تلاش میں ہوں کہ کہیں سے بائبل کا انگریزی ترجمہ بھی خرید لوں۔ میں قرآن پاک کو شروع سے آخر تک لفظاً بہ لفظاً پڑھوں گا لیکن آہستہ آہستہ، بستہ بستہ، بہ شرطِ فرصت۔ ریٹاٹر [ریٹائر] ہونے کے بعد مذہبیات کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ میری اصلاح ہو سکے۔ قرآن سے استفادے کے لیے مسلمان ہونا ضروری نہیں۔ دوسرے بھی بہ شرطِ استطاعت بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ یہی معاملہ انجیلوں کا ہے۔'' (خط نمبر ۱۲)

۱۹۹۷ء میں ڈاکٹر گیان چند پاکستان کے علمی دورے پر تشریف لائے۔ لاہور میں ان کے اعزاز میں دو تقریبات منعقد ہوئیں۔ یہاں کے ممتاز و معروف اہلِ قلم نے ان کے اعزاز میں منعقدہ تقریبات میں بھرپور شرکت کی۔ ڈاکٹر گیان چند پاکستان کے اس مختصر دورے سے بہت لذت یاب ہوئے اور واپسی پر ڈاکٹر ہاشمی کو لکھا:

''مجھے پاکستان اور اہل پاکستان بہت پسند آئے۔ اردو والوں کے حسن سلوک نے میرا دل موہ لیا۔ لاہور کے اساتذہ، طلبہ اور درس گاہیں کبھی میرے جذبات سے محو ہونے والی نہیں۔ آپ حضرات سے ملاقات محض ایک دو لمحے کے لیے ہوئی۔ سمندر سے پیاسے کو شبنم ملے تو تشنگی تھوڑے ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بشرط حیات ایک بار پھر آپ کے پاس آؤں۔ آپ نے تاریخی ادارے اورینٹل کالج میں مجھ کم سواد کے لیے جیسا شاندار اجتماع کیا، اس کے لیے کالج اور شعبے کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔'' (خط نمبر ۲۶)

زیر نظر خط ایک ثقہ عالم اور محقق کے خط ہیں اس لیے بے تکلفی اور شوخی کے ذائقے سے محروم ہیں۔ ان خطوں پر شروع سے آخر تک ایک خاص نوع کی سنجیدگی اور علمیت سایہ فگن ہے۔ کہیں کہیں بادِ بہاری کی صورت ایک آدھ جملہ ایسا آجاتا ہے جو متانت متن کو ایک نئے رنگ سے سرشار کر جاتا ہے۔ اس ثقاہت اور علمیت کے باوجود اسلوب بیان دل کش اور جاذب ہے۔ ڈاکٹر صاحب عام کاغذوں پر خط لکھتے تھے۔ ایک دو خط پیڈ پر لکھے گئے ہیں ورنہ باقی خطوں کے لیے عام کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔ آغاز خط میں وہ اپنا پورا پتا اُردو یا انگریزی میں لکھ دیتے ہیں۔ سو خط پختہ مگر شکستہ ہے۔ اعراب اور رموز اوقاف کا استعمال کم کم ہے۔ تاریخ کتابت بالعموم شروع میں اور اُردو ہندسوں میں لکھتے ہیں، ایک آدھ جگہ انگریزی ہندسے استعمال کیے گئے ہیں۔ القاب و آداب میں عام طور پر ''محبی! تسلیم'' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور آخر میں ''مخلص گیان چند'' کے۔ بعض الفاظ کا املا روشِ عام سے ہٹا ہوا ہے جیسے: گزشتہ بجائے گذشتہ، سیمنار بجائے سیمی نار۔ بعض لفظوں کو جوڑ کر لکھتے ہیں۔ راقم نے ایسے مقامات پر قوسین کبیر میں درست املا دے دیا ہے۔ راقم نے ڈاکٹر گیان چند کے زیر نظر مکاتیب کو تاریخ وار ترتیب دے کر آخر میں ان کی بہتر تفہیم و توضیح کے لیے مختصر حواشی و تعلیقات تحریر کیے ہیں:

[۱]

Gian Chand Jain　　　　University Of Hyderabad

M.A. ,D.Phil.D.Litt.　　　　Hyderabad-500001

M.A.C Sociallogy

Professor Of Urdu

گھر کا پتا: A 15، سنٹرل یونیورسٹی [یونی ورسٹی] پوسٹ آفس حیدرآباد 500134 (انڈیا)

۵/مئی ۱۹۸۶ء

محبی! تسلیم۔

آپ کا ۲۵/اپریل مقامی[1] کرم نامہ مجھے ۲۸/اپریل کو ملا۔ شکریہ

ہاں صاحب، آپ سے نہ ملنے کا مجھے بھی قلق ہے۔ میرے پاؤں کی ہڈی کو بھی سیمنار [سیمی نار] کے دنوں میں چٹخنا تھا۔ گزشتہ [گذشتہ] سال بین الاقوامی جشن مزاح کے موقع پر میں آنکھوں میں موتیا بند کے آپریشن کی وجہ سے معذور تھا، اس سال پاؤں کی وجہ سے نا رسائی اور محرومی میرا مقدر ہے۔ میں شہر سے دور رہتا ہوں۔ ۲۱/اپریل سے پہلے سیمنار [سیمی نار] میں نہ آسکنے پر میں نے دو شعر کہے:

فنا کی سمت چلا جا رہا ہوں تیزی سے　　　گِلہ ہو کیوں مجھے اپنی شکستہ پائی کا

حیدر آباد میں ، حیدر آباد سے　　　دور رہتے ہیں ہم، ہے یہ کیسا ستم

یہاں شہر والوں کو بھی پہنچنا مشکل ہے۔ آپ کے لیے تو اور بھی زیادہ مشکل تھا۔[۲] میرے شعبے کے رحمت علی خاں نے چوکسی کی، آپ کو بس میں بٹھا دیتے تو آپ یہاں آ جاتے۔ ستار رحمٰن دستوگی[۳] بھی میرے پاس آنے کے لیے تڑپا کیے۔ نہ آ سکے، چلے گئے۔ ان کا بھی دکھ بھرا خط ملا۔ تمام مندوبین میں، میں صرف آپ سے ملنے کا مشتاق تھا کیونکہ آپ محققینِ اقبال میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ آپ سے کچھ باتیں دریافت کرنی تھیں۔ میرے پاس اقبال پر چھوٹے بڑے کئی مضمون رکھے ہیں۔ آپ کو دے دیتا کہ پاکستان کے رسالوں میں شائع کرا دیتے۔ ''کلامِ اقبال کے دو مخطوطے'' اقبالیات[۴] میں شائع ہوگا۔ بقیہ مضامین کے لیے، میں چاہتا تھا کہ اقبال سے مخصوص پرچوں میں بھیجوں یا کم از کم تحقیقی پرچوں میں۔ مجھے علم نہیں کہ وہاں کے کون سے پرچے مناسب ہیں۔ پاکستان کی ڈاک اتنی مہنگی ہے کہ فرداً فرداً پرچوں کو کچھ بھیجنا مشکل ہے۔

اب آپ کم از کم ایک سوال کا جواب مجھے لکھ دیں۔

آپ نے رسالہ نقوش[۵] اقبال نمبر ۱، شمارہ ۱۲۱ بابت ستمبر ۱۹۷۷ء ص ۱۰ پر ۱۸۹۲ء کے تحت لکھا ہے

''ہماری زبان دہلی کے شمارہ نومبر میں ایک غزل شائع ہوئی جو اقبال کی قدیم ترین مطبوعہ دستیاب غزل ہے۔''[۶]

میں اقبال کی نومبر ۱۸۹۲ء کی کسی غزل سے واقف نہیں۔ براہِ کرم اس غزل کی نقل اور اس کا ماخذ (یعنی یہ کہاں سے لی ہے) مجھے لکھ بھیجیے۔

مجھے ہماری زبان دہلی میں شائع شدہ ذیل کی تین غزلوں ہی کا علم ہے:

ستمبر ۱۸۹۳ء	آپ نے پا زحموڑ امانے کر رکھ دیا
نومبر ۱۸۹۳ء	کیا مزہ بلبل کو آیا شکوۂ بے درد کا
فروری ۱۸۹۴ء	جان دے کر تمھیں جینے کی دعا دیتے ہیں

براہِ کرم جواب دینے کی زحمت ضرور کیجیے۔ مجھے یہ یقین ہے کہ آپ سے کبھی نہ کبھی پھر ملنا ضرور ہو گا۔[۷] میں فروری ۱۹۸۷ء میں ناٹر [ریٹائر] ہو رہا ہوں۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں [یونیورسٹیوں] کے شعبہ جاتِ اردو میں سب سے سینیر پروفیسر ہوں یعنی اکتوبر ۱۹۶۵ء میں یونیورسٹی [یونیورسٹی] پروفیسر ہو گیا تھا۔ آپ کے علم اور تصانیف کا قدرداں ہوں۔ حال میں اقبال سیمنار [سیمی نار] کے سووینیر میں آپ کا تعارف دیکھ کر تعجب ہوا۔ آپ نے ۱۹۶۶ء میں ایم اے پاس کیا جب کہ میں ایک سال پہلے پروفیسر ہو گیا تھا۔ اس لحاظ سے آپ تو بالکل بچے ہیں۔ جب تک آپ کو نہ دیکھا تھا میں سمجھتا تھا کہ آپ کوئی بزرگ آدمی ہوں گے۔

یہاں تک خط لکھنے کے بعد طے کیا کہ تین مضامین آپ کو بھیج دوں۔ آپ انھیں مناسب پرچوں میں بھیج دیجیے۔ آپ کو ڈاک کے مصارف اٹھانے پڑیں گے۔ پہلے میں سوچتا تھا کہ مشفق خواجہ[۸] کو بھیجوں لیکن آپ چونکہ ماہرِ اقبالیات ہیں اس لیے آپ کی مدد زیادہ کارگر رہے گی۔ مصارف کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ یہاں سے کچھ نہیں بھیج سکتا۔ آپ سے نئے نئے مراسم ہوئے ہیں۔ ان کا آغاز اس زحمت دہی سے کر رہا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ ''اقبال کا منسوخ اردو کلام'' میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ [۹] کسی رسالے کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کوئی دقت ہو تو سب رس کراچی [۱۰] کو بھیج دیجیے، وہ ضرور شائع کر دیں گے۔

امید کرتا ہوں کہ آپ کا مزاج مع الخیر ہوگا۔ یہ خط کل سے پہلے یونیورسٹی [یونیورسٹی] بھیجوں گا جہاں سے پرسوں سپردِ ڈاک ہوگا۔

آپ خط لکھیں تو یہ بھی لکھیے کہ آپ کا وطن مالوف کیا ہے؟ کیا لاہور ہی ہے؟ میری کتاب ابتدائی کلامِ اقبال، بہ ترتیب مہ و سال اشاعت کے لیے تیار ہے۔ چھپ کر تقریباً ۳۵۰ صفحات ہوں گے۔ جولائی ۱۹۰۸ء تک کا اردو کلام ہے جس میں منسوخ اور متداول کو ملا جلا کر لکھا ہے۔ حواشی ہیں، اختلافات نسخ ہیں۔ کیا یہ کتاب پاکستان میں شائع ہو سکتی ہے؟ مشفق خواجہ نے تو لکھ دیا کہ پاکستان میں شائع نہیں ہو سکتی۔ [۱۱] ہندوستان میں ابھی تک مجھے کوئی ناشر نہیں ملا۔ ساتھ میں منسلک تین مضامین۔

مخلص

گیان چند

[۲]

A 15 سنٹرل یونیورسٹی [یونیورسٹی]

پوسٹ آفس، حیدرآباد ۵۰۰۱۳۴، ہندوستان

۲۳ / جون ۱۹۸۶ء

محبی! تسلیم۔

میں نے رجسٹری سے اپنے کئی مضامین آپ کو بھیجے تھے کہ پاکستان کے مختلف رسالوں میں شائع کرانے کا کرم کریں۔ مجھے ان کی رسید نہیں ملی۔ کیا اقبال پر میرے کلام کی اشاعت کی اُدھر کوئی سبیل ہو سکتی ہے[؟]

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

مخلص

گیان چند

[۳]

A 15 سنٹرل یونیورسٹی [یونیورسٹی]

پوسٹ آفس، حیدرآباد ۵۰۰۱۳۴ ہندوستان

۲۱ / جولائی ۱۹۸۶ء

محبی! تسلیم۔

آپ کا ۳ / جولائی کا لطف نامہ مجھے ۱۸ / جولائی کو ملا۔ ممنون و مشکور ہوں۔

ساتھ کا رقعہ مدیر اقبالیات کو پہنچا دینے کی زحمت کیجیے۔

آپ نے میرے مضامین بہت معیاری رسالوں کو دیے ہیں۔ آپ کی اس عنایت کے لیے شکریہ عرض کرتا ہوں۔ میں نے مدیر سب رس کراچی کو لکھا تھا کہ آپ سے کوئی مضمون حاصل کر لیں۔ اب انھیں نہ دیجیے۔ میرے پاس کئی غیر مطبوعہ مضامین ہیں۔ میں یہاں سے

انھیں براہ راست بھیج دوں گا۔

ابتدائی کلامِ اقبال کو یہاں ہندوستان ہی میں ایک کرم فرما نے شائع کرنے کا وعدہ کر لیا ہے اس لیے آپ کو مزید زحمت نہ دوں گا۔ میں نے آپ کا مضمون ''بالِ جبریل کا متروک کلام'' دیکھا ہے۔[۱۲] میرے پاس آپ کی کتاب تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ [۱۳] نہیں ہے لیکن میں نے اس سے مفصل استفادہ کیا ہے۔ کسی ذریعے سے میرے پاس بھجوا دیں تو اس دان پر آپ کو بہت ساری ملے گا۔

میں نے اپنی دو کتابیں خود شائع کیں۔ حقائق [۱۴] اور ذکر و فکر [۱۵]۔ حقائق کا ایڈیشن ختم ہو چکا ہے۔ ذکر و فکر میرے پاس ہے۔ جب آپ یہاں اپریل ۱۹۸۶ء میں غریب خانے پر آنے کا پروگرام بنا رہے تھے، میں نے یہ کتاب آپ کے لیے نکال کر رکھی تھی۔ اب کسی طرح آپ کو بھجواؤں گا۔ پاکستان کی ڈاک بہت مہنگی ہے کسی کے ہاتھ دستی بھیج سکا تو سہولت ہوگی۔ لوگوں سے کہہ رکھوں گا کہ کسی قاصد کی خبر دے دیں۔ آج کل میں ایک کتاب تحقیق کا فن لکھنے میں مصروف ہوں۔ میں نے انگریزی کی ۲۵ کتابیں پڑھی ہیں لیکن زیادہ تر اپنی معلومات پر تکیہ کر رہا ہوں۔ اردو کے حساب سے لکھ رہا ہوں۔ پاکستان میں اس قسم کی کتابیں لکھی گئی ہوں گی۔ میری نظر سے کوئی نہیں گزری۔[۱۶] ایک صاحب عبدالصمد خاں [۱۷] ہیں جو اب کلکتہ چلے گئے ہیں ان کے پاس ہیں۔ میں نے انھیں لکھا ہے کہ بھیج دیں۔ میری دوسری کتابوں میں سے کئی Out of print ہیں۔ حیدرآباد میں کوئی نہیں ملتی۔

یکم جون ۱۹۸۶ء کے ہماری زبان دلی میں میرا ایک مضمون ''اقبال سے متعلق کچھ تحقیق پارے'' شائع ہوا ہے۔

یہ جان کر اطمینان ہوا کہ اقبال کی قدیم ترین غزل ستمبر ۱۸۹۳ء ہی کی ہے۔[۱۸] امید ہے آپ کا مزاج بخیر [یا بخیر] ہوگا۔

مخلص

گیان چند

[۴]

A 15 سنٹرل یونیورسٹی [یونیورسٹی]

پوسٹ آفس حیدرآباد-۵۰۰۱۳۴ ہندوستان

۱۱/اگست ۱۹۸۶ء شام

محبی! تسلیم۔

آپ کا بغیر تاریخ کا کرم نامہ نیز بیش بہا مضمون ملا۔ مضمون قیمتی ہے لیکن چوں کہ اس میں ۱۹۰۸ء تک کا کوئی کلام نہیں اس لیے میں اپنی کتاب کے لیے اس سے استفادہ نہ کر سکا۔[۱۹]

اقبال اکادمی [۲۰] کے لیے جو خط آپ ہی کو بھیج رہا ہوں تاکہ آپ بھی پڑھ لیں اور پھر اسے وہاں پہنچانے کی بنفسِ نفیس زحمت کریں۔ مجھے پاکستان جانے والے حضرات کا علم نہیں ہو پاتا۔ اپنی کتاب ذکر و فکر آپ کو بھیجنی ہے تلاش میں رہوں گا۔ آپ کا پچھلا خط مجھے مل گیا تھا جس میں آپ نے لکھا تھا کہ رسالہ زبان میں ۱۸۹۳ء میں کوئی غزل شائع نہیں ہوئی تھی۔

آپ کے الطاف و اکرام کے لیے تہِ دل سے مشکور ہوں۔ امید ہے آپ بخیر [بہ خیر] ہوں گے۔

مخلص

گیان چند

[۵]

شعبۂ اردو سنٹرل یونیورسٹی [یونی ورسٹی]

حیدرآباد ۵۰۰۱۳۴، ہندوستان

۷/ اگست ۱۹۸۷ء

محبی! تسلیم۔

میری ایک ریسرچ اسکالر مسیح فسرین پاکستان جا رہی ہے اس کے ہاتھ کتاب ذکر و فکر بھیج رہا ہوں۔ یہ کتاب ایک قسم کا بھان متی کا پٹارہ ہے۔ اس میں آخری تبصرے نہ ہوتے تو اس کی قیمت میں اضافہ ہوتا۔

میری کتاب ابتدائی کلامِ اقبال بہ ترتیبِ مہ و سال کی آفسیٹ کتابت مکمل ہو گئی ہے اور اس کی بار بار تصحیح کر دی ہے۔ اب عبدالصمد خاں کے خط کا انتظار ہے کہ وہ اسے پریس کو بھجوا دیں۔

سیارہ [۳۱] کے لیے ایک مفصل مضمون "ترانۂ ہندی کی کہانی" بھیج رہا ہوں۔ وہ اقبال نمبر نکالیں گے اس میں شامل کرنے کے لیے ہے۔

آپ نے کسی کے ہاتھوں میرے لیے کچھ چیزیں بھیجی ہیں۔ انجینیرنگ کالج عثمانیہ یونیورسٹی کے وہ استاد ایک نکاح میں مجھے ملے تھے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ یہ تحفہ عثمانیہ [یونی ورسٹی] کے شعبۂ اردو میں پہنچا دیں وہاں سے کوئی مجھ تک لے آئے گا۔ ابھی تک مجھے نہیں ملا۔ بہر حال اس زحمت نوازی کے لیے مشکور ہوں۔ دو چار دن میں مل جائے گا۔ صمد صاحب ہی معلوم کریں گے کہ میری اقبال کی کتاب [۳۲] اقبال اکادمی پاکستان بھی چھاپ سکتی ہے کہ نہیں۔

حاملِ رقعہ لڑکی میراں جی خمس الشاق [۳۳] پر کام کر رہی ہے آپ اس کی تو کیا مدد کر سکیں گے؟

امید ہے آپ کا مزاج بخیر [بہ خیر] ہوگا۔

مخلص

گیان چند

[۶]

شعبۂ اردو سنٹرل یونیورسٹی [یونی ورسٹی]

حیدرآباد ۵۰۰۱۳۴ ہندوستان

۷/ اگست ۱۹۸۷ء

محبی! تسلیم۔

دو دن پہلے سیـــارہ کا شمارہ ۳۲ اشاعتِ خاص ملا۔ تہِ دل سے مشکور ہوں۔ آپ کے خطوط بھی ملتے رہتے ہیں۔ حالیہ شمارے میں

ڈاکٹر تحسین فراقی [44] کا مضمون "مسلم فلسفہ میں زمان کا مسئلہ: علامہ اقبال کی ایک نایاب تحریر کی روشنی میں" اقبالیات میں ایک اضافہ ہے۔[45]

آپ ماہِ نو کا اقبال نمبر نکالنے والے ہیں۔ ایک مضمون "ترانہ ہندی کی کہانی" بھیج رہا ہوں۔ اسے شامل کر کے ممنون کیجیے۔

امید ہے آپ حضرات بخیر [بخیر] ہوں گے۔

زیراکس نقل ٹھیک نہیں آئی۔ کاتب کو اس کے پڑھنے میں زحمت ہوگی۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

مخلص

گیان چند

[۷]

University Of Hyderabad		Phones: 558220
Hyderabad-500134		550396

۲۴/ستمبر ۱۹۸۷ء

محبی! تسلیم

آپ کا ۱۳/ستمبر کا کرم نامہ مقامی ڈاک سے پرسوں ۲۲/ستمبر کو ملا۔ شکریہ۔ آپ نے مضامین کے جو تراشے بھیجے تھے وہ حیدرآباد پہنچنے کے ایک ماہ بعد میں حاصل کر سکا۔ پاکستان سے حیدرآباد تک کا فاصلہ جلدی طے ہو جاتا ہے لیکن شہر حیدرآباد سے مضافات تک آنے میں عرصۂ دراز درکار ہوتا ہے۔

میری ایک ریسرچ کی طالبہ ۲۴/اگست کو یہاں سے کراچی گئی تھی بعد میں اسے لاہور جانا تھا اور آپ سے ملنا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ ذکر و فکر کی ایک جلد نیز آپ کے کرم نامے کا جواب بھیجا تھا۔ حیرت ہے کہ دوست گام ابھی تک آپ کے پاس نہیں پہنچی، بہر حال پہنچ جائے گی۔ ذکر و فکر کوئی اچھا مجموعہ نہیں ہے۔ اس سے بہتر ہے حقائق۔ میں نے دیکھا تو میرے گھر میں کل ملا کر چار پانچ جلدیں نکل آئیں۔ ایک جلد آپ کو بھیجوں گا۔ یہاں سے آپ کے ہم نام فاروقی [46] تک کتاب بھیجنا بھی ایک مسئلہ ہے۔ کسی کے ہاتھ بھیجوں گا۔ یہ کیمپ بخت RTC کراس روڈ کا ملحقہ ہے اسے کھوجنا ممکن نہیں، اس لیے کتابیں یونیورسٹی ہی میں دوں گا۔

آپ مجموعے میں میرا مضمون "اقبال کا منسوخ اردو کلام" شائع کر دیجیے۔ شاید اس موضوع پر کسی اور نے اس انداز سے نہ لکھا ہو۔ میں نے صبیحہ نسرین (میری ریسرچ اسکالر) کے ہاتھوں ایک مضمون "ترانہ ہندی کی کہانی" رسالہ سیارہ لاہور کے اقبال نمبر کے لیے بھیجا ہے۔ وہ اس مضمون کو آپ ہی کو دے گی۔ یہ بھی اچھا تحقیقی مضمون ہے۔ مجموعے میں آپ اسے لینا چاہیں تو منسوخ کلام کو چھوڑ کر اسے لے سکتے ہیں۔ اگر آپ کو یہ مضمون مل گیا ہو یا سیارہ کو اس لڑکی نے کراچی سے ڈاک سے بھیج دیا ہو تو دونوں مضامین کو پڑھ کر انتخاب کر لیجیے۔ اگر دونوں کو شامل کیا جا سکے تو کیا کہنا۔

یہ غلط ہے کہ میں علیل ہو رہا تھا۔ جب آپ نے مجھے پاکستان میں دیکھا تھا، اس کے بعد کام کی کھانسی یا کبھی کمر میں درد تو ضرور رہا ہے لیکن ایسا

نہیں کہ جس کی وجہ سے مجھے یونیورسٹی [یونی ورسٹی] سے ایک دن کی چھٹی بھی لینی پڑی ہو۔ ہاں! آپ کہاں سے میرے عقائد کے پھیر میں پڑ گئے۔ میں جین مذہب ۲۷ کا فرد ہوں۔ قاعدہ ہے کہ انسان جس مذہبی گروہ میں پیدا ہوتا ہے اسی پر عقیدہ رکھتا ہے۔ خاندان اور ماحول کی وجہ سے اس پر اتنا Suggestion اور Brain washing ہوتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کو عقل کی رو سے مکمل ترین سمجھنے لگتا ہے۔ کسی کو اپنے مذہب میں خامی نہیں دکھائی دیتی جب کہ دوسرے مذاہب کی خامیاں بلکہ خوبیاں خوب دکھائی دیتی ہیں۔ نفسیاتی شعبدہ بازی کا یہی اثر ہے۔ آپ اسلام کو بہترین مذہب سمجھتے ہیں، میں جین دھرم کو۔ میں اپنے مذہب میں عقیدہ رکھتا ہوں لیکن تعقل پرستی کی وجہ سے محض ۵۰ فی صد۔ بقیہ بہت سی روایات کو ایجاد بندہ اور اساطیر کو بے اصل جانتا ہوں۔ بہر حال میں غیبی طاقتوں کو مانتا ہوں۔ یہ یقینی ہے کہ اس دنیا کے علاوہ اور بھی کوئی دنیا ہے۔ حیات قبل ولادت اور حیات بعد ممات کا قائل ہوں۔ یہ مانتا ہوں کہ انسان کا ازدواجی رشتہ اور انسان کی موت پہلے سے طے شدہ ہے جس میں ہماری کوشش کوئی دخل نہیں دے سکتی۔ لیکن حقیقت کیا ہے؟ اس کا علم نہیں۔ تناسخ ارواح یعنی آواگون یعنی انسان کے بار بار جنم لینے کا معتقد ہوں۔ پھر بھی یہ واضح کرنا چاہوں گا کہ جین دھرم ایک خدا کو نہیں مانتا۔ میں بھی اسی عقیدے پر قائم ہوں یعنی موحد نہیں ہوں۔ متشکک ہوں۔

آپ کو اس سب کے تذکرے میں نہیں پڑھنا [پڑنا] چاہیے تھا۔ ہمارے دو محقق قاضی عبدالودود ۲۸ اور رشید حسن خاں ۲۹ کسی مذہب کے قائل نہیں تھے۔ دونوں کو دہریہ کہا جا سکتا ہے۔ ادب کی تحقیق میں ان کے مذکور کی ضرورت نہیں، ہاں ان کی شخصیت زیرِ بحث ہو تو اس پہلو کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ میرا مسلک یہ ہے کہ مذہب سے قطع نظر کسی انسان کی خوشی میں اضافہ کر سکو تو یہ بہترین ہے۔ اگر یہ نہ کر سکو تو کم سے کم کسی انسان کے مصائب اور آلام میں اضافہ نہ کرو۔ یہی اصل مذہب ہے۔

یوپی اردو اکیڈمی لکھنؤ نے میری کتاب اردو کی مثنوی داستانیں کا تیسرا ایڈیشن اضافہ و ترمیم شدہ (پہلا ہندوستانی ایڈیشن) شائع کر دیا ہے۔ اقبال کی کتاب کی کتابت شدہ کاپیاں عبدالصمد خاں لے گئے تھے، دیکھیے کب تک چھپتی ہیں۔

امید ہے آپ بخیر [با خیر] ہوں گے۔		مخلص

گیان چند

[۸]

شعبۂ اردو

سنٹرل یونیورسٹی [یونی ورسٹی]

حیدرآباد ۵۰۰۱۳۴

۲۶ اکتوبر ۱۹۸۷ء

محبی! تسلیم۔

رفیع الدین فاروقی صاحب کی مدد سے آپ کو حقائق کی ایک جلد بھیج رہا ہوں۔ میری جو شاگرد پاکستان گئی تھی وہ وہاں جو لاہور میں محض ایک دن ٹھہر سکی اور فوراً ہندوستان آ گئی۔ اس نے ڈاک کے پارسل سے ذکر و فکر آپ کو بھیج دی تھی۔ امید ہے مل گئی ہوگی۔

ساتھ میں ملفوف دو چٹھیاں آپ پڑھ لیجیے اور انھیں مکتوب الیہم کو بھیجنے کی زحمت کیجیے۔ میری اقبال کی کتاب عبدالصمد خاں لے گئے ہیں۔ معلوم نہیں کب تک شائع ہوگی۔ آفسیٹ کتابت ان کے پاس ہے۔ تحقیق کا فن ہاں کتاب کی جو صورت حال ہے وہ جمیل جالبی صاحب [30] کے خط سے آپ کو معلوم ہو جائے گی۔ آپ اس سلسلے میں میری کوئی مدد کر سکتے ہیں؟ کیا مقتدرہ یا انجمن [31] پاکستان کے کسی شہری کو اس کا معاوضہ دے سکتی ہے یا کبھی میرا پاکستان آنا ہو تو کیا مجھے معاوضہ مل سکتا ہے؟

امید کرتا ہوں کہ آپ کا مزاج بخیر [بہ خیر] ہوگا۔ مخلص

گیان چند

[۹]

شعبۂ اردو، سنٹرل یونیورسٹی [یونیورسٹی]

حیدرآباد۔۵۰۰۱۳۴ (ہندوستان)

۶/دسمبر ۱۹۸۷ء

محبی! تسلیم۔

آپ کا ۲۵/نومبر کا کرم نامہ پرسوں ۴/دسمبر کو ملا۔ جواب میں حسبِ ذیل معروضات ہیں:

ا۔ مضمون ''ترانۂ ہندی کی کہانی'' ص ۸ پر اسی جگہ ختم ہو گیا ہے جو آپ کے پاس ہے یعنی ''کم از کم ہندوستان میں'' پر۔ یہ صفحہ واپس کر رہا ہوں۔ تراشے کا تراشا بھیجنے کے لیے آپ کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ آپ میری نہ صرف ادبی مدد کر رہے ہیں بلکہ ہمہ وقت پاکستان میں میری شہرت کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ تراشے کی مدد سے مضمون کے ص ۳ میں بہت سا اضافہ کیا، ص ۲ میں صرف تین جگہ۔ اب آپ ص ۳، ۴ کی نئی کاپی کو پرانی کاپی کی جگہ رکھ دیجیے۔ مضمون کا ایک off print مجھے بھجوا دیجیے۔

۲۔ دو چار دن پہلے ایک مختصر مضمون لکھا تھا۔ اس میں اضافہ کیا اور آج ہی صاف کیا ''کیا علامہ اقبال نے غیر موزوں اشعار کہے تھے؟'' [32] اسے اورینٹل کالج میگزین [33] کے اقبال نمبر میں دے دیجیے۔ مشکور ہوں گا۔

۳۔ یہاں کی اقبال اکیڈیمی کو توجہ دلاؤں گا کہ ڈاکٹر اقبال کی پچاسویں برسی شاندار طریقے پر منائے۔ آپ کو بلائیں تو اب کی بار تفصیل سے ملاقات ہو۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔

۴۔ وقار عظیم صاحب [34] کی پروفیسری کی تاریخ درست کرنے پر شکریہ۔ سجاد باقر رضوی صاحب [35] ہندوستان میں اب بھی معروف نہیں۔ پاکستان میں ضرور ان کا اہم مقام ہوگا۔

۵۔ رفیع الدین فاروقی کو حقائق میں نے نومبر کے اوائل میں بھیج دی تھی۔ حیرت ہے کہ وہ ۲۵/نومبر تک آپ کو نہ دے سکے۔

۶۔ علم و دانش سری نگر کا ایک بہت گھٹیا رسالہ تھا۔ اس کے ایڈیٹر وہاں کے ایک سابق وزیر پیر غیاث الدین تھے۔ ظاہر ہے وہ ایک سال میں یہ پرچہ بند ہو گیا ہوگا۔ ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۷ء میں نکلا ہوگا۔ میرے سامنے علم و دانش جلد ۲، شمارہ ۱۴، ۲ ، ۱۵ اقبال نمبر دوم ہے۔ اس کا سائز رسالوں کا عام سائز یعنی ہاتھ کا ذرا چھوٹا ہے۔ صفحات ۸۰ ہیں۔ اقبال نمبر اشاید جلد ۲ کا شمارہ رہا ہو۔ اس میں ۱۱ مضامین ہیں جن

میں صرف چار اقبال سے متعلق ہیں۔ وہ یہ ہیں:

۱۔ علامہ اقبال بیداریِ مشرق کا شاعر — سیف صبر قاسم
۲۔ اقبال اور تصوف (افتتاحی خطاب) — میر غیاث الدین
۳۔ علامہ اقبال (تقریر) — ڈاکٹر شکیل الرحمن
۴۔ صدارتی تقریر — رئیس الحسن حسینی، وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی

(یہ تقریر اسی رسالے کے اقبال نمبر کی اشاعت پر کی گئی۔)

رسالہ کاغذ، کتابت اور طباعت کے لحاظ سے اچھا نہیں۔ میں اپنی کتاب تحقیق کا فن کا مسودہ اشاعت کے لیے مقتدرہ قومی زبان کو بھیج رہا ہوں ڈاک سے۔ اس میں یہ مضامین رکھ رہا ہوں۔ مقتدرہ والے کوئی معاوضہ دینے کو تیار نہیں۔ میں نے لکھا ہے کہ مشفق خواجہ کے نام کاپی رائٹ کرتا ہوں۔ دیکھیے انھیں دیتے ہیں کہ نہیں۔

میں چاہتا تھا کہ اپنی دو تین کتابیں، جو ہندوستان میں چھپ چکی ہیں؛ پاکستان میں بھی چھپوا دوں۔ یہ کتابیں وہ ہیں جو ایک موضوع پر ہیں یعنی:

۱۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں: اس کا دوسرا ایڈیشن آج کل میں انجمن ترقی اردو ہند سے شائع ہونے کو ہے۔
۲۔ تفسیر غالب: غالب کے غیر متداول کلام کی شرح، یہاں ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی تھی۔
۳۔ عام لسانیات: ۹۱۰ صفحوں کی کتاب جو ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔
۴۔ ادبی اصناف: کوئی ۱۸۰ صفحات کی کتاب جو گجرات اردو اکیڈمی سے شائع ہونے کو ہے۔

پاکستان میں انھیں کوئی کسی بھی شرط پر چھاپ دے میں تیار ہوں۔ جب حقائق اور یہ مضمون آپ کو مل جائے تو کسی کے ذریعے رسید بھجوا دیجیے۔ شکریہ۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر [بخیر] ہوگا۔

مخلص

گیان چند

[۱۰]

شعبۂ اردو، سنٹرل یونیورسٹی [یونیورسٹی]

حیدرآباد ـ ۵۰۰۱۳۴، ہندوستان

۱۶/جنوری ۱۹۸۸ء

مشفق! تسلیم

آپ کا ۳۰/دسمبر کا مکتوب بر وقت مل گیا تھا۔ شکریہ۔

نئے سال کی دعاؤں کے لیے شکریہ۔ میں بھی خدا سے دعا کرتا ہوں کہ یہ سال آپ کے لیے شادمانی و ترقی درجات کا وسیلہ ثابت

ہو۔ آمین

براہ کرم ساتھ کا خط قمر رئیس صاحب[36] کو راولپنڈی بھیج دیجیے۔ ممنون ہوں گا۔ آپ اسے پڑھ لیجیے۔

جی چاہتا ہے آپ سے مسلسل مراسلت کروں لیکن پاکستان کی ڈاک مشکل اور مہنگی ہے اس لیے دیر ہو جاتی ہے ابھی تک تحقیق کا فن کی اسلام آباد سے رسید نہیں آئی۔ میں نے کسی طرح ہوائی ڈاک سے انھیں دسمبر کے اوائل میں یہ مسودہ بھیج دیا تھا۔ یہاں یوپی اردو اکادمی لکھنؤ نے اس کی اشاعت کی ہامی بھر لی ہے۔

مجھے اہل وعیال سے تحقیق و تصنیف میں کبھی رکاوٹ نہیں ہوئی۔ میرے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہیں۔ نومبر ۱۹۷۶ء سے وہ سب الگ ہیں۔ اب سب کی شادی ہو چکی ہے پچھلے ۱۱ سال سے میں اور میری اہلیہ تنہا رہتے ہیں۔ اس سے پہلے جب بچے ساتھ بھی تھے مجھے ان کے لیے بالکل وقت نہ دینا ہوتا تھا۔ حسب دلخواہ [دل خواہ] اپنا وقت لکھنے پڑھنے میں گزارتا تھا۔ اب تو پورا وقت میرا ہے۔

قاضی عبدالودود بیکار نہیں تھے۔ ان کے ایک بیٹے کا مجھے علم ہے لیکن قاضی صاحب نے ساری عمر معاش کے لیے کچھ نہیں کیا۔ ان کا پورا وقت تصنیف و تالیف کے لیے تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ مشفق خواجہ کے بچے نہیں ہیں۔ امید ہے آپ بخیر [بہ خیر] ہوں گے۔ مخلص

گیان چند

[۱۱]

شعبۂ اردو، سنٹرل یونیورسٹی [یونی ورسٹی]

حیدرآباد ۵۰۰۱۳۴ (ہندوستان)

۳۰/اپریل ۱۹۸۸ء

مجی! تسلیم۔

کئی مہینے پہلے میں نے آپ کو ایک مضمون 'ترانہ ہندی کی کہانی' کسی رسالے میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ آپ نے اس سلسلے میں مرغوب ایجنسی[37] کے ترانے کا تراشا بھیجا۔ میں نے مضمون کو ضروری ترمیمات کے بعد آپ کو واپس کر دیا۔ امید ہے مل گیا ہوگا۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری[38] نے اس میں دو تسامحات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کی روشنی میں دو جملے حذف کرنے ہیں۔ اگر مضمون ابھی نہ چھپا ہو تو حذف کر دیجیے۔

۱۔ ص ۲ کی آخری سطر میں اور ص ۳ کی کئی ابتدائی سطروں میں میں نے سری نگر کشمیر میں سروری صاحب کے ساتھ صاحب زادہ محمد عمر سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ اکبر حیدری نے بتایا کہ وہ محمد عمر نہیں، ان کے چچازاد بھائی تھے۔ اس لیے آپ ص ۲ کی آخری سطر سے ص ۳ کی ابتدا میں ان سے ملاقات کا پورا بیان قلم زد کر دیجیے۔ اس کے بعد کا برقرار رہنے والا جملہ یہ ہوگا "سوئیز کی انگریزی عبارت میں لکھا تھا....."

۲۔ ص ۱ کے آخر میں نیز ص ۷ کے شروع میں میں نے اقبال اور حسرت وغیرہ کے معرکوں کا بیان کیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اقبال کا مضمون "اردو زبان پنجاب میں" مخزن[39] اکتوبر ۱۹۰۳ء میں چھپا تھا اور اس کا جواب حسرت نے "اصلاح زبان پنجاب" کے عنوان سے اردوئے معلّٰی[40] فروری ۱۹۰۴ء میں دیا۔ اکبر حیدری لکھتے ہیں کہ یہ اقبال کا مضمون مخزن اکتوبر ۱۹۰۲ء میں چھپا تھا۔ چونکہ میرے

مضمون سے یہ بحث غیر متعلق ہے اس لیے ص ۹ کے آخری پیراگراف سے یہ حصہ نکال دیجیے۔
''اس کے جواب میں اقبال نے مخزن اکتوبر ۱۹۰۳ء......تا ص ۷ پر یہ بھی تنقیدی تھا۔'' ص ۹ کے آخر کے دونوں فٹ نوٹ بھی نکل جائیں گے۔

میری کتاب ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب مہ و سال شائع ہو گئی ہے۔ پونے پانچ سو صفحے ہیں قیمت ۱۲۵ روپے۔ آفسیٹ پر اچھی چھپی ہے۔ معلوم نہیں کس طرح یہ کتاب آپ تک بھیجیں گے۔ تقسیم کار ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دلی۔

امید ہے آپ بخیر [بہ خیر] ہوں گے۔ یہ خط جمیل الدین عالی صاحب [۴۱] کے لفافے میں رکھ کر بھیج رہا ہوں۔

مخلص

گیان چند

[۱۴]

شعبۂ اردو، سنٹرل یونیورسٹی [یونی ورسٹی]

حیدرآباد-۵۰۰۱۳۴، ہندوستان

۲۸/جولائی ۸۸[۱۹]ء

محبی! تسلیم

آپ کو بہت سے خطوط تقسیم کرنے کی ذمے داری سونپ رہا ہوں۔ ایک خط آپ کے پرنسپل صاحب [۴۲] کے نام ہے، ایک ڈاکٹر وحید قریشی [۴۳] کے نام ہے۔ وحید صاحب کا موجودہ پتا معلوم نہیں۔ مقتدرہ قومی زبان میری کتابیات کا پمفلٹ شائع کرے گا۔ [۴۴] میں نے انجمن ترقی اردو پاکستان کو نثری داستانیں کی طبع چہارم کا مسودہ بھیجا تھا، اسی کے ساتھ کتابیات رکھ دی تھی۔ امید ہے انھوں نے مقتدرہ کو بھیج دی ہوگی۔ اس کتابیات میں چند اضافے بھیج رہا ہوں۔ جمیل جالبی صاحب کے نام کے خط کے ساتھ اضافوں سے متعلق یہ پرزہ مقتدرہ کے پتے پر بھیجنے کا کرم کریں۔

میں نے مئی کے آخر میں ندوۃ العلما[ء] کراچی [سے] شاعر سے والوں کو آپ کے لیے اپنی کتاب ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب مہ و سال ۱۹۰۸ء تک بھیجی تھی۔ لکھیے کہ آپ کو ملی کہ نہیں؟ اگر نہیں ملی تو خود حمید الدین شاہد [۴۵] ایڈیٹر سب رس سے پوچھیے کہ حیدرآباد دکن سے کچھ شعرا آپ کے لیے یہ کتاب لائے تھے، وہ کہاں ہے؟

اکبر حیدری نے لکھا ہے کہ میری کتاب پاکستان میں بھی شائع ہو گئی ہے۔ مجھے کوئی علم نہیں۔ براہ کرم لکھیے کہ کیا یہ خبر صحیح ہے۔

رفیع الدین فاروقی حیدرآباد والے نے قرآن کریم کا ابو الاعلیٰ مودودی صاحب [۴۶] کا اردو ترجمہ مرحمت فرمایا۔ میں اس سے بہت خوش ہوں۔ کیا حسین اتفاق ہے کہ اسی ڈاک سے ایک صاحب کا گیتا کا اردو ترجمہ موصول ہوا۔ اب میں تلاش میں ہوں کہ کہیں سے بائبل کا انگریزی ترجمہ بھی خرید لوں۔ میں قرآن پاک کو شروع سے آخر تک لفظ بہ لفظ پڑھوں گا لیکن آہستہ آہستہ، جستہ جستہ، بہ شرط فرصت، ناٹر [ریٹائر] ہونے کے بعد مذہبیات کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ میری اصلاح ہو سکے۔ قرآن سے استفادے کے لیے مسلمان ہونا ضروری

نہیں۔ دوسرے بھی بہ شرطِ استطاعت بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ یہی معاملہ محققوں کا ہے۔

امید ہے آپ بخیر [بہ خیر] ہوں گے۔ منسلکہ تمام خطوط پڑھ لیجیے تا کہ آپ کو کوائف سے آگاہی ہو سکے۔　　　مخلص

گیان چند

[پس نوشت]

آپ کی کتاب اقبالیات ۸۶ء۔۸۷ ابھی ملی۔ اس وقت شعبے میں لکھ رہا ہوں۔ سامنے نہیں۔ گیان چند

[۱۴]

شعبۂ اردو سنٹرل یونیورسٹی

حیدرآباد ۵۰۰۱۳۴ (ہندوستان)

۲۴/اکتوبر ۱۹۸۸ء

محبی! تسلیم۔

۲۱/ستمبر کا کرم نامہ بروقت ملا، شکریہ۔ مشکور ہوں کہ آپ میرے دو مضمون رسالوں کے خاص نمبر میں شائع کرا رہے ہیں۔ وحید قریشی صاحب کا خط نہیں آیا۔ اس میں کوئی جواب طلب بات بھی نہ تھی۔

میں نے یہاں سے تین حضرات کے لیے کتابیں بھیجی تھیں۔ ۱۔ مشفق خواجہ کو اردو مثنوی شمالی ہند میں طبع دوم نیز ابتدائی کلامِ اقبال ۲۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کو اردو مثنوی شمالی ہند میں اور ۳۔ آپ کو ابتدائی کلامِ اقبال۔ بقیہ دو حضرات کو کتابیں مل گئی ہیں، صرف آپ کو نہیں ملی۔ اس چٹھی کے آخری صفحے پر خواجہ حمید الدین شاہد کے نام ایک رقعہ لکھ رہا ہوں۔ اسے علیحدہ کر کے لفافے میں رکھ کر پوسٹ کر دیجیے۔ مجھے کراچی کا ایڈیشن دیکھنے کو نہیں ملا۔

یہ درست ہے کہ ذکر و فکر کے مضامین میں کئی غیر تحقیقی کتابوں کا ذکر آ گیا ہے۔ رفیع الدین فاروقی کا خط آیا تھا۔ وہ دسمبر میں پاکستان جائیں گے۔ جانے سے پہلے مجھ سے ملیں گے۔ ان کے ہاتھ کچھ چٹھیاں بھیج دوں گا۔

میں ۲۹ فروری ۱۹۸۸ء کو ریٹائر [ریٹائر] ہوا۔ اس کے بعد ۱۳ مہینے کا Re.appointment ملا۔ اب بہ شرطِ حیات ۳۰/اپریل ۸۹ء کو ریٹائر [ریٹائر] ہو جاؤں گا۔ لکھنؤ میں بسنے کا ارادہ ہے۔ ادھر میرے مضامین کے دو مجموعے شائع ہو رہے ہیں۔ اردو ریسرچ سنٹر کے عبدالصمد خاں شائع کر رہے ہیں۔ آلسیٹ کی کتابت میں نے کرائی ہے۔ آگے کے مصارف وہ برداشت کریں گے۔ کتاب تحقیق کا فن ہندوستان میں یو پی اردو اکادمی لکھنؤ شائع کر رہی ہے۔ اس کی جانب سے میں ہی یہاں Vendike کی کتابت کرا رہا ہوں۔ ابھی دو تہائی کی کتابت ہوئی ہے جو ۳۴۰ صفحات پر آئی ہے۔ پوری کتاب پونے سات سو اور سات سو صفحوں کے بیچ آئے گی۔ امید کرتا ہوں کہ دسمبر کے آخر تک کتابت پوری ہو جائے گی اور فروری ۸۹ء تک اشاعت ہو جائے گی۔ یہی کتاب پاکستان میں انجمن ترقی اردو کے بجائے مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد شائع کر رہا ہے۔ اس کے بعد میں نے ایک مختصر کتاب اردو کا نیا عروض لکھنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس کے لیے پڑھ لیا ہے، لکھنا باقی ہے۔ میرا عروض آسان اور تجدید کے ساتھ ہوگا جس میں زحافات کے نام نہ دوں گا، غیر مانوس اوزان نہ لوں گا۔ ہندی کے جو

اوزان اردو میں آ گئے ہیں انھیں اردو ارکان میں ظاہر کر کے دوں گا۔ نیز اردو شعرا نے مختلف اوزان میں جن اجتہادات اور آزادیوں کو جائز کیا ہے ان کو تسلیم کروں گا۔ تقریباً سو صفحے کی کتاب ہوگی۔ [48] اس کے بعد زندگی کا آخری بڑا کام کرنا چاہتا ہوں اور بس۔ اردو تحقیق کی تاریخ۔ یہ دو جلدوں میں ہوگی۔ تقریباً چار سال لگیں گے۔ میری حماقت تو دیکھیے:

ع   سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

اس میں تذکروں سے لے کر آج تک کی تحقیق کو پرکھوں گا۔ معاصرین کی تحقیق کا بے لاگ جائزہ لوں گا۔ کل دیکھنا ہے کہ تحقیق کی تاریخ پوری ہوتی ہے کہ میری زندگی کی کتاب۔ میری صحیح عمر دفتری عمر سے زیادہ ہے۔ پچھلے مہینے ۶۵ پورے کر چکا ہوں۔ تحقیق کی تاریخ کے بعد اردو میں اور کچھ نہ لکھوں گا، [49] مذہبیات کا مطالعہ کروں گا۔

محمود شیرانی [50] کی پنجاب میں اردو [51] کمزور کتاب ہے لیکن مقالاتِ شیرانی [52] اعلیٰ درجے کی تحقیق ہیں۔ تذکرہ و فکر میں لکھتے وقت میں نے مقالاتِ شیرانی نہیں دیکھی تھی۔ اب ان کو اردو کا پہلا بڑا محقق مانتا ہوں۔ ان کے بعد قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی، [53] مولانا عرشی [54] اور مالک رام [55] ہیں۔ ہندوستان کے موجودہ محققین میں چار حضرات بہت گاڑھے اور گہرے محقق ہیں: ۱۔ رشید حسن خاں ۲۔ کالی داس گپتا رضا بمبئی [56] ۳۔ ڈاکٹر شیام لال کالڑا عابد پیشاوری [57] پروفیسر و صدر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی ۴۔ ڈاکٹر حنیف احمد نقوی [58] ریڈر اردو بنارس ہندو یونیورسٹی۔ اقبال کے محققین میں ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، آپ اور محمد عبداللہ قریشی [59] چوٹی پر معلوم ہوتے ہیں۔ تینوں میں آپ ممتاز معلوم ہوتے ہیں۔ پاکستان کے عمومی محققین میں جمیل جالبی اور مشفق خواجہ سب سے اوپر دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں تک میرا سوال ہے میں ایک اوسط درجے کا محقق ہوں، کسی بلند مقام کا حق دار نہیں۔ تحقیق کی تاریخ کے سلسلے میں پاکستان کے محققین کے بارے میں لکھنے سے پہلے پاکستان کا ایک لمبا سفر کرنا ہوگا۔ لیکن یہ سب خیالی پلاؤ ہیں۔ کوچ کا نقارہ بج رہا ہے کہ میں اس جگہ دراکو نہ دیکھ سکوں۔

برادرِ کرم ڈاکٹر اسلم فرخی [60] ادبی مشیر انجمن ترقی اردو پاکستان کو میری جانب سے ایک کارڈ لکھ دیجیے کہ وہ میرا بھیجا ہوا مضمون "ہندوستان میں اردو تحقیق کی رفتار ۱۹۴۷ء تا ۱۹۸۷ء" ماہوار رسالہ اردو [61] میں شائع کر دیں۔ یوں یہ مضمون رسالہ اردو ادب دہلی کے خاص نمبر کے لیے لکھا گیا تھا، جس نمبر کا موضوع ہے: "ہندوستان میں اردو ادب کی رفتار گزشتہ [گذشتہ] ۴۰ سال میں۔" معلوم نہیں اردو ادب کا خصوصی شمارہ کب شائع ہو۔ اردو کراچی والوں کو چھاپ لینے دیجیے۔ ذیل کا خط خواجہ حمید الدین شاہد صاحب کو بھیج دیجیے۔ امید کرتا ہوں کہ آپ کا مزاج بخیر [بخیر] ہوگا۔

مخلص

گیان چند

[پس نوشت]

ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری میرے شعبے میں پروفیسر ہو کر آ گئے ہیں۔ ۵۹ سال کے ہیں۔

مکتبۂ روایت ص ب ۵۰۸۲ لاہور ۱۲ نے مجھے روایت [62] ۳ اور یادِ نسیم احمد [63] کی دو جلدیں بھیجی ہیں۔ برادرِ کرم فون ۲۹۱۰۸۱۷ پر فون کر

کے میری طرف سے شکریہ اور رسید پہنچا دیجیے۔ گیان چند

[۱۴]

University Of Hyderabad — Phones: 558220
Hyderabad-500134 (India) — 550396

۱۶ فروری ۱۹۸۹ء

محبی! تسلیم۔

یہ خط یونیورسٹی کی ڈاک سے بھیج رہا ہوں۔ معلوم نہیں آپ تک پہنچے گی کہ نہیں۔ میں نے آپ کو ایک مضمون ''اقبال کی مہارت عروض'' بھیجا تھا۔ اس کا دوسرا حصہ ہے ''اقبال کے چند منسوخ اشعار کا وزن''۔[64] اس میں تین غلطیاں رہ گئیں جن پر یہاں گرفت کی گئی۔ اگر ابھی وہ مضمون شائع نہ ہوا ہو تو اس میں ذیل کی تصحیحات کرا دیجیے۔ یہ سب جزِ دوم منسوخ اشعار کا وزن سے متعلق ہیں:

۱۔ میں نے لکھا ہے: ''فارسی کی دو غزلوں کے مطلعے یہ ہیں۔'' اس کے آگے دو شعر ہیں:

پیر اہن و جوشن چہ آتش جنوں گرفت — سینہ بہ برق درگم، دیدہ بہ نیشتر زنم

اور اس کے بعد مطلع ہے: دسیدۂ، دمیدۂ۔ چونکہ ان میں پہلا شعر مطلع نہیں اس لیے تعارفی جملے میں 'مطلعے' کی جگہ 'شعر' کر دیا جائے یعنی: ''فارسی کی دو غزلوں کے یہ شعر ہیں:''

۲۔ اس کے آگے دو اردو اشعار درج کیے ہیں اور اُن کا وزن اُن کے نیچے دیا ہے۔

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
مفتعلن مفاعلن — مفتعلن مفاعلن

پہلے 'مفاعلن' کو بدل کر 'مفاعلان' کر دیا جائے یعنی: مفتعلن مفاعلان مفتعلن مفاعلن

۳۔ کافی آگے چل کر خاقانی کے دو فارسی اشعار درج ہیں۔ ان میں دوسرے شعر کا پہلا مصرع یوں چھپا ہے:

گرچہ بہ موقع لقب مفتعلن دوبار دو شد

اس مصرع میں 'موقع' کی جگہ 'موضع' کر دیجیے 'موضع لقب'

اگر یہ تصحیحات کی جا سکیں تو میں خوش ہوں گا۔

آج کل میرے پاس میری تین کتابوں کی مکمل کتابت موجود ہے کاتب غلطیوں کو بنا رہا ہے۔ امید ہے چند ماہ میں چھپ جائیں گی۔ کتابیں یہ ہیں:

۱۔ تحقیق کا فن: اسے یوپی اردو اکیڈیمی لکھنؤ شائع کر رہی ہے۔ ان کے لیے میں نے یہیں کتابت کرائی، جلد بھیج دوں گا۔

۲۔ کھوج:[65] یہ تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ۳۔ پرکھ اور پہچان:[66] اس کے دو حصے ہیں: پہلے میں تنقیدی مضامین ہیں دوسرے میں ادیبوں کے بارے میں مضامین ہیں۔ ان دونوں کو عبدالصمد خاں اپنے حیدر آباد اردو ریسرچ سنٹر سے شائع کریں گے۔

تحقیق کا فن میں تقریباً ۶۷۰ صفحات ہیں۔ اسے مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد بھی شائع کر رہا ہے۔ وہ لوگ کتابیاتِ گیان چند بھی چھاپنے والے تھے۔ معلوم نہیں اس کا کیا ہوا؟[۶۷]

یہاں کے رفیع الدین فاروقی پاکستان جانے والے تھے اور جانے سے پہلے مجھ سے ملنے کا وعدہ تھا۔ آئے نہیں۔ میں خود ۲۶ر نومبر سے ۹ر دسمبر تک دورِ جنوب کی سیاحت پر چلا گیا تھا۔ وہاں آنکھ کی Retina detach کر لی۔ حیدرآباد آ کر ۱۲ر دسمبر ۸۸ء کو آپریشن کر دیا جو ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہا۔ اب آنکھ ٹھیک ہے۔

میں اپریل ۸۹ء کے آخر میں حیدرآباد سے سبک دوش ہو جاؤں گا۔ بعد میں بہ شرطِ حیات، لکھنؤ رہنے کا پروگرام ہے۔ میرے شعبے میں ڈاکٹر اکبر حیدری بھی پروفیسر ہو کر آ گئے ہیں۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر [بخیر] ہوگا۔

مخلص

گیان چند

[۱۵]

شعبۂ اردو، سنٹرل یونیورسٹی

حیدرآباد۔ 500134، ہندوستان

۱۲ر اپریل ۱۹۸۹ء

محبی! تسلیم۔

کرم نامہ ملا۔ شکریہ ایک مختصر سا مضمون "اقبال کا ایک ہم نشیں" بھیج رہا ہوں۔ کسی رسالے میں چھپوا دیجیے۔

مجھے ابھی لاہور سے دعوت نامہ نہیں ملا۔ جیوں [جوں] ہی آئے گا میں منظوری بھیج دوں گا۔ آپ کا مشکور ہوں۔ کوئی تحقیقی مضمون تو شاید ممکن نہ ہو، ایک تنقیدی مضمون ہی لکھنے پر اکتفا کروں گا۔ عنوان "غیر مسلموں کے لیے اقبال کے اردو کلام کی معنویت" اس میں دکھاؤں گا کہ اقبال کی تعلیمات میں سے کون کون سے ایسی ہیں جو غیر مسلموں کے لیے بھی مفید ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ کسی نے اس موضوع پر پہلے ہی تو نہیں لکھ دیا؟[۶۸]

میری جو کتابیں ایک موضوع پر ہیں، چاہتا ہوں کہ پاکستان میں بھی چھپ جائیں۔ معاوضہ جو بھی کچھ ہو، غیر پاکستان میں کام آئے گا۔ کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں ۲۔ تفسیرِ غالب (منسوخ کلام کی شرح)

۳۔ عام لسانیات ۹۱۰ صفحے ۴۔ ادبی اصناف تقریباً پونے دو سو صفحے۔ یہ ابھی ہندوستان میں زیرِ طبع ہے۔

۵۔ اردو کا اپنا عروض۔ تقریباً ۱۲۵ صفحے۔ اس میں عروض کی تشکیلِ جدید کی ہے اور اصطلاحوں سے بچ کر آسان زبان میں لکھا ہے۔ مندرجہ بالا میں سے کسی بھی کتاب کی اشاعت کی کوئی صورت نکل آئے تو لکھیے۔[۶۹] مشکور رہوں گا۔

سیارہ میں "ترانہ ہندی" پر جو میرا مضمون چھپا اس کے ایک بیان کی تصحیح کی ضرورت ہے۔ ساتھ میں ملفوف کر رہا ہوں۔ مراسلے کے طور پر چھپوا دیجیے۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر [بخیر] ہوگا۔ یہ خط اپنے ایک شاگرد کے ہاتھ بھیج رہا ہوں جو اپنی تحقیق کے سلسلے میں پاکستان جا رہے ہیں۔

مخلص

گیان چند

[۱۶]

۱۵؍ اپریل ۱۹۸۹ء[۴۰]

محبی! آج آپ کا ۸؍ اپریل کا کرم نامہ ملا۔ آغا سہیل[۴۱] کا مقالہ مشفق خواجہ نے میرے پاس بھیج دیا تھا۔ ان کے اعتراض خوب ہوتے ہیں۔ اگر میں نے پہلے ایڈیشن کے بعد کتاب کو بدل کر نئی ترتیب سے لکھ دیا ہے تو اس میں آغا سہیل کو یا کسی دوسرے کو کیا اعتراض۔[۴۲] سہیل بخاری[۴۳] کے مقالے سے میں نے جو کچھ لیا ہے اس کا اعتراف کیا ہے جہاں اعتراف نہیں وہ ان کے مقالے سے نہیں لیا۔ کتاب کا تیسرا ایڈیشن یوپی اردو اکیڈمی لکھنؤ سے چھپا۔ وہ اور زیادہ مفصل ہے۔ چوتھا ایڈیشن قدرے ترمیم کے ساتھ انجمن کراچی میں چھپ رہا ہے۔ غالباً جولائی میں آ جائے گا۔ اس میں سہیل کے مقالے کا زیادہ تفصیل سے ذکر ہے۔

[۱۷]

A 15 سنٹرل یونیورسٹی

حیدرآباد 500134 (ہندوستان)

یکم جنوری ۱۹۹۰ء

محبی! تسلیم۔

آپ کا ۲۷؍ نومبر کا کرم نامہ مجھے شمالی ہند کے سفر سے واپسی پر ملا۔ میں ۳۰؍ نومبر کو دلی و لکھنؤ کے سفر پر گیا تھا۔ ۲۳؍ دسمبر کو واپس آیا۔ مکتوب سے یہ تشویش ناک خبر ملی کہ آپ کسی حادثے کے شکار ہو گئے تھے۔[۴۴] امید ہے اب آپ شفائے کلی حاصل کر چکے ہوں گے۔ میری دعا ہے کہ یہ سال ۱۹۹۰ء آپ کی صحت اور خوشی و ترقی کا سال ثابت ہو اور اس میں آپ مزید علمی و ادبی فتوحات حاصل کریں۔

میں اردو تحقیق کی تاریخ کے منصوبے پر کام کر رہا ہوں۔ کام آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہے۔ زندگی تیزی سے گزرتی جا رہی ہے۔ ۶۶ سال سے بڑھ گیا ہوں۔ کون جانے کہ کام پورا کر سکوں گا کہ نہیں۔ میں نے طے کیا ہے کہ تحقیق کی تاریخ لکھنے کے دوران کوئی مضمون نہ لکھوں گا تا کہ کام میں خلل نہ پڑے۔ اس لیے علامہ اقبال پر مضمون لکھنے کا ارادہ بھی فسخ کرتا ہوں۔ جگن ناتھ آزاد تقریباً اس موضوع پر لکھ چکے ہیں۔ ان کا مضمون میری نظر سے نہیں گزرا۔ لائبریری میں کتاب تلاش کر کے دیکھوں گا۔ پاکستان آنے کا ارادہ بھی فی الحال موقوف۔ اگر زندہ رہا تو تحقیق کی تاریخ جلد اول مکمل کرنے کے بعد آؤں گا کیونکہ دوسری جلد میں پاکستان کے محققین کی تفصیل ہوگی۔ پہلی جلد کی تکمیل ہی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ اصلاً میں یہ تاریخ تین جلدوں میں لکھنا چاہتا تھا۔ اب قطع کر کے دو جلدوں پر آ گیا ہوں۔

خورشید احمد خاں صاحب[۴۵] کے دو خطوط میرے نام آئے۔ میں انھیں جواب نہ دے سکا۔ وجہ یہ ہے کہ انھوں نے میرے ساتھ کام کرنے والے ریسرچ اسکالر کلیم الحق قریشی سے کچھ دریافت کرایا تھا۔ یہ صاحب کئی ماہ سے ملے ہی نہیں۔ براہ کرم خورشید احمد خاں کو

414658 پر فون کر کے کہہ دیجیے کہ مجھے ان کے دونوں خط نومبر میں مل گئے تھے۔ کلیم الحق قریشی سے متعلق امر کے متعلق دریافت کر کے انھیں جواب لکھوں گا۔

معلوم نہیں آپ کو رسالہ اردو ادب دہلی ملتا ہے کہ نہیں۔ اس کے تازہ شمارے میں میرا ایک کتابچہ اردو کا اپنا عروض شائع ہوا ہے۔ اس کے آخر میں دوسروں کے دو چھوٹے چھوٹے مضمون بھی ہیں۔ کتابچے کو علیحدہ سے کتابی صورت میں بھی چھاپا ہے۔ ستم ظریفی یہ کی ہے کہ اس کے آخر میں بھی وہ دونوں مضمون شامل کر دیے ہیں۔ اگر آپ کو اردو ادب نہ ملتا ہو تو میں کتابچہ بھیجوں۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر [بہ خیر] ہوگا۔

مخلص

گیان چند

[۱۸]

A 15 سنٹرل یونیورسٹی،

حیدرآباد دکن ۔ ۵۰۰۱۳۴

۱۳ فروری ۱۹۹۰ء

محبی! تسلیم۔

آپ کا ۱۷/ جنوری کا کرم نامہ ملا۔ مشکور ہوں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اب آپ بخیر [بہ خیر] ہیں۔

میرے پاس اردو کا اپنا عروض کی کوئی کاپی نہیں بچی۔ محض ۹۶ صفحات کی کتاب ہے۔ میں نے اس کی ایک کاپی مشفق خواجہ کے لیے اور ایک مزید کاپی بھی انھیں بھیجی ہے کہ فوٹو کے ذریعے پاکستان کے کسی ناشر سے چھپوا دیں۔ جلد چھپ جانی چاہیے۔ اگر آپ کا عروضی شاگرد اشتیاق بالا ایقاق رکھتا ہو تو مشفق خواجہ صاحب سے رسالے کا زیراکس منگا لے۔

شاعر نے گوشۂ گیان چند نکالا تھا۔[۶] مجھے ساہتیہ اکادمی کا انعام ملنے پر یہاں کے شعبۂ اردو نے مجھے ایک کتابچہ نذر کیا تھا جس کے کئی مضامین رسالہ شاعر سے لیے گئے تھے۔ کتابچے کا نام نذر گیان تھا اور یہ ۸ مارچ ۱۹۸۳ کو دیا۔ میرے پاس اس کی بھی محض ایک کاپی ہے۔ کتابچہ چنداں اہم نہیں۔ شعبے کے اساتذہ اور طلبہ کے مضامین پر مشتمل ہے۔

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ یہ خط ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کی معرفت بھجوا رہا ہوں۔

مخلص

گیان چند

[۱۹]

9/25، اندرا نگر لکھنؤ 226016

(ہندوستان)

۱۵/ مارچ ۱۹۹۱ء

محبی! تسلیم۔

آپ کا ۱۸؍ جنوری کا کرم نامہ دو تین دن پہلے ملا۔ بہت وقت لگا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے میری دونوں کتابیں دیکھ لیں۔ ساتھ ہی یہ بھی ندامت ہے کہ میں یہ آپ کو پیش نہ کر سکا۔ تجزیے[۷۷] اور تحریریں[۷۸] دونوں کی میرے پاس محض ایک ایک کاپی ہے۔ یہ مجموعے علالت ہوئے out of print ہو گئے۔

میں نے لکھنؤ میں مکان بنایا ہے لیکن کم ہمتی کے سبب ایک ٹھیکیدار کو مع سامان کے ٹھیکہ دیا۔ اس سے روپیہ بھی زیادہ لگا اور شاید اتنا اچھا نہ بن سکا جیسا کہ خود بنانے میں ہوتا لیکن پریشانی اور بھاگ دوڑ سے بچ گیا۔

میں اہلیہ کے ساتھ پاکستان آؤں گا تقریباً تین ہفتے کے لیے میری امریٹس فیلوشپ کی Contigency کی رقم ہے اس میں سے میرے سفر کے جزوی اخراجات مل جائیں گے۔ اہلیہ کے اخراجات میرے ذمے ہوں گے۔ دس پندرہ دن کراچی میں رہوں گا، دو تین دن لاہور اور دو تین دن اسلام آباد۔

یہاں پاکستان ہائی کمیشن میں ویزا کے لیے درخواست دی ہے۔ ارادہ کر رہا ہوں کہ رمضان گزرنے کے فوراً بعد آ جاؤں۔ پہلے دہلی سے ہوائی جہاز سے کراچی جاؤں گا، وہاں ابتداً مشفق خواجہ کے یہاں قیام کروں گا۔

براہ کرم ڈاکٹر سید معین الرحمن[۷۹] اور وحید قریشی صاحب کو (اگر وہ لاہور میں رہتے ہیں) فون کر کے میرے متوقع دورہ کی خبر دے دیجیے۔ ساتھ کا خط پوسٹ کرنے کی زحمت کیجیے۔ یہ صاحب انٹرمیڈیٹ میں میرے کالج ہوسٹل میں تھے، مجھ سے ایک سال جونیر۔

امید ہے آپ بخیر [بخیر] ہوں گے۔

مخلص

گیان چند

[۴۰]

مظفر نگر یوپی ہندوستان

۱۳؍ اپریل ۱۹۹۱ء

محبی! تسلیم۔

میں عزیزوں سے ملنے مغربی یوپی آیا ہوا ہوں۔ کئی مقامات پر گھوم کر ۱۵؍ اپریل کو لکھنؤ واپس ہوں گا۔

ایک نظم کہی ہے جو سیّارہ میں اشاعت کے لیے بھیج رہا ہوں۔ یہاں میرے پاس سیّارہ کا پتا نہیں۔ اس لیے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔

پاکستان کا سفر ملتوی ہو گیا ہے حیات باقی ہے تو جاڑوں میں آؤں گا۔ رام لعل صاحب[۸۰] کی معرفت آپ کے نام ایک خط بھیجا ہے۔ سیّارہ میں آپ کا خاکہ بہت پسند آیا۔[۸۱] امید ہے آپ کا مزاج بخیر [بخیر] ہو گا۔

مخلص

گیان چند

[۴۱]

۲۵/۱۹، اندرا نگر

لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۱۶ (ہندوستان)

۱۸/اپریل ۱۹۹۱ء

محبی! تسلیم۔

رام لعل صاحب کیم مئی کو فیض سیمینار (یمی نار) میں شرکت کے لیے کراچی جا رہے ہیں۔ یہ چٹھی انھی کے ہاتھ بھیج رہا ہوں۔ میں اپریل مئی میں پاکستان آنا چاہتا تھا لیکن میں کاہل واقع ہوا ہوں۔ مجھے ابھی تک ویزا ہی نہیں ملا۔ انجمن ترقی اردو ہند دہلی میں ایم حبیب خاں نے یہ ذمے داری لی تھی۔ میں نے اپنا پاسپورٹ اور فارم انھیں بھیج دیا تھا۔ آگے کیا ہوا؟ معلوم نہیں۔ مجبوراً میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ اگر زندہ رہا تو نومبر ۹۱ یا فروری ۹۲ء میں آؤں گا۔

سیارہ کا نیا شمارہ ۳۰ ملا، خوب ہے۔ اس کے کئی مضامین دیکھ ڈالے۔ سب سے زیادہ دلچسپ اشفاق محمود ریک [۸۲] کا مضمون بھلا مانس پروفیسر ہے۔ اس کے ذریعے آپ کو مزید جانا۔ آپ بالکل تو بۃ النصوح ہیں۔ میں عاصی پُر معاصی ہوں۔ آپ کو لکھتے ہوئے مجھی ڈر لگتا ہے۔

حفیظ الرحمٰن احسن صاحب [۸۳] کا مجموعہ فصل زیاں ملا۔ میری طرف سے انھیں شکریہ پہنچا دیجیے۔ کتاب پر نام اس طرح لکھا ہے کہ فصل زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ تعارفی مضامین سے ان کے بارے میں اندازہ ہوا۔ غزلوں میں واقعی بہت سنبھلا ہوا لفظ ہے ریشم میں لپٹا ہوا مجھے۔ خوب کہتے ہیں۔ غزلوں میں سماج پر تبصرے کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس کے باوجود غزلیت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

میں اپنی وہ کتابیں پاکستان میں شائع کرانا چاہتا ہوں جو مضامین کے مجموعے نہیں بلکہ کسی ایک مستقل موضوع پر ہیں۔ نثری داستانیں اور تحقیق کا فن تو وہاں چھپ چکی ہیں۔ مزید کتب یہ ہیں: اردو مثنوی شمالی ہند میں۔ میں نے اس میں خاصی ترمیم کی ہے۔ اب کی بار مختصر مثنویوں کو خارج کر دیا ہے۔ اس کتاب کے دو ایڈیشن انجمن ترقی اردو ہند شائع ہو چکے ہیں۔

۲۔ تفسیرِ غالب　غالب کے منسوخ کلام کی شرح

۳۔ ادبی اصناف　تقریباً پونے دو سو صفحوں کی مختصر کتاب جو چند ماہ قبل گجرات اردو اکادمی احمد آباد سے شائع ہوئی ہے۔

۴۔ اردو کا اپنا عروض　محض ۹۷ صفحے

۵۔ عام لسانیات　نو سو سے زیادہ صفحات

اس کے علاوہ میں اپنے منتخب مضامین، مضامین گیان چند کے نام سے چھپوانا چاہتا ہوں۔ ان کی پانچ جلدیں ہوں گی جو اس طرح ہیں:　۱۔ پہلی جلد تحقیقی　۲۔ دوسری جلد غالبیات　۳۔ تیسری جلد تحقیقی　۴۔ چوتھی جلد تنقیدی

۵۔ پانچویں جلد لسانیاتی

ان جلدوں میں ہلکے پھلکے مضامین نہیں ہے۔ صرف ٹھوس مضامین کو جگہ دی ہے۔ اگر ان سب کتب کی اشاعت کا وہاں انتظام ہو جائے تو کیا کہنا۔ عام لسانیات تو کسی ادارے سے چھپنی چاہیے۔ میں نے اس کے لیے جمیل جالبی صاحب کو لکھا ہے کہ کیا مقتدرہ سے چھاپ دیں گے؟ سب کتابوں کو خفیف سی ترمیم کے ساتھ تیار کر رہا ہوں۔ کوئی صورت نکلے تو میں ان چیزوں کو ڈاک سے بھیج سکتا ہوں۔ کل میں مطربی

یوپی میں اپنے وطن جا رہا ہوں۔ کئی مقامات پر جاؤں گا۔ مظفر نگر، بجنور، سہارن پور، دہرہ دون۔ یہ مقامات میرے اور میری بیوی کے بھائی بہنوں کے ہیں۔ ۱۵ر مئی کو لکھنؤ واپس آؤں گا۔ امید کرتا ہوں کہ آپ کا مزاج بخیر [بہ خیر] ہوگا۔

مخلص

گیان چند

[۴۲]

۲۵/۱۹، اندرا نگر

لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۱۶

۲۳/ جون ۱۹۹۱ء

محبی! تسلیم۔

آپ کا ۲۹ر مئی کا کرم نامہ چند روز پہلے ملا تھا۔ میں مغربی یوپی کے دورے سے ۱۵ر مئی کو واپس آ گیا تھا۔

ساتھ کی چٹھی جاوید طفیل صاحب[۸۴] کو بھیجنے کا کرم کریں یا انھیں پڑھ کر سنا دیں۔

ممنون ہوں کہ آپ میری کتابیں شائع کرانے کی فکر کر رہے ہیں۔ جمیل جالبی بھی اس سلسلے میں کچھ کر رہے ہیں۔ کتابیں تیار کر لوں تو انھیں بھیجوں گا۔ آئندہ کبھی مجھے لکھیں تو ڈاکٹر وحید قریشی کا موجودہ پتا لکھیے۔

میں نے حال میں مزید کچھ نہیں لکھا ہے۔ بس ایک سرسری مضمون ''شمس الرحمن فاروقی کی اصلاحیں'' لکھا تھا جو کراچی میں طلوع افکار[۸۵] کے لیے بھیج دیا ہے۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر [بہ خیر] ہوگا۔

مخلص

گیان چند

[۴۳]

۲۵/۱۹، اندرا نگر

لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۱۶ (ہندوستان)

گھر کا فون نمبر ۳۸۲۶۳۰

۱۸/۳۰۔ مارچ ۱۹۹۲ء

محبی! تسلیم۔

آپ کا ۱۷ر فروری کا کرم نامہ کافی دن سے ملا تھا۔ شکریہ۔ اردو کی نثری داستانیں لکھنؤ ۱۹۸۷ء اس کتاب کا آخری ایڈیشن ہے۔ یہی معمولی ترمیم کے ساتھ برسوں سے انجمن ترقی اردو پاکستان میں زیرِ طبع ہے۔ میں نے تحقیق کا فن کا مسودہ پہلے مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد میں اور اس کے کچھ بعد یوپی اردو اکادمی لکھنؤ کو دیا۔ لکھنؤ کا ایڈیشن کبھی کا چھپ گیا۔ مقتدرہ میں منظوری کے باوجود آج تک نہیں چھپا۔ اب میں نے جمیل جالبی صاحب کو لکھا ہے کہ کہیں اور سے چھپوا دیں۔

میرے پاس اس کتاب کی کوئی کاپی نہیں۔ کئی حضرات کو خرید کر تحفہ دے چکا ہوں۔ ایک کاپی خرید کر آپ کو بھی پیش کروں گا۔ اگر ادھر سے کوئی شخص لے جا سکے تو مجھے لکھیے۔ مقدمے اور تبصرے [86] آپ کو پسند آئی، اس کا شکریہ۔ ادھر میری کُل شاعری کا ایک مجموعہ کچھے بول کے نام سے چھپ گیا ہے۔ علامت [87] جس میں میری نظم شائع ہوئی ہوگی مجھے آج تک نہیں ملا۔ مشفق خواجہ صاحب نے لکھا تھا کہ وہ ۹۴-۱۹۹۳ء کے بابائے اردو لیکچر کے لیے مجھے مدعو کرا دیں گے۔ وہاں سے دعوت نامہ نہیں آیا۔ میرا جانا رک گیا۔ کسی تقریب کے بغیر ویزا ملنا مشکل ہے۔ میں نے اپنی آپ بیتی پر ایک مضمون لکھ دیا ہے۔ کتاب ہرگز نہ لکھوں گا۔ میرے ایسے کوئی اکتسابات نہیں کہ ان پر کتاب لکھوں۔ آج کل میں اردو کی ادبی تاریخوں کا تحقیقی جائزہ کے نام سے ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ کام کی رفتار سست ہے۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر [بہ خیر] ہوگا۔

مخلص

گیان چند

[۴۳]

۱۹/۲۵، اندرا نگر

لکھنؤ-۲۲۶۰۱۶ (ہندوستان)

فون ۳۸۲۶۳۰

۲۵/ مارچ ۱۹۹۳ء

محبی! تسلیم۔

آج عید ہے آپ کو مبارک ہو۔ میرا یہ رقعہ تہنیت کل نکلے گا کیونکہ آج ڈاک خانے کی چھٹی ہے۔ آپ کا ۱۴/ مارچ کا کرم نامہ کل ملا۔ میرے سامنے ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی [88] کی کتاب نذیر احمد، شخصیت اور کارنامے لکھنؤ ۱۹۷۳ء ہے۔ اس کے ص ۱۸۵ پر وہ خبر دیتے ہیں کہ انھوں نے تقویۃ النصوح کا مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۷۳ء کا ایڈیشن عظیم الشان صدیقی کے پاس دیکھا۔ ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی میں اردو کے استاد ہیں۔ انھوں نے دہلی یونیورسٹی سے "اردو ناولوں کا آغاز و ارتقاء ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی، ۱۹۷۰ء میں۔ آپ ان سے رابطہ قائم کیجیے۔ [89]

مجھے انجمن ترقی اردو پاکستان نے بابائے اردو لیکچر کے لیے مدعو کیا تھا۔ میں نے تقسیم لیکچر، اردو کی ادبی تاریخوں کا جائزہ ۱۹۸۰ء تک لکھ کر بھیج دیا۔ لیکچر کی تاریخ ۲۹/ اکتوبر ۱۹۹۲ء تھی۔ ستمبر میں اپنے اور اہلیہ کے ویزے کی درخواست دی۔ نہ ملا۔ میں پچھلے ہفتے دہلی گیا تھا۔ پاکستان ہائی کمیشن میں پریس کے افسر جمیل صاحب سے مل کر اپنے پاسپورٹ واپس لے آیا۔ ویزا نہ دینے کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی۔ مارچ کے اوائل میں ڈاکٹر محمد حسن [90] اور الٰہ آباد کے ڈاکٹر عقیل رضوی [91] پاکستان کے طویل ادبی دورے سے واپس آئے ہیں۔ قدر[؟] ہے تو مجھ جیسے غیر سیاسی آدمی پر۔ ان کی مرضی! امید ہے آپ کا مزاج بخیر [بہ خیر] ہوگا۔

مخلص

گیان چند

[۴۵]

۹/۲۵ اندرا نگر

لکھنؤ۔۲۲۶۰۱۶

ہندوستان

۱۵/دسمبر ۱۹۹۶ء

محبی ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب! تسلیم۔

آپ کا کرم نامہ ملا۔ اس کی ابتدا میں ۱۵/اکتوبر ۹۶ء کی تاریخ پڑی ہے۔ انتہا میں ۳/نومبر کی لیکن مجھے یہ دسمبر ۹۶ء میں ملا۔ بڑے بھائی سولس صاحب کی [تعزیت] کا شکریہ۔[92] ہماری زبان کے ایڈیٹر خلیق انجم[93] کے اصرار پر میں نے یہ مضمون لکھ کر بھیجا تھا۔

تحقیق کافن کی آپ ضرور ورق گردانی کیجیے۔ شاید آپ کو پسند آئے۔

میں نے اسلوب احمد صاحب[94] کا خط بھیج دیا ہے۔ آپ اس کے لیے معذرت خواہ کیوں ہیں؟ آئندہ ہندوستان میں اگر پانسات [پان سات] خطوط بھی بھیجنے ہوں تو مجھے بھیج دیجیے۔ میں انھیں لفافوں میں بند کر کے بھیج دوں گا۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر [بہ خیر] ہوگا۔

مخلص

گیان چند

[۴۶]

۹/۲۵ اندرا نگر لکھنؤ (ہندوستان) ۲۲۶۰۱۶　　　　امریکا کا پتا: 22356 West HARRISON Street

PORTERVILLE, California-93257 (U.S.A)

۳/دسمبر ۱۹۹۷ء

ذی مکرم! تسلیم۔

پاکستان بخیر و خوبی سے واپسی کے بعد مکروہات کچھ ایسی لگاتار میں اس طرح پھنسا رہا کہ آپ کو آپ کی چشمِ لطف کے لیے شکریے کا خط بھی نہ لکھ سکا۔[95] مصروفیت نے چٹھیاں لکھنے کی مہلت فرصت فراہم نہ ہونے دی۔ مجھے پاکستان اور اہلِ پاکستان بہت پسند آئے۔ اردو والوں کے حسین سلوک نے میرا جی موہ لیا۔ لاہور کے اساتذہ، طلبہ اور درس گاہیں کبھی میرے جذبات سے محو ہونے والی نہیں۔ آپ حضرات سے ملاقات محض ایک دو لمحے کے لیے ہوئی۔ سمندر سے پیاسے کو شبنم ملے تو تشنگی تھوڑے ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بشرطِ حیات ایک بار پھر آپ کے پاس آؤں۔ آپ نے تاریخی ادارے اور نٹل کالج میں مجھ کم سواد کے لیے جیسا شاندار اہتمام کیا، اس کے لیے کالج اور شعبے کا تہِ دل سے مشکور ہوں۔ آپ نے لطفِ خاص اخلاص سے کام لے کر میرے مستقر پر دوبارہ قدم رنجہ کیا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اردو کے سب سے بڑے شاعر اقبال کا سب سے بڑا اقبال شناس و ماہر (آپ) [کو] ابھی تک پروفیسری پر فائز نہیں کیا گیا۔ یہ پاکستان کے لیے شرم کی بات ہے۔ ہندوستان میں متعدد ایسے معلم جو آپ کی خاکِ پا بھی نہیں، پروفیسر بنے ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں آپ کے ساتھ کب انصاف ہوگا؟[96]

آپ سے مل کر قلب و ذہن دونوں کو استراحت اور روشنی ملی۔ آپ کے خلوص نے مجھے بندۂ بے دام بنا دیا۔ میں ۲۲ر دسمبر کو امریکہ سدھار رہا ہوں۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر [بہ خیر] ہوگا۔

تحسین فراقی اور اورنگ زیب صاحب ۹۷ کو میرا سلام پہنچا دیجیے۔ فراقی بڑے شگفتہ ہیں، وہ فراق نہیں وصالی ہیں۔

مخلص

گیان چند

[۴۷]

Phone: 949-559-6012 — 23 NEVADA

email: gianchand@aol.com — IRVINE-CA.92606 (U.S.A.)

۵ر جنوری ۲۰۰۰ء

محبّ مکرم، تسلیم۔

تین چار دن پہلے آپ کے لیے ایک صاحب نے ای میل کا پیغام بھیجا۔ عجیب سا خط تھا، اس میں ایک جگہ یہ بھی لکھا تھا۔ may be forged میں یہ سمجھا کہ کوئی مذاق کر رہا ہے۔ جب اردو میں لکھا خط اسی کے سلسلے میں دیکھا تو اندازہ ہوا کہ پیغام آپ کی طرف سے ہے۔ شروع میں صرف ڈاکٹر ہاشمی دیکھ کر میں یہ سمجھا کہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۹۸ مخاطب ہیں۔

میری اصل تاریخ ولادت ۱۹ر ستمبر ۱۹۲۳ء ہے۔ سرکاری کاغذات میں ۴ر فروری ۱۹۲۷ء ہے۔ معلوم نہیں آپ کو اس کی کیوں ضرورت پڑی؟ میرے ہائی اسکول سرٹیفکیٹ میں میرا نام Gian Chand Jain ہے۔ اردو میں میں نے جین لکھنا ترک کر دیا ہے کیونکہ یہ مذہب کا نام ہے۔ اسے Sur name بنانا مناسب نہ تھا۔ یہاں آرام سے گزر رہی ہے لیکن اردو کا ماحول نہیں، مشرق کی ملنساری نہیں۔ آسائش ہے لیکن جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں۔

پاکستان کے بارے میں یہی کہوں گا۔ ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ لاہور تو میں نے جیسے دیکھا ہی نہیں۔ کتب خانوں میں نہیں گیا۔ اہل ادب کے دولت خانوں میں جا کر ان کے نجی کتب خانے نہیں دیکھے مثلاً ڈاکٹر معین الرحمٰن کے یہاں کیا کیا نوادر نہ ہوں گے۔ افسوس تو یہ ہے کہ پاکستان یا ہندوستان جانے کی اب کوئی امید نہیں۔ ساڑھے چھہتر سال کا ہونے کو ہوں۔ جسم کا توازن (Balance) بگڑ گیا ہے۔ وسط جنوری کے بعد Prostate کا آپریشن کرانا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر معین الرحمٰن اور دوسرے احباب کو میرا سلام کہہ دیجیے۔ آپ سب کو عید اور نیا سال مبارک ہو۔ میں نئی صدی نہ کہوں گا کیونکہ میرے نزدیک ۳۱ر دسمبر ۲۰۰۰ کو بیسویں صدی ختم ہوگی۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر [بہ خیر] ہوگا۔

مخلص

گیان چند

[۴۸]

Phone & Fax: 949-559-6012 — 23 NEVADA
email: gianchand@aol.com — IRVINE-CA.92606 (U.S.A.)

۲۳ر اگست ۲۰۰۹ء

محبی ڈاکٹر رفیع الدین صاحب! تسلیم۔

ڈاکٹر خلیل انجم کی معرفت بھیجا ہوا آپ کا کرم نامہ ایک ہفتے پہلے ملا۔ میں قاضی عبدالودود پر ایک ضخیم کتاب لکھنے میں مستغرق ہوں۔ ۷۰۰ صفحوں کی ہوگی اور امید ہے میں آئندہ تین ہفتوں میں اسے پورا کرلوں گا۔ اس کی وجہ سے مجھے کوئی مضمون لکھنے میں تو تکلف تھا لیکن آپ کی فرمائش کا تو احترام کرنا تھا۔ ایک مضمون بہ عجلت تیار کر کے بھیج رہا ہوں۔ رجسٹری نہیں کرا رہا۔ امید کرتا ہوں کہ آپ کو مل جائے گا۔ جیوں [جوں] ہی ملے اپنے دوست صاحب کی معرفت مجھے ای میل سے رسید بھیج دیجیے۔[۹۹]

حیرت ہے کہ آپ کو میرے مستقر کے بارے میں تذبذب تھا۔ میں اور اہلیہ شروع ۱۹۹۸ء میں امریکہ منتقل ہو گئے ہیں۔ گھر کرائے پر لے کر یہاں میں اپنے لڑکے کے ساتھ رہتا ہوں۔ یہاں سے دو سو میل کے فاصلے پر میری لڑکی اور داماد رہتے ہیں۔ ان سے اکثر ملنا اور فون پر بات کرنا ہوتا رہتا ہے۔ میرا ایک لڑکا بنکاک (تھائی لینڈ) میں ہے۔ ہندوستان میں کوئی نہیں، اس لیے منتقل ہوئے۔ میں اور میری بیوی بیماریوں کے جھیلے ہیں۔ ابھی ۱۳ر اگست کو میں نے ہرنیا کا آپریشن کرایا جو اس بیماری کا میرا چھٹا آپریشن ہے۔ ساتھ ہی مجھے Parkinson's Disease بھی ہو گیا ہے لیکن مجھے رعشہ نہیں۔ پاؤں کا توازن کمزور ہو گیا ہے اور چال سست ہو گئی ہے۔ میرے داماد ڈاکٹر ہیں، اس لیے علاج کی بہت سہولت ہے۔ میں ۸۷ سال کا بوڑھا ہوں۔ آپ مجھے اپنا مجموعہ بھیجیں تو کسی آتے جاتے کے ہاتھ بھیجیں۔[۱۰۰] ہوائی ڈاک نہایت مہنگی ہے۔ بحری ڈاک سے بھیجیں تو محصول کم ہوگا لیکن تین چار مہینے میں ملے گا۔

میں قاضی صاحب والی کتاب پوری کر کے اس کی تنقیح کروں گا جس میں کوئی پانچ مہینے لگیں گے؛ اس کے بعد تین چار مہینوں میں اپنی کتاب اردو مثنوی شمالی ہند میں کو ترمیم و نظرثانی کر کے نئے ایڈیشن کے لیے تیار کروں۔ اس کے بعد فرصت ہوگی۔ اگر مجھے مجلس ترقی ادب، لاہور سے مقالات شیرانی کا Set اور پنجاب میں اردو کا کوئی اچھا ایڈیشن مل جائے تو میں حافظ شیرانی مرحوم پر ایک کتابچہ لکھوں۔ وعدہ نہیں کر سکتا کیونکہ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ ع سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں

لیکن چونکہ سالہا سال پر آس قائم ہے اس لیے مجلس ترقی ادب اگر مقالات حافظ محمود شیرانی کا Set مجھے بحری ڈاک سے بھیج دیں تو میں کچھ کروں گا۔[۱۰۱]

تحسین فراقی صاحب کی کتاب مشفق خواجہ نے بھیج دی۔ تحسین صاحب نے بڑا کام کیا اور بڑی جرأت دکھائی۔ ان کا موقف صحیح دکھائی دیتا ہے۔[۱۰۲]

یہاں مجھے اور سب آرام ہے لیکن اردو دنیا سے کٹ گیا ہوں۔ امریکہ میں شاعر ہیں لیکن کوئی محقق یا نقاد نہیں۔ میری یہ کیفیت ہے:

بلبل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر

پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

صرف تصنیف و تالیف کے سہارے وقت کاٹتا ہوں۔

آپ جیسے عالم اور مشفق سے ملنے کی طرح چلنا نہیں ہوا۔ افسوس کہ اس کی امید بھی نہیں۔ لیکن یہ تو امید ہے کہ آپ بخیر [بہ خیر] ہوں گے۔

مخلص

گیان چند

[٣٩]

23 Nevada

IRVINE - CA - 92606 - 1764   Phone: 949-559-6012

(USA)   email: gianchand@aol.com

١١/ نومبر ٢٠٠٠ء

محبی ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب! تسلیم۔

میں نے رضا لائبریری رام پور[١٠٢] کے ڈائریکٹر کو نسخۂ لاہور کے روٹوگراف کے تعلق سے کچھ وضاحتیں چاہی تھیں۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی کو بلا کر ان کی مدد لے لیں۔ ظہیر علی صدیقی اردو کے پی ایچ ڈی ہیں۔ پرسوں ظہیر صدیقی کا جواب آیا، جس میں نسخۂ لاہور کے روٹوگراف کو دیکھ کر یہ معلومات دی ہیں:

١۔ نسخۂ خواجہ[١٠٣] کے ص ٣٢ کی نقل کی مہر میں روٹوگراف میں مہر ہے جس پر Accession No. 6812 تحریر ہے۔

٢۔ نسخۂ خواجہ کے آخری ص ١٢٧ فتح دین والے پر مہر میں تحریر ہے:

نواب یونیورسٹی لائبریری، عربک سیکشن 6812

ظہیر نے جسے نواب پڑھا ہے وہ دراصل پنجاب ہوگا۔

٣۔ روٹوگراف میں آخر کے صفحے (نسخۂ خواجہ کا ص ١٣٢) پر عنوان خاتمہ ہے اور ساری عبارت بالکل وہی ہے جو مطبوعہ نسخۂ خواجہ میں ہے۔ قاضی عبدالودود نقل کرنے میں غلطی کر گئے۔[١٠٤]

٤۔ نسخۂ خواجہ کے ص ١١ والے مصرع کی ردیف ہوا ہی ہے ہوگا نہیں

جوہر آئینہ بھی چاہی ہی مژگاں ہوا

٥۔ ورق ٣٣ (نسخۂ خواجہ ص ٥٠) پر تین شعروں کی غزل روٹوگراف میں ہے

دونوں جہان .... تکرار کیا کریں

اب آپ یونیورسٹی لائبریری میں Accession No. 6812 کی کتاب کا پتا لگائیے۔ یہ کیا وجہ ہے کہ یہ اردو کے بجائے عربک سیکشن میں چڑھا دی گئی۔

میرے پاس تحسین کی کتاب دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ اصل حقائق اور معین الرحمٰن کی نسخۂ خواجہ صحیح صورتِ حال ہیں۔ میں نے سب کتابوں کو بہت باریکی سے پڑھا ہے۔ ان پر مضمون لکھ کر ہندوستان میں شائع کرا دینا چاہتا

ہوں۔[105] مجھے ابھی تک قدرت نقوی[106] کی کتاب مالِ مسروقہ نہیں ملی۔[107] مشفق خواجہ کو فون کر کے معلوم کروں گا۔

آپ اپنا دولت خانے کا پتا اور وہاں کا فون نمبر لکھ دیجیے۔ تحسین فراقی شعبۂ اردو میں ہیں یا فارسی میں؟ میں ان کی کسی کتاب کے نام سے واقف نہیں۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر [بہ خیر] ہوں گا۔

مخلص

گیان چند

[۳۰]

فون: 949-559-6012	Gian Chand Jain
ای میل: gian chand@aol.com	23 Nevada, IRVINE-CA-92606-1764,USA

۱۲/اپریل ۲۰۰۱ء

محبی ڈاکٹر رفیع الدین صاحب! تسلیم۔

آپ کے ۱۵/مارچ کے کرم نامے کا جواب بہت دیر سے دے رہا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ قاضی عبدالودود پر ایک کتاب کو مکمل کرنے میں مستغرق تھا۔ اب اس کا مسودہ بھی مکمل کر لیا۔ قاضی صاحب کے مضامین کی فہرست بطور ضمیمہ اور اپنی کتابیات تیار کرنی باقی ہے۔ کتاب ۱۱۰۰ صفحات کی ہوگی۔ اس ماہ کے آخر تک ناشرین کو بھیج دوں گا۔[108]

مجھے آپ کا مجموعہ تفہیم و تجزیہ[109] نہیں ملا۔ ڈاکٹر ممتاز احمد کو چٹھی بھی لکھی۔ ایک شام فون کیا تو کسی نے بتایا کہ وہ ایک گھنٹے بعد ملیں گے۔ میں نے آپ کا حوالہ بھی دیا۔ سوچا کہ چٹھی کا جواب دیں گے لیکن انھوں نے نہیں دیا۔

میں نے ہماری زبان[110] کے لیے اپنے مضمون میں شمول کے لیے ایک صفحہ قدرت نقوی مرحوم کے کتابچے نسخہ مسروقہ کے بارے میں بھی لکھا تھا۔ معلوم نہیں وہ شامل ہوا کہ نہیں۔ میرے پاس تو ہماری زبان آتا نہیں۔ کراچی میں میرا مکمل مضمون مشفق خواجہ رسالہ مکالمہ[111] میں شائع کرا رہے ہیں۔

تحسین فراقی صاحب کو میرا سلام شوق پہنچا دیجیے۔

میں اور اہلیہ شریک حیات آئندہ ستمبر اکتوبر میں ہندوستان جائیں گے۔ سفر براہ یورپ کریں گے اور راستے میں چار دن کے لیے کراچی میں سفر Break کریں گے۔ جمیل جالبی صاحب کے یہاں قیام ہوگا۔ لاہور نہیں آ سکتے کیونکہ سفر میں صرف ایک ہی جگہ درمیان میں ٹھہر سکتے ہیں۔ یوں بھی میں لاہور آ کر معین الرحمٰن صاحب سے دوچار نہیں ہونا چاہتا۔

ضروری بات تو رہ ہی گئی۔ میں نے آپ کی فرمائش پر حافظ شیرانی مرحوم پر دس صفحوں کا مضمون لکھ کر آپ کو بھیجا تھا۔ اس کی پہنچ کا پتا نہ چلا۔ اگر سوئے اتفاق سے نہ ملا ہو تو اس کی نقل مشفق خواجہ کے پاس ہے۔ ان سے لے لیجیے۔ مجھے اس مضمون کی رسید کے بارے میں email سے مطلع کیجیے۔[112]

امید ہے آپ کا مزاج بخیر [بہ خیر] ہوگا۔ یہ letter head اور اس سے بڑے سائز کے پیڈ علی گڑھ سے نثار الدین احمد[113] نے

مجھ سے پوچھے بغیر بھیج دیے۔ سڑک کا نام اور شہر کا نام ملا کر لکھ دیا۔

مخلص

گیان چند

حواشی و تعلیقات

۱۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کئی دوسرے کثیر المراسلت اصحابِ علم کی طرح کسی ایک دوست کے لفافے میں دوسرے دوستوں کے نام لکھے گئے خطوط بھی بھیج دیتے تھے اور انھیں تاکید کر دیتے کہ وہ متعلقہ افراد کو ڈاک کے ذریعے سے یہ خط بھیج دیں۔ یوں کفایت کے ساتھ ساتھ خط کی گم شدگی کے امکانات بھی کم ہو جاتے ہیں۔ ''مقامی کرم نامہ'' سے مراد یہ ہے کہ ہاشمی صاحب نے یہ خط حیدرآباد دکن سے پوسٹ کیا کیوں کہ وہ ان دنوں وہاں ایک عالمی اقبال سمینار میں شریک تھے۔

۲۔ یہ عالمی اقبال سمینار اقبال اکیڈمی حیدرآباد دکن کے زیر اہتمام ۱۸ تا ۲۲ اپریل ۱۹۸۶ء میں منعقد ہوا۔ پاکستان سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے علاوہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، محمد احمد خان اور معروف سیرت نگار سید صباح الدین شکیل نے شرکت کی۔ اس سمینار کی روداد ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ''اقبال پر ایک یادگار عالمی اجتماع'' کے عنوان سے لکھی جو اقبالیات، لاہور کے شمارہ جولائی ۱۹۸۶ء، ماہنامہ سب رس، کراچی کے شمارہ نومبر ۱۹۸۶ء اور روزنامہ نوائے وقت، لاہور کی ۹ نومبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر گیان چند اس پانچ روزہ سمینار کی صرف ایک نشست میں شریک ہوئے اور اپنا مقالہ پڑھا۔

۳۔ معروف شاعر، نقاد اور مترجم۔ یکم جولائی ۱۹۱۹ء [تاریخ پیدائش بعض جگہ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء بھی ملتی ہے] میں پیدا ہوئے۔ انگریزی ادبیات میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ انگریزی اور اردو میں کئی کتابیں لکھیں۔ اردو کتابوں میں حسنِ کلام [علم عروض اور حسنِ خطابت پر ___ ۱۹۳۶ء]، حدیثِ دل [مجموعۂ شعر ___ ۱۹۶۱ء]، اساسیہ شعر و ادب [آساسِ ادب ___ ۱۹۷۷ء] اور تنقید و تجزیہ [مضامین] شامل ہیں۔ ستا راجہان رستوگی ۲۵ فروری ۱۹۹۷ء کو آں جہانی ہوئے۔

۴۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور کا ششماہی اردو مجلہ۔

۵۔ اردو کا عہد ساز ادبی رسالہ۔ محمد طفیل نے ۱۹۴۸ء میں لاہور سے جاری کیا۔ ابتدا میں احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور اور سید وقار عظیم کے زیر ادارت شائع ہوتا رہا۔ شمارہ ۱۹ سے محمد طفیل نے اس کی ادارت سنبھالی اور چند سالوں میں اس کا شمار اردو کے اہم ادبی رسائل میں ہونے لگا۔ نقوش کے خاص نمبر اپنی نظیر آپ ہیں۔

۶۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اپنے مضمون ''حیات نامۂ اقبال'' مشمولہ نقوش اقبال نمبر بابت ستمبر ۱۹۷۷ء میں اقبال کی پہلی مطبوعہ غزل زبان دہلی کے نومبر ۱۸۹۳ء کے شمارے میں شائع غزل کو قرار دیا۔ ہاشمی صاحب نے ڈاکٹر گیان چند کی توجہ دلانے پر اپنی اس

غلطی کو تسلیم کیا۔ اقبال کی پہلی مطبوعہ غزل زبان دہلی کے نومبر ۱۸۹۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔

۷۔ ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی یہ متوقع ملاقات لاہور میں ۱۹۹۷ء میں اس وقت ہوئی جب گیان چند پاکستان کے علمی دورے پر آئے۔ یہاں دونوں کے درمیان دوسری اور آخری ملاقات ثابت ہوئی۔

۸۔ نامور محقق، شاعر اور کالم نگار۔ اصل نام عبدالحی۔ ۱۹ر دسمبر ۱۹۳۵ء کو خواجہ عبدالوحید کے گھر پیدا ہوئے۔ کم عمری میں کراچی چلے گئے جہاں ساری عمر گزار دی۔ ۱۹۵۸ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اردو کا امتحان پاس کیا۔ انجمن ترقی اردو میں بابائے اردو کے دستِ راست رہے۔ ۱۹۹۲ء میں ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے تمغہ برائے حسنِ کارکردگی پیش کیا۔ ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء کو انتقال ہوا۔ اہم کتابوں کے نام یہ ہیں: ادبیات (مجموعۂ شعر)، اقبال از احمد دین (تدوین)، جائزۂ مخطوطاتِ اردو (تحقیق)، غالب اور صفیر بلگرامی (تحقیق)، تحقیق نامہ (مجموعۂ مقالات)، کلیاتِ یگانہ (تدوین)، سخن در سخن (کالم مرتبہ مظفر علی سید)، خامہ بگوش کے قلم سے (کالم مرتبہ مظفر علی سید)، سخن ہائے ناگفتنی (کالم مرتبہ مظفر علی سید)، سخن ہائے گسترانہ (کالم مرتبہ ڈاکٹر انور سدید)، سن تو سہی (کالم مرتبہ ڈاکٹر انور سدید و خواجہ عبدالرحمٰن طارق)۔

۹۔ گیان چند کا یہ مضمون اورینٹل کالج میگزین بابت ۱۹۸۶ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

۱۰۔ معروف علمی و ادبی رسالہ۔ سب رس حیدرآباد دکن سے جنوری ۱۹۳۸ء میں ادارۂ ادبیاتِ اردو کے زیرِ اہتمام جاری ہوا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اس کے نگران اور خواجہ حمید الدین شاہد اس کے عملۂ ادارت کے رکن تھے۔ خواجہ حمید الدین شاہد قیامِ پاکستان کے بعد کراچی چلے آئے تو یہاں انھوں نے ادارۂ ایوانِ اردو قائم کیا اور ملازمت سے سبک دوشی کے بعد ۱۹۷۵ء میں سب رس کا اجرا کیا۔ ان کی زندگی میں یہ رسالہ باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ سب رس کے خاص شماروں میں "یادِ رفتگاں نمبر"، "اقبال نمبر" اور "ممتاز حسن نمبر" یادگار ہیں۔

۱۱۔ پاکستان میں اس کتاب کی پہلی عکسی اشاعت کا اہتمام ۲۰۰۴ء میں اقبال اکادمی پاکستان، لاہور نے کیا۔

۱۲۔ ہاشمی صاحب کا یہ مضمون مجلہ تحقیق، اورینٹل کالج، لاہور بابت: ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ ص ۳۱ تا ۴۲۔

۱۳۔ یہ ڈاکٹر ہاشمی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو ۱۹۸۱ء میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں ڈاکٹر وحید قریشی کی نگرانی میں لکھا گیا۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور نے اس کا پہلا ایڈیشن ۹ر نومبر ۱۹۸۲ء کو شائع کیا۔

۱۴۔ ڈاکٹر گیان چند کا مجموعۂ مضامین۔

۱۵۔ ڈاکٹر گیان چند کے مضامین اور تبصروں کا مجموعہ۔

۱۶۔ تحقیق کا فن ۱۹۹۴ء میں مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد سے شائع ہوئی۔

۱۷۔ ہندوستان کے کتاب دوست اور ادیب نواز دانش ور۔ حیدرآباد دکن میں اردو ریسرچ سنٹر کے ناظم۔ بعد میں انھوں نے یہ سنٹر کلکتہ میں منتقل کر لیا۔

۱۸۔ دیکھیے حاشیہ نمبر: ۶

۱۹۔ ہاشمی صاحب کے مضمون "بالِ جبریل کا متروک کلام" کی طرف اشارہ ہے۔

۲۰۔ اقبال اکادمی پاکستان وفاقی حکومت کا ایک علمی ادارہ ہے جو ایک صدارتی آرڈیننس کے ذریعے قائم ہوا۔ اولاً اس کا مرکزی دفتر کراچی میں تھا جو بعد میں لاہور میں منتقل ہوا۔

۲۱۔ حلقۂ ادبِ اسلامی کا ترجمان اور نقیب سہ ماہی علمی و ادبی مجلہ جو لاہور سے ۱۹۶۳ء میں ماہنامے کے طور پر جاری ہوا۔ نعیم صدیقی اس کے بانی مدیر تھے۔ موجودہ مدیر حفیظ الرحمٰن احسن ہیں۔ سیارہ نے کئی خاص اشاعتیں جیسے: اقبال نمبر، عبدالعزیز خالد نمبر وغیرہ شائع کیں جو حوالے کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔

۲۲۔ مراد ابتدائی کلامِ اقبال بہ ترتیبِ ماہ و سال۔

۲۳۔ دکن میں اُردو نثر کے بنیاد گزار، صوفی، شاعر اور مترجم۔ پیدائش: ۸۷۰ھ، وفات: ۹۰۲ھ۔ خوش نامہ، خوش نغز، شرح مرغوب القلوب، جل ترنگ، گل باس، سب رس، شہادت التحقیق کے مصنف اور مترجم۔

۲۴۔ محقق، نقاد، شاعر اور اردو ادبیات کے استاد۔ اصل نام منظور اختر۔ ۷ دسمبر ۱۹۵۰ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۸۶ء میں "عبدالماجد دریابادی: احوال و آثار" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر جامعۂ پنجاب سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ تین سال تہران یونی ورسٹی میں مہمان استاد کی حیثیت سے پڑھایا۔ آج کل اورینٹل کالج، لاہور کے شعبۂ اُردو کے سربراہ ہیں۔ اہم کتابوں کے نام یہ ہیں: جستجو (مضامین)، عجائباتِ فرنگ (تدوین)، عبدالماجد دریابادی: احوال و آثار (تحقیق)، نقدِ اقبال: حیاتِ اقبال میں، اقبال: چند نئے مباحث (تحقیق و تنقید)، مطالعۂ بیدل فکرِ برگساں کی روشنی میں، جہاتِ اقبال (مجموعۂ مضامین)، معاصر اُردو ادب (تنقید)، نقشِ اوّل (مجموعۂ شاعری)۔

۲۵۔ یہ مضمون بعد میں فراقی صاحب کے مجموعۂ مضامین جہاتِ اقبال میں شامل ہوا۔ یہ مجموعۂ مضامین بزمِ اقبال لاہور نے نومبر ۱۹۹۳ء میں شائع کیا۔

۲۶۔ ڈاکٹر ہاشمی کے دوست، رفیع الدین فاروقی جو جامعۂ عثمانیہ میں ایم فل علومِ اسلامیہ کے طالب علم تھے۔

۲۷۔ ہندوستان کا ایک قدیم مذہب۔ وردھمان مہاویر [م ۵۲۷ ق م] نے پانچویں صدی قبل مسیح میں اس کی داغ بیل ڈالی۔ اس مذہب کے پیروکار توحید کے قائل نہیں۔ ذات پات اور ویدوں کو نہیں مانتے۔ نروان حاصل کرنا ان کا آدرش اور مقصدِ حیات ہے۔ چھنا ہوا پانی پیتے اور گوشت سے مکمل پرہیز کرتے ہیں۔ ہاشمی صاحب نے اپنے خط میں ان سے دریافت کیا تھا کہ آپ کے نام کے ساتھ "جین" لکھا جاتا ہے تو کیا آپ جین مت کے پیروکار ہیں؟

۲۸۔ نامور محقق اور مدوّن۔ پ: ۱۸/مئی ۱۸۹۶ء م: ۲۵/جنوری ۱۹۸۵ء [پٹنہ]۔

۲۹۔ معروف محقق، نقاد و تذکرہ نگار: پ: ۲۵/دسمبر ۱۹۲۵ء [شاہ جہان پور] م: ۲۴/فروری ۲۰۰۶ء [شاہ جہان پور]۔

۳۰۔ معروف محقق، نقاد اور مترجم۔ ۱۲/ جون ۱۹۲۹ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۷۱ء میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی نگرانی میں سندھ یونیورسٹی جام شورو سے پی ایچ ڈی اور ۱۹۷۶ء میں ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اہم کتابیں: ایلیٹ کے مضامین [ترجمہ]، پاکستانی کلچر --- قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ، تنقید اور تجربہ (مضامین)، دیوانِ حسن شوقی (تدوین)، قدیم اُردو کی لغت، کدم راؤ پدم راؤ (تدوین)، تاریخ ادبِ اُردو (جلد اوّل، دوم، سوم)، ارسطو سے ایلیٹ تک، محمد تقی میر، نئی تنقید (مضامین)، ادب، کلچر اور مسائل، کلیاتِ میراجی (تدوین)، ن م راشد -- ایک مطالعہ، ادبی تحقیق (مضامین)۔ جالبی صاحب اس زمانے میں مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین تھے۔ گیان چند کی کتاب تحقیق کا فن ان دنوں زیرِ اشاعت تھی۔

۳۱۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی۔

۳۲۔ ڈاکٹر گیان چند کا یہ مضمون اورینٹل کالج میگزین، اقبال نمبر بابت: ۱۹۸۹ء جلد ۶۸ شمارہ ۱۲ میں شائع ہوا۔

۳۳۔ اورینٹل کالج، لاہور کا علومِ شرقیہ کی تحقیق کا معروف جریدہ۔ اس کا اجرا ۱۹۲۵ء میں ہوا۔ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع اس کے پہلے مدیر تھے۔ اوّل اوّل اس جریدے کا وقفۂ اشاعت چار ماہ تھا یعنی سال میں اس کے تین شمارے شائع ہوتے تھے۔ مولوی محمد شفیع کے بعد شیخ محمد اقبال، برکت علی قریشی، ایم عباس شوستری، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سید محمد اکرم، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور ڈاکٹر محمد اکرام چودھری اس علمی جریدے کے مدیر رہے۔ موجودہ مدیر ڈاکٹر مظہر معین ہیں۔ اس جریدے نے عربی، فارسی، اُردو، پنجابی، سنسکرت اور ہندی ادب کے نادر شہ پاروں کو متعارف کرایا اور تحقیق کی روایت کو ثروت مند کرنے میں فعال کردار ادا کیا۔

۳۴۔ معروف نقاد، استاد ادبیاتِ اردو، ادیب اور مترجم۔ دسمبر ۱۹۰۹ء کو الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی سے اُردو ادبیات میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ آج کل (دہلی)، ماہِ نو (کراچی) اور نقوش (لاہور) کے مدیر رہے اور اورینٹل کالج کے شعبۂ اُردو کے استاد اور صدر شعبہ رہے۔ ۱۷ نومبر ۱۹۷۶ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں: فنِ افسانہ نگاری (۱۹۵۰ء)، ہمارے افسانے (۱۹۵۰ء)، باغ و بہار اور اس کا مصنف (۱۹۵۴ء)، آغا حشر اور ان کے ڈرامے (۱۹۵۳ء)، ہماری داستانیں (۱۹۵۶ء)، نیا افسانہ (۱۹۵۷ء)، داستان سے افسانے تک (۱۹۵۹ء)، اقبال شاعر اور فلسفی (۱۹۶۸ء)، اقبالیات کا تنقیدی مطالعہ، قصص الحمراء، شرح اندر سبھا اور جمہوری نصب العین۔

۳۵۔ شاعر، نقاد، مترجم اور استاد۔ سید علی سجاد مقبل اعظمی کے گھر ۴/ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو پھانوں ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ کراچی یونیورسٹی سے ایم اے انگریزی اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اُردو کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اسلامیہ کالج سول لائنز، لاہور میں انگریزی کے استاد اور اورینٹل کالج میں اُردو کے استاد رہے۔ ۱۳/ اگست ۱۹۹۲ء کو راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ معروف کتابوں میں

تیشۂ لفظ (شاعری)، جو نئے معانی (شاعری)، مغرب کے تنقیدی اصول، تہذیب و تخلیق (تنقید)، داستانِ مغلیہ (ترجمہ) اور افتادگانِ خاک (ترجمہ) شامل ہیں۔

۳۶۔ معروف شاعر، صحافی، براڈکاسٹر۔ اصل نام عبدالحمید تھا۔ ۳؍فروری ۱۹۲۵ء کو الہٰ آباد میں پیدا ہوئے۔ انجمن فیض الاسلام فیض آباد، راولپنڈی سے ایک طویل عرصہ وابستہ رہے۔ انجمن کے رسالے فیضِ الاسلام کے مدیر بھی رہے۔ ۲۷؍مارچ ۲۰۰۹ء کو انتقال کیا اور اسلام آباد میں دفن ہوئے۔ کئی کتابیں لکھیں جن میں ولائے رسول ؐ (مجموعۂ نعت) ۲۰۰۲ء، بادۂ خیام (منتخب رباعیات کا ترجمہ) ۲۰۰۳ء، تذکرۂ نعت گویانِ راولپنڈی/اسلام آباد (تذکرہ) ۲۰۰۳ء اور روشنی اور سائے (مجموعۂ شعر) ۲۰۰۴ء اشاعت آشنا ہوئیں۔

۳۷۔ مرغوب ایجنسی لاہور کا ایک طباعتی ادارہ تھا۔ اس ادارے کے زیرِ اہتمام اقبال کی نظمیں کتابچوں کی صورت میں شائع ہوئیں۔ اقبال کے دورِ اوّل کی معروف نظم "ترانۂ ہندی" بھی مرغوب ایجنسی لاہور نے شائع کی تھی جس کا ترانہ ہاشمی صاحب نے ڈاکٹر گیان چند کو بھیجا تھا۔

۳۸۔ معروف محقق، مدوّن اور اُردو ادبیات کے استاد۔ ۱۳؍اکتوبر ۱۹۲۹ء میں سری نگر کشمیر میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد جعفر ہے۔ پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ (اردو) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ امر سنگھ کالج، سری نگر سے تدریس کا آغاز کیا۔ مختلف اداروں میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ آخر کار عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد دکن سے سبک دوش ہوئے۔ چند معروف کتابوں کے نام یہ ہیں: میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر، تحقیقی جائزے، تحقیقی نوادر، دیوانِ نامی، مقالاتِ حیدری، تذکرۂ شعرائے ہندی، تحقیق و انتقاد، باقیاتِ انیس، دیوانِ میر اور انتخاب مراثی دبیر۔

۳۹۔ اُردو کا معروف ادبی رسالہ۔ اس کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۰۱ء کو شیخ عبدالقادر کی ادارت میں شائع ہوا۔ مخزن کے ابتدائی مدیر معاون شیخ محمد اکرام تھے۔ رسالہ دو سال کے لیے دہلی سے بھی شائع ہوتا رہا۔ دہلی میں معاون مدیر علامہ راشد الخیری تھے۔ ۱۹۱۰ء میں مولوی غلام رسول کے ہاتھوں اسے فروخت کر دیا گیا۔ مولانا تاجور نجیب آبادی اور میری چند اختر بھی اس کے معاون مدیر رہے جب کہ حفیظ جالندھری اس کے مدیر رہے۔ اس رسالے کو آغاز سے ہی بلند مرتبہ لکھنے والوں جیسے: مولانا حالی، مولانا شبلی، علامہ اقبال، غلام بھیک نیرنگ، ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، یاس یگانہ چنگیزی، حافظ محمود شیرانی، محمد حسین آزاد، راشد الخیری، حسرت موہانی، آغا حشر کاشمیری، چکبست، سجاد حیدر یلدرم، ریاض خیرآبادی جیسے مشہور اور بلند پایہ اہلِ قلم کا بھرپور قلمی تعاون حاصل رہا۔

۴۰۔ بیسویں صدی کا ایک معروف ادبی و سیاسی رسالہ۔ اسے مولانا حسرت موہانی نے ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے جاری کیا۔ اس میں بیک وقت سیاسی اور ادبی مضامین شائع ہوتے۔ اگست ۱۹۰۸ء میں مولانا نظر بند ہوئے تو رسالہ بھی جاری نہ رہ سکا۔ دوبارہ اکتوبر ۱۹۰۹ء میں جاری ہوا اور ۱۹۱۳ء تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۱۳ء میں بند ہوا۔ تیسری بار اس کا اجرا ۱۹۲۵ء میں ہوا۔ اب اس میں مختلف دواوین اور کتابیں شائع کی جانے لگیں۔ اس رسالے کے ذریعے مولانا حسرت موہانی نے اُردو زبان و ادب کی بہت خدمت کی اور لوگوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کا اہتمام بھی کیا۔

۴۱۔ معروف شاعر، کالم نگار، سفرنامہ نگار اور دانش ور۔ ۲۰؍جنوری ۱۹۲۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دہلی سے حاصل کی۔ ۱۹۷۶ء میں کراچی یونی ورسٹی سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۸ء میں وزارتِ تجارت میں بہ طور اسسٹنٹ ملازم ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں سی ایس ایس کے بعد انکم ٹیکس آفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں نیشنل بنک آف پاکستان سے وابستہ ہوئے۔ سینیئر ایگزیکٹو بورڈ کے عہدے پر ترقی پا کر پاکستان بینکنگ کونسل میں پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ ایڈوائزر مقرر ہوئے۔ اہم کتابوں میں: غزلیں دوہے گیت (۱۹۵۸ء)، جیوے جیوے پاکستان (۱۹۷۳ء)، لاحاصل (۱۹۷۴ء)، دنیا مرے آگے (۱۹۷۵ء)، تماشا مرے آگے (۱۹۷۵ء)، صدا کر چلے (۱۹۸۵ء) اور حرفے چند (۱۹۸۸ء)۔

۴۲۔ ان دنوں ڈاکٹر ظہور احمد اظہر اورینٹل کالج، لاہور کے پرنسپل تھے۔

۴۳۔ نامور محقق، نقاد اور استاد۔ ۱۴؍فروری ۱۹۲۵ء کو میانوالی میں پیدا ہوئے۔ ایم اے فارسی، ایم اے تاریخ، پی ایچ ڈی فارسی اور ڈی لٹ اُردو کی ڈگریاں حاصل کیں۔ کئی کالجوں میں تاریخ فارسی، پنجابی اور اُردو کے استاد رہے۔ جامعۂ پنجاب میں پروفیسر، صدر شعبۂ اُردو و پنجابی، غالب پروفیسر، اورینٹل کالج کے پرنسپل اور ڈین فیکلٹی آف اسلامک اور اورینٹل لرننگ رہے۔ مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین، اقبال اکادمی کے ناظم، بزمِ اقبال کے معتمدِ اعزازی اور مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور کے ناظم رہے۔ ۱۹۹۳ء میں اُنھیں تمغائے حسنِ کارکردگی سے نوازا گیا۔ صحیفہ، اورینٹل کالج میگزین، اقبال، اخبارِ اُردو، اقبال ریویو، اقبالیات اور مخزن کے مدیر رہے۔ ۱۷؍اکتوبر ۲۰۰۹ء کو راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں: اُردو نثر کے میلانات، اقبال اور پاکستانی قومیت، اساسیاتِ اقبال، جدیدیت کی تلاش میں، شبلی کی حیاتِ معاشقہ، مثنویاتِ میر حسن، میر حسن اور ان کا زمانہ، پاکستان کی نظریاتی بنیادیں، مطالعۂ حالی، کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، اُردو کا بہترین انشائی ادب، تنقیدی مطالعے، نقدِ جاں، الواح، قائدِ اعظم اور تحریکِ پاکستان۔

۴۴۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی صدر نشینی کے زمانے میں کتابیاتِ مشاہیرِ اُردو کی اشاعت کا منصوبہ بنا اور اس کے تحت کئی کتابچے شائع ہوئے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کی کتابیات کی ترتیب و جمع آوری ڈاکٹر انعام الحق جاوید اور خاور جمیل نے کی۔ ۳۰۶ صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد نے ۱۹۹۱ء میں شائع کیا۔

۴۵۔ شاعر، صحافی اور ادیب۔ خواجہ شجاع الدین کے گھر ۳؍اکتوبر ۱۹۱۹ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ایم اے اُردو کرنے کے بعد ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد دکن میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کے دستِ راست رہے اور رسالہ سب رس کے مدیر۔ اُردو سٹی کالج اور جامعہ عثمانیہ میں استاد بھی رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کراچی آ گئے۔ یہاں ترقیِ اُردو بورڈ کے رکن رہے۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد کراچی سے سب رس کا اجرا کیا اور وفات (۲۰۰۱ء) تک تسلسل کے ساتھ شائع کیا۔ ان کی اہم کتابوں کے نام یہ ہیں: سرگذشتِ ادارۂ ادبیاتِ اُردو، شمس الامرا کے سائنسی کارنامے، ارمغانِ امجد، یادگارِ ماضی، حیدرآباد کے شاعر اور رسالۂ محمود و خوش دل۔

۴۶۔ نامور ادیب اور مسلم مفکر۔ ۲۵؍ ستمبر ۱۹۰۳ء کو احمد حسن کے گھر حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ مدینہ، بجنور، تاج، جبل پور، الجمعیت، دہلی اور مسلم کے مدیر رہے۔ ۱۹۳۲ء میں حیدر آباد سے ترجمان القرآن کا اجرا کیا۔ ۱۹۴۱ء میں جماعتِ اسلامی کی بنیاد رکھی۔ ۲۲؍ ستمبر ۱۹۷۹ء میں امریکا میں انتقال ہوا۔ بیسیوں کتابیں لکھیں جن میں تفہیم القرآن (تفسیر، ۶ جلدیں)، سیرتِ سرورِ عالمؐ، الجہاد فی الاسلام، خطبات، تفہیمات، تنقیحات، اسلام اور جدید معاشی نظریات، اسلامی ریاست، خلافت و ملوکیت، تعلیمات اور سنت کی آئینی حیثیت شامل ہیں۔

۴۷۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی کتاب ۱۹۸۶ء کا اقبالیاتی ادب: ایک جائزہ مراد ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۸ء میں اقبال اکادمی پاکستان، لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئی تھی۔

۴۸۔ ڈاکٹر گیان چند کی یہ مختصر کتاب پہلے اردو ادب دہلی کے دسمبر ۱۹۸۹ء کے شمارے میں شائع ہوئی پھر دہلی سے کتابی صورت میں بھی چھپی۔ پاکستان میں یہ کتابچہ نومبر ۱۹۹۱ء میں مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ یہ کتابچہ روایتی عروض کی پیچیدگی اور ثقالت کو کم کرنے کی غرض سے لکھا گیا اور بقول مؤلف اس میں ایسا آسان عروض پیش کیا گیا ہے جو مبتدیانِ شعر کے لیے فائدہ مند ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے معروف بحور اور مستعمل اوزان پر گفتگو کی ہے اور ہندی اوزان کے اشتراک سے نیا عروض وضع کرنے کی طرف ایک قدم بڑھایا ہے۔ ان کے اخلاص اور دیانتِ علمی کے باوجود رسالہ مبتدیوں کے لیے گمراہ کن ہے اور نئے علم الاوزان کے چکر میں پرانے عروض سے دور کرنے کی ایک کوشش ہے۔

۴۹۔ ڈاکٹر صاحب اپنے اس ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے اور اس کے بعد بھی اردو میں دو کتابیں لکھیں: ۱۔ ایک بھاشا دو لکھاوٹ، دو ادب ۲۔ قاضی عبدالودود بحیثیت مرتبِ متن۔ دونوں کتابیں بازارِ ادب میں متنازع قرار پائیں۔ بالخصوص اول الذکر کتاب کے خلاف اردو دنیا نے شدید ردِعمل کا اظہار کیا۔ ثانی الذکر کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے قاضی عبدالودود کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ان پر بھی گرفت کی گئی اور ان کے اس کام کو معاندانہ قرار دیا گیا۔

۵۰۔ نامور محقق، ادیب اور استاد۔ رشید حسن خاں انھیں تحقیق کا معلمِ اول قرار دیتے ہیں۔ پ: ۱۸۸۰ء م: ۱۹۴۶ء۔

۵۱۔ حافظ محمود شیرانی کی معرکہ آرا کتاب، جس میں انھوں نے پہلی بار ٹھوس شواہد اور دلائل کے ساتھ اردو اور پنجاب کے تعلق کو واضح کیا۔ پنجاب میں اردو صحیح معنوں میں اردو میں تحقیق کی پہلی کتاب ہے۔

۵۲۔ حافظ محمود شیرانی کے گراں قدر تحقیقی مقالات جنھیں ان کے لائق اور محقق پوتے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے دس جلدوں میں مرتب کیا۔ یہ تمام جلدیں مجلس ترقی ادب، لاہور نے شائع کیں۔

۵۳۔ معروف محقق، نقاد اور ادیب۔ پ: ۱۸۹۳ء م: ۱۹۷۵ء۔ سابق صدر شعبۂ اردو و فارسی لکھنؤ یونیورسٹی۔ چند تصانیف و تالیفات: اردو ڈراما اور اسٹیج، دیوانِ فائز، مجالسِ رنگین، آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ، متفرقاتِ غالب، تذکرۂ نادر، آئینۂ سخن فہمی، روحِ انیس، فیضِ میر، انیسیات،

اسلاف میر انیس۔

۵۴۔ معروف محقق، مدوّن کار اور غالب شناس۔ پ: ۸؍دسمبر ۱۹۰۴ء م: ۲۵؍فروری ۱۹۸۱ء۔

۵۵۔ نامور محقق، نقاد اور غالب شناس۔ پ: ۱۹۰۶ء م: ۱۹۹۳ء۔ اصل نام مالک رام تھا۔ آریہ گزٹ، بھارت ماتا اور نیرنگِ خیال کے مدیر رہے۔ اسکندریہ (مصر) میں ٹریڈ کمشنر کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ اور فارن سروس میں قاہرہ میں خدمات انجام دیں۔ ساہتیہ اکادمی میں اردو بورڈ کے رکن رہے۔ اہم کتابوں کے نام یہ ہیں: ذکرِ غالب، تلامذۂ غالب، گفتارِ غالب، تذکرۂ معاصرین [چار جلدیں]، قدیم دہلی کالج، وہ صورتیں الٰہی، عورت اور اسلامی تعلیم، تذکرۂ ماہ و سال۔

۵۶۔ شاعر، محقق، نقاد اور غالب شناس۔ ۲۵؍اگست ۱۹۲۵ء میں کشمیری لال ٹھکر داس گپتا کے گھر پیدا ہوئے۔ ادیب فاضل (اردو)، منشی فاضل (فارسی)، میٹرک کیمبرج، اکاؤنٹنسی اور ولایت لا کے امتحانات پاس کیے۔ تجارت کاری ذریعۂ معاش تھا مگر ادب کے ساتھ ان کی وابستگی ہر حالت میں قائم رہی۔ ۱۱ شعری مجموعوں کے علاوہ غالبیات پر سولہ، ملاحت پر پانچ اور جوش ملسیانی پر دو کتابیں لکھیں۔ ترتیب دادہ نو کتابیں ان کے علاوہ ہیں۔

۵۷۔ معروف محقق اور استاد۔ اصل نام شیام لال کالڑا، قلمی نام عابد پیشاوری۔ ۲۲؍دسمبر ۱۹۳۷ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں دلی یونیورسٹی سے ایم اے اردو اور ۱۹۷۶ء میں انشا اللہ خان، حیات، شخصیت اور ان کی نثری خدمات کے موضوع پر گراں قدر مقالہ لکھا اور جموں یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انشا کے حریف و حلیف، انشا اللہ خاں حیات، شخصیت اور ان کی نثری خدمات اور نقطہ اور شوشے ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

۵۸۔ معروف محقق، نقاد اور ماہرِ لسانیاتِ اردو۔ ۷؍اکتوبر ۱۹۳۶ء (سند میں ۲۹؍دسمبر ۱۹۳۸ء درج ہے) کو سہسوان ضلع بدایوں (یو پی) میں حکیم سید عقیل احمد نقوی کے گھر جنم لیا۔ اردو اور فارسی میں ایم اے کے بعد "شعرائے اردو کے تذکرے" کے عنوان سے مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ ان کی معروف کتابوں میں باقیاتِ سرور، تحقیقِ متن، دیوانِ ناسخ قدیم ترین نسخہ مع مقدمہ اور بینی نرائن دہلوی: حیات اور کارنامے شامل ہیں۔

۵۹۔ نامور محقق اور مؤرخ۔ والد کا نام رحیم بخش تھا۔ ۱۹۰۵ء میں کوچہ کمان گراں، لاہور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ محکمۂ ریلوے میں ملازم ہوئے اور ۱۹۶۰ء میں سبک دوش ہوئے۔ کئی رسائل جیسے: فردوس، تصوف، حقیقتِ اسلام، قوسِ قزح، نقوش، ادبی دُنیا اور المعارف کے مدیر اور معاون رہے۔ متعدد کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں؛ چند ایک کے نام یہ ہیں: تاریخ اقوامِ کشمیر (جلد سوم، ۱۹۳۶ء)، شاعرِ کشمیر (۱۹۳۶ء)، آئینۂ کشمیر (۱۹۶۶ء)، آئینۂ اقبال (۱۹۶۷ء)، مکاتیبِ اقبال بنامِ گرامی (۱۹۶۹ء)، معاصرینِ اقبال کی نظر میں (۱۹۷۷ء)، تذکارِ اقبال، روحِ مکاتیبِ اقبال (۱۹۷۷ء)، حیاتِ

اقبال کی گم شدہ کڑیاں (۱۹۸۳ء) اور اقبال بنام شاد (۱۹۸۶ء)۔ ۱۲/اگست ۱۹۹۲ء کو راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔

۶۰۔ محقق، نقاد اور شاعر۔ محمد احسن کے گھر ۳/مئی ۱۹۲۶ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ریڈیو پاکستان میں ملازمت اختیار کی۔ بعد ازاں سندھ مسلم کالج، گورنمنٹ کالج ناظم آباد اور جامعہ کراچی میں اُردو کے استاد رہے۔ اہم تصانیف: محمد حسین آزاد (حیات اور تصانیف)، تذکرۂ گلشنِ ہمیشہ بہار (تصحیح و تحشیہ)، نیرنگ خیال (تصحیح و تحشیہ)، قصص ہند (تصحیح و تحشیہ)۔ اوّل الذکر کتاب پر ۱۹۶۵ء میں داؤد ادبی انعام ملا۔

۶۱۔ سہ ماہی اُردو کا اجرا جنوری ۱۹۲۱ء میں مولوی عبدالحق نے اورنگ آباد سے کیا۔ یہ رسالہ ۱۹۳۶ء تک اورنگ آباد، ۱۹۴۷ء تک دہلی اور جولائی ۱۹۴۹ء کے بعد کراچی سے شائع ہوتا رہا۔ رسالے کی مجلسِ ادارت میں مولوی عبدالحق کے علاوہ شیخ محمد اکرام، ممتاز حسن، فضل احمد کریم فضلی، ہاشمی فرید آبادی، عندلیب شادانی، سید عبداللہ اور قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی شامل رہے۔ ۱۹۶۲ء کے بعد مشفق خواجہ، جمیل الدین عالی، شبیر علی کاظمی، اختر حسین، نورالحسن جعفری، ڈاکٹر اسلم فرخی اور ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری اس کے مجلسِ ادارت میں شامل رہے۔ اردو تحقیق کو باثروت بنانے میں رسالہ اُردو نے نمایاں اور فعال کردار ادا کیا۔

۶۲۔ مکتبۂ روایت کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والا جریدہ۔ محمد کامل عمر اور جمال پانی پتی اس کے مدیر تھے۔ اس رسالے کے صرف چار شمارے شائع ہو سکے۔

۶۳۔ نامور نقاد، شاعر اور ادیب۔ نومبر ۱۹۲۲ء میں کھنولی ضلع بارہ بنکی (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ سے حاصل کی۔ فیض عام کالج میرٹھ میں انٹر کے طالب علم تھے کہ ملک تقسیم ہو گیا۔ ہجرت کے بعد کراچی آ گئے۔ ریڈیو پاکستان میں مسودہ نویس مقرر ہوئے۔ یکم ستمبر ۱۹۸۳ء میں راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں: بیاض (شعری مجموعہ)، آکاش (شعری مجموعہ)، چراغِ نیم شب (مجموعہ شعر)، ادبی اقدار (تنقید)، نئی نظم اور پورا آدمی (تنقید)، غالب کون؟ (تنقید)، اقبال ایک شاعر (تنقید)، ادھوری جدیدیت (تنقید)، محمد حسن عسکری: انسان یا آدمی (تنقید) اور نئی شاعری نامقبول شاعری۔

۶۴۔ ڈاکٹر گیان چند کا یہ مضمون پہلے توازن مالیگاؤں کے شمارہ اپریل ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ بعد ازاں اورینٹل کالج میگزین دسمبر ۱۹۸۶ء اور تیسری بار ہماری زبان، دہلی کے ۸/جنوری ۱۹۸۸ء کے پرچے میں چھپا۔

۶۵۔ ڈاکٹر گیان چند کے تحقیقی مضامین کا مجموعہ۔

۶۶۔ ڈاکٹر گیان چند کا تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ۔

۶۷۔ دیکھیے حاشیہ نمبر: ۴۳۔

۶۸۔ ڈاکٹر صاحب اپنی مصروفیاتِ علمی کے باعث مضمون نہ لکھ سکے۔

۶۹۔ دیکھیے حاشیہ نمبر: ۴۸۔

۷۰۔ یہ خط ۱۹/اپریل کے خط کا ضمیمہ ہے چوں کہ نئے صفحے سے آغاز ہوا اس لیے اسے ایک الگ خط کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ خط کے

آخر میں مکتوب نگار کا نام اور اختتامی کلمات موجود نہیں۔

۷۱۔ محقق، نقاد، ناول و افسانہ نگار۔ ۶/جون ۱۹۳۳ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے اُردو اور جامعہ پنجاب سے "دبستانِ لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقا" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ گورنمنٹ ایف سی کالج، لاہور میں اُردو شعبے کے سربراہ رہے۔ لاہور میں انتقال ہوا۔ بدلتا ہے رنگ آسماں، غبارِ کوچۂ جاناں (ناول)، معارفِ سہیل (مقالات)، سرمد سلطانی (تالیف)، دبستانِ لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقا (تحقیق)، اُردو کا لسانی خاکہ (تحقیق)، شہرِ ناپرساں اور تل جواہو آسماں ان کی کتابیں ہیں۔

۷۲۔ ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر سہیل بخاری کے پی ایچ ڈی کے مقالے "اردو داستان" کے ایک ممتحن تھے۔ سہیل بخاری صاحب کو ان سے یہ گلہ رہا کہ انھوں نے میرے مقالے کو بہت دیر تک اپنے پاس رکھے رکھا اور اس کے کئی اجزا اپنے نام سے شائع کر دیے۔ آغا سہیل نے اسی سرقے اور جعل سازی کے حوالے سے مضمون لکھا جس کی نقل مشفق خواجہ مرحوم نے ڈاکٹر گیان چند کو بھجوائی۔

۷۳۔ معروف محقق اور نقاد۔ اصل نام سید محمود نقوی ہے۔ ۶/دسمبر ۱۹۱۲ء کو سرائے شیخ ضلع فتح پوری (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں ناگ پور یونیورسٹی سے ایم اے اُردو اور ۱۹۶۳ء میں جامعۂ پنجاب سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پی اے ایف اسٹیشن سکول، لاہور اور پی اے ایف کالج سرگودھا میں اُردو کے استاد رہے۔ سبک دوشی کے بعد مستقلاً کراچی چلے گئے۔ ترقی اردو بورڈ میں لغتِ کلاں کے شریک مدیر مقرر ہوئے۔ ان کی اہم کتابوں میں ناول نگاری، اُردو داستان، سب رس پر ایک نظر، غالب کے سات رنگ، باغ و بہار پر ایک نظر، اُردو کا روپ، اقبال مجددِ عصر، تصورِ الوہیت، اُردو کا اشتقاقی لغت اور ہندی شاعری میں مسلمانوں کا حصہ شامل ہیں۔

۷۴۔ ۶/ستمبر ۱۹۸۹ء کو ہاشمی صاحب موٹر سائیکل پر لاہور کے جی پی او چوک سے گزر رہے تھے کہ انھیں ایک تیز رفتار کار نے ٹکر ماری۔ وہ اس حادثے کے باعث ایک عرصہ تک صاحبِ فراش رہے۔

۷۵۔ محقق اور ادیب۔ ۸/اگست ۱۹۲۸ء کو گورداس پور میں پیدا ہوئے۔ ان کی معروف کتابوں میں قائدِ اعظم کے شب و روز، پنجاب کے قدیم شعرائے اُردو اور حدائق الحنفیہ (ترتیب و حواشی) شامل ہیں۔ ۲۴ فروری ۱۹۹۷ء کو لاہور میں وفات پائی۔ خورشید احمد خاں یوسفی نامور محقق حافظ محمود شیرانی کے داماد تھے۔

۷۶۔ معروف ادبی رسالہ۔ سیماب اکبر آبادی نے مکتبہ قصر الادب آگرہ سے پندرہ روزہ کی حیثیت سے جاری کیا۔ پہلا شمارہ ۱۵ فروری ۱۹۳۰ء میں چھپا۔ بہت جلد اس کے وقفۂ اشاعت کو مہینا کر دیا گیا۔ منظر صدیقی، اعجاز صدیقی اور افتخار صدیقی اس کے مدیر رہے۔ اب یہ رسالہ ممبئی سے افتخار امام صدیقی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالے نے کئی یادگار نمبر شائع کیے جنھیں حوالے کی حیثیت حاصل ہے۔

۷۷۔ ڈاکٹر گیان چند کا مجموعۂ مضامین۔

۷۸۔ ڈاکٹر گیان چند کا مجموعۂ مضامین۔

۷۹۔ معروف غالب شناس، ادیب اور استاد ادبیاتِ اُردو۔ ۱۵/نومبر ۱۹۳۲ء کو بھٹنڈہ پٹیالہ میں پیدا ہوئے۔ کراچی یونی ورسٹی سے ایم اے اُردو اور سندھ یونی ورسٹی جام شورو سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اشاریۂ غالب، غالب اور انقلاب ستاون، تحقیقِ غالب، غالب کا علمی سرمایہ، نقوشِ غالب، تحقیق نامۂ غالب، یادگارِ عبدالحق، مطالعۂ یلدرم، دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ، بابائے اُردو: احوال و آثار اور بازیافتِ غالب ان کی معروف کتابیں ہیں۔ ۱۵/اگست ۲۰۰۵ء میں لاہور میں انتقال ہوا۔

۸۰۔ نامور افسانہ نویس، ناول نگار اور نقاد۔ ۳/مارچ ۱۹۲۳ء کو میاں والی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سکھن داس چھابڑا ہے۔ اہم کتابوں کے نام یہ ہیں۔ آئینے، انقلاب آنے تک، وہ مسکرانے لگی، نئی دھرتی پرانے گیت، گلی گلی، آواز تو پہچانو، کل کی باتیں (افسانے) مٹھی بھر دھوپ، نیل دھارا، سورج جیسی رات (ناول)، زرد پتوں کی بہار (سفر نامۂ پاکستان)، خواب خواب سفر (سفر نامۂ یورپ)، اُردو افسانے کی تخلیقی فضا (تنقید) اور دریچوں میں رکھے چراغ۔

۸۱۔ یہ خاکہ پروفیسر اشفاق احمد ورک نے "ہمالیائی پروفیسر" کے عنوان سے لکھا۔ جو بعد میں ان کے خاکوں کے مجموعے خاکہ نگوری مطبوعہ ثقافت اکادمی، کراچی ۲۰۰۲ء میں شامل ہوا۔

۸۲۔ مزاح نگار، کالم نگار اور استاد۔ گورنمنٹ کامرس کالج شیخوپورہ میں طویل عرصہ تک تدریس کے فرائض انجام دیے۔ اب ایف سی کالج یونی ورسٹی میں اُردو کے استاد ہیں۔ پنجاب یونی ورسٹی سے محمد خالد اختر: شخصیت اور فن کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ قلمی دشمنی، ذاتیات، خاکہ نگوری، خود ستائیاں، منٹو اور مزاح، شفیق الرحمٰن: فن و شخصیت، خاکہ مستی، غزل آباد اور اردو نثر میں طنز و مزاح ان کی کتابیں ہیں۔

۸۳۔ معروف شاعر، ادیب اور صحافی۔ پ: ۱۹/اکتوبر ۱۹۳۲ء۔ سہ ماہی سیارہ، لاہور کے موجودہ مدیر۔ اہم کتابیں: فصلِ زیاں (شعری مجموعہ)، ننھی منی خوب صورت نظمیں، ۵۰ اے ذیل دار پارک (سوم ملفوظاتِ مولانا مودودی کا مجموعہ)۔

۸۴۔ محمد طفیل نقوش کے فرزند ارجمند۔ نقوش کے مدیر اور نقوش پریس کے منتظمِ اعلیٰ۔ نقوش کے خاص نمبروں کو زیادہ آب و تاب کے ساتھ دوبارہ شائع کر رہے ہیں۔

۸۵۔ اُردو کا معروف ادبی رسالہ۔ ۱۹۴۷ء میں کراچی سے حسین انجم نے جاری کیا۔ اس کے ابتدائی منتظم سید محمد حسن تھے۔ طلوعِ افکار کے مدیران میں جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، محمد احسن فاروقی، سید محمد باقر شمس اور ڈاکٹر شگفتہ موسوی کے نام شامل ہیں۔ ابتدا میں یہ رسالہ ترقی پسند نظریات کا ترجمان تھا مگر رفتہ رفتہ اس میں مختلف طبقوں کے ادبا کی نگارشات شائع ہونے لگیں۔ اس کے کئی خاص نمبر اپنی مثال آپ ہیں جیسے: جشن اور ادب نمبر اور سر آغا خان نمبر۔

۸۶۔ ڈاکٹر گیان چند کے مقدموں اور تبصروں کا مجموعہ۔

۸۷۔ لاہور سے شائع ہونے والا ماہوار ادبی رسالہ۔ اس کے حلقۂ ادارت میں محمد سعید شیخ [م: ۱۸/دسمبر ۲۰۰۳ء] امجد الطاف اور ریاض

احمد [۹ر جولائی ۲۰۰۷ء] شامل تھے۔ یہ پرچہ اب عرصہ ہوا بند ہو چکا ہے۔

۸۸۔ شاعر، افسانہ نگار، محقق اور مترجم۔ یکم جنوری ۱۹۳۵ء کو ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں لکھنؤ یونی ورسٹی سے بی ایس سی کرنے کے بعد ریلوے آفس گورکھ پور میں ملازم ہو گئے۔ بعد ازاں گورکھ پور یونی ورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۷۱ء میں پروفیسر محمود الٰہی کی نگرانی میں "نذیر احمد: شخصیت اور کارنامے" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڑھ میں اُردو کے استاد رہے۔ نذیر احمد : شخصیت اور کارنامے پر اتر پردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ نے نقد انعام دیا۔

۸۹۔ ڈاکٹر ہاشمی کی نگرانی میں ایم فل اُردو کے طالب علم عبدالمجید عابد "توبۃ النصوح کے متون کا تقابلی مطالعہ" کے موضوع پر کام کر رہے تھے، اسی سلسلے میں توبۃ النصوح کی مختلف اشاعتوں کی تلاش تھی۔

۹۰۔ نقاد، ادیب اور استاد۔ یکم جولائی ۱۹۳۶ء کو الطاف حسین کے گھر مراد آباد (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ایم اے، ایل ایل بی اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی، دہلی کے صدر شعبۂ اردو رہے۔ تنقید، تاریخ ادب، ڈراما، ترجمہ، تحقیق، تنقید، ترتیب اور شاعری کے موضوعات پر ستر سے زائد کتابیں لکھیں۔

۹۱۔ نامور نقاد، محقق اور استاد۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں قصبہ کراری ضلع الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں الٰہ آباد یونی ورسٹی سے ایم اے اُردو کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۵ء میں "اُردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں" کے موضوع پر کام کیا اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ جنوری ۱۹۵۳ء میں الٰہ آباد یونی ورسٹی میں اُردو کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۲ء میں پروفیسر کے عہدے پر تقرر ہوا۔ دلی اور جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، دہلی میں مہمان استاد کی حیثیت سے کام کیا۔ چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں: نئی فکریں، اُردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں، کیک اور شراب (ناول کا ترجمہ)، نئی علامت نگاری، تنقید اور عصری آگہی، سماجی تنقید اور تنقیدی عمل، انتخاب افسانہ اور مختصر تاریخ ادبِ اردو۔

۹۲۔ ڈاکٹر گیان چند کے بڑے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس کی وفات [۱۹۹۶ء] پر ڈاکٹر ہاشمی نے تعزیتی خط لکھا۔ ڈاکٹر پرکاش مونس ۷ر ستمبر ۱۹۱۱ء کو سیوہارہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ آگرہ یونی ورسٹی سے ایم اے اُردو اور آگرہ یونی ورسٹی سے ایل ایل بی اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اُردو ادب پر ہندی کا اثر اور اُردو اور ہندی کی داستانی روایات کا تقابلی مطالعہ ان کی کتابیں ہیں۔

۹۳۔ محقق، نقاد اور ادیب۔ ۲۲ر جنوری ۱۹۳۳ء کو محمد احمد کے گھر دہلی میں پیدا ہوئے۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ انجمن ترقی اُردو ہند (دہلی) کے سیکرٹری اور ہماری زبان کے مدیر ہیں۔ چند اہم تصانیف کے نام یہ ہیں: مرزا محمد رفیع سودا، متنی تنقید، غالب اور شاہانِ تیموریہ، غالب کے خطوط [پانچ جلدیں]، غالب کی نادر تحریریں، معراج العاشقین [تدوین]۔

۹۴۔ معروف نقاد، ادیب اور انگریزی ادبیات کے استاد۔ پ: مارچ ۱۹۲۵ء۔ سابق صدر شعبۂ انگریزی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ۔ چند

کتابیں ادب اور تنقید، نقشِ غالب، غالب کا فن، اقبال کی تیرہ نظمیں، نقشِ اقبال۔

۹۵۔ ڈاکٹر گیان چند جین پاکستان کے علمی دورے پر ۱۹۹۷ء میں آئے تو لاہور میں ان کے اعزاز میں دو تقاریب منعقد ہوئیں۔ ا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور کے تحت عامر ہوٹل، لاہور میں انھیں ایک استقبالیہ دیا۔ ۲۔ شعبۂ اُردو اورینٹل کالج نے سینٹ ہال میں ایک تقریب منعقد کی۔

۹۶۔ ڈاکٹر ہاشمی ۱۹۷۶ء میں اسسٹنٹ پروفیسر بنے۔ گورنمنٹ کالج سرگودھا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں وہ اسی عہدے پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۸۲ء میں وہ پنجاب یونی ورسٹی میں بہ طور لیکچرر منتخب ہوئے۔ ۲۳ر اپریل ۱۹۸۷ء کو اسسٹنٹ پروفیسر اور ۲۴ر جون ۱۹۹۱ء کو ایسوسی ایٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ پروفیسری پر فائز ہونے کے لیے وہ تقریباً دس سال منتظر رہے کیوں کہ شعبے میں پروفیسر کی اسامی خالی نہ تھی۔ یکم دسمبر ۲۰۰۰ء کو وہ پروفیسر منتخب ہوئے۔

۹۷۔ محقق اور استاد ادبیاتِ اُردو۔ [پ: ۲۹ر اکتوبر ۱۹۵۳ء] ۱۹۷۵ء میں اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور سے ایم اے اُردو اور ۱۹۹۰ء میں جامعہ پنجاب سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پنجاب آرٹس کونسل لاہور اور پھر بہاول پور کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر رہے۔ ۱۹۹۳ء میں اورینٹل کالج سے بہ طور لیکچرر اردو وابستہ ہوئے۔ آج کل پروفیسر اُردو کے ساتھ یونی ورسٹی کے پرنسپل رجسٹرار کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔

۹۸۔ نامور محقق، ادیب اور استاد۔ یکم جولائی ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئے۔ ایم اے انگریزی، اُردو اور فارسی کے بعد علی گڑھ یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی اور لکھنؤ یونی ورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، دہلی کالج اور لکھنؤ یونی ورسٹی میں فارسی اور اردو کے استاد رہے۔ اہم کتابوں میں دلی کا دبستانِ شاعری، مقدمہ کلیاتِ ولی اور مقدمہ نو طرزِ مرصع شامل ہیں۔

۹۹۔ یہ مضمون "محمود شیرانی مرحوم سے میرے استفادات" ہے جو ہاشمی صاحب کی فرمائش پر لکھا گیا اور ارمغانِ شیرانی مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی و ڈاکٹر زاہد منیر عامر مطبوعہ ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔

۱۰۰۔ مجموعے سے تحقیقی مقالات پر مشتمل ڈاکٹر ہاشمی کی کتاب تفہیم و تجزیہ مراد ہے جو ۱۹۹۹ء میں ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ/ کلیہ علومِ اسلامیہ و شرقیہ پنجاب یونی ورسٹی، لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی۔ اس مجموعے میں ہاشمی صاحب کے دس مضامین شامل ہیں۔

۱۰۱۔ ڈاکٹر گیان چند، حافظ محمود شیرانی پر کتاب نہ لکھ سکے البتہ ایک مضمون لکھا "محمود شیرانی مرحوم سے میرے استفادات"۔ یہ مضمون ارمغانِ شیرانی مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی و ڈاکٹر زاہد منیر عامر میں شامل ہے۔

۱۰۲۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن [م: ۱۵ر اگست ۲۰۰۵ء] نے ۱۹۹۸ء میں نسخۂ خواجہ کے نام سے دیوانِ غالب کا ایک قلمی نسخہ نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کیا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس نسخے کو پنجاب یونی ورسٹی کا مسروقہ نسخہ قرار دیا۔ انھوں نے دلائل کے ساتھ ثابت کیا کہ یہ وہی نسخہ ہے جس کا تعارف ڈاکٹر سید عبداللہ، قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور ایس ایم اکرام کرا چکے ہیں۔ معین صاحب کو اصرار تھا کہ یہ الگ نسخہ ہے۔ اس مناقشے نے خاصا طول پکڑا اور دونوں طرف سے کتابچے اور کتابیں لکھی گئیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے نسخۂ خواجہ کے خلاف جو کتاب لکھی اس کا نام ہے دیوانِ

غالب نسخۂ خواجہ: اصل حقائق۔

۱۰۳۔ رام پور کے روہیلہ سرداروں کے کتب خانوں پر مشتمل ایک مرکزی کتب خانے کی بنیاد ۱۷۷۴ء میں رکھی گئی۔ نواب محمد علی اور نواب غلام محمد کے بعد ۲۹ نومبر ۱۷۹۴ء کو لائبریری کی باقاعدہ تاریخ شروع ہوتی ہے۔ بعد کے نوابوں نے اس کی کتابوں میں اضافے کیے۔ پہلے اس لائبریری کا نام رام پور اسٹیٹ لائبریری تھا۔ نواب رضا علی خاں نے ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد لائبریری وقف کر دی تو اس کا نام رضا لائبریری کر دیا گیا۔ یکم جولائی ۱۹۷۵ء کو لائبریری مرکزی حکومت کی تحویل میں دے دی گئی۔ آغا محمد یوسف، میاں رحیم شاہ مجددی، بخشی عبدالرحیم خاں، منشی بانکے لال بہاری، کوپر صاحب، دیوان راج بہادر، حافظ احمد علی شوق، حکیم اجمل خاں، نجم الغنی، امتیاز علی خاں عرشی، بیم راج سود، اکبر علی خاں عرشی زادہ اور ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی اس عظیم الشان لائبریری کے ناظم رہے۔

۱۰۴۔ قاضی عبدالودود نے "دیوانِ غالب نسخۂ لاہور" کے پیراگراف سے ص ۱۴۳ میں درج تقریظ کی پہلی سطر کے "بفروغ گستری" اور دوسری سطر کے آخر اور تیسری سطر کے شروع کے الفاظ "خرام منامۂ دلربا" کو "بفروغ گستری" اور "خرام دلربا" پڑھا۔

۱۰۵۔ نسخۂ خواجہ کے حوالے سے ڈاکٹر گیان چند کا مضمون ہماری زبان، دہلی اور سورج، لاہور میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں ڈاکٹر تحسین فراقی کے نقطۂ نظر کی تائید کی گئی ہے۔

۱۰۶۔ محقق، غالب شناس، شاعر اور ماہرِ لسانیات۔ اصل نام سید شجاعت علی ہے۔ ۱۰ نومبر ۱۹۲۵ کو عبداللہ پور ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۸۵ء تک اُردو ڈکشنری بورڈ، کراچی میں مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۔ دسمبر ۲۰۰۰ء کو کراچی میں انتقال فرمایا۔ چند اہم تصانیف و تالیف: غالب کون ہے، غالب شناسی، غالب آگہی، سیرت النبیؐ، ہنگامۂ دل آشوب، اُردو ہندی لغت، مطالعۂ عبدالحق، لسانی مقالات (دو جلدیں)، اساسِ اُردو، مقالاتِ قدرت نقوی۔

۱۰۷۔ سید قدرت نقوی کے کتابچے کا نام مالِ مسروقہ نہیں بلکہ دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ یا نسخۂ مسروقہ ہے۔

۱۰۸۔ ڈاکٹر گیان چند نے قاضی عبدالودود پر جو کتاب لکھی، اس کا نام قاضی عبدالودود بحیثیت مرتبِ متن ہے۔ یہ کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے ۲۰۰۰ء میں شائع کی۔

۱۰۹۔ دیکھیے: حاشیہ نمبر: ۱۰۰

۱۱۰۔ ہماری زبان، انجمن ترقیِ اُردو ہند (دہلی) کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جو آج کل ڈاکٹر خلیل انجم کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔

۱۱۱۔ کراچی کا معروف علمی اور ادبی رسالہ۔ اس کے بانی اور مدیر مبین مرزا ہیں۔

۱۱۲۔ دیکھیے: حاشیہ نمبر ۹۹۔

۱۱۳۔ نامور محقق، نقاد اور عربی زبان و ادب کے استاد۔ پ: ۱۳ نومبر ۱۹۴۳ء۔ سابق صدر شعبۂ عربی، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ۔ چند اہم تصانیف: تذکرۂ شعرائے فرخ آباد، فہرستِ مخطوطات و نوادر در کتب خانۂ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، فہرستِ مخطوطاتِ احسن کلیکشن، احوال و نقدِ غالب، گوپال کتھا [تدوین]، تذکرۂ گلشنِ ہند [تدوین]۔

فہرست اسنادِ محولہ

الہ آبادی، دانش [مدیر]: بابت فروری، مارچ ۲۰۰۶ء: سبقِ اُردو: بھوانی۔

انجم، زاہد حسین: ۱۹۸۸ء: ہمارے اہلِ قلم، لاہور: ملک بک ڈپو۔

بلوچ، پروفیسر جعفر، شاہد رفاقت علی [مرتبین]: جون ۲۰۰۱ء: محاکمہ دیوانِ غالب نسخۂ لاہور (مسروقہ): لاہور: علم و عرفان پبلشرز۔

جاوید، ڈاکٹر انعام الحق و خاور جمیل: ۱۹۹۱ء: ڈاکٹر گیان چند جین (کتابیات): اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان۔

دلوی، پروفیسر عبدالستار: ۲۰۰۷ء: دو زبانیں، دو ادب (اردو اور ہندی کے تناظر میں): ممبئی: دائرۃ الادب۔

روہیلہ، مسعود الحسن خان: ۲۰۰۳ء: رام پور ۔ تاریخ و ادب: لاہور: ابلاغ پبلشرز۔

ساحر، عبدالعزیز: اکتوبر ۱۹۹۳ء: جمیل الدین عالی کی نثر نگاری: لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی۔

سدید، ڈاکٹر انور: جنوری ۱۹۹۲ء: پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ: اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان۔

سلیم، ڈاکٹر محمد منیر احمد: ۲۰۰۸ء: وفیاتِ اہلِ قلم: اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان۔

شاہد، رفاقت علی: ۱۷؍ ستمبر ۲۰۰۸ء: ڈاکٹر تحسین فراقی (کتابیات): لاہور: الفخر انٹرپرائزز۔

صدیقی، افتخار امام (مدیر): مئی تا دسمبر ۱۹۹۷ء: ماہنامہ شاعر [ہم عصر اُردو ادب نمبر]: بمبئی: مکتبہ قصر الادب۔

عمر، محمد سہیل؍ جمال پانی پتی (مدیران): ۱۹۸۶ء: روایت ۳: لاہور: مکتبۂ روایت۔

فتح پوری، فرمان، ڈاکٹر [مدیرِ اعلیٰ]: جولائی ۱۹۸۶ء: نگارِ پاکستان: گلشنِ اقبال کراچی۔

محمود الٰہی (چیئرمین): ۱۹۸۳ء: دستاویز (مصنفین کے اپنے قلم سے): لکھنؤ: اتر پردیش اُردو اکادمی۔

t رنگ، گوپی چند؍ عبداللطیف اعظمی: ۱۹۹۶ء: ہندوستان کے اُردو شعرا اور مصنفین: دہلی: اردو اکادمی۔

t شاد، ڈاکٹر ارشد محمود (مرتب): جون ۲۰۰۹ء: مکاتیبِ رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی: لاہور: ادبیات۔

t معلوم: جامع اُردو انسائیکلو پیڈیا [ج اول]: ۲۰۰۳ء: نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان۔

Abstract

Dr. Giyan Chand Jain (1923-1997) was a renowned scholar, critic, linguist, writer and historian of Urdu language and literature. His

works have been widely appreciated because of their originality and quality. He has been closely in touch with the prominent personalities working for Urdu language and literature all over the world. His correspondence with these literary figures and scholars, not only depicts the personal aspects of his life but also discloses his opinion and viewpoint about various academic and scholarly issues. This correspondence has not been compiled and published at a larger scale yet. However, his thirty letters addressed to Prof. Dr. Rafiuddin Hashimi, written during 1986-2001, along with the notes and annotations, have been edited in this article. These letters provide a direct reflection of the ideas, thoughts and priorities of Dr. Jain.

معیار : علمی و تحقیقی مجلہ، شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد ۱، شمارہ ۲، جولائی۔دسمبر ۲۰۰۹ء

اُردو رسائل کے اشاریوں کا اشاریہ

رفاقت علی شاہد*

اُردو میں اَدبی رسائل کا آغاز قدرے تاخیر سے ہوا بشرطے کہ ہم گلدستوں کو اَدبی رسائل کی موجودہ بحث میں شامل نہ کریں؛ جب کہ اُردو اخبارات اس سے تقریباً نصف صدی قبل شائع ہونا شروع ہو گئے تھے، اس لیے اَدبی رسائل کے آغاز تک ان کی کمی کسی نہ کسی حد تک اخبارات کے ذریعے پوری ہوتی رہی۔ ان اخبارات میں اَدبی و نیم اَدبی مضامین اور اَدبی سرگرمیوں کی رودادیں شائع ہوتی تھیں۔ اَدبی مضمون نگاری کا نقطۂ آغاز اصل میں انھی کو سمجھنا چاہیے۔ یہاں ان ابتدائی اَدبی مضامین کے معیار سے بحث نہیں۔ یہی روایت ترقی کرتے کرتے خالص اَدبی، تحقیقی، تنقیدی اور علمی مضامین کی تخلیق و اشاعت کا سبب بنی، چناں چہ آگے چل کر اَوَدھ اخبار اور اَوَدھ پنچ جیسے اخبارات و جرائد میں خالص تنقیدی و علمی مضامین کی اشاعت کو اس سلسلے میں مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۸۷۳ء میں حیدرآباد دکن سے مخزن الفوائد نامی جریدے کی اشاعت ہوئی۔ اب تک کی معلومات کے مطابق اسے اُردو کا پہلا اَدبی رسالہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ انیسویں صدی ہی میں علی گڑھ سے تہذیب الاخلاق، حیدرآباد دکن سے حسن، لکھنؤ سے شرر لکھنوی کا دل گداز اَدبی رسالوں کے طور پر جلوہ گر ہوئے۔ اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے معارف کے نام سے ایک اہم علمی و تنقیدی رسالہ شائع ہونا شروع ہوا۔ اسے وحید الدین سلیم پانی پتی ترتیب دیتے تھے۔ اپنی چند سالہ مختصر زندگی میں یہ رسالہ سیاحت میں رہا، چناں چہ علی گڑھ سے پانی پت، وہاں سے دہلی اور پھر آگرہ پہنچا۔ صدی کے اختتامی سالوں میں حیدرآباد دکن سے افسر نامی رسالے کا آغاز ہوا۔ یہ وہی علمی و اَدبی رسالہ ہے جس کے مدیر بعد میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق بنے۔

بیسویں صدی اصل میں اُردو رسائل کی صدی کہلانے کی حق دار ہے۔ اس صدی کے آغاز سے ہی اُردو کے اہم علمی و اَدبی رسالوں کی اشاعت شروع ہوئی، چناں چہ مخزن (لاہور)، عصرِ جدید (میرٹھ)، زمانہ (بریلی، کان پور)، اُردوئے معلّٰی (علی گڑھ، کان پور)، دکن ریویو (حیدرآباد دکن، بمبئی) اس سلسلے کے اہم رسائل ہیں۔ بعد ازاں تقسیمِ ہند تک اُردو میں مواد و ہیئت کے اعتبار سے ایسے قابلِ تقلید رسالے شروع ہوئے جنھوں نے اُردو ادب اور اپنے معاصر رسائل پر ہر اعتبار سے گہرے نقوش چھوڑے۔ لاہور سے ہزار داستان، ہمایوں، اَدبی دنیا، نیرنگِ خیال، اَدبِ لطیف، عالم گیر، شاہ کار، شبابِ اُردو، اورینٹل کالج میگزین، سویرا؛ لکھنؤ سے خیابان، الناظر، صبحِ اُمید، نگار (آغاز بھوپال سے)؛ اعظم گڑھ سے معارف؛ دہلی سے

* مکان نمبر ۲۸، گلی ۱۰، احمد کالونی، نزد کیو بلاک، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔

تمدن ، صلائے عام ، ساقی (بعد ازاں کراچی سے)، آج کل ، برہان ، ہماری زبان ؛ الہ آباد سے ادیب ، ہندستانی ؛ پنڈی بہاؤالدین سے صوفی ؛ اورنگ آباد سے اُردو (بعد ازاں دہلی اور کراچی سے)؛ بھوپال سے افکار (بعد ازاں کراچی سے)؛ حیدر آباد دکن سے تاج ، تاریخ ، مجلۂ مکتبہ ، مجلۂ عثمانیہ ، افادہ ، ذخیرہ ، ترقی ، سب رس ؛ میرٹھ سے نظارہ ، ماہ نو ؛ علی گڑھ سے علی گڑھ میگزین ، سہیل ؛ آگرہ سے شاعر (بعد ازاں بمبئی سے)، پیمانہ ، شمع ، نقاد ؛ بنگلور سے نیا دور ، گیا (بہار) سے ندیم ؛ پٹنہ سے معاصر ؛ امرتسر سے چمنستان ، مخزن ؛ پشاور سے ادیب ایسے ہی معروف رسالے ہیں جن کی منفرد علمی حیثیت آج بھی قابلِ مثال ہے۔

تقسیم کے بعد نوائے ادب (بمبئی)، اُردو ادب (علی گڑھ ، دہلی)، نقوش ، صحیفہ ، الاسلام ، اقبال ریویو ، اقبالیات ، فنون ، اوراق ، مجلۂ تحقیق ، ثقافت ، المعارف ، راوی ، فاران (لاہور)، قومی زبان ، معاصر (کراچی) ، خدا بخش لائبریری جرنل (پٹنہ)، اُردوئے معلّٰی ، تحریر (نئی دہلی)، بنگلہ دیش (امرتسر)، تحقیق (جام شورو) جیسے صفِ اول کے ادبی ، تحقیقی و علمی رسائل شروع ہوئے اور ان میں سے بیشتر اب بھی شائع ہو رہے ہیں۔

رسائل کے مذکورہ بالا نام مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ ان رسائل میں صفِ اول کے ادیبوں ، نقادوں ، عالموں اور محققوں کی تحریریں بالالتزام شائع ہوتی رہی ہیں۔ ظاہر ہے ان تحریروں سے استفادے کے لیے متعلقہ رسائل سے رجوع کرنا ضروری ہے۔

یہ صرف آج بیان نہیں کہ ادب کی تاریخ لکھتے وقت محض کتابوں سے استفادہ کافی ہے۔ رسائل میں بکھرے ہوئے اہم مضامین (جن میں سے بعض اپنے اپنے موضوعات پر آج بھی حرفِ آخر ہیں۔ یہ موضوعی خصوصی شمارے بھی اسی ذیل میں آتے ہیں) اور متون سے بھی مناسب طور پر فائدہ اُٹھانا لازم ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسائل کے مذکورہ مضامین اور متون سے استفادہ کیے بغیر معیاری اور جامع تاریخِ ادب لکھی نہیں جا سکتی۔ ادب کی تاریخ میں ، ظاہر ہے ادب کی عہد بہ عہد ترقی اور مختلف ادوار میں ادب کو متاثر کرنے والی تحریکوں کا تجزیہ اور تاریخ بیان کی جاتی ہے اور معاصر رسائل و جرائد کے مطالعے کے بغیر مذکورہ مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔ محض کتابوں کی مدد سے ہر دور کے ادب کی جہات ، رجحانات اور پھر ادب کی منزل بہ منزل ترقی کی تصویر پورے طور پر واضح نہیں ہوتی۔

اُردو رسائل اور ان میں شائع شدہ مضامین کی مذکورہ بالا اہمیت کے پیشِ نظر یہ احساس شدت سے سر اُٹھاتا ہے کہ مذکورہ سیکڑوں رسائل میں شائع ہونے والے ہزاروں مضامین کی فہرست موجود ہونی چاہیے ، تاکہ ان سے کما حقہ مستفید ہوا جا سکے۔ یہ فہرست ایسی ہونی چاہیے کہ استفادہ کرنے والے کو آسانی کے ساتھ مطلوبہ مضمون یا مضامین کی نشان دہی ہو سکے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے اشاریہ سازی کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

اشاریے کے بغیر اوّل تو رسالے کے مشمولات اور اس میں شائع ہونے والے کُل سرمایے کا اندازہ نہیں ہو سکتا ، دوسرے : اس کی غیر موجودگی میں محقق یا طالب کو اپنی ضرورت کے مضامین کی نشان دہی نہیں ہو سکتی۔ اب تک اُردو میں درجنوں موضوعات پر سیکڑوں تحقیقی کتب اور اسنادی مقالات لکھے جا چکے ہیں لیکن ان میں متعلقہ موضوعات پر رسائل کے اہم مضامین سے اس طرح استفادہ نہیں کیا جا سکا جس کی ایک تحقیقی مقالے یا کتاب میں ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اشاریہ نہ ہونے کی وجہ سے تحقیق کار کو علم نہیں ہو پاتا کہ جس موضوع پر وہ تحقیق کر رہا ہے اس موضوع پر رسائل میں کیا کچھ شائع ہو چکا ہے اور وہ کہاں کہاں دست یاب ہے۔ اگر جامع اشاریے موجود ہوں تو ہر تحقیق

کارکام شروع کرنے سے قبل ان اشاریوں کی مدد سے اپنے مطلب کے مواد سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے اور متعلقہ مواد تک رسائی حاصل کر کے اپنے تحقیقی کام کو مزید بہتر بنا سکتا ہے۔ ظاہر ہے اشاریے کی عدم موجودگی میں رسائل کے تمام شماروں کو کھنگال کر مفید مطلب مواد کا حصول نہ صرف وقت کا ضیاع ہے بل کہ محقق کے لیے اس قدر سوہانِ روح ہے کہ اس کی بیش تر صلاحیتیں اور طاقت اسی تلاش میں صرف ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر مخزن کی پچاس سالہ اشاعتی زندگی کے دوران اس میں ہزاروں تخلیقی، تنقیدی، تاثراتی اور تحقیقی تحریریں شائع ہوئیں۔ اب مخزن کا جامع اشاریہ موجود نہ ہونے کی وجہ سے ایک تو اس میں شائع ہونے والی تخلیقات سے آشنائی ممکن نہیں، دوسرے: تمام تحریریں سامنے نہ ہونے کے باعث رسالے کی مجموعی خدمات کا اندازہ نہیں ہو سکتا، تیسرے: اس رسالے میں شائع ہونے والی ہزاروں تحریروں میں سے اپنے مطلب کا مواد حاصل کرنا آسان نہیں۔ سیکڑوں شماروں میں موجود ہزاروں تحریروں کا جائزہ لے کر ضرورت کے مضامین کی تلاش یقیناً جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

اُردو ادبی رسائل کے مضامین کے اشاریوں کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالنے کے بعد جب ہم اس سلسلے میں عملی کوششوں کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں تو یہاں بھی ہمارا سامنا مایوسی سے ہوتا ہے۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اُردو کے سیکڑوں ادبی رسائل میں سے اب تک کسی ایک رسالے کے مضامین کا (رسالے کا) بھی جامع اشاریہ موجود نہیں۔ کہنے کو تو اب تک بیسیوں اُردو رسائل کے "اشاریے" تیار ہو کر شائع ہو چکے ہیں لیکن بہ نظرِ امعان دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اشاریے کہنا بہت مشکل ہے۔ ان میں سے بیش تر تو محض سیدھی سادی فہارسِ مضامین ہیں؛ کچھ اس سے ذرا زیادہ فائدہ مند ہیں تو وہ بھی فہارسِ مضامین کی صف سے آگے نہیں بڑھتے؛ صرف معدودے چند فہارس کو 'مشروح فہارس' کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے۔ اشاریے کے ذیل میں وہ پھر بھی شامل نہیں ہو سکیں۔ ایسی فہارس میں سہ ماہی اُردو کی مشروح فہارسِ مضامین (۴ جلدوں) کے طرز کی فہرستیں شامل ہیں۔

اُردو رسائل کی موجود فہارس کی تفصیل

ذیل میں اُردو رسائل کی اُن فہارسِ مضامین کی فہرست پیش کی جا رہی ہے جو اشاریوں کے نام سے شائع ہوئیں۔ اس فہرست میں اُن فہارس کا اندراج ہے جو کسی رسالے کے ایک سال سے زائد کے شماروں کی فہرست پر مشتمل ہیں۔ بعض رسائل ایک سال پورا ہونے پر اس سال کی فہرستِ مضامین شائع کرتے رہے ہیں۔ اس مفید کام کا آغاز ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) سے ہوا تھا، پھر برہان (دہلی)، ہماری زبان (علی گڑھ/دہلی) وغیرہم میں بھی مستقلاً ایسی فہرستیں شائع ہونے لگیں۔ زیرِ نظر فہرست میں ایسی فہارس سے صرفِ نظر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بعض اشاریے یا فہارس سندی مقالات کی شکل میں موجود ہیں۔ سرِ دست ان سے بھی صرفِ نظر کیا گیا ہے اور صرف انھیں فہارسِ مضامین کو اس فہرست میں جگہ دی گئی ہے جو مطبوعہ صورت میں (کتابی شکل میں یا رسائل میں) موجود ہیں۔

یہ اُردو رسائل کی اُن فہارسِ مضامین کی تفصیل ہے جو راقم الحروف کے علم میں آ سکیں۔ وسیع تر استفادے کے لیے اُن کی تفصیلات درج کی جاتی ہیں۔ اس فہرست کی تیاری میں مشفق خواجہ مرحوم اور محترم ڈاکٹر معین الدین عقیل کے کتب خانوں سے بہ طورِ خاص استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ درج ذیل ماخذ سے بھی معلومات حاصل کی گئی ہیں۔ جو اندراجات اس ماخذ کی مدد سے کیے گئے ہیں، اُن کے ساتھ اس کی نشان دہی کر دی گئی ہے:

۱۔ ”اُردو رسائل کے اشاریوں کا اشاریہ“: مولف: ڈاکٹر سید مسعود حسن: ماہنامہ اخبارِ اُردو، اسلام آباد، فروری ۲۰۰۹ء، ص ۱۲ تا ۱۸
[تلخیص: مسعود]

درج بالا ماخذ میں ۱۰۲ ۔ رسائل کی کل ملا ۱۲۸ ۔ اشاریہ یا فہرستوں کا اندراج ہے جب کہ موجود فہرست میں ۱۳۲ ۔ اردو رسائل و جرائد کی مذکورہ بالا مخصوص نوعیت کی ۱۷۳ ۔ اشاریوں کی تفصیل شامل کی گئی ہے ۔ جہاں جہاں معلومات حاصل ہوسکیں فہرست کے دورانیہ بحث اور توضیح کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے ۔ کتابی صورت میں شائع ہونے والے اشاریوں کے عناوین اور رسائل کے نام نسخ رسم خط میں جب کہ رسائل میں شائع شدہ اشاریوں کے عنوان و اوین کے اندر نستعلیق رسم خط میں درج ہیں۔

۱۔　اخبارِ اُردو　(ماہنامہ کراچی، اسلام آباد)

ا۔ ”موضوعاتی اشاریہ مضامین اخبارِ اُردو (اسلام آباد)“ مرتب: محمد اشرف کمال: ماہنامہ اخبارِ اُردو، اسلام آباد، جولائی ۔ ستمبر ۲۰۰۱ء، ص　　تا　　۔

[جولائی ۱۹۸۱ء (آغاز) تا جون ۲۰۰۱ء کی فہرست مشمولات]

۲۔　اخبار سین ٹیفک سوسائٹی　(مخزونہ علی گڑھ)

ا۔ ”اخبار سین ٹیفک سوسائٹی علی گڑھ“: از عابد رضا بیدار، مشمولہ: اُردو کے اہم اَدبی رسالے اور اخبار: رام پور، انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز، ۱۹۹۰ء، ص ۱ تا ۳۰۔

[۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء (آغاز) تا ۱۸۹۹ء اور ۱۸۷۳ء کے مضامین کا تذکرہ]

۳۔　اختر　(ماہنامہ مولانی، ضلع میمن سنگھ (سابقہ مشرقی پاکستان)

ا۔ ”ماہنامہ اختر مولانی، ڈھاکا“: از شعیب عظیم: سہ ماہی صحیفہ، لاہور، اپریل ۱۹۸۲ء، ص ۷۸ تا ۸۳۔

۲۔ ”ماہنامہ اختر مولانی: ایک تفصیلی جائزہ“: از شعیب عظیم: ماہنامہ جامعہ، نئی دہلی: مئی ۱۹۸۲ء، ص ۳۲ تا ۳۸۔

۴۔　اَدبِ لطیف　(ماہنامہ لاہور)

ا۔ ماہنامہ اَدبِ لطیف کی اَدبی خدمات: از ڈاکٹر شگفتہ حسین: ملتان، شعبۂ اُردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی: مارچ ۲۰۰۶ء، ص ۲۱۳ تا ۳۲۷۔

۵۔　ادیب　(ماہنامہ فیروز آباد)

ا۔ اہم مشمولات کی تجزیاتی فہرست، مشمولہ: ”فیروز آباد کا رسالہ ادیب“: از عابد رضا بیدار: سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ: شمارہ ۳: ۱۹۷۸ء، ص ۷۳ تا ۱۰۴۔

[یہ رسالہ جنوری تا دسمبر ۱۸۹۹ یعنی ایک سال شائع ہوا۔ یہاں اس کے اہم شمولات کی موضوع وار مختصر فہرست ہے]

۶۔　اَدیب　(ماہنامہ الہ آباد)

ا۔ موضوعی فہرستِ مضامین، مشمولہ: ”رسالہ ادیب الہ آباد“: از عابد رضا بیدار: سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ: شمارہ ۹: ۱۹۷۹ء۔

۲۔ ایضاً، مشمولہ: نوبت رائے نظر کا "ادیب" ۱۹۱۰ء۔ ۱۹۱۳ء: تعارف و انتخاب: ترتیب و مقدمہ: عابد رضا بیدار؛ پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۸۸ء؛ ص نو تا چھپن۔

[جنوری ۱۹۱۰ء (آغاز) تا جولائی ۱۹۱۳ء (انجام) کے مشمولات کی موضوع وار فہرست]

۷۔ ادیب (ماہنامہ، سہ ماہی، علی گڑھ)

۱۔ "گزشتہ تین برسوں کے مضامین کا اشاریہ (۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۳ء)"؛ مرتب: غلام اسلام انصاری؛ سہ ماہی ادیب، علی گڑھ؛ جولائی، دسمبر ۱۹۸۳ء [بحوالہ مسعود]

۸۔ ارتقا (سہ ماہی، کراچی)

۱۔ "اشاریہ ارتقا"؛ مرتب: ادارہ؛ سہ ماہی ارتقا، کراچی؛ شمارہ ۱۰: جنوری ۱۹۹۳ء؛ ص ۲۳۳ تا ۲۵۱۔

۹۔ اُردو (سہ ماہی، اورنگ آباد، دہلی، کراچی)

۱۔ "اشاریہ مضامین اُردو"؛ مرتب: سرفراز علی رضوی؛ سہ ماہی اُردو، کراچی؛ (۶ قسطیں) اپریل ۱۹۶۶ء، ص ۱۱۶ تا ۱۲۴ + جولائی ۱۹۶۶ء، ص ۱۱۷ تا ۱۳۲ + اکتوبر ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۳ تا ۱۴۸ + جنوری ۱۹۶۷ء، ص ۴۹ تا ۸۰ + اپریل ۱۹۶۷ء، ص ۸۱ تا ۱۱۲ + جولائی ۱۹۶۷ء، ص ۱۱۳ تا ۱۲۸

۲۔ اشاریۂ اُردو (جلد اول)؛ مرتب: سید سرفراز علی رضوی؛ معاون: ابو سلمان شاہجہان پوری؛ کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان؛ اشاعت اول ۱۹۷۶ء؛ ۲۴۰ ص (مذکورہ بالا کی کتابی صورت میں اشاعت)

[جنوری ۱۹۲۱ء (آغاز) تا ۱۹۶۲ء (بابائے اُردو نمبر) کی الف بائی ترتیب سے مصنف وار توضیحی فہرست مشمولات]

۳۔ "رسالہ اُردو اور صحیفہ میں ذخیرۂ اقبالیات"؛ مرتب: صابر کلوروی؛ سہ ماہی اقبالیات، لاہور؛ جنوری تا مارچ ۱۹۸۸ء؛ ص ۳۷۳ تا ۳۸۳۔

[رسالے میں اقبالیات کے موضوع پر شائع ہونے والے مضامین کی مصنف وار الف بائی ترتیب سے فہرست]

۴۔ اشاریۂ اُردو (جلد دوم)؛ مرتب: مصباح العثمان؛ کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۳ء؛ ۱۸۰ ص۔

[رسالے کے دورِ دوم: جنوری ۱۹۶۶ء تا ۲۰۰۲ء کے مضامین کی مصنف وار، "ردّ کہن" اور تبصروں کی فہرست اور شماروں کی تفصیل]

۱۰۔ اُردو ادب (سہ ماہی، علی گڑھ)

۱۔ "اشاریہ مضامین اُردو ادب"؛ مرتب: محمد ضیاء اللہ ظفر؛ سہ ماہی اُردو ادب، علی گڑھ؛ (چار قسطیں) شمارہ ۱: ۱۹۶۸ء، ص ۱۲۹ تا ۱۵۷ + شمارہ ۲: ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۳ تا ۱۴۸ + شمارہ ۳: ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۹ تا ۱۴۸ + شمارہ ۴: ۱۹۶۸ء، ص ۱۲۷ تا ۱۵۴۔

[جولائی ۱۹۵۰ء (آغاز) تا شمارہ ۲: ۱۹۶۷ء کے مضامین کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست اور مصنفین کا اشاریہ]

۱۱۔ اُردو نامہ (سہ ماہی، کراچی)

۱۔ اشاریۂ اُردو نامہ؛ مرتب: مصباح العثمان؛ کراچی: اُردو لغت بورڈ (اُردو ڈکشنری بورڈ)، ۱۹۹۷ء؛ [اگست ۱۹۶۰ء (آغاز) تا اپریل ۱۹۷۷ء (آخری شمارہ نمبر ۵۲) کے مشمولات کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار و مصنف وار اشاریہ مشمولات]

۱۲۔ اُردوئے معلّٰی (ماہنامہ، کانپور، علی گڑھ)

۱۔ فہرست مضامین، مشمولہ: "حسرت موہانی"؛ از عابد رضا بیدار؛ ماہنامہ برہان، دہلی؛ جولائی ۱۹۶۱ء تا اکتوبر ۱۹۶۲ء (۱۶ قسطیں)، مکمل

۱۳۳ صفحات۔

۲۔ ''اُردوئے معلّٰی کے مضامین کی فہرست'' مرتب: ڈاکٹر محمد ضیاءالدین انصاری۔ ماہنامہ آج کل، نئی دہلی: اگست تا دسمبر ۱۹۸۱ء (حسرت نمبر): ص ۶۶ تا ۸۰۔

۳۔ ''اُردوئے معلّٰی کے کچھ شماروں کی فہرست مضامین'' مرتب: انصار اللہ۔ دوماہی اکادمی، لکھنؤ: جولائی و اگست ۱۹۸۳ء: ص ۹۳ تا ۱۰۸۔

[جولائی ۱۹۰۳ء (آغاز) تا اپریل ۱۹۰۷ء کے ۳۶ مختلف شماروں کی شمارہ وار فہرستیں]

۱۳۔ اسلام اور عصرِ جدید (ماہنامہ نئی دہلی)

۱۔ ''اشاریہ سہ ماہی اسلام اور عصرِ جدید'' مرتب: محمد عرفان۔ سہ ماہی اسلام اور عصرِ جدید، نئی دہلی: جنوری ۱۹۸۶ء، جنوری ۱۹۹۳ء، اکتوبر ۱۹۹۶ء، اپریل ۱۹۹۸ء [بحوالہ مسعود]۔

۲۔ مکمل اشاریہ (۱۹۶۹ء تا ۱۹۹۹ء) اسلام اور عصرِ جدید (سہ ماہی)۔ مرتبین: محمد عرفان، جمیل انجم ابوذر خیری۔ نئی دہلی: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، ۱۹۹۹ء: ۵۶ ص۔

[آغاز (۱۹۶۹ء) تا اکتوبر ۱۹۹۹ء کی شمارہ وار فہرستِ مضامین]

۱۴۔ اقبال (سہ ماہی۔ لاہور۔ اُردو، انگریزی)

۱۔ اشاریہ سہ ماہی مجلّہ اقبال۔ مرتبہ: اختر النساء۔ لاہور: بزمِ اقبال، فروری ۱۹۹۴ء: ۸۶+۱۵۴ (اُردو) + ۳۴ + ۱۱۱ (انگریزی) ص

[جولائی ۱۹۵۲ء (آغاز) تا جنوری ۱۹۹۴ء کے مشمولات کی الف بائی ترتیب سے شمارہ وار، مصنف وار اور موضوع وار فہرستِ مضامین]

۲۔ ''اشاریہ (مصنف وار) سہ ماہی مجلّہ اقبال (حصّۂ اُردو) [اپریل ۱۹۹۴ء تا اپریل ۲۰۰۷ء]''

مرتب: محمد نعیم بزمی: سہ ماہی اقبال، لاہور: جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷ء: ص ۸۶ تا ۱۱۸۔

[اپریل ۱۹۹۴ء تا اپریل ۲۰۰۷ء کی الف بائی ترتیب سے مصنف وار فہرستِ مشمولات]

۳۔ اشاریہ سہ ماہی مجلّہ اقبال [اپریل ۱۹۹۴ء تا اپریل ۲۰۰۷ء]

مرتب: محمد نعیم بزمی۔ لاہور: بزمِ اقبال، جون ۲۰۰۹ء: ۱۲۸ (اُردو) + ۴۰ (انگریزی) ص۔

[اپریل ۱۹۹۴ء تا اپریل ۲۰۰۷ء کی الف بائی ترتیب سے مصنف وار اور تاریخی ترتیب سے اقبالیاتی اور عمومی مضامین اور تبصرہ ہائے کتب کی فہرستِ مشمولات]

۱۵۔ اقبالیات (سہ ماہی۔ لاہور۔ اُردو، انگریزی، فارسی، عربی، ترکی)

۱۔ اشاریہ اقبالیات (اُردو، انگریزی، فارسی، عربی، ترکی): مرتبہ: اختر النساء۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۸ء: ۳۱۳ ص۔

۲۔ ''سہ ماہی مجلّہ اقبالیات، لاہور: اپریل ۱۹۶۰ء تا جولائی ۱۹۹۴ء'' مرتبہ: اختر النساء۔

ماہنامہ اُردو بک ریویو نئی دہلی: (۷ قسطیں): شمارہ ۵۳ و ۵۴: مارچ و اپریل ۲۰۰۰ء: ص ۳۳ تا ۳۶ + شمارہ

۵۵ و ۵۶: مئی و جون ۲۰۰۰ء؛ ص ۳۳ تا ۴۵ + شمارہ ۵۷ و ۵۸: جولائی و اگست ۲۰۰۰ء؛ ص ۵۲ + شمارہ ۶۱ و ۶۲: نومبر و دسمبر ۲۰۰۰ء؛ ص ۵۶ تا ۵۸ + شمارہ ۶۳ و ۶۴: جنوری و فروری ۲۰۰۱ء؛ ص ۴۷ تا ۴۹ + شمارہ ۶۵ و ۶۶: مارچ و اپریل ۲۰۰۱ء؛ ص ۵۱ تا ۵۳ + شمارہ ۶۷ و ۶۸: مئی و جون ۲۰۰۱ء؛ ص ۵۲، ۵۳۔

۱۶۔ اقبالیات (شش ماہی، سری نگر)

ا۔ ''اقبالیات (سری نگر) کے مشمولات کا اشاریہ'': مرتب: جاوید اشرف؛ سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ؛ شمارہ ۶۳ تا ۶۸: ۱۹۹۱ء؛ ص ۷۹۷ تا ۸۰۰۔

[ستمبر ۱۹۸۸ء (آغاز) تا اپریل ۱۹۸۹ء (شمارہ ۵) کے مشمولات کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست]

۱۷۔ اکادمی (دوماہی، لکھنؤ)

ا۔ ''دوماہی اکادمی، لکھنؤ: پچھلی چار جلدوں میں شائع شدہ مضامین کی فہرست'': مرتب: ادارہ؛ دوماہی اکادمی، لکھنؤ؛ جولائی و اگست ۱۹۸۵ء؛ ص ۹۹ تا ۱۰۰۔

[جولائی و اگست ۱۹۸۱ء (آغاز) تا مئی و جون ۱۹۸۵ء کی شمارہ وار فہرستِ مضامین]

۲۔ ''دوماہی اکادمی، لکھنؤ: جلد ۵ تا ۸ میں شائع شدہ مضامین'': مرتب: اظہر مسعود رضوی؛ دوماہی اکادمی، لکھنؤ؛ جولائی و اگست ۱۹۸۹ء؛ ص ۷۹ تا ۸۸۔

[جولائی و اگست ۱۹۸۵ء تا مئی و جون ۱۹۸۹ء کے مشمولات کی فہرست]

۱۸۔ البلاغ (ہفتہ وار، کلکتہ) [مدیر: ابوالکلام آزاد]

ا۔ ''البلاغ (۱۹۱۵ء۔۱۶ء) کلکتہ (اشاریہ مندرجات)'': مرتب: ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری؛ مشمولہ: مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت: از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری؛ کراچی، ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان؛ ۱۹۸۹ء؛ ص ۱۳۷ تا ۱۴۷۔

[الہلال کی جگہ شروع ہوا۔ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء تا ۳۱ مارچ / اپریل ۱۹۱۶ء (شمارہ ۱ تا ۱۷) شائع ہوا۔ یہ انھی ۱۱ شماروں کے مشمولات کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست ہے]

۱۹۔ الجامعہ (پندرہ روزہ، کلکتہ)

ا۔ فہرستِ مضامین (ص ۱۸۷ تا ۱۹۱) مشمولہ: ''مجلہ الجامعہ کلکتہ'': از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری؛ مشمولہ: مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت: از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری؛ کراچی، ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان؛ ۱۹۸۹ء؛ ص ۱۸۷ تا ۱۹۱۔

[شمارۂ اوّل: یکم اپریل ۱۹۲۳ء تا شمارہ ۳۰: مارچ ۱۹۲۴ء کے مشمولات کی موضوع وار فہرست]

۲۰۔ الحکمت (علمی ماہنامہ، دہلی)

ا۔ ''اشاریہ الحکمت'': از نعیم ارشاد اعظمی؛ سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ؛ شمارہ ۱۴۴: اپریل تا جون ۲۰۰۶ء؛ ص ۱ تا ۴۷۔

[مئی ۱۹۶۵ء (آغاز) تا ستمبر ۱۹۶۷ء (انجام) کے مشمولات کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست]

۴۱۔　الرشاد (ماہنامہ اعظم گڑھ)

۱۔"اشاریہ ماہنامہ الرشاد": مرتب: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی: ماہنامہ الرشاد، اعظم گڑھ (ایک سے زائد قسطیں) مطبوعہ تفصیلات: اپریل و مئی ۲۰۰۳ء، ص ۲۸ + جون ۲۰۰۳ء، ص ۳۲ + جولائی و اگست ۲۰۰۳ء، ص ۳۳ + ستمبر و اکتوبر ۲۰۰۳ء، ص ۵۹ + نومبر و دسمبر ۲۰۰۳ء، ص ۵۱۔

[فروری ۱۹۸۱ تا دسمبر ۲۰۰۲ء کے مشمولات کی مصنف وار فہرست]

۲۔اشاریہ ماہنامہ الرشاد (۱۹۸۱ تا ۲۰۰۲ء) مرتب: ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی: اعظم گڑھ، جامعۃ الرشاد، ۲۰۰۳ء، ۲۳۲ ص۔

[ایضاً۔ نمبر ۱ مندرجہ بالا کی کتابی اشاعت]

۴۲۔　المسیرۃ عالمی (ششماہی۔ کراچی)

۱۔"ششماہی المسیرۃ عالمی، کراچی: شمارہ ۱ تا ۵" مرتب: مولانا احمد ساوی: ششماہی المسیرۃ عالمی، کراچی: مئی ۲۰۰۱ء، ص ۳۹۴ [بحوالہ مسعود]

۲۔ایضاً: ماہنامہ اُردو بُک ریویو، نئی دہلی: مئی و جون ۲۰۰۲ء، ص ۵۹ تا ۶۲۔

۳۔"اشاریہ ششماہی المسیرۃ عالمی" مرتب: حافظ سید محمد ظہیر سعید: مشمولہ: موضوعاتی اشاریہ ششماہی المسیرۃ عالمی شمارہ ۱ تا ۹ اور نعت رنگ، نعتیہ ادب کا کتابی سلسلہ، شمارہ ۱ تا ۱۳: از حافظ سید محمد ظہیر سعید: کوئٹہ، سیرت اکادمی بلوچستان (رجسٹرڈ):

اشاعت اوّل، ربیع الاوّل ۱۴۲۴ھ/　　مئی ۲۰۰۳ء، ص ۱۱ تا ۴۸۔

[شمارہ ۱ تا ۹ کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست مشمولات]

۴۔"موضوعاتی اشاریہ ششماہی المسیرۃ عالمی، کراچی [شمارہ ۱ تا ۹]" مرتب: حافظ سید محمد ظہیر سعید۔ ماہنامہ اُردو بُک ریویو نئی دہلی: (دو قسطیں): شمارہ ۱۱۹: ۱۲۰: ستمبر و اکتوبر ۲۰۰۵ء، ص ۱۷ تا ۱۹ + شمارہ ۱۲۱ تا ۱۲۲: نومبر و دسمبر ۲۰۰۵ء، ص ۲۵ تا ۳۱۔　[ایضاً]

۴۳۔　العصر (ماہنامہ لکھنؤ)

۱۔ اظہار یہ مضامین، مشمولہ: پیارے لال شاکر کے ماہنامہ "العصر" (۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۷ء) کا انتخاب: سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ: شمارہ ۱۳ تا ۱۵: ۱۹۸۰ء، ص ۵۸۹ تا ۵۹۳۔

[مارچ ۱۹۱۳ء (آغاز) تا دسمبر ۱۹۱۷ء (آخری شمارہ) کی اظہاریہ مشمولات کا عکس]

۲۔ایضاً (کتابی صورت میں) پٹنہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری: ۱۹۸۰ء، ص ۵۸۹ تا ۵۹۳۔

۴۴۔　العلم (سہ ماہی۔ کراچی)

۱۔ "اشاریہ مضامین العلم (سہ ماہی)" مرتب: حکیم نعیم الدین زبیری ندوی: سہ ماہی العلم، کراچی: اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص ۷۷ تا ۱۰۰۔

[جلد اوّل بابت ۱۹۵۱ء تا جلد چالیس (۴۰) بابت ۱۹۷۳ء کے مشمولات کی مصنف وار فہرست]

۲۵۔ المعارف (ماہنامہ۔لاہور)

۱۔ "اشاریہ ماہنامہ المعارف" (جنوری ۱۹۶۸ء۔مئی ۱۹۷۸ء)" مرتب: محمد عبداللہ: سہ ماہی اسلام اور عصرِ جدید نئی دہلی: جولائی، اکتوبر ۱۹۸۳ء، اکتوبر ۱۹۸۴ء، جنوری، اپریل ۱۹۸۵ء [بحوالہ مسعود]

۲۔ "اشاریہ المعارف (لاہور) [اقبالیات]" مرتبہ: اختر النسا: سہ ماہی اقبال، لاہور: اکتوبر ۱۹۹۱ء تا جنوری ۱۹۹۲ء، ص ۲۳۹ تا ۲۵۳۔
[آغاز (جنوری ۱۹۶۸ء) تا دسمبر ۱۹۹۰ء میں مضامین اقبالیات کی الف بائی ترتیب سے مصنف وار فہرست]

۳۔ "اشاریہ المعارف" (جنوری ۱۹۶۸ء، مئی ۱۹۷۸ء، جنوری۔دسمبر ۱۹۸۳ء) مرتب: عبداللہ خاور: ششماہی انسانیات، سری نگر: شمارہ ۸: جنوری ۱۹۹۶ء تا ۱۹۹۷ء [بحوالہ مسعود]

۲۶۔ المیزان (سہ ماہی۔اسلام آباد)

۱۔ "اشاریہ مجلّہ المیزان، اسلام آباد: شمارہ ۱ تا ۱۲": مرتب: محمد شاہد حنیف: ماہنامہ محدث، لاہور: نومبر ۲۰۰۹ء، ص ۱۳۹ تا ۱۴۰
[اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۷ء سے شمارہ ۱۲: ۲۰۰۱ء تک کل ۱۳ شمارے شائع ہوئے۔ یہ انھی شماروں کے مشمولات کی تاریخی ترتیب سے موضوع وار فہرست مشمولات اور اشاریہ مصنفین ہے]

۲۷۔ الناظر (ماہنامہ۔لکھنؤ)

۱۔ "ماہنامہ الناظر، لکھنؤ کے مضامین کی فہرست" مرتب: محمد یونس (بنارس): دو ماہی اکادمی، لکھنؤ: (دو قسطیں): جولائی و اگست ۱۹۸۹ء، ص ۷۵ تا ۸۰+ ستمبر تا دسمبر ۱۹۸۹ء، ص ۸۵ تا ۱۳۰۔
[جولائی ۱۹۰۹ء (آغاز) تا دسمبر ۱۹۳۶ء کی شائع شدہ ادبی مضامین]

۲۸۔ الندوہ (ماہنامہ۔لکھنؤ)

۱۔ "الندوہ کا اشاریہ" (۱۹۰۴ء تا ۱۹۱۲ء)" مرتب: عابد رضا بیدار: ماہنامہ ادیب، علی گڑھ: ستمبر ۱۹۶۰ء (شبلی نمبر) ص ۳۸۲ [بحوالہ مسعود]

۲۹۔ الہلال (ہفتہ وار۔کلکتہ)

۱۔ "الہلال (۱۹۲۷ء)۔ (اشاریہ مندرجات)" مرتب: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری: مشمولہ مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت: از ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری: کراچی، ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان ۱۹۸۹ء، ص ۲۰۲ تا ۲۲۳۔
[جریدے کے تیسرے دور بابت ۱۹ جون تا ۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کے مشمولات کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست]

۳۰۔ امروز (روزنامہ۔لاہور)

۱۔ "اشاریہ اقبالیات امروز" مرتب: حلیم احمد منصور: سہ ماہی اقبال، لاہور: اکتوبر ۱۹۹۲ء تا جنوری ۱۹۹۳ء، ص ۲۰۱ تا ۲۳۱۔

۳۱۔ اورینٹل کالج میگزین و ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین (سہ ماہی۔لاہور)

۱۔ "اشاریہ اورینٹل کالج میگزین، از ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۱ء" مرتبین: محمد ابراہیم، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ: شمارہ ۲۹: مئی ۱۹۳۲ء، ص ۱ تا ۵۶
[فروری ۱۹۲۵ء (آغاز) تا نومبر ۱۹۳۱ء کے مضامین کی الف بائی ترتیب سے مصنف وار اور عنوان وار فہرست مضامین اور تبصرہ و تنقید، عنوان رسائل و کتب اور مشمولہ عکسوں کی فہرست]

۲۔ فہرستِ مشمولات، مشمولہ: سہ ماہی اورینٹل کالج میگزین، لاہور: شمارہ ۱۳۲ و ۱۳۳: فروری و مئی ۱۹۵۸ء: ۱۹۹ص۔

[آغاز تا نومبر ۱۹۵۷ء کے مشمولات کی الف بائی ترتیب سے مصنف وار فہرست مشمولات]

۳۔ ''اشاریہ اورینٹل کالج میگزین و ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین'': مرتب: ڈاکٹر محمد بشیر حسین: سہ ماہی مجلہ انجمنِ عربی و فارسی، دانش گاہ پنجاب، لاہور: فروری و مئی ۱۹۶۸ء: ۱۰۲+۳ (اُردو) تا ۷ (انگریزی) ص۔

[فروری ۱۹۲۵ء (آغاز) تا ۱۹۶۷ء کے مشمولات کی الف بائی ترتیب سے مصنف وار و مضمون وار فہرست]

۴۔ ایضاً (کتابی صورت میں): لاہور: دانش گاہ پنجاب: ۱۹۷۰ء۔

[ایضاً]

۳۲۔ ایوانِ اُردو (ماہنامہ دہلی)

۱۔ ''اشاریہ ایوانِ اُردو (مئی ۱۹۸۷ء تا اگست ۱۹۹۱ء)'': مرتب: محمد فاروق انصاری: ماہنامہ ایوانِ اُردو، نئی دہلی: فروری تا ستمبر ۱۹۹۲ء [بحوالہ مسعود]

۲۔ اشاریہ ایوانِ اُردو، دہلی: مرتب: فاروق انصاری: دہلی: شاہی لیڈو ٹائزرس: فروری ۱۹۹۳ء: ۱۸۹+۴ص۔

[مئی ۱۹۸۷ء (آغاز) تا اپریل ۱۹۹۲ء کے مشمولات کی مصنفین کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست]

۳۳۔ آج کل (پندرہ روزہ، ماہنامہ نئی دہلی)

۱۔ اشاریہ آج کل (جلد اوّل): مرتب: جمیل اختر: دہلی: اُردو اکادمی: ۱۹۸۸ء: ۶۸۳ص۔

[۲۵ نومبر ۱۹۴۲ء (آغاز) تا دسمبر ۱۹۸۶ء کے مشمولات کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرستیں]

۲۔ اشاریہ آج کل (۱۹۴۲ تا ۲۰۰۰ء): مرتب: جمیل اختر: نئی دہلی: انٹرنیشنل اُردو فاؤنڈیشن: ۲۰۰۳ء: ۱۱۵۸ص۔

[''یکجا با موضوع و مصنف'' (مسعود)]

۳۴۔ آگہی (ماہنامہ کراچی)

۱۔ ''اشاریہ ماہنامہ آگہی کراچی'': مرتب نا معلوم: ماہنامہ آگہی کراچی: اکتوبر و نومبر ۱۹۹۶ء: ص ۱۵۹ تا ۱۹۲۔

[مارچ و اپریل ۱۹۸۹ تا جون ۱۹۹۶ کی شمارہ وار فہرستِ مضامین]

۳۵۔ آموز گار (ماہنامہ جل گاؤں)

۱۔ ''فہرست مضامین'': ماہنامہ آموز گار، جل گاؤں: مارچ تا مئی، اگست، اکتوبر، نومبر ۱۹۸۵ء [بحوالہ مسعود]۔

۳۶۔ آہنگ (ماہنامہ گیا (بہار)

۱۔ ''ماہنامہ آہنگ میں شائع شدہ تخلیقات کا گوشوارہ'': مرتب: محمد مفتی ماہنامہ آہنگ گیا: جون، اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۳ء جون، اگست، ستمبر ۱۹۸۴ء، مارچ ۱۹۸۵ء [بحوالہ مسعود]

۳۷۔ برہان (ماہنامہ دہلی)

۱۔ فہرستِ مضامین، مشمولہ: برہان، دہلی: (قسط وار) اپریل تا اگست ۱۹۹۶ء (تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں)۔

۲۔ "ماہنامہ برہان کا اشاریہ": (مرتب: عابد رضا بیدار) تصحیح و ترتیب و اضافہ و اشاریہ مصنفین شائستہ خان؛ سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ: شمارہ ۱۰۳: ۱۹۹۶ء؛ ص ۱۱۳ تا ۱۹۴۔

[۱۹۳۸ء (آغاز) تا ۱۹۶۵ء کے مشمولات کی موضوع وار فہرست اور مصنفین کا اشاریہ]

۳۔ علوم اسلامیہ کی انسائیکلوپیڈیا (دوسری جلد): ماہنامہ برہان کا اشاریہ (مرتب: عابد رضا بیدار)، تصحیح و ترتیب و اضافات اور اشاریہ مصنفین از ڈاکٹر شائستہ خان؛ پٹنہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری: ۱۹۹۶ء؛ ۸۰ ص۔

[ایضاً۔ مذکورہ بالا نمبر ۲ کی کتابی صورت میں اشاعت]

۳۸۔ پیامِ یار (ماہنامہ لکھنؤ)

۱۔ "ماہنامہ پیامِ یار، لکھنؤ" مرتب: فضل حق خورشید؛ ماہنامہ قومی زبان، کراچی؛ (چار اقساط) اپریل ۱۹۷۲ء، ص ۴۵ تا ۵۴ + مئی ۱۹۷۲ء، ص ۲۹ تا ۳۶ + جون ۱۹۷۲ء، ص ۳۳ تا ۴۰ + جولائی ۱۹۷۲ء، ص ۳۷ تا ۴۰۔

[نومبر ۱۸۸۶ء تا جنوری ۱۹۰۲ء کے متفرق ۲۷ شماروں میں شامل شعرا کی ان کے تخلص کی الفبائی ترتیب سے فہرست]

۳۹۔ پیش رفت (ماہنامہ دہلی)

۱۔ "پیش رفت، اگست ۱۹۹۳ء تا ستمبر ۱۹۹۶ء کے موضوعاتی اشاریے" مرتب: محمد بدیع الزماں؛ ماہنامہ پیش رفت، نئی دہلی، جنوری فروری ۱۹۹۷ء [بحوالہ مسعود]

۴۰۔ پیغام (ہفتہ وار کلکتہ)

۱۔ "پیغام کلکتہ (فہرستِ مندرجات)" مرتب: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری؛ مشمولہ مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت؛ از ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری؛ کراچی، ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان: ۱۹۸۹ء؛ ص ۱۶۵ تا ۱۷۳۔

۲۔ فہرستِ مضامین مشمولہ: ہفتہ وار پیغام (عکسی اشاعت)؛ کراچی، ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان: س ن [۱۹۹۸ء]؛ ص ۱۱ تا ۱۶۔

۳۔ ایضاً؛ مشمولہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ہفتہ وار پیغام: پٹنہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری: ۱۹۸۹ء [بحوالہ مسعود]

[۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء (شمارۂ اول) تا ۱۶ دسمبر ۱۹۲۱ء (تیرھواں اور آخری شمارہ) کی شمارہ وار یکجا مشمولات]

۴۱۔ تاریخ و سیاسیات (سہ ماہی کراچی)

۱۔ "اشاریہ مضامین سہ ماہی تاریخ و سیاسیات" مرتب: ابوسلمان شاہ جہان پوری؛ ماہنامہ قومی زبان، کراچی؛ اگست ۱۹۷۵ء؛ ص ۵۷ تا ۶۴۔

[اپریل ۱۹۵۱ء (آغاز) تا اگست ۱۹۵۲ء (انجام) کی مصنفین کی الفبائی ترتیب سے مضامین اور تبصروں کی فہرست]

۴۲۔ تحریر (سہ ماہی دہلی)

۱۔ "ایک دام کا اتاہی رسالہ تحریر": از عطا خورشید؛ سہ ماہی اُردو ادب، نئی دہلی؛ شمارہ ۱، ۱۹۸۷ء؛ ص ۹ تا ۳۱۔

[شمارہ ۱: ۱۹۶۷ء (آغاز) تا شمارہ ۴: ۱۹۷۸ء (اکتوبر تا دسمبر۔ آخری شمارہ) کے مشمولات کی موضوع وار تشریحی کتابیات]

۲۔ سہ ماہی تحریر: تعارف اور مندرجات کا اشاریہ" از ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری؛ مشمولہ: سالک نامہ: مرتب: کرنل بشیر حسین زیدی؛ دلّی: جشن مالک رام کمیٹی؛ ۱۹۸۷ء؛ ص ۱۵۷ تا ۱۷۵۔

[شمارہ ۱: ۱۹۶۷ء (آغاز) تا شمارہ ۸: ۱۹۷۸ء اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۸ء (اختتام) کی شمارہ وار کتابیاتی مشمولات]

۴۳۔ تحقیق (مجلہ۔ جامشورو (حیدرآباد۔ سندھ)

۱۔ اشاریہ مرتب: تحقیق احمد جیلانی؛ مشمولہ: سہ ماہی انشاء، حیدرآباد؛ "ڈاکٹر نجم الاسلام نمبر"

(حصہ اول)؛ ص تا ۔ (تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں)

۲۔ ایضاً؛ مشمولہ: ڈاکٹر نجم الاسلام: ایک شخص، ایک عہد: مرتبین: تحقیق احمد جیلانی و رفیق احمد خاں؛ حیدرآباد؛ مارچ ۲۰۰۲ء۔

۳۔ "تحقیق کا اشاریہ (شمارہ ۱ تا ۱۳)" مرتب: ڈاکٹر سفیر اختر؛ ششماہی نقطۂ نظر، اسلام آباد؛ (تین اقساط)؛ شمارہ ۲۴: اپریل تا ستمبر ۲۰۰۸ء؛ ص ۱ تا ۱۲ + شمارہ ۲۵: اکتوبر ۲۰۰۸ء تا مارچ ۲۰۰۹ء؛ ص ۱۳ تا ۳۰ + شمارہ ۲۶: اپریل تا ستمبر ۲۰۰۹ء؛ ص ۳۱ تا ۴۹۔

[ڈاکٹر نجم الاسلام کے دورِ ادارت کے ۱۳ شماروں]

۴۴۔ تحقیقات اسلامی (سہ ماہی۔ علی گڑھ)

"تحقیقات اسلامی، سہ ماہی کے سولہ سال (اشاریہ ۱۹۸۲ تا ۱۹۹۷ء)" مرتب: محمد ضیاء الاسلام ندوی؛ سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ؛ شمارہ ۱۱۱: مارچ ۱۹۹۸ء؛ ص ۲۳۹ تا ۲۷۶۔

[جنوری ۱۹۸۲ء (آغاز) تا اکتوبر ۱۹۹۷ء کے مشمولات کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست]

۴۵۔ تدبّر (ماہنامہ۔ لاہور)

۱۔ "اشاریہ تدبّر (شمارہ ۱۔ ۵۰)" مرتب: سید اسحاق علی؛ ماہنامہ تدبّر، لاہور؛ جولائی ۱۹۹۵ء؛ ص ۳۹ [بحوالہ مسعود]

۴۶۔ ترجمان القرآن (ماہنامہ۔ پٹھان کوٹ، حیدرآباد دکن، لاہور)

۱۔ اشاریہ ماہنامہ ترجمان القرآن: مرتب: حکیم نعیم الدین زبیری؛ کراچی؛ ادارہ معارف اسلامی؛ ۱۹۸۵ء؛ ۲۳۳ص۔

[محرم ۱۳۵۲ھ (آغاز جلد دوم) تا مارچ ۱۹۸۳ء جلد نمبر ۹۵ کی مصنفین کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست مشمولات]

۴۷۔ تعلیم و تربیت (سہ ماہی۔ علی گڑھ)

"تعلیم و تربیت" از عابد رضا بیدار؛ مشمولہ: اُردو کے اہم ادبی رسالے اور اخبار: از عابد رضا بیدار؛ رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل سٹڈیز؛ ۱۹۹۹ء؛ ص ۱۶۹ تا ۱۶۷۔

[۱۹۳۸ء کے چار شماروں کی توضیحی فہرست مضامین]

۴۸۔ تہذیب (ماہنامہ۔ رام پور)

"رام پور کا ایک علمی و ادبی رسالہ تہذیب" از شعار اللہ خاں رام پوری؛ دو ماہی اکادمی، لکھنؤ؛ مارچ و اپریل ۱۹۹۱ء؛ ص ۹ تا ۱۷

[ستمبر ۱۹۰۵ء تا اپریل ۱۹۰۷ء کو شائع ہوا۔ یہ دستیاب کیا رہ شماروں کی بیاز یب مضامین ہے]

۴۹۔　جادو (ماہنامہ ڈھاکا)

۱۔م "ماہنامہ جادو ڈھاکا: ایک تفصیلی تعارف": از شعیب عظیم: سہ ماہی صحیفہ، لاہور، شمارہ ۱۷۵: اپریل ۲۰۰۳ء، ص ۳۴ تا ۵۳۔

[اپریل و مئی ۱۹۲۳ء (شمارہ ۴، ۵) تا مارچ ۱۹۲۴ء (جلد ۲، شمارہ ۳) کے دستیاب تیس شماروں کی شمارہ وار بیاز یب]

۵۰۔　تہذیب الاخلاق (ہفت روزہ علی گڑھ)

۱۔اشاریۂ مندرجات تہذیب الاخلاق: مرتب: ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری، علی گڑھ: مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ۳۱۶ ص [بحوالہ مسعود]

۵۱۔　جامعہ (ماہنامہ، سہ ماہی۔ دہلی، نئی دہلی، علی گڑھ)

۱۔"تا زہ ترین اشاریہ ماہنامہ جامعہ (۱۹۹۲ء۔ ۱۹۹۳ء)": از ملاحت تبسم انجمن: ماہنامہ جامعہ، نئی دہلی: جنوری ۱۹۹۴ء۔

۲۔جامعہ ملّیہ اسلامیہ کا رسالہ جامعہ، عہدِ اوّل (۱۹۲۳ء تا ۱۹۳۷ء) کا اشاریہ: مرتب: شعائر اللہ خاں رام پوری: پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۵ء، ۹۳ ص۔

۳۔رسالہ جامعہ کا تنقیدی اشاریہ (۱۹۲۳ء تا ۱۹۴۷ء): از ڈاکٹر فرزانہ خلیل: دہلی: تخلیق کار پبلشرز: ۲۰۰۳ء، ۵۱۲ ص

[جنوری ۱۹۲۳ء (آغاز) تا جولائی ۱۹۴۷ء کے مشمولات کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار تشریحی بیاز یب]

۵۲۔　جدید اُردو (ماہنامہ کلکتہ)

"اشاریہ جدید اُردو، کلکتہ [۱۹۳۸ء تا ۱۹۵۰ء]": مرتب: ڈاکٹر محمد ظہیر الحسن: ماہنامہ آگہی، کراچی: (۱۱ اقساط): مارچ و اپریل ۱۹۹۱ء (سالنامہ)، ص ۱۸۶ تا ۱۸۹ + مئی ۱۹۹۱ء، ص ۸۸ تا ۹۳ + جون ۱۹۹۱ء + جولائی ۱۹۹۱ء، ص ۸۶ تا ۹۳ + دسمبر ۱۹۹۱ء، ص ۹۴ تا ۹۶ + جنوری ۱۹۹۲ء + فروری و مارچ ۱۹۹۲ء، ص ۱۵۱ تا ۱۵۶ + اپریل ۱۹۹۲ء + مئی ۱۹۹۲ء، ص ۹۰ تا ۹۶۔

[۱۹۳۸ء سے ۱۹۵۰ء تک کے مشمولات کی الف بائی ترتیب سے مصنف وار فہرست]

۵۳۔　جرنل آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی (سہ ماہی کراچی۔ انگریزی، اُردو) *Jounal of the Pakistan Historical society (Karachi)Index of Articles and Reviews*: مرتب: مرزا محمود بیگ: کراچی: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی: ۱۹۷۸ء۔

۵۴۔　حرمین (ماہنامہ جہلم)

"اشاریہ ماہنامہ حرمین، جہلم": مرتب: شاہد حنیف شاہد: ماہنامہ حرمین، جہلم: شعبان تا شوال ۱۴۲۳ھ/ نومبر و دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۱۲ تا ۴۳۔

[جنوری ۱۹۹۹ء (آغاز) تا دسمبر ۲۰۰۲ء کی مصنفین کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرستِ مضامین]

۵۵۔　خدا بخش لائبریری جرنل (سہ ماہی۔ پٹنہ)

۱۔"خدا بخش لائبریری جرنل کے ۵۲ شماروں کی فہرستِ مشمولات": سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ:

شمارہ ۱۵۵: ۱۹۹۸ء۔

۲۔"خدا بخش لائبریری جرنل ۱۔۱۰۰ (۱۹۷۷ء۔۱۹۹۵ء)، مضامین کی فہرست"۔سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ: شمارہ ۱۰۲: ۱۹۹۵ء ص ۲۲۳ تا ۲۹۱۔

۳۔ایضاً (کتابچہ)، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری: ۱۹۹۶ء، ۲۰+۵۰+۸ ص۔

[شمارۂ اوّل (۱۹۷۷ء) تا شمارہ ۹۵ (۱۹۹۴ء) کے مشمولات کی موضوع وار فہرست اور شمارہ ۹۶ تا ۱۰۰ کی شمارہ وار فہرست اور اشاریہ مصنفین]

۵۶۔ دانش (سہ ماہی۔اسلام آباد۔فارسی، اُردو، انگریزی)

"فہرست مقالاتِ کردر دانش چاپ شدہ" (فارسی)، سہ ماہی دانش، اسلام آباد: شمارہ ۳۸ و ۳۹: تیر و دسمبر ۱۹۹۴ء ص ۱۹۳ تا ۲۱۸

[شمارۂ اوّل تا شمارہ ۳۷: جولائی ۱۹۹۴ء کی شمارہ وار کچھ مضامین]

۵۷۔ دائرہ (ماہنامہ۔ڈھاکا)

"سہ ماہی دائرہ، ڈھاکا: ایک تفصیلی جائزہ" از شعیب عظیم: سہ ماہی جامعہ، نئی دہلی: جون ۱۹۸۶ء ص ۵۲ تا ۵۶۔

[اپریل ۱۹۷۶ء میں ایک ہی شمارہ نکلا۔ اس مضمون میں اسی کے مشمولات کی فہرست دی گئی ہے]

۵۸۔ دکن ریویو (ماہنامہ حیدرآباد دکن)

"دکن ریویو" از طاہر رضا بیدار: مشمولہ: اُردو کے اہم ادبی رسائل اور اخبار: رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز: ۱۹۹۹ء ص ۱۳۳ تا ۱۵۷۔

[جنوری ۱۹۰۴ء (شمارۂ اوّل) تا مئی ۱۹۰۷ء کے شماروں کی توضیحی فہرست مضامین]

۵۹۔ دل ربا (ماہنامہ ڈھاکا)

"مصور ماہنامہ دل ربا، ڈھاکا: ایک تفصیلی جائزہ"، از شعیب عظیم: ماہنامہ جامعہ، نئی دہلی: فروری ۱۹۸۵ء ص ۲۳ تا ۲۸۔

[اگست ۱۹۵۲ء سے مئی و جون ۱۹۵۳ء تک کل سات شمارے نکلے۔ یہاں کی شمارہ وار فہرست مشمولات ہے]

۶۰۔ دل گداز (ماہنامہ لکھنؤ)

۱۔"ماہنامہ دل گداز، لکھنؤ کے مضامین کی فہرست"۔ مرتب: نصر اللہ: سہ ماہی اکادمی، لکھنؤ: ستمبر و اکتوبر ۱۹۸۵ء ص ۲۳ تا ۸۵۔

[جنوری ۱۸۸۷ء (آغاز) سے دسمبر ۱۹۲۶ء (وفاتِ شرر) تک شرر کی کے شماروں کی فہرست مضامین]

۲۔دل گداز کا اشاریہ (۱۸۸۷ء۔۱۹۱۸ء)، مرتب: محمد قمر سلیم: ممبئی ۲۰۰۳ء ۲۲۶ ص [بحوالہ مسعود]

۶۱۔ راوی (ماہنامہ مجلہ۔لاہور، گورنمنٹ کالج)

۱۔رسالہ راوی کا اشاریہ: قیامِ پاکستان تک: مرتب: نور بشیر الدین: لاہور یونیورسل بکس، لاہور، اشاعتِ اوّل، مارچ ۱۹۸۹ء: ۱۰۶+۶ ص۔

[اکتوبر ۱۹۱۱ء (آغاز) سے مارچ، اپریل ۱۹۴۷ء تک کے مشمولات کی الف بائی ترتیب سے مصنف وار فہرست]

۲۔اشاریۂ راوی: دسمبر ۱۹۲۷ء سے نومبر ۱۹۸۷ء تک: مرتب: خواجہ خورشید احمد: لاہور، طیب بک اپو: مارچ

۱۹۸۹ء؛ ۲۱۳ ص۔

[دسمبر ۱۹۲۷ء تا نومبر ۱۹۸۷ء کی الف بائی ترتیب سے مصنف وار فہرست مشمولات]

۶۲۔ رحیق (ماہنامہ، لاہور)

۱۔ اشاریہ ماہنامہ رحیق؛ مرتب: سفیر اختر؛ ششماہی تحقیقہ نظر، اسلام آباد؛ شمارہ ۱۵: اکتوبر ۲۰۰۳ء تا مارچ ۲۰۰۴ء۔

۲۔ مشمولہ: مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اور اُن کا ماہنامہ "رحیق"؛ از سفیر اختر؛ ابواسر شرفو (واہ کینٹ)، دارالمعارف؛ اشاعتِ اول، جنوری ۲۰۰۴ء؛ ۵۶ ص۔

[اکتوبر ۱۹۵۶ء (آغاز) تا جون و جولائی ۱۹۵۹ء (انجام) کی مصنفین کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست مضامین]

۶۳۔ روشن (سہ ماہی مجلہ، بدایوں)

''رسالہ روشن بدایوں'' مرتب: سید آفتاب علی؛ ماہنامہ اُردو بک ریویو، نئی دہلی؛ (۳ اقساط) شمارہ ۸۳ تا ۸۶: ستمبر تا دسمبر ۲۰۰۲ء؛ ص ۲۳ تا ۲۶ + شمارہ ۸۷ و ۸۸: جنوری و فروری ۲۰۰۳ء؛ ص ۱۵، ۱۶ + شمارہ ۹۳ و ۹۴: جولائی و اگست ۲۰۰۳ء؛ ص ۳۵، ۳۶۔

[آغاز پندرہ روزہ کے طور پر ۱۵ ستمبر ۱۹۷۶ء کو ہوا۔ یہ سہ ماہی اور مجلّے کے طور پر اس رسالے کی جلد ۶: جنوری ۱۹۸۳ء سے شمارہ دسمبر ۱۹۹۰ء تک کی الف بائی ترتیب سے مصنف وار فہرست مضامین ہے]

۶۴۔ رہبر دکن (ہفتہ وار، حیدرآباد دکن)

۱۔ فہرست عنوانات بابت ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء؛ اشاریہ رہبر دکن: مرتب: عبدالرحمٰن؛ حیدرآباد، انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنس ریسرچ؛ ۱۹۷۹ء؛ ۵۸۵ ص [بحوالہ مسعود]

۶۵۔ رہان (ماہنامہ، منگرول)

۱۔ فہرست مضامین؛ مشمولہ: گجرات کا ماہنامہ رہان، منگرول: مکمل فائل کی عکسی اشاعت: سہ ماہی خدابخش لائبریری جرنل، پٹنہ؛ شمارہ ۴۱ تا ۴۳: ۱۹۸۷ء؛ ص ا تا ط۔

۲۔ ایضاً؛ (کتابی صورت میں) پٹنہ، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری؛ ۱۹۸۷ء؛ ص ا تا ط۔

[جولائی ۱۹۲۶ء (آغاز) تا جون ۱۹۲۸ء (اختتام) کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست مشمولات]

۶۶۔ زمانہ (ماہنامہ، کانپور)

۱۔ زمانہ کے مشتملات کی فہرست؛ پٹنہ، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری؛ ۱۹۹۵ء؛ ۲۵۳ ص۔

[جون ۱۹۰۳ء سے دسمبر ۱۹۴۲ء تک کے شماروں کی اہم ادبی مضامین کا عکس]

۲۔ شماروں کی اہم ادبی مضامین، مشمولہ دیا نرائن نگم کے بعد، رسالہ زمانہ کان پور سے انتخاب؛ پٹنہ، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری؛ ۱۹۹۵ء؛ ص ۱۷۷ تا ۲۲۲۔

[جنوری ۱۹۴۳ء تا مئی و جون ۱۹۴۹ء کی اہم ادبی مضامین کا عکس]

۶۷۔ زمیندار (ہفتہ وار، لاہور، کرم آباد)

روزنامہ زمیندار اور تحریک آزادی (توضیحی اشاریہ)؛ مرتب: احمد سعید؛ اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان؛ طبع

اوّل، جون ۱۹۸۸ء، ۳۵۹ ص۔

[مارچ ۱۹۱۳ء (آغاز) تا ۳۱ مارچ ۱۹۳۹ء کے دستیاب شماروں کی موضوع وار فہرستِ مشمولات]

۶۸۔ ساقی (ماہنامہ۔ دہلی)

ا۔ ''اشاریہ ساقی، دہلی''، مرتب: ڈاکٹر محمد ظفیر الحسن؛ ماہنامہ آگہی، کراچی؛ (۱۳/اقساط) دسمبر ۱۹۹۲ء تا اکتوبر و نومبر ۱۹۹۳ء: (دسمبر ۱۹۹۲ء + جنوری ۱۹۹۳ء + مارچ ۱۹۹۳ء، ص ۱۸۶ تا ۱۹۰ + اپریل ۱۹۹۳ء + مئی ۱۹۹۳ء، ص ۷۳ تا ۸۰ + جون ۱۹۹۳ء، ص ۱۴۴ تا ۱۴۸)

[مصنف وار فہرستِ مضامین۔ مکمل تفصیلات حاصل نہیں ہو سکیں]

۲۔ ''ساقی کے افسانے اور افسانہ نگار''، مؤلف: ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز؛ مشمولہ: اُردو افسانے کے فروغ میں ساقی کا کردار: از ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز؛ کراچی، انجمن ترقی اُردو پاکستان؛ اشاعتِ اوّل ۲۰۰۵ء؛ ص ۲۰۵ تا ۲۹۳۔

[جنوری ۱۹۳۰ء (آغاز) تا اکتوبر ۱۹۷۱ء (انجام) کے افسانوں کی مصنفین کی الف بائی ترتیب سے تفصیلی اور سالوار فہرست]

۶۹۔ سب رس (ماہنامہ۔ کراچی)

ا۔ ''اشاریۂ مضامین ماہنامہ سب رس، کراچی''، مرتبہ: عرشیہ رضوی (نگران: شفقت رضوی)؛ ماہنامہ سب رس، کراچی؛ جون تا ستمبر ۱۹۹۰ء (اشاریہ نمبر)؛ ص ۳ تا ۷۲۔

[نومبر ۱۹۷۷ء (آغاز) تا دسمبر ۱۹۸۹ء کے مشمولات کی الف بائی ترتیب سے مصنف وار فہرست]

۲۔ ''اقبال شناسی اور رسالہ سب رس، کراچی''، مرتب: شفقت رضوی؛ سہ ماہی اقبال، لاہور؛ اکتوبر ۱۹۹۳ء؛ ص ۲۲۱ تا ۲۴۸۔

[دسمبر ۱۹۷۷ء (آغاز) تا دسمبر ۱۹۹۲ء میں مصنفین کی الف بائی ترتیب سے مضامینِ اقبالیات کی فہرست]

۷۰۔ سچ (ہفتہ وار۔ لکھنؤ)

ہفتہ وار سچ کا توضیحی اشاریہ: از عبدالعلیم قدوائی؛ پٹنہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری؛ ۲۰۰۰ء؛ ۸۷۵ ص۔

[۱۹۲۵ء (آغاز) سے ۱۹۳۳ء (انجام) تک کے مشمولات کی توضیحی فہرست]

۷۱۔ سوغات (مجلہ، سہ ماہی۔ بنگلور)

ا۔ ''محمود ایاز کے سوغات (بنگلور) کا اشاریہ''، مرتب: ڈاکٹر سلمان اطہر؛ سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ؛ شمارہ ۸۱ تا ۸۳: ۱۹۹۳ء؛ ص ۲۷۳ تا ۲۹۵۔

[۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۳ء، ستمبر ۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۴ء (بطور سہ ماہی) اور دورِ جدید کے پہلے پانچ شماروں کی فہرستِ مضامین]

۲۔ ایضاً (کتابچہ)؛ پٹنہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری؛ ۱۹۹۵ء؛ ۲۳ ص [بحوالہ مسعود]

۷۲۔ سہیل (سہ ماہی۔ علی گڑھ)

''سہیل''، از طاہرہ ناہید؛ مشمولہ: اُردو کے اہم ادبی رسائل اور اخبار؛ رامپور، انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز؛ ۱۹۹۹ء؛ ص ۱۸۶ تا ۱۹۱۔ [آغاز (جنوری ۱۹۳۶ء) تا شمارہ ۵ کی فہرستِ مضامین]

۷۳۔ سیّارہ (ماہنامہ، لاہور)

"اشاریہ مضامین (نثر) سیارہ، اشاعت ہائے خاص ۱ تا ۲۵": (مرتب: امجد طفیل): ماہنامہ سیارہ، لاہور: جنوری ۱۹۸۸ء (اشاریہ نمبر): ص ۵ تا ۵۲۔

[اشاعت ہائے خاص نمبر ایک (جون ۱۹۷۶ء) تا نمبر ۲۳ (ستمبر و اکتوبر ۱۹۸۶ء) کے نثری شمولات کی تاریخی ترتیب سے موضوع وار فہرست اور شمارہ ۲۴، ۲۵ کی شمارہ وار [illegible] مضامین]

۷۴۔ شام و سحر (ماہنامہ، لاہور)

"مضامین شام و سحر" مرتب: شبیہ الحسن: ماہنامہ شام و سحر، لاہور: نومبر ۱۹۸۹ء: ص ۱۳ تا ۳۲۔

[جنوری ۱۹۷۵ء (آغاز) سے دسمبر ۱۹۸۸ء تک کے مضامین کی شمارہ وار فہرست]

۷۵۔ شاہین (مجلہ زمیندار کالج، گجرات)

۱۔ "زمیندار کالج گجرات میں اقبال شناسی: مجلہ شاہین میں مندرج مضامین" مرتب: ڈاکٹر احمد حسین قریشی قلعہ داری: سہ ماہی اقبال، لاہور: اکتوبر ۱۹۹۲ء و جنوری ۱۹۹۳ء: ص ۲۳۹ تا ۲۴۳۔

[مجلے میں شائع ہونے والے مضامین اقبالیات کی الفبائی ترتیب سے مصنف وار فہرست]

۷۶۔ صبح اُمید (ماہنامہ، لکھنؤ)

۱۔ شمولہ: "مکاتیب کا صبح اُمید: تعارف و انتخاب": از عابد رضا بیدار: سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ: شمارہ ۱۴: ۱۹۸۰ء

۲۔ ایضاً (کتابی صورت میں): پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری: ۱۹۸۰ء۔

[اکتوبر ۱۹۱۸ء (آغاز) تا مئی ۱۹۲۱ء کے شمولات کی الفبائی ترتیب سے موضوع وار فہرست]

۷۷۔ صدق (ہفتہ وار، لکھنؤ)

۱۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی کے ہفتہ وار صدق کا توضیحی اشاریہ: ترتیب: عبدالعلیم قدوائی: پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری: اشاعت اول ۲۰۰۳ء: ۱۳+۶۸۶ ص (سائز ۲۳×۱۸ س م)

[ج ۱، ش ۱: ۱۰ مئی ۱۹۳۵ء (آغاز) تا ج ۱۶، ش ۱۵: ۱۸ اگست ۱۹۵۰ء (اختتام) کے مضامین کی الفبائی ترتیب سے موضوع وار فہرست]

۷۸۔ صحیفہ (سہ ماہی، دو ماہی، لاہور)

۱۔ "مصنف وار اشاریہ مقالات صحیفہ" [شمارہ ایک تا ۳۸] مرتب: ملک احمد نواز: سہ ماہی صحیفہ، لاہور: شمارہ ۳۹: اپریل ۱۹۶۷ء: ص ۷۶ تا ۸۹۔

[شمارہ اوّل: جون ۱۹۵۷ء تا شمارہ ۳۸: جنوری کی الفبائی ترتیب سے مصنف وار فہرست]

۲۔ "مصنف وار اشاریہ مقالات صحیفہ" [شمارہ ۳۹ تا ۵۳]: مرتب: ایضاً: سہ ماہی صحیفہ، لاہور: شمارہ ۵۴: جنوری ۱۹۷۱ء: ص ۱۵۴ تا ۱۶۸۔

[شمارہ ۳۹: اپریل ۱۹۶۷ء تا شمارہ ۵۳: دسمبر ۱۹۶۷ء کی الف بائی ترتیب سے مصنف وار فہرست]

۳۔ ’’اشاریہ صحیفہ، لاہور‘‘ مرتب: محمد عبداللہ: ماہنامہ جامعہ، نئی دہلی؛ جنوری۔ جون ۱۹۸۳ء　　　[بحوالہ مسعود]

۴۔ ’’رسالہ اُردو اور صحیفہ میں ذخیرۂ اقبالیات‘‘ مرتب: صابر کلوروی: سہ ماہی اقبالیات، لاہور؛ جنوری تا مارچ ۱۹۸۸ء، ص ۲۷۳ تا ۲۸۴۔

۵۔ ’’مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ (موضوعاتی فہرست)‘‘ مرتب: ڈاکٹر نثار احمد فیضی: سہ ماہی صحیفہ، لاہور؛ شمارہ ۱۶۰: جولائی ۱۹۹۹ء؛ ص ۶۳ تا ۶۸۔

[شمارہ اوّل: جون ۱۹۵۷ء تا ۱۹۹۰ء میں شائع ہونے والے مضامین غالبیات کی الف بائی ترتیب سے مصنف وار فہرست]

جنوری تا مارچ ۱۹۸۸ء؛ ص ۲۷۳ تا ۲۸۴۔

۶ (۱)۔ ’’اشاریۂ صحیفہ، علامہ اقبال‘‘ مرتب: نثار احمد فیضی: سہ ماہی صحیفہ، لاہور؛ اکتوبر ۱۹۹۹ء؛ ص ۱۱۷ تا ۱۳۲۔

۷ (۲)۔ ایضاً، بہ عنوان: ’’علامہ اقبال (صحیفہ، لاہور میں)‘‘ ماہنامہ اُردو بک ریویو، نئی دہلی؛ شمارہ ۵۱ تا ۵۲: جنوری و فروری ۲۰۰۰ء؛ ص ۶۳ تا ۶۶۔

[شمارہ ۱: جون ۱۹۵۷ء تا دسمبر ۱۹۹۰ء کے مضامین اقبالیات کی الف بائی ترتیب سے فہرست]

۸۔ ’’سہ ماہی صحیفہ میں اقبالیاتی ادب‘‘ مرتب: محمد اصغر: سہ ماہی اقبالیات، لاہور؛ جولائی ۲۰۰۷ء؛ ص ۱۲۷ تا ۱۹۰۔

[جون ۱۹۵۷ء (آغاز) تا جولائی ۲۰۰۳ء کے شماروں میں اقبالیات سے متعلق مضامین کی تاریخی ترتیب سے مصنف وار فہرست]

۹۔ ’’صحیفہ: پچاس سالہ اشاریہ‘‘ مرتب: محمد شاہد حنیف: مشمولہ: سہ ماہی صحیفہ، لاہور؛ شمارہ ۱۹۰ تا ۱۹۲: جولائی ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء (اشاریہ نمبر)؛ ص ۲۳ تا ۶ + ۵۹ تا ۳۱۷۔

[شمارہ ۱: جون ۱۹۵۷ء تا شمارہ ۱۸۸ و ۱۸۹: جنوری تا جون ۲۰۰۷ء (یادِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء) کے مشمولات کی مصنفین کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست]

۷۹۔　صلائے عام (ماہنامہ، دہلی)

’’میر ناصر علی کا صلائے عام‘‘: از عابد رضا بیدار: مجلہ نقوش، لاہور؛ شمارہ ۹۶: دسمبر ۱۹۶۱ء؛ ص ۲۹۴ تا ۳۱۱۔

[ستمبر ۱۹۰۸ء تا اپریل ۱۹۰۹ء اور اپریل ۱۹۲۳ء تا اکتوبر ۱۹۳۲ء کے متفرق شماروں کے مضامین کی فہرست]

۸۰۔　ضیائے حرم (ماہنامہ، لاہور، سرگودھا)

اشاریہ ضیائے حرم: مرتب: (پیرزادہ) عابد حسن شاہ: بھکوال، بہاء الدین زکریا لائبریری؛ ۱۹۹۷ء؛ ۱۳۱۸ص۔

[اکتوبر ۱۹۷۰ء (آغاز) سے ستمبر ۱۹۹۰ء تک کے مضامین کی فہرست]

۸۱۔　ضیاء وجیہ (ماہنامہ، رام پور)

اسا شاریہ ضیاء وجیہ (۱۹۹۰ء۔ ۲۰۰۰ء): مرتب: شعائر اللہ خاں: رام پور، مکتبۂ وزیریہ؛ ۲۰۰۱ء؛ ۱۲۰ص [بحوالہ مسعود]

۸۲۔　عالم اسلام اور عیسائیت (ماہنامہ سہ ماہی، اسلام آباد)

۱۔اشاریہ عالم اسلام اور عیسائیت، جولائی ۱۹۹۰ء تا جنوری ۲۰۰۰ء؛ ترتیب و تدوین: سلیم اختر؛ اسلام آباد؛ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز؛ اشاعت اول، اپریل ۲۰۰۰ء؛ ۸۸ص۔

[جولائی ۱۹۹۰ء (آغاز) تا جنوری ۲۰۰۰ء (آخری سے پہلا شمارہ) کی مصنفین کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست مضامین اور مصنفین اور موضوعات کا اشاریہ۔ یہ اشاریہ رسالے کے آخری شمارے کے طور پر شائع ہوا۔]

۸۳۔ عصری ادب (سہ ماہی۔ دہلی)

۱۔"سہ ماہی عصری ادب" (۱۹۷۰ء تا ۱۹۸۸ء)؛ مرتب: عطا خورشید؛ مجلہ معیار و تحقیق، پٹنہ؛ شمارہ ۱: ۱۹۸۹ء؛ ص ۵۲۵ [بحوالہ مسعود]

۸۴۔ عصمت (ماہنامہ۔ دہلی، کراچی)

۱۔"مضمون نگاران عصمت" (جون ۱۹۰۸ء۔ جون ۱۹۶۸ء)؛ مرتب: ادارہ؛ ماہنامہ عصمت، کراچی؛ اگست، ستمبر ۱۹۶۸ء؛ ص ۴۳ [بحوالہ مسعود]

۸۵۔ غالب نامہ (سہ ماہی، ششماہی۔ نئی دہلی)

۱۔تجزیاتی مطالعہ غالب نامہ؛ مؤلف: عاصمہ اعجاز؛ لاہور؛ شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج؛ اشاعت اول فروری ۱۹۹۲ء؛ ۲۲۴+۲۲ص۔

[جنوری ۱۹۷۹ء (آغاز) تا شمارہ ۲۶: جولائی ۱۹۹۲ء تک کی تاریخی ترتیب سے مصنف وار فہرست مضامین

اور مصنفین کی الف بائی ترتیب اور مضامین کی تاریخی ترتیب سے موضوع وار توضیحی فہرستیں]

۸۶۔ فاران (ماہنامہ۔ کراچی)

۱۔"ذخیرۂ اقبالیات: فاران، کراچی میں"؛ مرتب: صابر کلوروی؛ سہ ماہی اقبالیات، لاہور؛ جنوری تا جون ۱۹۸۶ء (اقبال نمبر)؛ ص ۱۳۵ تا ۱۵۴۔

[اپریل ۱۹۴۸ء تا اپریل ۱۹۸۵ء میں اقبالیات کے موضوع پر شائع ہونے والے مضامین کی مصنفین کی الف بائی ترتیب سے فہرست]

۲۔"اشاریۂ فاران"؛ مرتب: صفدر علی خان؛ سہ ماہی انشاء، حیدرآباد دکن؛ (۱۰ قسطیں)؛ شمارہ ۱: ۱۹۹۳ء؛ ص ۱ تا ۲۳ + شمارہ ۲: ۱۹۹۳ء؛ ص ۲۵ تا ۴۰ + شمارہ ۳: ۱۹۹۳ء؛ ص ۴۱ تا ۸۰ + شمارہ ۴: ۱۹۹۳ء؛ ص ۸۱ تا ۸۸ + شمارہ ۵: اکتوبر ۱۹۹۴ء؛ ص ۱۲۱ تا ۱۳۹ + شمارہ ۶: جنوری ۱۹۹۵ء؛ ص ۱۳۷ تا ۱۴۳ + شمارہ ۸-۹: جولائی تا دسمبر ۱۹۹۵ء؛ ص ۱۲۱ تا ۱۳۹ + شمارہ ۱۴ و ۱۵: جنوری تا جون ۱۹۹۶ء؛ ص ۸۹ تا ۹۵ + شمارہ ۱۸ و ۱۹: جنوری تا جون ۱۹۹۸ء؛ ص ۱۲۹ تا ۱۳۰ + شمارہ ۲۱ و ۲۲: اکتوبر ۱۹۹۸ء تا مارچ ۱۹۹۹ء؛ ص ۱۵۸ تا ۱۶۳۔

[اپریل ۱۹۴۸ء تا اپریل ۱۹۸۵ء تک مصنفین کی الف بائی ترتیب سے فہرست مشمولات]

۸۷۔ فاران (مجلہ۔ لاہور گورنمنٹ اسلامیہ کالج، سول لائنز)

"اشاریۂ فاران"؛ مرتب: محمد اکرام الحق، سیف اللہ خالد؛ مجلہ فاران، لاہور؛ گولڈن جوبلی نمبر ۱۹۹۲ء؛ ص ۲۳ تا ۴۰۔

[۱۹۵۹ء (آغاز) سے ۱۹۹۱ء تک کی تاریخی ترتیب سے موضوع وار فہرست مشمولات]

۸۸۔ فصیح الملک (ماہنامہ۔ لاہور، مارہرہ)

۱۔"اشاریہ مضامین مطبوعہ [فصیح] الملک ۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۰ء"؛ مرتب: ابراہیم خلیل؛ مشمولہ: "فصیح الملک" (مضمون): از ابراہیم خلیل؛ ماہنامہ قومی زبان، کراچی؛ (دو قسطیں)؛ جنوری ۱۹۷۵ء؛ ص ۱۹ تا ۳۰ + مئی ۱۹۷۵ء؛ ص ۳۷ تا ۳۹۔

[مئی ۱۹۰۵ء (آغاز) تا اگست ۱۹۱۰ء (اختتام) کے نثری و شعری مشمولات کی مصنفین کی الف بائی ترتیب سے فہرست]

۸۹۔ فکر و نظر (سہ ماہی علی گڑھ)

"سہ ماہی فکر و نظر (علی گڑھ) کا اشاریہ"، مرتب: ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری؛ سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ؛ شمارہ ۷۸ تا ۸۰، ۱۹۹۳ء؛ ص ۲۹۷ تا ۳۲۳۔

[جنوری ۱۹۶۰ء (آغاز) تا دسمبر ۱۹۸۸ء کے مشمولات کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست]

۹۰۔ فکر و نظر (ماہنامہ سہ ماہی۔ کراچی، اسلام آباد)

۱۔ فکر و نظر کے پندرہ سال: ایک تفصیلی اشاریہ، مرتب: احمد خاں؛ اسلام آباد، ادارۂ تحقیقات اسلامی، مئی ۱۹۷۹ء، ۲۵۶ ص (سائز ۲۳×۱۶ س م)

[جلد ۱: جولائی ۱۹۶۳ء تا جلد ۱۵: جون ۱۹۷۸ء کے مضامین کی مصنف وار، موضوع وار، عنوان وار فہرست]

۲۔ اشاریۂ فکر و نظر: جولائی ۱۹۷۸ء۔ جون ۱۹۹۳ء، ترتیب: شیر نوروز خان؛ اسلام آباد، ادارۂ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی؛ اشاعت اوّل ۲۰۰۱ء، ۸+۱۹۹ ص۔ (سائز ۲۳×۱۶ س م)

[جلد ۱۶: جولائی ۱۹۷۸ء تا جلد ۳۰: جون ۱۹۹۳ء کی "مقالات"، "تبصرۂ کتب" اور "متفرقات" کے عنوان کے تحت مصنف وار، عنوان وار، موضوع وار، تبصرہ نگار وار فہرستِ مضامین]

۹۱۔ قومی زبان (ماہنامہ۔ کراچی)

۱۔ "قومی زبان اور اقبالیات"، مرتب: عبدالمنان خاں؛ ماہنامہ قومی زبان، کراچی؛ نومبر ۱۹۹۶ء؛ ص ۳۷ تا ۴۳۔

۲۔ ایضاً؛ سہ ماہی اقبالیات، لاہور؛ جنوری تا مارچ ۲۰۰۹ء؛ ص ۱۰۹ تا ۱۳۳۔

[۱۹۷۵ء تا ۱۹۹۵ء کے شماروں میں اقبالیات کے موضوع پر شائع ہونے والے مضامین کی، مصنفین کی الف بائی ترتیب سے فہرست]

۳۔ "قومی زبان، کراچی میں غالب پر ۱۹۷۵ء سے ۱۹۹۵ء تک شائع ہونے والے مضامین"، مرتب: عبدالمنان؛ ماہنامہ اردو بک ریویو، نئی دہلی؛ جولائی و اگست ۱۹۹۷ء؛ ص ۴۷ تا ۵۰۔

۴۔ "بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم: قومی زبان، کراچی میں مقالات" (۱۹۷۶ء۔ ۱۹۹۸ء)، مرتب: ڈاکٹر نثار احمد فیضی؛ ماہنامہ اُردو بک ریویو، نئی دہلی؛ جولائی و اگست ۱۹۹۸ء؛ ص ۴۹ تا ۵۶۔

۵۔ "علامہ سر محمد اقبالؒ" قومی زبان، کراچی میں مقالات (۱۹۷۶ء۔ ۱۹۹۸ء)، مرتب: ڈاکٹر نثار احمد فیضی؛ ماہنامہ اُردو بک ریویو، نئی دہلی؛ ستمبر و اکتوبر ۱۹۹۸ء؛ ص ۳۸ تا ۴۹۔

[۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۸ء کے دوران مرزا غالب پر شائع ہونے والے مضامین کی مصنفین کی الف بائی ترتیب سے فہرست]

۶۔ "مرزا اسد خاں غالب۔ قومی زبان، کراچی میں مقالات (۱۹۹۳ء۔۱۹۹۸ء)"، مرتب: ڈاکٹر نثار احمد فیضی؛ ماہنامہ اُردو بک ریویو، نئی دہلی؛ مارچ و اپریل ۱۹۹۹ء؛ ص ۴۵ تا ۵۲۔

۷۔ "قائداعظم محمد علی جناح" (قومی زبان، کراچی میں)، مرتب: ڈاکٹر نثار احمد فیضی؛ ماہنامہ اُردو بک ریویو، نئی دہلی؛ ستمبر و

اکتوبر ۱۹۹۹ء؛ ص ۳۳ تا ۳۵۔

۸۔ ''امیر خسرو'' (قومی رسائل ، کراچی میں)؛ مرتب: ڈاکٹر نثار احمد فیضی؛ ماہنامہ اُردو بک ریویو، نئی دہلی؛ ستمبر و اکتوبر ۱۹۹۹ء؛ ص ۲۵۔

۹۔ ''سرسید احمد خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد'' (قومی رسائل ، کراچی میں) [۱۹۶۸ تا ۱۹۹۰ء]؛ مرتب: ڈاکٹر نثار احمد فیضی؛ ماہنامہ اُردو بک ریویو، نئی دہلی؛ جنوری و فروری ۲۰۰۱ء؛ ص ۵۰ تا ۵۲۔

۱۰۔ ''اشاریۂ مضامین قومی رسائل''؛ مرتب: مصباح العثمان؛ ماہنامہ قومی رسائل ، کراچی؛ مئی ۲۰۰۳ء؛ ص ۶۲ تا ۷۹۔

۱۱۔ ''ماہنامہ قومی رسائل میں ذخیرۂ اقبالیات؛ ۱۹۵۰ء–۲۰۰۸ء''؛ مرتب: صبیح الرحمٰن؛ سہ ماہی اقبالیات، لاہور؛ جنوری تا مارچ ۲۰۰۹ء؛ ص ۱۰۹ تا ۱۳۳۔

۹۲۔ کشمیر درپن (ماہنامہ۔ الٰہ آباد، لکھنؤ)

۱۔ فہرستِ مضامین، مشمولہ: ''سرتیج بہادر سپرو کا رسالہ کشمیر درپن'': از عابد رضا بیدار؛ سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ؛ پہلا شمارہ؛ ۱۹۷۷ء؛ ص ۱۶۷ تا ۱۹۹۔

[(مارچ) ۱۹۰۳ء (آغاز) تا ستمبر ۱۹۰۷ء کے دستیاب شماروں کے مشمولات کی توضیحی فہرست]

۹۳۔ لسان الصّدق (ماہنامہ۔ کلکتہ)

۱۔ ''لسان الصّدق (اشاریۂ مضامین)''؛ مرتب: (ڈاکٹر) ابوسلمان شاہجہان پوری؛ مشمولہ: مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت: از مرتب؛ کراچی، ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان؛ ۱۹۸۹ء؛ ص ۸۳ تا ۹۳۔

۲۔ ایضاً، مشمولہ: لسان الصّدق ، کلکتہ : نومبر ۱۹۰۳ء تا مئی ۱۹۰۵ء (عکسی اشاعت)؛ کراچی، مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ؛ ۱۹۹۶ء؛ ص ۶۵ تا ۷۱۔

[۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء (آغاز) تا اپریل و مئی ۱۹۰۵ء (اختتام) کے مشمولات کی مصنفین کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست]

۹۴۔ ماہِ نو (ماہنامہ۔ کراچی، لاہور)

۱۔ ''اشاریۂ مضامین ماہِ نو، اپریل ۱۹۴۸ تا دسمبر ۱۹۶۸ء''؛ مرتب: ادارہ؛ ماہنامہ ماہِ نو، کراچی؛ استقلال نمبر (اگست) ۱۹۶۹ء؛ ص ۶۹ تا ۱۳۲۔

[اپریل ۱۹۴۸ء (آغاز) تا دسمبر ۱۹۶۸ء کی تاریخی ترتیب سے موضوع وار فہرستِ مشمولات]

۹۵۔ مجلّۂ بدایوں (ماہنامہ، سہ ماہی۔ کراچی)

۱۔ ''اشاریہ مجلّۂ بدایوں'' (فروری ۱۹۹۱ء۔ دسمبر ۱۹۹۵ء)؛ مرتب: ابراہیم خلیل نقوی سہسوانی؛ ماہنامہ مجلّۂ بدایوں، کراچی؛ اگست، اکتوبر، دسمبر ۱۹۹۶ء، جنوری، مئی ۱۹۹۷ء [بحوالہ مسعود]۔

۹۶۔ مجلّۂ عثمانیہ (شش ماہی۔ حیدرآباد دکن)

۱۔ ''مجلّۂ عثمانیہ کی اُردو خدمات'': از عبدالقادر سروری؛ شش ماہی مجلّۂ عثمانیہ، حیدرآباد دکن؛ جلد ۲۵، شمارہ ۱؛ ۱۹۵۳ء؛ ص ۶۳ تا ۷۱۔

[فروری ۱۹۲۷ء (آغاز) تا جلد ۲۳ شمارہ ۱: ۱۹۵۲ء تک کی شمارہ وار فہرستِ مضامین]

۹۷۔ مجلّۂ علومِ اسلامیہ (ششماہی۔علی گڑھ)

۱۔ "فہارس مجلّۂ علومِ اسلامیہ"؛ مرتب: ڈاکٹر اکمل ایوبی؛ ششماہی مجلّۂ علومِ اسلامیہ علی گڑھ؛ جون و دسمبر ۱۹۶۹ء؛ ص ۱۸۱ تا ۲۰۹۔

[جون ۱۹۶۰ء (آغاز) سے جون و دسمبر ۱۹۶۹ء تک کی مصنفین کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرستِ مضامین]

۹۸۔ مجلّۂ علوم القرآن (ششماہی۔علی گڑھ)

۱۔ اشاریہ؛ مرتب: ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی (معاون مدیر)؛ ششماہی علوم القرآن علی گڑھ؛ (چار اقساط) ۵/۲: ۱۹۹۰ء + ۶/۲: ۱۹۹۱ء + ۷/۲: ۱۹۹۲ء + ۸/۲: ۱۹۹۳ء۔

۲۔ "ششماہی علوم القرآن کے آٹھ سال"؛ مرتب: ظفر الاسلام اصلاحی؛ ششماہی علوم القرآن علی گڑھ؛ جولائی تا دسمبر ۱۹۹۳ء [بحوالہ مسعود]

۳۔ "مجلّۂ علوم القرآن: ۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۵ء"؛ مرتب: حافظ محمد تنویر الوری؛ ماہنامہ اُردو بک ریویو نئی دہلی؛ (دو اقساط) ستمبر و اکتوبر ۱۹۹۹ء؛ ص ۳۹ تا ۴۲ + نومبر و دسمبر ۱۹۹۹ء؛ ص ۲۵ تا ۵۳۔

۹۹۔ مرغزار (مجلہ۔شیخوپورہ، گورنمنٹ کالج)

۱۔ "اشاریہ مرغزار حصۂ اُردو" (جنوری ۱۹۶۲ء۔۱۹۹۲ء)؛ مرتب: سید تجمل حسین بخاری؛ مجلہ مرغزار، شیخوپورہ؛ جلد ۱۷، شمارہ ۱۹: مارچ ۱۹۹۵ء؛ ص ۱۲۲ [بحوالہ مسعود]

۱۰۰۔ مرّیخ (ماہنامہ۔پٹنہ)

۱۔ "اشاریہ مرّیخ" (۱۹۸۶ء تا حال)؛ مرتب: محمد حبیب الرحمٰن علیگ؛ ماہنامہ مرّیخ، پٹنہ؛ شمارہ ستمبر ۲۰۰۱ء؛ ص ۳۸ [بحوالہ مسعود]

۱۰۱۔ معارف (ماہنامہ۔علی گڑھ، پھر اٹاوہ، دہلی، آگرہ)

"معارف"؛ از عابد رضا بیدار؛ مشمولہ اُردو کے اہم ادبی رسالے اور اخبار؛ رام پور، انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز؛ ۱۹۶۹ء؛ ص ۵ تا ۱۷۔

[جولائی ۱۸۹۸ء (آغاز) سے دسمبر ۱۹۰۱ء تک کے مضامین کی فہرست]

۱۰۲۔ معارف (ماہنامہ۔اعظم گڑھ)

۱۔ اشاریۂ مضامین معارف، اعظم گڑھ؛ مرتب: ڈاکٹر صابرہ بیگم؛ سہ ماہی اُردو ادب نئی دہلی؛ شمارہ ۳۱: ۱۹۸۳ء؛ ص ۲۹ تا ۸۴۔

[جولائی ۱۹۱۶ء (آغاز) سے دسمبر ۱۹۲۵ء تک کے مضامین کی الف بائی ترتیب سے فہرست]

۲۔ ایضاً قسط ۲؛ سہ ماہی اُردو ادب نئی دہلی؛ شمارہ ۱: ۱۹۸۷ء؛ ص ۲۳ تا ۱۱۷۔

[جنوری ۱۹۲۶ء تا دسمبر ۱۹۳۵ء کے مضامین کی الف بائی ترتیب سے فہرست]

۳۔ "علومِ اسلامیہ کی انسائیکلوپیڈیا، پہلی جلد، ماہنامہ معارف کا اشاریہ" (۱۹۱۶ء۔۱۹۷۰ء)؛

مرتب: عابد رضا بیدار و شائستہ خان؛ دہلی: ۱۹۹۵ء؛ ۳۱۷ ص [بحوالہ مسعود]

۳۔ اشاریہ معارف، اعظم گڑھ (جولائی ۱۹۱۶ تا جون ۲۰۰۵ء)؛ مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ؛ مرتب: محمد سہیل شفیق؛ کراچی: قرطاس، بار اول، ربیع الاول ۱۴۲۷ھ/ اپریل ۲۰۰۶ء؛ ۶۳۳ ص (سائز ۲۳×۱۸ س م)۔

[شمارۂ اول: رمضان المبارک ۱۳۳۴ھ/ جولائی ۱۹۱۶ تا جون ۲۰۰۵ء کی زمانی ترتیب سے اور موضوع وار فہرست مقالات؛ تبصرہ شدہ کتب کی زمانی اور الف بائی ترتیب سے فہرست، ناموں کی الف بائی ترتیب سے وفیات کی فہرست، بعض شماروں میں اندراجات کے تسامحات اور معارف کے شماروں سے کتب خانوں کی فہرست، اور مصنفین کا اشاریہ]

۱۰۳۔ معاصر (ماہنامہ تاریخی-پٹنہ)

۱۔ "معاصر کی شمارہ وار فہرست" مشمولہ: رسالہ معاصر کا انتخاب: ترتیب و تقدیم: ڈاکٹر عطا خورشید؛ پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۵ء؛ ص ۵۷۵ تا ۵۹۹۔

[نومبر ۱۹۴۰ء (آغاز بطور ماہنامہ) تا شمارہ ۳۸ (۱۹۸۳ء آخری شمارہ بطور تاریخی) کی شمارہ وار مضامین کا عکس]

۲۔ معاصر کا توضیحی اشاریہ؛ مولف: ڈاکٹر محمد نور اسلام؛ پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۲۰۰۲ء؛ ۴۰+۲۱۳ ص۔

نومبر ۱۹۴۰ء (آغاز بطور ماہنامہ) تا شمارہ ۳۸ (۱۹۸۳ء۔ آخری شمارہ) کی مصنفین کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست مضامین]

۱۰۴۔ معیار (ماہنامہ-پٹنہ)

۱۔ "اشاریہ" مشمولہ: قاضی عبدالودود کا ماہنامہ معیار، پٹنہ: مکمل فائل کی عکسی اشاعت؛ سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ؛ شمارہ ۱۷ و ۱۸: ۱۹۸۱ء؛ ص ۳۸۵ تا ۳۹۷۔

۲۔ ایضاً (کتابی صورت میں)، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۸۸ء؛ ص ۳۸۶ تا ۴۰۰۔

[مارچ (آغاز) تا جولائی و اگست ۱۹۳۶ء (اختتام) کی موضوع وار فہرست مضامین]

۱۰۵۔ نخلستان (سہ ماہی-سجے پور)

۱۔ "سہ ماہی نخلستان کے دس سال"؛ از ابوالکلیم شائق؛ سہ ماہی نخلستان، سجے پور؛ اپریل ۱۹۹۰ء؛ ص ۳۲ تا ۵۵۔

[اپریل تا ستمبر ۱۹۸۰ء (آغاز) تا جنوری تا مارچ ۱۹۹۰ء کی شمارہ وار فہرست مضامین]

۱۰۶۔ نعت (ماہنامہ-لاہور)

۱۔ "ماہنامہ نعت کے دس سال (اشاریہ)"؛ ترتیب: شمیم اختر کوثر پروین؛ ماہنامہ نعت، لاہور؛ اکتوبر ۱۹۹۸ء؛ ص ۸۵ تا ۹۱۔

[جنوری ۱۹۸۸ء (آغاز) تا دسمبر ۱۹۹۷ء کی شمارہ وار اور مصنفین کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست منظومات]

۱۰۷۔ نعت رنگ (مجلہ-کراچی)

۱۔ "اشاریہ نعت رنگ (شمارہ ۱ تا ۳)"؛ مرتب: مصباح العثمان؛ مجلہ نعت رنگ، کراچی؛ شمارہ ۴؛ مئی ۱۹۹۷ء؛ ص ۳۲۱ تا ۳۳۳۔

[شمارۂ اوّل (اپریل ۱۹۹۵ء تنقید نمبر) تا شمارہ ۳ (ستمبر ۱۹۹۶ء) کی فہرست مضامین]

۲۔ ''اشاریہ کتابی سلسلہ نعت رنگ، کراچی'' مرتب: حافظ سید محمد اظہر سعید؛ مشمولہ موضوعاتی اشاریہ ششماہی السیرۃ عالمی، شمارہ ۱ تا ۹ اور نعت رنگ، نعتیہ ادب کا کتابی سلسلہ شمارہ ۱ تا ۱۴: از اشاریہ ساز؛ کوئٹہ: سیرت اکادمی بلوچستان (رجسٹرڈ)؛ اشاعت اوّل ربیع الاوّل ۱۴۲۴ھ/مئی ۲۰۰۳ء؛ ص ۲۹ تا ۵۶۔

[شمارۂ اوّل (اپریل ۱۹۹۵ء تنقید نمبر) تا شمارہ ۱۴ (۲۰۰۳ء) کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست مشمولات]

۳۔ اشاریہ مرتب: شفقت رضوی؛ مشمولہ: نعت رنگ کا تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ از شفقت رضوی۔

۴۔ اشاریۂ نعت رنگ (شمارہ ۱ تا ۲۰) مرتب: محمد سہیل شفیق؛ کراچی: نعت ریسرچ سنٹر؛ اشاعت اوّل ربیع الاوّل ۱۴۳۰ھ/مارچ ۲۰۰۹ء؛ ۲۶۷ص۔

[شمارۂ اوّل (اپریل ۱۹۹۵ء تنقید نمبر) تا شمارہ ۲۰ (اگست ۲۰۰۸ء) کی مصنفین اور عنوانات کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہارس مشمولات]

۱۰۸۔ نقّاد (ماہنامہ۔ آگرہ)

''ماہنامہ نقّاد اور اس کا اشاریہ'' مرتب: سید آباد علی؛ ماہنامہ قومی زبان، کراچی؛ (دو قسطیں) مئی ۱۹۷۴ء؛ ص ۲۱ تا ۲۸ + جون ۱۹۷۴ء؛ ص ۲۵ تا ۳۴۔

[جنوری ۱۹۱۳ء (آغاز) سے دسمبر ۱۹۱۳ء تک کے مشمولات کی الف بائی ترتیب سے مصنف وار فہرست]

۱۰۹۔ نقد و نظر (ششماہی۔ علی گڑھ)

۱۔ ''اشاریہ نقد و نظر، (علی گڑھ)'' مرتب: سید مسعود حسن؛ سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ؛ شمارہ ۱۱۳: ستمبر ۱۹۹۸ء؛ ص ۲۲۹ تا ۲۶۶۔

[۱۹۷۹ء شمارۂ اوّل (آغاز) تا ۱۹۹۶ء شمارہ دوم کے مشمولات کی مصنفین کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست]

۱۱۰۔ نقطۂ نظر (ششماہی۔ اسلام آباد)

۱۔ ''اشاریہ نقطۂ نظر'' (شمارہ ۱۔۱۰) مرتب: سفیر اختر؛ ششماہی نقطۂ نظر، اسلام آباد؛ شمارہ ۱۰: اپریل تا ستمبر ۲۰۰۱ء؛ ص ۱۰۶

[بحوالہ مسعود]

۱۱۱۔ نقوش (ماہنامہ۔ لاہور)

۱۔ ''اشاریۂ رسالہ نقوش'' مرتب: ملک احمد نواز؛ مجلہ نقوش، لاہور؛ شمارہ : (خطوط نمبر)؛ ص ۹۶۷ تا ۹۱۱۔

[شمارہ ۱: ۱۹۴۸ء تا شمارہ ۱۰۸: ۱۹۶۷ء کے مضامین کی الف بائی ترتیب سے مصنف وار فہرست]

۲۔ ''نقوش: کلیات اور مجلہ نقوش'' مرتب: سید جمیل احمد رضوی؛ مجلہ نقوش، لاہور؛ شمارہ ۱۳۵: جولائی ۱۹۸۶ء (طفیل نمبر۔ حصہ دوم)؛ ص ۵۸۰ تا ۵۹۰۔

[شمارۂ اوّل: ۱۹۴۸ء تا شمارہ ۱۳۳: ستمبر ۱۹۸۶ء کے مشمولات کی مصنفین کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست]

۱۱۲۔ نگار (ماہنامہ۔بھوپال،لکھنؤ)

۱۔نیاز فتح پوری کا نگار، وضاحتی اشاریہ۔ مرتب: ڈاکٹر عطا خورشید؛ پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری؛ ۱۹۹۴ء؛ ۳۴۷ص۔

[فروری ۱۹۲۲ (آغاز) سے جولائی ۱۹۶۲ تک کے مضامین کی موضوع وار فہرست]

۲۔"نگار پاکستان اور اقبالیات"۔ مرتب: محمد انور نذیر علوی؛ ماہنامہ قومی زبان، کراچی؛ نومبر ۱۹۹۶ء؛ ص ۳۵ تا ۵۱۔

[رسالے کے پاکستانی دور میں ۱۹۶۲ء سے ۱۹۹۲ء کے دوران شائع ہونے والے اقبالیات کے موضوع پر مضامین کی الف بائی ترتیب سے مصنف وار فہرست]

۱۱۳۔ نوادر (سہ ماہی۔لاہور)

۱۔"اشاریہ نوادر، شمارہ ۱ تا ۲۰۔۲۱ (موضوعاتی اور مصنف کے مطابق)"۔ مرتب: ڈاکٹر عطاء الرحمٰن میو؛ سہ ماہی نوادر، لاہور؛ جلد ۹، شمارہ ۲: اکتوبر ۲۰۰۹ء؛ ص ۲۰۵ تا ۲۳۳۔

[شمارہ ۱: مارچ ۲۰۰۱ تا شمارہ ۲۰۔۲۱: ۲۰۰۷ء کی تاریخی ترتیب سے موضوع وار فہرستِ مضامین]

۱۱۴۔ نوائے ادب (سہ ماہی۔بمبئی)

۱۔مقالہ نما نوائے ادب۔ مرتبہ: رفیعہ انعام دار؛ سہ ماہی نوائے ادب، بمبئی؛ اپریل ۱۹۷۷ء؛ [بحوالہ مسعود]

۲۔ایضاً (کتابچہ)؛ بمبئی: اردو پبلشرز؛ ۱۹۷۱ء؛ ۴۳ص۔

[۱۹۵۰ (آغاز) تا اکتوبر ۱۹۶۹ء کے مضامین کا موضوعاتی و مصنف وار توضیحی فہرست]

۱۱۵۔ نوائے وقت (روزنامہ۔لاہور)

۱۔"اشاریہ نوائے وقت"۔ مرتب: سرفراز حسین مرزا؛ لاہور: پاکستان اسٹڈی سنٹر، پنجاب یونیورسٹی؛ ۱۹۸۷ء؛ ۶۶۰ص (سائز ۱۸×۲۴ سم)۔

۱۱۶۔ نیا دور (ماہنامہ۔لکھنؤ)

۱۔"رسالہ نیا دور کے مضامین کی کتابیات"۔ مرتب: ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی؛ مشمولہ ہماری زبان، نئی دہلی؛ ۸، ۱۵ ستمبر ۱۹۸۴ء؛ ص ۶،۷۔

[دسمبر ۱۹۶۸ تا دسمبر ۱۹۸۱ء کے متفرق شماروں کی شمارہ وار ادبی مضامین]

۲۔"نیا دور، لکھنؤ (افسانہ نما، نیم خود نوشت سوانح، طنز و مزاح): جنوری ۱۹۹۵ تا دسمبر ۲۰۰۰ء"۔ مرتب: محمد اطہر مسعود خاں؛ ماہنامہ اُردو بک ریویو، نئی دہلی؛ شمارہ ۳ ع ۷: نومبر و دسمبر ۲۰۰۱ء؛ ص ۵۹ تا ۶۲۔

۱۱۷۔ نیا دور (سہ ماہی۔بنگلور، کراچی)

۱۔اشاریہ نیا دور، کراچی۔ مرتبین: نثار احمد فیضی و دیگر؛ پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری؛ ۲۰۰۱ء؛ ۶+۲۱۰ص۔

[بنگلور کے شمارہ ۱ (۱۹۴۰ء) تا کراچی کے شمارہ ۸۵۔۸۶: ۱۹۹۱ء (فسادات نمبر) کے مشمولات کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست]

۴۔اشاریہ نیا دور (سہ ماہی نیا دور، کراچی) مرتب: مصباح العثمان، نگران: ڈاکٹر جمیل جالبی؛ کراچی، بزمِ تخلیقِ ادب: ۲۰۰۹ء؛ ۲۲۷ص۔

[کراچی کے شمارہ ۱۵۱ (اگست ۱۹۵۵ء) تا شمارہ ۸۷ و ۸۸ (جنوری ۱۹۹۳ء) کے مشمولات کی مصنفین کی الف بائی ترتیب سے موضوع وار فہرست]

۱۱۸۔ نیرنگِ خیال (ماہنامہ لاہور، راولپنڈی)

۱۔"اشاریات مجلہ نیرنگ خیال [اشاریہ]" مرتب: تبسم انجم؛ سہ ماہی صحیفہ، لاہور؛ شمارہ ۱۶۵؛ اکتوبر ۲۰۰۰ء؛ ص ۵۵ تا ۸۳۔

۲۔نیرنگ خیال کا موضوعاتی اشاریہ (۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۷ء) مرتبہ: دیوان حنان خان؛ نئی دہلی: ۲۰۰۷ء؛ ۲۳۰ص۔ [بحوالہ مسعود]

۱۱۹۔ ہمارا ادب (مجلہ، سری نگر)

۱۔"ہمارا ادب کا اشاریہ" (۱۹۵۹ء سے ۱۹۸۹ء) مرتب: عبدالمجید بٹ جاجنی؛ مجلہ بارروانت، سری نگر؛ دسمبر ۱۹۹۲ء [بحوالہ مسعود]۔

۱۲۰۔ ہماری زبان (پندرہ روزہ، ہفت روزہ، نئی دہلی، علی گڑھ)

۱۔"کتابیات مضامین ہماری زبان" مرتب: ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی؛ ہفت روزہ ہماری زبان، نئی دہلی؛ (۷ قسطیں) ۱۹۸۳ء، ۲۲ جنوری، ص ۷ + یکم فروری، ص ۶ + ۸ فروری، ص ۷ + ۱۵ فروری، ص ۶ + یکم مارچ، ص ۶ + ۸ مارچ، ص ۶، ۷ + یکم اپریل، ص ۸۔

[رسالے کے تقسیم کے بعد کے دور میں یکم جنوری ۱۹۵۸ء تا دسمبر ۱۹۸۲ء کے مضامین کی شمارہ وار فہرست]

۱۲۱۔ ہمایوں (ماہنامہ لاہور)

۱۔"اشاریہ ماہنامہ ہمایوں، لاہور" مرتبین: نجمہ بانو، شائستہ عظمت، محمودہ سلطانہ؛ نظر ثانی و اضافہ: ڈاکٹر نسرین اختر (مقالہ برائے ایم اے اردو) سہ ماہی اورینٹل کالج میگزین، لاہور؛ شمارہ ۲۳۳، ۲۳۴ (۱۹۸۵ء)؛ ص ۱ تا ۱۷۳۔

۱۲۲۔ ہم درد (روزنامہ دہلی)

۱۔"اشاریہ جات ہم درد، کامریڈ" مرتب: ابو سلمان شاہ جہان پوری؛ مشمولہ: مولانا محمد علی اور اُن کی صحافت؛ مرتب: ابو سلمان شاہ جہان پوری؛ کراچی، ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان: ۱۹۸۳ء؛ ص ۴۹۵ [بحوالہ مسعود]

Abstract

Makhzan-ul Favaid (1874), published from Hayderabad Deccan is considered to be the first literary journal of Urdu. Afterwards, a number of literary and scholarly journals appeared in the second half

of nineteenth century including Tehzeebul Akhlaq, Muallim, Dilgudaz and Afsar. Twentieth century is duly called the century of journals in Urdu. Several research papers and articles have been written about these journals and a number of indexes of various journals have also been prepared. This article is actually a catalogue of the indexes of Urdu academic and literary journals edited and published do far. Thus it becomes a primary source for research in all fields of Urdu literature.

معیار: علمی و تحقیقی مجلہ شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد ۲، شمارہ ۲، جولائی-دسمبر ۲۰۰۹ء

مثنوی کام کندلہ

مصنف: عباس / مرتب: سلطانہ بخش*

عباس نے مثنوی کام کندلہ ۱۲۰۲ھ میں نظم کی ۔[1] اس مخطوطے کی کتابت ۱۲۵۲ھ میں ہوئی۔ کاتب جلال الدین بخاری ہیں۔ عباس کی مثنوی کا ایک اور نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کی اردو مخطوطات کی فہرست (جلد اول) میں نمبر ۲۱۸ پر دیگر مثنویوں کے مجموعے بست و نہ کتب کی ایک جلد میں اس تفصیل کے ساتھ موجود ہے "کندلہ پری و شہزادہ کامران" مصنف عباس، تاریخ تصنیف ۱۲۰۲ھ کتابت ۱۲۴۸ھ کاتب نامعلوم"۔[2] یہ مخطوطہ دستیاب نہ ہو سکا تاہم اس مثنوی کے کسی مطبوعہ نسخے کا علم نہیں ہے۔ عباس کی یہ مثنوی فارسی مثنوی "جواہر سخن" کا منظوم ترجمہ ہے جب کہ "جواہر سخن" کا نثری ترجمہ "ملکہ زمان و کام کندلہ" ہے، جس کی کتابت ۱۲۳۲ھ میں ہوئی ۔[3] اس کے علاوہ عباس کی اس مثنوی کا ذکر ڈاکٹر گیان چند کی 'اردو کی نثری داستانیں' کے ضمیمے میں قصہ مادھونل و کام کندلہ کے چھے مختلف نسخوں کی فہرست میں نمبر تین پر "دکنی مثنوی کام کندلہ از عباس ۱۲۰۲ھ تقریباً" نوے صفحات (قبل از تقسیم انجمن ترقی اردو) درج ہے۔[4] یہی مخطوطہ اب انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کی ملکیت ہے۔

ڈاکٹر گیان چند کے اس حوالے نے بڑی غلط فہمی پیدا کر دی اور یہ دور تک چلی گئی۔ چنانچہ سیدہ قاسم عظیم کی تالیف "فورٹ ولیم کالج کی تحریک" کے صفحہ نمبر ۱۱۲ پر حواشی نمبر ۳ میں اسی غلطی کو دہرایا گیا ہے۔[5] اصل قصہ "مادھونل کام کندلا" سنگھاسن بتیسی کی اکیسویں کہانی سے لیا گیا ہے۔ سنسکرت سے موتی رام کوی نے برج بھاشا میں ترجمہ کیا۔ فورٹ ولیم کالج میں مظہر علی ولا اور للو لال جی نے موتی کوی کی برج بھاشا سے ہندوستانی ترجمہ کیا۔[6] لیکن ڈاکٹر پرکاش مونس کے مطابق یہ قصہ ودھی کی نظم 'مادھونل و کام کندلہ' سے اخذ کیا گیا ہے۔[7] اس کے علاوہ لالہ رام سہائے تمنا نے 'قصہ مادھونل و کام کندلہ' کو 'حسن و عشق' کے عنوان سے مثنوی میں نظم کیا۔[8] سنسکرت کی سنگھاسن بتیسی میں بتیس پتلیاں ہیں جن کے باقاعدہ نام ہیں ۔ یہ پتلیاں باری باری راجا بھوج کو راجا بکرماجیت کے قصے سناتی ہیں۔ اکیسویں پتلی کا نام مدھوروتی' ہے۔ یہ پتلی راجا بھوج کو مادھونل و کام کندلا کا قصہ سناتی ہے۔[9] قصہ مادھونل و کام کندلا کا عباس کی مثنوی 'کام کندلہ' کے قصے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ عباس کی مثنوی اور مادھونل و کام کندلا کے قصے کا ڈھانچا یکسر مختلف ہے۔ مادھونل و کام کندلا میں مادھو برہمن اور کام کندلا طوائف کا قصہ ہے جب کہ مثنوی کام کندلہ میں شاہزادہ کامران اور کام کندلہ پری کی داستان ہے اور یہ دونوں قصے مختلف ماخذ سے لیے گئے ہیں۔ مادھونل و کام کندلا کا ماخذ سنسکرت کی سنگھاسن بتیسی کا ایک قصہ ہے۔ عباس کی مثنوی کا ماخذ فارسی کی مثنوی "جواہر سخن" ہے۔ مادھونل و کام کندلا کے برٹش میوزیم کے

* مکان نمبر ۱۶، گلی نمبر ۱، ۳۰ جی-۶/۱، اسلام آباد۔

مخطوطے کے مطابق اس کی تاریخ تالیف ۱۲۱۵ھ بمطابق ۱۸۰۱ عیسوی ہے[۱۰]۔ جب کہ عباس کی مثنوی ۱۲۰۴ھ بمطابق ۱۷۸۹ عیسوی کی تصنیف ہے۔ فارسی مثنوی 'جواہر سخن' کا نثری ترجمہ ''ملکہ زمان و کام کندلہ'' ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی دریافت ہے۔ ''یہ قصہ فارسی کی ایک داستان 'جواہر سخن' کا اردو ترجمہ ہے۔ مترجم کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ سنہ کتابت ۱۲۳۳ھ ہے۔ اندرونی شہادت سے پتا چلتا ہے کہ یہ فورٹ ولیم کالج سے قبل کی تصنیف ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں بھی مظہر علی ولا نے سوتی رام کبیشر کے ہندی قصے ''مادھونل وکام کندلا'' کا ترجمہ اردو میں کیا تھا لیکن یہ قصہ مختلف ہے۔ اس کا نام ملکہ زمان وکام کندلہ ہے۔ مترجم اردو کو کبا گی سے موسوم کرتا ہے۔ اور اپنا ماخذ ایک فارسی تصنیف جواہر سخن کو بتاتا ہے''[۱۱]۔ ''اردو کی نثری داستانیں'' میں ڈاکٹر گیان چند نے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے حوالے سے اس نثری قصے کا ذکر کیا ہے[۱۲]۔ فورٹ سینٹ کالج مدراس میں مقامی زبانوں کے علاوہ عربی اور فارسی زبانوں کی تعلیم کا انتظام بھی تھا۔ درس و تدریس کے لیے نامی گرامی علما اور اہل علم تعینات تھے۔ کالج کے کتب خانے میں دیگر زبانوں کی کتب کے علاوہ فارسی، عربی اور اردو کی کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا جو مطبوعات اور مخطوطات کی شکل میں تھیں۔ یہ کالج دکن کی سلطنتوں کے زوال کے بعد دکنی زبان و ادب کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا۔ کالج کے نصاب کے مدنظر تصنیف و تالیف کا اہم شعبہ قائم کیا گیا تھا۔ جہاں سے ہندوستانی، دکنی، فارسی، عربی، سنسکرت اور تمل وغیرہ کے علاوہ قانون اور ریاضی کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ ''ملکہ زمان وکام کندلہ'' کا یہ نثری قصہ فورٹ سینٹ کالج کے شعبہ تصنیف و تالیف کے زیر اہتمام ترجمہ ہوا۔ اس کالج کی جو مطبوعات و مخطوطات دستیاب ہوئے انھیں دکنی زبان سے موسوم کیا گیا تھا۔ مثلاً ''حکایت الجلیلا (الف لیلہ)، انوار سہیلی، سنگھاسن بتیسی، گلستان اور دیگر کتابوں کو ان کے مترجمین نے دکنی قرار دیا تھا۔ اس کالج کے بعض مصنفین نے جیسے سید تاج الدین نے ''گلدستہ ہند'' میں، منشی مظفر نے ''حیدر نامے'' میں اور ملکہ زمان وکام کندلہ'' کے مترجم نے اپنی زبان کو دکنی کے بجائے کبا گی اور سے موسوم کیا۔ اس کالج کے بعض مولفین گمنام ہیں جن کی غیر مطبوعہ تالیفات میں، ملکہ زمان وکام کندلہ، سنگھاسن بتیسی، ترجمہ گلستان اور دیگر فوجی قوانین شامل ہیں[۱۳]۔ دیگر تالیفات کی طرح 'ملکہ زمان وکام کندلہ' کا اردو نثر میں ترجمہ کالج کونسل نے اس کے افسران فوج کے لیے کرایا ہوگا، کیوں کہ مترجم آغاز میں اپنے ماخذ کا ذکر کرتا ہے 'جواہر سخن ایک قصہ عجیب نظم سے ہے اس کو نثر میں کبا گی اور سے تو آموز مردان والا شان کے پڑھنے کی خاطر لکھا ہے''[۱۴]۔ اس کا مخطوطہ سالار جنگ لائبریری میں ہے۔ نثری ترجمہ 'ملکہ زمان وکام کندلہ اور عباس کی مثنوی کام کندلہ کا قصہ ایک ہی ہے اور دونوں کا ماخذ فارسی مثنوی ''جواہر سخن'' ہے (جس کا مصنف نامعلوم ہے)۔ عباس کی مثنوی کے تمام عنوانات اور ذیلی عنوانات فارسی میں تحریر کیے گئے ہیں۔ یہ منظوم ترجمہ مثنوی کے تمام اجزا کے ساتھ موجود ہے جب کہ نثری قصہ 'ملکہ زمان وکام کندلہ' کے مترجم نے ذیلی عنوانات کو صرف نظر کر دیا ہے اور نثری قصے کو کل چودہ حکایتوں میں بیان کیا ہے۔ عباس کی مثنوی اور نثری قصے کے عنوانات کا مطالعہ اور موازنہ ایک ہی قصے کے دو اسلوب کی نشان دہی کرتا ہے۔

مثنوی کام کندلہ　ملکہ زمان وکام کندلہ (نثری قصہ) ۱۔ درتوصیف بادشاہ گوید، ص ۵ ۔ ۱۔ پہلی حکایت۔ شہزادہ پیدا ہوا اس کا بیان ہے۔ ص ۳۱۴ [۱۵]

۲۔ نوشتن ملک زادہ مکتوب بنام دستور زادہ۔ ص ۷

۳۔ دوسری حکایت۔ شاہزادہ نامہ وزیر زادہ کے نام لکھنے میں۔ ص ۳۱۴

دلی کتب خانہ عبدالحق" کی مہر ثبت ہے اور ایک شعر من تو شدم صرف کردم روزگار – من تمام عطر بجانہ پانیدار اور مخطوطے کا نمبر ۲۸۱۰-۳ درج ہے۔ اوپر کی طرف 'کام کندلا' لکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ کسی شخص نے خوش نما شکستہ میں ایک عبارت فارسی میں نقل کی ہے جس کی تحریر مخطوطے کی تحریر سے مختلف ہے۔ مثنوی کا آغاز مناجات کے اشعار سے اور اختتام 'در بیان مناجات الہٰی و ختم کتاب گوید' کے گیارہ اشعار سے ہوا ہے۔ آخری شعر میں تاریخ تصنیف درج کی گئی ہے:

کیا تصنیف بتیاں جب یہ ذکار – تھی ہجری ایک ہزار و دو صد چار ۱۲۰۴ھ مخطوطہ ناقص الاوسط ہے۔ شہزادے کی ہارات کا بیان موجود نہیں ہے یعنی صفحہ ۳۱ کا ربط صفحہ ۳۳ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ مثنوی کے آخر میں مکمل ترقیمہ موجود ہے۔ "ایں کتاب کام کندلا بخط ناچیز ہرہ از دست سید جلال الدین بخاری در دیوان کچہری بتاریخ ہفدہم جمادی الاول با تمام رسید از فرمائش غلام حسین صاحب کمیدان و سن ہجری ۱۲۵۴ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم"

مثنوی کا یہ نسخہ خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ اس کی کتابت کی روش قدیم ہے جس میں ک اور گ میں کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا۔ ٹ ڈ ڑ کے لیے بالائی اور زیریں تین نقطے استعمال کیے گئے ہیں۔ اعراب بالحروف کے طور پر "واؤ" رکھا گیا ہے مثلاً 'وستاد' (استاد) 'وس' (اس) 'اودھر' (ادھر) اور 'اوٹھا' (اٹھا) وغیرہ۔ تاہم کہیں کہیں جدید املا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ یائے مجہول اور یائے معروف کا کوئی التزام نہیں ہے مثلاً "کیرائے" (کیرائی) 'عربے' (عربی) 'بتاری' (بتارے) 'لاے' (لائی) وغیرہ۔ (ہائے ہوز (ہ) اور ہائے مخلوط یا دوچشمی (ھ) کا کوئی فرق نہیں ہے مثلاً 'اودہر' (ادھر) 'دیکہو' (دیکھو) 'کہولا' (کھولا) 'بادشاہی' (بادشاہی) 'پنہاں' (پنہاں) 'ہور' (اور) وغیرہ۔ عام طور پر اکثر الفاظ بغیر مد (~) کے لکھے گئے ہیں۔ مثلاً 'ارایش' (آرائش) 'اوازہ' (آوازہ) 'اراستہ' (آراستہ) وغیرہ۔ بے شمار الفاظ آج کل کے املا سے مختلف ہیں۔ لایق (لائق) 'سایل' (سائل) 'مایل' (مائل) 'دایم' (دائم) وغیرہ۔ اس کے علاوہ جمع کی یہ صورتیں ملتی ہیں۔ مثلاً 'لباساں' 'محلاں' 'ہزاراں' 'پریاں' 'زیوراں' 'دکاناں' وغیرہ۔ اس نسخے میں آوے' جاوے' پاوے اور کرکر وغیرہ جیسی اردو کی ترکیبیں بھی استعمال کی گئی ہیں۔

اس نسخے کا کاتب کم خط اور کم علم ہے۔ املا کی بہت سی غلطیاں ہیں۔ مثلاً 'مزہ' (مزا) 'اکسیر' (اکسیر) 'زوال' (زوال) 'تمسال' (تمثال) 'وضو' (وضو) 'اول' (ازل) 'وعظ' (وعظ) 'حاظر' (حاضر) 'عذلت' (عزلت) 'لذیذ' (لذیذ) 'مشش' (مشمس) وغیرہ۔ اس کے علاوہ کچھ الفاظ دکنی بول چال کی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ دکن والے عام طور پر "ق" کو "خ" کے لہجے میں بولتے ہیں۔ کاتب نے بھی چند الفاظ مثلاً 'طاقت' کو 'طاعت' اور 'طاق' کو 'طاخ' 'قامت' کو 'خامت' اور 'قورمہ' کو 'خورمہ' تلفظ کے خلاف لکھا ہے۔ املا اور تلفظ کی یہ صورتیں مقامی اثرات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس مثنوی کی تدوین میں جدید املا استعمال کیا گیا ہے۔

مثنوی کام کندلا اور نثری ترجمہ 'ملک زمان و کام کندلا' دونوں کا ماخذ فارسی مثنوی جو ہر سخن ہے۔ اس لیے مثنوی اور نثری قصہ ایک ہی ہے۔ یہ قصہ بنیادی طور پر فارسی قصوں یا ایران کی سرزمین سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ برصغیر میں کسی وقت تخلیق ہوا ہے۔ یہ قصہ دیومالائی فضا میں تحریر ہوا ہے۔ قصے کے اجزا، مافوق الفطرت عناصر، کردار، واقعات اور ماحول سب اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ اس قصے کا خمیر یکسر مقامی ہے۔ اس قصے کی فضا ایرانی نہیں ہے۔ اس کا مزاج وہی ہے جو اکثر داستانوں میں ملتا ہے۔

مترجم مثنوی نگار مہاس نے قصے میں تمام جزئیات کے ساتھ داستان بیان کی ہے اور کوشش کی ہے کہ یہ مثنوی اس معیار کی ہو جس

معیار کی فارسی مثنوی ''جواہر سخن'' ہے۔ اس تخلیقی عمل میں اس نے دکنی زبان کی خصوصیات کو فارسی زبان کی خصوصیات سے ملا کر ایک نیا معیار قائم کیا ہے۔ اس مثنوی کے تمام عنوانات کی ترتیب فارسی مثنوی کی نہج پر قائم ہے تاہم زبان قدرے دکنی آمیز ہونے کی وجہ سے زیادہ مانوس نہیں ہے لیکن اس سے اس مثنوی کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ زبان و بیان میں مقامی اثرات اور قدامت کے باوجود عباس کی مثنوی ایک سنجیدہ نظم ہے اور اردو کا نایاب نمونہ ہے۔

حواشی و تعلیقات مقدمہ

۱۔ مخطوطہ نمبر ۳ر ۳۸۰ مخزونہ کتب خانہ خاص، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان

۲۔ ''وضاحتی فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو''، مرتبہ افسر امروہوی، سید سرفراز علی، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، جلد اول، ۱۹۶۵ عیسوی، ص ۲۰۳

۳۔ رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر، ''اردو نثر کا آغاز و ارتقا''، کراچی، کریم سنز، ۱۹۷۸ عیسوی، ص ۳۱۲

۴۔ گیان چند، ڈاکٹر، ''اردو کی نثری داستانیں''، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت ثانی، ۱۹۶۹ عیسوی، ص ۶۹۷

۵۔ مظہر علی ولا کی تالیف کے سلسلے میں درج ہے ''اس تالیف کے علاوہ یہ قصہ ایک مثنوی میں بھی نظم کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی کسی عباس نامی شاعر کی ہے۔ سال تالیف ۱۲۱۴ھ بمطابق ۱۷۹۸ عیسوی۔ انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کا حوالہ ڈاکٹر گیان چند کی ''اردو کی نثری داستانیں'' میں دیا ہے'' مرتب نے سال تصنیف غلط دیا ہے ممکن ہے کہ یہ کمپوزنگ کی غلطی ہو سید وقار عظیم، ''فورٹ ولیم کالج تحریک اور تاریخ''، مرتب سید معین الرحمٰن، لاہور، یونیورسل بکس، ۱۹۸۶ عیسوی، ص ۱۱۲

۶۔ ''اردو کی نثری داستانیں''، ص ۳۰۱

۷۔ مظہر علی ولا و للو لال نے فورٹ ولیم کالج میں 'مادھونل و کام کندلا' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ولا نے لکھا کہ ان کا ماخذ موتی رام کبیشر کا برج بھاشا کا نسخہ ہے۔ ڈاکٹر پرکاش مونس کو یہ دیکھ کر اچنبھا ہوا کہ برج بھاشا میں کسی موتی رام نے مادھونل و کام کندلا لکھی ہی نہیں۔ انھوں نے کھوج لگا کر کے پتا لگایا کہ عالم کی اودھی نظم 'مادھونل و کام کندلا' ولا کا ماخذ ہے۔ ولا نے اس سے لفظی ترجمہ کیا ہے''۔ ''اردو میں تحقیق و تدوین (۱۹۶۰۔۱۹۸۰)''، ڈاکٹر گیان چند، سہ ماہی، اردو، ۱۹۸۳ عیسوی، جلد ۶۰، شمارہ (۲)، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، (اپریل تا جون) ص ۱۱۔۸۰۔ رام جس مہتا لاہور کے متوطن تھے، دہلی میں پیدا ہوئے اور بعد ازاں بنارس چلے گئے۔ انگریز مسٹر جانسن کے بنارس میں متوسل رہے۔ تذکرہ گلزار ابراہیم میں ان کا ذکر ''معصوم'' تخلص کے تحت کیا گیا ہے۔ ریاست رام پور کے کتب خانے میں گلزار کا جو مخطوطہ ہے اس میں معصوم کا حوالہ تو ضرور ہے لیکن حالات مہتا کے ذیل میں دیے گئے ہیں اور بہت مفصل ہے۔ کلام بھی تقریباً ۱۰۰ صفحات میں ہے۔ جس میں تمام اقسام نظم شامل ہیں۔ اس

مخطوطے میں محیط کی دس مثنویوں کا ذکر ہے۔ ان میں پانچ عشقیہ ہیں اور پانچ متصوفانہ۔ عشقیہ مثنویوں کی تفصیل یہ ہے ، ''محیط عشق۔ ہیر رانجھا کے حالات''، محیط درد۔ سسی پنوں کی داستان''، محیط غم۔ مرزا صاحباں کے بیان میں'' حسن بخش'' اور حسن عشق۔ مادھونل وکام کندلا کے ذکر میں''۔ بحوالہ، ''انجمن ترقی اردو کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست''، (جلد اول)، مرتبہ افسر صدیقی امروہی اور سید سرفراز علی رضوی ، ۱۹۶۵ عیسوی، ص ۳۰۸ تا ۳۱۰۔ ۹۔ اکیسویں پتلی 'ازدوھوتی' مادھونل وکام کندلا کا قصہ سناتی ہے کہ ایک برہمن مادھوا نہائی حسین، زیرک اور علوم وفنون میں ماہر تھا۔ جس راجا کے دربار میں جاتا وہاں اس کی خوب آؤ بھگت ہوتی۔ لیکن جب وہ اپنی لیاقت ظاہر کرتا ہے تو اسے ملک سے نکال دیا جاتا۔ ایک دن وہ پھرتا پھراتا شہر کام نگر کے راجا سین کے پاس پہنچتا ہے جہاں کام کندلا طوائف اپنے حسن و جمال اور ناچ گانے میں اس قدر کمال تھی گویا اروسی کا اوتار تھی۔ مادھو برہمن اس راجا کے دربار میں بڑی عزت پاتا ہے۔ دربار میں کام کندلا رنگ بھرے شیشے سر پر رکھے، منہ سے موتی پروتی، ہاتھ سے گیند اچھالتی، سازوں کی آواز پر رقص کرتی، وہ خوشبوؤں میں بسی ہوتی ہے کہ ایک بھونرا اس کے سینے پر آ بیٹھتا ہے اور ڈنک مارتا ہے وہ اپنے فن کے زور سے سینے میں ہوا بھر کر بھونرے کو اڑا دیتی ہے۔ مادھو رقاصہ کے حسن و جمال اور کمال فن کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور سب کچھ اس عطا کر دیتا ہے۔ کام کندلا بھی اس کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ اس پر راجا مادھو کو ملک سے نکال دیتا ہے۔ مادھو راجا بکرماجیت سے مدد طلب کرتا ہے راجا بکرماجیت دونوں کی محبت کا امتحان لیتا ہے اور بھیس بدل کر کام کندلا کے محل میں جاتا ہے اور اسے مادھو کی موت کی خبر سناتا ہے۔ کام کندلا مادھو کی موت کی خبر سن کر دم توڑ دیتی ہے۔ ادھر مادھو کو پتا چلتا ہے تو وہ بھی جان سے گزر جاتا ہے۔ راجا بکرماجیت کو بہت صدمہ پہنچتا ہے۔ راجا آگ میں جل کر مرنا چاہتا ہے تو بیر اسے روک لیتے ہیں اور امرت جل سے مادھو اور کام کندلا دونوں کو زندہ کر دیتے ہیں راجا بکرماجیت، رام سین کی فوجوں کو شکست دیتا ہے کام کندلا کو حاصل کرتا ہے اور اسے مادھو کے حوالے کر دیتا ہے۔ بحوالہ، آرزو چودھری، ''داستان کی داستان''، لاہور، عظیم اکیڈمی، ۱۹۸۸ عیسوی، ص ۳۹۸ تا ۳۹۹

۱۰۔ ''اردو کی نثری داستانیں''، ص ۳۰

۱۱۔ ''اردو نثر کا آغاز و ارتقا''، ص ۳۱۲

۱۲۔ ''اردو کی نثری داستانیں''، ص ۱۳۶ تا ۱۳۷

۱۳۔ علیم صبا نویدی، ''فورٹ سینٹ کالج''، مضمون، لاہور، مخزن، ششماہی، مجلّہ نمبر ۱۳، ص ۱۲۹ تا ۱۳۲

۱۴۔ ''اردو نثر کا ارتقا''، ص ۳۱۳ تا ۳۱۴

مثنوی کام کندلہ

از عباس ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء

من نوشتم صرف کردم روزگار
من نمانم خط بماند پائیدار

[حسب الحکم لامع النور مہاراجہ سپور دام اقبالہ نوشتہ می شود کہ امروز حضرت اقدس چہار شنبہ باشد مجلس ضیافت بتقریب شادی میمنت آبادی نور ناصیہ دولت و عظمت قرۃ باصرہ عصمت و عفت صاحبہ دام اقبالہا در دیوان خانہ حضور روالاحسن استقرار یافتہ باید کہ بوقت مغرب فایز دیوان خانہ مذکورہ گردید و بعد لذت از تناول طعام بہرہ اندوز حجراتے حضور داخل بزم گاہ سرور شوند]

یا فتاح
بسم اللہ الرحمن الرحیم وتمم بالخیر ہو الغنی

الٰہی دے سخن کے مجھ جواہر / تجلی سے توں کر معنی کا ماہر
دے اپنے لطف سیں گنج معانی / عیاں کر مجھ پورا نکتہ دانی
عنایت کر مجھے معنی کا مخزن / سخن کی شمع سے کر دل کو روشن
عطا کر گنج معانی کا خزینہ / منور کر سخن سے میرا سینہ
تکلم کو دے قوت حمد بولوں / سخن کے بے بہا موتیوں کو رولوں
مجھے غواص کر بحر سخن کا / پروؤں عقد میں گوہر یکتا کا
کر تا بولوں تیری حمد خدائی / کروں تجھ عشق میں نغمہ سرائی
کہ تیری مہر سے ذرہ تجلی[3] کے / سو بے شک مہر سے اوجا کے جھلکے[3]
حدوثی جاوئی کی مے سے مدہوش / وکھیں تو اقرب کا جام کر نوش
جواہر کر دیا نور علی نور / دی مشت خاک میں برقی نور

جو عکس سے مہر گیتی ذر بدخشاں
ہوا ہے سنگ خارا لعل رخشاں

چو[5] با نیساں کی بوند از چرخ ولاب[6]
صدف میں مہرو ماہ(ہ)لولو سے پر آب

زمرد بنا کر قاف کا سنگ
کیا ہے آسماں کو ں اس کے ہم رنگ

کر جب[9] تخرج[7] الحسیا کا ارشاد
ہو مردہ زندہ ہو بے جان اجساد[8]

ہے ذوزق تختہ سبعہ زمیں کا
بحر پر امر رب العالمیں کا

کر عالم تاب جو شمس وقمر ہیں
سو اس کے نور کے در[10] ویوزہ گر ہیں

جو ویسے نور کی جب بھیک منگ لائے
تب ایکی لمعت[11] درخشندہ کی پائے

ہے نام اسی کا پناہ و حافظ کل
کہے حافظ بلائل جائے بالکل

یہ اردا کام اوایا خدا ہے
یقیں[12] قدرت تو بندے میں دیا ہے

جو نور خاص اس کے نور کی ہیں
یقیں وہ رشک چندر[13] سور کی ہیں

ہے قدرت ان میں جو مشکل کی حل میں
ملاویں مشکلاں کئی لاکھ[14] پل میں

در نعت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم

کہاں ہے حمد کی میداں کو نہایت
کمیت خامہ[15] عاجز ہے نہایت

کہے طوطی زباں کی کھول کر لب
شکر گفتار ذکر نعت میں اب

مں-3 لے پردہ میم کا مشہور وموجود
احد سے ہے محمدؐ اور محمود

ہوا(ا) ہے بحر دل از بسکہ در جوش
یہ مضموں فرس[16] ہو ہاتف سے ہم گوش

زبح قاطع انگشت اعجاز
قمر شق گشتہ باایں نور اعزاز

بجکم داغ بغض وحسد رنج
ہوا ہے کر دیا طیر[17] لو انج

صدف سے دل کے در ہوتے ہیں اخراج
کروں جب مرقسم قیاں معراج

پلک مارے فلک عرش بریں پہ
سوجا کہ کن کے آئے پھر زمیں پہ

یہاں مجھ دل میں سوال کی تضمین
ہوے ہے یاد کیا دلچسپ[18] ورنگین

دو معرکاں باہم دم ساز گردیے
شدو گفت شنید و باز گردیے

نعت کا کوئی کہے کہاں[19] تک[20] حکایت
نہ آخر ہو کرے کوئی تک[21] روایت

یک رنگ شب شفا دھوے[22] کے ہاتھاں[23]
سنا ہاتف سے میں یہہ باتاں[24]

ہے اول بات جب خلاق اکبر
کیا چاہا ہے سب خلقت کو اظہر[25]

تب اپنے نور سے ذات محمدؐ
کیا مخلوق ایکی خلق بے حد

سما وارض جنت اور جہنم
بحر صحرا وحوش انعام و نعم[26]

نبی و مرسل و پیغمبری کو[27]
وہ دیو، بشر جن و پری کو

کیا پیدا جو ان کی ذات تجلی[28]
اور[29] ان کے نور کے قطرات تجلی

جو دوسرا یہ کہ اس نوری جسد کوں
گئے معراج باوصل احد کوں

کہوں اب آخری ہے بات ثالث
کہ جن کے مرتضیٰ داماد و وارث

امام و والدہ حسنین و رہبر
علی حیدر کرار صفدر

ولایت کے ملک کے شاہ داور
وہ دریائے شجاعت کے ہیں گوہر

کہاں[30] تک عاشق یہ دم مارے یا اللہ
علیؑ ربؓ محمد رب اللہ

جو قتل یک تن کو ستر بار کر کر
اٹھائے زندہ پھر ہر بار کر کر

جو پوچھیں بندہ تو کس کا ہے سچ[31] بول
علی اللہ[32] کہا ہر بار سب کھول

کہ ایسے میں ہوا ہے حق سے آواز
کہ اے اوج ولایت کا تو شہباز

یہ سب عالم پہ مقدرہ ہے میرا
بغیر[33] ایک گھر بندہ ہے تیرا

کہ جن نے حق سے پایا ایسا ارشاد
ہوا ذات پیمبر کا وہ داماد

بیان اس تیئیں باتاں کا ختم کر
اگے[34] کچھ اور کہتا سو رقم کر

ہے نور احمدی از بس کہ جامع
ہوئے ایجاد مصنوعات صانع

عناصر اس میں جو باہم کیا ہے
کہ صدق وعدل او رعلم وحیا ہے

صحابان[35] دین کے جو سب[36] ملی ہیں
ابو بکر و عمر، عثمان علی ہیں

ص۔4 طبق بھر دل کی کر صلوات کی کل
نثار آن جناب شافع کل

اُپر سب آل اور اصحاب ان کے
سبھی اولاد اورا حباب ان کے

در بیان عشق گوید

رکھو[37] اے عباس ثابت ہوش اپنا
کلام عشق پہ رکھ گوش اپنا

سنو اے عاشقاں افسانۂ عشق
سنو یاراں بیان[38] نامۂ عشق

اگے ہے دور جام بادۂ عشق
ہے بزم رہبر رواں جادۂ عشق

جو کوئی اس جام کے ہیں مست مخمور
او ہوش دنیوی سے بلکہ ہیں دور

بندہ عشق مجازی پہ جو کھوئے دل
حقیقت کی ہوا شاہد سے واصل

مجازی کا پایا فرع[39] اوراصل
گلستان حقیقی کا کل وصل

ہو(ا)ئی طلال اس کا زیب دستار
ہوا وہ ارباب محفل یار

کہ جو گلشن بہار عشق لایا
و(ہ) آسیب خزاں سے پھر لایا

کہ جن کو عشق کا دور قمر ہے　　　کباب و نقل با لخت جگر ہے
کہ جس کے سر اوپر ہے عشق کا تاج　　　وہی فرماں روائے ملک تاراج
لکھوں رنگیں پرت کا جب کہ مضمون　　　رواں آنکھوں سے ہو فوارۂ خوں
پرت[40] کا دل پو دکھ سہاپت[41] ہے　　　بہت مارگ[42] سوں و عاشق کی پرت ہے
ہے درد عشق مشکل دل پو دھرنا　　　انجھو کے گوہراں دامن میں بھرنا
ہوا ہے بیک خامہ سخت حیراں　　　بیان عشق کا ہے طول میداں
نہ طے کر سکے ہو پچ مقدور راہی　　　زباں شق ہو لیا مسہ[43] پر سیاہی
سنی آواز حرف عشق جب گوش　　　کر لے یک بارگی دریائے دل جوش
جو ہو بے تاب جاناں کے وصل بن　　　کیا دکھ سے پرت کے رین[44] کو دن
لاگے بیان صفت آن[45] یار　　　پروتا تھا ہو آنکھوں سے گہر بار
حکایت یاد تج اس فکر کی مجھ　　　کہ آیا حسب حال اس ذکر کے مجھ
ارے عباس کر ذکر دو واصل　　　تسلی بخش ہے تا یا نہ دل
سخن سنجی کہیں ہیں صاحب دل　　　بقول آساں پہ نقل از بس ہے مشکل
کہ جو غواص ہے بحر شعر کا　　　کہ اس کے ہاتھ ہے گوہر قدر کا
جسے مضمون موزوں کی فکر ہے　　　غذا اس[46] کی سنت خون جگر ہے
کیا ہوں شرح عشق وصف جاناں　　　ہے امید صلاح نکتہ داناں
دے جائے سخن زیب نکتہ کوشی　　　اثر آوے اس پو ذیل عیب پوشی
جو کوئی رشک وحسد سے منکر سخن کو ہیں　　　او ہیں بے مغز و نادان ناتواں ہیں
ص5 یہاں اس گفتگو (کو) مختصر کر　　　اگے کچھ اس حکایت کی فکر کر

در بیان آغاز حکایت گوید

سنواے عاشقوں کے بادہ نوشاں　　　سنو دل سے پرت کے خلعہ[48] پوشاں
رواں ہو خوش خرام اشہب قلم کا　　　جو طے کرتا ہے اب میداں رقم کا
کہ ایک تھا شہر کام آباد کر نام　　　کہ صفت اس کا نہ ہو کہنے سے اتمام
زمیں واں[49] کی ہمیشہ سبزو شاداب　　　صفائی اس کی رشک فرش سنجاب
خراماں گل رخاں رستوں میں ہر دم　　　ہوا واں کے نپٹ[50] مطبوع[51] و خرم
دکان آراستہ ہے چار بازار　　　تھے جلساں[52] رنگ برنگ گویا چمن چار
دو رستہ تھے چراغاں ہر دکاں کو　　　زمیں پر لا رکھے جیوں کہکشاں کو

در توصیف بادشاہ گوید

شہے با خاندان یک شکل دارا — جو اس اقلیم کا تھا تخت آرا

سکندر صولت و جمشید حشمت — ہمایوں فطرت و ہارون شوکت

شجاعت میں تھا رستم اس اگے زال[53] — سخاوت میں تھا وہ حاتم کی تمثال[54]

کرے جب دور مے سے بزم شادی — اڑے ہر بار دنا نچ کیقبادی

تھا شاہ کام بخش اس شاہ کا نام — سخی و عادل و عالی سرانجام

مہیا تھے سب ہی اسباب شاہی — سزاوار اس کو تھی عالم پناہی

مگر یک آرزو تھی دل میں جاوید — نہ تھا اس کو چراغ خانہ امید

نہ کام اس کو تھا غیر از یاد اولاد — کہے نت روز و شب اولاد اولاد

ہمیشہ یاد حق میں مشتغل تھا[55] — مناجات و دعا میں مشتغل تھا

بزرگ و شیخ و درویش و گدا سے — برائے سالک راہ خدا سے

نہایت التجا کر ہوئے سائل[56] — جو دل اولاد پہ اپنا ہے مائل[57]

تھا اس کا یک فرد دستور اعظم — خیال اس کا بھی نت فرزند پر ہر دم

یہ دونوں ہاتھ دعوات[58] کے اٹھاویں — خدا سے التجا فرزند کا لاویں

خدا قادر مجیب ہر دعائے — روائے حاجت ہر مدعائے

شجر امید کا جو بار لایا — ثمر فرزند دونوں کو دکھلایا[59]

جو پایا شاہ پس از دعوات بسیار — شجر سے آرزو کے در شہوار

کیا مال حقیقت کا تعقل — تمنا کی چنا گل زار کا گل

ادا کر حمد با تحمید قادر — تصرف کر دیا لعل و جواہر

بوقت سعد و مسعود ایام — رکھے اس کا م جو کا کامران نام

کنائے شادیاں بس دھوم کرکر — بتائے شیر یلی موسوم کرکر

پسر دستور کا با اسم مرسوم — ہوا ہے کام بخش عالم میں موسوم

ص۔6 کیا جب ماہ نوچلے[60] کا آغاز — ہوئی خدمت سے دایہ سر افراز

کنار دایۂ فرخندہ[61] پایہ — دے[62] جیوں پھول پہ[63] بلبل کا سایہ

بغل میں دائی کے مانند بلبل — کرے پالاں دے جیو ڈال پہ گل

جب یہ دونو(ں)پسر دستور وشاہ کے — ہوئے جب چار سال و چار ماہ کے

ادب ہوش مند تعلیم خاطر — یہ دونوں تجر کے پایا مقرر

شکر لب کھول کر جب ہوئے شاداں ۔ لڑی جوں دُر کے جل کے عقد[۶۴] جداں

کریں نت گفتگو آپس میں دیر کوش[۶۵] ۔ نوشت و خواند کر دیئے فراموش

ادیب و وعظ[۶۶] بچا ہو گئے بے زار ۔ کیا یہ ماجرا سب سے اظہار

طلب جلدی سے کر فی الاں[۶۷] شہ نے ۔ لگا دستور کوں غصے سے کہنے

جو کوئی مارے محبت کا سچا لاف ۔ اسے ہے یک قلم میں کاف[۶۸] تا قاف

تمنا جب ہوا دونو(ں) کو مافوق ۔ کر اس تختے سے[۶۹] تب زہرۂ شوق

بنا کر تختۂ چو بیں کو منظر ۔ دیکھیں بایک دگر خوبی نظر پر

لگے آپس میں تب گفتار کرنے ۔ تمنا کی لگے اظہار کرنے

ہنسیں گل کی طرح جب شوق سے کھل ۔ دہے جیوں شاخ گلبن سے جھڑے گل

جدائی یاد کی کر صدف بھر ۔ بکھرے دامنوں میں لو لوئے تر

غرض دستور سابق کی کچھ چند[۷۰] ۔ رکھے سب علم کی دفتر کے تئیں بند

ادیب اس حال کا پھر ہوئے ماہر ۔ دوبارہ اکمر[۷۱] کر دیا جا شاہ کو ظاہر

بلایا[۷۲] شاہ تیا بھیج باہم ۔ بلایا[۷۲] شاہ تیا بھیج باہم

کمر آراستہ بستہ ہو کے ترساں ۔ غضب سے شہ کے ہو جیوں بید لرزاں

الٰہی کیا ہوئی تقصیر صادر[۷۳] ۔ کہے مجھ اس غضب سے لا کے حاضر

لگا شہ داستاں بیٹے کا پڑھنے ۔ لگے خوش گوہراں لعلوں سے جھڑنے

پسر کی سب کہا آوارگی کوں ۔ اور اپنی چشم اور خوں خوارگی کوں

سنا دستور نے جب شاہ سے یہ حال ۔ تسلی پا ہوا دل جمع فی الحال

اٹھا کر وحشت دل جان کے مایوس ۔ نہایت التجا سے ہو زمیں بوس

مقرر تب کیا سن شہ کے ارشاد ۔ پسر کے واسطے کوئی اور استاد[۷۴]

پڑی دونو(ں) میں آ ایسی جدائی ۔ وصل ممکن نہ جز فضل خدائی

دیا بس دل پہ آہ سرد فرقت ۔ کیا پیدا جگر پر درد فرقت

جدائی کا پیے دونو(ں) نے جب جام ۔ گنوائے صبر و طاقت ہوش و آرام

ص۔7

نوشتن ملک زادہ مکتوب با دستورزادہ

لگا کرنے کو شہزادے نے تدبیر ۔ جو اس کے نام سے نامے کو تحریر[۷۵]

ترت کر خاکروبی کو اشارت ۔ لکھا مکتوب با رنگیں عبارت

کیا دیئے اسے دو لعل انمول ۔ حقیقت درد ہجرت کی کیا کھول

سو جاتے پھر ضرورت کے مکاں کو　　　چلیا لے ساتھ[76] اس ہجرت بیاں[77] کو

جونکلیا پاکھانے سے پلٹ کر　　　سوآیا نامہ اور لعلوں کو سٹ کر

گئی جب پاک پھر کرنے کو و زن　　　جو پائی تھی اشارت خاکروبن

او نامہ اور لعلوں کو اٹھائی　　　بہوت[78] کر احتیاط اس کو چھپائی

پسر دستور کے بھی پاکھانے　　　وہ زن ہرروز جاتی (تھی) کمانے

اب مجھ سے تک حیلہ مذکور　　　کہ ہے عمدا[79] و امرا کا یہ دستور

چلیں جب پاکھانے پہ گزرکر　　　اول جا خاکروب آوے نظر کر

اسی دستور سے دستور زادہ　　　کیا جب پاکھانے کا ارادہ

گئی جب دیکھ[80] آنے کو او زن　　　رکھ آئی خط ملک زادے کا وہ چھپن

کر جا دستورزادہ خط کو پایا　　　اٹھایا اور پھر افسوس کھایا

جوآیا واں سے پھر اپنے محل میں　　　مدد مانگے[81] حق سے اس مشکل کے حل میں

نوشتن دستور زادہ جواب مکتوب شاہزادہ

ترت خون جگر کی کر سیاہی　　　لکھا ہے درد دل اپنا گواہی[82]

لے کر مکتوب مضمون جگر سوز　　　گیا جب پاکھانے میں دگر روز

فراغت پا جو نکلا بہار[83] پھر کر　　　کر آیا اس مکاں میں خط کو دھر کر

جو او زن پھر گئی جب پاک کرنے　　　دل اپنا کام سے بے باک کرنے

رکھی او نامہ نامے نے اٹھا کر　　　ترت دی شاہزادے کو لے جا کر

غرض یہ نامہ و پیغام ہوئے　　　ظہور راز بالا[84] تمام ہوئے

مقرر یوں ہوا دونو(ں) نکل کر　　　کر لیا راہ غربت یاں[85] سے چل کر

گرفتن راہ غربت ملک زادہ و دستور زادہ

قلم غربت کا جو مارا ازل میں　　　بندھا آب و خورش کا رشتہ گل میں

ملے نہ گر ہے سر پر و تاج شاہی　　　خزانہ گنج و اقلیم و سپاہی[86]

پسر و دستور کا یہ حکم شہزاد　　　دو اسپ خوش قدم لے راہ زاد

ہوئی تجویز جس جا کے رہے ٹھار[87]　　　کھڑا دستور زادہ ہوکے تیار

کھڑا تھا شاہزادے کی طلب میں　　　نہایت منتظر ہو نیم شب میں

ملک زادہ رنگیلا چڑ دھوں[88] چاند　　　کر پاشاز[89] و عراق آیا کمر باندھ[90]

مکمل[91] لا کے تن پر زرہ و جوشن[92]　　　لئے گرز آہنی شل ہم تن

گیا 8 ہو کر اسوار اسپ برق پا پر
پرے پرواز ہو جاوے ہوا پر

یہ دونوں ہیں دستور وھیہ کے
کرن ہارے قبل خورشید و ماہ کے

جھلم[93] اور توپ[94] دستانے چڑھا کر
چلے میدان پر گھوڑے اڑا کر

چمک بجلیاں نس نعلوں کی ضو[95] میں
کہاں آئے جوت پاوے ماہ نو میں

دے اڑنے میں زریں بال دم کے
کرن جیوں چاند سے نکل ہیں سم کے

سر[96] نحور جیوں کریں افلاک گردی
چلے کرتے ہوئے صحرانوردی

شتاباں[97] ہیں کی جگن جھیں[98] برق میں
پڑے جا بیتان[99] لق و دق میں

مسی تتہ[100] نس واں کی زمیں تھی
ہر ایک کنکر شرار آتشیں تھی

دے جھلے دونو(ں) مثل اخگر[101]
رہے آتش کدے میں جیوں سمندر

تپش سے دھوپ کی جیوں شاخ سنبل
نپٹ کملائے ہور پژمردہ جیوں گل

نہایت تشنگی سے ہو کے بے تاب
کیا دستورزادے سے طلب آب

دکھا تھا اس نے پانی بھر کے چھاگل
لگا جسی سے جوں چھلی[102] کے تئیں گل[103]

دیا جلدی سے بھر ایک ساغر آب
ہوا کر نوش شہزادے نے سیراب

ہوئی ہے جیوں شجر کو آب یاری
چمن پر جیوں نسیم نو بہاری

اسی عنوان سے جب خشک لب ہو
لگے ہر بار پانی پر طلب ہو

تو دیتا بھر کو ہر ہر بار یک جام
ہوا چھاگل سے[104] پانی یا تمام

لگا جو شہزادہ راہ چلنے
لگا تیوں تیوں تپش سے دل پگھلنے

نپٹ گرمی سے عرق آلودہ(تن)
لگا بہنے مثال موم و روغن

چکیدہ[105] قطرہا گر عرق[106] راکب[107]
زمین راہ شد رشک کواکب[108]

منگا پانی ہو شاہزادہ پیاسا
لگا[109] بھرنے کے تئیں دل میں وہ ساسا

نہ تھا پانی سو ہو حیران بے کل
کیا دستور زادہ تک[110] تامل

منگا پانی ہو غصہ دوسری بار
نہ دیتا دیکھ کھینچا اس پر تلوار

کہا دیتا نہیں منگتا ہوں پانی
ابھی تجھ مار کر کرتا ہوں فانی

گھوڑے سے اتر دستورزادہ
لگے ہاتھ باندھ[111] آیا ہو پیادہ

کیا تقصیر اے شاہ نیکو نام
کر پہنچا اب چھاگل کا یا تمام

یہ کہتا سو چلا گھوڑا اڑا کر
کہاں پانی ہے آگے لاؤں جا کر

جلد ہو شاہزادے نے بھی تی اچال
عقب اس کے چلا گھوڑے کے تئیں ڈال

چلے دونو(ں) اڑا گھوڑے پس وپیش　　تپش اور تشنگی سے ہو کے دل[112] ریش
نسیم صبح ہو باد صبا ہو　　برق ہو جد جد شہر سا ہو[113]
چلے جو شاہ زادہ ہور سنگاتی　　دسے[114] آگے ندی یک پورجاتی
ص۔9 ترت[115] دستور گھوڑے سے اتر کر　　لیا پانی جو اس کام بھر کر
دیا شہزادے کو دستور با ہوش　　کر ہے یہ آب شیریں کیجئے نوش
لیا جب جام ہاتھ میں شاہ مقبول　　دیا[116] جیوں شاخ پہ شبنم بھرے گل
لگایا لب کے تئیں جب شاہ خوش ہو　　سنا پھر اکر آتی اس میں کچھ بو
کنارے پر خس وخاشاک ہر سو　　تعج ہے اس سبب آتی ہے کچھ بو
کیا سولے چلا گھوڑے کو دستور　　جو پانی میں کنارے سے بہت دور
وہاں سے جام بھر پانی کو لے کر　　کھڑا ہاتھ باندھ شہ کے ہاتھ دے کر
کہا شہ نے عجب کچھ گفتگو ہے　　کہ پانی میں وہی سابق کی بو ہے
کیا دستور ایسا تیری بار　　گلے تک[117] آب میں گھوڑا واسوار
لیا پھر خوش گوار اس جاسے پانی　　دکھانے[118] اپنی شرط جاں فشانی
دیا لا[119] شاہزادے کو سب تاش　　کہا دیتا ہے کانی[120] میں وہی آش[121]
کیا دستور زادہ ہو کے لاچار　　یہ شہ کے تئیں سنانے عرض اظہار
ہے میری عقل کو تجھ رائے سے تاب　　کہ جیوں ذرہ ہے خور سے روشنی یاب
پھرنے کے تئیں دیکھنا بہتر ہے جا کر　　جیوں آگے اٹکا[122] فرمائے خاطر
کیا درگوش شاہ سوتیاں نچھی[123] کے　　جو دیکھا کس کور تھالے میں من کے (کذا)؟
چلے لے واں سے دستور شہزاد　　کنارے شہر کے جوں[124] سرو شمشاد
جو دیکھیں بیٹھ تر جا کر قدم چند　　ہے پانی واں کا مثل شربت و قند
کی شہو[125] اس کی دل کو مسرور　　گویا عطر وگلاب ومشک وکافور
سب ہی آب وہوا ہور وضع واطوار　　معطر ہو مہکتے ہیں عطر بار
ہوئے کر نوش وہاں آب عطر سود[126]　　ہوئے دونو(ں) جواں بہت آسود
ہوئے شاکر بہت قدرت پہ رب کی　　تصدق ہیں تیری قدرت عجب کی
نہیں کچھ اس میں شک ہے بات برحق　　شکر خوروں کو دیتا ہے شکر حق
ہمیشہ جس کا جو طعم وغذا ہے　　مقدر رزق اس کا او سدا ہے
یہ قدرت دیکھو ہو محظوظ و مسرور　　نقوش حمد با کر دل پہ مسطور

کہے ہم کچھ نہ سمجھے یا الٰہی
یہ سب خوشبو ہی کا باعث گواہی

جو تھے اس بات کے دونو(ں) فکر میں
پڑا واں یک بیک دھوبی نظر میں

کھڑا دھوتا ہوا پوشاک باریک
کہ جس پر تو سے روشن ہوئی تاریک

یہ سب خوشبو ہی ہے اس کے اثر کی
گلاب[۱۲۷] و صندل و عود عطر کی

ص۔10 جو پوچھا شاہ یہ ہے پوشاک کس کا
کہا اس کا ہے یہ جو میں ہوں جس کا

تو کس کا ہے جو بولا ہو کے بے باک
ہوں میں اس کا کہ جس کا ہے یہ پوشاک

کہا دو تین بار اس بات میں پیچ
سو سمجھ بہم ہو تیغ[۱۲۸] میان سے کھینچ

کہا تجھیں چھوڑتا اپنے تکرکوں
عبث کھوتا ہے کیوں تو اپنے سر کوں

نپٹ ترساں و لرزاں ہو کے دھوبی
کہا کہتا ہوں اس کا نام و خوبی

کہ ہے ایک دختر نازک رنگیلی
ہے انچپل[۱۲۹] شوخ اور چنچل چھبیلی

دیے بر باد تقوا زہد کیاں
ہے رشک زلف سے سنبل پریشاں

جبیں کو دیکھ کیا چرخ تباہی
لیا خجلت سے مہ منہ[۱۳۰] پر سیاہی

کمان ابرو کی بس حسرت سے جا کر
لیا[۱۳۱] قوس(و)قزح کو شرما کر

چکارے[۱۳۲] کے دلاں چک دیکھ خوں ہے
چمن میں نرگساں سب سرنگوں ہے

ہے مژگان خنجر خوں خوار عاشق
خدنگ باعث آزار عاشق

جو ناسک[۱۳۳] سب پوچھیوں بے پر الف ہے
گویا صورت کی صورت کا حرف ہے

شگفتہ رخ پو ہے رخسار کا گل
دلاں سب شیفتہ ہے مثل بلبل

لب لعلیں پر ظاہر مسی پان
کہ ہے شام و شفق[۱۳۴] کو بان[۱۳۵] میان

دہن میں یوں دسے دانتاں کا رشتہ
کہ جوں در چک[۱۳۶] میں ہے موتیاں کا رشتہ

سنے سب زنخداں کا آوازہ
حلاوت ذائقے کو ہوئے تازہ

جو دیکھے قمریاں نے طوق غب[۱۳۷] غب
گلے میں طوق یا گویا ہیں دب دب

کمر پتلی کمر جوں زر تار چھلکے[۱۳۸]
ہیں چیتے دیکھ آوارے جنگل کے

کہوں کاں[۱۳۹] تک بیاں ساق سیمیں
تراش صاف شفاف بلوریں

طراوت ہوئے خشکی مغز کی جا
جو کوئی دیکھے نظر سے فندق[۱۴۰] پا

چمن میں چاک ہوئے دل سب گلاں کا
گزر گر ہوئے اس سرو رواں کا

ہے شہر کا نام آباد اس کا موطن
جو اس کا کام کندلہ نام روشن

نگہ سے جس کے پیدا لعل و زر ہے
سونا جز کا سیماب اس کا پدر ہے

لگا کہنے کو جب دھوبی چلے بول
بھر یا دامن میں موتیاں پان[141] کے رول

کیا بجز تمنا جوش تن میں
سکونت اس کا تھی اپنے وطن میں

جگر پر آ خدنگ عشق لاگا
پرت کا لوح دل پر مشق لاگا

ترک کر خواب و خور و عیش و آرام
کیا ورد زبان معشو(ق) کا نام

یہ بیت فرس[142] کیا نادرت قریں ہے
تراش نکتہ سنج سا یقیں ہے

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد[143]
بسا کیں[144] دولت از گفتار خیزد

مراجعت شہزادہ ملک زادہ و دستورزادہ بہ شہر خویش

ص۔11

نہ ہو ہرگز کچھ یہ بات اول
گرہ تدبیر کا تدبیر سے حل

ازل میں جس کسو[145] کا جو رقم ہے
خیال اس کا وہی ہر دم بہ دم ہے

جو بحر عشق کا ہے گا شناور
دکھاوے[146] وصل کے سائل کو داور

ہو شاہزادہ اسیر عشق پل میں
رقم راقم کیا تھا جو ازل میں

جو طرف مسکن مالوف پھر کر
عنان دل کے تئیں معطوف[147] کر کر

چلے ہوتے ہوئے جیوں شمع گریاں[148]
پرت کی آگ پر دل ہو کے بریاں[149]

جو نکلے اس ندی کا چھوڑ ساحل
چلے کرتے ہوئے قطع منازل

یہاں[150] سے جلد ہو کر اضطرابی
شہر کو اپنے پہنچے[151] آشتابی

پدر مادر سب ہی ارکان و دولت
اٹھا کر سند شاہی وصولت[152]

ترت بھیجے تھے ہو کر مضطرب حال
بیاپے[153] قاصد ان کو اگے دہال[154]

ولے نا کوئی ان کو جا ملایا
نہ کوئی ان کی خبر اور کھوج لایا

ہوئے سب خاندان پُر دل فگاری[155]
سب ہی خورد و کلاں[156] کرتے تھے زاری

کبھو[157] ہوتے تھے گریاں مثل یعقوب
کبھو لاتے تھے دل پر صبر ایوب

ہو اایک بارگی ایسا پکارا
کر آیا شاہزادہ پھر ہمارا

ملا آکر پسر مادر پدر سوں
گیا دستورزادہ اپنے گھر کوں

لگے خوشیوں کے بجنے شادیانے
ہر یک گھر میں لگے شادیاں[158] منانے

تھے اگرچہ شاد(اں) سب دوستاں دل
ولے شہزادہ تھا خود مضطرب دل

نہ تھی اس کو فکر کچھ خواب[159] و خور کی
وزیر شاہی و نفع و ضرر کی

خیال اس کو بجز معشوق کی یاد
کیا سب عیش اپنا تلخ برباد

نہ بولے ناسنے، نہ کھائے، نہ سوئے
نپٹ بے ہوش و بے دل بے خبر ہوئے

گئے جا آستان بوستان درگاہ | حقیقت سے پسر کی شاہ کو آگاہ

یہ[۱۶۰] سارا ماجرا جب شاہ کیا گوش | گیا غلطاں[۱۶۱] زمیں پر ہو کے بے ہوش

کیا وردو دعا سے حق دیا پوت | ہے کان آرزو کا لعل و یاقوت

خدا کر بہت سے کربت[۱۶۲] کی پچلایا | میرے نور البصر[۱۶۳] کو لا ملایا

اے داور کر تو[۱۶۴] یاور بخت میرا | کیا روشن شمع مت کر اندھیرا

بہت حسرت وحیرت سے دل چاک | کیا دستور کو ہو کر غضب ناک

پسر تیرا جو اغوا کر بھگایا | نپٹ دیوانہ وحشی کر کے لایا

درستی گر نہ ہو فرزند کو میرے | کٹاؤں گا میں زن فرزند کو تیرے

ص12 سنا جب شہ سے یوں دستور گمبھیر[۱۶۵] | کر تھاؤی عقل و روشن رائے تدبیر

پسر کو جلد خلوت میں بلایا | شتاب شہ کو شروع[۱۶۶] سنایا

رکھا اس امر میں شہ تجھ پو تقصیر | نہ جانو کیا لکھا ہے کلک[۱۶۷] تقدیر

پسر بولا سنوائے والد پاک | دکھو مت اس امر میں دل میں کچھ[۱۶۸] دھاک

کہ اب ہوتا ہوں میں اس کا سعالج | کہ جاوے شہ کے دل سے سب[۱۶۹] تعالج

ترت دستور جا شہ سے کیا عرض | کہ ہوئے شاہزادے کو جو کچھ مرض

پسر میرا سعالج ہوئے فی الحال | کہا مجھ سے کیا ہوں عرض درحال

یہ ہو سرد شاہا کا آتش نفس خشم[۱۷۰] | کہا کیا ہے بھر چاہتا[۱۷۱] تحکم چشم

پسر دستور کا باہم جنگل میں | جو تھا آ شاہزادے کے محل میں

کیا لایا ہوں خوش خبری ہو مسرور | شنیا[۱۷۲] ہوں کام کندلا جی کا مذکور

یہ تک سنتے ہی اٹھ بیٹھا کر اے یار | کیا کیا مژدہ لایا ہے کر اظہار

پسر[۱۷۳] دستور کا اٹھ کر ادب ساتھ | نہایت[۱۷۵] عاجزی سے باندھ کر[۱۷۴] ہاتھ

ثنا[۱۷۶] وصفت سے کر دل کو مقرون | کیا تسلیم الف قامت کو کر نون[۱۷۷]

کہا اور وقت اور رنگ[۱۷۸] شاہی | نپٹ تجھ[۱۷۹] دل پو ہے رنج و تباہی

وضو کر جلد کچھ فرما تناول | ہو خاطر جمع سن اے مدعا کل

تھا شہزادہ تمنائے وصل میں | کہا جو کچھ سوال سب عمل میں

تناول جب کیا اور پان کھایا | دروغ وراست اس نے کچھ سنایا

غرض ہر طرح شہزادے کو خوش دل | کیا آسان جو تھا وہ امر مشکل

ہوئے اس بات پر کل دوستاں خوش | بزرگ و خورد سب خاندان خوش

گیا دستورزادہ اٹھ قدم چند ۔۔۔ گیا شہزادہ پیدا پھر وہی چھند [۱۸۰]

پدر مادرو امرو اور وزرا ۔۔۔ سبھوں کے تئیں بھی خاطر میں گذرا

پسر دستور کا دے کر رفاقت ۔۔۔ شریک درد ومحنت رنج وراحت

جو تھا ہم دم ہو اس کا یار جاں ہے ۔۔۔ وبے شک اس کے دل کا رازداں ہے

بھلا ہے اس سے اس کا بھیدپانا ۔۔۔ چھپے جو کچھ فکر کرتا (و) کرانا

سنا یہ بات دستور خردمند ۔۔۔ پسر کو اپنے جا پوچھا اے دلبند

تو شہزادے کے سنگ تھا مونس جاں ۔۔۔ [۱۸۱] رہا ہر دم نہیں کچھ تجھ سے پنہاں

یہ شہزادے کی بے ہوشی کا باعث ۔۔۔ نزار[۱۸۲] وزار[۱۸۳] دل جوشی کا باعث

مفصل ماجرا مجھ سے بیاں کر ۔۔۔ کریں تا فکر اس کی مت نہاں کر

پسر نے تذکرہ دھوبی[۱۸۴] کا جملہ ۔۔۔ کیا مذکور عشق کام کندلہ

ص 13 بہ نام کامیاب اعلیٰ ہے تجار ۔۔۔ پدر اس کا بارنگ ونیک اطوار

نہ تاجر اس کے کوئی عزوقدر میں ۔۔۔ نظیر اس کا نہیں کوئی مال وزر میں

پسر سے خوب کر تقریر وتکرار ۔۔۔ کیا دستور نے جا شہ کو اظہار

سنا شاہ گفتہ و دستور زادہ ۔۔۔ کیا تاجر کے ملنے کا ارادہ

مرصع کی منگا زریں عماری ۔۔۔ کیا سب فوج میں حکم تیاری

سواری کا ہوا ہے جب نقارہ ۔۔۔ ہوا تیار لشکر شہ کا سارا

سوارو[۱۸۶] پارو[۱۸۵] بھی اسپ وکمان دار ۔۔۔ پہلوان کر زرہ[۱۸۷] دار دستاردار[۱۸۸]

چلے سب صف بہ صف ہو کو چپ وراست ۔۔۔ نقیباں سب لگے کرنے صف آراست

دلاور دل دلیراں قوی تن ۔۔۔ کر باسازو عراق[۱۸۹] وزرہ جوشن[۱۹۰]

سمند[۱۹۱] و ابلق[۱۹۲] و مشکی[۱۹۳] سرنگ[۱۹۴] پہ ۔۔۔ ہواکب[۱۹۵] رنگ برنگ خوش رنگ زرنگ پہ

ہر ایک خوش رو جوان بیست سالہ ۔۔۔ گویا پھولا تھا نافرمان ولالہ

منجیاں[۱۹۶] چوبداراں[۱۹۷] بازشتاں[۱۹۸] سب ۔۔۔ نپٹ آراستہ تھیں مہوشاں سب

بجے ڈکے[۱۹۹] گھوڑے[۲۰۰] کوس[۲۰۱] کرنائے ۔۔۔ ترہیاں[۲۰۲] اور نفیریاں[۲۰۳] اور سرنائے[۲۰۴]

وزیراں[۲۰۵] ،امیراں[۲۰۶]، ساتھ لے نکل ۔۔۔ چلا اس طرح باشان وتجمل

قلم عاجز ہے اس ذکر جلو میں ۔۔۔ زمیں گھٹ گئی تھی جن گھوڑوں کے (گاڑا)

استقبال نمودن تاجر بادشاہ [۲۰۷]

تو اب عباس[۲۰۸] روز امر کب فکر ۔۔۔ کر اس تاجر کے استقبال کا[۲۰۹] ذکر

سنہ آمد شہر کی تاجر پاک طینت
کر استقبال خود بازیب وزینت

ہے جتنے عمدہ و اعلیٰ رفیقاں
بہ رنگ و معتبر علی[410] طریقاں

جواں سب زری پوشاں جھلا جھل[411]
منقش[412] تاش و حتہا بی مکلل[413]

ہر یک کے ہاتھ طبقاں بھر کے بے حد
زمرد لعل و الماس وزبر جد[414]

یہ سب لے شاہ اوپر کرنے تصدق
چلے کہتے ہوئے سلطان صادق

ادب سے پیش آکر عجز ظاہر
تصدق کر دیا لعل و جواہر

جو ایسے زیب و فر سے شاہ نے جا
ہوا اس کے مکان میں رونق افزا

جو بیٹھا مسند شاہی کے اوپر
کھڑا ہاتھ[415] باندھ تاجر پیش ہو کر

کیا ارشاد تب شاہ مخیر[416]
بہ مہر[417] خسروی کا تو بہتر[418]

کہا درپیش مجھ کو تجھ سے ہے کام
مگر حکم ازل[419] کا ہے یہ انجام

پسر مجھ کو دیا اللہ نے ایک
کہ ہے افعال و اطوار میں نیک

اسے اب تو لے اپنی فرزندی میں
دے تجھ دختر کو میری دلدہی میں

رہے تا دوستی کا رشتہ محکم
کبھی رسم تودد[420] ہوئے نہ کم

ص۔14 کہا تاجر نے اے سلطان داور
کہ ہووے فضل حق تجھ یار[421] و یاور

میرا سب مال وجاں تجھ پہ سثوں[422] وار
ولے[423] اس امر میں ہوں سخت لاچار

یہی ہے ایک عرض اور اظہار میرا
نہیں اس کام میں اختیار میرا

مگر خاطر میں آئی ایک صورت
کہے مادر سے اس کی بالضرورت

چلا یہ بات سن کر شاہ بدولت
محل میں اپنے آیا[424] فروصولت[425]

کہا ملکہ زماں سے سب حقیقت
کہا تاجر نے جو کچھ فی الحقیقت

کیا سب ذکر تا اس پہ عیاں ہوئے
کہ تاتاجر کی زوجہ کن[426] رواں ہوئے

روانہ شدن ملکہ زمان پیش زوجہ تاجر

تُرت نکلی محافے میں ہو اسوار
مکلل پردہ زریں و زر تار

کنیزک[427] خوش رو پرستان مہوش
خراماں پیش روئی قُل چاؤ ش

سبھی[428] خوش قامتاں خورشید پرور[429]
بھواں جیوں تیغ[430] پلکاں[431] ہے تحجر

دسے ملکہ پری رویاں میں لا زیب[432]
ستاروں میں چندا[433] با زینت وزیب

چلی اس طرح با عزو قدر سوں
سنی تاجر کی زوجہ اس خبر کوں

نکل آئی میانے میں ہو اسوار
ہزاراں[434] لعل وزر اس پہ دیئے نثار

نپٹ الحاح[۴۳۵] اور عجز و ادب سے
لے گئی گھر اپنے شادی اور طرب سے

بٹھائی مسند شاہی کے اوپر
در و دیوار ہو گئے سب منور

کہی اے داورہ ملکہ زماں کی
رہے نت سلطنت تجھ پہ جہاں کی

تیرے آنے سے مجھ ہوئی افتخاری
میرے سب خاناں کو افتخاری

بلا شک تابع ارشاد ہوں میں
دل و جان سے تری منتظر[۴۳۶] ہوں میں

جو کچھ ارشاد ہے یا مہر یا خشم
بجا لاؤں گی چل کر با سر و چشم

گئی ملکہ نے جب اظہار کرنے
شکر لب سے شکر گفتار کرنے

جہاں میں جس طرح ہے رسم و دستور
لطافت سے کی نسبت کا مذکور

سنی تاجر کی زوجہ جب یہ ارشاد
کہی اے پاک گوہر نیک بنیاد

نہیں مختار ہوں میں اس امر میں
نہ کچھ مقدور[۴۳۷] ہے اس کے پدر میں

مگر ایک بات سے کرتی ہوں اطلب
میرے سے اس قدر ہو آئے مطلب

دکھا دیتی ہوں میں اس کے مکاں کو
جو ہوئے ہیچ[۴۳۸] گر ملکہ زماں کو

اجابت[۴۳۹] کر کہی جب اے مجھ
نہ شک تجھ دوستی میں مثل حب

قدم اس کام سوں تو اینچ[۴۴۰] پچھ مت
کرے جو کچھ آگے کھینچ[۴۴۱] وہ قسمت

ہو خوش تاجر کی زوجہ بے حسابی
چلی ملکہ زماں کو لے شتابی

ص۔15 طرف سے اپنے دل اس کا اٹھائی
جو اول ڈیوڑھی[۴۴۲] اس کی دکھائی[۴۴۳]

رفتن ملکہ زماں بہ دروازہ اول بہ طلب مقصود

جو ہیں اس داستاں کے نکتہ داناں
بیان عشق کے اسرار[۴۴۴] خواناں

پروے یوں سخن[۴۴۵] کے در لڑی میں
جو گئی شہزادی اول ڈیوڑھی میں

وہاں طاقت نہیں باری کر روکی
یقین ہے واں قزلباشوں کی چوکی

ہوئے حائل یہ ماما کون آئی
اسے سارے کون ہیں اس کے سنگاتی

یہ تک سنتے ہی شہزادی خجل[۴۴۶] ہو
گیا سب رنگ چہرے کا بدل ہو

پسر کی میں لیے اس در پہ آئی
سبک لوگاں[۴۴۷] میں ماما کر کہلائی

پہ ستاراں کہی ہے حکم جانی
کر آئی آپ چل ملکہ زمانی

ہے لا بد پیش تر دنیا ہے چلنے
کر آئی کام کندلہ جی سے ملنے

کہا دربان جا کر تا دیکھے در
وہاں سے در بدر تا ہفت در پر

تھی ساکن جس مکاں میں کام کندلہ
وہاں تک ڈیوڑھی[۴۴۸] تھی سات جملہ

خبر کے تئیں پہنچے وہ دل ربا نے　　دی پروانگی[249] ملک کو آنے

لی جب پروانگی وہ رشک چندر　　جو دیکھی ڈیوڑھی سے جا کے اندر

کھڑا ہے استوار یک طاق[250] سنگیں　　ستون سنگیں بدن[251] کی ساق سنگیں

سب ہی یک رنگ بام[252] و سقف[253] سنگیں　　دسے ہر چیز واں ہر طرف سنگیں

جدھر دیکھوں در و دیوار سنگیں　　چمکتے ہیں جھلجل[254] وار سنگیں

زمیں پر تخت سنگیں نصب ہے　　کہ گویا شیشہ صاف حلب[255] ہے

بساط[256] آراستہ بے شمار[257] ہے سب　　مکلل[258] باف[259] سنگیں تابے سب

ہے مسند ماہتابی[260] پر دھندھیر[261] ہے　　دسے شکل کرن جھالر دھندھیرے

عجب دیوے[262] کی آویزاں تھی قندیل　　خرد جس کی نگ سے ہوئے تبدیل

شمع دان اور قندیل سوز سنگیں　　سب ہی یک رنگ بزم[263] فروز سنگیں

کھڑے سنگیں بدن جھلجل جو الاں　　لے پیچھے پیک دان اور پان دالاں

دیوے کا حوض اور دیوے کے کنج ہیں　　کہ حوض بہشت اس کو توج[264] ہیں

اڑے نت خوش گو اس کا سو پانی　　کہ ہے تحقیق آب زندگانی[265]

کہاں اس کے برابر شربت قند　　اگر قند و شکر شیریں ہے ہر چند

کیا حق چو طرف اظہار گل زار[266]　　بچھاں بہشت جوں پچ خار گل زار

شگفتہ نسترن[267] دیکھے ہے نسریں[268]　　چمن کو زیب و زینت رشک[269] پروین

ہو کر گلشن میں شبنم[270] سے لبریز　　کھڑا لالہ لیے ساغر نشہ انگیز

ص۔16 بکھر کر اس ستم کے تاج اوپر　　ہے نافرمان نافرمان ہو کر

جو رنگیں ہیں چمن کے خوب رویاں　　ہے سوسن وہ زباں[271] سے شکر گویاں

مگر آئی ہے وہ دلبر[272] چمن میں　　کہ گویا ہے تراشے طرۂ خام (کذا)

بچھے ہر جا تختہ سنگیں ہے تاباں　　مصفا تر ہے روپے کی خیاباں

کریں سب صوتیاں[273] گل[274] وجد آغاز　　سنے واں بلبل طوطی کی آواز

عجب تر روضہ نزہت[275] قریں[276] ہے　　مگر یک تحفہ خلد بریں ہے

شجر[277] سب بارور ہیں با طراوت　　نکہہ سے ذائقہ کو ہوئے حلاوت[278]

انار[279] و سیب اور عناب تر ہے　　لذیذ و پختہ و شیریں ثمر ہے

ثمر جو پختگی پا کر جھڑے ہیں　　زمیں پر فرش ہو کر سب پڑے ہیں

کھڑی ہیں خوب واں چوکدان[280] سب　　سرو قد گل بدن نرگس نین سب

چنڈ[۳۱۰] اور بادکش[۳۱۱] لے کر نگاراں   کھڑے واں کے جو ہیں خدمت گزاراں
کہاں تک صحن کی بولوں صفائی   نصب ہیں صاف تر خشت[۳۱۲] طلائی
طلائی حوض خوش تر[۳۱۳] ہے صحن میں   طبق زر کا رنگیں ہیں جوں آنگن میں
کروں اس حوض کی توصیف تا چند   اڑے فوارے جس میں شربت و قند
گل گلزار پہ سو تختہ تختہ   گلاں[۳۱۴] خنداں ہیں غنچے سب شگفتہ
مگر دیکھا ہے لالہ خال دل پہ   لیا ہے رشک سے یہ داغ دل پہ
خوشی[۳۱۵] سے تازہ تر پہنا وا اوڑھا   ہے نافرماں[۳۱۶] نافرمان جوڑا
نگاہ کر اس کی زلف مشک بو پہ   کیا دل تار تار اپنا صنوبر[۳۱۷]
چمن میں یوں دسے ہے سنبل و گل   ہے جوں گل رو کے عارض پہ زلف کاکل
شہ گل زیب بخش تخت گلزار   سرو شمشاد و عرعر[۳۱۸] ہیں علم دار
سپاس[۳۱۹] حمد حق میں روز اور رین   ہے سوسن تن پھولوا پیرہن شین[۳۲۰]
دیگر ہے سیوتی[۳۲۱]، چمپا[۳۲۲]، چنبیلی   ہر ایک خوش رو ہے جیوں لہر رنگیلی
ہو سر خوش بادہ نوش سیر گلستاں[۳۲۳]   ہے بلبل نغمہ سنج لحن دبستاں
قلندر فاختے کرتے ہیں اقرار   سدا کوکو نوائے رب غفار
سب ہی طوطے مولے اور چنڈول   شکر گفتار حمد رب میں مشغول
نپٹ زاغ و زغن ہو کر خدا ہیں   سب ہی پڑھتے[۳۲۴] ہیں سورہ قاف قرین
ہے جاری آب شیریں کی جو نہراں[۳۲۵]   نسیم صبح سے موجوں کی لہراں[۳۲۶]
کنارے پہ ہے تاباں تختہ زر   شعاع نور میں جیوں چشمہ خور[۳۲۷]
ریاض دل کشا[۳۲۸] و جاں فزا ہے   کپور شک ارم اس کو سزا ہے
ثمر[۳۲۹] اس طرح نخل و شجر کی   کریں نہ فرق کوئی شام و سحر کی
ہے[۳۳۰] شہتوت اور ہو (ا) انگور شیریں   ہے لائق حور جنت اور شکر چیں[۳۳۱]
ہے کم سالاں[۳۳۲] پری[۳۳۳] عریاں نری پوش   کہ ہے دوشیزگی کے[۳۳۴] بحر کو جوش
ص۔18 خراماں[۳۳۵] باغ میں ہیں شوخ طناز   قلیلے زر کے ہیں لے شصت[۳۳۶] انداز
نپٹ ناز و ادا و عشوہ سے مہار[۳۳۷]   اڑویں طیر[۳۳۸] و مرغان[۳۳۹] ثمر[۳۴۰] خوار
ثمر افتادہ[۳۴۱] و آمیختہ[۳۴۲] ہیں   گئے اشجار کے جو ریختہ[۳۴۳] ہیں
کھڑے ہیں نخل قد سے کے سرافراز   ہے دعا قامتوں میں یکسر ممتاز
گئی سب سیر شہزادی ہو دل شاد   یہ صنعت[۳۴۴] دیکھ صانع کو کی یاد

چلی کہتی ہوئے خدا[345] کریم　　　بخش صانع[346] رب[347][348] رحیم

[349] رفتن مکرزمان بدر سیوم

جو پہنچی جا سیوم دروازہ اوپر　　　کہ بس تکرار گاہ تازہ اوپر

گزر نا قاصد وجاسوس کے ہے　　　کہ چوکی اس پہ قوم روس کی ہے

کیا دربان نے حرمت کر کر غروری　　　نپٹ سختی و مستی سینہ زوری

کہ اے ماما غریبہ عجز صورت　　　چلی آتی ہے کہہ کیا ہے ضرورت

سنی دربان سے گفتار درشتی　　　[350] دکھایا اپنے جو اطوار زشتی

کہی سب خاناں کو تنگ لاگا　　　کہ شیشے پہ قدر کے سنگ لاگا

نظر کر یہ مع المعروبیر[351] کی　　　یہ سب سختی ہوں باعث سے پسر کی

گئے ظاہر جو دربان سے پرستار　　　چلے خاوند سے کرنے کو اظہار

خبر پہنچائی جا ہر در کے دربان　　　لے آئے کام کندلا جی کا فرمان

در ثالث سوں بڑھ[352] کر شاہ زادی　　　[353] جو کر ہوئے دل اوپر قوت زیادی

عجب دیکھی وہاں مصنوع[354] قادر　　　محل یک گوہریں[355] براق و نادر

نمایاں قدرت اللہ عجب ہے　　　درودیوار سب گوہر نصب ہے

ہے چوب و تختہ وار کان گوہر　　　جدھر دیکھو سب ہی ایوان گوہر

نصب ہیں ہے رواق[356] و طاق میں نور　　　صدف گویا در شہوار سے پر

ہے چھت جھالر[357] پہ ہر تاز موتی　　　فلک پر جوں دسے تاروں کی جوتی

بساط گوہریں آراستہ ہے　　　نپٹ دلچسپ اور دل خواستہ[358] ہے

کہاں تک صفت اب مسند کی لکھیئے　　　کہ یک سر ہیں گہر آسودہ[359] تکیئے

ہے روشن شمع داناں گوہریں سب　　　ستارے جوں اتارے ہے زمیں سب

کھڑے ہیں مکن[360] گوہر عہد بردار　　　جو ہیں خدام سب نرگس نین[361] سار

صحن سب ایک سر فرش گہر ہے　　　کہ آب و تاب سے موج ظہر ہے

بنائے حوض خوشتر کر کے تدبیر　　　کہ اڑتا روز و شب فوارۂ شیر

نصب گوہر کے تئیں آس[362] پاس کرکر　　　کیے کچھ اس پہ گوہر آس[363] کرکر

ص۔19 جو اطراف و جوانب پھول بن ہے　　　گلوں کے شاہدوں کا انجمن[364] ہے

دیا ہے تختہ نسریں کہیں کھل　　　کہیں لالہ کھڑا شبنم کا لے گل

کہیں ہے موگرا کھل تختہ تختہ　　　کہیں غنچے کہیں ہے گل شگفتہ

بہار جاں فزا ہے یاسمن میں — لٹک[365] سے سرو دلہا[366] ہے چمن میں

کہیں ہے موتیاں[367] کا تختہ سیراب — کہاں موتی کو ایسا آب اور تاب[368]

کلاہ دلبری دھرے دھر سر کے اوپر — نپٹ گستاخ چشم شوخ شہپر[369]

چمن میں یک طرف شدن ہے شبو[370] — جہاں فرحت کی آتی روزو شب بو

جو سبزان چمن ہے تازہ اور تر — ہواشت جھڑیں شبنم کے گوہر

کھلا ہے تختہ رنگیں ہزارہ — ہزاراں عندلیبوں کا نظارہ

سب ہی بالا سے ہم قامت ہو شمشاد — فلک فرسا کیا[371] سر کو ہو دل شاد

ادھر دیکھو نظارہ ہے گلوں کا — ادھر ہے شوروغل بلبلوں کا

رکھا سر پہ شہہ گل[372] السر خاص — چمن میں کبک[373] اور طاؤس رقاص

ہوا سے موج زن ہو کر کے جاری — ہے آب خوش گوار جو نیاری

نکہ سے مہر کے پانی چوتا یاں — ہے جیوں ذر یتیم[374] اس کی خیاباں

ہے سیر تازہ گلزار ریاحین[375] — دگر ہے باغ مشجر[376] خلد آئین

سب ہی اشجار میوے سے لدے ہیں — جو حق کی آبیاری سو بڑے[377] ہیں

نظر اس سیب پہ کر ہوئے شاداں — نہ دیکھا جو شکر لب کا زنخداں

جو کھائے باغ کا گر جام[378] و نارنج — رہے پی کر شفا کا جام[379] نارنج

پری وش غنچہ لب خورشید رویاں — گہر دندان گل عارض مشک مویاں[380]

ہے زیور گوہریں جوں پھول ڈالی — اوڑنی[381] اور کمر موتیوں کی جالی

کریں ل شصت کی شرط شرطی[382] — اڑاویں باغ وہیں سے زاغ طوطی

غرض ہر طرف ہے گلزار شاداب — درختاں بار وریں سبزہ سیراب

ہو خوش دادرہ ملکہ زمانی — کہ زیب سلطنت ہے جاودانی

جو دیکھی سیر گل گشت چمن کر — تصدق صنع حق پہ جان وتن کر

رفتن ملکہ زمان بہ باغ چہارم

جو پہنچی جا کے چوتھے باب اوپر — نظر واں کی کرے اسباب اوپر

تعین چوکی واں ہے حبشیوں کی — قوی اور ہیکل تن[383] زنگی بچوں کی

کیا زنگی بچہ یک آ دادا[384] گر — جو آگے سے کھڑوں کو جتا کر

غضب دکھی نہیں ماما خبر توں — کہ آتی بے محابہ ہے کدھر توں

ص۔20 کہی جب شک گلوں کر تقاطر[385] — ہے تقیس آبرو بیٹے کی خاطر

پرستار واں سخن آراستہ کر
کیے رنگیں سخن پیراستہ کر

کہ ہے یہ داورہ ملک زمانی
ہے زینت بخش تخت خسروانی

تمنا کام کندلا ہی سے دل نے
کہا آئیں یک جہتی سے مل ملانے

چلی تشریف لے خود کر شتابی
جو ہے ملنے کی دل میں اضطرابی

پرستاروں سے جب عیاں کیا گوش
جو تھا ان سے سپہ فرحوں میں باہوش

کیا جا حرمت دے کر دو پو اظہار
جو پہنچے بخت ورجن کے اخبار

وہاں سے کام کندلا پہ ہو ظاہر
چلا پروانگی دربان[۳۸۶] لے باہر

چلائی الان تب واں سے رواں ہو
جو آیا شاہزادی کن رواں ہو

گئی پروانگی کا کوس میں ورد
ہے فرحت (سے) سے کرچتا ہے دل پہ

رکھی کیا محو حق آگے قدم کو
گل دل کر شگفتہ تازہ دم کو

جو دیکھی قدرت حق ہے نمایاں
زمرد کا محل شاہوں کے شایاں[۳۸۷]

رہا کاخ زمرد دیکھ کر صاف
کھلا لے جہاں کا رشک سے کاف[۳۸۸]

نظر دیکھا ہے سبزہ سبز گردون[۳۸۹]
ہوا خجلت سے پاانداز[۳۹۰] گلشن

عجب کچھ سبز بارفعت مکان ہے
گویا کاخ فلک کا نردبان[۳۹۱] ہے

ہے دیواراں زمرد در زمرد
رواق طاق ہیں یک سر زمرد

زمرد کے جو ہیں محراب ومنظر
ہیں خم خجلت سے طاق افلاک اخضر[۳۹۲]

زمرد کے ستون یک طرز رنگ سب
ہے قدجوں شاہدان سبز رنگ سب

غرض یک سر زمرد سقف ایواں
کر نکلا ہے زمرد کا نگر کان

جو پائے اس مکان میں فرش ترتیب
مرصع ہے زمرد کر کے تصحیب

بچھی ہے اس پہ مسند شاہ خوب
کیے جس پہ زمرد تعبیہ[۳۹۳] خوب

زمرد کی ہیں سب قندیل اور شمع
کواکب بام خضرا پہ ہیں جوں شمع[۳۹۴]

شمع رواں کے صحن روشن ستارے
ہیں قدرت کے مصور کے چتارے[۳۹۵]

کوئی مجلس زمرد لے کے باکل[۳۹۶]
کوئی لے بارکش شبرنگ[۳۹۷] کاکل

سب ہی اسباب حاضر لا مثالی
نظر مسند نشیں کی جائے خالی

زمرد سے دے کل انجمن سبز
دگر ہے فرش ومسند اور صحن سبز

نہ آئے صحن کی سبزی بیاں میں
وہی پرتو نظر ہے آسمان میں

ہے وصف حوض میں دانش گریزاں
خرد اس راہ میں افتاں[۳۹۸] وخیزاں

ہیں گرد اس کے زمرد طور[399] عمارت
ہے جوہر سبز مرآت میں بہ حسرت

ص۔21 اٹے ایسا کہ ہے دنیا میں نایاب
فوارہ عنبرو کا نور کا آب

دے سیراب تر خنداں ہو گلزار
شگفتہ ہیں ہر یک گلبن[400] ازہار

زمرد کا جو ہے براق تر کاخ
زمرد رنگ ہیں سب برگ اور شاخ

دے یک سر درختاں زمرد
شجر گلشن ہوا کان زمرد

ہوئے سب گل سے شبنم چشیدہ[401]
سر وشمشاد ہیں قامت کشیدہ

زمرد رنگ شاخوں پہ جو عنبر
ہے چشم سبز رنگ عبہر پرور

ادھر گل جوں عذار[402] مہ جبیں ہے
ادھر سنبل کے زلف کا قریں ہے

کھڑا لالہ لے ساغر بن کے ساقی
ہے بزم گل سحر ہے یار باقی

نوا شیریں پرند بولتے ہیں
کہ فی آئیں میں خوش مرغولے[403] ہیں

شہر جو آب شیریں کے ہیں سلسال
نہاں خانے کے اس کی صفت میں لال

کنارے حاشیہ اور سنج زمرد
شجر اگاز[404] میں سے بیچ زمرد

ہیں رعنا سبز و سیراب و ثمردار
ثمر ور خوشہ خوشہ نخل و اشجار

ہیں میوے جوں شکر اور شیر شیریں
کہ ہے سوز[405] و کنار[406] انجیر شیریں

معطر ہیں شجر بالا و پائیں
ثمر فرش زمیں ہوگئے خوش آئیں

زمرد پوش سبز اندام گل رو
کہ لب یاقوت عنبر بیز گیسو

کریں با یک دگر فی آمد ورفت
زمرد کے ہو سب زیور سے ہر[407] ہفت

نکلیے ساخت[408] خوشتر زمرد
فلاخن کے ہیں سنگ یک سر زمرد

اڑاویں لنگ[409] اور تا[410] دے مار
کہ مرغاں نہ دھریں میوے پہ منقار

خیاباں ہے زمرد کے جو ہر شمار
زمیں پہ کر دیئے جوں نقش زنگار[411]

فلک زادی چمن کا کر تماشا
کہیں صنعت جو ہے حق کا تراشا

زمام[412] قدح[413] و علی البداق[414]
عظیم الصانع[415] الکل الصناع

چلے زیب دیا کر دے ہر طرف
رقم کر لوح دل پہ حمد کے حرف

ہوتی جب قطرہ[416] فن مقصد کی مدبر
ہے عالی شان دیکھے پنجیں در

کہ قوم رانج[417] مت اس پہ تعیین ہے
قوی ہیکل محیج[418] و مشکلیں[419] ہے

از اں جملہ کہا ایک پیش آکر
نپٹ خاطر جو اپنے جلیس[420] لا کر

کدھر ہے ہوش اے ماما شیفہ
اگرچہ شکل میں دقی[421] ضعیفہ[422]

ہے عاجز اس مکاں میں رستم وزال
کہاں تیر اگز رائے خلوت ڈال[۴۲۳]

ملک زادی کبھی خاطر ہو برہم
اندیش[۴۲۴] دل پر دکھ[۴۲۵] تو مرہم

ہوئی بیٹے کی خاطر نقص حرمت
و لے اس بات میں مایوس کر مت

ص22 کہی جب پیش دتی کے کنیزاں
کر اے نادان عزو بے تمیزاں

ہے اس اقلیم کی یہ شاہزادی
سرزنش[۴۲۶] و ملامت تمہاری[۴۲۷]

زبان دھو آپ ساچشمے سے خور کی
کر باتاں[۴۲۸] اس کی کرشتایو خور[۴۲۹] کی

پر ستاراں کی سن کر خوب تقریر
سخن سچی کریں جوں شکر و شیر

دگر در پر کہا جا مرد رستم
واں سے گئی خبر تا باپ بلغم

سنی جب کام کندلا نے یہ تبیاں[۴۳۰]
لیا پروانگی دربان اسی آں

پرندے کی طرح پرواز کر کر
تکم پہنچا دیا آواز کر کر

ملک زادی ہوئی مسرور سہور[۴۳۱]
چلی در گاہ حق میں ہو کے مشکور

محل الماس کا دلچسپ جا ہے
کہو قصر جناں[۴۳۲] اس کا بجا ہے

نصب ہیں سب دروددیوار ہیرے
درخشاں تر ہیں جوں سیار ہیرے

سب ہی ہیروں کا دستا لمعت تاب
مرصع کا رسب ہیروں کے ہیں ایب[۴۳۳]

قلابے ، قفل اور کل میخ ہیرے
سب ہی ہیروں کے ہیں حلقہ زنجیرے

نصب الماس کر کر ایک غرفہ[۴۳۵]
بنائے نقش نادر طرز طرفہ

منقش خوب ہیروں کی زمیں ہے
کہ ہر یک خشت جوں نقش نگیں ہے

کہ جیوں آئینہ دیکھ الماس کی خشت
بنے پر تو سے خوش روصورت زشت[۴۳۶]

ہے چھت جھار کے تئیں الماس دوراں
فلک پر جیوں کو اکب ہے فروزاں

بساط خسروی پاکندہ اس پر
کہ ہیرے جا بجا تا تابندہ اس پر

نہ ہو صفت صدر ہیرے کی تقریر
دیگر ہے فرش پر ہیروں کی تحریر

جو ہیں الماس کے قندیل مصابح[۴۳۷]
نہ ہو معلوم فرق لیل و صباح[۴۳۸]

نصب قندیل کے اطراف ہیرے
شمع ولاں[۴۳۹] پو تاباں صاف ہیرے

کھڑے لے خوش پچھن سندر نگاراں
ہیں تن پر زیوراں ہیر(ے) کے ہاراں

پیالے سے کے شربت کی کٹوری
لے ہیروں کی صراحی آب خوری

کوئی ہیروں کے دستے کے چنورے[۴۴۰]
کہ تن ہیرے کے زیور سے سنورے[۴۴۱]

مصفا تر نگین کر فرش خشتی
نصب ہیرے ہیں جوں نگین بہشتی

ہے کس میں حوض کے صفتوں کی مقدور
کہ ہیں یک رنگ ہیرے چشم بددور

معطر مغز ہے جن و بشر کا
جو اڑتا اس میں فوارہ عطر کا

تک اب نظارہ' گلزار کر لے
تماشائے گل و ازہار[۴۴۲] کر لے

کھلا[۴۴۳] ہر طرف نافرمان لالہ
کہ یک شاہد دگر دیتا پیالہ

کہ یک ہے زیب بخش محفل گل
دگر ہے ساقی ساغر وہی مُل[۴۴۴]

ص 23 لباس قمری میں یک باطرب ہو
ہے دیکھے داغ دل سے مضطرب ہو

نہیں[۴۴۵] دائم زمانہ یک لائیک و تیرہ
ہے یارو ایک کوں دیگر سے خیرہ

جو ہیں باہم چمن کے گل و سنبل
پریشاں یک دگر فرحت سے ہے کھل

نپٹ ہے سر جھکا شاکر بنفشہ
عطا اس کو ہوا خلعت بنفشہ

صنوبر کے ہے حق میں دار[۴۴۶] ہو شاخ
شگفتہ دل جگر[۴۴۷] پہ تک ہے سوراخ

سرو آزاد بے فکر و خلل ہو
ہے نرگس سرنگوں اور منفعل ہو

عنادل طوطیاں کہتے ہیں تکرار
تحامد یا اللہ الوحش و اطیار

مقید چاہ کا پانی مہ سال
چمن میں خوش گوارہ[۴۴۸] نہار مسلسال[۴۴۹]

کہاں تک ہیرے کی توصیف بولوں
سخن کو سنگ سے ہیرے کے تولوں

کوئی سمجھے نہ سمجھے بات پچ کر
بنائے گنج کو سب الماس رنج[۴۵۰] کر

شجر جو باردور مثمر وہاں ہے
کہ طوطا[۴۵۱] و صف میں رطب اللساں ہے

ہے گرما سنگ طرح کیوں ترش رو
انار و سیب گل اندام خوش رو

نہایت[۴۵۲] ہے ترش رو تندخو واک
کہ ممتاز شیریں کام ہو تاک[۴۵۳]

عجب تر بوز میں صفت آب رنگ کی
ہے صورت نیک سیرت[۴۵۴] بد شرن کی

جو زرد آلو ہے رشک شکر و قند
لیا صفت خراش دل زمیں کند[۴۵۵]

زمانے کی دورنگی بس ہے بے حد
کسی کو نیک ثمر، کس کو ہے بد

کر اب ذکر پری رویاں کو آغاز
کریں جو میوہ خور مرغاں کو پرواز

کچھ خوش زلف چنچل ناز ڈالے
جو دیکھے زاہداں زنار ڈالے

کھڑے ہیں ہو کے زیور پوش الماس
نیلاں ناز ہے جن پھول میں باس

لیے[۴۵۶] ہیرے کے ٹھلیے اور قلولے
کریں الحان خوش جیسے ممولے

اڑاویں مارشتاں[۴۵۷] کر خوش آواز
کریں مرغان ہوا خوار پرواز

بنے ہیرے نصب کے سب خیاباں
ہیں پر تو سے درختاں نور یاباں[۴۵۸]

جو وہ زیب سریر بادشاہی[۴۵۹] ۔ کر(یں)سب سیر کر حمد الٰہی
ہے تیری صنعت قدرو قضائی ۔ بشیرا احرزٗ لا انتہائی

رسیدن ملکہ زمان بہ در خشم

چلی کر ہوش پیراں[۴۶۰] عقل کو گم ۔ ہوا دروش جب دروازہ خشم
واں چوکی ہے اردہ بیگنوں[۴۶۱] کی ۔ زنان مرد وش شیر افگنوں[۴۶۲] کی
اگرچہ فی الحقیقت میں زناں ہیں ۔ ولے مرداں شکن روئیں تناں[۴۶۳] ہیں
کہی یک روز جلدی دیکھ کر تی ۔ جسیم و جلد رو[۴۶۴] مانند تیر تی
ص-24 چلی آتی ہے بے شک ہو ز را ہوش[۴۶۵] ۔ بہ ایں شکل و شمائل چہ تیری جوش
ملک زادی کے ہوئی دل پہ ملالت[۴۶۶] ۔ سنی جب اس کی عثمان جہالت
کہی افسوس ہے اے ابن جاہل ۔ تیری باعث سے کلمات تجاہل
سنی ہوں آج ان نا محرماں سے ۔ لگے جوں تیر جھٹ آری کماں[۴۶۷] سے
پرستاراں کہی جب اے زناں ہو ۔ کہ تم کو ہوش ہے یا کودکاں ہو
جو دتی ہو صرف تم شکل میں بچ ۔ نہیں ہے ہوش اور عقل و سمجھ کچھ
ہے رونق بخش اور تگ جہاں دار ۔ کہ جس خاتون کی ہیں ہم سب پرستار
ملاقی کام کندلہ کی سے ہوئے ۔ چلی آشفتگی خاطر سے دھوئے
درخشم پوچھا بولی وونے[۴۷۰] نے ۔ جو حائل ہوئے تھے اردہ بیگنے نے
ترت وں سے بیان تا کام کندلہ ۔ جو پہنچا ہے ملک زادی کا جملہ
حکم جب کھول کر شکر لباں کو ۔ دی آنے کو تئیں ملکہ زماں کو
ملک زادی نپٹ ہو راحت انگیز ۔ ولاج دل[۴۷۱] میں ہو فرحت سے لبریز
ثنا کی ذرازی میں دل کے سفتہ ۔ کرے ہو غنچہ خاطر شگفتہ
گئی جب بولنے کو جاؤ دل حمد ۔ کہی ہر نو زباں[۴۷۲] ہو اللہ الحمد
گل رو کو دیئے آب و رنگ گلگوں ۔ چلی جب کاغ لعل یکرنگ گلگوں
جو دیکھی اور کہی لعلوں سے درخشاں ۔ ہے کاغ کام کندلہ یا بد خشاں
مگر چرخ بریں سے حق نے مصدور ۔ کیا ہے گازمیں پر قبہ نور
لعل یا دیدۂ خوبان انبوہ ۔ ولا قدرت سے اکالعل[۴۷۳] کا کوہ
کہاں سے ایسے ہیں براق برق ہیں ۔ مگر پر تو اسی کا ہے شفق میں
ستون لعل جوں گل ہوکے ہیں ساق ۔ ہے جیوں ہوئے حوراں لعل کے طاق

نہ شک شاہ بدخشاں دیکھ یک لعل
رہے آتش[۲۷۴] میں ہو دیوانہ جوں نعل[۲۷۵]

لگے اس طرح کے لعلاں جہاں ہیں
فریفتہ کیے سلاطین جہاں ہیں

ہے سب لعلوں کے دروازے دریچے
بجے زنجیر جوں بولیں سرپیچے[۲۷۶]

جو دیواراں اوپر گل لعل ہی لعل
چمن میں جوں کھلے گل لعل ہی لعل

کہوں کیا چھت کی میں لعلوں کی تفصیل
فلک پر جوں کواکب کے ہیں قندیل

ہے فانوساں فتیلہ سوز روشن
شمع واں انجمن افروز روشن

ہیں سب نادر تراش لعل رخشاں
مجا(ں) سب منور ہے درخشاں

بچھا ایسا بساط خسروانہ
نہیں زیر فلک دیکھا زمانہ

کہ جو ہر تار کو لعلاں ہیں سفتہ[۲۷۷]
جیسے حوراں کریں زلفوں سے رفتہ[۲۷۸]

ص۔25 ہیں خوباں کے گلے لعلوں کے مالے
بلور[۲۷۹] کچھے صراحی لے پیالے

نہایت خرم[۲۸۰] و شاداں طرب سے
ہیں حاضر دست بستہ ہو ادب سے

کھڑے خاموش جوں تصویر قالین
لب لعلیں ہے زیور تن پہ لعلیں

صحن سرخ یک سر رشک چندن[۲۸۱]
قصب ہے لعل یا لعلوں کا معدن

بدل حوراں کر لے صنعت چتیری
صحن میں حوض یا لعلوں کی ڈھیری

لگے ہیں چو طرف لعلوں کی تختیاں
تمنا جس کی[۲۸۲] رکھتے ہیں بختاں

اڑے فوارے نکہت بخش مادام[۲۸۳]
گلاب و بید مشک از صبح تا شام

چمن رنگیں ہے فصل نو بہاراں
گلاں گلچین پہ جیوں لعلوں کی ہاراں

شگفتہ مثل ساغر ہے گل سرخ
نمایاں اس پہ شبنم جوں مُل سرخ

ہے ریزاں[۲۸۴] سرخ گل ہر جا پو سوسو
پڑا ان پہ شکر لعلوں کا پرتو

چمن رنگیں شگوفے گل ہیں رنگیں
سمن نسریں ہزارا[۲۸۵](ں) گل ہیں رنگیں

کہیں ہے سر بلند تر سرو آزاد
کہیں ہے منفعل ممتاز شمشاد

کہیں خوش چشم ہے گلشن میں عبہر[۲۸۶]
کہیں عرعر[۲۸۷] کہیں سوسن صنوبر

کہیں گل چاندنی اور نارون[۲۸۸] ہے
شگفتہ نسترن رشک پرن[۲۸۹] ہے

جو ہیں طوطے ممولے سب نواسنج
چمن میں کبک وطاؤساں اواسنج

کریں نغمہ پہ چنڈول[۲۹۰] اور بلبل
بنے جیسے روضہ رضواں کے ہیں گل

عجب شیریں ہے آب رود باراں
تصدق قند و شیر اس سے ہزاراں

بنے لعلوں سے جو اس کے کنارے
ہے خط استوا پر جوں ستارے

رہے اس آب میں بوئے گلابی ہے رنگ لعلوں کے پر تو سے شہابی

کھلیں جب واں کے میوے کی رطوبت زباں[۴۹۱] شہد وشکر لے عذوبت

ثمر بے دانہ و انگور و انجیر ہیں پر ورنہ بجائے آب دے[۴۹۲] شیر

جو شیریں سیب ہے رشک سمرقند[۴۹۳] حلاوت بخش جاں مثل شکر قند

ہیں خوباں لعل لب اور تن اوپر لعل فلیلے اور قلولے یک سر لعل

چاہیں یوں[۴۹۴] کہ ہے وصف عواقب[۴۹۵] اڑے لعلاں چمک جوں نجم ثاقب

وہی ان شاہدوں کی صفت بولے سخن[۴۹۶] تولے جولے لعلوں کے تولے

وہاں کے دیکھ لعلوں کے خیاباں چھپے پالے میں غولاں[۴۹۷] ماہتاباں

نہایت ہو عجب ملکہ زمانی عفیفہ صالحہ مریم نشانی

جو دیکھی صنعتاں خوش اس زمیں کی تجلی لعلاں عقیدت اور یقیں کی

کہی اے خالق ارواح اجسام تصدق ذات[۴۹۸] کن درک[۴۹۹] الہام

ص۔26 فتوح[۵۰۰] مخزن ثمث[۵۰۱] سوالیہ کریں تجھ یہ قدرت کی نکالیہ[۵۰۲]

تجلی ہو معترف و حدانیت کی تصدق میں تیری یزدانیت کی

دیدن[۵۰۳] ملکہ زمان بہ دریتیم

ہوا درپیش واں مقصد کا اسباب رفیع الشان عالی المعنی باب

نشیں[۵۰۴] خوبہ ہیں منظور خداوند یہی[۵۰۵] باعث کہ ہیں بھی دستہ باطلہ

کہاتب پیش آکر ایک خوجہ ہو جوش چشم جوں دریا میں موجہ

ضعیفہ ناتواں ماما حقیرہ سمجھتی ہے نہیں آتی ہو خیرہ

کہ عاجز اس مکاں میں مرد ہیں سب قوی روزگرداں[۵۰۶] گرد ہیں سب

ہو ابد گفتگو نے زشت اطوار گل شاہی کے میں خارج کرے خار

کنیزاں کر سخن کو شکر آمیز ملک زادی کے مقتوں میں گہر ریز

کرے تا جلد درماں ہو باہم گہر دامن میں صحن[۵۰۷] کی فراہم

ترت جا نیچ کرتا خاص بیگم لے آئے جلد حکم کام کندلہ

ملک زادی بجا لا سجدۂ شکر دی تب دل کو اپنے مژدۂ شکر

چلی دیکھی تکہ جو چو طرف کر تماشائے فضائے باشرف کر

ہے مثل بحر آب خوشگوارہ عمیق وصاف ناپیدا کنارہ

جو دیکھی ہو کے حیراں ہوش کر گم یہ ہے در یا چہ یا ہے بحر قلزم

قلنگ[508] و بوزہ[509] و سر خاب لک لک[510]
سفا مرغ و بطبچ[511] کاقشاں[512] ہے لک لک

عجب ہے طوطیاں سوائے اس شمار[513]
زمرد کی ہیں یا لعلوں کی منقار

کہوں کیا صفت میں بے حد سفینے
نہ ہو شمہ لکھے کوئی صد سفینے

مرصع نورتن کی سب ہیں کشتیاں
بچھانے کلغک[514] جنت گر بہشتیاں

سفینے خوب پانی مثل شط[515] ہے
شناور جوں کہ رنگیں بال بط[516] ہے

منقش سب پو بنگلے نو رتن کے
ہر یک گل جس اوپر سو سو رتن کے

نصب محقق اوپر لعل و گہر ہیں
ستوناں سب تراش یکم وزر ہیں

زمرد کے رواق الماس کے در
گہر کی چھت پو آویزاں ہے جھالر

ہے ہر جا لعل و گوہر بے مثالہ
کہ جوں ہم دوش ہیں لولو و لالہ

لعل کے شمع دان ہیرے کی قندیل
نمایاں صانع قدرت کی تکمیل

دیے ترتیب جو واں فرش عالی
ہے تاباں جس پو تحریر تو آلی؟

مگر خالی جواہر کر کے براق[518]
جہاں کے معدناں[517] اور کان آفاق

ص۔27 بناتی اس محل منبوتاں کو
کہ لائق ہے غرض شاہتاں کو

ازاں جملہ مکلل کشتی خاص
جو ہیں حوراں خوشی سے دیکھ رقاص

ہے بنگلہ[519] اس پو نکہت بخش جس کا
معطر مغز ہے شوق و ہوس کا

مہیا اگرچہ اسباب حیاتی
ولے ہے خاص حجرہ صوفیاتی

سفید اس پو ہے چھت جوں ابر رحمت
تکیہ سے ہوئے دفع رنج و زحمت

گہر تاب اس پو فرش چاندنی ہے
دو ہفتہ شب کہ گویا چاندنی ہے

واں وہ ماہ تو خوش چشم شاہد
کرے قرآن تلاوت مثل زاہد

فرشتہ طینت و زاہد اطوار
جمال پاک پرتاباں ہے انوار

کریں جوں خاص حق کی راہ بینی
کہ گویا عابداں عزلت[520] نشینی

رکھی تا اس کو وہ نور غرایب[521]
مگر یک دن دیگر یک مصاحب

گئی دایہ سے وہ عصمت قبایہ
کرے خاوند سے جا عرض دایہ

کہ آئی آپ چل ملکہ زمانی
ملاقی ہو کے پانے شادمانی

کہ میں اس باب میں ارشاد پاؤں
ملک زادی کو جا کر پیش لاؤں

رخصت دی حکم اس کو کرا جاہت[522]
وہ شمع محفل حسن و وجاہت

ملک زادی نے حق کی کر ستائش
ہوا جب باب مقصد کا کشائش[523]

جو دیکھی جا کے اس دل خواہ رو کو — پری وش مہر سما(ں) ماہ رو کو

ہے ظاہر صولت و رعب و صلابت[۵۲۴] — نمایاں لمعت نور مہابت[۵۲۵]

چلی آہستہ دیکھ اس کی شہامت[۵۲۶] — عقب مسند کے ہو بے استقامت

کھڑی آ پیش دایہ دست بستہ — نہالاں کر ادب کے دل میں دستہ

ملک زادی تھی آئی تاج سر ناز — سلام بانیازی سے ہے ممتاز

شکر لب ہو گفتار[۵۲۷] و خوش الحان — یہ سنتے ہی ترت مصحف کو گرداں

جو دیکھی کر نگاہ نرگس نین سے — ہوا رسم سلام اول دوتن سے

گئی مقصد کو استفسار کرنے — سبب آنے کا اظہار[۵۲۸] کرنے

کہی ملکہ زباں شیریں بچن سے — نکالی گوہراں ڈرج[۵۲۹] دہن سے

ہزاراں دعوتاں کر آرزو گل — کھلا امید کے گلشن میں یک گل

بہار نوجوانی اس پہ آغاز — سخن و ریختہ گوں میں ہے ممتاز

فروغ محفل رنگیں قلوباں — ہے گیسوئے معبر[۵۳۰] دام خوباں

ہے باہم خط و عارض جوں صبح و شام — مہ انوار خوبی کامران نام[۵۳۱]

ہوا کب اسپ خوش رو پہ کرے چال — بچارا رستم اس اگے دے زال

ص۔28 جو دیکھے اس کی گر مژگاں کے خنجر — لگے صد برگ کو صد جا پہ نشتر

صنوبر تار تار اور چاک دل ہے — سرو حیرت سے قد کے پائے گل[۵۳۲] ہے

سنا جب سے ترا وصف حمیدہ — اہے بے خواب و خور قامت خمیدہ[۵۳۳]

تری سب خوبیاں روشن جبیں کی — پہنچا نیا شکل سے ماہ مبیں[۵۳۴] کی

ترے عارض کی خوبی گل سے سن کر — بیان زلف کو سنبل سے سن کر

ترے ابرو کی صفتوں کو جو پایا — ہلال عید نے شایع سنایا

صفات دل پذیر اس خوش نین کے — مگر پوچھا ہے نرگس سے چمن کے

لب شیریں بیاں رشک شکر کو — جو پایا پوچھ کر عناب تر کو

زنخداں کی کرے ہر آن تعریف — سنا ہے سیب سے شاید کر توصیف

تری اس طوق غبغب کے بیاں کو — جو پوچھا ہے مگر جا قمریاں کو

کہی ہو لقمہ خوں خوار چشتی — پڑی جو میان پا در چشتی[۵۳۵]

سناوے روز صفت شاق[۵۳۶] و پا کر — بلور صاف اور فندق[۵۳۷] سے پا کر

ملک زادی زباں کا کھول کر گنج — ہوئی جب کام کنلہ سے گہر سنج

کہی، سن کر ہو متوجہ زیادہ / مگر ہے اس کی شادی کا ارادہ

کہو ہیں جملہ ہر سو بات انساں / چہ اعلیٰ اوچہ ادنیٰ ذات انساں

ولے اول جو میرے شرط ہیں تین / قبولے گرچہ رکھ کر دل میں تسکین

ہے پہلی شرط یہ میں نہ کروں بات / خوشی لیے رہوں تا دام اس سات[538]

کہوں نا کھول کر شکر لباں کو / سناؤں نا کلام اس نوجواں کو

دوئم[539] وہ بلبل مشغوف[540] وشیدا / نہ دیکھے صورت گلگوں ہو پیدا[541]

سوم ہے شرط لاتی ہوں بیاں میں / رہوں نا شب کو میں اس کے مکاں میں

ملک زادی کہی رخصت ہوجاؤں / یہ سب شرطاں(ں) پسر کو میں سناؤں

یہ کہہ یک آن نہ دی دل کو فرصت / چلی تب کام کندلہ سے ہو رخصت

رخصت شدن ملکہ زماں از کام کندلہ و مراجعت نمودن بدولت خانۂ خود

اول آئی تھی سختی کھینچ نہایت / ہلاکت محنت وشدت نہایت

چلی آپ بیٹھ ڈولی خوش رواں پر / پلک مارے تلک پہنچی مکاں پر

کھڑی جا شاہ کے آگے ادب سے / ولے باہم ہے دل فکر و طرب سے

کہا مہہ اے پسر عصمت قبایاں / بہم فکر و طرب تجھ پہ نمایاں

گئی میں ہفت در سے پار ہو کر / کہ دل پہ زندگی دشوار ہو کر

جو دیکھی شاہد مقصد کی صورت / ہے تب فرحت بے حد کی صورت

فکر اس بات کے خاطر ہو جملہ / کری ہے تین شرطاں کام کندلہ

کہی نا کھول شہزادے سے لب کو / رہوں نہ اس کے گھر ہر چند شب کو

دکھاؤں اس کو نا کچھ حسن کا لمع / رہوں اس طرح جیوں فانوس میں شمع

عجب کچھ شوکت و تمکین واں کے / کہ ہوئے ہوش گم شاہ چیناں کے

شہہ اورنگ تمکیں دارائے داور / ہو اس بحر حیرت کا شناور

کہا تب اس گل خوبی کا اسرار / کرو سب بلبل بے دل سوں[543] اظہار

رفتن ملکہ زماں بار دیگر پیش کام کندلہ مع نوشیرواں و طلبیدن شاہزادہ و عقد و شادی

ملک زادی یہ سن کر ہو شتاباں / پری رو کے سوالاں اور جواباں

کہی ذرہ بہ ذرہ سب پسر کو / وہ بحر عشق کے تاباں گہر کو

بلائے جان خوباں شاہ زادہ / کیا تب خورے کا نوش بادہ

جو سمجھا اس قدر بھی منتظم[544] کر / ثبت شرط ثلاثہ[545] مر قسم[546] کر

گیا لے خامہ مرجان دستخط — لکھا اس ایک خط کو جان دستخط

چڑھا وہ ذر کوش آویزے لے کر — دے کر قرطاس دستاویز[547] لے کر

چلی ملک زما(ں) باقر شاہی — کیا جو یاوری فضل الٰہی

قبولیت کو شرطوں کے سنوارے — چہرہ وہ زیور درخشاں بنادے

دیے تب حکم شادی کر اجابت — وہ تاباں اختر برج نجابت

دیے فرماں مصاحب کو بلا کر — تیاری جلد کر ہر جنس لا کر

کرو ا کر دفتر گاں لعل و گوہر لے — کھلا صندوق زر کے سیم و زر لے

مہیں تر توشے خانے سے لے ہر باب — سمور[548] و قاقم[549] و دیبا[550] و سنجاب[551]

حریر[552] اطلس مشجر[553] چند اقسام — تصدق[554] چینی کے خوش[555] باف و دسام[556]

کر گندم اور برنج انبار خانے — کھلا لے ہر جنس کھانے کھلانے

گلفر، دار چینی[557]، قاقلہ[558]، جوز — کر مغز پستہ اور بادام ہے لوز[559]

غرض شادی کا تھا آغاز و انجام — سما اس حکم کے پایا سر انجام

ادھر دیکھو تو شاہوں کا ہے اسباب — کی کس چیز کی تھیں فکر کس باب

مکلل زیوراں پیرایہ تن کے — در لعل و جواہر نورتن کے

لباساں خلعتاں زربفت گلفام — جہاں میں جو کہ ہیں اقسام و اقسام

گلاب و مشک و عنبر اور عطر سب — عبیر و صندل عود و اگر سب

معطر کر زمیں پہ خاکیاں کو — مہک پہنچی ہے جا افلاکیاں کو

نہیں اب میں کہاں تک اس بیاں میں — نہیں پایا جہاں کے خاکیاں میں

ص۔30 ہے آگے فکر اسباب ضیافت — کر گھر و گگن[560] کی بزم با لطافت[561]

بزم ضیافت خانۂ عروس

ملوس ایلچی گلگوں رنگیں — چلائے رقعہ مضمون رنگین

امیراں، عمدگاں، وزراء، اکابر — دیا دو عالم و درویش صابر

خواص و عام ہم خویش و قرابت — کرے ہو شادیل صادا[562] اجابت

درخشاں تر بساط ماجتابی — در و دیوار سب رنگیں شہابی

نصب لعل و گوہر الماس ہر ٹھار — دسے سنج سما پہ جوں کر سیار

مرصع کے شمع داں ہے فروزاں — فتیلے جن پہ کا نوری ہے سوزاں

اڑے فوارہ حوض خوشتر یں کا — گلاب و عطر و مشک و عنبریں کا

جو پہنچا رسم نوشہ کی طرف سے
کر رقص و نغمہ و عزو شرف سے

ہوئے محفل نشیں سب اہل موعود
ہوا فکر و خلل کا باب مسدود

کمر بستہ کھڑے سب اھائی
کہ جن سے بزم پائے انتہائی

لے آئے آفتابے آب بھر کر
سب ہی عطر و گلاب و ناب بھر کر

جو فارغ ہوچکے ہاتاں[۵۶۳] دھلا کر
بچھائے نطع[۵۶۴] رنگیں لا کر

لگے دھرنے کئی مکس خوش طرز لوزے
مرصع کی رکابیاں اور کٹورے

جو بھر کر قصب سونے کے تھالے
بھرے جن سے بلوریں سب پیالے

کہوں کیا خوش طعاموں کے بیاں کو
قلم عاجز نہ طاقت ہے زباں کو

تجن[۵۶۵] اور بریانی مزعفر[۵۶۶]
طلائی ورق سے ہے شیرازگر[۵۶۷]

ہے قرص[۵۶۸] و شیر مال و گاؤ دیدے[۵۶۹]
کلچے، فیرنی، حلوے ملیدے

مشن قورمہ[۵۷۰] و شامی نمکین
کہاں شاہوں کو ایسا بزم نمکین

تناول کر چکے سب اہل ایماں
ہوا دور آب رنگ آب حیواں

ہوا بعضوں میں دور جام بادہ
کرے من بعد و دختر خواں زیادہ

ترت فارغ ہوئے ہاتاں دھلا کر
معطر بیسن اور گرم آب لا کر

دھرے ہے پان داناں اور لوز
قلفہ[۵۷۱] خوب کھا رولیا دگر جوز

بجیں باجے نئے ترا رخواں ساز
ڈہل[۵۷۲] دہربائے[۵۷۳]، طبلک[۵۷۴]، نے خوش آواز

ہے رقص لولیاں[۵۷۵] اور تال مردنگ[۵۷۶]
سرود و بربط و تنبورہ و چنگ

کہیں شادی مبارک تم کو جم جم
بجیں گھنگرو جھیرے[۵۷۷] ساز چھم چھم

لے رخ پہ ہو بزم افروز روشن
عروس شب نقاب روز روشن

دیا جب قرص خور بانور لمعت
سب اہل بزم کو دیئے پان رخصت

ص۔31 اجازت پا چلے سب ایک باری
شراب و خواب کے ہو کر خماری

چلں اب تو نے بھی اے عباس لے راہ
ہے استدعا دولت خانہ شاہ

در ضیافت خانہ نوشاہ

لڑی کر سعد مضموں کے گہر کی
ضیافت کر بیاں نوشاہ کے گھر کی

بہار گلشن کشور کشایاں
جلالی المسر فرماں روایاں

خدیو[۵۷۸] کام بخش عادل جہاں دار
دلاور داور دارائے دادار

ہوا جب بزم آرائے ضیافت
کیا عالم سے دفع رنج و آفت

ہوئی یک ہفتہ متواتر منادی
کہ سلطان زماں کے گھر ہے شادی

جہاں شہروں کے سب جمہور اسلام
بزرگ و معتبر ہم خاص(و) اور عام

کہ آتا بزم اور شادی طرب ہے
نہ جانا[579] تم کو واں اکل و شرب ہے

غرض شش ماہ تک تھا بزم فروز
تھی شب جوں شب برات اور روز نوروز

تھے کھانے کئی قسم کے نان کئی طرز
دو پیازے، کوفتے بریاں کئی طرز

رکابیاں ایک سب لعلیں ہی لعلیں
ہے فرش دیبق[580] و نیلک[581] و قالیں

شب دیگ ہے سب بہیں کے اسباب
رکابیاں اور پیالے چمچے و قاب

اسی عنوان سے ہر روز تازہ
تھا سامان ضیافت خوش طرازہ

تھا روز وشب سماع ورقص اوردھوم
تجمل تیل، مہندی رسم مرسوم

قلم پر ذرج[582] لب سے بات کا نقد
کہ اسباب جلو اور جلو ہا وعقد

منادی دن کو ہوئی چار پہر گشت
کہ ہے شہزادہ' نوشاہ شہر گشت

اول بزم ضیافت کو دیے ترتیب
رکھا تک نعمتاں با حسن وترکیب

خبر پہنچا بفر و[583] رونق کل
سماع و نوبت رقص وتجمل

پوشیدن[584] نوشاہ پوشاک وزر و جواہر

ہوئے محفل نشیں سارے براتی
دیگر جو خوش لباساں تھے سنگاتی

تناول کر ہوئے جب سیر و مسرور
ہوئے سب تازہ دل مشکور وافور

جو عنبر بوئے تحسین تربت لائے
گلاب و عطر سے ہاتاں دھلائے

دھرے لا یا صفا طبق برگ مقبول[585]
ہوئے رقاص خوباں شوخ مشغول[586]

ہے سامان شہر گشت آج شہ[587] کا
فروغ رونق آرائش جلو کا

پہنا رخشاں زری کا تن پو جامہ
مکمل لا دھرے سر پو عمامہ

تجی جیغہ[588] قلم[589] کے اور سر پیچ[590]
کہ دل حسرت سے ہو خوباں کا پیچ[591]

جو رنگین گوہریں زریں کمر بند
بہ ازاں سوگر[592][593] کے دل کو کر بند

لیے پوشاک عالی قیمتاں کے
گہر خالی خزائن کر جہاں کے

ص۔ 32 تھے ہاں گوہریں لعلیں کے پنچ[594] بند
جواہر بے بہا سب تن پونچ بند

نپٹ براق ہیرے کا پرک[595] ہے
درخشاں تر گہر شمس[596] فلک ہے

جو زریں سہرا با نور تن ہے
ہالاں ماہ پر گویا کرن ہے

تن تکلوں جواہر سے چلے بند
مکمل باندھ کر زریں علی[597] بند

لگائے جوش قبض ورستہ زر   کرے سیمیں بدن کو بستہ[598] زر

صفت سواری اسپ نوشاہ

پری پیکر عیار نادر خوش رو   تن تازی[599] نسب گلگوں خوش رو
ہے نازاں ابلق[600] لگام اس سے   لیا ہے برق جلدی وام اس سے
زمرد لعل وزرکے سُم ہیں اس کے   کر زریں مُو عیال[601] و دم ہیں اس کے
ہوا راکب جواہر کی جودھر زین   لے ساتھ ارکان دولت کو بہ تزئین
جہاں صف بہ صف پوشاک رنگین   ستارے جوں ہیں برافلاک رنگین
بہار ہمیں ایام جوانی   قبا زریں ورنگین زعفرانی

در بیان روشنی و مشعل

جو مشعل ہر طرف روشن یکاں[602] ہے   زمیں سب رشک صبح آسماں ہے
شب شب گشت شاہ خسروی تخت   جوں سال وجواں دولت جواں بخت
مہ و خورلے کے کچلول[603] گداتی   مشکیں[604] بھیک اس دین کی روشنائی
دے نوشہ فروزاں مشعلوں میں   ہے گویا ماہ روشن اختروں میں

در بیان آرائش چمن گوید

دوجانب رنگ برنگ تختے چمن کے   رہے گلشن میں جوں کر انجمن کے
عجب کچھ گلشن مقراض کاری   شگفتہ گل ہیں جوں فصل بہاری
لگے کرنے کے تیئں نظارہ بلبل   کرے نقل نقل[605] پہ قیں[606] کر سہم گل
گل نسرین و نافرمان شقائق[607]   کہ ہے شاہوں کے نظارے کے لائق
صنوبر نارون اور یاسمن[608] ہے   کہ جس سے زینت وزیب چمن ہے
شگفتہ تختہ گل چاندنی ہے   مہ انوار کے گویا چاندنی ہے
گل داؤدی اور شبو ہزارہ   ہے نرگس اور بنفشہ بے شمارہ

در بیان آتش بازی

کراب تعریف آتش بازیوں کی   ہوائی اور ہوا پروازیوں کی
فلیل کٹھرا[609] ہب نشیں ہے   جدھر دیکھو[610] بہار آتشیں ہے
اڑیں جب آتشیں لعان کواکب   نمایاں کیے ہزاراں نجم ثاقب
ص۔ 33 چلے وہ لیتے ہوئے ڈولی ہوا سوار   دے قندیل سے جوں صبح انوار
جو پہنچی آکے محبوب روپوش   کیا بے دل سے صبر و طاقت وہوش

کیا درد تشوق تنگ دل کو
نہ مہر اس پہ ستم گر سنگ دل کو

رفتن کام کندلا بہ گل خود

رواں ہو شاہد مہ آسماں پہ
ہوا ہے جب کہ نور افشاں جہاں پہ

روانہ ہو چلی چنچل چھبیلی
جفا جو پہ ستم دلبر چھبیلی

ہوئی جب رونق افزا اپنے در پہ
نظر معمول و مقدور و قدر پہ

کری اور سب اتاری تن کا برقع
منقش تار زر سنجن[611] کا برقع

تصرف کردی خوبان صف کو
بہ طرح اولین ہر دو طرف کو

تھے آخر دو جوڑہ بجز[612] صاحب[613]
دی دایہ کو اور پالے مصاحب

مزین شب کو کر کا شانہ اپنا
منور کر کے دولت خانہ اپنا

آمدن کام کندلا بہ گل شجر و کامرن

نکل کر صبح کو جوں شمس خاور
چلی کر عزم کاخ شاہ داور

ہر ایک برقع زری کا ایک اوپر سو
منقش بے بہا و تازہ و نو

سب ہی قدیم تن کا ردا پہ اوڑ
ہوئی ہمت زلف عنبریں چھوڑ

جو گئی عہد کی لطافت لوکاں کو
لطافت یک آفت کامراں کو

کہے او نت آہ دلبر ہو کے ہیہات[614]
بلا ہے پہ بلا یہ آمد و رفت

ہے دوصورت میں دیکھو سپنا ضروری
کر لیلی کی بلا ہے وصل دوری

غرض اس طرح سے آتی تھی ہر روز
ستم بے دل[615] پہ کر جاتی تھی ہر روز

لگا گھٹنے کو دن، دن روئے مہتاب
بدل کر رنگ و رونق بے خور و خواب

چلا ایسا خزاں و درد و افکار
ہوا ہے گلشن رخ زعفران وار

کہے کر ترک خواب و خور کو جملہ
ہے کل وشرب[616] نام کام کندلہ

تصور دل میں کر اس کے مکاں کا
ذر و لعل و جواہر کے نکل[617] کا

کر کر صد رنگ سوز و غم سے تن کو
گل اس کا[618] بنا سمجھا و من کو

لگا دیتے یوں رواں کر اشک گلگوں
کر حوض چشم سے فوارۂ خوں

پرت کے داغ سے صدپارہ کر کر
بناوے دل کو لالہ اور صنوبر

بنجھاوے[619] اپنے قامت کو شجر کر
زنخداں سیب، لب عناب[620] بر کر

غرض سوز جگر سے بسکہ رو رو
بنایا تن کے ہیکل باریک جوں سو

دریغا وصل دلبر کی طلب میں
رہا آنکھوں میں دم آجاں بلب میں

ص۔ 34 گل جو شمع ہو حسرت سے باہم | وہ پروانہ صفت جل جائے یک دم
الٰہی ایسے درد آلودہ تن کو | سرشت رنجش و درد و محن کو
نہ پیدا جگ میں کرتا تو بھلا تھا | اگر آخر کو یہ رنج و بلا تھا
دلا اب تو پرت کا ہوا داسی [۶۲۱] | کہ جوں جنگل بھٹکتا ہے سنیاسی
تک اپنے باغ و بن کا سیر جا دیکھ | دوگر کا شانہ آخر کے جا دیکھ

رفتن شاہزادہ بجانب باغ خاص خود

کہے ہیں گلشن آرایاں چمن کے | بہار افزا جو ہیں باغ سخن کے
چلا جب باغ میں وہ شاہ زادہ | کہ سوز و درد کا کر نوش بادہ
واں کا باغباں تھا اعتمادی | اسی [۶۲۲] شب میں ہوئی تھی اس کی شادی
سحر دتی تھی پھولاں گل کے دلہن | جو لے کھانا تھا نوشہ ہو کے خوش من
خبر کوئی دوڑ کر ایسے میں لایا | کہ سیر باغ کو شہزادہ آیا
یہ سنتے ہی اتفاقی [۶۲۳] الفور مالی | کہی دلہن نے کھانا تک بیٹھ والی
کہا تب نقل بند باغ شاہی | کہ آیا سیر کو عالم پناہی
کہاں اب طاقت و مقدور مجھ کو | کہا ہے جس نے یاں ماہور مجھ کو
وہ آیا باغ میں بافرد صولت | کہاں جانے میں اب التوئی [۶۲۴] و مہلت
یہ کہتا ہی جو آیا دوڑ باہر | خراج خسروی گہاں [۶۲۵] سے باہر
لیا ہے جب کہ دیکھا ہو شتاباں | کسوف [۶۲۶] غم کا پردہ ماہ تاباں
ہوا تسلیم کر کر دست بستہ | تحائف باغ کی لا دست بستہ
کہا اے زینت اورنگ شاہی | ترے دیکھے سے دل پر ہوئی تباہی
ہوا روئے مبارک کیوں مہ تبدیل | نہ تھی تجھ رخ سے مہرو مہ کو تعدیل [۶۲۷]
ہوئی شادی بہ فضل ذات باری | تھی انعامات کی امیدواری
کہے سب آرزو دل کی خلل ہو | خوشی سوز تفکر سے بدل ہو
یہ سن گفتار ہو شہزادہ بے تاب | رواں کر چشم سے انجھوں [۶۲۸] کا سیلاب
جو کھینچا آہ سرد آتشیں دم | کہ جوں بارش میں چمکے برق باہم
کیا آہ و فغاں و نالہ فریاد | سنایا قصۂ پر درد کر یاد
کہا تب باغباں ہو کر سوادب | کہ برآوے ترے مقصد کے تیں سب
کروں اظہار ذکر در گزشتہ | اتیت [۶۲۹] اس جا پہ آ یک سر گزشتہ

نپٹ تاراج لے کر خاک ساری　　　نہ کوئی اس کا تھا غیر از ذات باری
تھا اپنے شغل میں دن رین قائم　　　پرستش کی بحر میں غرق دائم
پدر میرا کرے مادام خدمات　　　کہ ٹل جاویں سب کلفت کے صدمات
انت یک روز کر کر لطف بسیار　　　نکالا درج لب سے دُر گفتار
کہ اے خدمت گزار خاک ساراں　　　تو لائق آفریں کا ہے ہزاراں
ہے مجھ پہ حقیقت خدمت کی تری　　　کہ وقت نیم شب تا کر کے دھری
تو آ مجھ پاس کر کر ہوشیاری[۶۳۰]　　　ہے یاں سے مجھ کو چلنے کی تیاری
کرتا کچھ دیوں اس کے جلدی میں　　　جو مقصد پائے گا ہر پیروی میں
جب اس گفتار کی پایا وہ بیرے　　　فراہم کر مسرت کے ذخیرہ پائے
پدر میرا شتاب آیا مکاں کو　　　کہا مادر سے میری اس بیاں کو
اٹھائے جب آدھی رات ہوئے　　　کرتا مقصد کی اس سے بات ہوئے
جو لوٹے خواب غفلت کے کمیں دار　　　سب ہی سامان بیداری کو یک بار
اٹھائے مار کر ہر چند پاٹکاں　　　ہوئے شق ہو غبار فلک پھاکاں
ہوئی آخر کے تئیں لاچار مادر　　　کہ کروں اظہار ذکر در گزشتہ جو
جو دیکھا دل کا خوش گفتار بلبل　　　بہ بہشت کے بہارستاں کا گل
چلا میں دوڑ کر امید انعام　　　کہ ہو تسخیر جس سے خاص اور عام
جو دیکھا کان تجربی[۶۳۱] کا بیرا　　　ہوا مثل خوشتان[۶۳۲] اوج گیرا
نہ سنگ جب رہ سا کالے برابر　　　چلا اڑ کر کے دو بھالے برابر
کہا میں تب بلند آواز کر کر　　　چلے ہو تم نے اب پرواز کر کر
ہوا تھا کچھ پدر کو میرے ارشاد　　　مجھے اس واسطے بھیجا ہو دل شاد
کہا آیا ہے اب تو کر کے دیری　　　بھلا کچھ مانگ لے بخشش فقیری
کہا تب میں نیاز و التجا سے　　　کیا آگاہ اپنے مدعا سے
جو دیکھوں جا کے دل راغب جہاں ہو　　　ولیکن میں رہوں سب سے نہاں ہو
یہ سن کر جلد یک پوڑی دیا ڈال　　　ہے حاضر کام آوے گرچہ فی الحال
کہا شہزادہ کر اس پہ شفقت　　　کیا توں دور اب رنج و مشقت
چراغ دل کا نور افروز ہے توں　　　رفیق ہم دم و دل سوز ہے توں
سچا ہے یار ہم درد و فاکیش　　　جو دیتا مرہم ناسور دل ریش

دیا جب باغباں حکمت کی پوڑی[633]　　　　بجائے شاہی و دہشت کی پوڑی

باز آمدن شہزادہ بگل خود و آوردن اکسیر کیمیا[634] بہمراہ

وہ نور دیدہ سلطان[635] کشمیر　　　　چلا شاداں و فرحاں لے وہ اکسیر

چلا پرواز مثل طیر کر کر　　　　چلا مہ جوں سماں[636] کا سیر کر کر

ص۔ 36 عروس مہر نکلے سے شرق کے　　　　جو نکل دلربا مثل برق کے

درخشاں اور برقع ماہتابی　　　　ہے خوش مہکار عبیر عطر و گلابی

کری تخت زرہ جو کو منور　　　　چلی جب شام ہوئی وہ مہر پرور

ملامت شدن شہزادہ از حکمت اکسیر و نشستن بمکان خود و رفتن مہر لقا کام کندلہ

لگا اکسیر پیشانی کو شہزاد　　　　ہوا جادو[637] میں بیٹھا خرم و شاد

کہا آپس میں کرنے لاگے گفتار　　　　وہ گنج حسن کے گھولے[638] پر دار

دیا شاید کر اب شالوں کا بستہ[639]　　　　وہ باغ شہر کا نقل تازہ دستہ[640]

محافے میں رکھی ہے عشوہ گر ناز　　　　جو دستہ آج ہم کو اس قدر باز[641]

کہی دل میں ہے سب ایسے سیانے　　　　کدھر گئے ہوش بکتے ہو دیوانے

عجب کچھ ہے سمجھ ان کو دکاں کا　　　　یاں شالوں کا بستہ ہے کہاں کا

جو پہنچی اپنے در پر ماہ انوار　　　　دو صف ہو گئیں[642] کنیزاں مثل سیار

چلی ہر دو طرف برقع کو دیتی　　　　تسموں سے کورنش و تسلیم لیتی

کری برقع جو دورہ گئے نہایت　　　　کر دایہ او مصاحب کو عنایت

اتاری جب کہ برقع ماہ پرور　　　　کہ جوں بادل سے نکلے مہر انور

نکل برقع جو دیکھا خوش نین سے　　　　ہوا خورشید جوں طالع دین سے

پڑا غش کھا نپٹ بے ہوش ہو کر　　　　کہ بحر بے خودی کو جوش ہو کر

اگر چہ عشق کا لاگا تھا بھالا　　　　ولے ہر طرح اپنے کو سنبھالا

رفتن کام کندلہ در حمام برائے غسل

اتاری تن کے سب پوشاک و زیور　　　　گئی حمام میں نہانے کو دلبر

گئی نہانے کو سیمیں تن گہر تاب　　　　گلاب و عطر سے آمیز[643] کر آب

جو گل رو نہا چکی باشادمانی　　　　معا شہزادہ پھر یک طاس پانی

جو ڈالا لے کے با دست چناری　　　　نپٹ ہو برہم و درہم پیاری

کہی اے دایہ جی یہ کیا ہے حرکات　　　　مگر کرتی ہو تم ہم سے ظرافات

کہی دایہ بالیوں کیا ہے مقدور / کہ ہوئی مجھ سے گستاخی سو دور [٦٣٤]
دیا اب آب وتاب اس سیم بر کو / جلا دیتے ہیں جوں زر اور گہر کو
جو پہنی اب پا قامت کی تلوار / جامہ پشواز و خوب شلوار

اکل وشرب نمودن کام کندلا

ہوا راغب ہوئی اکل وشرب پر / سرور و شادی و فرح و طرب پر
جتے تو لے دیتے تھا روز کھانا / جو تھا معمول دسترخواں پہ آنا
دو حصہ اس میں سے دایہ کو دیوے / مصاحب کو دو اور دو آپ لیوے
ص۔ 37 اسی عنوان حصے ان کو دے کر / دو حصے تھے جو اپنے آپ لے کر [٦٤٥]
کری جب اس میں یک حصہ تناول / ملک زادہ چلا دست تطاول [٦٤٦]
جو باقی تھا سو یک حصہ لیا زود / ترت کھایا ہے جوں حلوائے بیہود
کہی تب دیکھ دلبر ہو کے برہم / ہوئے لائق ظرافت کے مگر ہم
یہ کیا ہے دایہ جی ہے اختلاط آج / کرے پیدا یہ تازے ارتباط آج
کہی دایہ اے رشک ماہ رخشاں / تصدق تجھ پہ سیارہ درخشاں
ظرافت کی کہاں مقدور طاقت [٦٤٧] / کہاں ہے ہم سری کی مجھ لیاقت

طلبیدن کام کندلا مغز بادام طرفی تحمل

ہو حیرت میں وہ مہر اوج [٦٤٨] بادام [٦٤٩] / منگائی جلد و سرعت مغز بادام
یہ معمول دو آل وقاعدہ تھا / لے آئی ترت جتے بادام کا مغز
دی دایہ کو دو جو تھا وتیرہ / دیگر دو لے مصاحب بے نظیرہ [٦٥٠]
تھے باقی دو کری یک لے تناول / دیگر دو لے شاہزادہ بے تامل
رہا خاموش اس کو نوش جاں کر / جو تھا بے باک اپنے کو نہاں کر
جو دیکھی کر نگہہ مہ روئے بے عیب / کہ دیگر مغز جو تھا ہوگیا غیب
کہی اے دایہ جی یہ کام کیا ہے / یہ ہر ایک کام کا انجام کیا ہے
یہ غلط [٦٥١] آخرش [٦٥٢] دل تنگی ہے [٦٥٣] / نہایت باعث آ تنگی [٦٥٤] ہے
کہی دایہ نپٹ عجز و ادب سے / ہو ترساں شوخ [٦٥٦] چنچل [٦٥٥] کے غضب سے
چندر مکھ چاندنی [٦٥٧] سندر پیاری / کہ ترے سروقد پہ سے میں واری
ہوں حاضر پیش ترے مثل مرآت / میرے سے اس قدر کیوں ہوئے جرأت
ہو برہم قہر سے جوں مہر افلاک / کری لاچار ہو دست و دہن پاک

لگا جلد آفتاب زر کا پکر		کہ جوں دی آب مہ کو چشمۂ خور؟
دھلی دست دامن خوباں کی سرخیل		نیاز و عشوہ خلق پر کریں سیل[157]

میل نمودن کام کندلا بہ کشیدن حقہ

لے آئی حقہ الماس کاری		گڑا کو عنبریں مشک تتاری
لب نوشیں میں نے جوں نیشکر ہو		دسے جوں شاخ پر عناب تر ہو
دگی دلبر جب یک دم کھینچنے کو		ملاقہ[159] ہو سنہ فرخندہ نے کو
لے جلد اس نے کو یک دم آپ کھینچا		کنارے ہو لگے اپنے کو اونچا[160]
سنی بار دیگر حقے کی آواز		کہی اے دایہ کی ہاں یہ ترے ناز
لگی ہمسر ہو اب حقے کو پینے		کیا ہے روبرو ایسا کسی نے
کہی دایہ نپٹ الحاح کر کر		پری روہاں کی اسے سرتاج کر کر
ص۔ 38 جمال وحسن ومحبوبی کی اے کان		نہیں مجھ عاجزہ سے ہے یہ امکان

متوجہ شدن کام کندلا بہ استراحت

ہوئی معروض پر دایہ کی قائل		اٹھی تب استراحت کی ہو مائل
کری جا سیج پر پھولوں کی آرام		کہ جوں گلشن میں گل یہ گل رو دلارام
جو ہوگئے خواب کے نوجاں فراہم		ہوئی تب خنجراں مژگاں کے باہم
ہجابے دل خوشی کا تب نظارہ		لیا تک گدگلی[161] کر کے کنارے
پری دلبر اچھل جوں مقرۂ[162] برق		ہو جبہ چشم سے آلودہ[163] عرق[164]
شکر لب ترش رو ہو قہر آگیں		کدورت و غضب و غیظ و جذب و کیں
ہے خیرائے دائی کی کچھ آج کے کام		مجھے دیتے ہیں یک سر حیرت انجام
کہی تب اے خواتیں کی خاتون		تک اپنے دل میں اندیشہ لیا[165] توں
ہو(ں) میں ایک پیرزال عاجز ضعیف		جو ہوں اس قدر شوخ و (ز)ظریف
پری پر جب پڑھی افسون دائی		دو بارہ خواب کے شیشے میں آئی
کیا جا گدگدی پھر کامراں نے		بہار گلشن شاہزادہ نے
اٹھی پھر چونک اور بیدار ہو کے		نپٹ حیرت میں آ ہشیار ہو کے
تھیرے[166] ہوئے سب دست و پا سنگ		گھڑکنے کو لگی دایہ پہ ہو تنگ
کری تب دایۂ نیکو خصائل		چھبیلی، چلبلی، چنچل کو قائل
جو اٹھ بیٹھی کہی دلبر ہو لاچار		بھلا اس خواب سے رہنا ہے بیدار

طلب کردن راجہ اندر کام کندلا را و آمدن چوب دار

لے آیا چوب دار عشرت کا مژدہ　　سرور و شادی و فرحت کا مژدہ

کھڑا تسلیم کر اور باندھ کر ہات　　مؤدب[۶۶۷] ہو لگا کہنے کے تئیں بات

بنانے قصر عیش و بزم عشرت　　کہ زہرہ جس کی ہے رقاص اجرت

جہاں میں آج ہے راجوں کا سرتاج　　ہے جس کا نام راجہ اندر مہا راج

کیا تجھ یاد اے شیریں مقالی　　کہ حاضر سب ہیں تیری جائے خالی

دگر کہتا ہوں اے مہ رخ پری زاد　　کہ راجہ اندر کا ہے جس طرح ارشاد

کہ آتی روح افزا ہو کے تیار　　مکاں کو تیری اے محمود سیار

خراماں تر ہوا آ اس سے باہم[۶۶۸]　　کہ ہیں محفل میں سب خوباں فراہم

جو تھی آشفتہ خاطر ہو کے با چین　　کئی ہو شاداں با الراس[۶۶۹] والعین[۶۷۰]

دی گویا کہ صورت آرسی کی　　تصور میں عبارت لی ٹکی کی

بغیر ما چوب دارش آمد و رفت　　پری پیکر سراپا گفتہ بہر ہفت[۶۷۱]

ہفت شدن کام کندلا بہ زیور و جواہر

ص۔39

کری شانہ بہ موئے مشک فرسود[۶۷۲]　　لگائی تیل عنبر پر عطر سود[۶۷۳]

ہر یک مونڈھ جادو سے بھر کر　　بندھے لا رشتہ رنگیں سے اژدر

دھری مہتاب پر لا کہکشاں کو　　بناوے جوں شہاب مہوشاں کو

دھری کانوں میں کندن کے کرن پھول[۶۷۴]　　ہیں خوش بلبل یقیں کر نسترن پھول

دلے یوں گوہر[۶۷۵] پے الماس جھمکے　　کہ جوں افلاک پر پروین چمکے[۶۷۷]

لگائی[۶۷۶] کان میں نت او دیے سر　　ہوئے عشاق کے فی الفور پا سر

جواہر کا جو پہنی گل میں مالا　　ہے گویا فی الحقیقت مہ کا ہالہ

دلے جو بن اوپر ہیرے کے ہار[۶۷۸]　　ہے تا گن درمیاں دوانا داں

کمر بند مرصع کر پر　　پروے موتے جوں سطر گہر کر

حنا بند پاؤں پر یک رنگ کر لال　　کرے سب عاشقوں کے خوں کو پامال

آمدن روح افزا بمکان دلربا و رفتن بہ عطریا و سواریاں و تخت ہمہ پسکھا شدہ اندر

ہوئی ایسے میں آ کر روح افزا　　مکان دلربا کے رونق افزا

چلی یک من دو تن ہو[۶۷۹] کر رو بہ پیکر　　چلے افلاک پر گویا دو پیکر

مرصع کی ہوئی ڈورق پہ اسوار　　جو مہر بھی تک رہا یک طرف خس وار

چلا جب آب پر ذورق رواں ہو　　فلک پر شمس رخشاں جوں رواں ہو ۶۸۰
تھی ناری روح افزا جو پری زاد　　جو تو پرور ہے اس کا اصل اجداد
کری جو پا کے مہ رو سے خرافات　　مگر ہے ساتھ ترے مرد کی ذات ۶۸۱
کہی ہمراہ نہ میرے مرد کی ذات　　جو تو کہتی ہے شاید لائی ہے سات
غرض ساحل کو پہنچے تک وو سہ بار　　کرے اس بات پر دونوں نے تکرار

فرستادن راجہ اندر تخت جواہر مرصع بہ ساحل دریا و رقص پریاں

وہاں تخت مرصع ساخت تاج ۶۸۲　　دیا ہے بھیج راج اندر مہا راج
نگہ کر اُو اس جواہر رخت پر　　اتر بیٹھے دو شاید تخت اوپر
چہاری ۶۸۳ پنج ۶۸۴ و زریں لال　　تھے اس تخت مرصع کے جو حامل
اتارے لا کے راج اندر کے در پاس　　چلے دونوں(ں)نے اس عالی گہر پاس
نپٹ آراستہ دیکھی جو محفل　　ہو شد ا ں شگفتہ غنچہ دل
دھرے ہیں شمع دواں لعل وزر کے　　پریاں حاضر ہیں سارے بحر ور کے
ہیں رنگیں گرد اس کے پھول پارا ۶۸۵　　جو ہے مشہور اندر کا اکھاڑہ
اول کر راجہ راجوں کو تسلیم　　لگی منی بعد خوباں سے بتکریم
ص-40　بجاواں ساز جو رامش گری ۶۸۶ کا ۶۸۷　　لگا ہونے کو رقص یک بہ یک پری کا
کہ جب سب ہو چکے خوباں تنک ہو　　اٹھی جب کام کندلا باندھ گھنگھرو
شتابی دور کر شہزادہ اکسیر　　لگا مردنگ بجانے خوش ہم وزیر
جو سب تھے راگ و رنگ کا نوش سے کر　　نہ سمجھے اس کے تئیں کوئی غیر ہے کر
تھی گل رو رقص میں ہو مست مدہوش　　نہ پائی اس کے تئیں تک تمیز کر ہوش
ہو چابک دست یوں مردنگ بجایا　　کہ چپ میں راج اندر کو رجھایا
کہ اس مردنگ پہ نغمہ سرائی　　پری رو رقص میں فائق تر آئی
کہ راجا آفریں تحسین کر کر　　جواہر بے بہا دو ہاتھ بھر کر
دیا انعام خوش ہو بے شمارہ　　کرے سازاں نوازوں کو اشارہ
لیا جلدی سے ہو شہزادہ چالاک　　جواہر بے بہا ہو پیش بے باک

برخاست شدن بزم راجہ اندر و رخصت شدن کام کندلا و روح افزا

سرود و رقص و نظم ۶۸۸ آخر ہوا جب　　ہوا برخاست اندر کا سبا(ہ)تب
پریاں اٹھ کر چلیں رخصت ہو سارے　　ہوا طالع ہر چھپ گئے ستارے

٦٨٩ یہ دو محبوب پا ارشاد معراج ۔۔۔ وہی تخت مرصع ساخت عاج

چلیں خوش بیٹھ کروں سے رواں ہو ۔۔۔ ترت پہنچا دیے حال رواں ہو

ملک زادہ وہی بیٹا لگا کر ۔۔۔ جو بیٹھ اس تخت پر پہنچا ہے آکر

چلا ہے بیٹھ ذورق خوش رواں کو ۔۔۔ سرور فرح سے آئے مکاں کو

اتر ذورق سے جلدی کر ملک زاد ۔۔۔ محل کو اپنے آیا ٦٩٠ خرم وشاد

گیا فی الفور باغ خاص کو تب ۔۔۔ بلا اس معدن اخلاص کو تب

کہا سب ماجرائے شب بہ تفصیل ۔۔۔ کہ جوں زلف صنم ٦٩١ پر پیچ و تطویل

مدبر با خبر دانا خرد مند ۔۔۔ فکر سے شہہ کی مکدور و درد مند

کہا رکھ جمع خاطر اے ملک زاد ۔۔۔ ٦٩٢ ترے دیوے گا مقصد رب امجاد

ولے ہے فطرت و دانش ضروری ۔۔۔ کرنا حاصل ہوئے فرحت سروری

کر یک یک ماجرائے شب کے اذکار ۔۔۔ تو کر عنوان سے روایت ٦٩٣ کے اظہار

خواب اول دیدن

ترت آشہزاد اپنے محل میں ۔۔۔ مقید ہو کے اس عقدے کے حل میں

سکھا کر دائی کو تجویز اول ۔۔۔ فکر سے سو رہا خاموش تا حل

جو پہنچی آکے رنگیں پردہ داری ۔۔۔ مکاں کام کندلا کی سواری

کہی دایہ کہ اٹھ اے جاں فزائی ۔۔۔ سواری کام کندلا جی کی آئی

ص۔41 جو اٹھ بیٹھا کہا اے دایہ جی آہ ۔۔۔ عجب کچھ سیر میں تھا ہائے جی آہ

تماشا دیکھتا تھا کچھ عجب اب ۔۔۔ اٹھا دی تو نے ہے بے کر غضب اب

کہی دایہ بلائیں شاہ زادہ ۔۔۔ کہ تری ٦٩٤ عمر و دولت ہوے زیادہ

جو کچھ دیکھا تماشا من و عن سب ۔۔۔ بیاں کر کھول کر ٹک شکریں لب

کہا اب کام کندلا جی نے آکر ۔۔۔ چلی ہیں جب محافے کو اٹھا کر

محافے بیچ میں بھی کر شتابی ۔۔۔ جو بیٹھا ہو کے شاداں بے حسابی

کہاراں لے اٹھا معلوم کر بار ۔۔۔ لگے با یک دگر کرنے کو تکرار

دیا گل دو کے تئیں یہ کھٹہ ۔۔۔ ٦٩٥ ملک زادہ مگر شالوں کا کھٹہ

محافے میں رکھی ہے اس کو دل دار ۔۔۔ اسی سے ہے محافہ اس قدر بار

جو تو ایسے میں آہشیار کردی ۔۔۔ عجب کچھ وقت میں بیدار کردی

سنی جب کام کندلا یہ حقیقت ۔۔۔ کہی یہ سب بیاں ہے فی الحقیقت

ہوا سب عقل حیراں ہوش کر گم
نپٹ ہو کر حیرت کو تلاطم [۱۹۶]

چلی ہوتے ہی شام اپنے مکاں کو
مصاحب کو سنائی اس بیاں کو [۱۹۷]

کر میں حیرت میں ہوں اے محرم راز
ہوا کیوں یہ حقیقت اس پہ ابراز

مصاحب تھی جو دانش مند غایت
کہی اس کو تسلی کر نہایت

خیال اس کو تراخت من میں بہتا
بے جو من سوچنے میں ہے رہتا

غرض کر استراحت اٹھ فجر کو
لے آب چشم خور دھو چندر کو

اٹھا دی شب کے سب دل سے نشاں کو [۱۹۸]
چلی اسوار ہو عہد کے مکاں کو

خواب دوم دیدن شہزادہ

کری بیدار پھر وہ دایہ مکار
کر آئی کام کندلہ جی ہو اسوار

اٹھا فی الفور اور کرنے لگا آہ
تماشے میں عجب تھا میں نے دل خواہ

کری کیا کام تم نے دایہ جی اب
خلل اس سیر میں تم لائی جی اب

کہی دایہ اے زیب شہر یاری
ترے یہ نیکی پہ ہے میں (تو) واری [۱۹۹]

بیاں کر شکریں لب کھول مجھ سے
جو کچھ دیکھا ہے سپنا بول مجھ سے

کہا میں کام کندلہ جی کے ہمراہ
چلا [۲۰۱] ڈولی میں ہو بے [۲۰۰] ترس اشباہ

مکاں کو اپنے جب پہنچی وہ محبوب
کنیزاں خوش خلل ہوگئیں [۲۰۲] دو صف خوب

تو ایسے میں اٹھا دی شور وغل کر
پھر سے سیر و تماشا میں خلل کر

سنی جب کام کندلہ جب یہ مذکور
ہوئی ششدر رہی حیرت میں سو فور [۲۰۳]

غصے سے آگ ہو سورج کے مانند
رہی تا شام اٹھا دی شاد آنند

ص-42

مکدر خاطر اور بے زار ہو کر
نہانے میں چلی اسوار [۲۰۴] ہو کر

کر جا مینو نشاں رنگیں محل میں
اتاری جامہ و زین خلل میں

مصاحب کو کہی با شرم و غیرت
لگا بہنے جبیں سے عرق [۲۰۵] حیرت

اکیلی پہ ستم ہو کے غضب دو
نپٹ لا کر غصے سے کہیں بے ادو

سنجے [۲۰۶] اس کے یہ سب نشاں [۲۰۷] ہر روز
عجب [۲۰۹] دستے ہیں یک سر حیرت اندوز

جو رکھتی تھی مصاحب عقل صائب [۲۰۸]
کہے خبر جو حاضر و غائب

کہے اے جام خوبی کی مئے آشام
خیال اس کو ترا ہے صبح و تا شام

تصور میں رہے ترے ہو بے تاب
دسے اس کو وہی در عالم خواب

غرض سمجھا دیے کر نکتہ دانی
جو ڈالے آگ پہ گویا کر پانی

ہوئی تک اس کو دل جمعی و راحت — ترت فرمائی شب کو استراحت

سحر خوش زلف لے طرح ہمائی — مکلل جگمگی پوشاک وردائی[10]

چڑھائی سیم تن پر نور تن کو — نقابوں سے کری پوشیدہ تن کو

محافے میں مرصع ہو کے اسوار — چلی مہر کے مکاں کو ہو کے تیار

خواب دیکھنا کام شہزادہ

جو پہنچی جا کے جب نزدیک دل دار — کری دایہ ملک زادے کو ہشیار

کہ اٹھ بیدار ہو اے جان جاناں — نہال بوستاں کے حکم راناں

اے گنج معدن توصیف و تعریف — لے آئی کام کندلا جی نے تشریف

نپٹ جلدی سے اٹھ ہشیار ہو کر — نہایت دائی پو بے زار ہو کر

کہا کیوں مجھ کری بیدار ہے ہے — یہ کیسے وقت میں ہشیار ہے ہے

کہی دایہ اے شہزادے بلائیں — جو دیکھا کہہ فہم میں اپنے لالیوں[11]

کہا میں کام کندلا جی کے ہمراہ — جو چل دیکھا عجب کچھ سیر دل خواہ

پرستاراں جو ہو گئے وہاں دو صف سب — لگے دینے کو برقع دو طرف سب

جو دست راست سے برقع نکالی — اسی رخ کے کنیزاں کو دے ڈالی

طرف سے چپ کے بھی لے کر بدستور — چلی دیتی ہوئی برقعے کو کر دور

اٹھا دی تو نے آہ ایسے میں ہے ہے — گرا جام نمیں سے سیر کاٹے

یہ سن دلبر ہوئی آشفتہ خاطر — چہ خاطر تل خطیر[12] و عطر[13] عاطر

نپٹ ہوئی دل اوپر تشویش اس کو — ضرورت آپڑی تفتیش اس کو

چلی گئی شام کو ہوتے وہ دلبر — کدورت اور ملال و تکر دل پر

جو پہنچی جا کے جب اپنے مکاں کو — مصاحب سے کہی یہ سب بیاں کو

ص۔43 یہ باتاں مجھ نہیں آتے نظر خوب — یقیں ہیں سب عجب مکرو عذر خوب

مصاحب کھول کر سب اس کا احوال — تسلی اور تشفی کر کے فی الحال

کہی اے رونق بازار خوبی — کرے خواں تری گہر رفت روبی[14]

کہ ہر دم ہر زماں ہر وقت وہر آن — خیال اس کو رہے تر ایقیں جان

کرے اس فکر میں جب چشم کو بند — دسے وہ صورت مرات کے مانند

مصاحب سے تسلی جب کہ پائی — ترت اٹھ سیج پر پھولوں کے آئی

صف مژگاں[15] کو منہ پر مردنگ لے — کھڑے جب خواب کے فوجاں کنگ لے

نقیب مرغ سحری جب پکارا　　　صبح کا لے علم نکلا[۲۱۶] ستارا

کر اٹھ صبح دم چنچل پیاری　　　کل کو شہر کے چلنے کی تیاری

نقاباں پرنقاباں ڈال رخ پر　　　چھپے جوں ابر میں چندر چرخ پر

چلی رنگیں میانے پر ہوا سوار　　　ترت پہنچی مکاں کو شہر کے دل دار

خواب دیدن چہارم شہزادہ

سحر کے خواب میں سنا تھا شہزاد　　　اٹھا دی جلد دایہ نیک بنیاد

ہونک بیدار باغ جاں کا خوش گل　　　کر آئی کام کندلا باتجمل

اٹھا کہتا ہوا افسوس افسوس　　　بجاتا تھا میں نوبت سیر کا کوس

بیان کرنے نہیں مقدور اپنا　　　جو دیکھا آج ایسا نیک سپنا

کہی اے جاں تصدق ترے دم کے[۲۱۷]　　　مبارک فرق اور نازک قدم پر

سنا تک مجھ کو کیا دیکھا ہے رویا　　　ہے سارے خاناں کو مردہ گویا

کہاب کام کندلا جی نے آ کر　　　پرت کی آگ پرتن من جلا کر

چلی جب یاں سے کر کر اضطرابی　　　محافے رنج بیٹھا میں شتابی

جو پہنچی جب کر جاتا باب اول　　　چلی برقع کو دیتی ناز سے چل[۲۱۸]

دی برقع جو تھے آثر کے تئیں دو　　　مصاحب اور دایہ کو پری خو[۲۱۹]

لے سودا تو اٹھا دی آکے فی الحال　　　ہوا سب سیر[۲۲۰] کا بازار پامال

سنی دلبر نے اس سے جب یہ مذکور　　　غریق بحر حیرت ہو سو فور

ہو ڈولی میں چلی فی الفور دلبر　　　کر دورا سے میں جوں ماہ انور

مصاحب سے کہی ہو تیں پہ ابرو　　　نپٹ ہو حیرت آگیں اور غضب رو

عجب کچھ گفتگو بے ہوش پر ہے　　　ہے علم غیب یا مکر و سحر ہے

غرض سمجھائے اس دن بھی مصاحب　　　انہیں ہم دم[۲۲۱] و ہمدرد مصاحب

اظہار نمودن شہزادہ عیاں ایں چہار خواب باغبان فرزند تدبیر نگیں او

ص۔44 محرر جو پرت کے دفتراں کے　　　مبصر خوش نگہ کے گوہراں کے

کرے تفصیل اس رنگیں بیاں کی　　　پرکھ گوہر کو تھالی میں پر زباں کی

یاں تک لا کے شہزادہ اس ذکر کو　　　کہا جا باغبان فہم ور کو

کر اے دل سوز اے یار و فاکیش　　　جو ہے اب خواب مجھ آج درپیش

نقابوں کا بیاں پہنچا یا تمام　　　مگر اس خواب میں ہے ذکر حمام

سنا جب باغباں دانا فرزند　　　دیا اس طرح شہزادے کے تئیں پند

ہوں سے ہے وہ حیرت ناک پر فکر　　　سنے گی[۲۲] تجھ سے جب حمام کا ذکر

سعا تجھ پر کرے گی دوڑ حملہ　　　کرے گی قصد جاں رکھ یاد حملہ

مگر تو والدہ کو اپنے حاضر　　　رکھے تا ہو تسلی کر عجز ظاہر

ترت وہ عاشق کا بادہ پیا　　　جو آیا باغباں سے پا کے ایماء

جو پیش آ والدہ کے لب کو کھولا　　　گہر[۲۳] اس پند کے دامن میں رولا

خبر ایسے میں پہنچی یک باری　　　کہ آئی کام کندلا کی سواری

خواب بجم شہزادہ

نہال بوستان شاہ کشمیر　　　یہ سن کر سو رہا لے خواب کی تدبیر[۲۴]

کری بیدار جلدی دتی ڈوئن[۲۵]　　　کہ اے کان گنیاں[۲۶] کا شمع روشن

کہ اٹھ اے جوہر بے جرم بے عیب　　　دی آ کام کندلا تخت کو زیب

سعا اٹھ کر لگا بس آہ کرنے　　　خرد پر دائی کی صد آہ کرنے

کہ آ ایسے مزے میں کی خلل تو　　　خوشی کی فکر و حسرت سے بدل تو

عجب کچھ دیکھتا تھا خواب نادر　　　ظہور قدرت حق صنع[۲۷] قادر

کہی دایہ میں واری تجھ تن پہ　　　ترے نرگس نین نازک بدن کے[۲۸]

جو کچھ دیکھا ہے کہہ دے ٹیک تر خواب　　　اے شمع خسروی اے در پرتاب

کہا میں کام کندلا جی کے چل سنگ　　　گل میں اس کے پہنچا کر کے آہنگ

شکر لب بسم تن مہ رخ پری شو　　　کری بخشش جو تھے برقع ہو سب وہ

دگر پوشاک وزیور تن سے[۳۰] کر دور　　　گئی حمام میں وہ لعبت[۲۹] نور

جو نہائی دلبر شارق نشانی　　　سعا ڈالا میں ایک دو طاس[۳۱] پانی

یہ سن مدہوش لی جو ہر دار خنجر　　　ترت حملہ کری شہزادہ اوپر

ہوئی درمیانے مادر ایک باری　　　لگی کہنے کے تئیں عجز و بزاری

مرے دل کے چمن کا ایک ہے گل　　　مقاصد زندگی کی اس سے حاصل

خدا کے واسطے اب ہاتھ رکھ لے　　　مری زاری کے جوہر کو یہ کھولے

شفیع ہوئی جب کہ مادر راز دل ریش　　　کہی ہاں کہہ دے جو کچھ ذکر ہے پیش

بیان خسروان شہزادہ حقیقت خویش

ص-45　کہا تم جان دایہ کی خرافات　　　کہی اے دایہ جی یہ کیا ہے حرکات

گئی جب عاجزی[۴۳۳] کرنے کو دایہ
کہاں یہ مجھ میں گستاخی کا مایہ[۴۳۴]

سو سن کر خیریت[۴۳۵] آ گئیں وہ عجب ہو
چلی اٹھ خواہش اکل و شرب ہو

منگا[۴۳۵] کھانا ہی لقمہ اٹھا کر
جو تھا باقی[۴۳۶] میں کھایا جھٹ چلا کر

گھڑک دایہ یوہاں کیا ہے یہ کام
منگائی جلد و سرعت مثل دام

ٹھٹھل جب کری اس میں سے یک لے
میں لے کر کھا گیا باقی کو ٹک لے

نپٹ برہم ہوتم دایہ ہوئی[۴۳۷] الاان
منگائی[۴۳۸] جلد ہو کر سٹل قلیان[۴۳۹]

دکھی جب ایک دو دم پی[۴۴۰] کے بجا
ادھر[۴۴۱] سے جلد یک دم میں لے کھینچا[۴۴۲]

سنی حقے کی دیگر بار آواز
نہیں کوئی دوسرا ہوتا ہے اب زار

ہو برہم دایہ پر جلدی سے کرخشم
نپٹ کر نقل[۴۴۳] لے ہے تکبر پر خشم

وہاں سے جلد مانند بلبلوں کے
معطر سیج پر آئی گلوں کے

دو مژگاں خواب سے ہوگئے بہم[۴۴۴] جب
ہوئے جوں غنچۂ گل شکریں لب

کیا جلدی ادھر سے گذ گلی میں
یہ دلبر شوخ چنچل چلبلی میں

چونک فی الفور دایہ کو[۴۴۵] کہی واہ
یہ کیا ہم سے خطا آج ہے واہ

کہی دایہ اے خاتونوں کی خاتون
ترے غصے سے ہے مرا جگر خون

میں ادنیٰ دائی خادم عجز پیشہ
یہ مجھ مقدور ہے کر کچھ اندیشہ

کیا یوں گدگلی دو تین باری
ہوئے سب خوب کے قوجا بیقراری

کہی اٹھ بیٹھ اب ہشیار بہتر
کر ایسے خواب سے بیدار بہتر

کیا تب چوب دار آ کر کے تسلیم
کیا ہے یاد راج اندر نے تکریم

کر آئی روح افزا گھر تیرے شاد
ہو آ ناتقلق جوں سرو شمشاد

کہی سن مستعد ہو بیر[۴۴۶] ہے علت
جو بیر سے سراپا ہو کے بیر بہلت[۴۴۷]

ہوئی ایسے میں حاضر وہ پری زاد
سر وقد رشک مہ رو یاں تو شاد

چلی جوں ابر[۴۴۸] وہ باہم ہو یک بار
سنگھنے پر ہوئے دونو(ں) نے اسوار

شتابی میں بھی جا بیٹھا[۴۴۹] دواں ہو
چلا جل پر سفینہ خوش رواں ہو

کہی ہے روح افزا کے تب یو[۴۵۰]
ہے شاید مرد کوئی باہم ترے ہو

کہی تم نے تکرار تو لائق ہے سات[۴۵۱]
جو کہتی ہے مجھے اس طرح[۴۵۲] کی بات

غرض پہنچے تلک دو تین باری[۴۵۳]
کری تکرار ایسا یہ بیاری

وہاں تخت مرصع ساخت عاج
بچھا ہے جلد راج اندر مہا راج

ص۔46

ہوئے[756] اسوار دونو(ں) نے[757] تکریم　　　　کر فارغ[755] صدر آرا کو تسلیم

پریوں کا رقص ہو یک ایک باری　　　　جو پہنچی آخرش نوبت ہماری

ترت میں[758] دور کر حکمت کی اکسیر　　　　لگا مردنگ بجانے خوش ہم وزیر

ہوا راجا بہ سر مہر و عنایت　　　　دیا انعام[759] با اکرام نہایت

دو پاناں پھر جو اہر بے شمارہ　　　　کری تم ناز سے ہم پر[761] اشارہ

لیا میں کر کے چت[760] سے وہ جواہر　　　　لگی ہے اب کیا ہوں تم پو ظاہر

مصلحت نمودن کام کندلہ بہ شہزادہ و داخل دو شدن

ملک زادہ جواہر جب دھرا پیش　　　　یقیں جانی یہ قبایاں[762] وہ اوا کیش

ہو واقف اس کی طبع عشق جو سے　　　　دی تب مصلحت[763] رتی کو سے

کرے جب راج اندر مجھ کو پھر یاد　　　　کرو(ں) گی اطلاع تجھ اے ملک زاد

نہاں دستور سے سابق کے آتا　　　　پرند[764] وزیر[765] و[766] ہم مردنگ بجاتا

کروں میں خوب نا اس تال پہ رقص　　　　ادا اور وضع لٹک اور چال پہ رقص

نپٹ خوش ہو کے دیے چاہے انعام　　　　وہ راجا فیض بخش خاص اور عام

کروں گی عرض مہراج[767] کو نام　　　　حق مردنگ نواز کا ہے انعام

تو یہ پوچھے اگر چھاتا سو لے مانگ　　　　سنگوں[768] میں سو ملے گا جو کہے مانگ

کہے ہاں حوصلے سے بخش تیری　　　　تو کہہ فی الفور دے زوجہ کو میری

بہ فضل رب داتا و(و) توانا　　　　بر آوے آرزو سے شاہ دانا

یہ کہہ کر ہو محافے بیچ اسوار　　　　چلی شان و تجمل سے وہ دل دار

طلب نمودن راجا اندر بار دیگر کام کندلہ را و اطلاع دادن بہ شہزادہ

کیا جب یاد پھر مہراج اندر　　　　خبر کردی ملک زادے کو دلبر

چلا شاداں[769] و فرحاں پھر ملک زاد　　　　گویا[770] سرو رواں اور تازہ شمشاد

لگا اکسیر ہو پوشیدہ سب سے　　　　دعا منگ قادر و خلاق رب سے

بہ طرح اولیں دلبر کے ہمراہ　　　　وہ جمع نور بخش زینت و جاہ

اکھاڑے کو گئے شمس و قمر مل　　　　نہاں و ظاہر شیر و شکر مل

پری چہرہ نے کر راجا کو تسلیم　　　　جو جتنیں[771] سب پریوں سے پا کے تعلیم

کرے سب رقص نوبت اس کی آئی　　　　بندھی گھنگرو و گوہر پائے حنائی

ملک زادہ ترت اکسیر کر دور　　　　لگا مردنگ بجانے خوش ہو مسرور

زر و سیم و طعام و ظرف لنگر — ہوے فقر اغنی، مفلس تونگر

جو تھا ہمدرد و دولت خواہ ہم راز — کرے[807] اس باغباں کے تئیں سرافراز[808]

ادا کر سجدہ تمجید[809] رب کو — دے رونق[810] بسر عیش و طرب کو

ص۔48 جو پہنچا تیر مقصد آ ہدف میں — چکیدہ[811] و قطرہ[812] نیساں[813] صدف[814] میں

ہوا افسانہ پہنچا مدعا کو — عقیدت سے اٹھا دست دعا کو

در بیان مناجات الٰہی و ختم کتاب گوید

الٰہی دو جہاں میں رکھ امن سے — اٹھا دل کو خیال ما و من سے

گل مقصد ہو خنداں باغ دل میں — ستور[815] آوارہ ہو دشت قبل[816] میں

ہوا طالع[817] کی پاوے اعتدال — رہے مشتر[818] ہو جمعیت[819] کی ڈال

سخن شیریں تر و شیر و عسل[820] ہوئے[822] — بہ گام حرف زن ہوئے بسمل[821] ہوئے

مرا گفتار پاوے اشتہارا — زہند[823] تا اصفہان بلخ و بخارا

ہو حاصل[824] تا ہے دور ماہ و خورشید — مراد دین و دنیا و عمر جاوید

عطا کر مجھ در دریائے حشمت — دے دائم[825] آب و تاب عز و حرمت

طمع کو دور کر دے مجھ قناعت — صلاح و علم[826] و تقوا صبر و طاعت

رسیدم عاشقاں[828] کو وصل دلبر[829] — دیا حق[827] آبرو کو ان کے گل کر

کیا تصنیف جیاں جب یہ اذکار — تھی ہجری یک ہزار و دو صد و چار

بکس عباس ایں افسانہ اتمام[830] — وصل علی محمد و آل عظام

حواشی متن

۱۔ بچن۔ کلام ۲۔ چلکے۔ چلک (چمک، جھلک) ۳۔ بلکے۔ بلکنا (بے چین کرنا، بے قرار کرنا) ۴۔ جو قرب۔ علاوہ کرنا، جمع کرنا
۵۔ چوپ۔ چپنا نگرنا ۶۔ دولاب۔ ذخیرہ ۷۔ تخریج الحیا۔ زندہ نکالنا ۸۔ اجساد۔ جسد کی جمع (بہت سے جسم) ۹۔ دورق۔ چھوٹی کشتی
۱۰۔ دریوزہ گر۔ بمعنی دریوزہ گر، بھکاری، گداگر ۱۱۔ لمعت۔ شعاع، کرن ۱۲۔ تپی۔ تی، بمعنی آتی (ص۲) ۱۳۔ چندرسور۔ چاند سورج
۱۴۔ لاک۔ لاکھ (ص۲) ۱۵۔ کیت۔ مقدار ۱۶۔ فرس۔ فارسی ۱۷۔ طیر۔ پرند، پکھیرو ۱۸۔ دل چسپ۔ دلچسپ (ص۲)
۱۹۔ کاں۔ کہاں (ص۳) ۲۰۔ لک۔ تلک، تک (ص۳) ۲۱۔ لک۔ چھکنا (ص۳) ۲۲۔ اوٹھا دعوے۔ دعویٰ اٹھانا، بمعنی دعوے کا ثابت کرنا یا
جواب دیا جانا ۲۳۔ ہاتھاں۔ ہاتھ کی جمع ۲۴۔ باتاں۔ باتیں ۲۵۔ اظہر۔ ظاہر کرنا ۲۶۔ ہضم۔ حصول کرنا ۲۷۔ کوں۔ کو (ص۳)
۲۸۔ سیتی۔ سے (قدیم متروک) (ص۳) ۲۹۔ ہور۔ اور (ص۳) ۳۰۔ کیتک۔ کہاں تک (ص۳) ۳۱۔ بچ۔ بیچ ۳۲۔ علی۔ اونچا، بلند (ص۳)

۳۳۔ بضر۔ چھنگلیا کے پاس والی انگلی ۳۴۔ اگے۔ آگے ۳۵۔ صحاباں۔ صحابی کی جمع ۳۶۔ مہابلی۔ مہابلی بڑا طاقت ور شہ زور (ص ۴)
۳۷۔ رک۔ رکھ (ص ۴) ۳۸۔ بیان امر عشق۔ فارسی اضافت ۳۹۔ فرع۔ وہ مسائل جو اصل سے تعلق رکھتے ہوں ۴۰۔ پرت۔ محبت
۴۱۔ بپت۔ بپتا مصیبت ۴۲۔ مارگ۔ راستہ ۴۳۔ مہہ۔ منہ (ص ۴) ۴۴۔ رین۔ رات ۴۵۔ آن۔ معشوقانہ چھب ۴۶۔ اوس کا۔ اُس کی
(ص ۴) ۴۷۔ زیں۔ باریک آواز ۴۸۔ حلہ۔ پوشاک، جامہ ۴۹۔ وہاں۔ وہاں (ص ۵) ۵۰۔ نپٹ۔ مکمل، پوری طرح ۵۱۔ مطبوع۔
پسندیدہ ۵۲۔ جلساں۔ جلس کی جمع ۵۳۔ زال۔ زال بمعنی بوڑھا، رستم کا باپ جس کے بال سفید تھے ۵۴۔ مسال۔ تمثال (ص ۵)
۵۵۔ مشتغل۔ مشغول ۵۶۔ مایل۔ مائل (ص ۵) ۵۷۔ دونو۔ دونوں (ص ۵) ۵۸۔ ہات۔ ہاتھ (ص ۵) ۵۹۔ دیکھایا۔ دکھایا (ص ۵)
۶۰۔ پڑنے۔ پڑھنے (ص ۵) ۶۱۔ فرخندہ پاپے۔ مبارک قدم ۶۲۔ دسے۔ دکھائی دے ۶۳۔ جیو۔ زندہ، ذی روح ۶۴۔ عقد۔ ہار، گلوبند
۶۵۔ دہرکوش۔ زمانے بھر کی باتیں ۶۶۔ وعض۔ وعظ (ص ۶) ۶۷۔ الان۔ اسی وقت ۶۸۔ قاف تا قاف۔ ایک سرے سے دوسرے
سرے تک ۶۹۔ منے۔ میں ۷۰۔ چھند۔ مکر، فریب ۷۱۔ دوبار۔ دوبارہ (ص ۶) ۷۲۔ بولایا۔ بلایا (ص ۶) ۷۳۔ صادر۔ حکم جاری کرنا
۷۴۔ اوستاد۔ استاد (ص ۶) ۷۵۔ قطیر۔ سطر بندی کرنا ۷۶۔ سات۔ ساتھ (ص ۷) ۷۷۔ ست کر۔ پھینک کر ۷۸۔ بہوت۔ بہت
(ص ۷) ۷۹۔ عمد۔ جان بوجھ کر ۸۰۔ دیک۔ دیکھ (ص ۷) ۸۱۔ سنگے۔ بمعنی ساتھ ۸۲۔ گماں۔ گم کردہ، چھپا کر ۸۳۔ بہار۔ باہر
۸۴۔ بااقلام۔ قلم سے ظاہر ہوئے ۸۵۔ یہاں۔ یہاں (ص ۷) ۸۶۔ راہ زاد۔ زادِ راہ (ص ۷) ۸۷۔ ٹہار۔ ٹھار بمعنی ٹھیرنا، جگہ
۸۸۔ چودواں۔ چودھواں (ص ۷) ۸۹۔ شاز وار۔ ساز و براق، درشگوفے کی طرح ۹۰۔ بادھ۔ باندھ (ص ۷) ۹۱۔ مکلل۔ آراستہ، مرصع (ص ۸)
۹۲۔ جوشن۔ زرہ بکتر ۹۳۔ جلجلہ۔ زرہ کی طرح نقاب جو جنگ میں منہ پر ڈال لیتے ہیں ۹۴۔ ثوب۔ پوشاک، لباس ۹۵۔ ذو۔ ضو (ص ۸)
۹۶۔ مہ خور۔ چاند سورج ۹۷۔ شتاباں۔ دوڑتے ہوئے ۹۸۔ نیں۔ نہیں (ص ۸) ۹۹۔ نیستاں۔ وہ جنگل جہاں پر نرکل کے درخت ہوں
۱۰۰۔ مسی۔ تانبے کا بنا ہوا ۱۰۱۔ اخگر۔ چنگاری، شرارہ ۱۰۲۔ مچھی۔ مچھلی (ص ۸) ۱۰۳۔ گل گلیورا، مچھلی کا جبڑا ۱۰۴۔ تھے۔ سے
(ص ۸) ۱۰۵۔ چکیدہ۔ ٹپکا ہوا ۱۰۶۔ عرق۔ پسینہ ۱۰۷۔ راکب۔ سوار ۱۰۸۔ کواکب۔ ستارے ۱۰۹۔ سارسار۔ سارسار بمعنی محافظ
۱۱۰۔ نک۔ ذرا ۱۱۱۔ بہت باند۔ ہاتھ باندھ ۱۱۲۔ دل ریش۔ زخم خوردہ ۱۱۳۔ سبا۔ ملکہ بلقیس کے شہر کا نام ۱۱۴۔ دسے۔ نظر آیا ۱۱۵۔ ترت۔
جلدی سے ۱۱۶۔ دسیا۔ دکھائی دے ۱۱۷۔ لگ۔ تک (ص ۸) ۱۱۸۔ دیکھانے۔ دکھانے ۱۱۹۔ تاش۔ تشت ۱۲۰۔ کانسی۔ کانسہ، پیالہ
۱۲۱۔ آتش۔ رنگین ۱۲۲۔ اقتضا۔ تقاضا کرنا ۱۲۳۔ بچن۔ کلام ۱۲۴۔ جیوں جوں (ص ۹) ۱۲۵۔ شبو۔ گل شبو ۱۲۶۔ عطر سو۔ بہتر خوشبو
۱۲۷۔ کے۔ کی (ص ۹) ۱۲۸۔ تیغہ۔ تیغ (ص ۱۰) ۱۲۹۔ انچل۔ چلبلا، شوخ ۱۳۰۔ موں۔ منہ (ص ۱۰) ۱۳۱۔ سما۔ آسمان
۱۳۲۔ چکارے۔ چھوٹے ہرن ۱۳۳۔ نا سک۔ ناک ۱۳۴۔ گو۔ زبان (ہندی لفظ) ۱۳۵۔ پان۔ تیر خدنگ ۱۳۶۔ چک۔ چکا چوند ہوا
۱۳۷۔ غب غب۔ غبغب، تھوڑی کے نیچے لٹکا ہوا گوشت ۱۳۸۔ چلکے۔ چلکا، چمکنا، روشن ہونا ۱۳۹۔ کاں لگ۔ کہاں تک
۱۴۰۔ فندق۔ مہندی لگی رنگین انگلیوں کی پور ۱۴۱۔ بان۔ زبان (ص ۱۰) ۱۴۲۔ فرب۔ فاربی ۱۴۳۔ خیزد۔ اٹھا (ص ۱۰) ۱۴۴۔ بسا کیں۔ اکثر
۱۴۵۔ کسو۔ کسی (متروک ہے) ۱۴۶۔ دیکھاوے۔ دکھائے ۱۴۷۔ معطوف۔ پھیرا گیا ۱۴۸۔ گریاں۔ رو تا ہوا، آہ و زاری کرنا
۱۴۹۔ بریاں۔ بھنا ہوا ۱۵۰۔ چون۔ ہوا ۱۵۱۔ پوچھے۔ پیچھے (ص ۱۱) ۱۵۲۔ صولت۔ دبدبہ، رعب ۱۵۳۔ پیاپے۔ پے در پے ۱۵۴۔ دنبال۔
پیچھا کرنا (دنبال کردن) ۱۵۵۔ دل فگار۔ غمگین، اداس ۱۵۶۔ خورد و کلاں۔ چھوٹے بڑے ۱۵۷۔ کھو۔ کبھی (متروک) ۱۵۸۔ گنانے۔ شمار

کرونا ۱۵۹۔ خواب وخور۔ سونا اور کھانا ۱۶۰۔ اے۔ یہ (ص ۱۱) ۱۶۱۔ غلطاں۔ گرتا پڑتا ۱۶۲۔ کربت۔ دکھ، رنج، مصیبت ۱۶۳۔ نورا
ابصر۔ آنکھوں کا نور، اولاد ۱۶۴۔ توں۔ تو (ص ۱۱) ۱۶۵۔ گمبھیر۔ گمبھیر، بھاری (ص ۱۲) ۱۶۶۔ شروح۔ شرح کی ہوئی
۱۶۷۔ کلک۔ قلم ۱۶۸۔ دھاک۔ ڈر، خوف (ص ۱۲) ۱۶۹۔ علاج۔ فلوک کا دل سے دور ہونا ۱۷۰۔ خشم۔ غصہ، خفگی ۱۷۱۔ چتا۔ چاہتا
(ص ۱۲) ۱۷۲۔ سنیا۔ سنا ہوں (ص ۱۲) ۱۷۳۔ سات۔ ساتھ (ص ۱۲) ۱۷۴۔ باندے۔ باندھ (ص ۱۲) ۱۷۵۔ ہات۔ ہاتھ (ص ۱۲)
۱۷۶۔ مقرون۔ قریب، نزدیک کیا گیا ۱۷۷۔ کرنون۔ جھکا کر ۱۷۸۔ اورنگ شاہی۔ شاہی تخت ۱۷۹۔ نپٹ۔ تمام سر اسر ۱۸۰۔ چند۔ کس
قریب ۱۸۱۔ پنہاں۔ پنہاں (ص ۱۲) ۱۸۲۔ نزار۔ کمزور ۱۸۳۔ زار۔ لاغر ۱۸۴۔ تذکرا۔ تذکرہ (ص ۱۲) ۱۸۵۔ اپار وہ۔ قلعہ دار
۱۸۶۔ کمان دار۔ تیر انداز سپاہی ۱۸۷۔ زور دار۔ طاقت ور ۱۸۸۔ سنادار۔ برچھی بردار ۱۸۹۔ ابراق۔ چمکا ۱۹۰۔ جوشن۔ زرہ بکتر
۱۹۱۔ سمند۔ زردی مائل گھوڑا ۱۹۲۔ ابلق۔ چتکبرا ۱۹۳۔ مشکی۔ کالا سیاہ ۱۹۴۔ سرنگ۔ ایسا گھوڑا جس کی ایال اور دم کے بال سرخ ہوں
۱۹۵۔ راکب۔ سوار ۱۹۶۔ منجی۔ چوب دار ۱۹۷۔ چوب دار۔ عصابردار ۱۹۸۔ چاؤشاں۔ چاؤش کی جمع، نقیب ۱۹۹۔ گھورا۔ نقارے کی آواز
۲۰۰۔ کوس۔ بڑا طبل ۲۰۱۔ کرنائے۔ نفیری ۲۰۲۔ ترئیاں۔ تری کی جمع، شہنائی ۲۰۳۔ نفیراں۔ باجے ۲۰۴۔ سرنائے۔ الغوزہ
۲۰۵۔ وزیراں۔ وزیر کی جمع (ص ۱۳) ۲۰۶۔ امیراں۔ امیر کی جمع (ص ۱۳) ۲۰۷۔ نمودن۔ کرنا ۲۰۸۔ عیاش۔ عیاس (ص ۱۳)
۲۰۹۔ کے۔ کا (ص ۱۳) ۲۱۰۔ جل۔ قابل تعظیم ۲۱۱۔ جھلا جھل۔ چمک دار، روشن ۲۱۲۔ مقیشی تاش۔ سونے چاندی کے تاروں سے بنا ریشمی
زری کا کپڑا ۲۱۳۔ مینائی منگل۔ مرصع جڑاؤ کمخواب ۲۱۴۔ زبرجد۔ ایک قسم کا زمرد زردی مائل ۲۱۵۔ بہت باندے۔ ہاتھ باندھ ۲۱۶۔ تخیر۔ فیاض
۲۱۷۔ سپہر خسروی۔ آسمان کی بادشاہت ۲۱۸۔ نیر۔ چمکدار ستارہ ۲۱۹۔ اول۔ ازل (ص ۱۳) ۲۲۰۔ تودد۔ دوستی، محبت ۲۲۱۔ یار۔ خوش
قسمت ۲۲۲۔ ستوں وار۔ نچھاور کروں ۲۲۳۔ ولے۔ لیکن (ص ۱۳) ۲۲۴۔ فر۔ شان وشوکت ۲۲۵۔ صولت۔ رعب، دبدبہ ۲۲۶۔ کن۔
کی طرف ۲۲۷۔ کیتک۔ کہاں تک (ص ۱۴) ۲۲۸۔ سبھی۔ سب ہی (ص ۱۴) ۲۲۹۔ قامتاں۔ قامت کی جمع ۲۳۰۔ جیوں۔ جیسے
(ص ۱۴) ۲۳۱۔ پلکیاں۔ پلکاں، پلک کی جمع ۲۳۲۔ لاریب۔ بے شبہ ۲۳۳۔ چند۔ چاند ۲۳۴۔ جزاراں۔ جزدوں ۲۳۵۔ الحاح۔ منت،
خوشامد ۲۳۶۔ منقاد۔ مطیع، فرماں بردار ۲۳۷۔ کچھ۔ نہ کچھ (ص ۱۴) ۲۳۸۔ پوچھ۔ پیچھ (ص ۱۴) ۲۳۹۔ اجابت۔ جواب دینا، قبول کرنا
۲۴۰۔ انچ۔ یوں ہی (ص ۱۴) ۲۴۱۔ کھینچ۔ رکاوٹ، کشاکش ۲۴۲۔ دیوڑی۔ دیوڑھی (ص ۱۵) ۲۴۳۔ دیکھائی۔ دکھائی (ص ۱۵)
۲۴۴۔ اسمار۔ رات کے کہانی قصے ۲۴۵۔ بچن۔ کلام ۲۴۶۔ خجل۔ شرمندہ ۲۴۷۔ لوگاں۔ لوگ (ص ۱۵) ۲۴۸۔ لک۔ تک (ص ۱۵)
۲۴۹۔ پروانگی۔ اجازت ۲۵۰۔ طاق۔ طاق، محراب (ص ۱۵) ۲۵۱۔ سیمیں۔ چاندی کا، نقرئی ۲۵۲۔ بام۔ چھت کے اوپر کا حصہ
۲۵۳۔ سقف۔ چھت ۲۵۴۔ تجمل۔ آئینہ ۲۵۵۔ طلب۔ روزہ ۲۵۶۔ بساط۔ فرش ۲۵۷۔ ٹھار۔ جگہ، طرف ۲۵۸۔ منگل۔ چمکیلا ہوا
۲۵۹۔ زربفت۔ بنے ہوئے ۲۶۰۔ مہتابی۔ کپڑا جس پر روپہلی نقوش ۲۶۱۔ رو نقرہ۔ سے نقرئی ۲۶۲۔ روپے۔ چاندی کے
۲۶۳۔ پان دان۔ پان دان کی جمع ۲۶۴۔ سنج۔ وزن (سنجیدن۔ وزن کرنا، تولنا) ۲۶۵۔ زندہ گانی۔ زندگانی (۱۵)
۲۶۶۔ گل زار۔ گل زار (ص ۱۵) ۲۶۷۔ نسترن۔ سیوتی کا پھول ۲۶۸۔ نسرین۔ ایک قسم کا سفید گلاب ۲۶۹۔ رشک۔ رشک (ص ۱۵)
۲۷۰۔ منے۔ میں (متروک) (ص ۱۵) ۲۷۱۔ دو زبان۔ دس زبان ۲۷۲۔ میں۔ خود آپ، غرور، تکبر ۲۷۳۔ صوفیاں۔ صوفی کی
جمع ۲۷۴۔ آغاز۔ آغاز (ص ۱۶) ۲۷۵۔ نزہت۔ پاکیزگی، فرحت بخش ۲۷۶۔ قریں۔ قریب، ملا ہوا ۲۷۷۔ تراوت۔ طراوت سے

۲۷۸۔حلاوت ۔ مٹھاس ، شیرینی ۲۷۹۔آنار ۔ انار (ص۱۶) ۲۸۰۔ چوکین ۔چاروں طرف ۲۸۱۔پانوں سے ۔پان سے
۲۸۲۔درختاں ۔ درخت کی جمع ۲۸۳۔ فلاخن ۔ گوپھن ، رسی کا پھندا جس میں پتھر رکھ کر پھینکتے ہیں ۲۸۴۔عطر ۔ نارنگی
۲۸۵۔نہالاں ۔نہال کی جمع (نہال کرنا ، خوش کرنا) ۲۸۶۔چہالاں ۔چہال کی جمع یعنی چھلانگ ۲۸۷۔غزالاں ۔غزال کی جمع (ہرن)
۲۸۸۔دلچپ ۔دلچسپ (ص۱۶) ۲۸۹۔دیک ۔دیکھ (ص۱۶) ۲۹۰۔کتی ۔کیجے ۲۹۱۔خاوند ۔مالک ۲۹۲۔شائستہ ۔شائستہ (ص۱۶)
۲۹۳۔دایم ۔دائم (ص۱۶) ۲۹۴۔ملایم ۔ملائم (ص۱۶) ۲۹۵۔شگفتہ ۔آشگفتہ (ص۱۶) ۲۹۶۔دھرپایا ۔پاؤں دھرنا ۲۹۷۔شجر پا ۔شجر بن
کر (ص۱۶) ۲۹۸۔ساحت ۔آنگن ، احاطہ ۲۹۹۔ستوناں ۔ستون کی جمع ۳۰۰۔رنگے ۔رنگ (ص۱۷) ۳۰۱۔رواق ۔بالا خانہ ۳۰۲۔گچ ۔
گچ ، چونا ، تعمیری مصالحہ ۳۰۳۔اندور ۔اندرون ، منع کرنا ۳۰۴۔تا رور جوڑتا روجوڑ ملانا ۳۰۵۔ ہے ۔ہیں (ص۱۷) ۳۰۶۔جوت ۔
روشن ۳۰۷۔بدر ۔ چودھویں رات کا چاند ۳۰۸۔یمنت ۔برکت ، سعادت ۳۰۹۔مقرون ۔نزدیک کیا گیا ۳۱۰۔ چو نر ۔ مورچھل
۳۱۱۔بادکش ۔ لٹکانے والا پنکھا جس کو رسی لگا کر ہلاتے ہیں ۳۱۲۔خشت ۔اینٹ ۳۱۳۔خوشتر ۔بہت خوش (فارسی خوشترک)
۳۱۴۔گلاں ۔گل کی جمع ۳۱۵۔اوڑ ۔اوڑھنا (ص۱۷) ۳۱۶۔نافرمان ۔ایک پھول کا نام ہے ۳۱۷۔صنوبر ۔ایک قسم کا سرو کا درخت
۳۱۸۔عرعر ۔چیڑ کا درخت ۳۱۹۔رین ۔رات ۳۲۰۔چین کر ۔چن کر (ص۱۷) ۳۲۱۔سیوتی ۔سفید گلاب ۳۲۲۔چنپا ۔سفید اور زرد رنگ
کا خوشبودار پھول ۳۲۳۔بستان ۔ بوستان کا مخفف ۳۲۴۔پڑتے ۔ پڑھتے (ص۱۷) ۳۲۵۔شہراں ۔ شہریں ۳۲۶۔لہراں ۔لہریں
۳۲۷۔خور ۔خورشید ، سورج ۳۲۸۔دلکشا ۔دل کشا (ص۱۷) ۳۲۹۔تراکم ۔ڈھیر لگنا ۳۳۰۔بہ ۔عمدہ ، اچھا ۳۳۱۔حین ۔وقت ، زمانہ
عرصہ ۳۳۲۔کم سالاں ۔کم عمر ۳۳۳۔پری رویاں ۔پری رو کی جمع ۳۳۴۔کے ۔ کے (ص۱۷) ۳۳۵۔طناز ۔شوخ ، بے باک
۳۳۶۔شصت ۔ساٹھ (۶۰) ۳۳۷۔عبارت ۔کنگل ، (عبارت سے) ۳۳۸۔طیر ۔پرند ، چڑیاں ۳۳۹۔مرغاں ۔پرندے ۳۴۰۔ثمر خوار ۔ثمر
خور ، پھل کھانے والے ۳۴۱۔افتادہ ۔گرا ، (افتادن سے) ۳۴۲۔آمیختہ ۔ملا ہوا ۳۴۳۔ریختہ ۔بکھرا ، گرا ۔ ۳۴۴۔ای ۔ یہ (ص۱۷)
۳۴۵۔حقا "۔ حق ثابت کرنا ۳۴۶۔بدیع "۔ بنانے والا ۳۴۷۔صانع "۔ پیدا کرنے والا ۳۴۸۔رب "۔ حفاظت کرنے والا
۳۴۹۔سیوم ۔سوم ، تیسرا ۳۵۰۔زشتی ۔بری ، خراب ۳۵۱۔العسر والیسر ۔دشواری ، مشکل ۳۵۲۔بر ۔ بڑھ (ص۱۸) ۳۵۳۔زیادتی ۔زیادہ
(ص۱۸) ۳۵۴۔مصنوع ۔مثالی ، کاریگری ۳۵۵۔گوہریں ۔موتیوں سے بھرا ہوا ۳۵۶۔رواق ۔چھت ۳۵۷۔چھپٹ ۔ چھت (ص۱۸)
۳۵۸۔دل خواست ۔ خواہش کرنا ۳۵۹۔آسودہ ۔بھرا ہوا ، آراستہ ۳۶۰۔چین ۔ چمن (ص۱۸) ۳۶۱۔نین سار ۔ آنکھوں کی مانند
۳۶۲۔اسپاس ۔آس پاس ۳۶۳۔آس ۔آرزو ۳۶۴۔جمن ۔انجمن (ص۱۹) ۳۶۵۔لنک ۔ نازو ادا سے ۳۶۶۔ڈلا ۔ڈولنا ، ہلنا
(ص۱۹) ۳۶۷۔موتیاں ۔بیلے کا ایک خوشبودار پھول ۳۶۸۔آب ہوتاب ۔آب وتاب (ص۱۹) ۳۶۹۔عبہر ۔چنبیلی ، زرد نرگس
۳۷۰۔شبو ۔رات کو کھلنے والا پھول ۳۷۱۔فرسا ۔فرسودہ ، گھسا ہوا ۳۷۲۔عہر گل ۔شاہی کلاہ ۳۷۳۔کپک ۔ چکور تیتر ۳۷۴۔دریتیم ۔یکتا ،
بڑا موتی ۳۷۵۔دیا ۔ عین ۔شام کا ابتدائی وقت ۳۷۶۔ثمر ۔پھل دار ۳۷۷۔بدسے ۔ظاہر ۳۷۸۔جام ۔امرود ۳۷۹۔جام ۔پیالہ
۳۸۰۔مویاں ۔ مو یعنی بال کی جمع ۳۸۱۔اورسی ۔ ایک زیور ۳۸۲۔شروطی ۔ عہد کرنا ۳۸۳۔تل تن ۔ قوی ہیکل
۳۸۴۔ڈٹا ۔ ڈٹ کر ، جم جانا ۳۸۵۔تقاطر ۔تقاطر ، قطرہ قطرہ ٹپکنا ۳۸۶۔کنے ۔ کی طرف (ص۲۰) ۳۸۷۔کا ۔ کے (ص۲۰)
۳۸۸۔قاف ۔ کوہ قاف ۳۸۹۔برزن ۔برزدن یعنی برابری کرنا ، مقابل ہونا ۳۹۰۔پاانداز ۔ پاپوش ۳۹۱۔نردبان ۔سیڑھی

۳۹۲۔اخضر۔سبز رنگ ۳۹۳۔ تعبیہ۔آراستہ کیا ۳۹۴۔لمع۔چمکنا ۳۹۵۔چتارے۔نقش و نگار بنانا ۳۹۶۔باکل۔بلا ہوا اناج
۳۹۷۔شبرنگ کاکل۔سیاہ گیسو ۳۹۸۔افتاں و خیزاں۔گرتے پڑتے ۳۹۹۔طور۔طرز،ڈھنگ ۴۰۰۔ازہار۔کلیاں ۴۰۱۔چشیدہ۔
(چشیدن) بمعنی چکھنا ۴۰۲۔عذار۔رخسار،چہرہ ۴۰۳۔مرغولے۔پیچھاتے ہوئے ۴۰۴۔اوگیا۔ ہوگا (ص ۴۱)
۴۰۵۔سوز کیلا ۴۰۶۔کنارے۔پیرے ۴۰۷۔ہر ہفت۔سولہ سنگار ۴۰۸۔ساحت۔میدان ۴۰۹۔لنگ۔ ناز و ادا، آن بان ۴۱۰۔ساز۔گونج،
آواز ۴۱۱۔زنگار۔تانبے کا رنگ ۴۱۲۔درسام۔مصور،نقاش ۴۱۳۔قدیر۔قدرت والا ۴۱۴۔بوالعجب۔انوکھا،بے مثال ۴۱۵۔صناع۔
کاریگر ۴۱۶۔قطرہ زن۔گام زن ۴۱۷۔راج وت۔راجپوت ۴۱۸۔گنج۔ بہادر،دلاور ۴۱۹۔خشمگیں۔غضب ناک ۴۲۰۔تیغ۔تیغ
(ص ۴۱) ۴۲۱۔دستی۔دکھائی دینا ۴۲۲۔عفیفہ۔پارسا خاتون ۴۲۳۔ ذال۔زال (بوڑھا) (۴۱) ۴۲۴۔ریش۔ زخم،گھاؤ ۴۲۵۔رکب۔
رکھ (ص ۴۱) ۴۲۶۔سترگ۔بزرگ،عظیم، بڑا ۴۲۷۔نیاری۔سرشت،طبیعت ۴۲۸۔ باتاں۔باتیں (ص ۴۲) ۴۲۹۔خور۔سورج
۴۳۰۔بتیاں۔باتیں (ص ۴۲) ۴۳۱۔سوا۔زیادہ کرنے والا ۴۳۲۔قصر جناں۔جنت کا محل ۴۳۳۔باپ۔ پاپا (ص ۴۲) ۴۳۴۔عقاب۔
آنکڑا،حلقہ ۴۳۵۔غرفہ۔کھڑکی،دریچہ ۴۳۶۔زشت۔بدشکل،بدصورت ۴۳۷۔مصباح۔چراغ ۴۳۸۔لیل و اصباح۔رات اور صبح
سویر ۴۳۹۔شمع دلاں۔شمع دان کی جمع ۴۴۰۔بنورے۔سورج کمل ۴۴۱۔سنورے۔سنوارے (ص ۴۲) ۴۴۲۔ازہار۔کلیاں پھولوں کی
۴۴۳۔کھولا۔کھولا (ص ۴۲) ۴۴۴۔مل۔انگوری شراب ۴۴۵۔وتیرہ۔طریقہ ۴۴۶۔دار۔نوک دار (ص ۴۳) ۴۴۷۔تک۔تنک (حرف)
۴۴۸۔نیارے۔نیارے (ص ۴۳) ۴۴۹۔سلسال۔صاف،خوش گوار پانی ۴۵۰۔دریج کر۔اچھی طرح چلا کر ۴۵۱۔طوبا۔طوبیٰ،جنت کا
ایک درخت ۴۵۲۔ہواک۔ایک نیلا پرندہ ۴۵۳۔تاک۔ انگور ۴۵۴۔بدشرن۔بری تاثیر ۴۵۵۔کند۔قطع کرنا،کاٹنا ۴۵۶۔غلولہ۔گولی
۴۵۷۔شستان۔شش شش کرنا ۴۵۸۔پایاں۔پایاب کی جمع بمعنی پانی والا ۴۵۹۔بادشاہی۔بادشاہی (ص ۴۳) ۴۶۰۔پیریں۔سنوارنا
،آراستہ کرنا ۴۶۱۔اژدر۔ہنگیوں۔اژدہنگیوں بمعنی خوبصورت کی جمع ۴۶۲۔شیر انیوں۔شیر کی طرح بہادر ۴۶۳۔روئیں تن۔دھات کے بنے
ہوئے،جس کے جسم پر تیغ و خنجر کارگر نہ ہوں ۴۶۴۔جلد رو۔تیز رفتار ۴۶۵۔رول۔چادر ۴۶۶۔ملالت۔ملال،رنج (ص ۴۳) ۴۶۷۔کو
دکاں۔بچہ،غلام ۴۶۸۔جگ۔ایسے (ص ۴۳) ۴۶۹۔سجگ۔سجھ (ص ۴۳) ۴۷۰۔اونے۔اس نے (ص ۴۳) ۴۷۱۔ایاغ۔
پیالہ،جام ۴۷۲۔بہر فو۔تعریف میں مبالغہ کیا ۴۷۳۔ہوگیا۔ہوگا (ص ۴۳) ۴۷۴۔آتل۔آتش (ص ۴۳) ۴۷۵۔نغل۔نغل در آتش
بمعنی بے قرار ۴۷۶۔سر بچے۔مولا،پرندہ ۴۷۷۔سفیدہ۔پرندہ ۴۷۸۔رفت۔توڑنا ۴۷۹۔جنور۔سورج کمل (ص ۴۵) ۴۸۰۔خور خوش
۴۸۱۔چندن۔صندل کی لکڑی ۴۸۲۔کا۔کی (ص ۴۵) دام۔بیٹھ ۴۸۳۔ریزاں۔بکھرے ہوئے،گرتے ہوئے
۴۸۵۔ہزار۔ہزاراں،ہزار کی جمع ۴۸۶۔عبہر۔چنبیلی ۴۸۷۔عرعر۔چیڑ کا درخت ۴۸۸۔نارون۔ انار کا درخت ۴۸۹۔پرن۔ثریا،ستارہ
۴۹۰۔چہندول۔ایک خوش آواز پرندہ ۴۹۱۔ضرورت۔مضاس ۴۹۲۔ہوے۔ہوہ (لیکن دونوں کے لیے "وہ" استعمال ہوتا ہے) ۴۹۳۔ثمرقند۔
سمرقند (ص ۴۵) ۴۹۴۔کے۔کر (ص ۴۵) ۴۹۵۔عواقب۔عاقبت کی جمع ۴۹۶۔تولے۔تولنا ۴۹۷۔وخجلت۔شرم و حیا
۴۹۸۔ثمن۔ذریعے سے (ص ۴۵) ۴۹۹۔درک الہام۔علم ہونا،سمجھنا ۵۰۰۔فتوح۔کامیابی ۵۰۱۔ثلث موالید۔موالید ثلاثہ،حیوانات
،جمادات ۵۰۲۔مکالیہ۔مقالیہ،کنجیاں ۵۰۳۔رسیدن۔پہنچنا ۵۰۴۔تعین۔مقرر کیے گئے ۵۰۵۔دستہا و تدگواروں ۵۰۶۔گردن۔
قوی،طاقت ور ۵۰۷۔سحت۔سکاری سے اچھے کام نکالنا ۵۰۸۔کلنگ۔ کلنگ،پرندہ (ص ۴۶) ۵۰۹۔جوزہ۔جوڑ نہ، بلند

۵۱۰۔لک لک۔ سارس ۵۱۱۔بوزنے۔ بیخ (ص۲۶) ۵۱۲۔کاغذاں۔کاغذ کی جمع ، دراج قفس ۵۱۳۔غبار۔جگہ، جانب ۵۱۴۔کھٹک۔ دربان، چوکیدار ۵۱۵۔شط۔دریا کا کنارہ ۵۱۶۔بط۔بیخ ۵۱۷۔معدن۔معدن کی جمع ۵۱۸۔مینو نشاں۔بہشت کی طرح خوب صورت ۵۱۹۔بنگ۔پھولوں کا پودا ۵۲۰۔عذلت۔عزلت (ص۲۷) ۵۲۱۔غرائب۔ غرائب، عجیب چیزیں ۵۲۲۔اجابت۔منظوری ۵۲۳۔کشائش۔کشادگی ۵۲۴۔صلابت ۔ سختی ۵۲۵۔مہابت۔خوف ۵۲۶۔شہامت۔بہادری، بڑائی ۵۲۷۔نغز۔عمدہ ۵۲۸۔ استظہار۔ظاہر کرنا ۵۲۹۔درج۔پٹاری، ذخیرہ ۵۳۰۔عبیر۔خوشبودار ۵۳۱۔ذال۔زال (ص۲۷) ۵۳۲۔کل۔گھرانا، خاندان ۵۳۳۔قامت۔قامت (ص۲۸) ۵۳۴۔مبین۔روشن ۵۳۵۔فش۔بھوجن کھلا ۵۳۶۔شاق۔مشکل، دشوار ۵۳۷۔فندق۔ مہندی لگی انگلیوں کی پور۔ ایران کا مشہور سرخ میوہ جسے انگلیوں سے تشبیہ دیتے ہیں ۵۳۸۔سات۔ساتھ (ص۲۸) ۵۳۹۔دوئم۔دوئم (ص۲۸) ۵۴۰۔مشغوف۔عاشق، شیدا ۵۴۱۔ہویدا۔ظاہر، روشن ۵۴۲۔سیوم۔سوم (ص۲۸) ۵۴۳۔سوں۔سے (متروک) (ص۲۹) ۵۴۴۔بخت سمجھنا ۵۴۵۔ثلاث۔تین (۳) ۵۴۶۔مرتسم۔مہر لگانا ۵۴۷۔دست اویز۔دستاویز (ص ۲۹) ۵۴۸۔سمور ۔لومڑی کی طرح کا جانور جس کی کھال کی پوستین بنتی ہے ۵۴۹۔قاقم۔ ایک جانور جس کے کھال کی پوستین بنتی ہے ۵۵۰۔دیبا۔منقش باریک ریشمی کپڑا ۵۵۱۔سنجاب۔ایک جانور جس کی ملائم پشم دار کھال کی پوستین بنتی ہے ۵۵۲۔حریر۔ریشم ۵۵۳۔مشجر۔پھول دار کپڑا ۵۵۴۔چنیں۔اس طرح (ص۲۹) ۵۵۵۔خوش باف۔اچھا بنا ہوا ۵۵۶۔رسام۔نقاش ۵۵۷۔قاقلہ۔الائچی ۵۵۸۔جوز۔اخروٹ ۵۵۹۔لوز۔بادام کی مٹھائی ۵۶۰۔لیٹیں۔ ولی، مہمان ۵۶۱۔لطافت۔پاکیزہ ، نفیس ۵۶۲۔صادل۔ گانے والا ۵۶۳۔ہاتھاں۔ ہاتھوں (ص۳۰) ۵۶۴۔نطع۔نطع، چمڑے کا دسترخوان ۵۶۵۔تجن۔ایک قسم کا میٹھا پلاؤ ۵۶۶۔مزعفر۔زعفران میں پکے میٹھے چاول ۵۶۷۔ازفر۔کھیر ۵۶۸۔قرص۔روٹی ۵۶۹۔گاؤ دیدہ۔ایک قسم کی میدے کی خمیری روٹی ۵۷۰۔قورمہ۔قورمہ (ص۳۰) ۵۷۱۔قلقل۔ قلقل ۵۷۲۔دہل ۔ نقارہ ۵۷۳۔ سرنائے۔ نفیری ۵۷۴۔نے۔ بانسری ۵۷۵۔لولیاں۔ رقاصائیں ۵۷۶۔مردنگ۔ڈھول ، طبلہ ۵۷۷۔مجیرے۔پیتل کی دو کٹوریاں جو طبلے کے ساتھ بجائی جاتی ہیں ۵۷۸۔خدیو۔بادشاہ ۵۷۹۔ جائزہ۔جائزہ (ص۳۱) ۵۸۰۔ دیبق۔ منقش ریشمی کپڑا ۵۸۱۔نیلک۔ایک قسم کا ریشمی کپڑا ۵۸۲۔درج۔پٹاری ۵۸۳۔بغر۔آگے چلنے والا ۵۸۴۔پوشیدن۔پہننا ۵۸۵۔تنبول۔تنبول، پان ۵۸۶۔منگول۔شوخ ۵۸۷۔شو۔تماشا، نظارہ ۵۸۸۔جیغہ۔پگڑی میں لگانے کا زیور ۵۸۹۔قل۔سرپر (ص۳۱) ۵۹۰۔سرپیچ۔جڑاؤ زیور جو پگڑی پر لگایا جاتا ہے ۵۹۱۔پرپیچ۔فریب ، دھوکا ۵۹۲۔بزاراں۔بزار کی جمع ، پارچہ فروش ۵۹۳۔سو کر۔ چمک کر ۵۹۴۔نج۔مثل، مانند (ص۳۲) ۵۹۵۔پرک۔ستارہ ۵۹۶۔شمشمس۔حس (ص۳۲) ۵۹۷۔عطل بند۔ بازو کا ایک زیور ۵۹۸۔بستہ۔بندھا ہوا ۵۹۹۔ تن نازی۔عرب کا جسیم گھوڑا ۶۰۰۔ابلق۔چتکبرا ۶۰۱۔عیال۔ ایال (ص۳۲) ۶۰۲۔یکاں۔بے نظیر ۶۰۳۔کچکول۔کشکول، بھیک کی کٹوری ۶۰۴۔منگیں۔مانگیں (ص۳۲) ۶۰۵۔قل قل۔ غلغل ، پرندوں کا چہکنا ۶۰۶۔بیلیں لگانے والا ۶۰۷۔شقایق۔گل لالہ ۶۰۸۔ تاروں۔ تاریں ، انار کا درخت ۶۰۹۔کدھا۔کتھا (کدھا بھی مستعمل ہے) ۶۱۰۔دیکھو۔دیکھو (ص۳۲) ۶۱۱۔تچن۔زنار، زنجیری ۶۱۲۔بجر۔بجز، سوائے ۶۱۳۔موہب۔موہب، مستعد ۶۱۴۔بیولت۔ سولہ سنگار ۶۱۵۔بے دل۔رنجیدہ، اداس ۶۱۶۔اکل وشرب۔کھانا پینا ۶۱۷۔تکن۔تک، تلک ۶۱۸۔اس کا بنا۔ اس کے بنا، اس کے بغیر ۶۱۹۔نجھاوے۔غور سے دیکھنا ۶۲۰۔بنتاب رے۔ سرخی مائل رنگ ۶۲۱۔داسی۔داس، غلام ۶۲۲۔ووی۔اسی (ص۳۲)

ادھر) (ص۴۵) ۷۴۲ـ کھینچے ـ کھینچا (۴۵) ۷۴۳ـ نغل ـ جوتا ۷۴۴ـ گرگل ـ گدگدی ۷۴۵ـ خاتوتو ـ خاتونوں ، خواتین (ص۴۵)
۷۴۶ـ ہونت ـ سولہ سنگار ۷۴۷ـ حاظر ـ حاضر ۷۴۸ـ سام ـ ساہم (ص۴۵) ۷۴۹ـ روان ـ دوڑتا ہوا ۷۵۰ـ جل پر ـ پانی
پر ۷۵۱ـ سات ـ ساتھ (مصرع میں سات ہی رکھا) ۷۵۲ـ مجے ـ مجھے (متروک) ۷۵۳ـ ای ـ یہ (ص۴۵) ۷۵۴ـ عاج ـ ہاتھی دانت
۷۵۵ـ فایز ـ فائز (ص۴۶) ۷۵۶ـ پریاں کا ـ پریوں کا (ص۴۶) ۷۵۷ـ ایک ایک باری ـ باری باری ۷۵۸ـ رجب ـ راجا (ص
۴۶) ۷۵۹ـ کری کی (متروک) ۷۶۰ـ چیت ـ دھیان، توجہ ۷۶۱ـ پو ـ پر (متروک) ۷۶۲ـ سہیاں ـ سہیلیاں (ص۴۶) ۷۶۳ـ کو ـ تیکو کا
مخفف، اچھا ۷۶۴ـ پرند (پردھان، ہندی) گہرا دھیان یا مراقبہ ۷۶۵ـ دوچ ـ بجزک ، شعلہ مارنا ۷۶۶ـ لنک ـ ازدوا
۷۶۷ـ چیتا ـ چاہتا (ص۴۶) ۷۶۸ـ منگوں ـ مانگوں (ص۴۶) ۷۶۹ـ اکسیر ـ اکسیر، کیمیا ۷۷۰ـ منگ کر ـ مانگ کر ۷۷۱ـ بیٹھیں ـ
بیٹھیں (ص۴۶) ۷۷۲ـ نغم ـ نغمہ ۷۷۳ـ سماں ـ آسمان ۷۷۴ـ وحش و طیار ـ جانور اور پرندے ۷۷۵ـ سیار ـ گردش کرنے والے ستارے
ـ سیارے ۷۷۶ـ باہم ـ سب کے ساتھ ۷۷۷ـ ندما ـ ندیم کی جمع بمعنی مصاحب، دوست ۷۷۸ـ ہور ـ اور (متروک) ۷۷۹ـ مردنگ ـ
ایک قسم کا باجا ۷۸۰ـ پرند (پردھان) نہایت زور، دھیان (ہندی) ۷۸۱ـ منگ لے ـ مانگ لے ۷۸۲ـ چیتا ـ چاہتا (ص۴۷)
۷۸۳ـ درفشاں ـ موتی بکھیرتا ۷۸۴ـ لباں ـ لب کی جمع ۷۸۵ـ راجوں ـ راجاؤں (ص۴۷) ۷۸۶ـ تفاوت ـ مختلف
۷۸۷ـ نیں ـ نے (متروک) ۷۸۸ـ دیا کرنا ـ مہربانی کرنا ۷۸۹ـ کیری ـ گری (ص۴۷) ۷۹۰ـ غلطاں ـ فکرمند ۷۹۱ـ خلایق ـ خلائق
(۴۷) ۷۹۲ـ زربے ـ زری کے (ص۴۷) ۷۹۳ـ فاخر ـ قیمتی ، عمدہ ، بیش قیمت ۷۹۴ـ سور و چندر ـ چاند سورج کی جوڑی
۷۹۵ـ نہفتہ ـ پوشیدہ ۷۹۶ـ کوں ـ کو (متروک) ۷۹۷ـ دوبارا ـ دوبارہ (ص۴۷) ۷۹۸ـ ارائش ـ آرائش (ص۴۷) ۷۹۹ـ پس و
پیش ـ آگے پیچھے ۸۰۰ـ چپ راست ـ دائیں بائیں ۸۰۱ـ اُراستہ ـ آراستہ ۸۰۲ـ شاہد ـ محبوب ۸۰۳ـ مہر و خور ـ چاند سورج
۸۰۴ـ زنگاری ـ سبز رنگ ۸۰۵ـ پوچے ـ پہنچے (ص۴۷) ۸۰۶ـ یگاں ـ یگانے ، رشتہ دار ، عزیز ۸۰۷ـ کرے ـ کیے (ص۴۷)
۸۰۸ـ سرافراز ـ سربلند ۸۰۹ـ تمہید ـ حمد و ثنا ۸۱۰ـ سرگزر ۸۱۱ـ چکیدہ ـ ٹپکا ہوا (ص۴۸) ۸۱۲ـ قطرہا ـ قطرے بہت سے
۸۱۳ـ نیساں ـ جس کی بارش سے سیپ میں موتی پیدا ہوتا ہے ۸۱۴ـ صدف ـ سیپ ۸۱۵ـ حسود ـ حاسد کی جمع ۸۱۶ـ خجل ـ شرمندہ
۸۱۷ـ طالع ـ نصیب ، قسمت ۸۱۸ـ مثمر ـ پھل دار ۸۱۹ـ جمعیت ـ گروہ ، آبادی ۸۲۰ـ عسل ـ شہد ۸۲۱ـ سم ـ زہریلا
۸۲۲ـ پاوے ـ پائے (ص۴۸) ۸۲۳ـ زہند ـ ہندوستان سے ۸۲۴ـ اہے ـ ہیں (ص۴۸) ۸۲۵ـ دایم ـ دائم (ص۴۸)
۸۲۶ـ صلاح ـ نیکی ، بھلائی ۸۲۷ـ ریاض ـ بہت سے باغ ۸۲۸ـ بتیاں ـ باتیں (ص۴۸) ۸۲۹ـ اذکار ـ تذکرہ ۸۳۰ـ اتمام ـ پورا کیا

Abstract

This is the unpublished text of a rare Mathnavi, Kam Kundla by Abbas, written in AD 1204. It is an Urdu translation of a Persian

Mathnavi: Jawahir-e Sukhan by an unknown poet. The transciption of the text was completed in 1252 AD by Jalaluddin Bukhari. Another copy of this Mathnavi has been mentioned in the Catalogue of Urdu Manuscripts Vol. 1, Anjuman Taraqqi-e Urdu, Pakistan, Karachi, under Serial No. 218. The researcher has added notes and annotations corelated with the text. The name of the poet of Jawahir-e Sukhan and the detail of the life and where abouts of Abbas are not known.

معیار: علمی و تحقیقی مجلہ، شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد ۲، شمارہ ۲، جولائی۔دسمبر ۲۰۰۹ء

''تثلیث فی التوحید'' کا ایک نمونہ:
مولانا ظفر علی خان، مولوی عبدالحق اور محفوظ علی بدایونی کا ایک غیر مطبوعہ مکتوب

زاہد منیر عامر*

مولانا ظفر علی خان (۱۸۷۳ء.....۱۹۵۶ء) کی زندگی اور خدمات کے حوالے سے متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن ان کی زندگی کے بعض احوال ہنوز پردۂ خفا میں ہیں۔ آئندہ سطور میں ایک ایسی غیر مطبوعہ دستاویز پیش کی جا رہی ہے جس سے ان کی زندگی کے بعض ایسے کوائف پہلی بار منظر عام پر آ رہے ہیں جن سے عام قاری تو کیا، ان کے سوانح نگار اور محققین بھی بے خبر رہے ہیں۔ یہ دستاویز مولانا ظفر علی خان کا ایک خط ہے جسے انھوں نے ''رسالہ'' قرار دیا ہے اور جو انھوں نے اپنے بے تکلف دوست بابائے اردو مولوی عبدالحق کے نام لکھا تھا۔ ۹ مئی ۱۹۰۶ء کو لکھا جانے والا یہ خط مولانا ظفر علی خان ہی کی زندگی کے حوالے سے اہم نہیں ہے بلکہ یہ خط اردو ادب کی دو اور ممتاز شخصیات مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء.....۱۹۶۱ء) اور مولوی محفوظ علی بدایونی (۱۸۷۰ء.....۱۹۳۳ء) کے سوانح پر بھی ایک بالکل نئے زاویے سے روشنی ڈالتا ہے اور ان تینوں شخصیتوں کے مزاج، عزائم اور روش کا رنگ بھی اندازہ گیر ہے۔ مکتوب الیہ مولوی عبدالحق، مولانا ظفر علی خان کے دورِ طالب علمی کے ساتھی، ہم مذاق اور ہم کار رہے۔ مولوی عبدالحق مڈل کا امتحان دینے کے بعد علی گڑھ کے ہائی سکول میں داخل ہوئے، انھوں نے یہیں سے انٹرنس اور ایف۔اے کے امتحانات دیے اور ۱۸۹۵ء میں بی۔اے کا امتحان دے کر فارغ التحصیل ہوئے۔ مولانا ظفر علی خان میٹرک کرنے کے بعد علی گڑھ آئے، یہاں سے انھوں نے ۱۸۹۳ء میں ایف۔اے کا امتحان دیا۔ اس امتحان کے بعد ان کے والد نے انھیں کشمیر بلا لیا۔ والد کی خواہش تھی کہ وہ ملازمت اختیار کریں لیکن ظفر علی خان ابھی مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے چنانچہ خود ان کے بقول:

> ''والد صاحب سے میں نے عرض کیا کہ مجھے بی۔اے پاس کر لینے دیا جائے، چنانچہ کشمیر کی ملازمت چھوڑ کر میں علی گڑھ چلا گیا اور دو سال کے بعد بی۔اے کے امتحان میں کامیاب ہو کر یونیورسٹی بھر میں تیسرے یا چوتھے نمبر پر رہا''[1]

ان کے ہم جماعت دوستوں میں عبدالحق اور محفوظ علی بدایونی بھی شامل تھے۔ مولانا شوکت علی ان سے ایک سال آگے اور مولانا محمد علی جوہر ایک سال پیچھے تھے۔ بی۔اے کا امتحان دینے کے بعد انھیں ابتدا ہی میں نواب محسن الملک کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ نواب محسن الملک ان دنوں بمبئی میں تھے اور انھیں ایک پرائیویٹ سیکرٹری کی ضرورت تھی، جو ان کی انگریزی کی خط کتابت کر سکے اور ان کے ایما پر ترجمہ

---

* مہمان پروفیسر، مسند اُردو و مطالعہ پاکستان، کلیہ لغات و ترجمہ، جامعۃ الازہر، قاہرہ۔

نگاری کے کام بھی انجام دے سکے۔ ایک نئے گریجویٹ کی حیثیت سے ظفر علی خان کو ملازمت کی ضرورت تھی چنانچہ وہ پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے نواب محسن الملک سے منسلک ہو گئے انھوں نے سال بھر یہ خدمت انجام دی۔ نواب محسن الملک کے ایما پر ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر کی مشہور تصنیف A History of the Conflict between Religion and Science کا اُردو ترجمہ معرکہ مذہب وسائنس اسی زمانے کی یادگار ہے۔ اس ترجمے کا انتساب نواب محسن الملک کے نام ہے بقول مترجم "جن کی تحریک پر پندرہ سال پہلے اس کتاب کا ترجمہ "کیا گیا۔ معرکہ مذہب وسائنس کے دیباچے پر "کرم آباد۔ پنجاب ۵ا مارچ ۱۹۱۰ء" درج ہے[۲]۔ وہیں اس کتاب کی اولین اشاعت کا سال بھی ہے اس لیے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ترجمہ گنگ جگ ۱۸۹۵ء میں کیا گیا یعنی بی اے کرنے کے فوراً بعد۔ گویا اس وقت وہ نواب محسن الملک کے ساتھ معتمد اور مترجم کے طور پر منسلک ہو چکے تھے۔

بمبئی کے اس زمانہ قیام میں اپنے استاد گرامی مولانا شبلی نعمانی کی زبانی حیدرآباد کے احوال سن کر ظفر علی خان کے دل میں حیدرآباد جانے کی خواہش پیدا ہوئی چنانچہ نواب محسن الملک اور مولانا شبلی کے مشورے سے ظفر علی خان بمبئی سے عازم حیدرآباد ہوئے اس سفر میں ان کے ہمراہ مولانا شبلی نعمانی کا ایک مکتوب بھی تھا جس میں مولانا شبلی نے اپنے لائق شاگرد کی نسبت نواب افسر الملک بہادر سپہ سالار افواج نظام کو لکھا تھا کہ:

> "اس نوجوان میں بلا کی تیزی ہے اس بڑھتے ہوئے دور میں ایسے ذہین نوجوانوں کا ہونا اس امر کی دلیل ہے
> کہ مسلمانوں میں جوہری کی نظر تربیت کی کمی ہے ظفر علی خان نے علی گڑھ میں رہ کر جو کچھ حاصل کیا ہے حیدرآباد
> اس سونے پر سہاگے کا کام دے سکتا ہے"[۳]

ظفر علی خان ۱۸۹۶ء میں حیدرآباد کی فوج میں ملازم ہو کر لیفٹیننٹ ہو گئے وہ فوج میں زیادہ دیر نہ رہ سکے اور جلد ریاست کے ہوم آفس میں منتظم پیشی اور صدر مترجم کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ یہاں ان کے کچھ علیگ احباب پہلے سے موجود تھے جن میں مولوی عبدالحق اور مولوی عزیز مرزا بھی شامل تھے عزیز مرزا ہوم سیکرٹری تھے ان کی تحریک پر ظفر علی خان نے لارڈ کرزن کی کتاب Persia & the Persian Question کا اردو ترجمہ خیابان فارس کے نام سے کیا یہ ترجمہ ۱۹۰۲ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ اسی زمانے میں انھوں نے شمس العلما سید علی بلگرامی کی فرمائش پر مولانا شبلی کی مشہور کتاب الفاروق کو انگریزی کا لباس عطا کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب مولانا شبلی بھی حیدرآباد آ چکے تھے اس زمانے میں کیے جانے والے دیگر تراجم میں Mystress of the court of London کا ترجمہ اسرارِ لندن، Kippling کی The Jungle Book کا ترجمہ جنگل میں منگل، رائیڈر ہیگرڈ کے The People of the Mist. کا ترجمہ سیرِ ظلمات بھی شامل ہیں۔

۱۹۰۲ء میں انھوں نے انگریزی کے افسانوی ادب کے اردو تراجم کی اشاعت کے لیے افسانہ کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا Mystress of the court of London کے اردو ترجمے اسرارِ لندن کی اشاعت اول ماہنامہ افسانہ ہی میں بالاقساط ہوتی رہی۔ "ایک سال کے اندر اندر مولانا کو احساس ہوا کہ وہ اس سے بہت بہتر کام کر سکتے ہیں" چنانچہ انھوں نے ۱۹۰۳ء میں دکن ریویو کے نام سے ایک معیاری علمی و ادبی رسالہ جاری کیا۔ اسرار لندن اس میں بھی شائع ہوتا رہا لیکن دکن ریویو نے بہت جلد ایک وقیع علمی ادبی مجلے کی حیثیت پائی اور یہ نیا رسالہ ملک کے سربرآوردہ اہل قلم کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ دکن

ریویو میں لکھنے والوں میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی، عبدالحق، نواب نصیر حسین خان خیال، نظم طباطبائی، وحشت کلکتوی، کشن پرشاد شاد، مرزا ہادی عزیز، نواب عزیز جنگ بہادر، مولوی منظور حسین اور مولوی معشوق حسین خان شامل تھے۔ ملازمت کا سلسلہ بھی جاری تھا اور دکن ریویو نے بھی ناموری کمائی تھی پھر یوں ہوا کہ ظفر علی خان یکا یک حیدرآباد سے سومالی لینڈ چلے گئے۔

مولانا ظفر علی خان کے سوانح نگاروں کے ہاں اس بات کی وضاحت نہیں ملتی کہ حیدرآباد کی اس ملازمت کے دوران مولانا ظفر علی خان سومالی لینڈ کیونکر چلے گئے تھے سوانح نگاروں کا خیال ہے کہ انھوں نے حیدرآباد کی ملازمت ترک کر دی تھی جو بعد از اں دوبارہ اختیار کی۔ ایک رائے یہ بھی دی گئی ہے کہ انھیں حیدرآباد کے ریونیو سیکرٹری مسٹر ہامس کا رڈان وا کری حجو میں "دوا کی نامہ" لکھنے پر شہر بدر کر دیا گیا تھا[۴] یہ بات سید محفوظ علی بدایونی کے فرزند ابن علی نے لکھی ہے اور ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ "وہ سیدھے قبلہ و کعبہ کے پاس سومالی لینڈ پہنچے جہاں تقریباً ایک سال تک رہے"۔ ظفر علی خان کا سومالی لینڈ کا سفر ۱۹۰۶ء کی بات ہے جیسا کہ آمدہ صفحات میں پیش کیا جانے والا خط اس بات کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کر رہا ہے۔۔۔۔ پھر یہ بھی غلط ہے کہ وہ سیدھے سومالی لینڈ پہنچے۔ ان کا سفر حیدرآباد سے بمبئی اور بمبئی سے سومالی لینڈ کی طرف ہوا، اور یہ بھی غلط ہے کہ تقریباً ایک سال رہے تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ ظفر علی خان کو حیدرآباد سے دوبار خارج البلد کیا گیا ایک بار ۱۹۰۹ء میں اور دوسری بار ۱۹۱۸ء میں یہ دونوں واقعات ۱۹۰۶ء کے بہت بعد کے ہیں، ۱۹۰۶ء میں انھوں نے وہاں کے بعض حالات کے باعث اپنے طور پر دو سال کی چھٹی حاصل کی تھی جیسا کہ اس خط سے ثابت ہو رہا ہے۔

وہ ۲۲/ مارچ ۱۹۰۶ء کو بمبئی سے آسٹریلین جہاز کے ذریعے روانہ ہوئے، ۲۷/ مارچ کو عدن پہنچے ایک ہفتہ قیام کے بعد ۳/ اپریل کو بربرہ پہنچے، اسی خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دو سال کی رخصت میں انھوں نے بعد ازاں چار ماہ کی توسیع بھی کروائی اور یہ خط اس حقیقت کا بھی مظہر ہے کہ جس وقت مولوی محفوظ علی سومالی لینڈ میں تعینات تھے اس وقت مولوی عبدالحق حیدرآباد میں برسرکار تھے اور ظفر علی خان رخصت پر اور اس خط کے ذریعے یہ حیثیت ثانی اثنین (تینوں دوست) اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی کرتی دکھائی دے رہی ہے۔

مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے پہلے قدم کے طور پر جس ماہنامہ پرچے کو زندہ کرنے کا عزم کیا جا رہا ہے وہ دکن ریویو کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا دکن ریویو جیسا کہ سطور ماقبل میں ذکر ہوا ۱۹۰۴ء میں جاری ہوا تھا، ۱۹۰۵ء تک مولانا ظفر علی خان حیدرآباد میں مقیم تھے اور یہاں ان کی سرگرمیوں کی کچھ تفصیل بھی ہمیں معلوم ہے مثلاً زودھوئی کی طغیانی ۱۹۰۵ء کے موقع پر ان کی سرگرمیاں اور ان کی طویل نظم "شورِ محشر" جس کا متن محفوظ ہے نیز دکن ریویو کا شمارہ جنوری ۱۹۰۵ء جس پر مولانا حالی نے ۱۱/ مارچ ۱۹۰۵ء کو تحسین کا خط لکھا جو مولانا حالی کے مجموعہ مکاتیب میں موجود ہے۔

بربرہ سے عبدالحق کو لکھا جانے والا یہ خط ظفر علی خان اور محفوظ علی بدایونی دونوں کی طرف سے ہے لیکن اس میں ظفر علی خان کی آواز زیادہ بلند ہے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ظفر علی خان، محفوظ علی اور عبدالحق کو ساتھ ملا کر کوئی بڑا کاروبار کرنا چاہتے ہیں، اگر یہ کاروبار کاغذ سازی کا کارخانہ لگانے کا ہو تو اس مقصد کے لیے ظفر علی خان اس فن کی تربیت پانے کے لیے بیرون ملک جانے کے لیے بھی تیار ہیں۔ اس اجتماعی کاروبار کی تمہید کے طور پر وہ اپنے پرانے شوق یعنی ادبی صحافت کو بھی پورا کرنا چاہتے ہیں اور عبدالحق کو دکن ریویو کی ادارت میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ واضح رہے کہ ایک دوست کی حیثیت سے عبدالحق پہلے بھی دکن ریویو کے قلمی معاون رہ چکے تھے اور انھوں نے

اس کے اسلام نمبر کے لیے ایک مفصل مضمون العالم الاسلامی بھی لکھا تھا جس کی داد میں مولانا حالی نے ایک خط لکھ کر دی تھی۔[۵]

عبدالحق کی طرف سے مولانا ظفر علی خان کے اس خط کا کیا ردعمل سامنے آیا، ہمیں اس کی کوئی خبر نہیں البتہ یہ ضرور معلوم ہے کہ محفوظ علی بربرہ چھوڑ کر بمبئی چلے آئے اور ظفر علی خان سے مل کر دی آسیڈینٹل اینڈ اورینٹل ٹریڈنگ کمپنی قائم کرائی اور ساتھ ہی ٹائمز بلڈنگ بمبئی میں ایک دفتر کرائے پر لے کر دکن ریویو کی اشاعت بھی شروع کردی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اگست ۱۹۰۶ء تک بمبئی واپس اور دکن ریویو کی از سر نو اشاعت وغیرہ کے اقدامات مکمل ہو چکے تھے تب ہی تو جنوری ۱۹۰۷ء میں دکن ریویو کا پہلا شمارہ بمبئی سے شائع ہو گیا جس میں جنوری ۱۹۰۵ء کے شمارے پر مولانا حالی کی رائے پر مبنی خط بھی شائع کیا گیا۔

مولوی عبدالحق نے محفوظ علی اور ظفر علی کے حوالے سے ایک جگہ لکھا ہے کہ: ''(محفوظ علی) بمبئی پہنچے تو مولوی ظفر علی خان صاحب سے ملاقات ہوئی''[۶]

آمدہ صفحات میں درج ہونے والا خط مظہر ہے کہ مولانا ظفر علی خان اور میر محفوظ علی کی وہ ملاقاتیں جن میں مستقبل کے خیالی گھوڑے دوڑائے گئے، بربرہ میں ہوئیں۔ یہ درست ہے کہ مولانا ظفر علی خان حیدرآباد سے بربرہ جانے کے لیے بمبئی سے ہو کر گئے تھے جب کہ مولوی محفوظ علی ۱۹۰۴ء سے بربرہ میں تھے، جیسا کہ مولانا ظفر علی خان کے نام ان کا ایک خط مظہر ہے کہ وہ بربرہ کی ملازمت کے لیے اپنے وطن (بدایوں) سے روانہ ہو کر ۹ مئی ۱۹۰۴ء کو بمبئی اور یہاں دو روز قیام کے بعد ۱۲ نومبر ۱۹۰۴ء کو منگولیا جہاز کے ذریعے براہ کیپ عرب افریقہ کے لیے روانہ ہو گئے تھے[۷] اس لیے ظفر علی خان اور محفوظ علی کی خیالی پلاؤ پکانے والی ملاقاتیں بمبئی میں نہیں بلکہ بربرہ ہی میں ہوئیں۔

آمدہ صفحات میں درج ہونے والے خط میں محفوظ علی نے ظفر علی خان کے قلم سے لکھوایا ہے کہ ''میں ستمبر میں ۲۲ (بائیس) مہینے کی ملازمت پوری کر کے........'' گویا انھوں نے نومبر ۱۹۰۴ء میں بربرہ کی ملازمت جوائن کی تھی اور اس بات کی تصدیق محفوظ علی کے خط بنام ظفر علی خان سے بھی ہو جاتی ہے جس کا حوالہ سابقہ سطور میں گزرا۔[۸] اس خط کی ساری طول گفتاری اور متنوع مضامین میں سے اصل مدعا کی جستجو کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں دوستوں کے منصوبے دکن ریویو کی نشاۃ ثانیہ اور کاغذ سازی کی مل یا چمڑے کے کارخانے کے قیام پر مبنی تھے۔ مولانا ظفر علی خان اور محفوظ علی کے بعد کے احوالِ حیات کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ محفوظ علی جیسا کہ خط میں بیان ہوا بربرہ سے بمبئی آگئے اور ظفر علی خان بھی بمبئی پہنچ گئے، محفوظ علی اور بقول خود دو یا تین ماہ کی چھٹی لے کر آئے ہوں گے (انھوں نے لکھوایا تھا کہ عبدالحق کے پاس پہنچوں گا اور انھوں نے عبدالحق کو حیدرآباد سے لے کر بمبئی پہنچنا تھا) مستقبل میں ان منصوبوں کی جو صورت پذیری ہوئی ان میں ایک دکن ریویو کا احیا تھا اور دوسرے ایک درآمد برآمد کی تجارتی کمپنی دی آسیڈینٹل اینڈ اورینٹل ٹریڈنگ کمپنی کا قیام تھا اس کمپنی کے قیام کے لیے دونوں دوستوں ظفر علی خان اور بدایونی نے بمبئی کی تجارت گاہوں کمپنیوں اور مشہور دکانوں کی تحقیق کی، مختلف اجناس اور مختلف ملکوں کی مصنوعات کی جانچ پڑتال کی اور کاروبار کے ہر ممکنہ پہلو پر غور و خوض کیا۔ اس تحقیق کے دوران میں بہ قول عبدالحق ایک دستی یعنی نوٹ بک ہر وقت ان کی جیب میں رہتی تھی جہاں کوئی کام کی چیز نظر پڑی فوراً اس میں درج کر لیتے۔ تحقیق احوال کے بعد انھوں نے اپنے منصوبے کی جزوی اور کلی تمام تفصیلات اس میں لکھ لی تھیں۔ یہ نوٹ بک کوئی دو سو صفحات پر مشتمل نہایت عمدہ کاغذ پر ٹائپ شدہ نفیس منبری جلد کی کتاب بن گئی تھی۔ یہ ہوم ورک مکمل کرنے کے بعد انھوں نے اپنے دوستوں اور ہم خیالوں کو گرین ہوٹل میں فرسٹ کلاس ڈنر دیا اور یہ کتاب دوستوں کی اس محفل میں پیش کی۔ اس کے بعض حصے پڑھ کر سنائے بعض کی تشریح کی۔ سب دوستوں نے اسے پسند کیا اور دونوں کو مبارک باد دیتے ہوئے

نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ اس ڈنر سے اگلے دن اتوار تھا، تیسرے دن سے دی آ مپیریئل لینڈ اور کیمل ٹریڈنگ کمپنی کا دفتر کھولا گیا۔ اس ادارے میں جاپان سے ریشم اور اون کا سامان، چین سے چینی ظروف، تصویریں اور پردے، افریقہ سے ہاتھی دانت کا سامان، فرانس سے زیبائش و آرائش کی اشیا وغیرہ وغیرہ درآمد کی گئیں[۹] لیکن یہ کاروبار زیادہ عرصہ نہ چل سکا اور دونوں دوست اپنے اپنے سرمائے کا نقصان اٹھا کر اپنی پرانی مصروفیات کی طرف لوٹ گئے۔ اس کاروبار میں خسارے کو بنیاد بنا کر مولانا ظفر علی خان کے ناقدین نے انھیں اعتراضات کا نشانہ بنایا اور میر محفوظ علی کے مالی نقصانات کی ذمہ داری ظفر علی خان پر ڈالی گئی۔

ظفر علی خان کے ناقدین نے اس منصوبے کی نسبت یہ کہا کہ ”حقیقت یہ ہے کہ میر محفوظ علی صاحب جیسے ہونہار اور لائق شخص کو ایڈیٹر ستارۂ صبح نے دنیا سے کھو دیا اور یہ ایسا ظلم صریح ہے جس کی پاداش سے وہ کبھی محروم نہ رہیں گے“[۱۰]

بریرہ کی صحبتوں میں میر محفوظ علی اور ظفر علی خان کے درمیان اس کاروبار کے منصوبوں کی نسبت معترضین نے لکھا ہے کہ:

یہاں پہنچ کر میر محفوظ علی صاحب کو آزادانہ زندگی پر اختیار کرنے پر ایسے شدومد کے ساتھ لکچر دیے اور انھیں بمبئی چل کر تجارت کرنے پر اس حد تک آمادہ کیا کہ مہینہ ہی بھر کے بعد جب ظفر علی خان بریرہ سے ہندوستان واپس آنے لگے تو ان کی رائے کے مطابق میر محفوظ علی صاحب نے بھی رخصت حاصل کی اور ان کے ساتھ ہو لیے اور بمبئی آ کر کاروبار کی طرح ڈالی۔ ظفر علی خان کے پاس کو روپیہ نہ تھا مگر باتوں اور اسکیموں کی کمی نہ تھی۔[۱۱]

یہ منصوبہ جس نے بقول معترضین ”غریب محفوظ علی کو بالا وفقان بمبئی کی گلیوں میں جوتیاں چٹخانے کے لیے چھوڑ“[۱۲] دیا اس خط میں زیر بحث ہے، اس خط کے مکتوب الیہ مولوی عبدالحق ہیں، دیکھنا چاہیے کہ عبدالحق اس منصوبے کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں۔ محفوظ علی کے بریرہ چھوڑ کر بمبئی آنے کا سبب محض ظفر علی خان کے لیکچر تھے یا ان کے کچھ ذاتی احوال بھی اس فیصلے کا سبب تھے.....؟ یہ جاننے کے لیے پہلے ہم اس خط کے مکتوب الیہ کی رائے دیکھتے ہیں اور پھر خود محفوظ علی کی رائے سے رجوع کیا جائے گا، عبدالحق نے مضامین محفوظ علی کے مقدمے میں لکھا ہے:

”سالی لینڈ کی عجیب سرزمین میں ان کا دل نہ لگا اور استعفیٰ دے کے ہندوستان چلے آئے“[۱۳]

اس مقام پر پہنچ کر ظفر علی خان کے ناقدوں اور معترضین کے اعتراضات بھی دیکھ لینے چاہئیں، معترضین کے اعتراضات یہ تھے:

☆میر محفوظ علی نے ظفر علی خان کے کہنے پر رخصت لی۔

☆ظفر علی خان کے کہنے پر اس میں توسیع کروائی۔

☆ظفر علی خان کی رائے سے استعفیٰ دیا۔

☆جب ظفر علی خان کو رجسٹراری کا عہدہ ملا تو وہ بلا مشورہ واپس حیدرآباد چلے گئے۔

☆میر محفوظ علی بمبئی کی گلیوں میں جوتیاں چٹخاتے رہ گئے۔

☆میر محفوظ علی کے سرمائے کا بیشتر حصہ ظفر علی خان کی اولوالعزمیوں کی بدولت تجارت کی بجائے محض ظاہری طمطراق کی نذر ہوا۔

☆ حقیقت یہ ہے کہ میر محفوظ علی جیسے ہونہار اور لائق شخص کو ظفر علی خان نے دنیا سے کھو دیا، اس کی زندگی برباد کر دی، تمام امیدوں اور امنگوں کو خاک میں ملا دیا۔

☆جب اس ظالم نے قدموں پر سر رکھ دیا اور عذر خواہی کی تو میر صاحب نے معاف کر دیا۔"[۱۳]

اب یہ دیکھنا ہے کہ بریرہ کے قیام کو چھوڑنے اور کوئی نیا کاروبار کرنے سے متعلق خود محفوظ علی کی کیا رائے تھی۔ اوپر منقول اعتراضات میں سے پہلے تین اعتراضات کا جواب اگلے صفحات میں منقول خط سے خود بزبان محفوظ علی فراہم ہو رہا ہے جس میں انھوں نے اپنے گھریلو اور خانگی امور بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"میرے ذاتی معاملات اس درجہ پریشان کن ہیں کہ اگر سچ پوچھو تو میرا ایشیا سے باہر نکلنا تو کجا ہندوستان سے بلکہ محالک متحدہ آگرہ و اودھ سے، بلکہ رتبل کھنڈ ڈویژن سے، بلکہ بدایوں سے، بلکہ سیدباڑہ سے، بلکہ گھر سے نکلنا بھی بہت مشکل ہے۔ نوکری کی کوشش کھیل روپیہ کی ہوس.......... بہر حال میں یہاں چلا آیا اور اس کے علاوہ میری صحت ایسی زبردست نہیں کہ اس ملک کی سخت آب و ہوا کا عرصہ تک تحمل کر سکے نہ اس قدر کمزور ہے کہ دو دو برس تین تین برس عالم تجرد میں گزاروں.................................."

"آج کل میرے ذاتی معاملات اس درجہ پیچیدہ اور مختلف ہو رہے ہیں کہ اگر ان کا تفصیلی حال تمہیں لکھوں تو میرے ساتھ بہت کچھ ہمدردی کرو گے۔ والد صاحب قبلہ کی عمر اب اس قابل نہیں کہ وہ گھر کے انتظام کے بار کے متحمل ہوں۔ کوئی دوسرا بھائی نہیں۔ بچے اس قابل نہیں۔ عزیز اور دل برادری سب خون چوسنے والے اور سر کی ٹوپی تاکنے والے ہیں۔ کوئی ایسا معتبر آدمی نہیں ملتا جسے حل و عقد کا ذمہ دار بنایا جائے۔ اگر خدا نخواستہ کوئی فوری یا سخت پریشانی کی بات ہو تو پندرہ روز میں مجھے اطلاع ہو اور دوسرے پندرہ دن کے بعد یہاں سے کوئی کارروائی کی جا سکے۔ حال میں میرے ایک عزیز نے کچھ زیادتی کی تھی میں نے جناب کمشنر صاحب سے استدعا کی کہ اس کا تدارک کر دیں۔ انہوں نے بکمال مہربانی حکام متعلقہ کو لکھ دیا جس سے امید ہے کہ معاملات روبہ اصلاح ہو جائیں گے مگر یہ انتظام عارضی اور چند روزہ ہے اور روز روز اس طرح سے وہ کیوں لکھنے لگے تھے۔ نظر بر آں مجھے تو یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چاہے یہاں کتنی ہی معقول تنخواہ ملتی ہو اور چاہے کتنی ہی عزت و آبرو ہو لیکن ان سب کا چھوڑنا آسان ہے بہ مقابلہ بدایوں کے معاملات کو خراب ہونے دینے کے جن پر آئندہ نسلوں کا سہارا اور بھروسا ہے۔ میں مکرر سے کہتا ہوں کہ تم اگر جاپان یا انگلستان جاتے ہو تو جاؤ مگر اس طرح سے کہ پہلے میں، تم اور عبدالحق تینوں ایک جگہ باہم مل کر عہد کی تجدید کریں جو آج سے دو سال قبل حیدر آباد میں ہوا تھا اور جس کی رو سے ہم نے یہ اقرار کیا تھا کہ اپنی آئندہ قسمتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح سے وابستہ کر دیں گے کہ ہم پر یہ مثل صادق آنے لگے.................."

ان اقتباسات سے معترضین کے خیالات کی نفی ہو جاتی ہے۔ آخری دو اعتراضات بھی بادر ہوائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ظفر علی خان اور محفوظ علی دونوں دوستوں کی شخصیتوں میں کاروبار کے لیے موزوں عناصر موجود ہی نہ تھے اور وہ اپنے لیے ایک ایسے مستقبل کی منصوبہ بندی کر رہے تھے جس کے تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت ان میں تھی ہی نہیں چنانچہ پونجی کم ہوتی چلی گئی مال کی نکاسی برائے نام ہوئی اور رفتہ رفتہ تجارت کی دکان بڑھانی پڑی۔ اس خط کے مکتوب الیہ مولوی عبدالحق نے اس کا الزام ملک کے تعلیمی نظام کو دیا ہے ان کے خیال میں "انسان کی صلاحیت اس میں ہے کہ وہ اپنی صلاحیت کو پہچانے، اس کی نہ ہمارے بزرگ پروا کرتے ہیں نہ ہمارے معلم اور استاد لڑکے سکولوں اور کالجوں

میں اس طرح داخل کر دیے جاتے ہیں جیسے بھیڑ بکریاں باڑے میں۔ پڑھتے پڑھتے جب امتحانوں کی آزمائش سے صحیح سلامت نکل آتے ہیں تو بھٹکتے پھرتے ہیں، مہینوں دفتروں کے چکر کاٹتے ہیں، بُرا بھلا جو موقع ملتا ہے صبر شکر کر کے قبول کر لیتے ہیں۔ ایسے خوش نصیب چندہی ہوتے ہیں جنھیں اپنے ذوق کے موافق کوئی کام مل جاتا ہے یہ تعلیم جو ایک سو برس سے ہمارے ملک میں جاری ہے ایک ہی ڈھرے پر چلی آرہی ہے چھوٹی موٹی اصلاحوں سے کام نہیں چلتا، انقلابی اصلاحوں کی ضرورت ہے۔"[15] محفوظ علی کے فرزند ابن علی کی رائے کے مطابق جس کی سات پشت میں کسی نے تجارت نہ کی ہو اور جس کا آبائی پیشہ زمینداری رہا ہو وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔[16]

مولوی عبدالحق ہی کا تجزیہ یہ بھی ہے کہ یہ دو گریجویٹ جن کی سات پشتوں میں کسی نے تجارت نہیں کی تھی اور جنھوں نے کبھی تجارتی ماحول بھی نہیں دیکھا تھا چوبیس پچیس سال سکولوں میں گزار کر دو چار دفتروں کی خاک چھان کر تجارت کرنے چلے تھے۔ "اس تجربے کے تلخ ہوتے پر درآمد برآمد کی تجارت خام خیالی نہ تھی تو کیا تھی"[17] نتیجہ یہ ہوا کر "ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ ہمارے دونوں دوست ایک لٹے پٹے قافلے کے مسافروں کی طرح چلے آرہے ہیں، بچا کھچا سامان بھی ساتھ ہے جس سے ان کی نفاست ذوق کا پتہ چلتا تھا، ان میں سے بعض اشیا حیدر آبادی دوستوں نے خرید لیں ایک دو چیزیں اب بھی میرے پاس بطور یادگار باقی ہیں۔"[18]

ظفر علی خان کو ملازمت مل جانے اور محفوظ علی کے جوتیاں چٹخاتے رہ جانے کی بات بھی غلط ہے اس لیے کہ ظفر علی خان تو پہلے ہی برسر روزگار تھے اور دکنی کے اس ناکام تجربے کے بعد وہ حیدر آباد کی ملازمت میں واپس پہنچ گئے اور محفوظ علی کو بھی صدر نظامت کوتوالی میں مترجمی کی خدمت مل گئی تھی اور بقول عبدالحق "دونوں دوست ایک جگہ ہو گئے تھے اور خوش تھے"[19] اور یہاں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ محفوظ علی ۱۹۰۱ء میں جب خیر پور سندھ کی ملازمت سے فارغ ہو کر بدایوں آبیٹھے تھے تو اسی وقت ظفر علی خان حیدر آباد میں عزیز مرزا کے دفتر میں مترجم تھے اس بات کا اعتراف محفوظ علی کے بیٹے ابن علی نے بھی کیا ہے کہ اس وقت ظفر علی خان نے عزیز مرزا سے کہہ کر راجہ دائے رایاں بہادر کے یہاں محفوظ علی کا تقرر کروایا تھا۔[20]

البتہ محفوظ علی کو اس وقت بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑا جب حیدر آباد میں رہتے ہوئے انھیں وطن کی یاد نے بے تاب کر دیا اور وہ "ایک روز نوکری چھوڑ چھاڑ کر وطن کو سدھار" گئے یہ صورت حال سید صاحب کی خود اختیار کردہ تھی اس میں کسی کا دوش نہ تھا اور پھر اس کے بعد روزگار اور مصروفیات کے بہت سے مواقع نے ان کے در پر دستک دی لیکن ان کی افتادِ طبع اور بدایوں سے غیر معمولی وابستگی نے انھیں کسی کام کی طرف مائل نہ ہونے دیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے دہلی سے "ہمدرد" جاری کیا تو انھیں اس سے منسلک کرنے کی کوشش کی۔ مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کو اورنگ آباد سے دہلی منتقل کیا تو کوشش کی کہ وہ انجمن میں آجائیں لیکن وہ وعدہ کرنے کے باوجود کبھی دہلی نہ آئے اور "حیدر آباد کی ملازمت ترک کرنے کے بعد وہ بدایوں سے باہر نہ گئے اور آخر دم تک وہیں رہے"[21]

خود حیدر آباد میں ان کے صاحب زادے ابن علی پولیس میں ملازم تھے بدایوں کی محبت میں ان کے پاس جا کر رہنا بھی گوارا نہ کیا کبھی کبھار ملنے جاتے تھے اور چاہتے تھے کہ ابن علی پولیس کی ملازمت چھوڑ دیں اس لیے ظفر علی خان کے ناقدین مولوی ظفر الملک ہوں یا ضیاء الحق باپوڑی [22] کے اعتراضات بے وزن ہیں اور ان کا مدار محض سماع پر ہے، البتہ حیرت اس بات پر ہے کہ ضیاء الحق باپوڑی، مولوی عبدالحق کے بھائی تھے، انھوں نے اپنے بھائی کے ایک نہایت عزیز دوست کو رسوا کرنے کے لیے پمفلٹ بازی کی، دوسری طرف ظفر الملک علوی سے بھی ظفر علی خان کا پرانا دوستانہ تھا، مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا ظفر علی خان سے اپنی اولین ملاقات کی یاد تازہ کرتے ہوئے

لکھا تھا کہ "ذاتی نیاز غالباً ۱۹۱۱ء کے آخر میں حاصل ہوا، جب وہ اپنے عزیز ترین دوست سید محفوظ علی بدایونی بی اے (علیگ) کے ہمراہ اُردو ہی کے کسی کام کے سلسلے میں لکھنو آئے اور مولوی ظفر الملک علوی کے ہاں مقیم ہوئے" [۴۳]

اس دوست داری اور تعلق کے باوصف کتاب الاشرار اور پولیٹیکل گرگٹ جیسی کتابوں کی تالیف و اشاعت حیران کن ہے، یہ حیرت رفع ہو جاتی ہے جب اس پمفلٹ بازی کے پس پردہ کارفرما غلام نظام الدین نظامی بریلوی کا ہاتھ دکھائی دیتا ہے، جس نے پولیٹیکل گرگٹ کا دیباچہ بھی لکھا، نظام بریلوی کے پردے میں ظفر علی خان کے حریف خواجہ حسن نظامی چھپے ہوئے تھے، جس کی کچھ تفصیل راقم اپنی تالیف مکاتیب ظفر علی خان (طبع اول ۱۹۸۶ء، طبع جدید ۲۰۰۸ء) میں پیش کر چکا ہے۔

اس معاندانہ مہم سے بھی میر محفوظ علی بدایونی اور ظفر علی خان کے باہمی تعلق کے شیشے میں کوئی بال نہ آیا، محفوظ علی کو ظفر الملک علوی اور ضیاء الحق بابوڑی کی یہ پمفلٹ بازی پسند خاطر نہ ہوئی [۴۴] اور ظفر علی خان اس کے بعد بھی محفوظ علی کی محبت کا دم بھرتے رہے، دونوں کی باہمی محبت کا حال جاننے کے لیے ظفر علی خان کے اپنی اہلیہ کے نام خطوط ملاحظہ فرمائے جا سکتے ہیں، ان تمہیدی معروضات کے بعد اب ملاحظہ ہو مولانا ظفر علی خان کا وہ دلچسپ خط جو اس تثلیث فی التوحید یعنی ظفر علی خان، محفوظ علی بدایونی اور عبدالحق کی زندگیوں، شخصیتوں اور سوانح پر کئی معلومات کا مخزن ہے اور پہلی بار منظر عام پر آ رہا ہے، مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کی باہمی بے تکلفی اور دور شباب کی زور آوری کے سبب بعض مقامات ایسے نازک ہیں کہ یہ طباعت ان کا بار نہیں اٹھا سکتی اس لیے انھیں حذف کر دیا گیا ہے، بعض مقامات پر تکمیل عبارت کے لیے اضافے کی ضرورت پیش آئی ہے، ایسے اضافوں کو جو تعداد میں زیادہ نہیں قلابین میں محدود کر دیا گیا ہے۔ خط کے اصل املا کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، ضروری توضیحات حواشی میں درج کر دی گئی ہیں۔

[۴۵] ر ر ہ

۹ مئی ۱۹۰۶ء

ڈیر عبدالحق [۴۶]

اُن تمام خطوط میں جو میں یہاں آ کر احباب کو لکھنا چاہتا تھا تمہارے والے خط کا نمبر سب سے پہلا ہونا چاہیے تھا مگر کچھ تو اس خیال سے کہ تمہیں جو خط لکھوں وہ اس قدر مطول و مشرح ہو کہ زلیخا کے دوانیاں رکی بھی.................. اور کچھ محفوظ [۴۷] کی اخوت کی وجہ سے جس نے اصرار کیا کہ عبدالحق والا خط تمہید سے بھرا ہوا ہو اور ایسا ہو کہ ایک فقرہ میرا (محفوظ کا) اور ایک تمہارا (مجھ ظفر کا) ہو خط لکھنے میں یہ اصطلاح حیدرآباد تو طے ہی ہوتی رہی ایک خیال یہ بھی تھا کہ تم میرے خط کا جواب لکھنے میں اس کاہلی اور تساہل سے کام لو گے جو ادیبوں سے خط و کتابت کرنے میں تمہارا شعار خاص ہے، اس لیے میں نے بھی خیال کیا کہ جلدی کیا ہے

ع　یہ بھی کر لیں گے جو فرصت ہوگی

چونکہ تم کو لازمی طور پر یہ خیال ہوگا کہ وہ سرزمین جس میں جناب مولوی محفوظ صاحب مع اپنی توند کے جس کا سوا پاؤ روز افزوں ترقی پر ہے اور مع اپنی اُس داڑھی کے جو حیدرآباد دکن میں بد قطعی نے [۴۸] سے عریض ہو چلی تھی لیکن جو سومالی لینڈ میں آ کر برف ہا رو بد برچیدزاغ [۴۹] کا پورا مصداق ہو گئی ہے، براجمان رہے ہیں کیسی ہوگی۔ اس لیے ضرور ہوا کہ اپنے حالات سفر اور یہاں کی مختصر کیفیت قلمبند کر

کے رنج خدمت اپنے مخلص دلی اور محب قلبی مولوی محمد عبدالحق کے جن کا عارض شجر رشک صحرائے لق و دق ہے اور جن کی فصاحت و بلاغت اور علم و فضل کے سامنے بڑے ممتحان و بالغ نظران عرب عجم کا رنگ فق ہے ہرگز رائیں تا کہ اس شکن [۳۰] سرائے میں یہ نقش ارژنگ [۳۱] جوعاصی پر معاصی حقیر فقیر گنہگار ازلی و بندۂ نابکار لم یزلی ظفر علی عفی عنہ سے یادگار رہے بقول شاعر

غرض نقشے است کز ما باز ماند کہ ہستی را نمی بینم بقائے [۳۲]

آغاز کتاب

فصل اول

رنج بیان پہنچنے اس احقر کے بندرگاہ عدن میں

۲۳/ مارچ کو جہاز آسٹریلین میں جو مساجریز میری ٹائم، (فرانسیسی کمپنی) کا اسٹیمر ہے روانہ ہو کر ۲۸ کو میں عدن پہنچا اور ہوٹل ڈیلوئیورس میں جس کا مالک ایک پارسی ہے مقیم ہوا۔ بربرہ جانے والا اسٹیمر میرے پہنچنے سے ایک دن پہلے روانہ ہو چکا تھا اور دوسرا جہاز ایک ہفتہ کے بعد روانہ ہوتا اس لیے مجبوراً مجھے ایک ہفتہ "اپنی ایڑیاں عدن میں ٹھنڈی کرنی پڑیں" میجر بیگ [۳۳] نے ایک خط ایڈ سے بیل صاحب [۳۴] اسسٹنٹ ریذیڈنٹ عدن کے نام مجھے دیا تھا۔ اس خط کے ذریعے سے میں سے ملا۔ کپتان جناک [۳۵] (اسسٹنٹ ریذیڈنٹ عدن) بڑے خلق اور عنایت سے پیش آئے اور مجھے ایک چٹھی بربرہ کے کمشنر کے نام دی۔ عدن ریذیڈنسی کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر کوہدن [۳۶] سے جو مالابار کی طرف کے ہیں اور سید رستم علی [۳۷] دفتر ادو مجسٹریٹ عدن سے جو ہندی الاصل ہیں مگر اب یہیں کے ہو گئے ہیں میری ملاقات ہوئی اور ان دونوں نے میری دعوت کی۔ ان کے علاوہ وکاؤس جی دنشا کی فرم کے مالک مسٹر ہرمزجی [۳۸] سے [بھی] ملاقات ہوئی۔ یہ ایک نہایت ذی اثر اور بہت بڑا متمول تاجر ہے جس کا ساحل عرب اور مشرقی افریقہ پر پورا پورا تجارتی تسلط ہے اور یہ وہ پہلا تاجر ہے جو انگریزوں کے سایہ میں یہاں آیا۔ علاوہ اس کے کہ اس کی ساحل عرب و افریقہ کے ممتاز بندرگاہوں میں کوٹھیاں اور شاخیں ہیں اس کے کئی جہاز بھی چلتے ہیں چنانچہ اس کے جہاز فالکن نامی میں، جو عدن و بربرہ کے درمیان چلتا ہے اور جس کو گورنمنٹ اپنی ڈاک لے جانے کے لیے ایک خاص بیش رقم قرار دیتی ہے۔ میں ۳/ اپریل کو سوار ہو کر روانہ بربرہ ہوا۔ (خاص عدن کے حالات تمہیں پھر کبھی معلوم ہو جائیں گے ان کے لیے اس مختصر "رسالہ" میں گنجائش نہیں۔)

بربرہ ۳/ اپریل کی صبح کے نو بجے تھے [کہ] اپنے جہاز کے بائیں جانب افق پر کچھ پہاڑیاں اور ان کے دامن میں کچھ سفید سفید بتاشے سے رکھے ہوئے معلوم ہوئے۔ مسٹر وارک [۳۹] کپتان جہاز سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہی بربرہ ہے تقریباً گیارہ بجے ہم بندرگاہ بربرہ میں لنگر انداز ہوئے۔ جہاز نے لنگر ڈالا ہی تھا کہ ایک کشتی جہاز کی طرف آتی ہوئی معلوم ہوئی میں سمجھا کہ محفوظ [۴۰] ہوگا اس خیال کو اس سے اور بھی تقویت ہوئی کہ اس کشتی میں ایک سپاہی سرخ پگڑی اور خاکی وردی کا نظر آیا زیادہ غور کرنے سے ایک شخص ہندوستانی وضع کے کپڑے پہنے ہوئے، کرسی ٹوپی پہنے سامنے بیٹھا پایا لیکن اس شخص پر محفوظ کا دھوکا مطلق نہیں ہو سکتا تھا۔ کشتی قریب آئی اور یہ شخص مع اردلی کے جہاز پر آیا۔ میں انگریزی وضع میں تھا اس لیے اس بچارے نے چاروں طرف دیکھا اور ڈرتے ڈرتے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں اور جب میں نے کہا کہ میں بمبئی سے آیا ہوں تو میرا نام لے کر پوچھا کہ کیا آپ مولوی ظفر علی خان صاحب ہیں۔۔۔؟ میں

نے جواب دیا۔ ہاں۔ کہنے لگے کہ سید صاحب (محفوظ) نے مجھے بھیجا ہے۔ خود کسی ضروری کام سے دفتر میں رہ گئے ہیں اس وقت مجھے خیال آیا ہے کہ محفوظ وہی محفوظ ہے جس نے ڈِکنس [۴۱] کی عادت بگاڑ دی تھی جو چھ گھنٹے کے بجائے دس گھنٹے کام کرتا تھا جو اپنے کام کے علاوہ دوسروں کا کام بھی انجام دیتا تھا اور جس نے اپنے جانشینوں کے لئے ایک ایسی Legacy ڈِکنس کے دفتر میں چھوڑی تھی جو ان بچاروں کو یکے بعد دیگرے تباہ کرکے رہی اور اب تک کر رہی ہے۔ خیر میں سامان رکھوا کر کشتی پر سوار ہوا اور ساحل پر پہنچا۔ کچہریوں سے جو سڑک محفوظ کے مکان کو آتی ہے وہ ساحل سے نظر آتی ہے میں کشتی سے اترا ہی تھا کہ دور سے ایک توند اور ایک داڑھی بھاگتی ہوئی نظر آئی۔ اپنے رہبر اور اردلی کے ساتھ میں محفوظ کے مکان کی طرف جانب ساحل بڑھا آیا۔ دروازہ پر کیا دیکھتا ہوں کہ وہی داڑھی اور وہی توند کھڑی ہوئی ناچ رہی ہے۔ یہ ناچ ایسا متعدی تھا کہ بے اختیار میں بھی ناچنے لگا میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس داڑھی کے اندر ایک منہ تھا اور اس توند کے نیچے ایک پتلون تھی اور پھر جو غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس منہ اور داڑھی اور توند اور پتلون کے مالک ہمارے تمہارے مشفق دیرینہ صاحب الحمید والدیانج [جمع دیباچہ] مولوی محفوظ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ خیر میں اور وہ مکان میں آئے پہلا خیال جو میرے دماغ میں دوڑتا ہوا آیا اور جو اس وقت وہیں لنگر انداز ہے یہ تھا کہ منجملہ اُن نعمتوں کے جو مجھے یہاں حاصل ہیں، یہ مکان ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ یہ مکان شہر کے شمال کی طرف کنارے پر واقع ہے یعنی اس کے سلسلہ میں تاجروں کے مکانات اور کوٹھیاں ہیں۔ مشرق کی طرف خانہ خدا ہے اور بڑا مزا آتا ہے جب محفوظ مسجد کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہتا ہے۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے

یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

مغرب کی طرف ایک وسیع میدان ہے جس کے دوسرے سرے پر رزیڈنسی اور بارکیں، مہمان خانہ اور ایک ولی کا مزار ہے جس کا گنبد نہایت اُنچا ہے لیکن سب سے زیادہ حسن جس پر میں مفتوں ہوں اس مکان کے غربی حصے کا سواد ہے یعنی اس مکان کی غربی دیوار سے بیس فٹ کے فاصلہ پر بحر عرب اپنے نیلے پانی کی موجوں کو لیے ہوئے جاہ و جلال کے ساتھ متلاطم ہے اور جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے ایک لاجوردی میدان نظر آتا ہے جو افق میں جا کر غائب ہوگیا ہے یہ سین [۴۲] دن رات کے ہر گھنٹہ میں دلفریب اور دلکش ہے یعنی صبح کو پانی کا تلاطم اور امواج کے پے بہ پے تھپیڑوں اور کشتیوں اور جہازوں ڈونگوں [۴۳] کے مستولوں کی چوٹیاں سوالی مچھروں کی نمو اہی اور شناوری اور شام کے وقت ڈوبتے ہوئے آفتاب کی کرنوں کا ارغوانی نارنجی اور سنہرے رنگوں سے موجوں کو رنگ دینا عجب بہار دیتا ہے۔ پھر رات کو چاندنی کا لطف ایسا نظر فریب ہے کہ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس کے جوبن کے لوٹنے میں تم بھی ہمارے شریک ہوتے۔ خیر تو میں یہاں پہنچا محفوظ سے باتیں شروع ہوئیں جن کا سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا اور جو عیاروں کی لڑائی کی طرح سوتے وقت کوڑے کے ڈھک کر رکھ دی جاتی ہیں اور صبح ہوتے ہی پھر شروع ہو جاتی ہیں۔

محفوظ حقیقت میں پیر فانی ہوگیا ہے داڑھی میں بہ مشکل پانچ فیصدی بال سیاہ رہ گئے ہوں گے دوسرے روز محفوظ مجھے کچہری میں اپنے ساتھ لے گیا اور کمشنر سومالی لینڈ اور ڈپٹی کمشنر بربرہ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس اور دوسرے عہدہ داروں سے ملایا۔ کمشنر صاحب نہایت ہی تپاک سے پیش آئے اور محفوظ سے کہا کہ اپنے بھائی کو اندرون ملک کی خوب سیر کرواؤ چنانچہ ہمارا ارادہ ہے کہ ایک مہینے کے لیے سومالی لینڈ کے اندرونی حصہ میں جا کر اسے خوب اچھی طرح سے دیکھیں جس کا انتظام ہو رہا ہے۔ اس زمانہ کی خصوصیت یہ ہوگی کہ محفوظ رخصت پر نہ ہوگا بلکہ

on duty سمجھا جائے گا۔

یہاں کے ہندوستانی عہدیداروں میں ڈاکٹر سید جلال ہاسپٹل اسسٹنٹ سیالکوٹی [۴۳] اور بابو ہیری چند (سپرنٹنڈنٹ کسٹمس) وزیر آبادی [۴۵] اور محمد سعید صوفی دہلوی (ہیڈ کلرک کسٹمز ڈیپارٹمنٹ) [۴۶] ہیں اول الذکر ایک نہایت معقول بھلے مانس اور یاروں کے یار ہیں اور مخلوظ سے اور نیز اب مجھ سے اُن کے مراسم بہت اچھے ہیں ان میں عیب اگر ہے تو یہ ہے کہ یہ سخت اول درجے کے چھپا تے۔ غالی۔ کٹر مرزائی ہیں اور مرزائی بھی اس قماش اور وضع کے کہ غلام احمد کا دیانی [۴۷] کو پیمبر اسلام اور خدائے اسلام سے زیادہ سمجھنے والے ہیں۔ ان کی مرزا لا نیاں سنتے سنتے جب ہم لوگوں کو تاب ضبط نہیں رہتی تو ان کے چلے جانے کے بعد میرے منہ میں تو جو آتا ہے مرزا کو کہتا ہی ہوں مگر مخلوظ بڑے عذور سے کہتا ہے ....

ثانی الذکر صاحب یعنی ہیری چند ایک اول درجہ کا بدمعاش اور چھٹا ہوا شخص ہے جس کا کام سازش کے سوا کچھ نہیں اور سب سے زیادہ افسوس کا مقام یہ ہے کہ یہ شخص اُس بستی کا رہنے والا ہے جس کی خاک نے اس احقر کے کالبد کی تعمیر میں حصہ لیا ہے یعنی مولوی ہیری چند صاحب وزیر آبادی ہیں یہ شخص اس درجہ مغلوب خدیعت ہے کہ ایک شخص نے جب پوچھا کہ سید صاحب کے بھائی جو تمہارے ہم وطن ہیں آئے ہیں تم ان سے ملنے کیوں نہیں گئے تو کہنے لگا "اونہہ میں جانا تھا.....؟" اور جب سامنے ملا تو کہنے لگا معاف فرمایئے میں اس لیے حاضر نہیں ہوا کہ کپڑے میلے تھے۔ اس شخص کی اس قسم کی منطق کی کل ایک اور مثال دیکھنے میں آئی۔ مخلوظ نے ایک چھوٹا سا جلسہ کیا تھا تقریب یہ تھی کہ یہاں کے منصرم کمشنر مستقل ہو گئے ہیں تمام انگریز افسروں نے جو مقیم بربرہ ہیں اپنے اپنے مکانوں پر جھنڈیاں لگائیں اور خوشی کی۔ لہٰذا مصلحت اس کی مقتضی تھی کہ کمشنر صاحب کے استقلال کی خوشی کی تقریب پر کل ہندی لوگ جو بربرہ میں ہیں جمع ہو کر خوشی منائیں اس خیال سے مخلوظ نے سب لوگوں کو چائے نوشی کی دعوت دی۔ مولوی ہیری چند صاحب کو بھی رقعہ دعوت بھیجا گیا اس رقعہ کا جو جواب حضرت نے دیا ہے وہ بجنسہٖ منسلک ہے (ملاحظہ ہو Exhibit A)

باقی رہے محمد سعید صوفی دہلوی [۴۸] یہ ایک مرنجاں مرنج شخص ہیں۔ ان کا تکیہ کلام لفظ "یعنی" ہے ایک اور خصوصیت ان کی یہ ہے کہ ایک بات کرتے ہیں اور بیچ میں دفعتاً رُک جاتے ہیں اور کہتے ہیں "کیا.....؟" پھر خود ہی "یعنی" سے اس استفسار کا جواب بھی دے دیتے ہیں۔ مثلاً:-

"ہم میں آپ میں Telepathy. ---کیا؟"---"یعنی روحانی تاربرقی قائم ہے"

سومالیوں کی فوٹوگرافی کسی خاص وقت میں کروں گا اس وقت صرف ایک snapshot. بھیجتا ہوں:-

اخاہ یہ کون آئے! ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام شخص جس کا سر منڈا ہوا ہے اور گلے سے ٹخنوں تک ایک سفید چادر میں لپٹا ہوا ہے ایک ہاتھ میں ایک برچھا اور دوسرے میں تسبیح لئے جھومتا جھامتا چلا جاتا ہے..... اگر اس کا رنگ کالا نہ ہوتا تو اس پر عرب یا ہندی کا گمان ہو سکتا تھا کیونکہ اس میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جس نے اسے اس کا حبشی الاصل اور زنگی النسل ہونا ثابت ہو۔ تاریخ کی کتابوں سے اس قوم کی اصلیت پر کچھ زیادہ روشنی نہیں پڑتی لیکن جہاں تک معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ خالص عربی النسل ہیں جو پانچ سو چھ سو سال کا عرصہ ہوا کہ یہ لوگ خلیج عدن کو عرب کے ساحلی مقامات سے عبور کر کے یہاں آئے اور آباد ہو گئے۔ یہاں کی گرمی سے رنگ میں ملاحت کا تو ام گاڑھا ہو جانا کچھ بڑی بات نہ تھی خود سومالی لوگ اپنا شجرہ نسب جو بیان کرتے ہیں وہ یہی ہے کہ وہ عرب شیخ اسحٰق بن احمد اور شیخ جبرتی بن اسمٰعیل ابتداءً میں

برسوں میں آئے اور ان کی اولاد اس ملک میں پھیل گئی ہاں یہ ممکن ہے بلکہ قرین قیاس ہے کہ شیخ نجی ایک چینی وہ کوئی اپنا سر منڈوا ....آئے ہوں اور یہاں کی قدیم دیسی......کے ساتھ وہ کام کیا ہو جس کا سماں ایک شاعر نے یوں باندھا ہے

ابر سیہ میں برق نے جلوہ دکھا دیا

اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ ہوا کہ مشکل اور ترقی کی ترکیب امتزاجی سے پہلے ٹھگنے پھر سانولے پھر اچھے خاصے کالے کلوٹے نکل آئے۔ پھر بھی رنگ ایسا برا نہیں ہے اور نقشہ تو ہزاروں لاکھوں میں کسی کا خراب ہو تو ہو۔ مجھے ایک دن محفوظ کی عدالت میں جانے کا اتفاق ہوا

ہاں لگے ہاتھوں ایک شرعی مقدمہ کا حال بھی سن لیجیے جو اس روز اس عدالت میں پیش ہوا تھا جس کے میر مجلس جناب مولوی محفوظ علی صاحب تھے۔ ایک عورت نے آکر دعویٰ کیا ۔۔۔۔۔۔۔ (حاشا کہ اس میں ذرا مبالغہ نہیں) جب پوچھا گیا کہ کیوں تو جواب دیا کہ ....مرد کہتا تھا کہ یہ جھوٹ بولتی ہے......اب ملا محفوظ کو بجز اس کے کیا چارہ تھا کہ یا تو خود قیاس کریں یا کسی ڈاکٹر کو متعین کریں کہ اصل حقیقت سے کورٹ کو اطلاع دیں۔ محفوظ کی سفید داڑھی نے شق ثانی پر اکتفا کیا اور معاملہ ڈاکٹر سید جلال اور کے افسر اعلیٰ ڈاکٹر [illegible] سول سرجن بربرہ کے سپرد کیا گیا۔ سید جلال نے سول سرجن کے سرٹیفکیٹ کو پیش کر کے اظہار حلفی دیا کہ ....

میں گرد و نواح کے مقامات دیکھ چکا ہوں۔ شاید تمہیں یہ معلوم نہ ہو کہ سومالی لینڈ میں انگریزوں کے تسلط سے قبل مصریوں کی حکومت تھی اور عرابی پاشا کے غدر کی گڑبڑ کے وقت جہاں انگلستان نے مصر کی دوسری دستگیری کی وہاں ایک یہ بھی تھی کہ اسے سومالی لینڈ کے بار حکومت سے سبکدوش کر دیا۔ مصریوں کی یہاں بہت سی یادگاریں موجود ہیں۔ منجملہ ان کے سب سے بڑی یادگاری وہ پانی ہے جس پر یہاں کے ادنیٰ و اعلیٰ کا مدار زندگی ہے یعنی مصریوں نے یہاں سے دس میل کے فاصلہ پر پہاڑ میں قدرتی چشموں کا سراغ لگا کر اس پانی کو جو تھوڑا تھوڑا رس رس کر پتھروں اور سوتوں سے ہوتا ہے متعدد حوضوں میں جمع کیا اور ان حوضوں کو بذریعہ نلوں [کے] بربرہ سے ملا دیا۔ پانی جب پہاڑ سے نکلتا ہے تو بہت گرم ہوتا ہے اور اس میں غالباً وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ماتھ جرمن سپا پٹنم [Math Germans Patnem] اور اسی قسم کے دوسرے یورپین معدنی گرم چشموں کا خاصہ ہیں۔ پانی البتہ کسی قدر کھاری ہے مگر اس سے کم جتنا حیدرآباد کے بعض کنووں کا۔ اس پادل کا ہے جس کا نام دل میں کھاری پانی ہے لیکن چونکہ ملا محفوظ کا مذاق نہایت ہی لطیف واقع ہوا ہے اس لیے وہ میرا لا ربربرہ کا پانی نہیں پیتا بلکہ ہر ہفتہ عدن سے Condensend water یعنی آب مقطر منگواتا ہے۔ شاید تمہیں یہ نہ معلوم ہو کہ عدن میں ایک بہت بڑا کارخانہ لب ساحل ہے جہاں سمندر کا پانی مقطر کر کے میٹھا کیا جاتا ہے۔ یہ پانی نہایت ہلکا، شیریں اور خوشگوار ہوتا ہے۔

دوسری یادگار مصریوں کا Light House ہے جو بربرہ سے ساڑھے تین میل کے فاصلے پر لب ساحل واقع ہے۔ انگریزوں نے کفایت شعاری کو مدنظر رکھ کر اس لائٹ ہاؤس میں روشنی کرنا چھوڑ دیا ہے اور اس کے برابر لکڑی کا ایک ستون کھڑا کر دیا ہے جس پر ہر رات ایک لالٹین جلا دی جاتی ہے جو چھوٹے لمبے جہازوں کی راہنمائی کرتی ہے۔

محفوظ یہاں بڑے مزے میں ہے۔ افسروں کی نظر میں اس کی بہت بڑی وقعت ہے۔ ساڑھے تین سو روپے پاتا ہے۔ مکان مفت

، برف ملت، نوکر ملت غرض ایک بہت بڑے حاکم کا جو .Prestige ہونا چاہیے وہ اُسے حاصل ہے۔ تمہیں اٹھتے بیٹھتے یاد کرتا ہے میرے یہاں آنے سے پہلے مجھے لکھا کرتا تھا کہ عبدالحق کو بھی ساتھ لیتے آؤ تو بڑا اچھا کام کرو چنانچہ میں نے تم سے اس کا ذکر بھی کیا تھا جب میں پہنچا تو بار بار بلکہ کئی دن تک یہ کہتا رہا کہ اگر تم عبدالحق کو لے آتے تو ہماری خوشی دوبالا ہو جاتی۔

یہاں سے مخطوط تمہیں براہ راست خطاب کرتا ہے

(اور میں بھی برابر کا شریک ہوں)

اے ہوالالحق پیچ میرز ۵۰ مرد اور دنیا تو بڑی خراب ہے۔ میں نے تجھ سے محبت کی۔ میں نے تجھے یاد کیا میں نے تجھے خطوط لکھے حالانکہ میں بڑا ہی کاہل و مجہول ہوں لیکن او رذال دنیا تو بڑی بے وفا اور ملول پرست ہے میں بڑا خوش ہوتا اگر تو مجھے مل جاتی مگر افسوس کہ تو نہیں ملتی تاہم میں تیرا پیچھا نہ چھوڑوں گا۔

یار عبدالحق خدا کے لیے کچھ ایسی ترکیب کرو کہ باقی حصہ زندگی ہمارا تمہارا ظفر کا ایک ساتھ گزرے۔ تمہاری وقعت جو کچھ میرے دل میں ہے اس کا علم عالم الغیبات ۵۱ کو ہے اور میری زندگی کا بہترین مقصود یہ ہے کہ ہم، تو اور ظفر ایسے متحد المقاصد اور مشترک الاغراض ہوں کہ تثلیث زندہ کر کے دکھا دیں (تو تو سینٹ پال ہے ہی)......................

جیسا کہ تمہیں معلوم ہے میں ہمیشہ سے

بلائے صحبت لیلیٰ و فرقت لیلیٰ

[میں] مبتلا ہوں یعنی نوکری کی تلاش بھی بہت اور نوکری سے بیزاری بھی بہت۔ مگر خدا جانتا ہے کہ مری بیزاری محسن الملک ۵۲ کا استعفا نہیں نہ بہشت میں لائیں مانا بلکہ میرے ذاتی معاملات اس درجہ پریشان کن ہیں کہ اگر سچ پوچھو تو میرا ایشیا سے باہر نکلنا تو کجا ہندوستان سے بلکہ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ سے بلکہ رہیل کھنڈ ڈویژن سے بلکہ بدایوں سے بلکہ سید باڑہ سے بلکہ گھر سے نکلنا بھی بہت مشکل ہے۔ نوکری کی کوشش کیوں یا روپیہ کی ہوس بہر حال میں یہاں چلا آیا اور خدا کے فضل و کرم اور تمہاری پیاری دعا سے (کیونکہ اگر میں دعا لکھوں تو تم کہو گے جھوٹا بے ایمان مکار کہیں کا میں نے کس روز دعا کی تھی) اچھی حالت میں ہوں مگر دل تو وہ یکسوئی اور فراغ خاطر کہاں جیسا تو ان لوگوں کو حاصل ہے جن کے پاس کچھ نہیں یا ان کو ہے جن کے پاس مجھ سے کروڑ درجہ زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ میری صحت ایسی زبردست نہیں کہ اس ملک کی سخت آب و ہوا کا عرصہ تک تحمل کرے نہ اس قدر کمزور ہے کہ دو دو برس تین تین برس عالم تجرد میں گزاروں......................

....

ظفر آ گئے اس لیے ذرا طبیعت بہلنے لگی ورنہ میں تھا اور کنج تنہائی اور کتابوں کی ورق فرسائی۔ یقینی سمجھو کہ یہ حالت دیرپا نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر میں یہاں کی تنہائی کا یہ انتظام کروں کہ جھوٹی سچی سوسائٹی پیدا کروں تو تجرد کی تکالیف پر بھی غالب آؤں مگر اس کو کیا کروں کہ مکان کے معاملات خراب ہوتے ہیں۔ آج کل میرے ذاتی معاملات اس درجہ پیچیدہ اور مختلف ہو رہے ہیں کہ اگر ان کا تفصیلی حال تمہیں لکھوں تو میرے ساتھ بہت کچھ ہمدردی کرو گے۔ والد صاحب قبلہ کی عمر اب اس قابل نہیں کہ وہ گھر کے انتظام کے بار کے متحمل ہوں۔ کوئی دوسرا بھائی نہیں ۔ بچے اس قابل نہیں۔ عزیز اور اہل برادری سب خون چوسنے والے اور سر کی ٹوپی تاکنے والے ہیں۔ کوئی ایسا معتبر آدمی نہیں ملتا جسے کل دفتر کا ذمہ دار بنایا جائے۔ اگر خدا نخواستہ کوئی فوری یا سخت پریشانی کی بات ہو تو پندرہ روز میں مجھے اطلاع ہو اور دوسرے پندرہ روز کے بعد یہاں سے

کوئی کارروائی کی جا سکے۔ حال میں میرے ایک عزیز نے کچھ زیادتی کی تھی میں نے جناب کمشنر صاحب سے استدعا کی کہ اس کا تدارک کر دیں۔ انہوں نے بکمال مہربانی حکام متعلقہ کو لکھ دیا جس سے امید ہے کہ معاملات روبہ اصلاح ہو جائیں گے مگر یہ انتظام عارضی اور چند روزہ ہے اور روز روز اس طرح سے وہ کیوں لکھنے لگے تھے۔ نظر برآں مجھے تو یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جاہے یہاں کتنی ہی معقول تنخواہ ملتی ہو اور جاہے کتنی ہی عزت و آبرو ہو لیکن ان سب کا چھوڑنا آسان ہے بہ مقابلہ بوا ہی کے معاملات کو خراب ہونے دینے کے جن پر آئندہ بچوں کا سہارا اور بھروسا ہے۔ میں ظفر سے کہتا ہوں کہ تم اگر جاپان یا انگلستان جاتے ہو تو جاؤ مگر اس طرح سے کہ پہلے میں، تم اور عبدالحق تینوں ایک جگہ باہم مل کر اس عہد کی تجدید کریں جو آج سے دو سال قبل حیدرآباد میں ہوا تھا اور جس کی رو سے ہم نے یہ قرار دیا تھا کہ اپنی آئندہ قسمتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح سے وابستہ کر دیں گے کہ ہم پر یہ مثل صادق آنے لگے True friends like ivy & its prop the wall ---- together they will stand together fall.[53] اور کوئی کام کی بات سوچ کر بسم اللہ کر دیں۔

میں ستمبر میں بائیس (۲۲) مہینے کی ملازمت پوری کر کے[54] زیادہ سے زیادہ تین مہینے اور کم سے کم دو مہینے کی چھٹی لوں گا اور ان شاء اللہ بشرط خیریت پہلے سیدھا تمہارے پاس حیدرآباد آؤں گا اور تم سے یہ استدعا کروں گا کہ کم از کم ایک سال کی رخصت حاصل کر کے کم از کم برائے چندے ہی ہو، بوریا بدھنا سنبھالو اور میرے ساتھ چلو۔

میں نے یہاں کی ملازمت میں تقریباً (تمہیں اپنا بے تکلف دوست اور بھائی سمجھ کر لکھتا ہوں) ڈیڑھ سو کے حساب سے بچایا ہے یعنی کم و بیش ڈھائی ہزار اس وقت جمع ہیں۔ اس کے علاوہ چلتے وقت تک جسے ابھی تقریباً چار مہینے ہیں پانچ چھ سو اور پس انداز کروں گا گویا برما کی کمائی کی پس انداز رقم تین ہزار ہوئی۔

مزید برآں کم و بیش تین چار ہزار کا سر دست انتظام کر سکتا ہوں۔ اس چھ سات ہزار سے اگر ہم اتفاق کے ساتھ کوئی کام شروع کریں تو اس مشترکہ زندگی کی ابتدا اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ یہ بات کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے زیادہ تر تمہاری صلاح و مشورہ کے بعد متعین کی جائے گی۔ میں ایمان سے کہتا ہوں کہ مجھے نہ دنیا کا لالچ، حرص و طماعی ہے نہ روپیہ سے خواہشات نفسانیہ پوری کرنے کی آرزو و تمنا ہے بلکہ اگر میں روپیہ حاصل کرنے کا آرزومند ہوں تو ان اچھے مصارف پر خرچ کرنے کے لیے جو تمہارا اور ظفر کا نصب العین ہے۔ اگر میں نام و نمود چاہتا ہوں تو اس لیے نہیں کہ ان سے مجھے ذاتی خواہش شہرت و نام آوری کا پورا کرنا مقصود ہے بلکہ اس لیے ممکن ہے کہ اس بہانے سے ہم تم دوسروں کی بھلائی کا ذریعہ بن سکیں۔ مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر ہم کچھ کر سکیں تو ابھی کریں۔ اور اگر کبھی کچھ ہو سکنے والے ہوں تو ابھی ہو جائیں کیونکہ باقی تم دونوں کی تو میں کہتا نہیں مگر مجھ میں تو انحطاط شروع ہو گیا ہے اور جو جوش و ولولے و قوت آج ہے وہ سال دو سال کے بعد اتنے نہ رہیں گے۔

میری صلاح یہ ہے کہ ہم اول تو اپنے اُس ماہواری پرچہ[55] کو زندہ کریں اور تمہاری اور ظفر کی لٹریری قابلیت اور اپنے انتظامی سلیقہ (دیکھو کیسا لائق ہے۔ اپنے آپ کو اس لیاقتِ علمی سے محروم قرار دیتا ہے جو اسی کا حصہ ہے اور جس کے تم بھی باوجود نکما ہونے کے قائل ہو۔ بہر حال میں اس وقت amanuensis[56] ہوں اور بقول "نقل کفر کفر نباشد"[57] جو کچھ وہ اپنی ہیچمدانی[58] اور ہیچ میرزی کے متعلق لکھوانا چاہتا ہے لکھتا جاتا ہوں۔ ظفر) سے کام لے کر اسے ملک کا بہترین علمی پرچہ بنا دیں جس قسم کا بنانے کی تمہاری اس وقت آرزو تھی جب ہم تم میرے ارادۂ برما سے قبل ولایت چلنے والے تھے۔ اور اُسے اس خوبی سے نکالیں کہ مخزن[59]، زمانہ[60]، اردوئے معلّی[61] سب دھرے رہ جائیں۔ اس کے علاوہ ایک دوسری بات میرے خیال میں آئی ہے وہ یہ کہ آج کل سودیشی سودیشی[62] کے شور نے ملک میں

ایک تہلکہ بپا کر رکھا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اور ان روشن خیال لوگوں کو شریک کر کے جو ملکی مصنوعات کو فروغ دینے کے حامی ہیں
ایک کارخانہ قائم کریں اس وقت سب سے زیادہ ضرورت جن چیزوں کی ہے ان میں کاغذ سب سے اہم ہے۔ اگر کاغذ کی ایک مل کسی مناسب
مقام پر قائم کی جائے تو باوجودیکہ متعدد ملیں ہندوستان میں ہیں پھر بھی یہ مل نہایت نفع والی ثابت ہوگی۔ اس وقت کم و بیش سو اخبار ایسے ہیں
جو مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اگر ایسے کارخانے کے قائم کرنے میں یہ اخبار حصہ لیں تو بڑی آسانی سے انڈین مسلم پریس کی ایک ذاتی مل
ہو سکتی ہے جس سے کاغذ کی بہم رسانی میں سہولت کے علاوہ جو نفع حصہ داروں کو ہوگا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ پیپر مل لکھنو نے ۱۹۰۵ء
میں اپنے حصہ داروں کو منافع بہ حساب بارہ فیصدی تقسیم کیا ہے۔ ممکن ہے کہ تمہیں یہ شیخ چلی کا منصوبہ معلوم ہو لیکن مہینے دو مہینے میں تم سنو گے کہ
ہندو اہل اخبار نے مشترکہ سرمایہ سے ایک پیپر مل جاری کی ہے۔

اس کام کے لیے جہاں تک میرا علم ہے ۲ یا ۳ لاکھ کا سرمایہ کافی ہوگا۔ اگر اس کے سو سو کے حصے کیے جائیں تو کیا تمہارے خیال
میں پچاس اہل اخبار بھی ایسے نہ نکلیں گے جو کم از کم پانچ پانچ حصوں سے اس میں شریک نہ ہوں گے۔ ہم تم اور ظفر چند روپیہ بیس بیس حصے
خرید سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ میں بڑودہ کے اثر کو کام میں لا کر یہاں کے دو ایک بڑے بڑے تاجروں کو جن کی کوٹھیاں بمبئی میں ہیں آمادہ کروں کہ
وہ بھی کچھ حصے لیں۔ کیا تمہارے خیال میں اتنے بڑے ہندوستان میں اور خصوصاً مسلمانوں کے اس حصہ میں جو روشن خیال اور علیگڑھ کا تعلیم
یافتہ کہلاتا ہے اس مجوزہ کمپنی کے حصہ دار نہ ملیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ بواپسی ڈاک تم ان تمام امور سے مجھے اپنی رائے سے اطلاع دو۔

ہم نے تم نے اور ظفر نے اس عرصہ میں بہت سے منصوبے باندھے تھے لیکن میں تم سے ایمان سے کہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم
میرے اس بیان کو نہایت ہی سچا سمجھو گے کہ اس مرتبہ میں تلا ہوا ہوں کہ میں تم اور ظفر اپنی آئندہ زندگی کا قطعی فیصلہ کر چھوڑیں اور کوئی کام شروع
کریں خواہ وہ کام یہ کاغذ والی مل ہو یا کوئی اور۔ لیکن جو کچھ بھی ہو جلد ہو اور قطعی ہو تا کہ ظفر جو اپنی دو سالہ رخصت سے فائدہ [۹۳] اٹھانا چاہتا ہے
جاپان جائے اور خاص اسی چیز کو سیکھے جس کے متعلق ہم کام کریں۔ مثلاً اگر ہم قطعی فیصلہ کر لیں کہ کاغذ کا کارخانہ قائم کریں تو ظفر کو کاغذ سازی
سیکھنا چاہیے اگر ہم یہ فیصلہ کریں کہ چمڑے کا کارخانہ قائم کیا جائے تو ظفر کو دباغت [۹۴] سیکھنا چاہیے۔ و قس علیٰ ہذا۔

امید ہے کہ تم ان تمام امور پر پوری طرح سے اور نہایت سچے دل سے غور کر کے بواپسی ڈاک اپنی مفصل رائے لکھ بھیجو گے۔
مجھے ظفر سے یہ معلوم ہوا کہ تم اس قسم کی صلاح کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہو لیکن اس میں مذبذب ہو کہ در صورت حیدرآباد سے بالفعل رخصت لینے
اور آئندہ ترک تعلق کرنے کی حالت میں تمہارے future prospects [۹۵] کیا ہوں گے۔ اگر چہ اس کا سب سے پہلا جواب تو یہ ہو
سکتا ہے کہ اگر میں اور ظفر بھوکے رہیں گے تو تم کو بھی فاقہ کرنا پڑے گا اور اگر ہماری حالت اچھی ہوگی تو تم بھی اس میں ہمارے برابر کے شریک
ہو گے لیکن چونکہ ضروریات معاشرت کی وسعت اس امر کی مقتضی ہے کہ ہر فرد بشر کے لیے کسی قدر انتظام جداگانہ طور پر ہو لہٰذا مناسب ہوگا کہ کم
از کم اس پہلے سال کے لیے جب کہ تم رخصت پر ہو گے تمہارے لئے بطور خاص کچھ انتظام کر دیا جائے جس کا تصفیہ تمہاری رائے پر موقوف
ہے۔

السعود[؟] غشی[؟] کے خط سے معلوم ہوا کہ تم میرے مکان پر خیریت پوچھنے گئے تھے اگرچہ مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت
نہیں لیکن تمہاری کاہلی کو مد نظر رکھ کر مجھے تمہارے اس Visit کی داد دینی پڑتی ہے۔ معشوق حسین کو بھی میرا سلام کہہ دینا۔
میں نے جیسا کہ تم کو معشوق سے معلوم ہوا ہوگا چار مہینے کی توسیع اپنی رخصت میں اور کرالی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس عرصہ

میں اختر [66] کہیں آوارہ نہ ہو جائے۔ مجھے تمہاری برادرانہ محبت سے امید ہے کہ کم از کم ہفتہ میں ایک دفعہ مکان پر جا کر تم دیکھ لیا کرو گے کہ وہ کچھ پڑھتا بھی ہے یا نہیں اور کیسا ہے......؟

اور ہر ہفتہ مجھے خط لکھا کرو گے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو اُسے اپنے پاس لے جا کر رکھو۔

ظفر

[میر محفوظ علی بدایونی کا سوادِ خط]

پیارے بھائی عبدالحق۔ دفتر میں سر مار کر (؟) ابھی آیا تھا ظفر نے تقاضا کیا کہ ابھی خط تیار ہو جائے۔ میں نے کہا یہ اردو راتھری گے (؟) سانس لینے دے کہنے لگا کل ڈاک جاتی ہے اس دفعہ بھی رہ جائے گا اس لیے میں نے ظفر کے قلم اور اپنی زبان سے یہ خط لکھا ہے امید کہ جس روز خط پہنچے اسی دن جواب لکھ مارنا۔ اگر اس خط کا جواب آیا تو.............. گناہ قلمی معاف کروں گا۔

تمہارا محفوظ

[مولانا ظفر علی خان کا سوادِ خط]

کیا مولانا حالی [67] ابھی تک حیدرآباد ہی میں تشریف رکھتے ہیں۔ اگر ہوں تو میرا اُن کی خدمت میں دست بستہ سلام عرض کر دینا۔

ہاں جو ریویو ڈراما [68] پر لکھنے کا انہوں نے وعدہ فرمایا تھا وہ ضرور لکھوا کر کسی بڑے اخبار مثلاً پیسہ اخبار [69] یا وطن [70] یا وکیل [71] میں چھپنے کے لئے بھیج دینا۔

ظفر

میں نے ایک بڑی غلطی کی جس کی اب اصلاح کرتا ہوں یعنی مولوی مشتاق حسین خاں صاحب کی خدمت عالی میں مری دست بستہ ڈنڈوت اور عرض پہنچا دیں اور کہہ دیں کہ اگر کبھی ہم سے آپ سے محبت تھی تو اس کے اظہار کا اب وقت ہے جب کہ میں یہاں عالم تجرد میں ٹھن ٹھنا رہا ہوں...

ہاں ایک بات لکھنی بھول گیا۔ یہاں بڑے مزے سے گزر رہی ہے۔ سمندری ہوا کھاتے ہیں۔ گوشت، دودھ، گھی، گیہوں، چاول ہر ایک چیز ملتی ہے۔ غرض ڈٹ ڈٹ کر چین کرتے ہیں............... ہاں نہیں ملتا تو ساگ پات۔ ترکاری کا یہاں اس قدر توڑا ہے کہ اشرفیوں کے تھیلے کے بدلے میں بھی ایک چنا نہیں مل سکتا۔ بھاجی کو میں (اور میں کیا محفوظ) تو ترس گیا۔ اس لیے بخ خدمت تمہاری کے عرض ہے کہ بذریعہ خط اطلاع اسو کھا میتھی کا ساگ دو سیر یا اس سے زیادہ اگر ممکن ہو اور تھوڑا سا سوکھا پودینہ پارسل کر کے ویلیو پارسل پر Declared Value [72] درج کر دینا کہ یہاں محصول کروڑ گیری زیادہ نہ دینا پڑے بھیج دو۔ دیکھنا اس میں تساہل نہ کرنا ورنہ ہماری روٹی کا لطف کرکرا ہو جائے گا۔

ایک اور فرمائش ہے سیاح بلاد اسلامیہ ابن "قیس" و "معلوم" کا سفرنامہ بلاد اسلامیہ [73] اور شبلی کا اردو ترجمہ کا تازہ دیوان جو کانپور میں چھپا ہے [74] اور مارکوپولو [75] کا سفرنامہ بھیج دو۔ بڑی سخت ضرورت ہے۔ اگر چاہتے ہو کہ سومالی لینڈ کے حالات کے متعلق ہماری واپسی ہند پر ایک اچھی سی کتاب تیار دیکھو تو یہ کتابیں فوراً بھیج دو۔ اس میں کاہلی نہ کرنا۔

اگر تم کو ٹکٹوں سے شوق ہو تو افریقہ کے ہر قسم کے ٹکٹ یہاں سے بھیجے جا سکتے ہیں۔

تمہاری میز پر ہم نے ایک شاخ مرجان سفید یعنی Coral دیکھی تھی جو بہت ہی چھوٹی تھی یہاں تمہارے واسطے ایک بہت بڑا

سو گئے کا ورحست دکھا گیا ہے جو آئیں گے تو لیتے آئیں گے۔

سوائی چھوکرے جو ہمارے پاس نوکر ہیں استعداد وکسب اللہ میں اگرچہ سید علی بلگرامی ۶ے کی .... لیکن اُن سے کچھ تھوڑے ہی کم ہیں اور اتنی اردو بہت جلد سیکھ جاتے ہیں جتنی سید علی یونانی و عبرانی جانتا ہے۔ مگر اُن کی اردو ہوتی بڑے مزے کی ہے۔ ان کی اردو کے نمونے ملاحظہ ہوں:

چھوکرا نمبر ا (مسمّی ڈاگالا)۔

(ا) صاحب پنکھا بنائے گا.....؟ (صاحب کیا میں پنکھا بچھاؤں)

(ب) .... (صاحب پاخانہ میں لوٹا رکھ دیا)

چھوکرا نمبر ۲ (مسمّی عبدہ)

(ا) صاحب شوکرے کا ڈکٹر آتا مانگتا (صاحب چھوکرے کا ڈاکٹر آنا مانگتا ہے) اس سے عبدہ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر سید جلال کے ہاں کا چھوکرا آنا چاہتا ہے۔

(ب) صاحب ہم کو صراری میں پانی گاعدن وال دے گا.....؟

(صاحب میں نے صراحی میں عدن والا پانی بھر دیا)

ایک عرب صاحب جو یہاں سب انسپکٹر پولیس ہیں اور اپنی اردو پر بہت فخر کرتے ہیں ایک روز تشریف لائے۔ تم جانتے ہو کہ عرب ج کی جگہ گ بولتے ہیں۔ سب انسپکٹر صاحب جو محفوظ کے کثرت کار کے متعلق یہ نصیحت کرنا چاہتے تھے کہ بہت زیادہ محنت کرنے سے آپ کی صحت پر بہت خراب اثر پڑے گا نہایت متانت سے سر ہلا کر فرمانے لگے۔

صاحب تم کا ئےکو اتنا کم کرتا۔ تمہارا ادھر بائی بھی نہیں کوئی بھی نہیں۔ تم سِیک ہو جائے گا۔ کائے کو تم تمہارا .... مارے گا۔

اخیر کا فقرہ سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ سب انسپکٹر کو اس کی جرات کیسے ہوئی اور اُس نے محفوظ کی .... کا قصد کیسے کیا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ بچارے کا مطلب یہ تھا کہ تم کیوں اپنی جان مارتے ہو یعنی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے ہو۔

ظفر

معشوق کہنا ہم کا نہ طوف ہائے دے دینا

ظفر

[ہیری چند کا سوا دخط]

مکرم معظم جناب سید محفوظ علی صاحب سلامت باشد

بعد از تسلیم۔ بندہ بموجب ارشاد آپ کے حاضر خدمت ۸ بجے ہو جائے گا۔

میں نے اس واسطے پہلے جواب نہیں لکھا کہ میرے ہاتھ گیلے تھے معاف فرماویں۔

آپ کا تابعدار غلام

ہیری چند ۸ رمئی ۱۹۰۹ء

حواشی و تعلیقات

۱۔ ظفر علی خان: ازالۃ الخفا قسط نمبر ۲ در روزنامہ زمیندار ج ۱۵ ش ۸۹ لاہور ۲۳ اپریل ۱۹۲۸ء

۲۔ یہ ترجمہ پہلی بار انجمن اردو حیدر آباد دکن نے رفاہ عام سٹیم پریس لاہور سے چھپوا کر ۱۹۱۰ء میں شائع کیا۔ آغاز میں مولوی عبدالحق کا ۵۹ صفحات پر مشتمل مقدمہ ہے جس کے بعد مترجم کے قلم سے ۹ صفحات پر مشتمل ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر کے حالات درج ہیں۔ جدید اشاعت لاہور: الفیصل ناشران ۱۹۹۵ء

۳۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر مولانا ظفر علی خان حیات، خدمات و آثار، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۳ء ص ۳۶

۴۔ ابن علی بدایونی، سید: سید محفوظ علی بدایونی در طنزیات و مقالات (سید محفوظ علی بدایونی) مولفہ محمد محی الدین بدایونی بی اے کراچی: انجمن ترقی اردو ۱۹۷۲ء ص ۳۵

۵۔ عبدالحق، مولوی مقدمہ مکتوبات حالی حصہ اول مرتبہ خواجہ سجاد حسین پانی پت: حالی پریس ۱۹۲۵ء ج اول ص ۸

۶۔ عبدالحق، مولوی مقدمہ مضامین محفوظ علی مرتبہ انجمن ترقی اردو کراچی: انجمن ترقی اردو ۱۹۵۶ء ص ب

۷۔ محفوظ علی بدایونی، سید فریقہ کا سفر (بحوالہ ظفر علی خان) در مضامین محفوظ علی محولہ بالا ص ۱۱

۸۔ محولہ بالا جائے مذکور

۹۔ محولہ بالا صفحہ ج د

۱۰۔ ظفر الملک علوی کتاب الاسرار کا پہلا باب یعنی ظفر علی خان دیکھیے از اقوام جرائم پیشہ باپوڑ ضلع میرٹھ: عصر جدید پریس س ن (غالباً ۱۹۱۸ء) ص ۲۹

۱۱۔ محولہ بالا صفحہ ۲۷، ۲۸

۱۲۔ ایضاً ص ۲۸

۱۳۔ مضامین محفوظ علی محولہ بالا صفحہ ا ب

۱۴۔ کتاب الاسرار کا پہلا باب صفحہ ۲۹

۱۵۔ مضامین محفوظ علی صفحہ ر ، ، ،

۱۶۔ طنزیات و مقالات صفحہ ۳۸

۱۷۔ مضامین محفوظ علی صفحہ ر

۱۸۔ مضامین محفوظ علی صفحہ "

۱۹۔ محولہ بالا جائے مذکورہ

۲۰۔ طنزیات و مقالات صفحہ ۳۳

۴۱۔ مضامین محفوظ علی صفحہ "ز"

۴۲۔ پولیٹیکل گرگٹ یعنی نمائشی اور دوستی کے لیڈر کا خاکہ یعنی ظفر علی خان کی حقیقت میر محمد عصر جدید پریس میرٹھ باہتمام ن۔ن (۱۹۱۸ء)

۴۳۔ حب رسولؐ کا متوالا دوست سیندار بیاد گار نمبر ج ۵۷ ش ۱۵ لاہور ۱۵/جنوری ۱۹۵۵ء ص ۳

۴۴۔ طنزیات و مقالات صفحہ ۳۶،۳۷

۴۵۔ بریرہ سومالی لینڈ (افریقہ) کے ایک شہر کا نام جہاں مولانا ظفر علی خان کے دوست میر محفوظ علی بدایونی (دیکھیے حاشیہ نمبر ۲۷) ایک جج کی حیثیت سے مقیم تھے۔

۴۶۔ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق (ہاپوڑ ۱۸۷۰ء.....کراچی ۱۹۶۱ء) والد شیخ علی حسین کی ملازمت کے سال گزاری پنجاب میں تھی اسی نسبت سے مولوی صاحب کا بچپن بھی وسطی پنجاب میں گزرا یہیں مڈل تک تعلیم حاصل کی پھر مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ہائی اسکول میں داخل ہوئے جہاں سے ۱۸۹۵ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کر کے فارغ التحصیل ہوئے۔ بی۔اے کے بعد بمبئی آکر نواب محسن الملک کے پرائیویٹ سیکریٹری بنے یہاں سے کرنل افسر جنگ نے انھیں حیدرآباد لے جا کر مدرسہ آصفیہ کا صدر مقرر کیا یہیں سے ۱۸۹۶ء میں ماہ نامہ "افسر" جاری کیا، تین برس بعد (۱۸۹۹ء) ریاست کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں مترجم مقرر ہو گئے، تیرہ برس تک یہ ذمہ داری انجام دی ۱۹۱۲ء میں انسپکٹر آف سکولز صوبہ اورنگ آباد مقرر ہوئے اسی برس انھیں ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے شعبہ ترقی اردو کا سیکریٹری منتخب کرلیا گیا ان سے پہلے اس منصب پر مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمٰن شروانی فائز رہ چکے تھے۔

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی تاسیس میں کلیدی کردار ادا کیا، ۱۹۱۹ء میں عثمانیہ کالج اورنگ آباد قائم ہوا تو اس کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر پنشن لے لی مگر اس کے باوجود جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو کے سربراہ بنا دیے گئے اور اردو کی ایک بڑی لغت کی تیاری کا منصوبہ ان کے سپرد کر دیا گیا۔

۱۹۲۳ء میں انجمن ترقی اردو کا آغاز ہوا، گاندھی جی نے اپریل ۱۹۳۶ء میں اپنے نوقائم شدہ لسانی مرکز میں مولوی صاحب کو بلایا تو مولوی صاحب کو کانگریس کی اردو زبان اور رسم الخط کے لیے ناپسندیدگی کا اندازہ ہوا، جس پر انھوں نے انجمن ترقی اردو کو تحفظ اُردو کی ایک مستقل تحریک بنا دیا، جامعہ عثمانیہ کی ملازمت ترک کر دی، اورنگ آباد کا قیام چھوڑ دیا۔ اپنا تمام ساز و سامان لے کر ۱۹۳۸ء میں دہلی اٹھ آئے ۱۹۴۷ء تک یہیں رہ کر تحفظ و فروغ اردو کے لیے کوشاں رہے، نہایت قیمتی کلاسیکی متون کے مخطوطات تلاش کر کے شائع کیے۔ تقسیم ہند کے فسادات میں انجمن اور مولوی صاحب کا سرمایہ لٹ گیا جو رقم بنکوں میں تھیں (تقریباً تین لاکھ روپے) حکومت ہند نے روک لیں۔

بے سروسامانی کی حالت میں کراچی آکر ۱۹۴۸ء میں انجمن کا آغاز کیا۔ رفتہ رفتہ دو کتاب خانے (خاص و عام) ناپ اور لیتھو کے مطبعے اور اردو کالج قائم کیے مولوی صاحب اس ادارے کو اردو یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے اسے ان کے اخلاص کا ثمر ہی کہا جائے گا کہ ان کی وفات کے تینتالیس برس بعد ان کا خواب پورا ہو گیا اور مولوی صاحب کے بے سروسامانی کے عالم میں قائم کردہ ادارے نے ترقی پا کر اردو یونیورسٹی کا رتبہ حاصل کر لیا۔

۲۶ مستقل تصانیف اردو شعرا کے متعدد تذکرے، مقدمات، تنقیدات، خطبات، مکتوبات، خاکوں کے ضخیم مجموعے اور سٹینڈرڈ اردو انگلش ڈکشنری اور قاموس الکتب جیسی کتابیں۔ ماہنامہ قومی زبان، رسالہ اُردو اور انجمن ترقی اُردو جیسا ادارہ یادگار چھوڑ کر ایک سادہ پر خلوص اور تجرد کی زندگی گزار کر مولوی صاحب ۱۶ راگست ۱۹۶۱ء کو راہی ملک عدم ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۲۷۔ سید محفوظ علی بدایونی (۸ مئی ۱۸۷۰ء ..... ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۳ء) مڈل پاس کرنے کے بعد ۱۸۸۸ء میں بریلی چلے گئے جہاں سے دسویں کا امتحان پاس کیا اور مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کے ساتھ ہاسٹل میں مقیم رہے۔ ۱۸۹۳ء میں علی گڑھ میں بی۔اے کے لیے داخل ہوئے، یہاں وہ مولانا ظفر علی خان اور مولوی عبدالحق کے ہم جماعت ہوئے، ۱۸۹۵ء میں بی۔اے پاس کرنے کے بعد سید محمود نے انھیں دربار خیر پور کی ملازمت کے لیے منتخب کر لیا جس کا آغاز ۱۸۹۶ء میں ہوا اس سلسلہ ملازمت میں وہ اسسٹنٹ جج، جوڈیشل سیکریٹری، ریونیو سیکریٹری وغیرہ مناصب پر فائز رہے۔

۱۹۰۱ء میں سندھ کو خیر باد کہہ کر بمبئی چلے گئے، اسی زمانے میں مولانا ظفر علی خان ریاست حیدر آباد دکن سے وابستہ ہو چکے تھے ان کی خواہش اور اصرار پر حیدر آباد چلے گئے اور مسٹر ہنکن (Hank in) کے دفتر میں مترجم مقرر ہوئے۔ یہاں اس وقت مولانا ظفر علی خان کے علاوہ مولوی عزیز مرزا، مولانا شبلی نعمانی، مولانا عبدالحلیم شرر بھی موجود تھے چنانچہ ان احباب کی نہایت پر لطف صحبتیں رہیں۔ پڑھنا لکھنا، شعر خوانی زندہ دلی ان دنوں کے مشاغل رہے۔

اسی زمانے میں برطانوی حکومت کو صومالی لینڈ میں ایک ایسے جج کی ضرورت پیش آئی جو مسلمان ہو اور انگریزی و اسلامی قوانین سے آگاہ ہو۔ ایم اے او کالج علی گڑھ کے پرنسپل اور مولوی محفوظ علی کے استاد مسٹر ماریسن کی نگاہ انتخاب مولوی محفوظ علی پر پڑی چنانچہ انھیں حیدر آباد خط لکھ کر اس منصب کے لیے بلایا گیا جس کے نتیجے میں انھوں نے ۱۹۰۳ء میں صومالی لینڈ پہنچ کر جج کا منصب سنبھالا وہ ۱۹۰۷ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ یہاں سے رخصت ہو کر بمبئی آئے اور ظفر علی خان کے ساتھ مل کر اس کمرشل کمپنی کا آغاز کیا، جس کا ذکر اس خط میں اور پس منظر میں ہو چکا ہے۔ ۱۹۰۹ء میں ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا، ۱۹۱۳ء میں مولانا محمد علی جوہر نے کامریڈ اور ہمدرد کے دفاتر کلکتے سے دہلی منتقل کیے تو اپنے پرانے دوست محفوظ کو بھی دہلی بلا لیا اور کامریڈ اور ہمدرد کی ادارت اور نگرانی ان کے سپرد کر دی گئی یہاں ایک بار پھر انھیں ہم مذاقوں کی صحبت میسر ہوئی جن میں مولانا محمد علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم اجمل خان جیسے لیڈر شامل تھے، لیکن وہ جم کر یہاں نہ رہ سکے اور واپس بدایوں چلے گئے، زندگی کا آخری حصہ اپنے بدایوں میں گزارا۔ بقول حسن ریاض "چھوٹا قد، رنگ گورا، داڑھی سفید، مزاج میں شگفتگی، خوب صورت آدمی" تھے محفوظ علی بدایونی طنزیات و مقالات ص ۵۱۲)

رشید احمد صدیقی نے گنج ہائے گرانمایہ میں لکھا ہے:

"یہ سید تو کہیں بند نہ تھا اس پر کسی کا رعب ہی نہ پڑتا تھا میں نے ایسا شریر و شگفتہ بڑھا کہیں نہ دیکھا جرات جہاں کہہ دیتا اور جتنا برجستہ کہتا وہ کسی کے اٹھائے نہ اٹھتی میں نے ایسا باغی نہ دیکھا جس کی کہیں سے گرفت نہ ہو سکتی تھی یہ بڑھا تو ذہین نوجوان اور حسین عورت سے زیادہ کشش اپنے

اندر رکھتا ہے اس کے سامنے چپ بھی نہیں رہا جاتا تھا اور بے باک ہونے کی جرأت بھی نہ ہوتی تھی"

شاہ معین الدین احمد ندوی نے ان کی وفات پر لکھا تھا:

"ناواقف شخص ان کو دیکھ کر انگریزی تعلیم یافتہ ہونے کا گمان بھی نہیں کر سکتا تھا اور یہ رنگ برابر گہرا ہوتا گیا آخر میں بڑا ذوق وشوق اور بڑی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور اسی پر ان کا خاتمہ ہو گیا۔ (معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۴۳ء، ص ۴۶۲)

۲۸۔ یعنی خضاب، محفوظ علی کی داڑھی سے متعلق مختلف ماخذ میں دلچسپ بیان سے ملتے ہیں مثلاً دیکھیے: طنزیات و مقالات ص ۲۱، ۲۸، ۳۹...... یاد رفتگاں ۳۰۲

۲۹۔ برف باریدن بر زاغ کوے کے پروں پر برف گرنا یعنی نہایت سیاہ شے پر نہایت سفید شے کا برس جانا۔

۳۰۔ سہ اور پنج کو ملا کر بنایا گیا لفظ: سپنجی، یعنی تین یا پانچ روزہ دنیا۔

۳۱۔ ارژنگ مشہور مصور مانی کی کتاب کا نام ہے، مانی (۲۱۵ء......۲۷۳ء) ایران کا ایک فلسفی تھا۔ اس نے تیرہ سال کی عمر میں اپنے نئے مذہب کا اعلان کیا، اگرچہ زرتشتی ساجدوں نے اس کی مخالفت کی لیکن وقت کے بادشاہ شاپور نے اس کا مذہب قبول کر لیا تاہم مانی کو جلاوطن کر دیا گیا، جس کے بعد وہ ہندوستان، تبت اور چین میں اپنے خیالات کی تبلیغ کرتا رہا۔ شاہ پور کی وفات پر مانی دوبارہ ایران گیا، بادشاہ ہرمز نے اس کا خیر مقدم کیا لیکن ایک سال بعد بہرام اول کی تخت نشینی پر مانی کو قتل کروا دیا گیا۔ نقش ارژنگ میں مانی کی کتاب سے تلمیح ہے۔ یہ تلمیح مولانا ظفر علی خان کی منظومات میں بھی پائی جاتی ہے مثلاً ایک نظم طریقت کا کلام اللہ میں کہا

مری آنکھوں میں نقش مانی و بہزاد پھرتا ہے
مرا مسلک ہے ارژنگی، مرا مشرب ہے پازندی

(نگارستان ص ۷۷)

۳۲۔ اس (تحریر سے) ایک یادگار قائم کرنا مقصود ہے کہ میں زندگی کو بہت ناپائدار دیکھتا ہوں۔

۳۳۔۳۹ جتنی وضاحت متن میں موجود ہے اس سے زیادہ دستیاب نہیں ہو گی۔

۴۰۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۲۷

۴۱۔ جتنی وضاحت متن میں موجود ہے اس سے زیادہ دستیاب نہیں ہو گی۔

۴۲۔ Scene منظر

۴۳۔ چھوٹی کشتیوں

۴۴۔ جتنی وضاحت متن میں موجود ہے اس سے زیادہ اب دستیاب نہیں۔

۴۵۔ میری چند کی نسبت خود اسی خط میں جو تفصیل موجود ہے وہ اس کے کردار کے تعارف کے لیے کافی ہے۔ اس کے تعارف میں مولانا نے اس شخص کے اپنا ہم وطن ہونے پر افسوس کیا ہے اور اسے سازشی اور شعلہ خدیعت شخص قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

"میری چند ایک اول درجہ کا بدمعاش اور چھٹا ہوا شخص ہے جس کا کام سازش کے سوا کچھ نہیں اور سب سے

زیادہ افسوس کا مقام یہ ہے کہ یہ شخص اس بستی کا رہنے والا ہے جس کی خاک نے اس احقر کے کالبد کی تعمیر میں حصہ لیا ہے یعنی مولوی ہیری چند صاحب وزیر آبادی ہیں یہ شخص اس درجہ قلب خدیعت ہے کہ ایک شخص نے جب پوچھا کہ سید صاحب کے بھائی جو تمہارے ہم وطن ہیں آئے ہیں تم ان سے ملنے کیوں نہیں گئے تو کہنے لگا ''کوٹھی میں جاتا تھا.....؟'' اور جب سامنے ملا تو کہنے لگا معاف فرمایئے میں اس لئے حاضر نہیں ہوا کہ کپڑے میلے تھے
...............''

اس مکتوب کے آخر میں ہیری چند کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تحریر بھی موجود ہے۔ مولانا ظفر علی خان کے مطابق یہ صاحب بربرہ میں سپرنٹنڈنٹ کسٹمز کے عہدے پر فائز تھے۔

۴۶۔ جتنی وضاحت متن میں موجود ہے اس سے زیادہ اب دستیاب نہیں۔

۴۷۔ مرزا غلام احمد قادیانی (قادیان ۱۳ فروری ۱۸۳۵ء۔ لاہور ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء) مشہور مذہبی پیشوا اور قادیانی جماعت کے بانی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کے دفتر میں ملازمت اختیار کی، عیسائی مشنریوں اور آریہ سماجیوں سے مناظروں کے باعث شہرت پائی، ۱۸۹۱ء میں مہدی اور مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ ۱۸۹۲ء میں اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے ریویو آف ریلیجنز نامی رسالہ جاری کیا، مناظروں، مباحثوں، تصنیف و تالیف کے دوران ہی میں دعویٰ نبوت کر ڈالا۔ اسی پر بس نہیں کی بلکہ مسیح موعود، مہدی، نبی، کرشن، گورو گوبند ہونے اور سو کے قریب دیگر دعاوی کیے۔ بقول خود ان کی تمام عمر سرکار انگلشیہ کی خدمت و اطاعت گزاری میں گزری اور انھوں نے اس کی تائید و حمایت میں اتنی کتابیں لکھیں کہ ان سے پچاس الماریاں بھر جائیں۔ تنسیخ جہاد جیسے خیالات کی اشاعت کے لیے ان کتابوں کو دنیا بھر میں پھیلایا۔ مولانا ظفر علی خان نے عمر بھر مرزا غلام احمد قادیانی کی جھوٹی نبوت کے خلاف جدوجہد کی ان کی نظم و نثر میں اس موضوع پر بکثرت آثار موجود ہیں۔ جن کا ایک مجموعہ ارمغان قادیان کے نام سے ۱۹۳۶ء میں مسلم پرنٹنگ پریس لاہور سے شائع ہوا۔ (تعداد صفحات ۱۹۲)

۴۸۔ جتنی وضاحت متن میں موجود ہے اس سے زیادہ دستیاب نہیں ہو سکی۔

۴۹۔ عرابی پاشا (۱۸۳۹ء.....۱۹۱۱ء) مصر کا قوم پرست عسکری رہنما، مصر اور ایتھوپیا کی جنگ (۱۸۷۵ء.....۱۸۷۶ء) میں کرنل کے عہدے پر فائز ہوا۔ ۱۸۷۹ء میں مصر کی ترک حکومت کے خلاف بغاوت میں شریک ہوا ۸۲.....۱۸۸۱ء میں جب خدیو مصر توفیق کی درخواست پر برطانیہ اور فرانس نے مصر میں مداخلت کی تو اس نے ایک قومی مزاحمتی تحریک کو منظم کیا۔ برطانیہ کی کامیابی کے بعد اسے جلاوطن ہونا پڑا۔ جلاوطنی کا زمانہ سری لنکا میں گزار کر وہ ۱۹۰۱ء میں مصر واپس آیا اور ۱۹۱۱ء میں راہی ملک عدم ہوا۔

(A Dictionary of World History 2000 Encyclopedia.com)

۵۰۔ ہیچ میرز = بے قیمت

۵۱۔ نیتوں کے جاننے والے یعنی خدا کو ہے

۵۲۔ نواب سید مہدی علی محسن الدولہ محسن الملک (اٹاوہ ۹ دسمبر ۱۸۳۷ء.....شملہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء) ابتدائی تربیت اپنے نانا صدر الصدور مولوی محمد علی وزیر ریاست ٹونک سے اٹاوہ اور پھپھوند میں حاصل کی، بعد ازاں محرر اہلمد پیش کار سررشتہ دار تحصیل دار

کے مدارج سے ہوتے ڈپٹی کلکٹری تک پہنچے۔ ۱۸۷۲ء میں ریاست حیدرآباد سے منسلک ہوئے، ۱۸۸۸ء میں لندن کا سفر اختیار کیا، ۱۲/جولائی ۱۸۹۳ء کو حیدرآباد سے مستعفی ہو کر سرسید کی تحریک سے وابستہ ہو گئے اور ان کے قریبی ساتھیوں میں شمار ہوئے۔ انھیں سرسید سے مکمل اتفاق نہیں تھا تاہم وہ ان کے مقاصد کے حصول میں ان کے معاون رہے اور سرسید کی وفات کے بعد کالج کے سیکریٹری بھی بنے۔ متعدد اعزازات حاصل کیے اور کتابیں لکھیں میلاد شریف (۱۸۷۰ء)، رسالہ حامی قوانین، کتاب المحبت و الشوق (غزالی کا ترجمہ)، مجموعہ لیکچرز ۱۹۰۴ء، مجموعہ مضامین تہذیب الاخلاق، مکاتبات الخلان فی اصول التفسیر و علوم القرآن، مکاتیب محسن الملک وغیرہ تصانیف ہیں۔ مولانا ظفر علی خان کو انگریزی کتابوں کے اردو ترجمے کی طرف بھی انھوں نے متوجہ کیا جس کے نتیجے میں معرکہ مذہب و سائنس جیسا معرکہ آرا ترجمہ وجود میں آیا۔

۵۳۔ ......حقیقی دوست دیوار پر لگی بیل اور اس کے سہارے کی طرح اکٹھے ابھرتے اور اکٹھے ڈوبتے ہیں۔

۵۴۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر محفوظ علی یہاں نومبر ۱۹۰۲ء میں آئے ہوں گے۔

۵۵۔ مراد کن ریویو ہے جس کے مستقل قلمی معاونین میں عبدالحق اور محفوظ علی دونوں شامل تھے۔

۵۶۔ یعنی اقبال

۵۷۔ کفریہ کلمات کو نقل کرنا کفر نہیں ہوتا

۵۸۔ کچھ نہ جاننا

۵۹۔ سر عبدالقادر کا مشہور ادبی ماہنامہ جس کا آغاز ۱۹۰۱ء میں ہوا اور جس کا سلسلہ اشاعت طویل وقفوں سے مدت مدید تک جاری رہا۔

۶۰۔ نیاز ابن گم کا رسالہ

۶۱۔ حسرت موہانی کا رسالہ

۶۲۔ غیر ملکی

۶۳۔ یعنی ریاست حیدرآباد دکن سے لی گئی رخصت۔

۶۴۔ چڑار گئے کالن

۶۵۔ مستقبل کے امکانات

۶۶۔ مولانا ظفر علی خان کے فرزند اختر علی خان (م ۱۷/اکتوبر ۱۹۵۸ء)

۶۷۔ شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی (پانی پت ۱۱۳۵ھ/۱۸۳۷ء.....۱۹۱۴ء) نو برس کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا تھا، پرورش بڑے بھائی نے کی، باقاعدہ تعلیم نہ ہو سکی، تاہم اپنی محنت سے فارسی عربی فلسفہ منطق حدیث تفسیر کا مطالعہ کیا۔ کم سنی میں شادی کر دی گئی جس پر حالی گھر سے نکل بھاگے، دلی میں غالب سے ملاقات و تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔ غالب سے ان کے فارسی قصائد سبقاً سبقاً پڑھے۔ غالب نے ان کے شعری ذوق کی ستائش کی۔ شیفتہ سے بھی تعلق رہا۔ ۱۸۶۹ء تک ان کی مصاحبت میں رہے۔

۱۸۷۲ء میں پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازم ہوئے جہاں انگریزی سے اردو میں ترجمہ شدہ عبارتوں کی اصلاح

کے کام پر مامور ہوئے اسی دوران میں انجمن پنجاب کے مشاعروں میں شریک ہوئے اور بعض یادگار نظمیں لکھیں، ترک قیام لاہور کے بعد اینگلو عربک سکول دہلی میں مدرس مقرر ہوئے، ۱۸۷۹ء میں مسدس مد و جزر اسلام جیسی بلند پایہ نظم لکھی، ۱۸۸۶ء میں ایچی سن کالج لاہور کے قائم ہونے پر اس ادارے سے بطور مصاحب ہو کر ایک بار پھر لاہور آئے لیکن جلد ہی لاہور سے اکتا کر باردگر دہلی چلے گئے، حیات سعدی (۱۸۸۴) مقدمہ شعر و شاعری (۱۸۸۳ء) یادگار غالب (۱۸۹۷) حیات جاوید (۱۹۰۱ء) وغیرہ مشہور تصانیف ہیں۔

۶۸۔ غالباً مولانا ظفر علی خان کی کتاب جنگ روس و جاپان پر ریویو کا ذکر ہے جو ایک ڈرامے کی صورت میں لکھی گئی اور پہلی بار حیدرآباد سے ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی، میر محفوظ علی بدایونی کے صاحبزادے سید ابن علی بدایونی نے لکھا ہے کہ "جنگ روس و جاپان والا ترجمہ انھوں نے وہیں (جریرہ میں) مکمل کیا" (طنزیات و مقالات ص ۳۵) جنگ روس و جاپان پر اس کا ترجمہ ہونا مذکور نہیں، دوسرے اس کی تصنیف جریرہ میں نہیں بلکہ وہاں جانے سے پہلے حیدرآباد دکن میں ہو چکی تھی اور یہ ڈرامہ ۱۹۰۵ء میں دکن ریویو کی تیسری جلد کے شمارہ ۹۔۱۱ میں شائع بھی ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۰۵ء ہی میں کتابی صورت میں بھی چھپ گیا تھا، نیز اس کے سرورق پر بھی یہ صراحت موجود ہے "مصنف ممدوح نے ایام قیام حیدرآباد میں تصنیف فرمایا" (ر ک طبع ثانی اسلامیہ سٹیم پریس ۱۹۱۲ء)

۶۹۔ پیسہ اخبار برعظیم کا مشہور اخبار جسے منشی محبوب عالم نے ۱۸۸۷ء میں فیروز والا سے جاری کیا، آٹھ صفحوں کا یہ مجیدہ اخبار پہلے یہ ہفت روزہ تھا پھر ہفتے میں تین دن نکلنے لگا بعد ازاں روزنامہ ہو گیا، منشی محبوب عالم اس سے پہلے ۱۸۸۶ء میں ایک ماہانہ رسالہ زمیندار جاری کر چکے تھے جس کے مقاصد وہی تھے جو مولانا ظفر علی خان کے والد مولوی سراج الدین احمد کے پیش نظر تھے جب انھوں نے اپنے طور پر اخبار زمیندار کا اجرا کیا۔

پیسہ اخبار فیروز والا سے لاہور منتقل ہوا، انیسویں صدی کے اواخر تک روزنامہ بن گیا، مولانا ظفر علی خان کے زمیندار کی عنان ادارت سنبھالنے تک اردو صحافت پر پیسہ اخبار کی حکمرانی رہی۔

۷۰۔ وطن کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خان ایک مشہور مصنف اور صحافی تھے وطن کے اجرا سے قبل وہ گیارہ برس وکیل کی ادارت کر چکے تھے چنانچہ جب ۱۹۰۲ء میں اپنے اخبار وطن کا اجرا کیا تو اسے وکیل ہی کے انداز میں چلایا لیکن بعد ازاں بہ ضرورت زمانہ کے تحت اخبار کی روش تبدیل کر لی اور ایک زمانے میں وطن کی اشاعت چار ہزار تک پہنچ گئی۔ ۱۹۱۵ء میں اسے روزنامہ کر دیا گیا، ۱۹۳۵ء میں اس کا سلسلہ اشاعت موقوف ہو گیا۔

۷۱۔ وکیل ہفت روزہ اخبار تھا، انیسویں صدی کے آخر میں امرتسر سے جاری ہوا، اس کے مدیر شیخ غلام محمد (م ۱۹۱۴ء) تھے ابتدا میں ہفت روزہ تھا لیکن بعد ازاں سہ روزہ ہو گیا، اس اخبار سے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبداللہ عمادی جیسے لوگ بھی منسلک رہے، بقول مولانا محمد علی جوہر "وکیل اردو صحافت کا بہترین نمونہ تھا اور اس کے خیالات ہمیشہ دانشمندانہ اور پروقار رہے اور یہ اعلیٰ رواداری کا مظہر تھا"

۷۲۔ تسلیمات

۷۳۔ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس سے کون مراد ہے؟

۷۴۔ مولانا شبلی نعمانی (۳ جون ۱۸۵۷ء.....۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء) مشہور عالم، متکلم، شاعر اور سیرت نگار، مولانا فاروق چڑیاکوٹی کے شاگرد تھے۔ علی گڑھ کالج میں تدریس کے تجربے نے مغربی علوم و تہذیب و تمدن سے آشنا کیا آرنلڈ سے دوستی ہوئی جو دونوں شخصیتوں کے ایک دوسرے سے استفادے کا باعث بنی۔ شبلی نے روم، مصر و شام کے اسفار کیے اور ان کی روداد سفر بھی لکھی۔ سرسید کی وفات کے بعد انھوں نے علی گڑھ کو چھوڑ دیا اور ریاست حیدرآباد سے وابستہ ہو گئے یہاں ان کی تحریک و تجویز پر عثمانیہ یونی ورسٹی میں اردو کو پہلی بار اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنایا گیا۔ ۱۹۰۸ء میں لکھنؤ جا کر ندوۃ العلما کی زمام سنبھال لی یہاں بہت سی اصلاحات کیں۔ ۱۹۱۳ء میں انھیں لکھنؤ چھوڑنا پڑا اور وہ اپنے مولد اعظم گڑھ واپس آ گئے۔ یہاں انھوں نے دار المصنفین کی بنیاد رکھی اور اپنے تصنیفی کاموں کا سلسلہ آگے بڑھایا ان کی تصانیف میں سیرت النبی ؐ کی پہلی دو جلدیں، شعر العجم، الفاروق، النعمان، الغزالی، سوانح مولانا روم، اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر، علم الکلام اور الکلام شامل ہیں۔ وہ اردو اور فارسی کے ایک خوش فکر شاعر تھے فارسی غزل میں بالخصوص ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ یہاں ان کے شعری دیوان کا ذکر ہے۔

۷۵۔ مارکو پولو (وینس ۱۲۵۴ء.....۱۳۲۴ء) اٹلی کا مشہور سیاح، مشرقی ممالک میں طویل طویل اسفار کرتا ہوا چین تک پہنچا۔ قبلائی خان نے مدت تک اسے اپنے دربار میں رکھا، وہ ۱۲۹۱ء میں پیکنگ سے واپس وینس چلا گیا، لیکن یہاں محض دو برس ٹھہرنے کے بعد دوبارہ عازم چین ہو گیا اور قبلائی خان کی وفات سے دو سال قبل تک وہیں رہا۔ ۱۲۹۴ء میں واپس وینس آ گیا مگر یہاں اُسے گرفتار کر لیا گیا، اس کی یہ قید علمی دنیا کے لیے ایک بڑے علمی فائدے کا سبب بنی، دوران قید اس نے ایک زندانی ساتھی کو فرانسیسی زبان میں اپنے سفر کے احوال قلم بند کروائے یہی تحریر مارکو پولو کا سفرنامہ قرار پائی، اور دنیا کی کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا اور صدیوں تک مشرق کو جاننے کے لیے اہل مغرب کے پاس یہی سفرنامہ واحد ذریعہ معلومات رہا۔

۷۶۔ شمس العلما سید علی بن سید زین الدین حسین بلگرامی (۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء..... محرم الحرام ۱۳۲۹ھ/مئی ۱۹۱۱ء) ۱۸۷۴ء میں سنسکرت میں امتیاز کے ساتھ پٹنہ کالج سے بی اے کیا، اگلے برس انڈین سول سروس کے امتحان میں اول آئے، ارضیات، نقشہ نویسی، معدنیات، حیوانات کے علوم حاصل کرنے کے لیے لندن یونیورسٹی میں داخل ہوئے، ۱۸۹۳ء میں انھیں حکومت ہند نے شمس العلما کا خطاب دیا، ۱۹۰۴ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی زبان میں ریڈر مقرر ہوئے اسی سال انڈیا آفس لائبریری میں عربی فارسی مخطوطات کی فہرست سازی پر مامور ہوئے، ریاست حیدرآباد میں بھی مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۰۹ء میں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری لی، وہ جرمن، فرانسیسی، عربی، فارسی، سنسکرت، بنگلہ، مرہٹی، تلگو، گجراتی، انگریزی اور اُردو زبانیں جانتے تھے، انھوں نے بعض اہم کتابوں کو فرانسیسی اور انگریزی سے اُردو میں منتقل کیا جن میں تمدن عرب (۱۸۹۸ء) اور تمدن ہند (۱۹۱۳ء) مشہور ہیں۔

Abstract

Maulana Zafar Ali Khan (1873-1956), a known and reverent figure of Urdu literature, journalism and Muslim politics in South Asia, was a close friend and class fellow of Maulvi Abdul Haq (1870-1961). Mahfuz Ali Badayuni (1870-1943), a well known humanist and journalist, was another childhood friend of both of them. This article introduces the life and works of Maulana Zafar Ali Khan and produces the text of an unpublished personal letter written jointly by Maulana Zafar Ali Khan and Mahfuz Ali Badayuni to their common old friend Maulvi Abdul Haq. This letter was written on May 9, 1906 and throws light on the multidimensional personalities of the three friends. These personal aspects of the three prominent figures have been remained hidden from the public before.

معیار: علمی و تحقیقی مجلہ، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد ۲، شمارہ ۴، جولائی۔ دسمبر ۲۰۱۰ء

گارسیں دتاسی[1]: رکنِ انجمنِ پنجاب، لاہور[2]۔ مزید تحقیق

محمد اکرام چغتائی*

صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ شرقیات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ کتنے بلند پایہ اور جید علما و فضلا نے السنۂ شرقیہ اسلامیہ، ان کے ادبی شاہکاروں اور علوم و فنون کی تحقیق و تفحص میں اپنی زندگیاں وقف کر دیں اور ان شعبوں میں ایسے ناقابلِ فراموش کارہائے نمایاں سرانجام دیے کہ تمام تر اختلافات اور تحفظات کے باوجود ان کی محنت، لگن اور اپنے علمی مقصدِ حیات سے گہری وابستگی کی داد دینا پڑتی ہے۔ اسی مورخانہ و شناسوں کی اس لمبی صف میں فرانس کے ایک مستشرق گارسیں دتاسی بھی اپنی فتوحاتِ علمیہ کے سبب بڑی شان اور تمکنت سے کھڑے ہیں، بلکہ انھیں کچھ ایسے امتیازی خصائص بھی حاصل ہیں جو پوری تاریخِ استشراق میں کم کم ہی دکھائی دیتے ہیں مثلاً:

الف) وہ السنۂ شرقیہ اسلامیہ، ان کے ادب پاروں اور علوم متداولہ پر عالمانہ و محققانہ دسترس رکھتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُسے جنوبی ایشیا کی جدید زبانوں بالخصوص ''ہندوستانی'' (یعنی اردو) سے گہرا لگاؤ تھا۔ یوں وہ ایک اسلام شناس کے علاوہ ہندشناس بھی تھا اور اس اعتبار سے مستشرقین میں ایسے امتزاج کی کوئی اور مثال دستیاب نہیں۔

ب) گارسیں دتاسی نے اپنے استاد محسن اور فرانسیسی مستشرقین کے جدِ اعلیٰ سلوستر دساسی[3] (Silverstre de Sacy، ۱۷۵۸ء-۱۸۳۸ء) کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا، اسی کی فرمائش پر عزالدین مقدسی کی ''کشف الاسرار عن حکم الطیور والازہار'' (طبع ورمز جس ۱۸۲۱ء) سے اپنے علمی سفر کا آغاز کیا۔ عربی، فارسی اور ترکی زبانیں اسی سے سیکھیں اور یہی شخص تھا، جس نے اس کو اردو سیکھنے کی ترغیب دی۔ حیرت ہے کہ جن ممالک میں یہ چاروں زبانیں بولی جاتی ہیں وہاں دتاسی کبھی نہیں گیا، لیکن ان ممالک کے اربابِ علم و دانش، مطابع وغیرہ سے بذریعہ خط کتابت اس کے گہرے روابط قائم تھے۔

ج) سلوستر دساسی کی تجویز پر فرانسیسی حکومت نے اردو کی پروفیسر شپ منظور کی (۱۸۲۸ء) اور اسی کی سفارش پر اس نئی اسامی پر گارسیں دتاسی کا تقرر ہوا۔ چند سال قبل اپنے استاد کے بزور اصرار پر دتاسی نے انگریزوں کی تالیف کردہ قواعد اردو کی کتابوں کی مدد سے اس زبان کی مبادیات پر دسترس حاصل کی۔ پھر وہ دو تین بار انگلستان گیا اور وہاں کے اردو داں اصحاب (جان شیکسپیئر، ڈنکن فوربز وغیرہ) سے قریبی مراسم استوار کیے۔ تقریباً دو سال میں اسے اردو زبان پر عبور حاصل ہو گیا۔ دیکھا جائے تو اردو کے حوالے سے دتاسی کی حیثیت ''خود آموختہ

---

* ۱۳۹، اے گلشن راوی، لاہور۔

پروفیسر" کی ہے۔ فرانس میں اردو پروفیسر شپ قائم ہوتے ہی اس کی تعیناتی ہوئی اور جوں ہی وہ اللہ کو پیارا ہوا، یہ اسامی بھی ختم کر دی گئی اور ایسی ختم ہوئی کہ پھر بحال نہ ہو سکی۔ یہ نصف صدی [یعنی ۱۸۲۸ء میں اردو کی پروفیسر شپ کے قیام سے تاسی کی وفات (۱۸۷۸ء) تک] فرانس میں اردو زبان و ادبیات کا زمانۂ عروج تھا اور اس عرصے میں اردو پر جتنا کام ہوا وہ سب تاسی ہی کا مرہونِ منت ہے۔

د) گارساں دتاسی کے استاد سلوستر دساسی نے اپنے ملک میں کسی استاد کے بغیر عربی اور فارسی زبانیں سیکھیں۔ اس کے شاگرد نے بھی اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کسی مدرس کے بغیر اردو زبان سیکھی اور پھر شبانہ روز محنت سے اس پر اتنی دسترس حاصل کر لی کہ اسے لکھنے، پڑھنے اور بولنے میں ذرہ بھر دقت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ بعض ہندوستانی مشاہیر کو اردو میں خطوط لکھتا تھا اور ہندوستان کے جن چند اصحابِ علم کو پیرس میں اس سے ملاقات کا موقع ملا، وہ اس کی رواں اردو گفتگو سن کر حیران و ششدر رہ جاتے۔ یہ ایسا کمال ہے جو یورپ کے بہت کم اردو دانوں کو حاصل ہوا۔

ر) گارساں دتاسی جن مختلف ذرائع سے ہندوستان کے اداروں اور مطبعوں سے شائع ہونے والی کتب، اخبارات اور مجلات منگوایا کرتا تھا، ان میں سب سے بڑا ذریعہ اس کے وہ ہم وطن اور یورپی احباب تھے، جو ہندوستان میں اہم عہدوں پر فائز تھے اور اسے گاہے بگاہے مطلوبہ معلومات فراہم کرتے رہتے تھے۔ تعجب خیز امر یہ ہے کہ اس دور میں، جب مراسلت کے تیز ذرائع معرضِ وجود میں نہیں آئے تھے، اس نے کس تسلسل اور پابندی سے اپنے اطلاع کنندگان (informateurs) سے مستقل رابطہ رکھا اور ان ہی کی مرسلہ اطلاعات کی بنا پر وہ تقریباً ستائیس برس ہر سال اردو زبان و ادب کی سالانہ پیش رفت پر جامع خطبات پیش کرتا رہا۔

ز) جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ گارساں دتاسی نے کسی یونیورسٹی یا تعلیمی ادارے میں داخل ہوئے بغیر اردو سیکھی، مزید یہ کہ ہندوستان میں، جہاں یہ زبان تحریر و تقریر میں مستعمل ہے تمام عمر وہاں قدم تک نہیں رکھا، لیکن اس کے باوجود اس نے ان دونوں زبانوں کی مفصل تاریخ قلم بند کی، جو پہلے دو جلدوں اور پھر ترمیم و اضافات کے ساتھ تین جلدوں میں شائع ہوئی۔ علاوہ ازیں اس تاریخ سے بھی زیادہ اہم اس کے وہ ستائیس سالانہ خطبات ہیں جو وہ ہر تعلیمی سال کے شروع ہوتے ہی ہندوستان کی علمی، ادبی، صحافتی، مذہبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے متعلق دیا کرتا تھا۔ ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھیں تو تاریخِ استشراق میں شاید ہی کوئی اور ایسی مثال دستیاب ہو سکے۔

ح) گارساں کی "تاریخ"[۴] کے دونوں ایڈیشنوں پر سرسری نظر ڈالتے ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مجموعی ڈھانچہ تذکروں ہی سے مماثل ہے کیوں کہ اس میں اردو اور ہندی شعراء اور مصنفین کے احوالِ زندگی الفبائی ترتیب سے درج کیے گئے ہیں۔ ان سوانحی کوائف میں فروگذاشتوں، غلطیوں، لغزشوں اور کوتاہیوں کی بھرمار ہے۔ بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اس "تاریخ" کا اہم ترین حصہ اس کا مقدمہ ہے جس میں اس نے اردو پر لسانیاتی اعتبار سے بحث کی ہے اس کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس زبان کی ادبی، معاشرتی، سیاسی اور معاشی اقدار پر بحث کی ہے۔ اسی پیش گفتار میں گارساں تاسی نے اردو کی ادبی تاریخ کا ایک ابتدائی خاکہ پیش کیا ہے، جس کو بعد میں مولوی کریم الدین پانی پتی (۱۸۲۱ء-۱۸۷۹ء) نے "طبقات شعرائے ہند" (۱۸۴۸ء) میں مناسب ترمیم و اضافہ کے ساتھ آگے بڑھایا۔[۵] ممکن ہے اپنے زمانۂ طالب علمی یا چند سال بعد یہ خاکہ محمد حسین آزاد کی نظر سے بھی گزرا ہو، کیوں کہ "آبِ حیات" میں بھی کم و بیش ان ہی اصولوں کی پیروی کی گئی ہے۔ بعض نقاد کی رائے میں "طبقات شعرائے ہند" اردو شاعری کی تاریخ نویسی کی طرف پہلا قدم ہے لیکن حقیقت میں اردو کی ادبی تاریخ کا نقشِ اول گارساں دتاسی کی "تاریخ" کے ابتدائیے کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

ایک نامور جرمن خاور شناس نے سلوستر دساسی کے تلامذہ کے تحت گارساں تاسی کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ جو بغیر استاد کی

سفارش پر اس "چہیتے شاگرد" (Lieblingsshuler) کی مدرسۂ السنۂ شرقیہ میں بطور اولیں مدرس اردو تقرری ہوئی، اس کے مطالعات اور تحقیقات کا محور و مرکز یہی زبان بن گئی۔ قواعد اردو، نظم و نثر کے منتخبات، تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی، سالانہ خطبات، مدوین دیوان ولی اور بالخصوص تراجم کے ذریعے اس نے اردو کو یورپ کے کونے کونے میں متعارف کرا دیا اور اردو داں طبقے کو ایسی راہوں سے روشناس کرایا، جن سے وہ پہلے آشنا نہیں تھے۔[6]

گارساں دتاسی نے نئی قائم کردہ اردو پروفیسر شپ پر اپنی تقرری (پہلے عارضی اور پھر مستقل) ہوتے ہی اردو زبان و ادب سے متعلق کئی اہم منصوبوں کا آغاز کر دیا۔ ابتدائی سترہ اٹھارہ سالوں میں ان میں سے جو منصوبے پایۂ تکمیل کو پہنچے، ان میں مبادیات ہندوستانی، صرف اردو، قواعد زبان اردو، دیوان ولی (۱۸۳۳ء)، تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی (جلد اول، ۱۸۳۹ء) قابل ذکر ہیں۔ ہمارے ہاں ان تصنیفات سے عدم واقفیت کی بڑی وجہ وہ زبان ہے جس میں یہ لکھی گئیں یعنی فرانسیسی، جس کا جاننے والا مقامی لوگوں میں کوئی نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ گارساں کے بھی مضامین فرانس کے مختلف رسائل بالخصوص "ژورنال ایزیاتیک" (Journal Asiatique) میں شائع ہوتے تھے، جو ہندوستان میں کہیں دستیاب نہیں تھے۔ موجودہ تحقیقات کی روشنی میں جنوبی ایشیا میں گارساں دتاسی کا باقاعدہ اور براہ راست تعارف ۱۸۴۸ء میں ہوا، جب ایلیٹ نے اس کی 'تاریخ'' کی جلد اول کا انگریزی ترجمہ کیا اور اس کو سامنے رکھ کر مولوی کریم الدین پانی پتی نے اپنے تذکرہ ''طبقات شعرائے ہند'' کو مرتب کیا۔ اس تذکرہ کے سرورق کی انگریزی اور اردو عبارات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مؤلف نے گارساں دتاسی کی 'تاریخ'' کے انگریزی ترجمے کو اردو میں منتقل کر دیا ہے جب کہ دونوں کے تقابلی مطالعے سے اس بات کی نفی ہو جاتی ہے۔ مولوی کریم الدین نے اس 'تاریخ'' سے استفادہ ضرور کیا ہے خاص طور پر اس کے مقدمہ میں ادبی تاریخ کے بنیادی اصولوں کو من و عن نقل کر دیا، لیکن بیشتر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ مولوی موصوف کا تذکرہ بالکل ایک الگ تصنیف ہے البتہ اس کے بنیادی مصادر میں گارساں دتاسی کی 'تاریخ'' بھی شامل ہے۔

گارساں دتاسی نے اپنی ابتدائی تحریروں، تبصروں اور خطبوں میں دہلی کالج جیسی شمالی ہند کی اہم ترین درسگاہ کا کہیں کہیں اجمالاً ذکر کیا ہے لیکن یہاں کے اساتذہ و طلبا سے اس نے علمی روابط قائم رکھے۔ اس مدرسے کے پہلے پرنسپل فیلکس بوترو سے تو اس کے قریبی دوستانہ مراسم تھے اور وہ اس کے استفسارات کا مفصل جواب بھجواتا رہتا تھا۔ اس کے بعد دوسرے پرنسپل ڈاکٹر الوئس اشپرنگر سے اس کے تعلقات کی نوعیت قدرے مختلف تھی، یعنی مسعدی اور مسعود سعد سلمان لاہوری کی 'ہندی'' شاعری کے بارے میں ان کے مابین گرما گرم مباحثہ ہوا اور اس کے نتیجے میں 'ہندوستانی'' یعنی اردو کے قدیم شعری آثار منظر عام پر آئے۔[7] تذکرہ صدر تذکرہ ''طبقات شعرائے اردو'' بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے کیوں کہ اس کا مؤلف مولوی کریم الدین پانی پتی بھی اسی کالج کا فارغ التحصیل تھا۔ چند سال بعد دہلی کالج ہی کی ایک نامور شخصیت مولوی ذکاء اللہ دہلوی (م ۱۹۱۰ء) نے گارساں دتاسی کے ایک فرانسیسی کتابچے کا اردو میں بعنوان ''تذکرہ مختصر احوال مصنفین ہندی'' ترجمہ کیا (دہلی: مطبع مظہر العجائب، ۱۸۵۶ء)۔ کہا جاتا ہے کہ مترجم نے انگریزی متن کو استعمال کیا، جو غالباً مصنف کے دوست سابق قائم مقام پرنسپل دہلی کالج فرانسس ٹیلر نے تیار کیا تھا۔[8] ان ہی دنوں سرسید احمد خان کی دہلی کی عمارات، تاریخی آثار اور نامور شخصیات کے احوال پر مشتمل کتاب ''آثار الصنادید'' (طبع دوم۔ دہلی ۱۸۵۴ء) طبع ہوئی۔ اس کا ایک نسخہ بالواسطہ یا بلاواسطہ گارساں دتاسی تک پہنچا تو پہلے اس نے اس پر جامع تبصرہ لکھا[9] اور پھر اس کے حصہ دوم اور سوم کو فرانسیسی میں منتقل کیا۔[10] سرسید اور گارساں دتاسی میں براہ راست مراسلت یا ملاقات کا کوئی ثبوت تو نہیں ملتا حالانکہ وہ لندن جاتے ہوئے دو روز پیرس میں ٹھہرے تھے (۲-۳ مئی ۱۸۶۹ء)، لیکن گارساں دتاسی سے ملنے کے لیے

وقت نہ نکال سکے۔[11] پھر بھی سرسید اس کے غائبانہ معترفین میں شامل تھے، جیسا کہ ان کے اخبار "سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ" (بابت ۱۹ اپریل ۱۸۶۷ء) سے ظاہر ہوتا ہے۔[12] اس سفر میں سرسید کے چھوٹے بیٹے سید محمود (۱۸۵۰ء–۱۹۰۳ء) بھی شریک سفر تھے، لیکن وہ پانچ سال بعد یعنی ۱۸۷۱ء میں جب کیمبرج آئے، تو ان کی گارساں دتاسی سے مفصل ملاقات ہوئی۔[13]

۱۸۷۸ء میں گارساں دتاسی کا انتقال ہوا اور اس سے اگلے سال اس کا انتہائی اہم نجی کتب خانہ نیلام ہو گیا۔ اس میں ترکی، عربی، فارسی اور بالخصوص اردو کتب و رسائل کا بیش بہا ذخیرہ تو بکھر گیا، لیکن ان کی اہمیت کا کچھ اندازہ اس فہرست سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے جو اس کے شاگرد نے مرتب کی تھی۔[14] گارساں جیسے اردو زبان و ادب کے شیدائی کی رحلت یا اس کے ادارتی کتب خانے کی نیلامی جیسے حوادث کا ذکر ہمارے اخبارات و رسائل یا کسی معاصر کی تحریر میں نظر نہیں آتا۔ تقریباً ربع صدی اسی خاموشی میں گزر گئی۔ بالآخر اس علمی سکوت کو معروف ماہر لسانیات جارج گریرسن نے توڑا اور "ہندوستانی" (یعنی اردو) کی جامع ببلیوگرافی کے تحت گارساں دتاسی کی بیشتر تصانیف و تراجم کے حوالے درج کیے۔[15] اسی ببلیوگرافی سے مولوی عبدالحق نے "قواعد اردو" کا مقدمہ لکھتے ہوئے بھرپور استفادہ کیا۔[16] بعد میں گریرسن نے "لسانیاتی جائزہ ہند" میں اپنی اسی ببلیوگرافی کو شامل کیا[17] اور مولوی عبدالحق نے اپنا مقالہ بعنوان "کیا یورپ نے اردو کی کیا خدمت کی؟"[18] میں حسب سابق گریرسن ہی کی فہرست مصادر کو پیش نظر رکھا۔ شاید ان ہی مطالعات کے زیر اثر محی الدین قادری زور کو گارساں دتاسی کے سوانح اور اردو خدمات کو اجاگر کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ خوش قسمتی سے وہ ان دنوں پیرس میں مقیم تھے اور اس دوران میں انھوں نے جو کچھ جمع کیا، اس کی بنیاد پر گارساں دتاسی پر ان کا کتابچہ اشاعت پذیر ہوا۔[19]

گارساں دتاسی ہر سال مدرسہ السنۂ شرقیہ کا نیا سیشن شروع ہوتے ہی ایک جامع خطبہ دیا کرتا تھا جو اس سال میں اردو زبان و ادب کی ترقیوں پر مبنی ہوتا تھا۔[20] انجمن ترقی اردو نے مولوی عبدالحق کی زیر نگرانی گارساں دتاسی کے ان سالانہ لیکچروں (۱۸۵۰ء تا ۱۸۷۷ء) کو "خطبات" اور "مقالات" کے زیر عنوان اردو میں منتقل کرایا اور ان تراجم میں سید راس مسعود، مرزا کھال، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، پروفیسر عزیز احمد، اختر حسین رائے پوری اور عبدالماجد (ملازم کمپنی کرانیکل) نے تعاون کیا۔[21] اس کے بعد گارساں دتاسی کی تصنیفات بالخصوص "تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی" (= "تاریخ") کو زیادہ تر تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور اس کی سوانح و اتفاقی فروگذاشتوں کی نشاندہی کی گئی۔ اس ضمن میں کاظمی عبدالودود کا اہم فہرست ہے۔[22]

تصانیفِ گارساں دتاسی کے انگریزی تراجم:

گارساں دتاسی کی زندگی ہی میں اس کی بعض فرانسیسی کتب کو انگریزی میں منتقل کرنے کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ ابتدائی تراجم اشاعت پذیر تو نہیں ہوئے، کیوں کہ یہ ایک ضرورت کے تحت کیے گئے تھے اور وہ ضرورت یہ تھی کہ ان ہی کو پھر کاملاً جزواً اردو میں ترجمہ کیا جاتا تھا۔ متذکرہ بالا دو کتابیں یعنی "طبقات شعرائے ہند" (مولوی کریم الدین پانی پتی) اور "رسالہ تذکرات" (مولوی ذکاء اللہ دہلوی) ایسے ہی انگریزی تراجم کے توسط سے منظر عام پر آئیں، جو بالترتیب ایف فیلن اور فرانسس ٹیلر[23] نے کیے تھے۔ ان کے بعد گارساں دتاسی کی "گل بکاؤلی"[24] اور "تاریخ" (طبع ثانی) کی جلد اول (۱۸۷۰ء) کے انگریزی ترجمے کا ذکر کیا جاتا ہے جو ہندوستان میں مقیم کسی نامعلوم فرانسیسی نے کیا تھا۔ مولوی محفوظ الحق کی اطلاع کے مطابق نواب سید نصیر حسین خیال نے ۱۹۱۷ء میں انھیں اس انگریزی ترجمہ کا مسودہ دکھایا تھا۔[25] برسوں یہ ترجمہ محفوظ رہا،[26] لیکن بالآخر یہ بھی دستبرد زمانہ کی نذر ہو گیا۔

گارساں دتاسی نے ایک مفصل مضمون بذیل عنوان "ہندوستانی مسلمانوں کے مذہب کی خصوصیتوں پر ایک یادداشت"[27] لکھا، جو

تین قسطوں میں ''نوول انیا تیک'' میں شائع ہوا۔[۲۸] اس میں مصنف نے اردو کتابوں سے اخذ کردہ معلومات کی روشنی میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں (سنی اور شیعہ سمیت) کی مذہبی رسومات اور تقریبات کا بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ تقریبات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہجری اور شمسی مہینوں کے اعتبار سے منائی جاتی ہیں۔ اول الذکر تقریبوں میں محرم، آخری چہارشنبہ، بارہ وفات (جشن ولادت حضور اکرمؐ)، عرس شاہ مدار، قفل روزہ، میاد جلال بخاری، ولادت حضرت علیؓ، شب برات، ماہ رمضان، عید الفطر، عید الاضحی اور ثانی الذکر تقریبوں میں عرس سالار مسعود غازی (بہرائچ)، عید خضرؑ، عرس گوگا (ظاہر پیر) شامل ہیں۔ اسی مضمون کے دوسرے حصے میں اکیس مسلمان اولیائے کرام کے مختصر حالات زندگی دیے گئے ہیں۔ گارساں دتاسی کے اس مضمون کے اہم پہلو درج ذیل ہیں:

الف) اپنے دور کے بعض مغربی سیاحوں اور ہندشناسوں کے برعکس گارساں دتاسی نے اس بات پر خاصا زور دیا ہے کہ ہندوستان میں صرف ہندو ہی نہیں بستے، بلکہ یہاں مسلمانوں کی بھی بڑی تعداد آباد ہے اور وہ اپنی زبان، تاریخ اور تہذیب کے اعتبار سے ہندوؤں سے بالکل الگ قوم ہے۔ اہل مغرب میں گارساں دتاسی پہلا شخص ہے جس نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو تہذیبی اعتبار سے دو مختلف قومیں قرار دیا ہے۔

ب) مسلمان تو دنیا کے بیشتر ممالک میں آباد ہیں، لیکن ہندوستانی مسلمان ان سے خاصے مختلف دکھائی دیتے ہیں اور اس کی بنیادی وجہ یہاں کے مسلمانوں کے رہن سہن، رسم و رواج، مذہبی معتقدات اور تقریبات پر گہرے مقامی اثرات دکھائی دیتے ہیں اور یہ نتیجہ ہے صدیوں مسلمانوں اور ہندوؤں کے ایک ساتھ رہنے کا۔ گارساں دتاسی کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ ان رسومات کا قرآنی تعلیمات سے دور کا بھی تعلق نہیں اور یہ اسلام کے اساسی عقائد سے بھی متصادم ہیں، لیکن ہندوؤں کے ساتھ برسوں کے میل جول سے یہ مقامی رنگ اتنی مضبوط جڑیں پکڑ چکا ہے کہ اب انھیں اکھاڑنا ممکن نہیں۔ یوں گارساں دتاسی نے ہند اسلامی تہذیب کے مختلف مظاہر کو ظاہر کیا ہے اور ان دور رس اور دیرپا اثرات کی بھی نشاندہی کی ہے جو اسلامی اور ہندی تہذیبوں پر مثبت یا منفی انداز سے مرتسم ہوئے ہیں۔

موضوعاتی اعتبار سے گارساں دتاسی کے اس اہم ترین مضمون کا انگریزی ترجمہ تقریباً اصل فرانسیسی مضمون کے ساتھ ہی ایک الگ مجلّہ میں شائع ہو گیا تھا،[۲۹] لیکن اب اس کا انگریزی ترجمہ کتابی صورت میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ اس کے مترجم جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) کے استاد (انگریزی) محمد وسیم ہیں۔[۳۰] مترجم نے صرف خود کو ترتیب و ترجمہ ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اسی موضوع پر دو اہم انگریزی کتب پر جو گارساں دتاسی کے زیر نظر مضمون کے ایک سال بعد طبع ہوئیں[۳۱]، گارساں کے تبصروں[۳۲] کا انگریزی ترجمہ بھی ساتھ ہی شامل کر دیا ہے۔

دور حاضر کے فرانسیسی مستشرق مارک گابوریو (Marc Gaborieau) نے گارساں دتاسی کے اسی مضمون کے ایک حصہ کو موضوع بحث بنایا ہے جو مسلمان اولیا، فقرا اور ان کے مزارات سے تعلق رکھتا ہے اور مختلف پہلوؤں سے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔[۳۳]

گارساں دتاسی پر مقالات خصوصی برائے ڈاکٹریٹ

اب تک گارساں دتاسی پر پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کرنے والوں کی تعداد چار ہے۔ ان میں دو خواتین ہیں اور ان کا تعلق فرانس سے ہے، لیکن انھوں نے اپنے مقالات کراچی اور دہلی کی یونیورسٹیوں میں پیش کیے۔ ان دونوں خواتین نے گارساں دتاسی کی ''تاریخ'' کے اردو ترجمہ اور اس کے بیشتر حصوں کو تنقید و تجزیہ کا موضوع بنایا۔ پاکستانی اسکالر نے گارساں دتاسی کے ''خطبات'' پر مقالہ سپرد قلم کیا، جبکہ بھارت کی ایک مسلمان خاتون نے فرانس جا کر اپنی تحقیقات مکمل کیں اور گارساں دتاسی کے سوانحی کوائف اور اس کی تصنیفات پر مبسوط مقالہ (بزبان فرانسیسی) برائے ڈاکٹریٹ مکمل کیا۔ ان چار اسکالروں میں اس خاتون کو سب سے پہلے گارساں دتاسی پر پی ایچ۔ ڈی کی اعلیٰ علمی سند حاصل

کرنے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ چناں چہ ان سنہ یافتگان میں سب سے پہلے اسی کے مقالے کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اس خاتون اسکالر کا نام ثریا حسین (سابق پروفیسر و صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) ہے۔ وہ ۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۰ء پیرس میں مقیم رہیں اور وہیں کی سوربون یونیورسٹی سے تین ہند شناسوں اور ایران شناسوں (آنری ماسے، لوئی رینو اور ژان فلیوزا) کی زیر نگرانی اپنا مقالہ مکمل کیا جو پانڈیچری کے فرنچ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔[۳۴] تقریباً دو دہائیوں بعد انھوں نے خود ہی اپنے اس فرانسیسی مقالے کو اردو میں منتقل کیا۔[۳۵] اس کتاب کو دو فصول بعنوان ''حیات گارسیں دتاسی'' اور ''دتاسی کے علمی کارنامے'' میں تقسیم کیا گیا ہے اور فصل دوم چار ذیلی عنوانات (اردو زبان و ادب، تراجم، عمرانیات و اسلامیات اور متفرق مطبوعات) پر مشتمل ہے۔ آخر میں چند ضمائم ہیں جن میں گارسیں دتاسی کی غیر مطبوعہ تحریروں کا اردو ترجمہ، مکمل فہرست کتب و مقالات گارسیں دتاسی اور اس کے نجی کتب خانہ کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ بلاشبہ ثریا حسین کی یہ علمی کاوش گارسیں دتاسی جیسے محسن اردو کے سوانحی کوائف اور اس کے تصنیفی کارناموں سے آگاہی کے لیے بنیادی حیثیت کی حامل ہے اور یہ اس فرانسیسی اردو داں کی زندگی اور علمی سرگرمیوں کے تمام پہلوؤں کا عالمانہ اور محققانہ سطح پر احاطہ کرتی ہے۔

جس زمانے میں ثریا حسین پیرس میں اپنا مقالہ خصوصی مکمل کر رہی تھیں، اس وقت ایک فرانسیسی خاتون مسکعی لیلیان ازرو کراچی میں گارسیں دتاسی کی ''تاریخ'' (طبع ثانی) کا اردو ترجمہ کرنے میں مصروف تھی۔ محترمہ ازرو (Nazroo) نے ترجمے کے ساتھ جا بجا تنقیدی حواشی بھی لکھے ہیں۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی زیر نگرانی مکمل ہوا اور جامعہ کراچی کی جانب سے موصوفہ کو ڈاکٹریٹ کی سند حاصل ہوئی (۱۹۶۰ء)۔ نصف صدی گزر گئی لیکن ابھی یہ ترجمہ شائع نہیں ہوا۔[۳۶]

ڈاکٹر معین الدین عقیل، جن کے پاس اس ترجمے کا مکمل مسودہ محفوظ ہے، اس کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''مترجمہ نے متن کے ترجمے کے ساتھ ساتھ حواشی بھی تحریر کیے اور کچھ اضافی اور تازہ معلومات سے کام لیا اور مطالب اور مباحث کی تفصیلات کو حذف کر کے محض بنیادی معلومات تک ترجمہ کو محدود رکھا ہے اور پھر ہندی زبان و ادب سے متعلق تمام موضوعات بھی حذف کر دیے جو اصل کتاب کا ایک شریک حصہ تھے۔ چناں چہ انھوں نے ترجمہ کتاب کے عنوان سے ہندوی کا لفظ حذف کر کے کیا۔ واضح رہے کہ گارسیں دتاسی اردو کے لیے ''ہندوستانی'' کا لفظ استعمال کرتا رہا ہے۔''[۳۷]

گارسیں دتاسی پر ڈاکٹریٹ کے تیسرے مقالے کا موضوع ''خطبات گارسیں دتاسی'' ہے۔ سید سلطان محمود حسین نے یہ مقالہ لکھ کر سندھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی (۱۹۷۱ء)۔ اس کا کچھ حصہ بعنوان ''تعلیقات خطبات گارساں دتاسی'' شائع ہو چکا ہے۔[۳۸] اس کے پیش لفظ میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں لکھتے ہیں:

> ''یہ مقالہ بہت ضخیم اور بسیط تھا اور اس کی اشاعت ہمارے ملک کے محدود وسائل کی وجہ سے بہت مشکل تھی۔ تاہم اس کے حواشی اور تعلیقات ابتدائی طور پر شائع کرنا ممکن نہ ہو سکا۔''

ابتدائی پچاس صفحات گارسیں دتاسی کی زندگی اور اس کی تصانیف پر لکھے گئے ہیں اور تمام تر پیش کردہ معلومات ثانوی ماخذ پر مشتمل ہیں۔

دیکھا جائے تو اردو کے نامور محقق قاضی عبدالودود نے ان ''خطبات'' کو اپنے مخصوص انداز تحقیق کا ہدف بنایا اور گارسیں دتاسی کی غلطیوں اور لغزشوں پر سخت گرفت کی۔[۳۹] فی الواقع یہ مقالہ خصوصی قاضی موصوف کی تحقیقات ہی کا تسلسل ہے لیکن رطب و یابس سے معمور۔

ایک سال بعد یعنی ۱۹۷۷ء میں ایک فرانسیسی خاتون اسکالر نے گارساں دتاسی کی 'تاریخ'[38] کا چار جلدوں میں جائزہ لیا (بزبان انگریزی)۔ ڈاکٹریٹ کے اس مقالے کا ایک نسخہ دہلی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔[39]

اقبال اور گارساں دتاسی:

اقبال فرانس کے فلسفیوں اور اسلام شناسوں کے افکار اور تحقیقات سے بخوبی آگاہ تھے، چناں چہ جب وہ پیرس گئے تو خصوصی طور پر برگساں اور لوئی ماسینیوں سے ملنے ان کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہ یورپی مستشرقین بالخصوص جرمن تاریخ استشراق اور جرمن ادبیات کی ''تحریک مشرقی'' پر گہری نظر رکھتے تھے، جس کا ثبوت ''پیام مشرق'' کا دیباچہ ہے لیکن حیرت ہے کہ وہ گارساں دتاسی اور اس کی اردو خدمات سے بھی واقف تھے، حالاں کہ ان کی سوانحی کتب وغیرہ میں اس کا کہیں تذکرہ نہیں کیا گیا۔ اس ضمن میں ایک ہی روایت دستیاب ہے جو میاں محمد بشیر کے توسط سے ہم تک پہنچی ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون ''اقبال کی یاد میں''[40] میں رقم طراز ہیں:

> ''والد مرحوم [جسٹس شاہ دین] کی وفات کے چند سال بعد جب دسمبر ۱۹۲۱ء میں میں رسالہ ''ہمایوں'' جاری کرنے کی تیاری کر رہا تھا تو میں ان [اقبال] کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک نظم کے لیے درخواست کی۔ یہ سن کر کہا کہ ''تم رسالہ کیا نکالتے ہو۔ اردو کے رسالے تو نکلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں۔ تم اردو لٹریچر کے لیے کوئی اور زیادہ مفید کام کرو''۔ میں نے پوچھا تو فرمایا کہ ''تم فرانسیسی زبان سے واقف ہو۔ گارساں دتاسی کی تصانیف کو اردو میں منتقل کر دو'' مگر میرے دماغ میں رسالے کا شوق سمایا ہوا تھا۔''[41]

اس اقتباس کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ۱۹۳۰ء کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) نے ''خطبات گارساں دتاسی''، ''مقالات گارساں دتاسی'' (دو جلد) اور ''گارساں کے تمہیدی خطبے'' یکے بعد دیگرے شائع کیے وہ در حقیقت علامہ اقبال کی خواہش ہی کو عملی جامہ پہنایا گیا۔

گارساں دتاسی کے ہندوستانی ملاقاتی:

گارساں دتاسی زندگی میں ایک بار بھی ہندوستان نہیں آیا اور ان دنوں جن معدودے چند ہندوستانی اصحاب کو سفر یورپ کا موقع ملتا تھا، ان میں بیشتر انگلستان ہی کا رخ کرتے تھے۔ کبھی کبھار ان مسافروں کو لندن جاتے ہوئے چند روز کے لیے پیرس میں ٹھہرنا پڑتا اور ان میں سے کوئی ایسا صاحب ذوق اور علم دوست شخص ہوتا، جو گارساں دتاسی سے ملنے کے لیے کچھ وقت نکال لیتا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ سر سید احمد خاں اپنے چھوٹے فرزند سید محمود کے ہمراہ لندن جاتے ہوئے پیرس ٹھہرے (۱۸۶۹ء) لیکن گارساں دتاسی سے ملاقات نہ کر سکے۔ البتہ تین سال بعد (۱۸۷۲ء) جب سید محمود دوبارہ اکیلے پیرس گئے تو گارساں دتاسی سے ملے اور ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا اور اپنی ''تاریخ'' کا نیا ایڈیشن جو ایک سال قبل (۱۸۷۱ء) میں شائع ہوا تھا، ان کو تحفتاً پیش کیا۔ گارساں دتاسی اپنے ایک خطبہ (بابت ۱۸۷۲ء) میں اس ملاقات کا یوں ذکر کرتا ہے:

> ''سید احمد خاں کے فرزند سید محمود نے لندن اور کیمبرج میں اپنی تعلیم مکمل کر لی ہے اور وہ بیرسٹری کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس گئے ہیں۔ جب وہ ابھی پیرس میں ٹھہرے تھے تو اس وقت مجھے ان سے ملنے کے متعدد مرتبہ موقعے ملے اور ان سے بہت دلچسپ گفتگوئیں رہیں۔ اس نوجوان فاضل شخص کی دلی تمنا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک درس گاہ قائم کی جائے جو کیمبرج کے نمونے کی ہو۔''[42]

گارساں دتاسی سے ملنے والی دوسری شخصیت مولوی مسیح الدین خاں رئیس کاکوری تھی۔[43] الحاق اودھ (۱۸۵۶ء) کے بعد آخری

تاجدارِ اودھ واجد علی شاہ اختر کلکتہ سدھارے اور وہاں مٹیا برج میں ایک نیا لکھنؤ بسا لیا۔ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو واگزار کرانے کے لیے ایک وفد انگلستان بھجوایا، جس کے سربراہ لہ بیجی مسیح الدین کاکوری مقرر ہوئے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب تو نہ ہو سکے، البتہ انھیں کچھ سال یورپ کے مختلف ممالک کی سیاحت کا موقع مل گیا۔ انھوں نے اپنے سفری تجربات و مشاہدات کو اپنی کتاب 'سفیر اودھ' میں قلم بند کیا۔ ان ہی ایامِ سیاحت میں وہ پیرس بھی گئے اور وہیں گارسیں دتاسی سے بھی ملاقات ہوئی۔[۴۴]

گارسیں دتاسی کے ایک ملاقاتی معروف قانون دان اور مؤرخ جسٹس سید امیر علی (۱۸۴۸ء–۱۹۲۸ء) تھے، جن کی ''اسپرٹ آف اسلام'' (طبع اول لندن ۱۸۹۱ء) مقبول ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ وہ اپنی یادداشتوں (بزبان انگریزی) میں گارسیں دتاسی سے ملاقات کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں۔ متعلقہ اقتباس کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

> ''انگلستان سے واپس ہندوستان جاتے ہوئے (اوائل ۱۸۷۳ء) میں چند روز کے لیے پیرس ٹھہرا اور عظیم مستشرق موسیو گارسیں دتاسی اور چند دیگر احباب نے، جن سے میں لندن میں مل چکا تھا، مجھے ملاقات کی دعوت دی۔ دتاسی انتہائی دلکش شخصیت کا مالک تھا۔ وہ اور اس کی بیٹی دونوں درست اور رواں انگریزی میں گفتگو کر سکتے تھے، لیکن اس کے باوجود اس نے اردو میں بات چیت کرنے کو ترجیح دی۔ شاید وہ یوں اپنی فطری خواہش کا اظہار کرنا چاہتا تھا کہ اسے اس زبان پر کس قدر عبور حاصل ہے۔ میں بہت سے اردو داں انگریزوں سے مل چکا ہوں، لیکن میرے خیال میں وہ گارسیں دتاسی جیسی شستہ اور رواں اردو نہیں بول سکتے۔
>
> ایک روز دوپہر کے کھانے کے بعد گارسیں دتاسی نے اپنا خاصا بڑا ذاتی کتاب خانہ دکھایا۔ اس دوران میں وہ متواتر اردو اشعار سناتا رہا۔ ان میں زیادہ تر اشعار سوداؔ اور اس کے دوست اور مدمقابل آتش کے زورِ قلم کا نتیجہ تھے۔''[۴۵]

گارسیں دتاسی نے بھی اس ملاقات کا ذکر کیا ہے:

> ''جب وہ [امیر علی] ہندوستان جا رہے تھے تو راستے میں پیرس میں مجھے ان سے گفتگو کا موقع ملا اور اس زبان کے متعلق میرے خیالات میں، جس پر بہت سے لوگ اعتراض کرتے ہیں، ان کے مباحث کی وجہ سے بہت تقویت پہنچی۔''[۴۶]

ہندوستان میں مقیم گارسیں دتاسی کے یورپی اطلاع کنندگان:

گارسیں دتاسی کے خطبات اور مکتوبات سے پتا چلتا ہے کہ اس کا حلقہ احباب دور دراز کے ممالک تک پھیلا ہوا تھا، بالخصوص انگلستان اور ہندوستان کے خاور شناسوں، اہل ذوق اور اربابِ علم و دانش سے اس کا مراسلت کا سلسلہ برسوں چلتا رہا۔ یہ امر کس قدر تعجب خیز ہے کہ اس باقاعدگی اور مستقل مزاجی سے ہندوستان کے علم و ادب کے قدر دانوں، اخبارات و جرائد کے مدیران، ناشرین کتب اور شعبہ تعلیم کے ماہرین سے اپنا تعلق مستحکم کیا اور ان کی ارسال کردہ معلومات سے استفادہ کرتا رہا۔ علاوہ ازیں اس کے مکتوب الیہوں میں فرانس اور انگلستان کے کچھ ایسے ذی علم اصحاب بھی شامل تھے، جو عرصہ دراز سے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں فرائض منصبی ادا کر رہے تھے اور گارسیں دتاسی کی فرمائش پر مطلوبہ معلومات، کتب، رسائل اور بسا اوقات خطی نسخوں کی نقلیں تیار کرا کے بھجوایا کرتے تھے۔ وہ گارسیں دتاسی کے علمی استفسارات کا بڑی تلاش و جستجو اور کاوش سے جواب دیتے تھے۔ اس کے ایسے چند رفقائے کار کا سطورِ ذیل میں مختصر ذکر کیا جاتا ہے:

۱) فیلکس بوترو (Félix Boutros) ۔ جائے ولادت "سین" (فرانس)۔ نوجوانی میں اپنے کسی قریبی عزیز کے بلاوے پر ہندوستان چلا آیا۔ مقامی لوگوں سے میل جول کے سبب بہت جلد اردو زبان سیکھ لی اور بولنے اور لکھنے پڑھنے میں یہی زبان اس کا ذریعہ اظہار تھی۔ ۱۸۳۲ء میں وہ درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہو گیا اور چند سالوں میں اس شعبے کے جانے پہچانے مدرسین میں شمار ہونے لگا۔ جب اضلاع شمالی و مغربی کے لفٹنٹ گورنر جیمز تھامسن (James Thomsan) نے دہلی کالج کی تنظیم نو کا بیڑا اٹھایا، تو اس درس گاہ کے لیے سیکرٹری کا عہدہ ختم کرنے اور اس کی جگہ پرنسپل مقرر کرنے کی تجویز پیش کی، چنانچہ اس کالج کا پہلا پرنسپل بوترو مقرر ہوا اور وہ چار سال (۱۸۴۱ء–۱۸۴۵ء) اسی عہدے پر کام کرتا رہا۔ اس کے دور پرنسپلی کا اہم ترین کارنامہ ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے جنوبی ایشیا میں یہ پہلا ادارہ ہے جس کا اولیں مقصد انگریزی کی اہم سائنسی، فنی اور علمی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنا اور ان تراجم کے ذریعہ یورپ کے "علوم مفیدہ" کو مقامی لوگوں میں متعارف کرانا تھا۔ ان ہی "علوم مفیدہ" کے فروغ اور انھیں مقبول عام بنانے کے لیے "انجمن پنجاب" (لاہور، سنہ تاسیس ۱۸۶۵ء) اور سر سید احمد خاں کی تشکیل کردہ سائنٹفک سوسائٹی غازی پور، علی گڑھ (سنہ تاسیس ۱۸۶۴ء) کوشاں رہیں اور انھی کو اپنے اغراض و مقاصد کا حصہ بنایا۔ مزید یہ کہ بوترو نے اردو ترجمے کے جو اصول وضع کیے، وہ کم و بیش وہی ہیں جن پر اسی مقصد کے تحت بنائے گئے اداروں مثلاً دار الترجمہ (حیدرآباد دکن)، مجلس زبان دفتری (لاہور)، ادارہ تالیف و ترجمہ (پنجاب یونیورسٹی) ادارہ تصنیف و تالیف و ترجمہ (جامعہ کراچی) وغیرہ نے عمل درآمد کیا۔

۱۸۴۵ء میں خرابی صحت کی وجہ سے بوترو واپس فرانس چلا گیا۔ وہاں انجیرس (Angiers) شہر میں سکونت اختیار کر لی۔ ذرا طبیعت سنبھلی تو شادی کر لی۔ ایک لڑکا پیدا ہوا۔ کچھ دیر بعد پھر بیمار پڑے اور اسی شہر میں وفات پا گیا (مئی ۱۸۶۴ء)۔[۴۸]

گارساں دتاسی سے نہ صرف بوترو کی دوستی تھی، بلکہ وہ اسے نایاب کتابوں کی نقول فراہم کرتا تھا اور اس کے کئی منصوبوں میں شریک رہا۔ مثلاً سر سید احمد خاں کی "آثار الصنادید" کے بعض فرانسیسی ترجمہ (پیرس ۱۸۶۱ء) کی نظر ثانی مترجم یعنی گارساں دتاسی کی فرمائش پر بوترو نے کی۔ بوترو کی ایک انگریزی کتاب (سیرام پور، ۱۸۴۲ء) پر دتاسی گارساں نے تبصرہ کیا۔ بوترو کے نجی کتاب خانہ میں اردو کی بعض کتابوں کے مخطوطات اور نایاب مطبوعات موجود تھیں، جن سے گارساں دتاسی بوقت ضرورت استفادہ کرتا رہتا تھا، مثلاً تذکرہ ذوق دہلوی اور مصطفیٰ خاں شیفتہ کا تذکرہ "گلشن بیخار" (مکتوبہ ۱۸۳۴ء)، جو گارساں دتاسی کو بھجوایا گیا۔[۴۹] اسی طرح "حدائق البلاغت" کے اردو ترجمہ از امام بخش صہبائی (دہلی، ۱۸۴۲ء) کی ایک نقل خصوصاً گارساں دتاسی کے لیے تیار کرا کے انھیں ارسال کی گئی۔ ویسے بھی یہ ترجمہ بوترو کی فرمائش پر کیا گیا، جیسا کہ مترجم نے ابتدائیہ میں خود اس بات کا اعتراف کیا ہے:

> "بوترس صاحب...... ارشاد کیا کہ اگر یہ نسخہ فارسی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا جاوے اور اس میں عربی اور فارسی کی جگہ اردو اور زبان داں ہند کے مندرج ہوں تو ان لوگوں کے واسطے کہ اردو اشعار سے ذوق رکھتے ہیں...... بہت مفید ہوگا۔ اس واسطے اس خاکسار نے بموجب اس کے کہ المامور معذور باوجود کم استعدادی کے تقدیم امر میں سعی کر کے اس رسالہ کو ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں مرتب کیا۔"[۵۰]

اسی طرح امام بخش صہبائی "انتخاب دواوین" کے شروع میں لکھتے ہیں:

> "...... ناچار شائقین سخن کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ صاحب والا مناقب حاکم بلند مناصب داور عدل گستر بوترس صاحب بہادر پرنسپل کے ارشاد سے دواوین اردو میں سے ہر مصنف کے اشعار انتخاب ہو کر ایک

مجموعہ مرتب ہوا کہ ناظرین کو اکثر شعرا کے کلام سے ایک جائے میں التقاط و فراوری کا افادہ حاصل ہو......[51]

۲) شارل دوشوا (Charles d'Ochoa)۔[52] گارساں دتاسی کا ہم وطن اور شاگرد۔ فرانس کے کسی سوانحی انسائیکلوپیڈیا میں اس کا نام موجود نہیں، اس لیے شارل کے تفصیلی حالات زندگی معلوم نہیں ہو سکے۔

گارساں دتاسی اپنے ایک خطبہ (بابت ۳ دسمبر ۱۸۶۶ء) میں بتاتا ہے کہ "خیرات کا بارہ ماسا پھر دوبارہ آگرہ میں طبع ہوا ہے۔ یہ کتاب اچھی خاصی مشہور ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ میرے شاگرد Ch. d'Ochoa ہندوستان سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس وقت یہ نسخہ شاہی کتب خانے میں موجود ہے۔[53]

مختلف ہندوستانی مطابع سے عربی، فارسی اور اردو مطبوعات (مابین ۱۸۱۶ء – ۱۸۲۸ء) سے متعلق شارل نے جو رپورٹیں بھجوائی تھیں، ان کی بنیاد پر رینو (J. Reinaud) نے ایک فہرست مرتب کی تھی، جس میں شارل کو یاد شرق میں سرگرم فرانس کے ایک سائنسی مشن کا رکن بتایا گیا ہے۔

آغا افتخار حسین کے مطابق دوشوا ایک سائنس مشن کا سربراہ تھا اور اسے حکومت فرانس کے وزیر تعلیم نے ۱۸۴۳ء میں ہندوستان بھیجا تھا۔ اس نے قواعد اردو لکھنا شروع کی تھی، لیکن صرف ایک صفحہ ہی لکھ سکا۔ دشوا کی ایک نوٹ بک قومی کتب خانہ (پیرس) میں محفوظ ہے جس میں اس نے اردو کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔[54]

گارساں دتاسی "تاریخ" میں موتی رام کی "مادھونل" کے تحت لکھتا ہے کہ "میرے دوست شارل دشوا نے ہندوستان سے اطلاع دی ہے کہ اس کتاب کا ایک مخطوطہ دیوناگری رسم الخط میں ہے۔ اب یہ قلمی نسخہ پیرس کے شاہی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔"[55]

فرانس کے قومی کتب خانہ میں جو اردو مخطوطات محفوظ ہیں، ان میں کچھ شارل ہی کے دیے ہوئے ہیں۔ بعض قلمی نسخوں پر اس نے مفید حواشی بھی قلمبند کیے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے اردو زبان سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ اردو قلمی نسخے جمع کرتا رہتا تھا۔ ایسے ہی چند خطی نسخوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

مخطوطہ نمبر ۸۳۲ (اوراق ۳۰۳) اس میں شارل نے اردو اور فرانسیسی میں حواشی لکھے ہیں۔ ان میں اردو کے روزمرہ استعمال ہونے والے محاورات مع فرانسیسی ترجمہ دیے گئے ہیں۔ صفحہ ۲۳۸ پر ایک مختصر فرانسیسی نوٹ میں مشرقی زبانوں کے نظام اعراب و علامات کا ذکر کیا ہے۔ صفحہ ۱۳۸ سے پتہ چلتا ہے کہ شارل نے قواعد اردو لکھنا شروع کی تھی، لیکن وہ اس کا صرف ایک صفحہ ہی لکھ سکا۔ جس میں وہ ہندوستانی زبان، جو اردو، ہندی اور ریختہ کے ناموں سے بھی موسوم ہے، اصل ہندی اور برج بھاشا کو قرار دیتا ہے۔ بقول اس کے "ہندوستانی ایک جدید دکنی زبان ہے جو عربی (فارسی) اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں لکھی جاتی ہے لیکن زیادہ تر عربی رسم الخط مستعمل ہے۔ دیوناگری رسم الخط صرف برج بھاشا اور ہندی بولیاں لکھنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔"

مخطوطہ نمبر ۸۳۸، مکتوبہ انیسویں صدی عیسوی، یورپی کاغذ، صفحات ۲۰۰، ۹ سطوری صفحہ۔

یہ قلمی نسخہ بھی شارل کے کتب خانہ کی ملکیت تھا۔ اس میں چار قلمی تحریریں ہیں:

الف) الفبائی ترتیب میں فارسی اور اردو کتب کی فہرست۔ (مرتبہ شارل)۔

ممکن ہے یہ فہرست گارساں دتاسی کے لیے تیار کی گئی ہو۔

ب) بیجاپور کے سرکاری کتب خانہ کی فہرست (مرتبہ شارل)

اس کے شروع میں یہ عبارت مرقوم ہے:

"فہرست کتب خانہ حضرت آثار قدس انوار بلدہ دارالظفر بیجاپور، بمعرفت شیخ محمد متولی و محمد علی...... و محمد مراد مشرف و خواجہ عزیز تحویل دار واقعہ بتاریخ ۷ ماہ ربیع الاول ۱۵ جلوس والا نوشتہ شد۔"

ج) اس کتب خانہ کی فہرست جو ۱۸۲۳ء میں ریکٹر کو فراہم کی گئی (مرتبہ شارل)

اس فہرست کا آغاز:

"فہرست کتب خانہ حضرت آثار قدس انوار بلدہ دارالظفر بیجاپور بتاریخ نہم شہر ربیع الثانی ۱۲۳۹ ہجری در وقت ریذیڈنٹ ریکٹر صاحب بہادر۔"

ان تین فہارس کے بعد میر علی شیر قانع ٹھٹوی کی "تحفۃ الکرام" کی فہرست اسماء اور پھر میر حسن کی مثنوی "سحر البیان"۔

مخطوطہ نمبر ۸۲۵ (ہندوستانی ۲۰۶)۔ دیوان عاجز۔ مکتوبہ اٹھارویں صدی عیسوی۔ خط نستعلیق۔ ۱۴۳ صفحات۔ ۱۲ سطور فی صفحہ۔ یہ نسخہ پہلے شارل کے کتب خانہ کی زینت تھا۔

مخطوطہ نمبر ۸۲۶ (ہندوستانی ۲۰۷)۔

انیسویں صدی عیسوی کے مختلف اردو شعراء کے کلام کا مجموعہ۔ صفحات ۵۳۔ فی صفحہ ۱۵ سطور۔

مخطوطہ نمبر ۸۲۷ (ہندوستانی ۲۰۸)۔ دیوان علیم اللہ شاہ۔

مکتوبہ ۱۸۲۱ء۔ خط نستعلیق۔ یورپی کاغذ۔ ۹۶ اوراق۔ فی صفحہ ۹ سطور

مخطوطہ نمبر ۸۲۸ (ہندوستانی ۲۰۹)۔

مختلف شعراء کی نظمیں اور گیت۔ مکتوبہ انیسویں صدی عیسوی۔ خط نستعلیق۔ یورپی کاغذ۔ ۳۴۴ صفحات۔ فی صفحہ ۱۲ سطور۔

مخطوطہ نمبر ۸۲۹ (ہندوستانی ۲۱۰)۔

قصہ بے نظیر و بدر منیر (یعنی مثنوی سحر البیان) از میر حسن۔ مکتوبہ ۱۸۱۵ء۔ خط نستعلیق۔ یورپی کاغذ۔ ۲۱۶ صفحات۔ فی صفحہ گیارہ اشعار۔

مخطوطہ نمبر ۸۵۲ (ہندوستانی ۲۱۳)۔ بزبان اردو۔ مکتوبہ انیسویں صدی عیسوی۔ خط نسخ۔ صفحات ۲۲۳۔ فی صفحہ ۱۱ سطور۔

مخطوطہ نمبر ۸۸۲ (سنسکرت دیوناگری ۲۳۰)۔ کلپا سوتر۔ جینی پراکرت میں۔ شارل کے لیے نقل کرائی گئی۔ "مہاویر کی وفات کے بعد ہمارے دور (پٹاولی) تک کے جینیوں کے بڑے روحانی پیشواؤں کے حالات"۔ ناگری متن کے ساتھ لاطینی رسم الخط۔ جدید نسخہ جو ۱۹۲۳ء کے مکتوبہ نسخے سے تیار کیا گیا۔ ناگری خط۔ یورپی کاغذ۔ صفحات ۲۷۳۔ فی صفحہ ۲۳ سطور۔

۳) ناتھنیل بلانڈ (Nathaniel Bland) (۳ فروری ۱۸۰۳ء – ۱۰ اگست ۱۸۶۵ء)۔

بک لینڈ کے مطابق اس نے اپنی ابتدائی تعلیم ایٹن (۱۸۱۸ء) اور کرائسٹ چرچ (آکسفورڈ) میں مکمل کی۔ (۱۸۲۱ء–۱۸۲۵ء) فارسی زبان و ادبیات سے گہرا شغف رکھتا تھا۔ اس کے بیشتر مضامین رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مجلّہ میں شائع ہوتے رہے

(۱۸۴۳ء-۱۸۵۳ء)۔ جوا کھیلنے کا شوقین تھا۔ تمام جائداد اسی کھیل کی نذر کر دی۔ بالآخر خودکشی کر لی۔[۵۶]

بلاں کی وفات سے ایک سال بعد یعنی ۱۸۶۶ء کے ایک خطبہ میں گارساں دتاسی اس کا ان الفاظ میں ذکر کرتا ہے:

> ''بلاں کا انتقال ہمبورگ لے بین (Hambourg les-Bains) میں ہوا، جہاں وہ عزلت گزینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ابتدا میں انھوں نے ڈنکن فوربز (Duncan Forbes) کی شاگردی اختیار کی اور فارسی اور اردو کی تحصیل کی۔ اس کے بعد وہ میرے درسوں میں شریک رہے اور پھر کچھ دنوں کے لیے لندن چلے گئے تھے۔ ان کا بہت دنوں سے یہ ارادہ تھا کہ ادب فارسی کی ایک تاریخ لکھیں لیکن موت نے انھیں مہلت نہ دی کہ وہ اس خیال کو عمل میں لا سکتے۔ انھوں نے فارسی شعراء کے تذکرے ''آتش کدہ'' پر مفصل تبصرہ کیا ہے اس کا قلمی نسخہ میں نے انھیں سودا کے قلمی نسخے کے بدلے میں دیا تھا۔ اس کے علاوہ نظامی کے ''مخزن الاسرار'' کا ایڈیشن انھیں کی مساعی کا رہین منت ہے۔ آپ نے ہندوستان کے سب سے قدیم شاعر مسعود بن سعد کے کلام پر بھی تبصرہ کیا ہے۔''[۵۷]

بلاں نے ایک انگریزی کتاب بعنوان ''ایرانی شطرنج'' (با تصویر) بلنڈ (لندن ۱۸۵۰ء) جس پر گارساں دتاسی نے تبصرہ کیا (در: ژورنال ازیاتیک، بابت مارچ، اپریل ۱۸۵۱ء، ص ۲۸۵-۲۸۹)۔ اس تبصرے میں شطرنج سے متعلق عربی اور فارسی کی پانچ کتابوں سے معلومات درج کی گئی ہیں۔[۵۸]

انیسویں صدی عیسوی کے تقریباً وسط میں ایک دلچسپ علمی بحث کا آغاز ہوا اور اس کا مرکز و محور یہ سوال تھا کہ ہندوستانی یعنی اردو کا اولیں شاعر کون تھا؟ حیرت ہے کہ اس بحث میں حصہ لینے والے ہندوستانیوں اور انگریزوں کے علاوہ فرانسیسی اور جرمن مستشرقین بھی شامل تھے۔ اس بحث کو شروع کرنے والا گارساں دتاسی تھا، جس نے سعدی کی سیاحت ہندوستان اور شاہ محمد کمال کے تذکرہ ''مجمع الانتخاب'' میں درج کردہ اشعار کی بنا پر سعدی ہی کو اردو کا پہلا شاعر قرار دیا۔[۵۹] معروف جرمن خاورشناس اور دہلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اشپرینگر (م-۱۸۹۳ء) نے شاہان اودھ کے کتب خانوں میں محفوظ بعض مخطوطات کے پیش نظر گارساں دتاسی کے اس دعویٰ کو رد کرتے ہوئے استفہامیہ عنوان کے تحت مضمون لکھا ''کیا سعدی نے ریختہ اشعار کہے؟''[۶۰] ان مضامین کے مندرجات بالخصوص گارساں دتاسی کے نتائج تحقیق سے اختلاف کرتے ہوئے بلاں نے ایک مضمون بشکل خط گارساں کو ارسال کیا، جس میں اس نے سعدی کے بجائے مسعود سعد سلمان کو اردو کا پہلا شاعر قرار دیا۔[۶۱] اس نے اپنے دعویٰ کی بنیاد امیر خسرو کی 'غرۃ الکمال' اور عوفی یزدی کے تذکرہ 'لباب الالباب' پر رکھی۔ ان تصانیف میں مسعود سعد سلمان لاہوری کے ''دیوان ہندوی'' کا حوالہ موجود ہے لیکن بدقسمتی سے اب وہ ناپید ہے۔ تقریباً ڈیڑھ صدی گزر گئی، لیکن اب بھی بلاں کی تحقیق ہی کو حرف آخر مانا جاتا ہے اور اردو زبان و ادب کے مؤرخین اردو کے اولیں شاعر کا سہرا مسعود سعد سلمان ہی کے سر باندھتے ہیں۔[۶۲] بعد میں گارساں دتاسی نے بھی اپنی 'تاریخ' میں بلاں کی تحقیق کو درست تسلیم کر لیا[۶۳] اور جا بجا اس کی تحریروں اور علمی تعاون کے حوالے دیے۔[۶۴]

۳) فرانسس ٹیلر (م-۱۸۵۷ء) دہلی کالج کے آغاز (۱۸۲۵ء) سے اختتام (۱۸۵۷ء) تک ٹیلر نام کے تین اشخاص کا بطور سیکرٹری، قائم مقام پرنسپل، ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل ذکر کیا جاتا ہے یعنی جان ہنری ٹیلر، اس کا بیٹا فریڈرک ٹیلر اور فرانسس ٹیلر، لیکن ان میں مؤخر الذکر ٹیلر ہی گارساں دتاسی کے قریبی احباب میں شامل تھا۔ یہ وہی شخص تھا، جس کے قتل کے جرم میں محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کو تختہ

دار پر لٹکا دیا گیا۔

گارساں دتاسی اپنے ایک خطبہ (بابت ۲ دسمبر ۱۸۵۶ء) میں اس ٹیلر کا یوں ذکر کرتا ہے:

''چند ہفتے ہوئے مسٹر فرانسس ٹیلر نے جو دہلی کے ایک دیسی کالج کے پرنسپل ہیں، مجھے ان ہندوستانی تصانیف کی ایک فہرست بھیجی ہے جو حال میں سلطنت مغلیہ کی راجدھانی (دلی) میں شائع ہوئی ہے۔ اس فہرست میں چند ایسی کتابوں کا بھی ذکر ہے جو میں نے اب تک آپ حضرات کو نہیں بتائی ہیں۔

یہ کتابیں اردو ادب کے لیے ایک قابل قدر اضافہ کا حکم رکھتی ہیں''۔[66]

اگلے سال اپنے اس علمی مددگار[67] کے قتل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''مسٹر فرانسس ٹیلر مجھے اکثر و بیشتر شمالی ہند کی ادبی تحریکات سے مطلع کرتے رہے۔ ان پر ادبی مسائل کی فراہمی کے لیے بڑا بھروسہ تھا۔ وہ خط کا جواب پابندی سے دیتے اور جو پوچھا جاتا، اس میں اپنی حتی الامکان تحقیق کرتے۔ وہ ہندوستانی زبان سے بخوبی واقف تھے اور اس کے عالموں سے ان کے دوستانہ مراسم تھے، اس لیے بحث طلب معلومات میں وہ اہل زبان عالموں کی رائے بھی لیتے رہتے تھے۔ اس سے ان کے ادبی و علمی معاون ہونے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے''۔[68]

۵) سر ولیم میور (۱۸۱۹ء–۱۹۰۵ء)۔ معتقد انگریز شخصیت اور مؤرخ۔ گارساں دتاسی ایک خطبہ (بابت ۲ دسمبر ۱۸۵۹ء) میں بتاتا ہے:

''آگرہ گورنمنٹ نے بھی انسٹی ٹیوٹ آف فرانس کو ۵۷ کتابوں کا ایک ذخیرہ تحفتاً بھیجا ہے اور اس میں بھی مجھے چند کتابیں نظر آئی ہیں۔ یہ ذخیرہ میرے قابل فخر احباب مسٹر ولیم میور معتمد حکومت ممالک مغربی و شمالی ہند اور مسٹر ایچ ایس ریڈ، ناظم تعلیمات ممالک مغربی و شمالی کے توسط سے وصول ہوا ہے''۔[69]

برسوں بعد وہ ولیم میور سے پیرس میں ملاقات اور اس کے مالی تعاون کا ان الفاظ میں ذکر کرتا ہے:

''سر ڈبلیو میور جو گورنر جنرل کی کونسل کے رکن مقرر ہوئے ہیں، علاج کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ پیرس سے گزرتے وقت وہ مجھ سے ملنے آئے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ موصوف نے سال رواں میں عمدہ کتابوں کے مصنفوں کی ہمت افزائی کے لیے پانچ ہزار روپے کی رقم عنایت کی ہے۔ ان میں سے سولہ اردو کے اور دو ہندی کے لکھنے والے ہیں۔ ان میں جو کتاب مجھے سب سے زیادہ پسند آئی وہ مولوی نذیر احمد کی ''توبۃ النصوح'' ہے''۔[70]

۶) جی۔ ڈبلیو لائٹنر (۱۸۴۰ء–۱۸۹۹ء)۔ مستشرق اور ماہر تعلیم۔ گورنمنٹ کالج لاہور کا پہلا پرنسپل، اورینٹل کالج کا بانی اور پنجاب یونیورسٹی لاہور کا رجسٹرار۔

گارساں دتاسی ایک خطبہ (بابت ۳ دسمبر ۱۸۶۹ء) میں بتاتا ہے کہ 'لاہور سے ایک اور ہندوستانی اخبار بہت عرصے سے شائع ہو رہا ہے جس کے متعلق مجھے ابھی حال ہی میں ڈاکٹر لیٹنر کے توسط سے معلومات حاصل ہوئی ہیں''۔[71] ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ ''یہ معلومات ڈاکٹر لائٹنر کے اس خط سے لی گئی ہیں جو انھوں نے مجھے بھیجا تھا''۔[72]

''سنین اسلام'' (جلد اول) طبع ہوئی (۱۸۷۱ء) تو فی الفور اس کا ایک نسخہ گارساں دتاسی کو بھجوایا گیا۔ اس نے اسی سال کے خطبے

میں اس پر تبصرہ کیا[73] اور فالر کے ترجمے کے مخصوص نظریے کی بھرپور تائید کی۔[74]

۷) ابراہام رچرڈ فلر (Abraham Richard Fuller)۔ رائل آرٹلری، بنگال میں بھرتی ہوا (۱۸۲۵ء)۔ کیپٹن اور میجر کے عہدوں پر فائز ہوا (بالترتیب ۱۸۵۸ء، ۱۸۶۵ء)۔ پنجاب کا ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن تعینات ہوا۔ عربی اور فارسی سے دلچسپی رکھتا تھا۔ ایچ ایم ایلیٹ کی فرمائش پر عنایت خاں کے "شاہجہاں نامہ" کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس کا مسودہ برٹش لائبریری میں محفوظ تھا۔ اب امریکی تاریخ دان بیگلی نے اسے شائع کرادیا ہے۔ فلر کی موت پانی میں ڈوبنے سے ہوئی (اگست ۱۸۶۷ء) عمر اڑتیس سال۔

گارسیں دتاسی اپنے خطبہ (بابت ۳ دسمبر ۱۸۶۶ء) میں فلر کا یوں ذکر کرتا ہے:

"میرے محترم دوست میجر فلر نے "پنجاب ایجوکیشنل میگزین" کے پچھلے نمبر بھیجے ہیں۔"[75]

گارسیں دتاسی کا ذاتی کتب خانہ اس کی وفات کے بعد نیلام ہوگیا، لیکن اس کی کچھ نادر کتب فروخت نہ ہوسکیں اور وہ اب اس کے آبائی شہر مارسیلز کی میونسپل لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ان میں غالب کی "قاطع برہان" (دہلی، صفحات ۱۵۲) کا وہ نسخہ موجود ہے جو مؤلف نے خود میجر فلر کو پیش کیا اور فلر نے بطور تحفہ گارسیں دتاسی کو ارسال کردیا۔[76]

۸) ای سیسے (E. Sice) گارسیں دتاسی کا شاگرد۔ برسوں پانڈیچری میں رہائش پذیر رہا اور وہاں سے اپنے استاد کو وقتاً فوقتاً اخبارات اور مخطوطات بھجواتا رہتا تھا۔ اردو جانتا تھا اور جنوبی ہند میں اسے رابطے کی زبان سمجھتا تھا۔[77]

گارسیں دتاسی ایک خطبہ (بابت ۶ دسمبر ۱۸۶۹ء) میں لکھتا ہے:

"میرے پرانے شاگرد مسٹر ای سیسے نے، جو آجکل پانڈیچری میں ہیں، اس [عمدۃ الاخبار، بریلی] کی ایک اشاعت کا نمونہ مجھے بھیجا ہے۔"[78]

"تحفۂ عبادت (مثنوی) از شاہ محمد قادری کا قلمی نسخہ ای سیسے نے پانڈیچری سے ارسال کیا۔"[79]

۹، ۱۰) ڈاکٹر پیٹرکن (Dr. Peterkin) اور سی ترال (C. Tarral)۔ ۱۸۳۳ء میں گارسیں دتاسی نے Rudiments ..... (مبادیات ہندوستانی) کے ساتھ کچھ اردو خطوط بطور نمونہ چھپوائے تھے۔ یہ کاتب ہندوستان میں مقیم اس کے احباب اور تلامذہ لکھا کرتے تھے۔ بعد میں بھی یہ سلسلہ مراسلت جاری رہا۔ ان تمام موصولہ خطوط کو اس نے "ژورنال ازیاتیک" میں مع فرانسیسی ترجمہ شائع کرادیا۔ ان ہی مکتوب نویسوں میں پیٹرکن اور ترال کے نام بھی شامل ہیں۔ ایک مختصر نوٹ میں وہ خود لکھتا ہے کہ "۱۸۳۳ء میں اردو خطوط کا مجموعہ چھپا۔ اس کے بعد سے میرے پاس بکثرت دیگر خطوط بھی اس زبان میں جمع ہوگئے ہیں۔ فارسی اور ناگری دونوں رسم الخط میں۔ بعض لندن کی ایشیاٹک سوسائٹی نے مجھے تحفتاً دیے ہیں اور کچھ مختلف لوگوں سے مستعار ملے ہیں، جیسے پیٹرکن..... ترال وغیرہ۔ میں ان کو انگریزی ترجمے کے ساتھ مستقبل قریب میں چھاپنا چاہتا ہوں اور اس کام میں میرا شاگرد داوری برتراں بھی مجھے مدد دینے والا ہے"۔[80]

ان کے علاوہ گارسیں دتاسی نے "تاریخ"، خطبات اور مقالات میں چند ایسے باذوق اردو دانوں اور ماہرین تعلیم کا تذکرہ کیا ہے جو ضرورت پڑنے پر اسے کتابیں، رسالے وغیرہ بھجوایا کرتے تھے۔ ان میں سے چند نام یہ ہیں۔ ریونڈ جی، سمال[81]، سر الیگزنڈر گرانٹ، ڈائرکٹر تعلیمات (۱۸۲۶ء-۱۸۸۴ء)، سر چارلز ٹریویلین (۱۸۰۷ء-۱۸۸۶ء)، میجر جیرو وغیرہ۔[82]

گارسیں دتاسی کی "تاریخ" پر معاصرین کے تبصرے

سطور بالا میں بیان کیا جاچکا ہے کہ گارسیں دتاسی نے ادبیات ہندی و ہندوستانی کی جو جامع تاریخ قلمبند کی، اس کا پہلا ایڈیشن دو

جلدوں پر مشتمل تھا اور اس کے سنین طباعت ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۷ء تھے۔ اس کے بعد گارساں دتاسی کو ہندوستان اور انگلستان کے مختلف ذرائع سے نئی معلومات حاصل ہوتی رہیں اور وہ انھیں اپنی ''تاریخ'' میں مناسب جگہوں پر شامل کرتا رہا۔ آخر یہ اضافات اس قدر بڑھ گئے کہ اس کا دوسرا ایڈیشن دو کے بجائے تین جلدوں پر پھیل گیا (مطبوعہ ۱۸۷۰ء-۱۸۷۱ء)۔ ہمارے ہاں بیشتر اصحاب علم و فضل نے ''تاریخ'' کی اشاعت ثانی ہی کو تنقید و تحقیق کا ہدف بنایا ہے اور اسی کی کمیوں، کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کو طشت از بام کیا ہے لیکن یورپ کے بعض علمی مجلات میں ان دونوں طباعتوں کے منظر عام پر آتے ہی عالمانہ، ناقدانہ اور قدرے محققانہ تبصرے شائع ہونے لگے۔ چوں کہ یہ مغربی رسائل ہمارے کتاب خانوں میں ناپید ہیں، اس لیے ان میں چند سے تبصروں کا مختصر اً ذکر کیا جاتا ہے۔

گارساں دتاسی کی ''تاریخ'' کی اولیں اشاعت کی پہلی جلد (مطبوعہ ۱۸۳۹ء) پر جو تبصرہ شائع ہوا وہ انگریزی میں بعنوان ''ہندوستانی لٹریچر'' تھا۔ یہ ''دی ایشیاٹک جرنل'' میں طبع ہوا۔[۸۳] مبصر کا نام درج نہیں، لیکن تبصرے کے بعض حصے شاہد ہیں کہ تبصرہ نگار اردو زبان و ادب اور اس کے بعض شعراء کے کلام سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس نے بالخصوص چند دلّی مظہر جانجاناں اور ولی کی شاعری پر مختصر تبصرہ کیا ہے اور ان شعراء کے چند اشعار کا انگریزی ترجمہ بھی دیا ہے۔ اس تبصرے کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

"There is, however, in the case of de Tassy's work and its reception in the above quarters, a *dignus vindice nodus*, of such a character as places it beyond the emulation of ordinary aspirants. Anything from his pen, on the subject of oriental literature, must command the attention and respect of all who take an interest in the conduct of the human intellect, cultivated to a high degree, in a nation, and by institutions, cultivated to a high degree, in a nation, and by institutions, equally distant and diverse from those of Europe, and especially of such as appreciate the important relations into which we are now brought with the countless myriads of the southern half of Asia."[۸۴]

''تاریخ'' کی اولیں طباعت کی دوسری جلد ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی اور اس پر یورپ کے تین ممالک (فرانس، جرمنی اور آسٹریا) کے علمی جرائد میں الگ الگ تبصرے کیے گئے۔ ''ژورنال ازیاتیک'' میں لانسرو (Ed. Lancereau) نے اس کے مندرجات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور اسے اپنے موضوع پر اہم اولیں تصنیف قرار دیا ہے۔[۸۵] مبصر، گارساں کے قریبی احباب میں شامل تھا اور ہندی سے نیا دو لگاؤ رکھتا تھا۔ گارساں دتاسی نے زندہ مشرقی زبانوں کا ایک مجموعہ ''ہندی و ہندوی منتخبات'' (پیرس ۱۸۴۹ء) مدرسۂ السنۂ شرقیہ کے طلباء کے لیے تیار کرایا۔ اس کے حصہ منظومات کی چوتھی نظم مہابھارت کے ہندی ترجمے سے شکنتلا کے قصے پر مبنی ہے جس کی مفصل لغت لانسرو ہی کی تیار کردہ ہے۔[۸۶] دوسرا تبصرہ جرمنی کی اورینٹل سوسائٹی کے مجلّے میں شائع ہوا۔[۸۷] تبصرہ نگار نے اپنا نام نہیں لکھا، لیکن اس نے گارساں دتاسی کی اس علمی کاوش کی داد دی ہے۔[۸۸] تیسرا تبصرہ جرمن بولنے والے ممالک کی تاریخ استشراق کے جلیل القدر معروف آسٹرین خاورشناس ہامر پورگشتال (۱۷۷۴ء-۱۸۵۶ء) نے کیا۔[۸۹] اس مفصل تجزیے کا انداز عالمانہ ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مبصر ایسے فارسی تذکروں پر گہری نظر رکھتا ہے جن میں نمایاں اردو شعراء کے حالات زندگی اور شعری نمونے منقول ہیں۔ اردو کے آغاز اور اس کے عہد بہ عہد ارتقاء پر فارسی زبان و

ادبیات کے مختلف النوع اثرات کا عمیق جائزہ لیا گیا ہے اور اس تناظر میں گارساں کی "تاریخ" کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔[۹۰]
دہلی کالج کے پہلے پرنسپل اور گارساں دتاسی کے دوست فیلکس بوتروکا مکتوب

"بوترو کے مکتوب بنام گارساں دتاسی (دہلی، ۱۹ دسمبر ۱۸۴۱ء) سے اقتباس (اردو ترجمہ)

دہلی کالج کے دو شعبے ہیں۔ ایک میں انگریزی پڑھائی جاتی ہے اور دوسرے میں ہندوستانی اور جدید یورپ کے علوم، نیز دیگر قدیم مشرقی زبانیں یعنی عربی، فارسی اور سنسکرت۔ اساتذہ کی تعداد بیس ہے۔ درجہ دوم کے دو کالج ہیں، ایک میرٹھ اور دوسرا بریلی میں اور یہ دونوں دہلی کالج کے ماتحت ہیں۔

دو تین سالوں میں ہندوستانی زبان خاصی اہمیت اختیار کر گئی ہے اور یہ قدر و منزلت اسے پہلے حاصل نہیں تھی۔ وہ صوبہ بہار اور مغربی صوبجات یعنی راج محل سے کوہ ہمالیہ کے دامن میں واقع میرٹھ تک سرکاری زبان قرار پا چکی ہے۔ یہ زبان ہندوستان کے کونے کونے میں بولی جاتی ہے اور اس کے بولنے والوں کی تعداد کم از کم چالیس ملین کے لگ بھگ ہے۔ انگریزی حکومت نے بھی اسے اپنایا ہے۔ عدالتوں اور سرکاری اخباروں میں بھی یہی زبان مستعمل ہے۔

تقریباً چھ ماہ قبل میں نے کالج میں بیس مترجمین کا تقرر کیا ہے اور انھیں جو عربی، فارسی اور سنسکرت کی معروف کتابوں کے علاوہ علوم طبیعی، اقتصادی سیاسیات، تاریخ، فلسفہ اور مروجہ اینگلو انڈین طرز حکومت سے متعلق انگریزی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرنے کا فریضہ سونپا گیا ہے۔

رامائن اور مہابھارت کے ترجمہ میں خاصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ میں نے ان دونوں مشہور منظومات کا منظوم ترجمہ شروع کرا دیا ہے۔ اس ترجمہ کے بعد ان کتابوں کا متن شائع کرنے کا بھی ارادہ ہے۔"[۹۱]
سوانح گارساں دتاسی کا ایک معاصر فرانسیسی ماخذ

اردو ترجمہ:

"گارساں دتاسی (ژوزف ہیلیودوغ)، فرانسیسی مستشرق۔ ۲۰ جنوری ۱۷۹۴ء کو مارسیلز میں پیدا ہوا۔ اسی آبائی شہر میں ابتدائی تعلیم مکمل کی اور وہیں عربی زبان سیکھی۔ وہ ۱۸۱۷ء میں پیرس آیا اور یہیں محنت شاقہ اور کامیابی سے السنہ شرقیہ پر عبور حاصل کیا۔ بالخصوص اس نے خود کو ہندوستان کی جدید زبان یعنی ہندوستانی کے لیے مختص کر دیا۔ اس کی تصانیف اور خطبات اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ اسے ہندوؤں کی زبانوں اور ادب پر کس قدر عبور حاصل ہے۔ وہ پیرس کی ایشیاٹک سوسائٹی کے ابتدائی اراکین میں سے ہے۔ وہ لندن کی ایشیاٹک سوسائٹی کا بھی رکن (غیر ملکی) ہے۔ وہ مدرسہ السنہ شرقیہ کے خصوصی مدرسہ میں ہندوستانی کا پروفیسر ہے۔ ۱۸۳۸ء میں اسے اکادمی برائے کتبات وفنون لطیفہ کا ٹالیراں (Tallyrand) کی جگہ رکن بنایا گیا۔"

[اس کے بعد گارساں کی تصانیف اور تراجم کی فہرست دی گئی ہے]۔[۹۲]

گارساں دتاسی اور ایچ۔ ایچ۔ ولسن کے مابین مراسلت:

دیکھا جائے تو گارساں دتاسی کی مکتوب نویسی کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ بالخصوص انگلستان کے ہند شناسوں، اردو دانوں اور ہندوستان کے مقامی علماء کے علاوہ یہاں بہ سلسلہ ملازمت و سیاحت یورپی افراد کے ساتھ اس کا مسلسل رابطہ تھا۔ وہ ہندوستان کبھی آیا نہیں، اس لیے اسے جن معلومات کی ضرورت پڑتی تھی، اس کا واحد ذریعہ یہی خط و کتابت تھی۔ اس کے مکتوب الیہوں میں انیسویں صدی عیسوی کے تقریباً سبھی علماء، ادباء، ماہرین لسانیات و ہندیات اور مستشرقین شامل ہیں لیکن ان طبقوں میں جن اصحاب سے اس کے برسوں قریبی روابط قائم رہے ان میں ایک نام ہوریس ہیمن ولسن (Horace Hayman Wilson، ۱۷۸۶ء-۱۸۶۰ء) کا ہے جو بنیادی طور پر سنسکرت دان تھا، لیکن ہند شناسی میں وہ صف اول کے متخصصین میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے کچھ سال کلکتہ میں بھی گزارے اور یہاں کی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے مقتدر عہدہ داروں میں شامل رہا۔[۹۳]

گارساں دتاسی اپنے دور کے ایک عظیم سنسکرت دان اور ہند شناس کی حیثیت سے ولسن کا بڑا احترام کرتا تھا اور اس کی تصانیف کو بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ گارساں دتاسی کی اس عقیدت و احترام کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اپنی "تاریخ" کی تینوں جلدوں کے سرورق پر ولسن کی ایک کتاب کی عبارت نقل کی ہے۔[۹۴] پھر اسی "تاریخ" میں جا بجا ولسن کی تحریروں کے حوالے دیے ہیں۔[۹۵] سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے مخلص روابط کی بڑی وجہ ولسن کی اردو دانی تھی، چناں چہ گارساں دتاسی نے اس کی وفات پر جو مضمون لکھا ہے اس میں واضح طور پر ولسن کے اس پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "اس عام بول چال کی زبان کو جو حقیقت میں ہندوستان کی اصلی زبان ہے حقیر سمجھنے کے بجائے وہ اس کو بڑی اہمیت دیتا تھا اور اپنے سامعین سے کہتا تھا کہ اس زبان سے دلچسپی لیں۔"[۹۶] علاوہ بریں ولسن لندن ایسٹ انڈیا ہاؤس کے کتاب خانہ کا نگران تھا اور یہاں اردو مخطوطات کے نادر اور موجود قلمی نسخے جمع کیے گئے تھے، جن کی گارساں دتاسی کو بھی گاہے بگاہے ضرورت پڑتی رہتی تھی۔

گارساں دتاسی اور ولسن کے مابین اکیس برس (۱۸۳۱ تا ۱۸۵۲ء) خطوط کا تبادلہ ہوتا رہا۔ اس وقت گارساں دتاسی کے سترہ مکاتیب ولسن کلیکشن میں محفوظ ہیں۔ یہ کلیکشن جنوری ۱۹۶۹ء کو مسٹر جیرالڈ سرکن (Gerald Sirkin) نے انڈیا آفس لائبریری کو پیش کیا، جو اب برٹش لائبریری کے شعبہ انڈیا آفس اینڈ اورینٹل میں موجود ہے۔ گارساں دتاسی کے ان غیر مطبوعہ سترہ خطوط میں سولہ فرانسیسی اور ایک انگریزی میں لکھا گیا اور ایک خط (لندن سے) کے علاوہ بقیہ تمام مراسلات پیرس سے بھجوائے گئے۔ ولسن کے نام سبھی خطوط کو پندرہ جلدوں میں محفوظ کیا گیا ہے۔ سطور ذیل میں گارساں دتاسی کے مراسلات کا مکمل حوالہ، ان کے اہم اندراجات اور متعلقہ جلدوں کے نمبر مع سنین پیش کیے جاتے ہیں:

مکتوب اول: پیرس، بابت ۱۴، اکتوبر ۱۸۳۱ء (جلد دوم ۱۸۲۲ء-۱۸۳۶ء)، ورق ۲۰۸-۲۰۹

ولسن نے گارساں دتاسی کی کتاب "اسلام میں مذہب مسلمانان" (Religion musulmane dans l'Islam) میں "غازی میاں کا شادی" (اردو رسم الخط میں لکھا ہے) کا ذکر دیکھا تو اس کے بارے میں گارساں دتاسی سے استفسار کیا۔ جواباً گارساں نے اپنی کتاب "ہندوستانی مبادیات" (Rudiments de la Langue hindoustani) کا حوالہ دیا ہے۔ اردو رسم الخط میں منظوم قصہ "کامروپ و کلا" کا متن مع فرانسیسی ترجمہ چھپوانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے [جو "کامروپ کی مہم جوئی" کے زیر عنوان ۱۸۳۲ء میں شائع ہوا]۔

ان تین کتابوں کی تالیف کا ارادہ ظاہر کیا ہے:

الف) صرف اردو

ب) دکنی شعراء کے احوال

ج) کھڑی بولی کا ذخیرۂ الفاظ

نیز ''منتخبات ہندوستانی'' (Chrerstomathie hindoustani) کا ذکر اور اس کے متعلق مختصر اظہار خیال [یہ کتاب ۱۸۴۷ء میں طبع ہوئی]۔

مکتوب دوم: لندن، بابت ۳ اپریل ۱۸۳۷ء۔ جلد سوم (۱۸۳۷ء-۱۸۳۸ء)، ورق ۵۶-۵۷

فتح علی حسینی گردیزی کے ''تذکرۂ شعراء'' کے قلمی نسخہ کا حوالہ، جو ایسٹ انڈیا ہاؤس کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں اردو مخطوطات کی اطلاع۔ نصرتی کی مثنوی ''گلشن عشق'' کے قلمی نسخہ کے کوائف جو ایسٹ انڈیا ہاؤس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ انگلستان آمد کے بعد اپنی گوناگوں مصروفیات کا ذکر۔

مکتوب سوم: پیرس، بابت ۱۲ فروری ۱۸۳۸ء۔ جلد سوم (ایضاً)، ورق ۹۶-۹۷

بینی نرائن جہاں کا ''قصہ شاہ و گدا''۔ بینی نرائن فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھا۔ اس کا ترجمہ ''چار گلشن''۔ نیز ''دیوان جہاں'' اور ''مجموعۂ غزلیات جہاں''۔ راگ مالا۔ مثنوی سراج اور ملا جلال بلخی کے قصہ امیر حمزہ کے بارے میں استفسار کہ ان تصانیف کا کوئی اور نسخہ ولسن کی نظر سے تو نہیں گزرا۔ سید احمد شہید یا ان کے پیروکاروں کی تصنیف کردہ کتب سے متعلق معلومات کی ضرورت۔ فتح علی حسینی گردیزی، مصحفی، امیر، علی ابراہیم خلیل اور بینی نرائن جہاں کے تذکروں کی تفصیلات۔

مکتوب چہارم: پیرس، بابت ۳ جون ۱۸۳۸ء۔ جلد سوم (ایضاً)، ورق ۱۲۹-۱۳۰

بینی نرائن جہاں کی ''چار گلشن'' اور اس کے انگریزی ترجمہ کا ذکر۔ راس مالا، راج مالا وغیرہ کے متعلق بعض سوالات اور مطلوبہ معلومات کی جلد فراہمی کی استدعا۔

مکتوب پنجم: پیرس، بابت ۷ افروری ۱۸۳۹ء، جلد چہارم (۱۸۳۹ء)، ورق ۱۵-۱۶

دیوان ولی (اردو متن مع فرانسیسی ترجمہ) اور ''کامروپ'' کے زیر طبع ہونے کی اطلاع۔

مکتوب ششم: پیرس، بابت ۳ مئی ۱۸۳۹ء۔ جلد چہارم (ایضاً)۔ ورق ۲۹-۳۰

اپنے فرانسیسی دوست موسیو دبادیہ (d'Abbadia) کا تعارف کرایا ہے۔

مکتوب ہفتم: پیرس، بابت ۲۸ مئی ۱۸۳۹ء۔ جلد چہارم (ایضاً)، ورق ۳۴-۳۵

''تاریخ اکبری'' اور ''تاریخ نادرشاہی'' کے حاصل ہونے کی اطلاع۔

مکتوب ہشتم: پیرس، بابت ۲۴ جون ۱۸۳۹ء، جلد چہارم (ایضاً)۔ ورق ۵۲-۵۳

''کامروپ'' کی رفتار طباعت

مکتوب نہم: پیرس، بابت ۵ مئی ۱۸۴۰ء، جلد پنجم (۱۸۴۰ء)۔ ورق ۸۶-۸۷

رکی سانحات۔ چند معاصرین کا ذکر کیا گیا ہے۔

مکتوب دہم: پیرس، بابت ۱۲ اپریل ۱۸۴۱ء، جلد ششم (۱۸۴۱ء)۔ ورق ۷۰-۷۱

موسیو گوریزیو (Gorrezzio) کا ذکر کیا گیا ہے [یہ بھی فرانسیسی ہند شناس ہے، جس کی تقسیم کا اتباع کرتے ہوئے گارساں دتاسی نے ہندوستان کی قدیم شاعرانہ وراثت کو چار حصوں میں بانٹا ہے یعنی آکھیانا (قصے کہانیاں)، ادی کاویہ (مروج پرانی نظمیں)، اتیہاسا

(تاریخ اور مختلف واقعات) اور کاویہ (عام نظمیں)۔ مزید یہ کہ گارساں دتاسی نے گوریزیو کی اس رائے سے اتفاق کیا ہے کہ ہندوستانی ہی وہ زبان ہے جو اپنی شاعت کے باعث ان سارے متعلقہ دکنی امور کی جن سے ہندوستان گزر چکا ہے حامل ہے اور سنسکرت سے ساری زندہ بولیوں کے مقابلہ میں قریب تر ہے۔" [رک: ثریا حسین، ص ۹۳،۸۲]

مکتوب یازدہم: پیرس، بابت ۳۰ ستمبر ۱۸۴۱ء، جلد ششم (ایضاً)، ورق ۱۵۴-۱۵۵

''کامروپ''، ''دیوان ولی'' اور ''تاریخ'' کی جلد اول کی اشاعت کی خبر۔

مکتوب دوازدہم: پیرس، بابت ۲۰ جولائی ۱۸۴۶ء، جلد دہم (۱۸۴۶ء-۱۸۴۷ء)، ورق ۴۹

اپنے فرانسیسی دوست لی ویکاونٹ ڈاٹمپ (le Vicomte d'Etampes) کا تعارف۔

مکتوب سیزدہم: پیرس، بابت ۲۲ جون ۱۸۴۷ء، جلد دہم (ایضاً)، ورق ۱۵۶-۱۵۷

[اپنی تازہ کتاب ''ہندوئی کے مبادیات'' (Rudiments de la langue hindoui) کا ذکر جو اسی سال طبع ہوئی۔ اس میں ہندی صرف و نحو کی قواعد کے بعد عبارات اور دیگر ہندی کتابوں کے اقتباسات یکجا کئے گئے ہیں۔]

مکتوب پانزدہم: پیرس، بابت ۲۵ اکتوبر ۱۸۵۰ء، جلد دوازدہم (۱۸۵۰ء-۱۸۵۳ء)، ورق ۶۱-۶۲

عطار کی ''منطق الطیر'' کی ترتیب و ترجمہ (زیر تکمیل)۔ [اس کتاب کا فارسی متن ۱۸۵۷ء اور فرانسیسی ترجمہ ۱۸۶۳ء میں طبع ہوا]۔

''تاریخ'' کی جلد سوم کا آغاز۔

مکتوب شانزدہم: پیرس، بابت ۱۵ اپریل ۱۸۵۱ء، جلد دوازدہم (ایضاً)، ورق ۸۶-۸۷۔

''منطق الطیر'' کی ترتیب و ترجمہ کا ذکر۔

مکتوب سیزدہم: پیرس، بابت ۵ مئی ۱۸۵۲ء، جلد دوازدہم (ایضاً)، ورق ۱۷۲-۱۷۳۔

گارساں دتاسی کا ولسن کے نام یہ آخری خط ہے اور یہ انگریزی میں ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

"Dear Sir,

The taste for eastern topics appears to be more vivid in France since some time. We have a new *Revue orientali* which appears monthly and the editor of this *Review* has begun another publication under the title of the *Miroir de l' Orient* [Mirror of the Orient]. He has launched the first number of this *illustrated* remodeling of the old *Bibliothéque Orientale* [Oriental library] of which a colossal tradition is also contemplated.

Mr. Prisse d'Avesus, the editor of the *Miroir orientale* is a very ancient acquaintance of mine. He requested from me a letter of introduction for you as he has the intention of soliciting a substription from the Directors of the Honourable East India Company. I avail myself of your kindness for me in complying to his

desire and in the meantime, I beg you to revive the new insurance of the respectful consideration and perfect devotedness with which I have the honour to be.

Yours faithfully,

[۹۷]Garcin de Tassy"

وفاتِ گارساں دتاسی

''کامل یقین سے اب یہ کہنا ممکن ہے کہ گزشتہ بیس سالوں سے باقاعدگی سے ہندوستانی زبان و ادب پر جو عالمانہ اور ماہرانہ خطبات پیش کیے جاتے رہے وہ آئندہ اشاعت پذیر نہیں ہو سکیں گے، کیوں کہ ان خطبات کے روحِ رواں اور منفرد انداز و قابلیت سے متصف پیش کار اب اس دنیائے فانی میں نہیں رہے۔ موسیو گارساں دتاسی نے ۲۵ ستمبر کو بعمر پچاسی برس وفات پائی۔ وہ انسٹی ٹیوٹ کے رکن، پیرس کی ایشیاٹک سوسائٹی کے صدر، مدرسۃ السنۂ شرقیہ کے پروفیسر اور یورپ و ہندوستان کے بڑے علمی اداروں کے رکن رہے۔ علاوہ ازیں انھیں دیگر ممالک کے درج ذیل اعزازات سے بھی نوازا گیا تھا:

Knight of the Legion of Honour (i)

Commander of the Order of St. Jacques of Portugal (ii)

Cavalier of the Pole Star of Sweden (iii)

۱۸۲۱ء میں فرانس کی ایشیاٹک سوسائٹی کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ اس کے پہلے صدر عظیم مستشرق سلوستر دساسی مقرر ہوئے اور سیکرٹری کے فرائض گارساں دتاسی کو سونپے گئے۔ بعد میں گارساں دتاسی نے اس سوسائٹی کے مجلّہ ''ژورنال ایشیاٹک'' میں انتہائی مفید مضامین شائع کرائے۔ ادبِ شرقیہ کی ترویج و ترقی میں ان کی گرانقدر خدمات سے سبھی واقف ہیں۔ ان کی مطبوعہ تحریروں اور تراجم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اردو اور ہندی پر کامل دستگاہ رکھتے تھے، بلکہ عربی، فارسی اور ترکی زبانوں سے بھی کما حقہ واقف تھے۔ بلاشبہ ان سبھی کے نمونے اس کی کتابوں مثلاً ''مسلمانانِ مشرق کی زبانوں میں بلاغت و عروض'' [پیرس ۱۸۷۳ء] اور ''تمثیلی یعنی منظوم کہانیاں اور عوامی گیت'' [طبع ثانی، پیرس ۱۸۷۶ء] وغیرہ میں آسانی ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان کی تالیفات و تراجم پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خود کو دو زبانوں یعنی ہندی اور ہندوستانی تک وقف کیے رکھا۔ گارساں دتاسی نے ان دونوں زبانوں کی تاریخ قلمبند کی، معروف دکنی شاعر ولی کے کلام کو مرتب کیا اور اس کو اپنی زبان میں منتقل بھی کیا۔ اسی طرح ''کامروپ کی مہم جوئی'' [پیرس ۱۸۳۴ء] اور 'اسلامی ہندی تاریخ کا ایک باب یعنی بادشاہ دہلی شیر شاہ کی تاریخ'' [پیرس ۱۸۶۵ء] کے فرانسیسی تراجم شائع کیے۔ ہندی اور ہندوستانی زبانوں کے نمونہ جات، منتخبات اور لغات بھی مرتب کیں۔ سر ولیم جونز کی ''قواعد فارسی'' کا ترجمہ کیا۔ [۱۸۴۵ء] فریدالدین عطار کی ''منطق الطیر'' کا متن مع ترجمہ شائع کیا [۱۸۶۳ء] اور اس کی بنیاد پر ایرانیوں کی فلسفیانہ اور مذہبی شاعری پر اپنی کتاب لکھی [۱۸۵۷ء]۔ ۱۸۷۴ء میں گارساں دتاسی کی تصنیف بعنوان ''قرآن کے مطابق مذہب اسلام'' منظر عام پر آئی، لیکن اس کی چند تالیفات مثلاً ''مسلمانوں کے یہاں آدمیوں کے اسماء اور القاب پر ایک یادداشت'' [۱۸۷۶ء] ''باغ و بہار'' (متن مع ترجمہ) [۱۸۵۳ء] وغیرہ دوسری اور تیسری بار طبع ہوئیں۔

بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندی اور اردو ادب کے خصوصی حوالے سے یورپ میں ان کا کوئی مدمقابل نہیں۔ ان کے انتقال

سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ اتنی آسانی اور جلدی سے پُر نہیں ہوگا"۔ [۹۸]

حواشی

۱۔ اردو میں بالعموم "گارساں" لکھا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر حمید اللہ، آغا افتخار حسین اور ڈاکٹر ثریا حسین جیسے متخصصین (بحوالہ گارسیں) اور فرانسیسی زبان جاننے والے "گارسیں" کو درست تسلیم کرتے ہیں، چناں چہ زیر نظر مقالے میں اسی تلفظ کو اپنایا گیا ہے۔ گارسیں دتاسی کا پورا نام "ژوزف الیودور گارسیں دتاسی" (*Joseph-Héliodore Garcin de Tassy*) ہے لیکن یہاں صرف معروف حصہ گارسیں دتاسی ہی استعمال کیا گیا ہے۔

۲۔ گارسیں دتاسی نے اپنی "تاریخ" (طبع ثانی) کی تینوں جلدوں کے سرورق پر اپنے نام کے ساتھ القاب و خطابات کے علاوہ یورپ اور ہندوستان کے اُن مختلف علمی اداروں اور انجمنوں کے نام لکھے ہیں، جن کے اراکین میں وہ شامل تھا۔ ان ہی میں انجمن پنجاب (*"Anjuman" de Lahore*) بھی شامل ہے۔

۳۔ برائے تفصیل دیکھیے: دو وفات نامے جو درج ذیل مجلے میں شائع ہوئے:

The Asiatic Journal. vol. xxvi. New Series, May-August 1838, pp. 209-210; vol. xxvii. Sept.-Oct. 1858, pp. 115-129, 182-197, obituary notice by M. Reinaud.

نیز ملاحظہ کیجیے:

Henri Dehérain: *Silvestre de Sacy, ses contemporains et ses disciples*. Paris 1938

۴۔ فرانسیسی عنوان:

Histoire de la littérature Hindouie et Hindoustanie

"تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی"۔ پہلا ایڈیشن، مشتمل بر دو جلد (پیرس، ۱۸۳۹ء تا ۱۸۴۷ء)۔ دوسرا ایڈیشن، مشتمل بر تین جلد (پیرس، ۱۸۷۰ء تا ۱۸۷۱ء)۔ زیر نظر مقالے میں صرف لفظ "تاریخ" استعمال کیا گیا ہے اور جس ایڈیشن کا حوالہ دیا گیا ہے، اس کی قوسین میں نشاندہی کر دی گئی ہے۔

۵۔ بقول گارسیں دتاسی: "یہ در حقیقت میری تاریخ کی پہلی جلد سے حذف و اضافہ کے ساتھ تالیف کیا گیا ہے جس سے اب ایک نئی کتاب ہو گئی ہے اور استفادہ کے لیے کارآمد ہے۔ اضافہ تقریباً تمام کا تمام یا تو خاندان تیموری کے شاہزادوں کے حالات کا ہے جو اپنا وقت کاٹنے کے لیے اردو شاعری کیا کرتے تھے یا دلی کالج کے پروفیسروں کے حالات سے متعلق ہے۔" ("تمہیدی خطبے" از گارساں دتاسی۔ دہلی، ۱۹۳۰ء۔ بہ تصحیح ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔ ص ۲۱۷-۲۱۵۔ پانچواں خطبہ بابت ۲ دسمبر ۱۸۵۳ء) "طبقات شعرائے ہند" (دہلی، ۱۸۴۷ء) کے سرورق پر گارسیں دتاسی کا نام موجود ہے لیکن اس کے مؤلف متن میں مختلف مقامات پر اس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"اگرچہ میں نے ارادہ کیا تھا کہ بہت تذکرہ جمع کر کے اس تذکرہ کو فراہم کروں لیکن پہلے مجھ سے چونکہ دی تاسی نے زبان فرنچ میں درمیان ملک فرانس کے ایک تذکرہ ان تذکروں مفصلہ ذیل سے بہت اچھی طرح پر تالیف کر لیا تھا، اسی لیے اردو تذکروں سے جو اوس کے دستیاب نہیں ہوئے اور اس کے تذکرے سے مدد لے کر یہ تذکرہ میں نے فراہم کیا۔" (دیباچہ، ص ۹)

"تاسی کہتا ہے کہ یہ تذکرہ میں نے بہت کوشش سے فراہم کر کے اپنا ایک تذکرہ زبان فرنچ میں جمع کیا۔ لا یہ سب تذکرہ میری پسند نہیں ہے۔" (دیباچہ، ص ۹-۱۰)

"ان ہی مصنفین کی پیروی سے ایک مصنف ملک فرانس نے جس کا نام یاد نہیں، غلطی کی ہے یہ شعر جو میں آگے لکھتا ہوں، اوس نے سعدی شیرازی کی طرف منسوب کیے ہیں۔" (ص ۴۸)

بذیل ذکر رونق‌آرا (مثنوی در باب حالات ماہ سنور سوداگر):

"اس قصہ کی ایک جلد قلمی تاسی کے پاس درمیان پارس کے موجود ہے" (ص ۸۲)

بذیل شیخ ولی محمد بن حافظ میران (مصنف قصہ پیغمبراں):

"اوس کی ایک قلمی جلد دی تاسی کے پاس موجود ہے" (ص ۱۷۰)

مزید تفصیل کے لیے رک: "طبقات شعرائے ہند اور مولوی کریم الدین" از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (صحیفہ ۴۰) (جولائی ۱۹۶۷ء)، ص ۹-۳۰)۔ ایس اے صدیقی: "مولوی کریم الدین، حیات اور کارنامے"، پٹنہ ۱۹۷۸ء؛ "طبقات شعرائے ہند"، طبع عکسی، لکھنؤ ۱۹۸۳ء مقدمہ از ڈاکٹر محمود الٰہی۔ محمد اکرام چغتائی: "ایک نادر مجموعۂ مکاتیب" ("اردو" (کراچی) جلد ۶۱ شمارہ ۳-۴ (۱۹۸۵ء)، ص ۱۳۸-۱۸۴)۔

۶۔ رجوع کیجیے (= رک):

Johann Fück: <u>*Die arabischen Studien in Europa*</u>. Leipzig 1955, p. 151.

۷۔ رک: سعدی اور مسعود سعد سلمان کی "ہندی شاعری" پر گارساں دتاسی کے مضامین در جواب مراسلات از Newbold اور N. Bland در: ژورنال ازیاتیک (۱۸۴۳ء)۔ اشپرنگر کا مضمون در: "جرنل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" (کلکتہ)، ۱۸۵۲ء (اشاعت مکرر: کیا سعدی شیرازی نے ریختہ میں اشعار لکھے؟ تالیف ڈاکٹر گیان چند در: "اردو"، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۶ء، ص ۲۶-۳۷)۔ نیز ملاحظہ کیجیے: "تاریخ" ۲: ۲۹۰-۱۹۱؛ ۳: ۲-۴ اور بذیل "خسرو" ۲: ۲۰۲-۲۰۸ (مع خالق باری، پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کے منتخب فرانسیسی تراجم)۔

گارساں دتاسی کے مذکورہ صدر مضمون (۱۸۴۳ء) پر تبصرہ در: دی ایشیاٹک جرنل (لندن)، جلد دوم (نومبر- اپریل ۱۸۴۴ء)، ص ۶۳-۶۶۔

۸۔ گارساں دتاسی نے اپنے خطبہ (بابت ۲ دسمبر ۱۸۵۶ء) میں اس ترجمہ کا یوں ذکر کرتا ہے:

"میں ایک کتاب کے اضافے کی جسارت اور کروں گا اور وہ میری کتاب "مختصر احوال مصنفین ہندی کے تذکروں کا" کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ابھی حال ہی میں دہلی سے شائع ہوا اور اس کے مترجم محمد ذکاء اللہ ہیں۔ ابھی تین دن ہوئے، اس ترجمہ کی تین جلدیں مجھے وصول ہوئی ہیں۔ اعتراف کرنا پڑتا ہے اور مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ دلکش ہندوستانی زبان پر میری یہ ادنیٰ درجہ کی تصنیف خود

ہندوستانیوں میں مقبول ہوئی۔" ("مقالات گارساں دتاسی"، جلد اول، دہلی ۱۹۴۳ء، ص ۲۱۲۔ نیز دیکھیے: "تاریخ" ۳:۴، ۲۵۳ بذیل ذکر "ذکا اللہ")

اس رسالے کی اشاعت ثانی بعنوان "رسالہ تذکرات" مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔ دہلی: اردو مجلس ۱۹۶۸ء۔

۹۔ ژورنال ازیاتیک (نومبر، دسمبر ۱۸۵۶ء)، ص ۵۳۲-۵۳۶۔ نیز رک: "تاریخ" ۳:۴، ۳۸-۳۹

۱۰۔ مطبوعہ پیرس ۱۸۶۹ء، صفحات ۱۹۲

۱۱۔ رک سرسید کا سفرنامہ "مسافران لندن" مرتبہ اصغر عباس۔ علی گڑھ ۲۰۰۹ء، ص ۱۱۶-۱۳۰

۱۲۔ بحوالہ "اخبار عالم" (میرٹھ) سے منقول ہے۔ اس کی اقتباسی عبارت یہ ہے: "راقم "اخبار عالم" صاحب ممدوح کی کرم فرمائی غائبانہ اور قدردانی بے پایاں کا ممنون اور مشکور ہے کہ صاحب ممدوح نے اپنی ۱۴ تقریریں یعنی تقریر فوائد تکمیر کی ایک کتاب جو زبان فرانسیسی چھپی ہے مرحمت فرمائی اور اپنی تصویر بھی جس سے ایک کمال علم اور وقار اور عظمت اور انکسار معلوم ہوتا ہے تو گر اس کی تکمیل ہوئی عطا کی۔ انشاء اللہ تعالیٰ آیندہ حال مفصل صاحب ممدوح کا بنظر اطلاع اس ملک کے آدمیوں کے زیب صفحہ اخبار ہوگا۔" (بحوالہ ڈاکٹر ثریا حسین: "گارساں دتاسی۔ اردو خدمات، علمی کارنامے"۔ لکھنؤ ۱۹۸۴ء، ص ۳۸-۳۹= ثریا حسین)

۱۳۔ رک ثریا حسین، ص ۳۹

۱۴۔ اصل فرانسیسی حوالہ:

Franeois Deloncie: _Catalogue des Livres Orientaux composant la Bibliothèque de M. Garcin de Tassy; suivi du Catalogue des Manuscrits hindustanis, persans, arabes, ture_. Paris 1879.

فہرست نگار دولنکل نے فرانسیسی۔ ہندوستانی اور ہندوستانی۔ فرانسیسی لغت بھی تیار کی تھی، جس کے صرف تیس صفحات شائع ہوئے تھے (پیرس ۱۸۷۵ء)۔ گارساں دتاسی نے اس دو زبانی لغت کا دیباچہ لکھا تھا۔

۱۵۔ Indian Antiquary (بمبئی ۱۹۰۳ء)

۱۶۔ مطبوعہ لکھنؤ: الناظر پریس، ۱۹۱۳ء

۱۷۔ جلد نہم، حصہ اول ۱۹۱۶ء۔ طبع عکسی، نیو دہلی ۱۹۶۸ء۔

۱۸۔ "اردو" (اورنگ آباد) ۱۹۲۳ء

۱۹۔ "گارساں دتاسی اور اس کے ہندی خواہان اردو"۔ حیدرآباد دکن ۱۹۳۱ء، طبع دوم ۱۹۴۳ء (تبصرہ از قاضی عبدالودود، در معاصر (پٹنہ)، جون ۱۹۴۲ء و "گارساں دتاسی" از قاضی عبدالودود، پٹنہ ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۱-۱۱۴)

۲۰۔ اصل فرانسیسی عنوانات درج ذیل ہیں:

1) _Discours à l'ouverture de son Cours d'Hindoustani a l'Ecole des Langues Orientales Vivantes_, 1850-1869.

2nd ed. "_La Langue et la littérature hindoustanies de 1850 à 1869_". Paris 1974

ii) *La Langue et la Littérature hindoustanies, Revue annuelle* Paris 1871-1878.

۲۱۔ خطبات گارساں دتاسی، حصہ اول (۱۸۵۰ء-۱۸۶۹ء) مع مقدمہ از ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ نظرثانی از ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ کراچی ۱۹۷۹ء (۱۹۳۵ء)، حصہ دوم (۱۸۶۵ء-۱۸۶۹ء) کراچی ۱۹۷۴ء (۱۹۳۵ء)۔ مع حواشی از ڈاکٹر مولوی عبدالحق و شیخ چاند۔ "مقالات گارساں دتاسی، جلد اول (۱۸۷۰ء-۱۸۷۳ء) کراچی ۱۹۶۴ء (۱۹۴۳ء)۔ انتخاب از ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ جلد دوم (۱۸۷۳ء-۱۸۷۷ء)۔ نظرثانی از ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ کراچی ۱۹۷۵ء (۱۹۴۳ء) نیز رک: "گارساں دتاسی: تمہیدی خطبے" (۱۸۵۰ء-۱۸۵۵ء)۔ تصحیح ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔ دہلی ۱۹۴۰ء۔ "خطبات" کے ایک مترجم ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے گارساں دتاسی کے مرتبہ "دیوان ولی" (پیرس ۱۸۳۳ء) کے مقدمہ کو اردو میں منتقل کیا تھا۔ (در: یادگار ولی مرتبہ سید محمد۔ حیدرآباد دکن، ۱۹۳۷ء)

۲۲۔ رک: "گارساں دتاسی" ۔پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری ۱۹۹۵ء (مجموعہ مقالات مع ضمائم)۔
قاضی عبدالودود کے علاوہ آغا افتخار حسین (بسلسلہ ملازمت دو سال پیرس میں مقیم رہے ۱۹۶۲ء-۱۹۶۴ء) کی تین کتب:
الف) "یورپ میں اردو، لاہور" ۱۹۶۸ء (فرانس، ص ۱۰۱-۱۳۳)
ب) "یورپ میں تحقیقی مطالعے"، لاہور ۱۹۶۷ء ("تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی اور اردو تذکرے" ص ۵-۸۶)
ج) "پیرس کے کتب خانوں میں اردو، پنجابی اور سندھی مخطوطات کی فہرست"۔ کراچی ۱۹۶۷ء۔
گارساں دتاسی کی حیات و تصانیف پر مزید مطالعات کے لیے رک:
مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی: "گارساں دتاسی اور تحریک سرسید" (در تہذیب الاخلاق (لاہور)، ستمبر ۱۹۶۳ء)۔ ایضاً: "گارساں دتاسی کا ایک نادر خط" (صحیفہ ۳۳ (اکتوبر ۱۹۶۵ء)، ص ۳۲-۳۸)۔ ڈاکٹر رضیہ نور محمد: "اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" لاہور ۱۹۸۵ء۔ ڈاکٹر جواز جعفری: "اردو ادب یورپ اور امریکہ میں"، لاہور ۲۰۱۰ء ("گارساں دتاسی" ص ۹۸-۱۰۹)۔ صبا اکرام: اردو ادب کے لیے گارساں دتاسی کی خدمات (صحیفہ جولائی-ستمبر ۲۰۰۳ء ص ۳۲-۳۹)۔

N. Hasan: *Garcin de Tassy, A French devotee of Urdu* (in: Pakistan Review (Lahore) vol. 10 (April 1962) pp. 21-22)

۲۳۔ "تاریخ" ۳۵۲:۳

۲۴۔ یہ جو درج ذیل کتاب میں شائع ہوا:

A Group of Eastern romances and stories from the Persian, Tamil and Urdu. With introduction, notes and appendix by William Alexander Clouston. Glasgow, compiled from Garcin de Tassy's گل بکاؤلی 1889. (includes Izatullah Bengali's abridgement and T. P. Manuel's translation).(cf. *Urdu Books. A Descriptive Catalogue of Works in the Oriental and India Office Collections of the British Library,* London. Compiled by Salim al-Din Quraishi. Islamabad: NLA, 2000, p. 419, no.

4883)

۲۵۔ رک: مولوی محمد محفوظ الحق کا مضمون بعنوان ''تاریخ مستشرقین کا تذکرہ شعرائے اردو'' (در: معارف (اعظم گڑھ) اگست ۱۹۳۲ء، و ''گارساں دتاسی'' از قاضی عبدالودود، مذکورہ بالا ضمیمہ اول)

۲۶۔ نواب نصیر حسین خیال اپنے مکتوب بنام سید مسعود حسن رضوی ادیب (بابت ۱۸ مئی ۱۹۳۱ء) میں لکھتے ہیں:
''شب کو نواب محبت خاں کا ذکر آیا تھا۔ ان کے متعلق دتاسی نے جو لکھا ہے اس کا ترجمہ حاضر کرتا ہوں۔''
(''مخطوطات مشاہیر بنام سید مسعود حسن رضوی ادیب''، مرتبہ نیر مسعود، لکھنؤ ۱۹۸۵ء، ص ۱۱۸-۱۱۹)

۲۷۔ فرانسیسی عنوان:

Mémoire sur quelques particularités de la religion musulmane dans l'Inde, d' àpres les ouvrages hindoustani.

۲۸۔ بابت ۱۸۳۱ء ص ۸۱-۱۰۷، ۱۶۱-۲۲۹، ۳۰۸-۳۲۴۔ ایک سو صفحات سے زائد پر مشتمل یہ مضمون ترامیم و اضافات کے بعد ایک اور کتاب میں بھی شائع ہوا، مطبوعہ پیرس ۱۸۶۹ء

۲۹۔ رک:

On certain peculiarities in the Mohammadanism of India (in: *Asiatic Journal* (London), new series, 6 (1831), pp. 352-356; 7 (1832), pp. 5-58, 140-144)

۳۰۔ پورا حوالہ یہ ہے:

Muslim Festivals in India and Other Essays. New Delhi: OUP, 1995 (pp. 197)
مع مقدمہ و حواشی: گارساں دتاسی نے ایک مضمون زیر عنوان ''ہندوؤں کے تہواروں کا ذکر، ہندوستانی زبان کی کتابوں کے مطابق'' (Notice sur les fêtes populaires des Hindus) تحریر کیا (ژورنال ازیاتیک، ۱۸۳۴ء)، جس کی ابتدا میں وہ لکھتا ہے: ''میں نے مسلمانوں کے مذہب پر جو یادداشت شائع کی ہے اس میں نیا دہ تر میں نے مسلمانوں کی تقریبوں کا ذکر کیا ہے اور خیال ظاہر کیا ہے کہ ان اسلامی تقریبوں میں سے متعدد میں ہندو بھی حصہ لیتے ہیں اور ہندوؤں کے تہواروں میں مسلمان اکثر شریک رہتے ہیں۔ اس لیے مجھے مفید معلوم ہوا ہے کہ آج برہمن ہندوستان میں جو عام تہوار پائے جاتے ہیں ان کے متعلق صحیح معلومات پیش کروں اور یہ نیا مضمون میرے پرانے مضمون کا گویا تکملہ سمجھا جا سکے گا۔ وہ مضمون بھی دیکھے جائیں جو میں نے بیگم حسن علی اور مسٹر ہیرکلوٹس کی دلچسپ تالیفوں پر لکھے تھے۔'' وحیم صاحب نے گارساں دتاسی کے اس مضمون کا انگریزی ترجمہ بھی کیا ہے بعنوان:

Notice on he fetes of Hindus according to Hindustani works

جو ان کے مجموعہ مضامین "*On Becoming an Indian Muslim*" (دہلی ۲۰۰۳ء، بطور ضمیمہ) میں شامل ہے۔

۳۱۔ رک:

Begum Hasan Ali: *Observations on the Musulmans of India*. 2 vols. London i)

1832.

ii) Ja'far Sharif: Qanoon-e-Islam. London 1832.

۳۲۔ اول الذکر کتاب پر تبصرہ (ژورنال ایشیاٹک، جنوری ۱۸۳۲ء) گارساں دتاسی نے تبصرے میں اس کتاب کو اپنے مضمون کا ضمیمہ قرار دیا ہے۔ ثانی الذکر کتاب پر تبصرہ (ژورنال دساواں، Journal de Savants، ۱۸۳۳ء)۔ بقول مبصر، جعفر شریف کو لالہ میاں بھی کہا جاتا تھا۔ وہ کرناٹک اور سلطنت گولکنڈہ کے شہر ایلور کا باشندہ تھا۔

۳۳۔ رک:

Muslim saints, faquirs and pilgrims in 1831 according to Garcin de Tassy. (in: Perspectives of mutual encounters in South Asian History, 1761-1860. Edited by Jamal Malik. Leiden: Brill, 2000, pp. 128-156)

۳۴۔ رک:

Garcin de Tassy. Biographie et etude critique de ses ouvres, par Sayida Surriya Hussain. Pondichéry, 1962.

۳۵۔ بعنوان ''گارساں دتاسی - اردو خدمات، علمی کارنامے''۔ لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۳ء

۳۶۔ اس اردو ترجمہ کے پیش لفظ (از مترجم) اور ''تاریخ'' کے دیباچے کے ترجمہ (مع اضافہ از مترجم) کے لیے رک: جریدہ (جامعہ کراچی)، شمارہ ۲۹ (۲۰۰۴ء)، ص ۲۵۱-۳۳۵؛ ''معروضات'' کے تحت سید خالد جامعی لکھتے ہیں:

''گارساں دتاسی کی ''تاریخ ادب ہندوستانی'' فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی۔ اس کا ترجمہ ایک فرانسیسی طالبہ لیلیان نازرو نے پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کے طور پر کیا تھا۔ ان کے نگران ڈاکٹر ابواللیث صدیقی تھے۔ یہ مقالہ دو جلدوں میں ترجمہ کیا گیا اور طالبہ کو اس ترجمہ پر پی ایچ۔ ڈی کی سند عطا کی گئی۔ دونوں جلدیں اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل ہیں اور گزشتہ چالیس برس سے اشاعت کی منتظر ہیں۔ اس مقالے کی صرف ایک جلد ڈاکٹر محمود حسین کتب خانے میں دستیاب ہے جبکہ جلد دوم تلاش کے باوجود نہ مل سکی۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے ذخیرۂ کتب میں بھی دوسری جلد تلاش کی گئی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ پہلی جلد کی فراہمی کے لیے ہم ڈاکٹر معین الدین عقیل کے شکر گزار ہیں جن کی توجہ اور محنت سے جلد اول ہمیں مل گئی جسے عنقریب مکمل شائع کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خوشخبری دی ہے کہ اس کتاب کی دوسری جلد بھی وہ کہیں سے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو ان شاء اللہ اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل یہ مسودہ فوری شائع کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد فرانسیسی میں تاریخ ادب ہندوستانی کی آخری اشاعت کو سامنے رکھ کر راقم الحروف اور جناب عمر حمید ہاشمی صاحب دونوں جلدوں کا تقابل کر کے نظر ثانی کا کام کریں گے۔''

چھ سال گزر گئے لیکن معلوم نہیں، یہ کام کس مرحلہ میں ہے۔

۳۷۔ رک: ''جریدہ'' (کراچی) شمارہ ۲۹ (۲۰۰۴ء)۔ ''تاریخ ادب ہندوستانی - ایک معروضی مطالعہ'' از ڈاکٹر معین الدین عقیل، ص ۲۲۶-۲۳۵۔ مقالہ نگار نے ''تاریخ'' کے مقدمہ کے ایک انگریزی ترجمہ (از گیتا کرشن کتی) کا حوالہ دیا ہے جو ''انڈین لٹریچر'' (دہلی، جون ۱۹۸۲ء) میں شائع ہوا۔

۳۸۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء۔

۳۹۔ ان "خطبات" پر دو مقالات لکھے، جو پہلے "معیار" (پٹنہ مئی ۱۹۳۶ء) اور "معاصر" (پٹنہ) "عہد جدید"، ۱۹۵۹ء) میں طبع ہوئے اور اب ان کی کتاب "گارساں دتاسی" (پٹنہ ۱۹۹۵ء) میں شامل ہیں۔ (ص ۸۶-۹۶، ۹۹-۱۱۰)

۴۰۔ اس مقالے کی چار جلدوں کے مندرجات وغیرہ کا براہ راست علم نہیں ہو سکا۔ ایک ثانوی ماخذ سے اس کا حوالہ درج ذیل ہے:

A critical study of Garcin de Tassy's "Histoire..." Thesis submitted to the University of Delhi (Department of Urdu) for the degree of Philosophy by Robert Ardobin, Reader (in French Language), Department of Modern European Languages, vol. 1 to 4 (1977).

(Delhi University Library Cat. No. 3143-46)

۴۱۔ در: "ملفوظات اقبال"، مرتبہ محمود نظامی۔ لاہور، بلا تاریخ، ص ۴۳۔ طبع ثانی ۱۹۷۷ء، ص ۳۶-۴۷

۴۲۔ رک: "مقالات گارساں دتاسی"، حصہ اول۔ کراچی ۱۹۶۲ء، ص ۳۳۶-۳۴۷

۴۳۔ رک: ثریا حسین، ص ۳۹

۴۴۔ محمد مسیح الدین علوی کاکوروی (م ۱۸۸۱ء) ملکہ کشور اور شہزادے مرزا جواد علی سکندر حشمت کی مدافعین کے لیے پیرس میں مقیم رہے۔ (رک: "سفیر اودھ" (خود نوشت سوانح عمری)۔ لکھنؤ: انوار پریس ۱۹۴۹ء، ص ۹۹)۔ گارساں دتاسی نے ۲۴ جنوری ۱۸۵۸ء کو مسیح الدین خاں کی پیرس میں موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ ("تاریخ" ۲: ۳۳۵-۳۳۶)۔ شہزادے کی وفات (۳ مارچ ۱۸۵۸ء) پر اس نے مضمون بھی لکھا تھا، جو پیرس کے رسالہ "ژورنال دیبا" (Journal des Debats) میں شائع ہوا (۱۸۵۸ء)

۴۵۔ رک:

Islamic Culture (Hyderabad Deccan), October 1931, p. 541. "*Memoirs of Late Rt. Hon'ble Syed Ameer Ali.*" See also "*Memoirs and other writings of Syed Ameer Ali*", edited by Syed Razi Wasti. Lahore 1968, p. 34.

۴۶۔ رک: "مقالات گارساں دتاسی"، حصہ اول، ص ۳۱۶۔ مقالہ بابت ۱۸۷۳ء۔

۴۷۔ رک: "گارساں دتاسی کے تمہیدی خطبے" (۱۸۵۰ء-۱۸۵۵ء) بہ تصحیح عبدالستار صدیقی، ص ۱۱۲ (خطبہ بابت ۵ دسمبر ۱۸۵۳ء)، ص ۱۲۹ (خطبہ بابت ۳ دسمبر ۱۸۵۴ء)۔ "خطبات گارساں دتاسی" (۱۹۳۵ء)، ص ۱۹، ۹۰، ۱۷۱، ۲۵۰-۲۵۳ و خطبہ بابت ۵ دسمبر ۱۸۶۳ء، ص ۳۲۷ (تحتی نوٹ)۔ خطبہ بابت ۷ دسمبر ۱۸۶۸ء۔ گارساں دتاسی کے "خطبات" میں بوترو کے بیان کردہ سوانح کی تائید ڈاکٹر زور مرحوم (گارساں دتاسی، تذکرہ صدرہ ص ۹۷-۱۰۰) اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (دلی کالج کے چند پرنسپل در: "دلی کالج اردو میگزین" قدیم دلی کالج نمبر، ۱۹۵۳ء، ص ۱۰۳-۱۰۵) میں اپنے لفظوں میں لکھ دیا ہے۔ برٹش لائبریری، لندن (انڈیا آفس اینڈ اورینٹل) میں چند ایسی دستاویزات محفوظ ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بوترو دلی کالج مستقلاً چھوڑ کر واپس فرانس نہیں گیا تھا، بلکہ خرابی صحت کے باعث رخصت پر تھا اور علاج معالجے کے بعد واپس آنا چاہتا تھا، چنانچہ روانگی سے قبل اس نے اسٹیچر بیگم سے یہ طے

کرلیا تھا کہ واپسی پر عہدۂ پرنسپلی اسے لوٹا دیا جائے گا، لیکن بعد میں اس معاہدہ پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ بوترو نے فرانس سے اشپرنگر کو یاددہانی کے متعدد خطوط لکھے اور متعلقہ افسران سے بھی رابطہ قائم کیا۔ راقم نے یہ تمام تفصیلات اپنے انگریزی مقالہ

Félix Boutros, his life and contribution to Urdu language and literature

میں درج کر دی ہیں۔ یہ مقالہ کولیژ دفرانس، پیرس (Collège de France) میں منعقدہ ایک تقریب (زیرِ صدارت مارک گابوریو) میں پیش کیا گیا (۲۰۰۱ء)۔

۴۸۔ ''گارساں دتاسی کے تمہیدی خطبے''، مذکورہ بالا، ص ۸۲

۴۹۔ ایضاً، ص ۹۷

۵۰۔ اس ترجمہ کے بارے میں ایک مضمون نگار لکھتا ہے:

''صہبائی نے اس کا ترجمہ دہلی کالج کے پرنسپل بوترو کی فرمائش پر کیا، چنانچہ بوترو کا صہبائی سے ''حدائق البلاغت'' کا ترجمہ کروانا ثابت کرتا ہے کہ اردو میں بھی ان کو دستگاہ کامل تھی اور کچھ چیزیں اس ترجمے سے قبل اردو میں آ چکی تھیں، ورنہ کچھ نہ کچھ بنیاد ہونی چاہیے، جس کی بنا پر ان سے ترجمہ کی فرمائش کی گئی۔ پرنسپل بوترو جیسا دانشور اور زبان شناس کسی مبتدی کو یہ کام نہیں سونپ سکتا جبکہ اس زمانے میں اردو کے ایک سے ایک ماہر یہاں موجود تھے۔'' (نوائے ادب (بمبئی)، ج ۷ ش ۱ (اپریل ۱۹۹۷ء)، ص ۹۳۔ ''امام بخش صہبائی اور اردو زبان و ادب'' از ایم زیڈ حسین ص ۹)

۵۱۔ مطبوعہ دہلی، ۱۸۴۲ء۔ نیز ''باغِ اردو'' (شیر علی افسوس)۔ زیرِ نگرانی بوترو۔ دہلی ۱۸۴۵ء (بحوالہ ''تاریخ'' ۱: ۱۳۳، تحقیقی نوٹ)

۵۲۔ گارساں دتاسی نے ''تاریخ'' میں اس کا نام Charles Olloba y Ochoa بھی لکھا ہے (۲: ۴۳۰)

۵۳۔ خطبات (۱۹۳۵ء)، ص ۵۲۶

۵۴۔ دیکھیے ان کا مضمون ''اردو کی بابت فرانسیسیوں کی چند تحریریں'' (اردو نامہ (کراچی)، مارچ ۱۹۶۲ء، ص ۴۷-۴۳)

۵۵۔ ۲: ۳۳۳ (تحقیقی نوٹ)۔

۵۶۔ رک:

C.E. Buckland: *Dictionary of Indian Biography*. Reprinted: Lahore 1975 (London 1906), p. 45

۵۷۔ ''خطبات گارساں دتاسی'' (۱۹۳۵ء)، ص ۵۷۳-۵۷۴، خطبہ بابت ۳ دسمبر ۱۸۶۹ء

۵۸۔ ثریا حسین، مذکورہ بالا، ص ۳۰۸-۳۰۹

۵۹۔ ژورنال ازیاتیک (۱۸۴۳ء)، ص ۱-۴۷

۶۰۔ ''جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال'' (کلکتہ، ۱۸۵۲ء)، ص ۵۱۳ ببعد

۶۱۔ ژورنال ازیاتیک، ۲۱۵ (۱۸۵۳ء)، ص ۵۶۳ ببعد۔ زیرِ عنوان

"Mas'ud, poète persan et hindoui"

۶۲۔ برائے تفصیل رک:

Sunil Sharma: *Persian poetry at the Indian Frontier, Mas'ud Sa'd Salman of Lahore*

New Delhi 2000

۶۳۔ مثلاً دیباچہ ''تاریخ'' ا: ۲۴۷، ۲۰۳-۲۰۲، ۳۰۵ (بذیل ''خسرو'' جس میں خسرو کی مقبول ریختہ غزل اور کبیر کی کریتوں کا فرانسیسی ترجمہ دیا گیا ہے)، ۲۹۰-۲۹۱۔ جلد سوم (متعلقہ مسعود سعد سلمان)، ص ۲-۳ (متعلقہ سعدی مع ریختہ اشعار کا فرانسیسی ترجمہ)۔

۶۴۔ دیباچہ ''تاریخ''۔ جلد دوم ص ۱۲ (تحقیق نوٹ) ۲۹۰-۲۹۱

گارساں دتاسی اور بلاں کے تعاون کی چند اور مثالیں:

الف) تذکرہ ''عمدہ منتخبہ'' کی ایک نقل گارساں دتاسی کے لیے تیار کرائی (''تاریخ''۔ دیباچہ ص ۵۰، تحقیق نوٹ)

ب) گارساں دتاسی نے عطار کی ''منطق الطیر'' مرتب کی (۱۸۵۷ء) جس کا مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری میں مقیم بلاں کے کتب خانے سے دستیاب ہوا تھا۔

ج) گارساں دتاسی نے بذریعہ خط ''تزک بابری'' (بزبان چغتائی، قلمی) کے پائے جانے کا بلاں نے جو غلط ذکر کیا ہے، اس کی تصحیح کی ہے (ژورنال ازیاتیک، مارچ ۱۸۴۳ء ص ۲۹۲)

نیز رک: ''تاریخ'' ا: ۲۹۰ (تحقیق نوٹ)، ۳۳۰ (''بھگوت گیتا'' فارسی، قلمی) (تحقیق نوٹ)

۶۵۔ رک: دہلی اردو اخبار (بابت ۲ جنوری ۱۸۵۴ء)۔ بحوالہ ''دلی کالج میگزین''، قدیم دلی کالج نمبر، ۱۹۵۳ء ص ۵۸-۵۳

۶۶۔ خطبات گارساں دتاسی (۱۹۳۵ء)، ص ۴۰۳

۶۷۔ گارساں دتاسی نے ''تاریخ'' میں بھی نیلر کے قتل کا ذکر کیا ہے۔ رک ۳: ۲۷۱ (تحقیق نوٹ)۔ ۳: ۲۱۳، ۳۵۴

۶۸۔ ''خطبات گارساں دتاسی'' (۱۹۳۵ء)، ص ۲۲۹-۲۳۱

۶۹۔ ایضاً، ص ۴۰۳

۷۰۔ ''مقالات گارساں دتاسی''، حصہ دوم ص ۳۶ (خطبہ بابت ۱۸۷۳ء)

۷۱۔ ''خطبات گارساں دتاسی'' (۱۹۳۵ء)، ص ۵۱۹۔ خطبہ بابت ۳ دسمبر ۱۸۶۹ء۔

۷۲۔ ''مقالات گارساں دتاسی''، حصہ اول (۱۹۶۳ء)، ص ۲۵۷۔ مقالہ بابت ۱۸۷۲ء

۷۳۔ متعلقہ اقتباس:

''لاہور کے پروفیسر جی ڈبلیو لائٹنر نے اپنی تصنیف ''سنینِ اسلام'' کی جلد اول شائع کر دی ہے جو سولہ سطری ۱۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ اردو میں اسلامی تاریخ و ادب کا خلاصہ ہے۔ موصوف کو اس کتاب کی تیاری میں مولوی محمد حسین سے بہت قیمتی مدد ملی۔ یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ ہندوستان کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ اس کتاب کا طرز تحریر نہایت سلیس اور شستہ ہے جس کی اہل مشرق بڑی قدر کرتے ہیں اور جو اکثر ان کتابوں میں مفقود ہوتا ہے جو اہل یورپ ہندوستان کے متعلق خود لکھتے ہیں یا دوسروں سے لکھواتے ہیں۔'' (''مقالات گارساں دتاسی''، حصہ اول، ص ۸۰۷۔ مقالہ بابت ۱۸۷۱ء)

۷۴۔ ''...... میں ڈاکٹر لائٹنر کی اس رائے سے بالکل متفق ہوں کہ مغربی زبانوں کی تصانیف کا لفظ بلفظ ہندوستانی میں ترجمہ کرنے کے بجائے ان کے مطالب کو سلیس زبان میں ادا کرنا چاہیے۔'' (ایضاً)

۷۵۔ "خطبات گارساں دتاسی" (۱۹۳۵ء)، ص ۵۴۴

۷۶۔ بحوالہ ثریا حسین، ص ۵۶-۵۷

۷۷۔ سیسے کا یہ بیان ہے کہ ۱۸۴۳ء میں کرونڈل سے مالابار تک بارہ سو میل کے دوران سفر اس نے ہر جگہ اردو میں بات چیت کی تھی اور جنوبی ہند میں ایک رابطے کی زبان کا وجود اتفاقیہ ذکر چکی ہے (رک ثریا حسین، ص ۲۲۷)

۷۸۔ "خطبات گارساں دتاسی" (۱۹۳۵ء)، ص ۴۸۳

۷۹۔ "تاریخ" ۱: ۳۵۹

۸۰۔ رک: ژورنال ازیاتیک (اکتوبر ۱۸۲۷ء)، ص ۳۵۳۔ لیکن گارساں دتاسی کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

۸۱۔ "تاریخ رشید الدین خاں" (تاریخ دکن) از مجرم حیدرآبادی۔ مطبوعہ حیدرآباد دکن، ریورنڈ جی، سمال (Rev. G. Small) نے از راہ نوازش اس کتاب کا ایک نسخہ مجھے بھیجا ہے۔" ("خطبات" (۱۹۳۵ء) ص ۵۳۳۔ خطبہ بابت ۳ دسمبر ۱۸۶۶ء)

۸۲۔ رک ثریا حسین، ص ۵۹

۸۳۔ جلد اکیس، سلسلہ جدید، جنوری تا اپریل ۱۸۳۹ء، ص ۹۵-۱۰۶

۸۴۔ ایضاً، ص ۹۵

۸۵۔ بابت ۱۸۲۷ء، ص ۳۲۷ ببعد

۸۶۔ رک ثریا حسین، ص ۱۱۹

۸۷۔ اس جرمن رسالے کا اسی سال یعنی ۱۸۴۷ء میں اجراء ہوا۔ (بمقام لائپزگ)۔ بالعموم اس مجلّہ کا مخفف ZDMG استعمال کیا جاتا ہے اور یہ اب بھی ویس بادن (جرمنی) سے شائع ہو رہا ہے۔

۸۸۔ شمارہ اول (۱۸۴۷ء)، ص ۳۶۹ ببعد

۸۹۔ ویانا کی اکیڈمی آف سائنسز کا بانی اور پہلا صدر۔ اب بھی اس کے نام سے آسٹریا کی اورینٹل سوسائٹی (ویانا) قائم ہے۔ تفصیل کے لیے رک:

Hammer-Purgstall and the Muslim India. By M. Ikram Chaghatai. Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 1998 (Broshure Series No. 6)

۹۰۔ تبصرے کا عنوان 'ہندی تاریخ ادبیات' در:

Jahrbücher der Literatur (Vienna), 120 (1847), pp. 126-147.

۹۱۔ رک: ژورنال ازیاتیک، بابت فروری ۱۸۳۹ء، ص ۲۰۷-۲۰۸

۹۲۔ رک:

uvelle Biographie Générale. Publiés par MM. Firmin Didot Frères. vol. xix, Paris ,N 1857, cols. 468-469

۹۳۔ رک: بک لینڈ کی "ڈکشنری آف انڈین بائیوگرافی"، ص ۱۵۵۔ "ڈکشنری آف نیشنل بائیوگرافی" بذیل 'ولسن'۔

۹۴۔ منقولہ عبارت یہ ہے:

The Hindi dialects have a literature own and one of very great interest. (*Intro. to Mack. Collect.*)

۹۵۔ "تاریخ" ۔ ا: ۸۵ (تحقیق نوٹ)، ۲۱۳، ۲۷۳، ۳۲۵ (تحقیق نوٹ)، ۳۳۳۔ ۲: ۱۲، ۱۳، ۲۷ (تحقیق نوٹ)، ۱۰۳، ۱۳۲ (تحقیق نوٹ)، ۱۳۳ (تحقیق نوٹ)، ۱۸۲ (تحقیق نوٹ)، ۲۲۳ (تحقیق نوٹ)، ۲۶۰ (تحقیق نوٹ)، ۳۰۹ (تحقیق نوٹ)، ۳۳۳ (تحقیق نوٹ)، ۴۸۶، ۵۱۱ (تحقیق نوٹ)، ۵۲۷ (تحقیق نوٹ)۔ ۳: ۳ (تحقیق نوٹ)، ۲۸ (تحقیق نوٹ)، ۱۹۵، ۱۷۷، ۲۳۳، ۲۵۶، ۲۵۸، ۲۵۹، ۳۰۰ (تحقیق نوٹ)۔

۹۶۔ "ریویو اورینٹال اے امریکن" ۔ ۱۸۶۱ء، ص ۱۵۲-۱۵۶، بحوالہ ثریا حسین، ص ۲۳۷۔

۹۷۔ اس ولسن کلیکشن کا نمبر یہ ہے: MSS Eur 301

۹۸۔ اس وفات نامہ کے اختتام پر مصنف کے مخففات E.R. درج ہیں اور یہ اس انگریزی مجلّہ میں شائع ہوا:

Indian Antiquary (Bombay). Ed. by Jas. Burgess, vol. VII (November 1878), p. 292

گارسیں دتاسی کے انتقال پر ڈولنگر نے اس کے حالات زندگی اور تصنیفات پر ایک مفصل مضمون لکھا، جس کا مکمل حوالہ درج ذیل ہے:

The British Empire in India: a Review of the life and works of Garcin de Tassy. By Johann van Dollinger. (i Doellinger Review, vol. 35 (June 1879), pp. 385-403)

اس جامع اور معلوماتی مضمون کا اردو ترجمہ الگ سے شائع کیا جائے گا۔

Abstract

Joseph-Heliodore Garcin de Tassy was a well-known, eminent and established, French scholar of oriental languages and literature. He had a profound interest in Urdu and Islamic studies and despite the fact that he never visited India; he had a close contact with the scholars, orientalists and researchers, working on the history of Urdu language and Literature. He was a student of a reputed French Orientalist, Silverstre de Sacy (1758-1838) and learnt Persian, Arabic and Turkey languages from him. In 1828, he became the first

Professor of Urdu in France at the recommendation of his teacher and continued to work at the post till his death in 1878. The article gives a detailed and comprehensive account of his works and activities, his friends and collaborators, his sources and methods and his services regarding the compilation of the first history of Urdu language and literature which has been used a source material by many of his successors. In this article the writer has disclosed first time that Garan de Tarry was also a member of Anjuman-e Punjab, Lahore and was interested in its literary activities.

معیار: علمی و تحقیقی مجلہ، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد [illegible]، شمارہ [illegible]، جولائی-دسمبر [illegible]ء

تلنگانہ تحریک اور مخدوم محی الدین

سیدہ مظہر جمیل*

تلنگانہ تحریک دراصل صدیوں کی نا آسودگیوں، قدیم استحصالی زرعی نظام کی ستم سامانیوں، زرعی معیشت پر طاقت ور طبقات کی اجارہ داریوں، زرعی پیداوار کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف، غریب و مفلس طبقات پر مقتدر طبقات کے بڑھتے ہوئے مظالم اور مفلسی، ناداری، جبر، استحصال و مصائب کی چکی میں پستے ہوئے عوام کی جہد ابقا کی تحریک تھی۔

ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح دکن میں بھی شروع ہی سے ایک ایسا معاشی نظام قائم رہا ہے جس میں نہ صرف زرعی اراضیات بلکہ تمام پیداواری وسائل ہمیشہ حکمراں طبقے کی ملکیت تصور ہوتے تھے اور جسے وہ ذاتی صوابدید پر اپنے عزیزوں، امیروں، درباریوں، اطاعت گزاروں، وظیفہ خواروں، خدمت گاروں، محسنوں، حلیفوں اور دوسرے پسندیدہ لوگوں میں بعض شرائط یا بلا شرائط تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ عطیہ پانے والا کبھی خراج کی صورت میں سرکاری خزانے کو مخصوص رقم کی ادائگی کرتا اور کبھی گاہے بگاہے نذر گزارتا تھا۔ البتہ اکثر عطیہ پانے والے اس بات کے پابند ہوتے کہ وہ اپنی جاگیر پر مسلح سپاہیوں کی ایک مخصوص تعداد پر مشتمل لشکر تیار کریں اور انھیں جنگی ضرورتوں سے آراستہ رکھیں اور وقتِ ضرورت اپنے مربی و محسن بادشاہ کی فوجی اور مالی اعانت و امداد کے لیے کمربستہ رہیں۔

جاگیریں دائمی نوعیت کی بھی ہوتی تھیں اور عارضی یا خاص مقصد یا مدت سے مشروط بھی۔ اصولاً جائیداد بخشنے والا ہر وقت جائیداد کو ضبط کرنے کا مجاز بھی ہوتا تھا۔ اس طرح جاگیر پانے والا دائمی قانونی حق سے محروم رہتا تھا۔ لیکن رواجاً جاگیر عطا کرنے والا جاگیری حقوق کی نسل در نسل منتقلی میں بالعموم حارج نہ ہوتا تھا۔[1] دکن میں رائج جاگیرداری کا نظام ہندوستان میں صدیوں سے قائم جاگیردارانہ بندوبست سے مختلف نہ تھا بلکہ تمام خوبیوں اور خرابیوں کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ یہاں کا جاگیری نظام چند اضافی خصوصیات بھی رکھتا تھا۔ مثلاً دکنی حکمرانوں کے مختلف ادوار میں ہونے والی تبدیلیوں، مقامی جاگیرداری نظام میں بعض مخصوص کردار بھی پیدا کر دیے تھے۔

ریاست حیدرآباد دکن:

ریاست حیدرآباد کا کل رقبہ بیاسی ہزار چھ سو اٹھانوے مربع میل پر محیط تھا جسے انتظامی اعتبار سے چار ڈویژن اور سترہ اضلاع میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یہ پورا علاقہ جغرافیائی، لسانی اور تہذیبی لحاظ سے تین خطوں میں تقسیم تھا۔ یعنی (۱) مرٹھواڑہ جس میں چھ ڈسٹرکٹ

---

* [illegible]۔ اے، بی راہ خیابان بادبان، فیز [illegible]، ڈیفنس کراچی۔

(اورنگ آباد، بھیر، عثمان آباد، گلبرگہ، ناندیڑ، پربھنی) شامل تھے۔ (۲) تلنگانہ میں نو ڈسٹرکٹ شامل تھے (رائچور، محبوب نگر، نلگنڈہ، ورنگل، میدک، بیدر، نظام آباد، عادل آباد اور کریم آباد) (۳) کرناٹک میں صرف دو ڈسٹرکٹ شامل تھے۔ کم و بیش یہی علاقے موجودہ بھارت میں اندھرا پردیش، کرناٹک اور مہاراشٹر کے لسانی صوبوں میں مدغم کیے گئے ہیں۔

ریاست کے کل رقبے کا ۶۰ء۲۷ فیصد حصہ جاگیرداری نظام کا حصہ تھا جس میں بتیس فیصد سے زیادہ آبادی جو چونتیس فیصد دیہاتوں، قصبوں اور شہروں میں بستی تھی۔ یہ آبادی تو براہ راست جاگیرداروں کی رعیت شمار ہوتی تھی ورنہ کسی نہ کسی طرح ان کے زیر اثر تھی۔ کل رقبے کا بارہ فیصد علاقہ کوہستانی اور دشوار گزار تھا جہاں قیمتی معدنیات کے ذخائر موجود تھے لیکن کسی قسم کی کاشت ممکن نہ تھی۔ صرف بیس فیصد رقبہ علاقہ دیوانی نظام میں شامل تھا جس سے ریاستی عوام کسی صورت میں فیض یاب ہو سکتے تھے!

ریاست میں مسلم آبادی کا کل تناسب صرف ۸۰ء۱۲ فیصد سے پندرہ فیصد تک تھا جو زیادہ تر حیدرآباد اور اطراف حیدرآباد کے علاوہ دوسرے بڑے بڑے شہروں میں آباد تھے اور اکثر کا دارومدار سرکاری ملازمت، سپہ گری، عمارت سازی یا جاگیرداروں کی خدمت گزاری پر ہوتا تھا۔ بہت کم مسلمان خاندان کاشت کاری کے پیشے سے وابستہ تھے۔ ہاں بیسویں صدی کے اوائل میں ہونے والی معاشی اور انتظامی تبدیلیوں کے نتیجے میں مسلمانوں میں تجارت کے علاوہ کپڑا بافی، بیڑی سگریٹ سازی اور جلد سازی جیسے ذرائع معاش میں دلچسپی لینی شروع کی تھی۔ بالعموم مسلمانوں کی اکثریت معاشی تنگ دستی کا شکار رہی ہے اور رفتہ رفتہ مڈل کلاس کا دائرہ تنگ سے تنگ تر ہوتا گیا ہے آصف جاہی سرکار برائے نام وظیفوں اور امدادی طریقوں سے عام مسلمانوں کی اشک شوئی کے فرائض ادا کرتی رہی ہے لیکن اجتماعی اور عوامی بہبود کے لیے وسیع پیمانے پر معاشی اسکیم شاید ہی اختیار کی گئی ہو۔

آبادی کا کثیر تناسب یعنی پچاسی فیصد ہندوؤں پر مشتمل تھا۔ ان میں بھی اکثریت قدیم دراوڑی قبائل پر مشتمل تھی۔ اونچی جاتی کے ہندو بہت کم تھے۔ چند پرانے کائستھ خاندان نسل بانسل سے آباد تھے جو شہروں کی حد تک مسلم معاشرت اور تہذیب میں داخل ہو گئے تھے اور جو کائستھ خاندان دیہی پس منظر میں آباد تھے، انھوں نے ہندوانہ طرز معاشرت اختیار کیا ہوا تھا۔ دیہی آبادی بالعموم تیلگو، مرہٹی اور کنڑی زبانیں بولتی تھی۔ اور ان کے معاشرتی بھی علاقائی اثرات کی حامل تھیں۔ زیادہ تر کاشت کاری ہندوؤں کے ذمے تھی۔ سودی کاروبار اور عام چھوٹی موٹی تجارت بھی ہندو گھرانے کرتے تھے۔

ریاست میں طبقاتی فرق ہر زمانے میں نمایاں رہا ہے دیہی آبادی میں غربت کا تناسب بہت زیادہ تھا۔ مجموعی طور پر ریاست حیدرآباد میں متوسط طبقہ دن بہ دن کمزور ہوتا گیا ہے سوئی اثرات اور پیداوار و وسائل کی عدم دستیابی نے عام لوگوں کو محنت کے ساتھ قناعت پسندی اور راضی بہ رضا ہونا سکھا دیا تھا لیکن بیسویں صدی کے بدلتے ہوئے حالات اور نئے امکانات کے فروغ نے ان میں بھی تبدیل ہوتی ہوئی زندگی سے اپنا حصہ وصول کرنے کا حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔[۲]

تلنگانہ:

ریاست میں تلنگانہ کا علاقہ سب سے وسیع جغرافیائی اور لسانی وحدت رکھتا تھا۔ چنانچہ آبادی کی کثرت بھی اس علاقے میں بستی تھی۔ زرخیز زمینات کا اسی فیصد حصہ (Wet-Land) بھی تلنگانہ ہی میں واقع ہوا تھا۔ چونکہ آبادی کا سب سے بڑا ذریعہ معاش کھیتی

باڑی تھا، لہٰذا زرعی اراضی پر دباؤ بھی نسبتاً سب سے زیادہ اسی خطے میں تھا اور یہاں کھیتی باڑی کا معیاری یونٹ (average economic holding) بالعموم پانچ ایکڑ آبی زمین یا بارہ ایکڑ خشک زمین تصور ہوتا تھا۔ جب کہ مرٹھواڑہ میں معیاری یونٹ پندرہ ایکڑ خشک اور چار ایکڑ آبی زمین پر مشتمل تھا۔ دیہی آبادی کا انحصار کاشت کاری پر تھا لیکن تلنگانہ ہی میں پچیس فیصد خاندان بے زمین زرعی مزدور کی حیثیت رکھتے تھے جنہیں خاص خاص موسموں میں کام مل پاتا ورنہ جنہیں اکثر و بیشتر ''بیگار'' کی چکی میں پیلا جاتا تھا۔ تمام تر محنت مشقت کے باوجود دیہی آبادی کا ساٹھ فیصد حصہ غربت اور تنگ دستی کا شکار تھا۔[3]

ریاست حیدرآباد جاگیرداری نظام کے لیے ایک ایسا گوشۂ عافیت بن گئی تھی جہاں نہ تو برطانوی قوانین اور اصلاحات کے اثرات پہنچ پائے تھے اور نہ آصف جاہی سلاطین کی طرف سے کوئی ایسی قدغن اور پابندیاں عائد کی گئی تھیں جو جاگیرداروں کے طبقاتی کردار کو کسی طرح محدود کرنے کا سبب ہوتیں۔ جاگیردارانہ سماج کے تمام استحصالی رویے آصف جاہی دور میں نہ صرف خوب پھلے پھولے بلکہ ان ریاست کے منجمد پانیوں میں بعض ایسی متعفن قوتیں بھی پیدا ہوئیں جنھوں نے اس طرزِ معیشت کے استحصالی پہلو کو مزید ہلاکت خیز اور عوام دشمن بنا دیا اور بعض ایسے کرداروں کو جنم دیا جو کسی دوسرے جاگیرداری سسٹم میں شاید پیدا نہ ہو پائے تھے۔ اس بے لگام آزادی نے جہاں بے شمار معاشرتی مسائل اور اخلاقی گراوٹ پیدا کر دی تھی، وہیں زرعی معیشت کی پیداواری قوت نمو بھی مائل بہ زوال ہوتی چلی گئی تھی۔

یوں تو جاگیری نظام میں جاگیردار کا پیداواری عمل سے براہِ راست تعلق ہوتا ہی نہیں ہے کہ درمیان میں کئی طبقے اور کردار اس عمل کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے اور اس میں باضابطگی پیدا کرنے میں مددگار رہتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ درمیان میں کارفرما طبقات کی ترقی و خوش حالی اور عام رعیت کی بدحالی کی صورت میں نکلتا تھا۔ یہاں تک کہ خود جاگیردار بھی اصل منفعت سے پوری طرح فیض یاب نہ ہو پاتا تھا۔ چنانچہ جاگیری نظام میں عمال اور انتظامی کارندوں کو ایسے سخت رویوں اور مظالم کو برتنا پڑتا تھا جو عام رعیت کو ان کے خلاف کلمۂ احتجاج تک بلند کرنے کے قابل نہ چھوڑتے تھے۔

شکم پوری کاشت کار:

مذکورہ بالا زمینی حقائق کی روشنی اور پس منظر میں اگر تلنگانہ تحریک کے اسباب و علل اور نتائج و اثرات پر غور کیا جائے تو بہت سی باتیں خود بہ خود واضح ہو جاتی ہیں اور یہ بات بھی بہ آسانی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی نسبت جاگیرداری معیشت اور معاشرت کو ریاست حیدرآباد میں اس قدر استحکام کیوں حاصل ہوا اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں برطانوی حکومت کے دوران ہونے والی زرعی اصلاحات (بنگال، اودھ، شمالی ہندوستان، پنجاب وغیرہ) کے اثرات سے دکن کیونکر محفوظ رہ سکا۔ مزید برایں یہاں کی معیشت و معاشرت میں مراعات یافتہ اور غیر مراعات یافتہ طبقات کے درمیان بڑھتے ہوئے فرق بلکہ خلیج کی وجہ بھی سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ معاشرتی ظلم اور معاشی استحصال جب انسان کی قوتِ برداشت سے باہر ہو جاتا ہے تو وہ کس طرح انقلاب کے تیز و تند دھارے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

نصف اول ہی میں انسانی تاریخ کی دو نہایت بھیانک اور خوں آشام عالمی جنگیں برپا ہو چکی تھیں جن میں ہونے والے

انسانی قتلِ عام اور مال و اسباب کے نقصانات کا تخمینہ پوری انسانی تاریخ کے مجموعی جنگی نقصانات سے بھی سوا بتایا جاتا ہے۔ ان جنگوں کے نتیجے میں یورپ، ایشیا، افریقا اور جنوبی امریکا کے نقشوں میں ایسی دور رس تبدیلیاں عمل میں آئیں اور انسانی ہجرتوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس کی نظیر تاریخ کے کسی دوسرے دور میں نہیں ملتی ہے۔ ہندوستان میں ان تبدیلیوں کے آثار انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں محسوس ہونے لگے تھے۔ چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے علاوہ متعدد سیاسی و سماجی ادارے وجود میں آچکے تھے جو ہندوستانی عوام میں تبدیل ہوتے ہوئے تناظر کا احساس جگا رہے تھے اور کسی نہ کسی انداز میں برطانیہ کے سامراجی شکنجے سے نجات پانے کے جتن اختیار کر رہے تھے۔

انڈین کیمونسٹ پارٹی کا قیام ۱۹۲۰ء کے آس پاس سوویت روس میں عمل میں آچکا تھا لیکن ملکی سطح پر پارٹی کی تنظیم بعد میں ہوئی۔ اس وقت برطانوی ہند میں کیمونسٹ پارٹی غیر قانونی تھی۔ لہٰذا پارٹی کی تنظیم مکمل طور پر انڈر گراؤنڈ (زیرِ سطح) تھی۔ لیکن پارٹی کے قیام سے قبل بنگال، مدراس، بمبئی، کانپور اور بعض دوسرے صنعتی شہروں میں مضبوط ٹریڈ یونین تنظیمیں وجود میں آچکی تھیں۔ کسان سبھائیں بھی سرگرمِ عمل تھیں۔ بنگال اور پنجاب میں آزاد ہندوستان کے حامیوں اور فاشزم مخالف انتہا پسند گروہوں نے بھی ایک ایسی فضا پیدا کر رکھی تھی جس کے پس منظر میں کیمونزم کے فروغ اور اشاعت کے روشن امکانات تھے۔ برطانوی حکومت کی رائل نیوی کے بحری جوانوں کی مسلح بغاوت اور ہڑتال نے ہندوستان کے سیاسی موسم کو غیر معمولی حدت اور شدت سے دوچار کر دیا تھا۔ اس پس منظر میں کیمونزم اور سوشلزم مقبول ترین نظریے اور آدرش کی حیثیت سے روز افزوں مقبولیت حاصل کر رہے تھے۔ چونکہ ہندوستان میں برطانوی سامراج حکومت کے خلاف ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی تھی، اس لیے کل ہند سطح پر کیمونسٹ پارٹی کی تنظیم بھی مکمل نہیں ہو سکی تھی۔ ابتدائی دنوں میں ہر بڑے صنعتی شہر کے کیمونسٹوں نے اپنے اپنے طور پر غیر رسمی طور پر منظم کر لیا تھا اور ایک دوسرے سے اکثر رابطے پیدا کر لیے تھے۔ بالآخر الگ الگ صوبوں کے کیمونسٹ لیڈر ۱۹۳۳ء میں بمبئی میں جمع ہوئے اور ایک مرکزی کمیٹی کا قیام عمل میں آگیا جس کے سکریٹری کامریڈ سجاد ظہیر اور دوسرے گھاٹے تھے۔ اس کو بعد میں ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ کے اجلاس میں باقاعدہ تنظیمی شکل دی گئی۔ اس اجلاس میں بھی پولٹ بیورو کا چناؤ ہوا۔ کامریڈ پی سی جوشی سکریٹری جنرل مقرر ہوئے اور پولٹ بیورو میں کامریڈ جوشی کے علاوہ کامریڈ اے جے گھوش اور کامریڈ رودات بھردواج بھی شامل تھے لیکن یہاں اس امر کا اظہار بھی ہو جانا چاہیے کہ برٹش کیمونسٹ پارٹی کے فیصلے کے مطابق شروع میں کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کو انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ محاذ بنا کر کام کرنا چاہیے تاکہ کیمونسٹ کو براہِ راست عوام تک رسائی حاصل کرنے میں عملاً کوئی دشواری نہ ہو۔[۴]

ریاست حیدرآباد میں ابتدا ہی سے قانونی طور پر کسی سیاسی جماعت یا ایسی سماجی سرگرمی کی اجازت نہ تھی جس کی پشت پر سیاسی تصور یا پروگرام کارفرما ہو۔ سنجیدہ ثقافتی مجلسیں ہوں کہ مذہبی و نیم مذہبی اجتماعات سب "سرکار عالیہ" کی خصوصی اجازت ناموں کے مرہونِ منت ہوتے تھے۔ بے ضرر قسم کے ادبی مشاعرے اور قوالیاں بھی ریاستی مخبروں کی گہری نظرداری کے بغیر منعقد نہ ہو سکتی تھیں۔ سوشل کلب تک سرکار کی نادیدہ نگہداشت سے باہر نہ تھے لیکن حیدرآباد شہر میں تعلیمی اداروں کے فروغ اور جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کی قدرے حوصلہ افزائی کی جانے لگی تھی بشرطیکہ ان سے کسی قسم کی سیاسی و سماجی آزاد خیالی کے پھیلنے کا احتمال نہ

ہو۔ چنانچہ کالجوں اور تعلیمی اداروں میں ادبی مجلسوں کا اور ڈرامیٹک سوسائٹیوں کا قیام ممکن تھا لیکن ان کی کارکردگی اور مقاصد کی ذمے داری متعلقہ تعلیمی اداروں کی انتظامیہ پر عائد ہوتی تھی۔ صرف مجلس اتحادالمسلمین ایک ایسی تنظیم تھی جو ریاستی حدود میں قائم تھی اور ابتدا میں جس کا اولین مقصد دینی اسلام کی تبلیغ اور شعائر اسلامی کا فروغ بتایا گیا تھا لیکن ادھر کچھ مدت سے مجلس مکمل طور پر آصف جاہی بادشاہت کے حق میں مسلم رائے عامہ کو بیدار کرنے میں مصروف تھی، جس کا مطلب سرکار عالی اعلیٰ حضرت حضور نظام الملک میر عثمان علی خاں خلد اللہ و ملکہٗ و سلطنتہٗ کی شاہانہ اور حاکمانہ فضیلت، خدا ترسی اور علم وتہذیب کے لیے گراں قدر تاریخی خدمات کے لیے عوامی سطح پر قبولِ عام کی فضا پیدا کرنا تھا۔ حیدرآباد شاہی خاندان کے فرادی سالگرہوں اور آصف جاہی بادشاہت سے متعلق اہم واقعات کے متعلق ستائشی و تہنیتی پروگرام مجلس کی خاص سرگرمیاں تھیں۔ مجلس ابتدا ہی سے آصف جاہی سلطنت کو مسلمانوں کے تاریخی جاہ و جلال کی علامت قرار دیتی تھی اور حکومت سے مالی وظیفہ اور سرپرستی حاصل کرتی تھی۔[۵]

ریاستی حدود میں انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ، خلافت تحریک اور خاکساروں کے رہنما اور عمائدین اکثر و بیشتر بطور مہمان کسی نہ کسی تقریب میں شرکت کے لیے حیدرآباد آتے رہتے تھے اور نظام سرکار نے ملک گیر شہرت کے حامل سیاسی لیڈروں پر ریاست میں داخلے پر پابندی عائد نہ کی تھی لیکن سرکاری طور پر ریاستی حدود کے اندر نہ تو انڈین نیشنل کانگریس کو اور نہ آل انڈیا مسلم لیگ کو ذیلی شاخیں قائم کرنے کی اجازت تھی۔ کانگریسی رہنما اور مسلم لیگی زعما بھی ریاستی حکام بالخصوص نظام سرکار سے غیر ضروری بیر لینے کے قائل نہ تھے، کیوں کہ آزادیٔ ہند سے قبل ریاست حیدرآباد براہِ راست برطانوی حکومت کی نگہبانی اور سرپرداری کے تحفظ میں تھی۔ اور ہندوستان کی تحریک آزادی کا ریاست سے براہ راست کوئی تعلق اس وقت تک قرینِ قیاس نہ تھا جب تک ہندستان سے برطانوی راج کا خاتمہ عمل میں نہ آجائے۔ سبھاش چندر بوس اور بھگت سنگھ کی قوم پرستانہ مسلح جدوجہد اور برطانوی حکومت کے نظام کو مفلوج کردینے والی دہشت گردی کو بھی ایک خاص حلقے میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جانے لگا تھا۔ مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے بعد جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ نوجوان نسل کے ہیرو بن چکے تھے۔ بنگال کے قوم پرست شاعر گرو دیو رابندرناتھ ٹیگور کی وطن پرستی اور اقبال کا مردِ مومن بھی اپنے اپنے لیے پسندیدگی کے حلقے رکھتے تھے۔

چنانچہ بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی تک ریاستی حدود میں کیمونسٹ پارٹی کے قیام کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ لیکن علمی سطح پر سوشلزم سے وابستہ خیالات و تصورات ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح حیدرآباد کے پڑھے لکھے لوگوں میں بھی بہت زیادہ اجنبی نہ رہے تھے۔ بلاوہ ریاست کے اطراف پائی ہوئی صورت حال اور عالمی واقعات سے خود کو کیونکر بے بہرہ رکھ سکتے تھے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی انھیں بھی اتنی ہی عزیز تھی جتنی کسی بھی دوسرے ہندوستانی کو ہو سکتی ہے اسی طرح ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ابھرنے والی سیاسی لہروں اور ترقی پسندانہ خیالات و تصورات کے اثرات کو بھی کسی فرمانِ شاہی اور انتظامی قدغن کے ذریعے نہیں روکا جاسکتا تھا کہ خیالات و تصورات نہ تو مخصوص سرحدوں میں اسیر رکھے جاسکتے ہیں اور نہ انسانی افکار کو قید و بند کی بیڑیاں پہنائی جاسکتی ہیں۔[۶]

ریاست حیدرآباد کی حدود میں کیمونسٹ پارٹی کا باقاعدہ قیام چوتھی دہائی کے اوائل میں ہوا تھا لیکن سوشلسٹ خیالات و

نظریات کی پذیرائی کا عمل بہت پہلے سے شروع ہو چکا تھا۔ حیدرآباد، سکندرآباد اور بعض دوسرے شہری مراکز میں پڑھے لکھے نوجوان مطلق العنان ملوکیت کے شکنجے سے آزاد جمہوری معاشرے کا خواب دیکھنے لگے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء/۱۹۳۸ء کے آس پاس حیدرآباد کے چند باشعور نوجوانوں نے اپنے آپ کو ایک گروپ کی صورت میں منظم کرلیا تھا جسے ''کامریڈ ایسوسی ایشن'' کے نام سے شہرت ملی۔

اردو کے ممتاز و مقبول شاعر مخدوم محی الدین کامریڈ ایسوسی ایشن کے روحِ رواں تھے۔ بے شک یہ نئی تعلیم اور شعور سے آراستہ نوجوانوں کا ایک بہت چھوٹا سا اور غیر منظم گروپ تھا جس کے سامنے نہ تو کوئی ایسی سیاسی روایت موجود تھی جو مطلق العنان شخصی ملوکیت کے خلاف عوامی سیاسی جدوجہد میں ان کی رہنمائی کر سکتی اور نہ انھیں ریاست کے اندر اور باہر کسی ایسی قوت اور پارٹی کی پشت پناہی حاصل تھی جو نظام شاہی ملوکیت کے جابرانہ استبداد سے تحفظ فراہم کر سکتی ہو۔ بے شک اس گروپ میں شامل کم و بیش تمام نوجوان عملی سیاست کے تجربے سے محروم تھے اور کسی خاص مسئلے کے حق میں عوامی ہمدردی، تعاون و اعانت حاصل کرنے کے گُر سے بھی کوئی خاص واقفیت نہ رکھتے تھے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک اس بات کا شعور و ادراک رکھتا تھا کہ بیسویں صدی میں کسی خوددار انسان یا معاشرے کے لیے فردِ واحد کی غلامی اور ملوکیت کو قبول کرنا شرفِ انسانیت کے خلاف ہے۔ وہ سب انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ کا گہرا شعور رکھتے تھے اور انقلابِ فرانس کے بعد وجود میں آنے والی جدید دنیا کے سائنسی اور علمی مباحث اور ان کے نتیجے میں ظہور پانے والی عالمی تبدیلیوں سے بھی خوب آگاہ تھے۔

مخدوم محی الدین کامریڈ ایسوسی ایشن کے روحِ رواں تھے جب کہ اس کے پُرجوش اراکین میں عالم خوندمیری، سید ابراہیم، احسن علی مرزا، غلام حیدر، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، اوتار پرشاد سری نواس لاہوٹی، جواد رضوی، مرزا حیدر حسین، شہاب الدین وغیرہ شامل تھے۔ کامریڈ ایسوسی ایشن کوئی باقاعدہ سیاسی تنظیم نہیں تھی بلکہ ابتدا میں ایسے پڑھے لکھے پُرجوش شہری نوجوانوں کا گروپ تھا جو انقلابِ روس کی کامیابی اور دنیا میں اشتراکی حکومت کے قیام سے از حد متاثر ہوئے تھے اور دنیا بھر کے محنت کش عوام کے اتحاد ہی میں مظلوم اور استحصال کے شکار انسانوں کی نجات دیکھتے تھے۔ نوجوانوں کا یہ گروہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کا بھی زبردست حامی تھا اور ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا بھر سے نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کو ضروری خیال کرتا تھا۔ یہ لوگ وہ تھے جو آصف جاہی مطلق العنان ملوکیت کے مکمل انہدام کے خواہش مند تھے اور چاہتے تھے کہ ریاست حیدرآباد کے عوام کو بھی آزاد اور جمہوری معاشرے کی برکات سے فیض یاب ہونے کا حق حاصل ہو۔ چنانچہ آصف جاہی شخصی حکومت کا مکمل خاتمہ ان کا سب سے پہلا ہدف تھا، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی کامیابی ہندوستان کا مقدر بن چکی ہے اور انگریز سرکار کو آج نہیں تو کل ہندوستان کی نوآبادی سے اپنے اقتدار کو لپیٹ لینا پڑے گا اور ایسی صورتِ حال میں نظام شاہی حکومت کا اسی صورت میں قائم رہنا، ریاست کے عوام کو آزادی اور جمہوریت کی نعمتوں سے محروم رکھنے کے مترادف ہوگا۔

کامریڈ ایسوسی ایشن میں مخدوم کی شرکت اور موجودگی نے عوامی حلقوں کو اس گروپ کی سرگرمیوں پر فوری طور پر متوجہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ کامریڈ ایسوسی ایشن کے مٹھی بھر اراکین نے اپنی بے سروسامانی اور ناتجربہ کاری کے باوجود محض اپنے عوام دوست آدرش، انقلابی تصورات، لگن، کٹ منت، سیاسی فہم و فراست اور بے لوث جدوجہد کے ذریعے دیکھتے دیکھتے ریاست حیدرآباد کے شہری

اور صنعتی مراکز میں محنت کشوں کی تنظیموں کا جال پھیلا دیا تھا اور ریاست میں ٹریڈ یونین تحریک کی ایسی بنیاد رکھ دی تھی جسے بہت جلد انقلاب کی راہ ہموار کرنی تھی۔

ہر چند کامریڈ ایسوسی ایشن کی سرگرمیوں کا دور محض دو تین برسوں ہی تک محدود رہا ہے جب انھیں اپنی صوابدید اور فکری و سیاسی تجزیے کی روشنی میں کام کرنے کے مواقع ملے تھے اور ۱۹۴۲ء۔۱۹۴۳ء کے بعد یہ لوگ آہستہ آہستہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (CPI) میں مدغم ہو گئے تھے۔ ابتدائی دور میں بھی بعض ایسے شواہد کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ تنظیمی طور پر نہیں تو کم از کم فکری سطح پر سیاسی و معاشی مسائل کی بابت حیدرآباد کے باہر موجود بعض کمیونسٹ رہنماؤں سے تبادلۂ خیال کرتے رہے ہوں گے؟! مخدوم محی الدین اس وقت بھی جب وہ سٹی کالج کی ملازمت میں تھے، ریاست کے باہر ہونے والے مشاعروں کے سلسلے میں دہلی، بمبئی، لکھنؤ اور علی گڑھ وغیرہ کا سفر کرتے رہتے تھے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرکردہ رہنماؤں سے دوستانہ مراسم بھی رکھتے تھے۔ ان کا ناگپور میں موجود سوشلسٹ عناصر سے بھی رابطہ قائم تھا اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا نمائندہ میگزین National Front اور دوسرا پارٹی لٹریچر بھی کسی نہ کسی ذریعے سے مخدوم اور مخدوم کے توسط سے حلقۂ احباب میں تقسیم ہوا کرتا تھا۔ خود حیدرآباد میں کتابوں کی بڑی بڑی دکانیں موجود تھیں جہاں سیاسی موضوعات اور انقلابی ہو اور کی حامل ایسی کتب بھی بہ آسانی دستیاب ہو جاتی تھیں جو بالعموم ریاست کے باہر ہندوستانی شہروں میں انگریز حکومت کی عائد کردہ پابندی کی وجہ سے نہیں ملتی تھیں۔ چنانچہ کامریڈ ایسوسی ایشن نے بہت خاموشی اور لگن کے ساتھ پڑھے لکھے نوجوانوں اور روشن خیال لوگوں میں جمہوریت، مساوات اور انصاف پر مبنی معاشرے کے قیام کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے حیدرآباد اور سکندرآباد کے علاوہ دیگر شہری مراکز میں بھی ہم خیال دوستوں کی تلاش کی تھی اور انھیں یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ ایسا ہی ایک چھوٹا سا گروپ ورنگل آباد میں بھی اپنا وجود رکھتا ہے۔

کامریڈ ایسوسی ایشن کے دوستوں بالخصوص مخدوم محی الدین نے ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے بعض لیڈروں سے گہرے مراسم پیدا کر لیے تھے اور کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر سی راجیشور رائے (C. Rajeshwar Rai) اکثر چوری چھپے حیدرآباد کا چکر لگاتے رہتے تھے۔ کامریڈ ایسوسی ایشن کے اراکین نے مختصر سی مدت میں حیدرآباد کے انڈسٹریل یونٹوں کا سروے مرتب کر لیا تھا۔ اور شہر کے مزدوروں اور محنت کشوں کے رہنماؤں سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنا شروع کر دیے تھے جو آئندہ چند برسوں میں ٹریڈ یونین تحریک کی داغ بیل ڈالنے اور محنت کشوں کے حقوق کی عملی جد و جہد کو بڑھاوا دینے میں نہایت کارگر ثابت ہوئے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ جب مخدوم محی الدین اور راج بہادر گوڑ اور ان کے ساتھیوں نے ناگپور کے بعض کامریڈوں کی مدد سے آل انڈیا اسٹوڈنٹ یونین قائم کرنے کی کوشش کی تھی تا کہ ریاست کے طالب علم کیمونٹی میں غیر فرقہ وارانہ بنیاد پر اور قومی سوچ رکھنے والی جمہوریت پسند تحریک کو فروغ دیا جا سکے۔ اسی زمانے میں حیدرآباد میں اسٹیٹ کانگریس کے زیر اثر ہندو طلبا نے اپنے ہوسٹلوں میں "بندے ماترم" کا قومی گیت گانے کی تحریک شروع کی تھی جسے نظام سرکار نے سختی سے کچل دیا تھا، لیکن سرکاری اقدام کا رد عمل بھی شدید ہوا تھا، اور حیدرآباد کے اکثر تعلیمی اداروں میں 'بندے ماترم' تحریک کے حق میں جلسے منعقد کیے گئے، جلوس نکالے گئے اور ہڑتالیں کی گئیں، حیدرآباد کے پرسکون ماحول میں یہ ایک ایسی سیاسی ہلچل کاری تھی جس نے نظام شاہی سرکار کو چونکا دیا تھا بلکہ ریاستی حدود کے باہر بھی ترقی پسند اور قوم پرست حلقوں کو بھی حیران

کردیا تھا کہ آصف جاہی ریاست کے اندر بھی ہندوستان کی آزادی کے حق میں کوئی قوم پرستانہ آواز بلند ہو سکتی ہے؟ کامریڈ ایسوسی ایشن براہِ راست بندے ماترم تحریک میں ملوث نہ تھی لیکن اس کے متعدد اراکین نے اس تحریک میں فعال کردار ادا کیا تھا۔ یہی وہ وقت تھا (۱۹۳۰ء) جب ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے ان لوگوں سے رابطہ قائم کیا اور ۱۹۴۰ء کے اواخر میں حیدرآباد کمیونسٹ پارٹی کا پہلا باقاعدہ 'سیل' (Cell) یہاں قائم کردیا گیا۔ کامریڈ ایسوسی ایشن کے اکثر اراکین نے کمیونسٹ پارٹی میں باقاعدہ رکنیت حاصل کی اور ابتدائی طور پر حیدرآباد شہر کے لیے ایک یونٹ قائم کیا گیا جس کے سیکریٹری شہاب الدین مقرر ہوئے جب کہ اسٹیٹ ریجنل سیکریٹری شپ پر مرزا حیدر حسین نامزد ہوئے۔ اور تنظیمی و پالیسی ساز سیل کے سیکریٹری مخدوم محی الدین مقرر ہوئے۔ اس سیل میں مخدوم محی الدین کے علاوہ حامد علی قادری، غلام حیدر اور راج بہادر گوڑ شامل تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کے یونٹ کے قیام کے بعد بھی کامریڈ ایسوسی ایشن کی سرگرمیاں جاری رہیں بلکہ بقول راج بہادر گوڑ حیدرآباد میں بائیں بازو کی سرگرمیوں کا سیاسی پلیٹ فارم کامریڈ ایسوسی ایشن ہی تھا جب تک یہاں کمیونسٹ پارٹی کا باقاعدہ قیام عمل میں نہیں آگیا۔[۷]

کامریڈ ایسوسی ایشن نے جس سال اپنی پبلک سرگرمی کا آغاز کیا تھا، اسی برس جنگِ عظیم دوم کا آغاز بھی ہوا تھا۔ چنانچہ کامریڈ ایسوسی ایشن کے دوستوں نے جنگ کے خلاف اور امنِ عالم کی بحالی کے حق میں 'اینٹی نازی ڈے' (Anti Nazi Day) منانے کا فیصلہ کیا، جس میں مخدوم نے جہاں جرمنی اور ہٹلر کے خلاف شدید جذباتی تقریر کی، وہیں برطانوی حکومت کی جنگی حکمتِ عملی پر بھی بہت سخت تنقید کی اور برطانوی وزیرِ جنگ لارڈ لنلیتھگو (Lord Linlithogow) جس نے ہندوستان کی برطانوی نوآبادی کو بھی جنگ کی بھٹی میں جھونکنے کا اعلان کردیا تھا اور کہا تھا کہ ہندوستان کے عوام برما اور ایشیا میں کھولے گئے جنگی مورچوں میں بہادری سے مقابلہ کریں گے۔ اور جرمنی کے ہٹلر اور اٹلی کے مسولینی کے فاشسٹ عزائم کو چکنا چور کردیں گے۔ مخدوم نے لارڈ لنلیتھگو پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''لارڈ لنلیتھگو کو اس بات کا قطعی کوئی اختیار نہیں کہ وہ ہندوستان کے عوام کو ان کی مرضی معلوم کیے بغیر جبرانہ طور پر جنگ کی بھٹی میں دھکیل دے۔'' مخدوم نے مزید کہا تھا کہ ''لارڈ لنلیتھگو کو اپنی غلامانہ نوکرشاہی کے ذریعے جنگ میں فتح حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اگر جنگ میں عالمی امن کے دائمی قیام کے لیے جنگ لازمی ہی ہو جائے تو پہلے ہندوستان میں قومی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے جسے جنگی حکمتِ عملی وضع کرنے اور اس پر عمل درآمد کا اختیار بھی ہونا چاہیے۔''[۸]

ایک طرف تو نظام شاہی حکومت نے جسے تاجِ برطانیہ کے 'یار وفادار' ہونے کا اعزاز حاصل تھا اور جس نے آصف جاہی سلطان نواب میر عثمان علی خاں کو ہز اکسزالٹیڈ ہائی نس کے سرکاری خطاب کے ساتھ تئیس توپوں کی سلامی کا حق دار قرار دے رکھا تھا اور دربارِ شاہی میں وائسرائے کی کرسی کے بعد نظام کی کرسی رکھی جاتی تھی، جنگ میں برطانوی حکومت کی مکمل طرف داری کا اعلان کردیا تھا۔ ریاست حیدرآباد کی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل سید احمد العیدروس کے مطابق نظام حیدرآباد جنگ کے ابتدائی دنوں ہی میں تاجِ برطانیہ سے اپنی وفاداری کے ثبوت میں جنگی ہوائی جہازوں کے دو مکمل اسکواڈرن اور ایک تباہ کن بحری جہاز (Destroyer) کی مساوی قیمت بطور نذرانہ برطانوی حکومت کو پیش کرچکے تھے۔ یہ گراں قدر مالی نذرانہ ان تمام فوجی و نیم فوجی امداد کے سوا تھا جن جنگی اشیائے ضرورت کی مستقل سپلائی کی ذمے داری نظام شاہی سرکار نے قبول کرلی تھی۔ اس کے علاوہ حیدرآبادی فوجی دستے مشرقِ وسطیٰ اور برما

کے محاذوں پر بھی اتحادی فوج کے شانہ بہ شانہ جنگ میں شامل رہے تھے۔ اس پس منظر میں مخدوم محی الدین کا جنگ کے خلاف گستاخانہ بیان نظام شاہی شیش محل پر ایک بھاری پتھر کی طرح پڑا تھا اور ہر چند مذکورہ بیان سے ریاست کے کسی قانون کی خلاف ورزی بھی نہ ہوتی تھی اور یہ محض ایک رائے کی حیثیت رکھتا تھا لیکن نظام شاہی حکومت نے اس بیان کو برطانوی حکومت اور اعلیٰ حضرت نظام کی حکومت کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش قرار دے کر گرفتار کر لیا تھا اور ایک مجسٹریٹ کی عدالت سے اس باغیانہ فعل پر ڈھائی سو روپیہ نقد کا جرمانہ یا عدم ادائیگی جرمانہ تین ماہ قید کی سزا سنا دی گئی تھی۔

مخدوم محی الدین اور ان کے رفیقوں نے جرمانے کی ادائیگی کی بجائے جیل یاترا کو قبول کیا۔ یہ مخدوم کی پہلی جیل یاترا تھی۔ [۹] کامریڈ ایسوسی ایشن کی اس سیاسی ہلچل کاری نے نہ صرف حیدرآباد میں برطانوی سامراج کے ناقدین، جنگِ آزادی کے ہمدردوں اور جمہوری قدروں کے چاہنے والوں کو متوجہ کر دیا تھا بلکہ ریاست کے باہر بھی جنگ مخالف عناصر نے اس بروقت جرأت مندانہ اقدام کو سراہا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب ابھی ہندوستانی عوام پہلی جنگِ عظیم کی ہلاکت خیزیوں اور اس کے جان لیوا اثرات سے باہر نہ نکل سکے تھے اور اب بلا جواز وہ دوسری جنگِ عظیم کا ایندھن بننے پر آمادہ نہ تھے۔

چوں کہ کامریڈ ایسوسی ایشن نے اپنے ابتدائی دنوں ہی میں حیدرآباد میں طلبا تنظیم کی داغ بیل ڈال دی تھی اور چند ہی برسوں میں حیدرآباد اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام عمل میں آ چکا تھا، اور ریاست کے تعلیمی اداروں میں طلبا کی غیر تعلیمی سرگرمیوں میں سیاسی شعور اور آزادیٔ اظہار کی جرأت مندی جھلکنے لگی تھی۔ اور طلبا مفت تعلیم کے علاوہ سیکولر نظامِ تعلیم کا مطالبہ بھی کرنے لگے تھے کیوں کہ ریاست کی اسی فی صد آبادی غیر مسلموں پر مشتمل تھی اور ان کے لیے مسلم عقائد کی تعلیم کا کوئی جواز نہ تھا۔ مزید براں تیلگو اور مراٹھی زبان بولنے والے علاقوں میں اس بات کا شعور پیدا ہونے لگا تھا کہ انھیں مادری زبان میں بھی تعلیم حاصل کرنے کی سہولت دی جائے تاکہ ان کی زبانوں اور تہذیب کو بھی تحفظ فراہم کیا جا سکے۔ ریاست کے دیہی علاقوں میں تعلیمی اداروں کی تعداد بہت کم اور ان کے انتظام کی صورت ناقابلِ اطمینان تھی۔ ہائی اسکول جسے عرفِ عام میں مکتبۂ فوقانیہ کہا جاتا تھا، بالعموم تحصیل ہیڈکوارٹر تک محدود تھے، گاؤں اور دیہاتوں کے بچوں کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ دور دراز کے علاقوں سے روزانہ پیدل سفر کر کے اسکول تک پہنچ سکیں۔ دیہی علاقے میں رہائشی اقامت گاہوں (ہوسٹلوں) کی سہولت ناپید تھی۔ چنانچہ کامریڈ ایسوسی ایشن نے نہ صرف طلبا میں ان کی تعلیمی ضرورتوں اور حقوق کا احساس پیدا کیا بلکہ ان کے والدین کو بچوں کے لیے تعلیمی سہولتوں کے فقدان کے خلاف آواز اٹھانے پر مائل کیا۔

تعلیم ہی کے شعبے سے منسلک معاملہ پرائمری ٹیچرز کی تنخواہوں اور زندگی کی عام سہولتوں کے فقدان سے تعلق رکھتا تھا۔ حیدرآباد کے پرائمری ٹیچرز کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی۔ ان کی تنخواہیں عام کلرک کی تنخواہ سے بھی کم ہوتی تھی اور انھیں رہائشی الاؤنس، صحت اور اسی قسم کی دوسری سہولتیں بھی حاصل نہ تھیں۔ بالخصوص دیہاتوں اور قصبات میں ان کی داد رسی بھی مشکل سے ہوا کرتی تھی۔ کئی مقامات پر ماہانہ تنخواہ کی ادائیگی غیر معمولی تاخیر سے ہوا کرتی تھی اور واجبات کی وصولی میں اساتذہ کو متعلقہ نظامت کے چکر پر چکر لگانا پڑتے تھے۔ کامریڈ ایسوسی ایشن کے اراکین بالخصوص مخدوم محی الدین نے اس مسئلے پر پوری تن دہی سے توجہ دی اور پرائمری ٹیچرز کے ایک بڑے حلقے کو اس بات پر قائل کر لیا کہ ان کے حقیقی مسائل کا حل صرف ان کے اتحاد اور تنظیم ہی کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ مخدوم محی الدین نے پرائمری اسکول کے ٹیچرز کی باقاعدہ تنظیم قائم کرکے انھیں اپنے حقوق کے حصول کی راہ پر لگا دیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ عوامی مسائل اور مشکلات کو عوامی حلقوں کے سامنے اجاگر کیا گیا اور طلبا اور ٹیچرز اپنے حقوق کی جنگ کے لیے صف آرا ہونے لگے۔ چنانچہ اب حکومت کے شعبۂ تعلیم کے لیے ممکن نہ رہا تھا کہ وہ معروضی حقائق سے نگاہیں چرا کر "سب اچھا ہے" کی رپورٹ جاری کرتے رہیں۔

یہ تھا وہ پس منظر جب (۱۹۳۹ء) ریاست حیدرآباد میں کیمونسٹ پارٹی آف حیدرآباد کا باقاعدہ قیام عمل میں آیا۔ اور مخدوم محی الدین حیدرآباد دکن کے پہلے یونٹ سیکریٹری اور راج بہادر گوڑ اسسٹنٹ سیکریٹری مقرر ہوئے۔ جب کہ غلام حیدر، حامد علی قادری، اونکار پرشاد، سبھا سو ریٹی، سری نواس لاہوٹی، عالم خوند میری، سید ابراہیم، جواد رضوی، حیدر حسین وغیرہ اس یونٹ / سیل کے اراکین تھے۔ اس موقع پر ریاستی سطح پر تنظیمی ارتباط پیدا کرنے کے لیے کیمونسٹ پارٹی کی اسٹیٹ ریجنل کمیٹی بھی قائم کی گئی تھی۔ جس کے سیکریٹری مرزا حیدر حسین مقرر ہوئے اور شہاب الدین کو ریجنل کمیٹی میں نئی سیکریٹری مقرر کیا گیا تھا۔ ریاست کی سیاسی و سماجی تاریخ میں یہ نہایت اہم اور یادگار لمحہ تھا جس نے ریاست کی آئندہ تاریخ کے خطوط واضح کر دیے تھے۔

انجمن اتحاد المسلمین ـــــ رضا کار تنظیم:[10]

تلنگانہ تحریک کے کرداروں میں انجمن اتحاد المسلمین اور اس کی ذیلی مسلح رضا کار تنظیم کا شمار بھی کیا جانا چاہیے کہ ان تنظیموں کی منفی حکمتِ عملی اور فرقہ وارانہ تصورات اور سرگرمیاں ریاست حیدرآباد کے عوام میں جمہوری معاشرے کے قیام اور جاگیرداری معیشت سے نجات کے بارے میں زیادہ گہرے شعور، عزم اور جوش و ولولے کے جذبات پیدا کرنے کا سبب ہوئے تھے۔ نظام شاہی سرکار کے آخری دنوں میں بالخصوص یہ انجمن اتحاد المسلمین اور اس کی ذیلی تنظیموں کا دیوانہ پن اور غیر منطقی جذباتیت ہی تھی جس نے نظام حیدرآباد کو اپنا یرغمال بنا کر انتہائی غیر دانش مندانہ فیصلے کروائے تھے۔

یوں تو انجمن اتحاد المسلمین کا قیام سب سے پہلے ۱۹۲۷ء کے اوائل میں مولوی محمود نواز خاں نائب قلعہ دار، مولانا بندے حسین، مولوی حکیم مقصود علی اور مولانا صابر حسین نے مسلمانوں کو ایک سیاسی مرکز پر متحد کرنے کی کوشش کی تھی اور ایک 'انجمن اتحاد بین المسلمین' قائم کی۔ بعد میں ادارے کا نام 'مجلس اتحاد المسلمین' کر دیا گیا۔ اس کا بنیادی مقصد اسلام کی تبلیغ تھا اور ریاست میں عیسائی پادریوں اور ہندو مذہب پرستوں کی ان کوششوں کا سدباب کرنا تھا جو مسلمانوں کو مذہب اسلام سے برگشتہ کرنے کے مترادف تھیں۔ اتحاد المسلمین کو ابتدا ہی سے ریاست کے جاگیرداروں اور نوابوں کی اعانت حاصل رہی اور جیسے جیسے ریاست کی فضا میں سیاسی رنگ پیدا ہوتا گیا، مجلس اتحاد المسلمین کا کردار بھی مذہبی و ثقافتی کی بجائے سیاسی ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ مجلس کے دستور میں نمایاں تبدیلی کرکے اسے آصف جاہی مملکت کی غیر مشروط وفاداری اور ہر حالت میں آصف جاہی فرماں روائی اور اقتدار کے تحفظ کا ذمے دار قرار دے دیا گیا تھا جس کے بعد مجلس اتحاد المسلمین نے خواجہ ابوالحسن، خواجہ بہاء الدین اور نواب بہادر یار جنگ کی سرکردگی میں ریاستی مسلمانوں کو آصف جاہی مملکت کی بقا کے لیے وسیع پیمانے پر متحد اور متحرک کرنا شروع کر دیا۔ اضلاع اور تحصیل کی سطح پر اس کی ذیلی شاخیں قائم کی گئیں اور ریاست کے طول و عرض میں مسلم فرقہ پرست سیاست کو فروغ دیا جانے لگا، دوسری طرف آریہ سماج، ہندو مہا سبھا اور اسٹیٹ کانگریس کے

بعض گروہ ہندوؤں میں ہندو فرقہ پرستی کی سیاست کو چمکانے میں مصروف تھے۔ چنانچہ حیدرآباد، گلبرگہ، عثمان آباد، نظام آباد اور بعض کے علاوہ کئی دوسرے مقامات پر ۱۹۳۸ء میں پہلی مرتبہ ہندو مسلم فسادات ہوئے جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا زبردست جانی و مالی نقصان ہوا۔ ان فسادات کے بعد مجلس نے آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ریاستی مسلمانوں کے مؤقف کو ہندوستان کے مسلمانوں تک پہنچانے کا فیصلہ کیا اور نواب بہادر یار جنگ کو جنھیں اپنی خطابت اور معتدل سیاسی رویے کی وجہ سے ہندوستان گیر شہرت حاصل تھی، اتحاد المسلمین کا صدر منتخب کرا لیا گیا۔ نواب بہادر یار جنگ مسلم لیگی حلقوں میں بھی معتبر مقام رکھتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے رہنماؤں کے سامنے مجلس کے مؤقف کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ مجلس کسی بھی ایسی تجویز کی حمایت کرنے یا قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوگی جس میں نظام شاہی اقتدارِ اعلیٰ کی نفی ہوتی ہو یا کمی آتی ہو مگر مقامی نظم و نسق میں ایسی اصطلاحات پر تیار ہو جائے گی جس کا مقصد ریاست میں ''اچھی حکومت'' قائم کرنا ہوگا۔ مجلس اتحاد المسلمین اسٹیٹ کانگریس کے مؤقف برائے 'ذمے دار حکومت' کی بجائے 'اچھی حکومت' کی قائل تھی کیوں کہ ذمے دار حکومت کے لیے انتخاب کے عمل سے گزرنا ہوتا ہے جس میں مسلم اقلیت پر ہندو اکثریت کو فوقیت حاصل ہو جائے گی۔ چنانچہ مجلس اتحاد المسلمین نے ریاستی آبادی کے تناسب پر قابو پانے کے لیے بعض ایسی تجاویز پر عمل درآمد شروع کیا اور ہندوستان کے کئی علاقوں سے بعض جو مسلم قبائل کو حیدرآباد میں آباد کرنے کی ترغیب دی جو مستقبل میں حیدرآباد کی ریاست پر منفی اثرات مرتب کرنے کا باعث ہوئے۔ آہستہ آہستہ مجلس اتحاد المسلمین نے ایک ذیلی تنظیم رضاکار تنظیم بھی قائم کرلی جسے آصف جاہی سرکار کی فوج نے باقاعدہ فوجی تربیت دینی شروع کی۔ اس جنگ جویانہ سرگرمی نے مجلس اتحاد المسلمین کی قوت میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا تھا اور نظام سرکار بھی اس کے دباؤ کو محسوس کرنے لگی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں مجلس اتحاد المسلمین کی جنگ جویانہ سرگرمیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ نظام خود بھی قاسم رضوی کی بڑھتی ہوئی قوت سے خوف کھانے لگے تھے۔ قاسم رضوی نے خود فیلڈ مارشل کی وردی زیب تن کرلی تھی اور ان کے چاروں طرف مسلح دستوں کی گارڈ رہنے لگی تھی۔ ان کی تقریروں میں جہادی جوش اور جذبے میں مسلسل اضافہ ہوتا جاتا تھا اور انھوں نے نظام حیدرآباد کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ جنگ کی صورت میں حیدرآباد کا بچہ بچہ ریاست کے دفاع کے لیے اٹھ کھڑا ہوگا اور رضاکار خود تن تنہا مٹھی بھر ہندوستان کو سرحدوں میں ایک انچ اندر داخل ہونے سے روک سکیں گے۔ لائق علی کے زمانے میں لوکل اسلحہ ساز فیکٹری جو گولکنڈہ کی پہاڑیوں میں قائم کی گئی تھی، قاسم رضوی کی نگرانی میں دے دی گئی تھی۔ کسانوں کی انقلابی تحریک کی بیخ کنی اور سدباب کی ذمے داری بھی قاسم رضوی کے حوالے تھی۔ غرض قاسم رضوی کی سیاسی اور فوجی طاقت میں اس قدر اضافہ ہو چکا تھا کہ نظام ان کی مرضی کے بغیر کوئی آزادانہ فیصلہ کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔

نواب بہادر یار جنگ کے انتقال (۱۹۴۴ء) کے بعد مجلس کی لیڈرشپ سید قاسم رضوی کے حصے میں آگئی تھی۔ سید قاسم رضوی ضلع عثمان آباد کے ایک چھوٹے سے قصبے لاتور میں چھوٹی موٹی وکالت کیا کرتے تھے۔ بعد میں وہ حیدرآباد منتقل ہو گئے تھے۔ قاسم رضوی نے جذباتی انداز میں آصف جاہی حکمرانی کو اسلامی نشاۃِ ثانیہ کی آخری نشانی قرار دے کر حیدرآباد میں مسلم تشخص کے فروغ کو اپنا مشن بنا لیا تھا۔

غرض اسٹیٹ کانگریس ہو کہ مجلس اتحاد المسلمین یا سابقہ انجمن اتحاد و ترقی جس کی روحِ رواں کاری پد ملا نیڈو، نواب اکبر علی خاں، نواب علی یاور جنگ، رام کشن راؤ، ایم نرسنگ راؤ وغیرہم تھے۔ ان سب کی تجاویز ریاست کے جمہوریت پسند اور عوام دوست

حلقوں کے لیے کسی طرح قابل قبول نہ تھے، کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ بیسویں صدی کے اس دورِ جمہور میں شخصی حکومت، ملوکیت اور مطلق العنانیت کا جابرانہ نظام کسی بھی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا جمہوریت پسند حلقے ریاست کے مستقبل کو ہندوستان کی تحریک آزادی کے تابع سمجھتے تھے اور ایک آزاد جمہوری معاشرے کے قیام کے لیے سرگرمِ عمل تھے اور انھیں قدم بہ قدم نظام شاہی سرکار، انجمن اتحاد المسلمین کے رضاکاروں، جاگیرداروں اور دیشمکھیوں کے گماشتوں کے ظالمانہ رویوں کا سامنا تھا۔

ترقی پسند ادب کی تحریک:"

حیدرآباد میں یوں تو انجمن ترقی پسند مصنفین کی باقاعدہ شاخ ۱۹۴۳ء میں قائم ہوئی لیکن بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی ہی سے لکھنے پڑھنے والے حلقوں میں ترقی پسند اور جدید خیالات و تصورات مقبول ہونے لگے تھے بلکہ اس سے قبل سرسید، حالی، شبلی، اقبال، جوش اور ٹیگور کے حوالے سے زندگی اور ادب کے نئے موضوعات زیر بحث آنے لگے تھے۔ ہندوستان سے آنے والے ادبی جرائد اور رسائل میں ادب اور زندگی کے باہمی رشتے، تخلیقی ادب کے معاشرتی کردار کی بابت تصورات ہوں کہ قدیم و جدید فلسفے، عقائد، اقدار، روایت، جمالیاتی عناصر کی بابت گفتگو یا جدید سائنسی انکشافات و تصورات کی نشان دہی بالعموم حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقوں میں بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھے اور برتے جاتے تھے، جامعہ عثمانیہ کی داغ بیل ڈالی جا چکی تھی اور شعبہ ہائے تصنیف و تالیف اور دارالترجمہ نے دنیا کے قدیم و جدید کتابوں کے اردو تراجم کے ذریعے لوگوں میں علم و شعور کی نئی آگاہی بخشی تھی۔ اسی طرح کلاسیکل ادب و شعر کے جدید مطالعے نے قدیم شاعری میں بھی عوامی زندگی کے مسائل، معروضی حقائق اور سچائیوں سے کی نشان دہی کر دی تھی۔ چنانچہ تیسری دہائی کے دوران حیدرآباد میں پڑھے لکھے افراد کا ایک ایسا گروپ موجود تھا جو غیر رسمی طور پر ادب و شعر، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت، سیاست اور آرٹ کے جدید موضوعات پر بحث مباحثے کرتے تھے اور نئے انداز کی نظمیں، غزلیں، مضامین اور کہانیاں تخلیق کرتے تھے۔ اس زمانے میں کمیونزم کی بین الاقوامی تحریک اور روسی انقلاب سے لوگوں کو خصوصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور مارکس، اینجلز، لینن کے علاوہ گورکی، ٹالسٹائی، چیخوف اور دوسرے روسی ادیبوں کی تحریریں ذوق و شوق سے پڑھی جانے لگی تھیں۔ اس طرح انگریزی، امریکی، فرانسیسی اور جرمن ادیبوں کی تازہ تخلیقات سے دلچسپی رکھنے والوں کا بھی ایک حلقہ موجود تھا جو بالعموم درس و تدریس سے وابستہ لوگ تھے یا یورپ اور امریکا میں تعلیم پا کر لوٹنے والے افراد۔ حیدرآباد میں دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح کمیونسٹ پارٹی پر بھی پابندی تھی لیکن کمیونسٹ لٹریچر بالعموم دستیاب تھا اور جو چیزیں عمومی طور پر دستیاب نہ ہوئیں، وہ خاص ذرائع سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں تک پہنچ جایا کرتی تھیں کیوں کہ اس زمانے میں حیدرآباد اور برطانوی ہندوستان کی سرحدیں کھلی تھیں اور اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنے جانے پر کوئی پابندی عائد نہ تھی۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں سوشلزم نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان کے تمام پڑھے لکھے لوگوں کا مقبول موضوع بن چکا تھا۔ حیدرآباد میں ایسے لوگوں کے حلقے میں ڈاکٹر جے سوریا نائیڈو، اختر حسین رائے پوری، جے وی نرسنگ راؤ، عزیز احمد، پروفیسر نور الحسن، پروفیسر صلاح الدین، پروفیسر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، محی الدین قادری زور جیسے لوگ شامل تھے۔ بعد کے دور میں آنے والوں میں سب سے نمایاں نام مخدوم محی الدین کا تھا۔ ان میں سے اکثر لوگ سروجنی نائیڈو کے گھر "گولڈن تھریشولڈ" میں جمع ہوا کرتے تھے، ادبی و علمی مباحث پر گفتگو ہوتی اور تازہ تخلیقات پر تنقید و تبصرہ کیا جاتا تھا جو ایک جدید طرزِ عمل تھا۔ محترمہ سروجنی نائیڈو خود انگریزی کی عمدہ شاعرہ

تھیں، مولوی عبدالحق، قاضی عبدالستار ان سرگرمیوں کو تحسین کی نظر سے دیکھتے تھے۔ بعد میں سبط حسن حیدرآباد آئے تو وہ بھی اس حلقے میں اٹھنے بیٹھنے لگے تھے۔ عالم خوندمیری، احسن علی مرزا، محمد ابراہیم، راج بہادر گوڑ، سجا سوتی وغیرہ بھی ان محفلوں میں شریک ہوتے۔ ہندوستان سے آمدہ کتب میں علامہ اقبال، حالی، اکبر الہ آبادی، منشی پریم چند، نیاز فتح پوری، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھ پوری وغیرہ کی منظوم اور نثری تحریریں خصوصی طور پر پسند کی جاتی تھیں۔ نیاز فتح پوری کے پرچے 'نگار'، پنڈت دیا نرائن نگم کا 'زمانہ' (کانپور)، حسرت موہانی کا 'اردوئے معلی' اور لاہور کے رسالے 'مخزن' اور 'ادبی دنیا'، محمد علی جوہر کے جریدے 'کامریڈ' اور مولانا ابوالکلام آزاد کے 'الہلال' کے حلقہ ہائے اثر بھی موجود تھے۔ چنانچہ حیدرآباد، سکندرآباد، ورنگل آباد، گلبرگہ اور دوسرے شہری مراکز میں جس طرح اردو لکھنے والے ادیبوں، شاعروں میں ترقی پسند خیالات و تصورات مقبول ہو رہے تھے، اسی طرح دکن میں بولی جانے والی دوسری زبانوں مثلاً ملیالم، تیلگو اور مراٹھی زبانوں کے ترقی پسند ادیب بھی تیز رفتاری سے اپنا اثر قائم کر رہے تھے۔ دکن میں لکھے جانے والے ترقی پسند ادب کا سب سے پہلا داعیہ ملوکیت کے خلاف اور جمہوری معاشرے کے قیام کے حق میں تھا۔

ترقی پسند مصنفین کا اچھا خاصا وسیع حلقہ حیدرآباد میں پہلے ہی سرگرم عمل تھا۔ کامریڈ ایسوسی ایشن کے اکثر اراکین بھی ترقی پسند ادب میں دلچسپی رکھتے تھے۔ مخدوم محی الدین ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے حیدرآباد کے باہر بھی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اردو کے علاوہ دکن میں بولی جانے والی دیگر زبانوں میں ملیالم، تیلگو اور مراٹھی وغیرہ میں بھی ترقی پسند ادب کی تحریک مقبولیت حاصل کر رہی تھی۔ چنانچہ ۱۹۴۳ء میں جب حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کا باقاعدہ قیام عمل میں آیا تو بقول سبط حسن "مسز سروجنی نائیڈو ہماری انجمن کی سرپرست بن گئیں۔ انجمن کا پہلا اجلاس مسز نائیڈو کی کوٹھی ہی میں ہوا۔ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ یہ تحریک مسز نائیڈو کی کوٹھی سے پیدل باہر نکلی اور حیدرآباد کے نوجوان ادیبوں میں گھل مل گئی۔ اور اس کا دائرہ دن بہ دن وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ نئے آنے والوں میں مخدوم کے علاوہ صمد رضوی ساز، ابراہیم جلیس، نظر حیدرآبادی، کلیم اللہ، حسینی شاہد، مسلم ضیائی، مغنی تبسم، عزیز قیسی، توصیف ناظم، سلمان اریب، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، زینت ساجدہ، رضیہ اکبر، حمایت علی شاعر، تحسین سروری، شہاب الدین، امجد یوسف اور کنول پرشاد کنول وغیرہ تھے اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ کہکشاں زیادہ سے زیادہ وسیع اور روشن ہوتی چلی گئی۔

اکتوبر ۱۹۴۵ء میں جب حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی اردو کانفرنس منعقد ہوئی تو مخدوم روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے لیکن اس کے باوجود وہ کانفرنس کے انعقاد میں پوری طرح سرگرم عمل تھے۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر تاراچند، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھ پوری، پروفیسر احتشام حسین، کرشن چندر، ساحر لدھیانوی، سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، قاضی عبدالغفار، سبط حسن وغیرہ شریک ہوئے تھے۔ ہندوستان کی آزادی کے اعلان کے ساتھ حیدرآباد میں انجمن اتحادالمسلمین کے عمل دخل اور اثر و نفوذ میں غیرمعمولی اضافہ ہوگیا تھا اور بائیں بازو کی سرگرمیوں پر زبردست پابندیاں عائد ہونے لگی تھیں۔ اسی سلسلے میں ۱۹۴۷ء کے اواخر میں انجمن ترقی پسند مصنفین پر بھی پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ چنانچہ اسے پہلے "مجلسِ ادب" کے نام سے پکارا جانے لگا اور بعد ازیں انجمن عوامی مصنفین نام قرار پایا۔ سلمان اریب ہی انجمن کے معتمد عمومی مقرر ہوئے تھے۔

ترقی پسند ادب کی تحریک اگرچہ براہ راست تلنگانہ تحریک کا حصہ نہیں تھی لیکن اس نے ملوکیت کے خلاف اور جمہوری آزاد

معاشرے کے قیام کے لیے جس طرح رائے عامہ کو متاثر کیا ہے اور ترقی پسند ادیبوں نے زندگی کی حقیقتوں کو جن پر جاگیردارانہ معاشرے اور تہذیب کے ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے، جس طرح واشگاف انداز میں ادب کا موضوع بنایا تھا اور نظام شاہی کی مطلق العنانیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی، اس نے ترقی پسند ادب کی تحریک کو بھی تلنگانہ تحریک کا حلیف بنا دیا تھا۔

عارضی معاہدۂ جاریہ　　(Stand Still Agreement)

۳/ جون ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے انڈین نیشنل کانگریس، آل انڈیا مسلم لیگ اور دوسری تمام چھوٹی بڑی سیاسی جماعتوں کی صوابدید کے ساتھ ہندوستان کی مکمل آزادی کی اسکیم کا اعلان کردیا تھا جس کے تحت ہندو آبادی کے اکثریتی صوبوں پر مشتمل 'ہندوستان' اور مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل پاکستان کی دو آزاد ریاستیں وجود میں آنا طے پایا۔ آزادی پلان کے تحت دونوں ریاستوں کا نظام جمہوری اور وفاقی طرز کا طے ہوا تھا اور ہر دو آزاد ریاستیں اپنی اپنی دستور ساز مجالس کے ذریعے خود اپنے دساتیر بنانے کی پابند تھیں اور عبوری دور میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو مناسب ترمیم و اضافے کے ساتھ حکومتی معاملات چلانے کے لیے استعمال کیا جاسکے گا۔ مذکورہ اسکیم کے تحت ہندوستان کی کم وبیش پانچ سو دیسی ریاستوں کو ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ الحاق اور اتحاد قائم کرنے کا اختیار دیا گیا تھا جس کے لیے رہنما قواعد بھی متعین کیے گئے تھے۔ اس ضمن میں ریاست کی آبادی کی اکثریت کو خاص طور پر بنیاد بنایا گیا تھا اور ریاست کے حکمرانوں کو پابند کیا گیا تھا کہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت اپنے باشندوں کے مفادات اور سیاسی رویوں کو بھی پیش نظر رکھے۔

اسی طرح ہندوستان کی آزادی کے نتیجے میں پاکستان اور ہندوستان کی دو آزاد جمہوریتوں کے قیام کے موقع پر The Auspicious Day جشن آزادی کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر اسٹیٹ کانگریس، انڈین نیشنل کانگریس کا جھنڈا لہرانا چاہتی تھی۔ ظاہر ہے نظام شاہی حکومت اس بات کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی کہ اس کی مطلق العنانی کے ہوتے ہوئے اپنی رعیت کو کسی اور ریاست کے پرچم لہرانے کی اجازت دے دیتی۔ چنانچہ اس موقع پر کانگریس کے مرکزی رہنما جن میں سوامی جی، ڈاکٹر میلکوٹے، کرشنا چاری جوشی بھی شامل تھے، گرفتار کرلیے گئے۔ اور طلبا تنظیموں کے درجنوں ورکرز کو بھی پابند سلاسل کردیا گیا۔ سلطان بازار جہاں طلبا یونین کا مرکزی دفتر تھا، پرچم کشائی کی تقریب منعقد ہونے والی تھی جسے پولیس نے مکمل طور پر محاصرے میں لے لیا تھا۔ وہاں جمع ہونے والے پرجوش ہجوم پر اندھا دھند لاٹھی چارج کی گئی اور اشک آور گیس پھینکی گئی۔ سلطان بازار، بیگم بازار اور متعدد مقامات پر پولیس اور مظاہرین کی آنکھ مچولی جاری رہی۔ کم وبیش یہی صورت حال ریاست کے دوسرے بڑے شہروں میں پیش آئی۔ ہزاروں طالب علم رہنما اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹی سے خارج کردیے گئے تھے۔ چالیس کی دہائی کے نصف آخر تک جامعہ عثمانیہ کی فضا بھی کافی تبدیل ہوچکی تھی اور یہاں ہندو مہا سبھا بھی طلبا میں اپنا اثر و رسوخ پیدا کرچکی تھی۔ چنانچہ مسلم طلبا کے ہوسٹلوں اور ہندو طلبا کے ہوسٹلوں میں ایک طرح کی کشیدگی کی فضا پیدا ہورہی تھی جسے سوشلسٹ اور غیر فرقہ وارانہ سیاست میں یقین رکھنے والے عناصر مختلف سیاسی تحریکوں اور پروگراموں کے ذریعے ہندو مسلم کشیدگی میں تبدیل ہونے سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے رہے تھے اور نظام شاہی حکومت کی طنابیں اپنی تمام تر طاقت، دولت اور امارت کے باوصف دن بہ دن ڈھیلی پڑتی جاتی تھیں۔ اس وقت آصف جاہی مطلق العنانیت کو سب سے بڑی فکر خود اپنے مستقبل کی بابت لاحق تھی کہ

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد انگریز ہندوستان سے اپنا بوریہ بستر سمیٹ لے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا اور اب مسلم لیگ کے دو قومی نظریے کی بنیاد پر ملک کی تقسیم بھی اٹل دکھائی دینے لگی تھی۔ والی ریاست نظام میر عثمان علی خاں پہلے ہی اسٹیفورڈ کرپس کو لکھ چکے تھے کہ برطانوی حکومت ہندوستان کی آزادی کے فارمولے میں ریاست حیدرآباد اور برطانوی حکومت کے درمیان خصوصی روابط کی اہمیت کو ضرور پیش نظر رکھے گی جیسے ماضی میں تاج برطانیہ کے ساتھ رہے ہیں۔ نظام کی خواہش تھی کہ آزادیٔ ہند کے بعد بھی ریاست کو تاج برطانیہ کے ساتھ سیاسی رشتے قائم کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے کسی آئندہ سیاسی بندوبست اور نظام میں برطانوی حکومت ریاست حیدرآباد کی مطلق العنان خودمختیاری کا فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں تھی اور نوزائیدہ آزاد ہندوستانی حکومت آزادی کے بعد کسی دیسی ریاست کی خودمختاری کو قبول کرنے پر تیار ہو سکی تھی۔

اسی طرح ۱۹۴۶ء میں حیدرآباد کے چیف منسٹر نواب احمد سعید خاں چھتاری لارڈ کرپس کو برار کی بازیافت کی یادداشت بھی پیش کر چکے تھے اور ساتھ ساتھ اس تمام علاقے کی واپسی کا مطالبہ بھی کر دیا تھا جو وقتاً فوقتاً تاج برطانیہ نے ریاست حیدرآباد سے دوستانہ استعمال کے لیے حاصل کیے تھے۔ ان میں ضلع اڑیسہ میں واقع بستر اسٹیٹ اور بستر سے ملحق "کوراپٹ" اور "جے پور اسٹیٹ" شامل تھے۔

ریاست کا مستقبل — وفود — معاہدے — فارمولے — ساجدات[۱۳]

دریں اثنا ریاست حیدرآباد کے وفود دہلی اور حیدرآباد کے درمیان پھیرے لگاتے رہے جنھیں سر والٹر مانکٹن اور سر سلطان احمد جیسے مشیران قانونی کی اعانت بھی حاصل تھی اور انگریز نوکرشاہی کی ہمدردی بھی۔ کم و بیش مسلسل اٹھارہ ماہ تک باہم دگر متعدد تجاویز اور معاہدوں کے تبادلے بھی ہوتے رہے لیکن نظام کی تلون مزاجی اور انجمن اتحاد المسلمین کے غیر حقیقی رویے نے کسی سمجھوتے کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ ابتدائی پروگرام کے مطابق تقسیم ہند کی مجوزہ تاریخ جون ۱۹۴۸ء کے آس پاس تھی لیکن معروضی حقائق کی برق رفتار تبدیلی اور لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی ہندو مسلم عصبیت، منافرت اور سیاسی تلخی کی وجہ سے تقسیم ہند کے پلان میں قدرے تعجیل کرنی پڑی اور اسے اگست ۱۹۴۷ء ہی کو عمل میں لانا قرار پایا۔ اس صورت حال کے پیش نظر نظام حیدرآباد نے ۳/ جون ۱۹۴۷ء کو یک طرفہ طور پر ایک فرمان کے تحت اعلان کر دیا کہ "ہندوستان کی آزادی کے بعد ریاست حیدرآباد مطلق العنان خودمختار ریاست ہوگی اور وہ آزادیٔ ہند کے نتیجے میں آنے والی کسی حکومت کی پارلیمنٹ میں اپنا نمائندہ بھیجنے کی پابند نہ ہوگی۔"

اس اعلان کے بعد جون ۱۹۴۷ء کو نظام حیدرآباد کا ایک وفد جس میں نواب احمد سعید چھتاری، نواب علی یاور جنگ، سر والٹر مانکٹن، محمد عبدالرحیم اور پنگل وینکٹ ریڈی شامل تھے، دہلی آیا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور سردار ولبھ بھائی پٹیل جو کانگریس کے نامزد وزیر داخلہ تھے، کے سامنے (۱) برار کی واپسی (۲) حیدرآباد کی خودمختار حیثیت کا تحفظ (۳) اور ہندوستان سے آئندہ تعلقات میں نظام کی مطلق العنانیت کی شرائط کے ساتھ دہلی کی نوزائیدہ ریاست کے ساتھ الحاق تجاویز رکھیں۔

برطانوی حکومت اور کانگریس نے تینوں نکات کو یکسر 'ناقابل عمل' قرار دے کر مسترد کر دیا اور جواباً ہندوستان کی نوزائیدہ ریاست سے غیر مشروط انضمام کی تجویز ہی کو قابل قبول قرار دیا۔

۸/ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک مرتبہ پھر نظام حیدرآباد نے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو لکھا کہ وہ ہندوستان کی نوزائیدہ حکومت

کے ساتھ مکمل الحاق کی بجائے کسی ایسے دوطرفہ معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے تیار ہیں جس کے تحت ریاست کی انفرادی سالمیت برقرار رکھی جا سکے۔ نیز حیدرآباد ریاست کو اس بات کا بھی اختیار رہنا چاہیے کہ وہ جہاں مناسب خیال کرے اپنے ایجنٹ جنرل مقرر کر سکے اور اگر ہندوستانی حکومت کسی موقع پر برطانوی دولتِ مشترکہ سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کرے تو نظام کو بھی حق حاصل ہوگا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ اپنے آئندہ تعلق کے بارے میں ازسرِنو غور کرے۔ یہ تجاویز بھی برطانوی حکومت اور انڈین نیشنل کانگریس کے لیے قابلِ قبول نہیں تھیں کہ ان سے ہندوستان میں موجود متعدد ریاستوں کے ساتھ ہونے والے معاہدات پر منفی اثرات مرتب ہونے کے امکانات تھے۔ دہلی کا مشورہ یہ تھا کہ پہلے نظام الحاق کے سیاسی معاہدے پر دستخط کردے۔ ہندوستانی حکومت نظام کو اس کے خاندان کے بابت مراعات کو ایک جداگانہ دستاویز کا حصہ بنا کر ضروری تحفظ فراہم کردے گی لیکن نظام کے گرد انجمن اتحادالمسلمین کے اثر ورسوخ کا دائرہ بہت تنگ ہوتا جارہا تھا جو ہندوستانی حکومت سے 'حیدرآباد کی آزاد ریاست' کے ماسوائے ہر قسم کے معاہدے کے خلاف تھی۔ چنانچہ اتحادالمسلمین سے وابستہ پریس نے نہ الحاق اور الحاق کی تمام تجاویز اور معاہدات کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کی مہم شروع کر رکھی تھی بلکہ سر والٹر مانکٹن کے علاوہ نواب احمد سعید چھتاری، نواب علی یاور جنگ کو بھی وفد کی رکنیت سے مستعفی ہونے پر مجبور کردیا تھا جس کی کھلے عام مذمت نظام حیدرآباد کو بھی کرنی پڑی لیکن عملاً نظام انجمن اتحادالمسلمین کے خلاف کسی قسم کی تادیبی کارروائی کی سکت نہیں رکھتے تھے کہ عوامی سطح پر نظام کی آخری پناہ گاہ بھی انجمن اتحادالمسلمین ہی تھی۔

دراصل اس وقت نظام کے گرد ایک مضبوط لابی ان زعما کی بھی موجود تھی جن کی رائے میں معاہدۂ الحاق اگر ناگزیر ہی ٹھہرتا ہے تو الحاق کا حق ہندوستان کی بجائے پاکستان کی نوزائیدہ ریاست کے ساتھ استعمال کیا جائے! اس سلسلے میں سر ظفر اللہ خاں کے توسط سے حکومتِ پاکستان سے رابطہ بھی قائم کیا گیا تھا اور بہ قول سر والٹر مانکٹن ۱۰/اکتوبر ۱۹۴۷ء کو انھیں مسٹر جناح سے کراچی ملاقات میں کرنے کی ہدایت بھی دی گئی تھی جو بہ وجوہ ممکن نہ ہو سکی۔ ادھر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے نظام کو مشورہ دیا کہ ریاست کی مخصوص جغرافیائی پوزیشن کے علاوہ ریاست کی ہندو آبادی کی مخالفت کے پیشِ نظر پاکستان کے ساتھ اس کا الحاق یا الحاق کی تجویز خودکشی کے مترادف ہوگی۔ چنانچہ فی الحال وہ کسی ایسے معاہدے پر دستخط کردے جو موجودہ سیاسی صورتِ حال کو بلا کسی ترمیم یا تبدیلی جاری رکھنے کا جواز فراہم کر سکے کہ دریں اثنا نظام تذبذب کی کیفیت سے باہر نکل سکے۔ کہتے ہیں قائدِ اعظم محمد علی جناح بھی غیر رسمی طور پر دبے لفظوں میں نظام کو مشورہ دے چکے تھے کہ وہ ریاست کی جغرافیائی حیثیت کے پیشِ نظر جلد از جلد دہلی حکومت سے کسی نہ کسی قانونی تعلق پر غور کرے۔

اس وقت دکن میں جاری کسانوں کی تحریک ایک انقلابی چھاپہ مار جنگ میں تبدیل ہوتی جارہی تھی۔ یہ صورتِ حال خود ہندوستان کی کانگریسی حکومت کے لیے باعثِ تشویش تھی۔ اور ہندوستان کی نوزائیدہ حکومت نظام کو وقتی طور پر اس لیے بھی تقویت فراہم کرنا چاہتی تھی کہ وہ یکسوئی سے اس عوامی تحریک کا مقابلہ کر سکے۔ برطانوی حکومت اور ریاست حیدرآباد کے درمیان خفیہ دستاویز اور خط وکتابت میں بھی ریاست دیہی معاشرے میں بڑھتی ہوئی بے چینی پر تشویش کا اظہار کیا جاتا رہا تھا اور نظام شاہی حکومت کو مسلسل مشورہ دیا جاتا رہا تھا کہ وہ ریاستی حدود میں بائیں بازو کی سرگرمیوں کو مضبوط نہ ہونے دے۔

اس عرصے میں اتحادالمسلمین کے رضاکاروں کی تعداد تیس لاکھ سے تجاوز کرگئی تھی جنھیں رات دن عسکری تربیت دی جاتی تھی

اور دیہی علاقوں میں جاری کسان تحریکوں کو کچلنے کی خدمات بھی ان سے حاصل کی جاتی تھیں۔ ان تمام اقدامات نے معروضی صورت حال کو مزید گمبھیر بنا دیا تھا۔ اُدھر ریاست کے دیہی علاقے میں کسان تحریک کی مسلح جدوجہد اپنے عروج پر تھی اور نظام شاہی حکومت تمام تر وسائل کے باوجود اس پر قابو پانے میں ناکام ہو چکی تھی۔ کیمونسٹ پارٹی (تلنگانہ ڈسٹرکٹ کمیٹی) ہندوستان کی نوزائیدہ حکومت کے ساتھ مکمل الحاق اور انضمام کے حق میں بھی تاکہ باقی ماندہ ہندوستان کی طرح ریاستی عوام بھی آزادی کی نعمت غیر مترقبہ سے بہرہ مند ہو سکیں۔ وہ مطلق العنان شخصی اور ملوکانہ حکومت کا مکمل خاتمہ چاہتے تھے اور ریاست حیدرآباد میں ایک آزاد جمہوری معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ گزشتہ دس برس کے دوران انھوں نے اسی اہم مقصد کے حق میں نہایت شاندار عوامی تحریک چلا رکھی تھی۔ اس ضمن میں انھوں نے مختلف معاہدوں اور تجاویز کی بھی کھل کر مخالفت کی تھی۔

ایک طرف ریاست حیدرآباد دکن کے شہری اور دیہی علاقے مکمل طور پر انقلابی جدوجہد کی لپیٹ میں تھے اور آئے دن ہندوستانی پولیس میں عوام اور فوج کے درمیان مسلح تصادم کی خبریں شائع ہو رہی تھیں اور کسانوں کی تحریک کو سوشلسٹ انقلاب کا مترادف ٹھہرایا جا رہا تھا۔ انجمن اتحاد المسلمین کے رضاکاروں کی مجاہدانہ جنگ و تاز اور انجمن کے صدر سید قاسم رضوی کے بلند بانگ دعووں کی گونج جس میں وہ دہلی کے لال قلعے پر آصف جاہی پرچم بلند کرنے کی بشارت دیا کرتے تھے، ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالمی پریس کی زینت بن رہے تھے۔ حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن اور لوکل پریس مکمل طور پر قاسم رضوی کے تصرف میں تھا۔ حیدرآباد، سکندرآباد اور ایک دو بڑے شہروں کے علاوہ ریاست میں نظام شاہی حکومت کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ لیکن اس مشکل مرحلے پر آصف جاہی خاندان کے مربی اور ہمدرد لارڈ ماؤنٹ بیٹن جن کی مساعی جمیلہ کے بدولت نظام کو 'معاہدۂ جاریہ' کی چھتری حاصل ہو گئی تھی کہ وہ اس مہلت میں ایسی تدابیر اختیار کرتے جس میں اپنی مطلق العنانیت کی بجائے حیدرآبادی عوام کے لیے زیادہ بہتر مستقبل اور بہبودی مراعات حاصل کرسکنے کا جواز نکل سکتا۔ لیکن مقام تاسف تو یہ ہے کہ انجمن اتحاد المسلمین کے زعما کی جذباتیت اور ناعاقبت اندیشی نے اس زریں عرصۂ مہلت کو بھی غیر ضروری نعرے بازی اور کھوکھلی للکاروں اور بڑ ک میں ضائع کر دیا تھا۔

اس ضمن میں نظام شاہی حکومت کی وہ کوششیں بھی غیر دانش مندانہ اور ناعاقبت اندیشی ہی کہی جا سکتی ہیں جو اس نے عین وقت پر ہندوستان کی نوزائیدہ حکومت سے جنگ آزمائی کے ارادے سے یورپ سے خطیر پیمانے پر جنگی اسلحہ حاصل کرنے کے سلسلے میں کی تھیں۔ ریاست حیدرآباد کی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل العیدروس نے اپنی خود نوشت یادداشت میں صاف لکھا ہے کہ انھیں مئی ۱۹۴۷ء اور نومبر ۱۹۴۷ء کے درمیان اس وقت کے وزیر اعظم نواب احمد سعید چھتاری کے حکم سے لندن اور یورپ کے کئی دارالحکومتوں کے دورے کرنے پڑے تھے تاکہ وہ جلد از جلد یورپ سے ایسا جنگی اسلحہ حاصل کرسکیں جو جنگ کی صورت میں ریاست کے کام آ سکے۔ اس سلسلے میں کمانڈر انچیف نے لکھا ہے کہ ابتدائی طور پر تین کروڑ روپے لندن کے ایک بینک میں ٹرانسفر کیے گئے اور انھیں لندن کے علاوہ کئی دوسرے شہروں کے اسلحہ ڈیلروں سے ملایا گیا جو بہ عجلت ریاست کو مناسب جنگی ساز و سامان فراہم کر سکتے تھے۔ اس سلسلے میں چند فیلڈ مارشل بھی ان کے ہمراہ تھے اور ان سب نے یہ سفر خفیہ طور پر کیا تھا۔ اس سلسلے میں العیدروس نے کراچی جا کر پاکستانی زعما سے ملنے کا احوال بھی لکھا ہے۔ لیکن پاکستان اس پوزیشن میں نہ تھا کہ فوری طور پر کوئی فوجی امداد فراہم کرسکتا۔ غلام محمد اور بعض دوسرے پاکستانی

تھا نظام حیدرآباد کے ذخیرۂ جواہرات کی پاکستان منتقلی میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ بعد ازیں العیدروس نے یورپ میں خطیر رقوم بھاری جنگی اسلحہ اور ساز و سامان کی فراہمی کے لیے صرف کیں لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ اس عجلت کاری اور دولت کی بربادی کے باوجود ریاست حیدرآباد نہ تو مطلوبہ اسلحہ وقت پر حاصل کرسکی اور جو اسلحہ خفیہ طور پر پہنچ گیا تھا، اس میں سے بھی ایک گولی جنگی محاذ پر دفاع میں نہ چلائی جاسکی۔

ریاستی حکام کی سیاسی بصیرت اور فوجی دیوالیہ پن کا حال یہ تھا کہ جنگی ساز و سامان اور اسلحہ تو کجا ریاست حیدرآباد ہندوستان کی جانب سے عائد کردہ پابندیوں کی وجہ سے روزمرہ کی اشیائے صرف تک کی قلت سے دوچار تھی۔ فوجی نقل و حرکت کے لیے پیٹرول ناپید تھا۔ لہٰذا دوسرے عام ذرائع رسل و رسائل پر مزید پابندیوں کے بعد بھی حالات نارمل نہ ہو پا رہے تھے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن ۲۱/ جون ۱۹۴۸ء کو ہندوستان کے گورنر جنرل کے عہدے سے سبکدوش ہوکر انگلستان واپس ہوئے اور ان کی جگہ شری راج گوپال اچاریہ بھارت کے نئے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ اس اثنا میں دہلی اور حیدرآباد کے درمیان سیاسی رشتے نہایت نازک مقام پر پہنچ چکے تھے اور دہلی کے باخبر حلقوں میں اندیشہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ نظام کو مزید مہلت دی گئی تو وہ پاکستان سے الحاق کا فیصلہ بھی کرسکتے ہیں اور اس طرح ہندوستان کے قلب میں ایک تازہ انٹرنیشنل تصادم کھڑا کیا جا سکتا ہے جو وادیٔ کشمیر کی صورت حال سے زیادہ گمبھیر ثابت ہو سکتی ہے۔ دلّی کے بعض حلقوں میں یہ بات بھی برسرعام کہی جا رہی تھی کہ حضور نظام سر ظفر اللہ خاں کے توسط سے مسٹر جناح سے رابطے میں ہیں۔ اس پس منظر میں دلّی کی سیاسی فضا بہت تیزی سے گرم ہوتی جا رہی تھی۔ مزید براں ریاست میں جاری تلنگانہ تحریک کی کامیابیوں کی خبر نے بھی ہندوستان کی وزارت داخلہ کو بے چین کر رکھا تھا کہ آصف جاہی حکومت ہندوستان کی چھوٹ دیے جانے کے باوجود کمیونسٹوں کو قابو کرنے میں ناکام ہو چکی تھی۔ لہٰذا بگڑتے حالات کے تحت دلّی کے حکمراں حلقوں میں یہ فیصلہ کرلیا گیا تھا کہ نومبر کے پہلے ہفتے میں ریاست حیدرآباد پر پولیس ایکشن کردیا جائے گا۔

پہلے ہندوستانی فوج کو ۱۱/ ستمبر ۱۹۴۸ء کو وجے واڑہ اور شولاپور کے راستوں سے حیدرآباد کی سرحد عبور کرنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن قائد اعظم محمد علی جناح کی اچانک رحلت کے سبب اس پیش قدمی میں دو دن کی مزید تاخیر کی گئی اور اب ۱۳/ ستمبر کی صبح تین بجے دو سمت سے ہندوستانی افواج ریاست کی حدود میں داخل ہوگئی اور تیزی سے پیش قدمی کرتے ہوئے اسی دن سہ پہر تک سرحد سے قریب تمام اہم شہروں پر قابض ہوتی چلی گئی۔ بعض مقامات پر حیدرآبادی فوج اور رضاکاروں نے کچھ دیر مزاحمت کی لیکن بہت جلد مورچے خالی کرنے پڑے۔ بعض مقامات مثلاً بیدر، عثمان آباد، لاتور وغیرہ میں ریاستی عوام نے جذبات سے مغلوب ہوکر ٹینکوں کے سامنے لیٹ کر انھیں روکنا چاہا اور اس طرح اچھا خاصا جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ تمام ضلعی صدر مقامات بغیر کسی مزاحمت کے ہندوستانی فوج نے قبضے میں لے لیے۔ دکن ریڈیو سے سیز فائر کے احکامات جاری کرنے پڑے اور ہندوستانی فوج کے لیے بلارام اور تلنگیری کی بیرکس خالی کردی گئیں۔ ہندوستانی حکومت کے ایجنٹ جنرل کے ایم منشی جنھیں چند روز قبل ایک ریسٹ ہاؤس میں نظر بند کردیا گیا تھا، آزاد کردیے گئے۔ ہندوستانی حکومت نے جنرل چودھری کو ریاست کا ملٹری گورنر مقرر کیا اور انھیں ریاست کے نظم و نسق چلانے کی ذمے داری سونپی۔ سید قاسم رضوی کو انجمن اتحاد المسلمین کے ہیڈکوارٹر سے گرفتار کرلیا گیا۔ سید لائق علی کی وزارت پہلے ہی برخواست ہو چکی تھی۔ سابق وزرا کو عارضی طور پر

مکانوں پر نظر بند کردیا گیا۔

جمہوری معاشرے کے قیام کی داغ بیل:

یکم فروری ۱۹۴۹ء کو ملٹری گورنر نے حکومتِ ہند کی جانب سے نظام حیدرآباد میر عثمان علی خاں کو لکھا کہ ریاست حیدرآباد آزاد حکومت ہند کے وفاق کا حصہ ہے اور مرکز اور ریاست کے درمیان عام معاملات حکومت ہندوستان کے دستور کے مطابق طے کیے جائیں گے اور والیِ ریاست کے آئندہ استحقاق کا فیصلہ بھی ریاست کی قانون ساز اسمبلی کے ذمے رہے گا لیکن کسی آئندہ فیصلے تک نظام کے جیب خاص، خطابات اور مراعات سے متعلق معاملات حسبِ دستور قائم اور برقرار رکھے جائیں گے۔ شاہی خاندان کے تحفظ اور جانشینی وغیرہ کے متعلق امور میں بھی والیِ ریاست کی رائے کو ضروری اہمیت دی جائے گی۔ لیکن ریاست کے نظم و نسق کو دوعملی کے نظام سے بچانے کی خاطر صرف خاص کے شعبے کو ریاست کے شعبہ دیوانی میں ضم کردیا جائے گا۔ صرف خاص کے معاوضے میں نظام کو ہر سال پچیس لاکھ روپے کی رقم ادا کی جائے گی۔

۲۵ جنوری ۱۹۵۰ء کو یعنی دستور ہند کے نفاذ سے ایک دن قبل حکومت ہند اور نظام کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت نظام کے خطابات، مراعات، امتیازات وغیرہ کے آئندہ بھی جاری رہنے کی ضمانت فراہم کی گئی۔ اور نظام کے جیب خاص کے لیے سالانہ پچاس لاکھ روپے زرِ کل پرس مقرر کیا گیا اور اس بات کا اعلان کیا گیا کہ نظام کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد، جواہرات، تمسکات اور نوادرات آئندہ بھی نظام کی ملکیت رہیں گے۔

۲۶ جون ۱۹۵۰ء کو مسٹر ایم کے ویلوڈی چیف منسٹر مقرر کیے گئے اور ان کی سرکردگی میں چھ وزراء پر مشتمل عبوری حکومت قائم کی گئی جو آصف جاہ سابع نواب میر عثمان علی خاں والیِ ریاست حیدرآباد دکن کی مطلق العنانیت کی بجائے دستور ہند کے تحت جمہوری روایت کی پابند اور پاسدار تھی۔ ہر چند نواب میر عثمان علی خاں کو تقریباً چھ برس تک بحیثیت راج پرمکھ (دستوری سربراہ ریاست) باقی رکھا گیا۔ لیکن سقوطِ حیدرآباد کے ساتھ نہ صرف دوسو سالہ آصف جاہی مطلق العنان ملوکیت کا خاتمہ عمل میں آگیا بلکہ دکن کی سرزمین سے آصف جاہی سلطنت کے پیش رو سلسلۂ ملوکیت (بہمنی سلطنت، قطب شاہی سلطنت اور مغل عہد سلطنت) کا نام و نشان بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹ گیا اور ریاست حیدرآباد کے عوام بھی ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے لوگوں کی طرح آزادی اور جمہوریت کی نعمتوں سے سرفراز ہوئے۔

بعد ازیں ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح قدیم ریاست حیدرآباد کو بھی لسانی تقسیم کے مراحل سے گزرنا پڑا۔ تیلگو، مرہٹی اور کنڑی زبانوں کی بنیاد پر اضلاع کو لسانی اکائیوں میں ضم ہونا پڑا۔ یعنی آندھرا پردیش، مہاراشٹر اور کرناٹک۔ اس طرح تلنگانہ تحریک کا پہلا بنیادی مقصد یعنی مطلق العنان ملوکیت اور بادشاہت کا مکمل خاتمہ اور آزاد جمہوری معاشرے کے قیام کی صورت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

اکثر سیاسی مبصرین کی اس رائے میں یقیناً بہت وزن موجود ہے کہ اگر مطلق العنان ملوکیت کے مکمل خاتمے اور جمہوری معاشرے کے قیام کے حق میں مذکورہ تحریک موجود نہ ہوتی تو اس بات کا پورا اندیشہ موجود تھا کہ نظام حیدرآباد، انجمن اتحاد المسلمین کی فرقہ

وارانہ جذباتیت اور حلقہ بگوش درباریوں کی ناعاقبت اندیشانہ مشاورت کے زیر اثر ریاست حیدرآباد کے سیاسی مستقبل کو بھی ریاست کشمیر کی طرح ایک بین الاقوامی تنازعے میں تبدیل کر دیتے اور آج حیدرآبادی عوام بھی اسی قتل و غارت گری اور ظلمت نصیبی کا شکار ہوتے جس سے کشمیر کے عوام گزشتہ ساٹھ باسٹھ برسوں سے دوچار ہیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں آج حیدرآباد ریاست کے عوام جدید لسانی اکائیوں میں شامل ہو کر بھی ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح ترقی و خوش حالی کی فصل کاٹ رہے ہیں۔

اس ضمن میں ریاست کے کمیونسٹوں کی بابت یہ تاثر بھی زیادہ درست نہ ہوگا کہ وہ نظریاتی طور پر آصف جاہی ملوکیت کے خاتمے کے درپے تھے۔ چنانچہ انھوں نے سیاسی حکمت عملی میں ریاست کے عوام کی قومی امنگوں اور حیدرآبادیت کے جذبات و تصورات کو برتنے میں قطعی طور پر اغماض برتا ہے۔ جہاں تک آصف جاہی ملوکیت کے مکمل خاتمے کا تعلق ہے کیمونسٹ ہی نہیں بلکہ کوئی بھی باشعور شخص اس عہد جمہور میں مطلق العنان بادشاہت کے تحفظ کی حمایت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ کیمونسٹوں سے بادشاہی نظام کے حق میں کلمۂ خیر کی توقع ہی عبث تھی لیکن جہاں تک 'حیدرآبادیت' کے قومی تصورات اور عوامی امنگوں سے گریز کرنے کے الزام کا تعلق ہے یہ بات قطعی غلط ہے اور تاریخی حقیقت کے برعکس ہے۔ بے شک کیمونسٹ اس فرسودہ جاگیردارانہ، معطل نوابی ماحول کی جگہ ایک ایسے عوامی جمہوری معاشرے کے قیام کے لیے سرگرم عمل تھے جہاں ریاست حیدرآباد کے عوام کی فلاح و بہبود اور عزت و وقار کی ضمانت دی جاسکے۔ وہ آصف جاہی سلاطین اور ان سے قبل بہمنی اور قطب شاہی عہد میں کیے گئے بعض اچھے کاموں کی تحسین بھی کرتے رہے خاص طور پر اردو زبان و ادب کے لیے ریاست حیدرآباد کی خدمات سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے، لیکن حقیقت بین اور باشعور لوگ اردو زبان اور مسلم ثقافت کی ترقی کے ساتھ اس علاقے میں آباد دوسری تہذیبوں اور ثقافتوں مثلاً تیلگو، مراٹھی اور کنڑی بولنے والوں کے لیے بھی اسی قدر تحفظ اور ترقی کے مواقع چاہتے تھے۔ وہ حیدرآباد کی آزادی اور ترقی سے کمیٹڈ تھے اور ان کا یہی وہ کمٹمنٹ تھا جو بعد میں لسانی بنیادوں پر تشکیل پانے والی نئی جغرافیائی اکائیوں یعنی آندھرا پردیش، مہاراشٹر اور کرناٹک کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ یہ تلنگانہ تحریک کا صرف ایک پہلو تھا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا تلنگانہ تحریک کا بنیادی مقصد سرزمین دکن کو صدیوں سے قائم فرسودہ جاگیردارانہ نظام معیشت سے آزادی دلانا تھا تاکہ نسلوں اور پیڑھیوں سے آباد کاشت کار اور غریب عوام کو جو ہمیشہ استحصالی چکیوں کے پاٹوں بیچ پستے چلے آتے تھے، ایک آزاد اور جمہوری معاشرے کے ذمے دار فرد ہونے کا افتخار بھی حاصل کر سکیں۔ چنانچہ آصف جاہی سلطنت کے خاتمے کی تحریک ریاست میں جاگیرداری کے استحصالی نظام کے خاتمے سے بھی عبارت تھی اور تحریک کے ان دونوں پہلوؤں اور مقاصد کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

تلنگانہ تحریک ۱۹۴۸ء کے بعد:

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ تلنگانہ تحریک کے دو بنیادی مقاصد تھے۔ پہلا مقصد سرزمین دکن سے آصف جاہی مطلق العنان ملوکیت کا مکمل خاتمہ اور ریاست حیدرآباد کو درحقیقت میں بھی ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح ایک آزاد و جمہوری معاشرے کا قیام اور فروغ تھا۔ یہ مقصد کسی حد تک ہندوستان کے پولیس ایکشن (نومبر ۱۹۴۸ء) اور اس کے نتیجے میں سقوط حیدرآباد کی صورت میں کسی نہ کسی حد تک حاصل ہو گیا تھا اور اب اس بات میں کسی شبہے کی گنجائش باقی نہ رہی تھی کہ جلد ہی ریاستی عوام ایک آزاد و جمہوری معاشرے سے فیض

یاب ہو سکیں گے۔ لیکن تحریک کا دوسرا اہم مقصد یعنی سرزمین دکن سے جاگیردارانہ نظام معیشت و معاشرت کا مکمل خاتمہ ہنوز حاصل نہ ہو سکا تھا۔ ہر چند یہ دونوں مقاصد عملی جدوجہد میں اس طرح باہم مدغم ہو چکے تھے کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن ہی نہ رہا تھا۔ چنانچہ نظام سرکاری فوج، پولیس، انجمن اتحاد المسلمین کے مسلح رضاکار، جاگیرداروں، دیش مکھوں کے زرخرید غلاموں، تاڑی کے جنگلات کے ٹھیکے داروں اور ان کے دوسرے حلیفوں پر مشتمل لشکر جب تلنگانہ، مرہٹواڑہ اور کرناٹک کے کسانوں کی سرکوبی کرتے تھے تو وہ نہ صرف نظام شاہی کے بدترین دشمنوں کو کچل رہے ہوتے تھے بلکہ جاگیردارانہ نظام کو تحفظ بھی فراہم کر رہے ہوتے تھے۔ لہٰذا تلنگانہ تحریک میں شامل دونوں حریف خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ کسی ایک مقصد کا جزوی یا کلی حصول پوری تحریک کا حصول نہیں تھا۔ بے شک سقوط حیدرآباد دکن کے بعد تحریک کے سرگرم رہنماؤں میں جن میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ بھی شامل ہیں، یہ گمان ضرور پیدا ہوا تھا کہ شاہی ریاست حیدرآباد کے ہندوستان کے ساتھ انضمام کے بعد تلنگانہ تحریک کے خلاف سرکاری طاقتوں کی طرف سے مسلح مزاحمت کی شدت میں کمی ضرور آ جائے گی کیوں کہ نظریاتی اور سیاسی سطح پر کانگریس بھی جاگیرداری کا خاتمہ چاہتی ہے۔ اور توقع کی جاتی تھی کہ اس کی جانب سے کسانوں کی مسلح جدوجہد کی اگر پذیرائی نہ بھی ہو تو کم از کم اس عوامی تحریک کے خلاف ریاستی طاقت، فوج اور پولیس کی شدت پسندی میں اعتدال ضرور پیدا ہو جائے گا۔ لیکن یہ خیال تحریک کے رہنماؤں کے لیے محض خوش گمانی ثابت ہوا کیوں کہ کامریڈ رندیوے کے تجزیے کے مطابق "انڈین نیشنل کانگریس ایک قومی سوشلسٹ پارٹی نہیں ہے بلکہ وہ دراصل امپیریلسٹ قوتوں کی ایجنٹ پارٹی ہے اور ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں اس نے اپنے نظریاتی دعووں اور اعلانات کے برخلاف امپیریلسٹ طاقت سے ساز باز کیا ہے اور ادھوری آزادی پر اکتفا کرلی ہے جو عوام کے مکمل حقوق کا تحفظ نہیں کر سکتی۔ اس لیے ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کو نہ صرف کانگریس کے خلاف مورچہ بندی کرنی چاہیے اور اس کی حاصل کردہ آزادی پر قناعت کر لینے کی بجائے مکمل آزادی کے حصول کے لیے عوامی جدوجہد تیز کر دینا چاہیے جو مکمل سوشلسٹ انقلاب کے بغیر ممکن نہیں۔" کامریڈ رندیوا کی مذکورہ پالیسی دراصل اب تک کی جانے والی اس تمام سیاسی جدوجہد کی نفی کرتی تھی جو گزشتہ تین عشروں سے جاری تھی۔ مزید براں زمینی حقائق سے بھی متصادم تھی۔ لہٰذا خود سوشلسٹوں میں "رندیوا ڈاکٹرائن" کے بارے میں بے اطمینانی پائی جاتی تھی۔ راج بہادر گوڑ نے پولیس ایکشن کے بعد کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

> After the Police action in November 1948, some of us thought that we would get a breathing time. But on the one hand, we were under Rana dive's sepll and thought that India Bourgeoise had gone over irrevocably to the side of impericalism and that the police action was to strike a bargain with Nizam to jointly attack the people and on the other, the Congress Govt. at the Centre was also more keen to liquidate the Communist party than anything else.

The arms that were laid down for some time were taken up again with the summer offensive of the union forces in May 1949.[۱۳]

برطانوی محقق اور مبصر Barry Pavier نے بھی اپنے تحقیقی مقالے ''تلنگانہ تحریک ۱۹۴۴ء تا ۱۹۵۱ء" (The Telengana Movement 1944-51) میں اسی نوع کے خیالات کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ دلّی کی کانگریس حکومت نے نظام سرکار کے بارے میں جو نرم گوشہ رکھی تھی اور اس کے معاملات کو دوسری ہندوستانی ریاستوں سے مختلف انداز میں طے کرنا چاہتی تھی، اس میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی چشم ابرو کی اشارات ضرور شامل تھی لیکن بڑی وجہ ریاست کے دیہی علاقوں میں کسانوں کی مسلح جدوجہد کی بابت آنے والی خبریں تھیں۔ دلّی کی کانگریس حکومت نظام سرکار کی فوج اور پولیس کو زیادہ سے زیادہ وقت دینا چاہتی تھی کہ وہ جلد از جلد کسانوں کی تحریک کی سرکوبی سے فارغ ہوجائے۔ لیکن جب آصف جاہی سرکار اپنی تمام تر طاقت کے باوجود کمیونسٹوں کو کچلنے میں ناکام نظر آنے لگی تھی تو ہندوستان کی نوزائیدہ حکومت کو بھی پولیس ایکشن کا فیصلہ کرنا پڑا تھا جس کا پہلا مقصد نظام حیدرآباد کو کسی ایسے ناگہانی فیصلے سے فوری طور پر روکنا تھا جو ہندوستان کی حکومت کے لیے مصائب کا سبب بن سکے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کانگریس حکومت دکن میں کسی بھی ایسی مسلح انقلابی جدوجہد اور تحریک کو برداشت کرنے کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی جس کے اثرات قرب و جوار کے ہندوستانی علاقے پر بھی پڑتے ہوں۔ تلنگانہ کی تحریک پر تو سیدھے سیدھے کمیونزم کی چھاپ لگ چکی تھی۔ اور یہی ایک بات کانگریس میں شامل نیشنل بورژوازی کے لیے بھی قابل قبول نہ تھی۔ چنانچہ پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد میں متعین فوجی گورنر کو جو ہدایات جاری کی گئی تھیں ان میں ریاست کی حدود میں بڑھتی ہوئی بدامنی، بغاوت اور کسانوں کی مسلح جدوجہد کو کچل دینے کی ہدایات سرفہرست تھیں۔

اگست ۱۹۴۸ء کو کے ایم منشی (جو ریاست میں دلّی کانگریس حکومت کے ایجنٹ مقرر ہوئے تھے) نے ہندوستان کی وزارت داخلہ کو جو رپورٹ بھیجی تھی اس میں تلنگانہ تحریک اور دکن میں اس کے مضرت رساں وسیع اثرات کی بابت تفصیل سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''ہمیں ریاست میں فوری طور پر شدید مراحل کا سامنا ہے۔ پہلا مرحلہ انجمن اتحاد المسلمین کے رضا کاروں کی دہشت گردی سے نجات پانے کا ہے لیکن خیر یہ کوئی ایسی مشکل بات بھی نہیں جس کا حل نہ ہو، لیکن دوسرا مشکل ترین مرحلہ کمیونسٹ پارٹی کی جدوجہد اور اس کی حکمت عملی سے تعلق رکھتا ہے کہ اس کے اثرات اور نتائج صرف ریاست حیدرآباد تک محدود نہیں رہیں گے بلکہ کمیونزم کے اثرات پورے جنوبی ہندوستان کو اپنی گرفت میں لے لیں گے۔ اس خطرناک کمیونسٹ حکمت عملی سے اگر فوری طور پر اور مؤثر انداز میں نہ نمٹا گیا تو ہندوستان کی نوزائیدہ قومی حکومت کے لیے وبال جان بن جائے گی۔"[۱۴]

برطانوی مؤرخ اور مبصر Barry Pavier نے اپنے مذکورہ مقالے میں مزید لکھا ہے کہ انڈین کمیونسٹ پارٹی ابتدا ہی سے یونائیٹڈ آندھرا اسٹیٹ کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانا چاہتی تھی جس کے لیے اس نے مدراس پریذیڈنسی کے ان ساحلی علاقوں سے جن کی سرحدیں آندھرا سے ملتی تھیں کسان تحریکوں کو منظم کر رکھا تھا۔ تلنگانہ تحریک کی کامیابی مدراس اور دوسرے سرحدی علاقوں میں کسان بغاوتوں کو جنم دے سکتی تھی۔ یہ وہ خدشات تھے جنھوں نے کانگریس حکومت کو تلنگانہ میں جاری مسلح کسان جدوجہد کے خلاف قوت آزمائی پر مجبور کردیا تھا۔ پولیس ایکشن کی بابت کمیونسٹ پارٹی کے مختلف حلقوں میں مختلف ردعمل ہوا تھا۔ گولکنڈہ ڈسٹرکٹ کے باہر مصروف بعض

کمیونسٹ یونٹوں نے اپنے ہتھیار زمین میں دفن کرکے گھروں کی راہ لی تھی کہ چند ہفتے رک کر کانگریس حکومت کی حکمتِ عملی کا جائزہ لے لیا جائے۔ اور اس اثنا میں بعض یونٹ ایسے بھی تھے جنھوں نے حیدرآباد کی پسپا ہوتی ہوئی فوجیوں سے ان کے ہتھیار اور راشن چھین چھین کر جمع کرنا شروع کردیا تھا۔ پانچ ہزار افراد پر مشتمل ایک مشتعل ہجوم نے سوریا پیٹ کے دیش مکھ دیتا ریڈی، پرتاپ ریڈی کے بنگلے پر دھاوا بول دیا اور اسے جلا کر خاک کردیا تھا۔ اسی طرح ورنگل ڈسٹرکٹ کے دیش مکھ نے اپنی حویلی پر کئی ماہ سے مسلح پولیس کی نفری جمع کر رکھی تھی۔ پولیس ایکشن کی خبریں سن کر مقامی کسانوں کے دو جتھوں نے اس کی حویلی پر دھاوا بول دیا اور چھت پر پہرہ دیتے ہوئے پولیس والوں کو جلا کر مار ڈالا اور ظالم دیش مکھ کو خودکشی کرلینی پڑی۔ اس کا بھائی رگھوا ریڈی چھپتا چھپاتا گاؤں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا لیکن بالآخر گاؤں والوں نے اسے ڈھونڈ نکالا اور ہلاک کردیا۔ رضاکار کیمپوں پر کسانوں کی ٹولیوں نے دھاوے بولے تھے اور کیمپوں سے انھیں اچھا خاصا غلہ اور ہتھیاروں کا ذخیرہ ہاتھ لگا تھا۔ بعض مقامات پر جہاں رضاکار خوش دلی کے ساتھ ہتھیار پھینک دیتے، وہاں انھیں واپسی کا محفوظ راستہ دے دیا جاتا تھا۔ غرض ریاست پر ہندوستان کے پولیس ایکشن نے تلنگانہ تحریک پر بالواسطہ اور بلاواسطہ کئی اثرات مرتب کیے تھے۔ بعض علاقوں میں جہاں کھاتے پیتے زمین داروں کی نوجوان پود محض نظام حیدرآباد کے خلاف جدوجہد میں آکر شریک ہوئے تھے، سقوطِ حیدرآباد کے بعد تحریک چھوڑ کر شہری زندگی کی طرف واپس لوٹ گئے تھے۔

نلگنڈہ ڈسٹرکٹ میں مصروفِ پیکار کمیونسٹ یونٹوں نے جہاں پولیس ایکشن کی مخالفت نہیں کی تھی، وہیں انھوں نے اپنی مسلح جدوجہد بھی ترک نہ کی تھی، اور جاگیرداروں، زمین داروں اور دیش مکھوں کی فاضل زمینیں چھین چھین کر بے زمین کاشت کاروں میں تقسیم کرنے کے عمل کو بھی جاری رکھا تھا۔ انھوں نے خاص طور پر زمین پر کام کرنے والے محنت کشوں کی ایک طاقت ور فوج بنا رکھی تھی اور پہلی مرتبہ ان میں یہ شعور پیدا کیا تھا کہ ان کی محنت کا معقول معاوضہ ملنا چاہیے۔ اور اس دورِ جمہور میں بلا اجرت بیگار بدترین غلامی کے سوا کچھ نہیں جس سے فوری نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ سوریہ پیٹ، نلگنڈہ، حضور نگر وغیرہ میں کھیت مزدوروں کے ایسے جتھے موجود تھے۔ جن کی آبادکاری پر پہلی مرتبہ توجہ دی جارہی تھی۔ کمیونسٹوں کے ایک حلقے میں یہ خیال بھی تھا کہ شاید انڈین فوج دریں حالات کسی نہ کسی سمجھوتے کی صورت نکالے گی اور براہِ راست نہتے کسانوں پر تشدد کرنے سے باز رہے گی لیکن یہ سب توقعات غلط ثابت ہوئیں اور صرف چند ہفتے بعد ہی انڈین فوج تلنگانہ کے علاقے میں اس طرح داخل ہوئی تھی کہ اس کے جلو میں نظام شاہی کے منظورِ نظر دیش مکھوں اور جاگیرداروں کے گروہ تھے جن سے کمیونسٹوں نے زمین چھین کر بے زمین کاشت کاروں میں تقسیم کی تھیں۔ انڈین فوج کا سب سے پہلا مطالبہ یہی تھا کہ دیش مکھوں سے چھینی ہوئی زمینیں بلا عذر ان کے حوالے کی جائیں۔ ظاہر ہے یہ ایک مشکل صورتِ حال تھی اور جس کے نتیجے میں انقلاب کی راہ میں مصروفِ عمل عوام اور ہندوستانی فوج کے درمیان کشیدگی اور چھاپہ مار کارروائی میں اضافہ ہوگیا اور انقلابی دستوں نے دشوار گزار جنگلات میں اپنے مورچے بنالیے تھے جہاں فوجی سپاہیوں کو داخل ہونے سے پہلے کئی بار سوچنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ہندوستانی فوج نے بھی وہی حکمتِ عملی اختیار کی تھی جو عام طور پر فوج اور پولیس عوامی جدوجہد کے خلاف کیا کرتی ہے یعنی وہ دس دس پندرہ پندرہ دیہاتوں کا محاصرہ کرلیتے اور گھر گھر تلاشی کی مہم شروع کی جاتی۔ دس بارہ برس سے زیادہ کا شاید ہی کوئی نوجوان (جو پہلے ہی انقلابی مورچوں میں شامل نہ ہوگئے ہوں) ایسا ہو جو فوجی کارروائی کے زد میں نہ آیا ہو۔ جس شخص پر بھی انقلابی

ہونے کا شبہ ہو جاتا، بغیر کسی کارروائی کے قید میں ڈال دیا جاتا۔ صرف چند ہفتوں کی مختصر سی مدت میں تلنگانہ کے مختلف اضلاع سے دسمبر ۱۹۴۸ء کے اواخر تک دس ہزار سے زائد لوگ جیلوں میں ٹھونسے جا چکے تھے اور کم و بیش پانچ سو افراد کمیونسٹوں کے حلیف ہونے کے شبے میں قتل کیے جا چکے تھے۔ لوٹ مار، آتش زنی، خوف و ہراس اور دہشت گردی کے وہ سب ہتھکنڈے جو اس سے قبل ریاستی فوج پولیس اور رضاکاروں سے مخصوص سمجھے جاتے تھے، ہندوستانی فوج کو بھی مرغوب تھے۔ ایک اندازے کے مطابق صرف چند ماہ میں پچاس ہزار سے زیادہ مسلح فوجی دستے تلنگانہ کی عوامی تحریک کی سرکوبی پر مامور کیے گئے تھے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ انڈین فوج کی منظم کارروائی بھی تلنگانہ تحریک کو خاطر خواہ زک پہنچانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔[۱۵]

ریاست حیدرآباد کی فوج کے کمانڈر انچیف العیدروس کے مطابق ''کسانوں کی چھاپہ مار کارروائیاں جو وہ گھنے جنگلات سے نکل کر کیا کرتے تھے، کسی فوجی حکمت عملی سے قابو میں نہ آ سکی تھیں اور تلنگانہ کا بیشتر علاقہ میں بلا شرکت غیرے کمیونسٹوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ انھوں نے پورے علاقے کو یونٹوں اور سیلوں (Cells) میں تقسیم کر رکھا تھا جن کی تنظیمی ساخت ہمیشہ بہت مضبوط ہوتی ہے دیہاتوں اور قصبات میں مقامی آبادیوں پر مشتمل پنچایتیں روزمرہ کے نظم و نسق اور معاملات کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں وہ امداد باہمی کے اصول پر کام چلاتے تھے۔ مجرمانہ سرگرمیاں جن میں بلّی ویز ڈکیتیاں، چوری چکاریاں، اور چھوٹے موٹے جرائم ناپید ہو چکے تھے۔ لوگ اپنی مرضی سے ایک مقام سے دوسرے مقام بلا روک ٹوک جا سکتے تھے۔ گاؤں اور بستیوں کے مکین خود کو محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ یہ صورت حال مکمل عوامی ہمدردی، تعاون اور شراکت کے بغیر پیدا نہ ہو سکتی تھی کیوں کہ لوگ جانتے تھے کہ یہ سب کچھ خود ان کی بھلائی اور بہبود کے لیے کیا جا رہا تھا۔

''تحریک کے رہنماؤں نے علاقے کی خواتین کو باشعور بنانے اور ان میں عزت نفس کا احساس پیدا کرنے میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب گاؤں کے مرد تحریک کے لیے عملی جدوجہد میں پیش پیش تھے، علاقے کی عورتیں گاؤں کے انتظامی معاملات پر نگاہ رکھتی تھیں۔ علاقے میں جہاں جہاں غلہ چارے یا پانی کی کمی کا احساس ہوتا، وہاں کمیونسٹوں کی کمک کسی بھی پریشانی سے پہلے پہنچ جاتی تھی۔ کمیونسٹوں نے علاقے میں ایک ایسا زبردست عوامی کمیونی کیشن سسٹم بنا رکھا تھا کہ ایک علاقے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ جاتی تھی اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ سارا نظام قطعی طور پر عوامی اور مقامی نوعیت کا تھا جس میں بیرونی معاونت شامل نہ تھی۔ بلاشبہ تلنگانہ اور ریاست کے دوسرے دیہی علاقوں میں کمیونسٹوں کی حکومت قائم تھی جسے وہ اپنے ضابطوں، اصولوں اور قوانین کے تحت چلا رہے تھے۔ لیکن تلنگانہ تحریک کی کامیابی کا سارا دار و مدار بے لوث عوامی جدوجہد اور غیر معمولی مضبوط قوت ارادی پر تھا۔''

جنرل العیدروس نے مزید لکھا ہے کہ ''خود انڈین فوج کو اپنی تمام تر فوجی قوت، جنگی مہارت اور اسباب رسل و رسائل کی فراوانی کے باوجود ڈھائی برس تک اس تحریک کے خلاف کامیابی نصیب نہ ہو سکی تھی۔ یہ درست ہے کہ ہندوستانی فوج نے جہاں تلنگانہ تحریک کی قوت کو ختم کرنے میں غیر معمولی سرگرمی دکھائی تھی، وہیں اس نے ریاست کے اندرونی علاقوں میں سڑکوں اور پیراجوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ علاقے کو خودرو جنگلات سے صاف کرنے کی مہم بھی چلائی تھی جس کی وجہ سے کمیونسٹوں کی سرگرمیوں میں اضمحلال پیدا ہوا

تھا۔ لیکن اپنی بے بضاعتی کے باوجود کمیونسٹوں نے مسلح چھاپہ مار کارروائیوں سے انڈین فوج کو چین سے نہ بیٹھنے دیا تھا۔ کمیونسٹوں کے پاس فوج کی طرح اسلحے کی فراوانی تو نہ تھی لیکن اچھا خاصہ اسلحہ حاصل تھا جن میں سے بیش تر سرکاری اسلحہ خانے سے لوٹا گیا تھا اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے بھی فراہم کیا جا رہا تھا۔"[19]

دس لاکھ ایکڑ زمین کی تقسیم:

ہر چند ۱۹۵۱ء-۱۹۵۰ء کے اواخر تک تلنگانہ تحریک ریاستی جبر اور ہندوستان کی فوج کشی کے باوجود ریاست کے عام دیہی علاقے کو اپنے حصار میں لے چکی تھی اور اس مدت میں تلنگانہ تحریک دس لاکھ ایکڑ زمینوں کو جاگیرداروں، دیش مکھیوں اور استحصال کے نمائندوں سے چھین کر بے زمین کاشت کاروں میں تقسیم کر چکی تھی۔ پندرہ ہزار مربع میل پر محیط وسیع و عریض رقبہ جس میں لگ بھگ چوبیس ہزار چھوٹے بڑے گاؤں، دیہات، قصبے اور شہر واقع تھے اور کم و بیش چالیس فی صد ریاستی آبادی براہ راست تحریک کے حلقۂ اثر میں آ چکی تھی، لیکن جیسے جیسے تحریک کی وسعت اور پھیلاؤ میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، ویسے ویسے تحریک کے رہنماؤں کے سامنے نظم و نسق کے بہت سے مسائل پیدا ہوتے جاتے تھے۔ اور آزاد کرائے گئے علاقوں میں باقاعدہ نظم و نسق اور ریاستی ڈھانچے کے متبادل اداروں کی عدم موجودگی کا احساس شدت سے پیدا ہو رہا تھا۔ ایک منظم معاشرے میں بندوبست اراضی کے علاوہ کئی دوسرے معاملات بھی ہوتے ہیں جنھیں چلانے کے لیے ریاستی ڈھانچے اور انتظامی ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے۔ عارضی طور پر تو امداد باہمی کی بنیاد پر بھر دو پیمانے پر کام چلایا جا سکتا ہے لیکن چند روز، چند ہفتوں اور چند ماہ کے بعد ہی ایک دیرپا انتظام کی عدم موجودگی کا احساس ساری فتوحات کو پھیکا بنا رہی تھی اور تجربے نے یہ بات سکھا دی تھی کہ دیرپا انقلاب وسیع البنیاد پلاننگ، حکمت عملی، متبادل انتظامی اداروں کے قیام اور متبادل طریقہ ہائے نظم و نسق کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔ چنانچہ تلنگانہ تحریک کے رہنماؤں میں بھی یہ احساس پیدا ہو رہا تھا کہ مقامی طور پر جاگیردارانہ معیشت کا خاتمہ ایک چیز ہے اور مکمل طور پر کمیونسٹ انقلاب قطعی مختلف بات۔ مزید برآں تلنگانہ تحریک کے رہنماؤں میں بھی اختلاف رائے جو پہلے ہی سے چلا آتا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نمایاں ہوتا گیا اور ہندوستان کی جمہوری حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد بے جواز دکھائی دینے لگی کیوں کہ جاگیرداری کا مکمل خاتمہ کانگریس کے اپنے پروگرام میں بھی شامل تھا۔ لیکن چونکہ تحریک کا سارا دارومدار عوام کے انقلابی جوش و خروش پر تھا اور کمیونسٹ رہنماؤں کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ تحریک کو بیچ منجھدار میں چھوڑ کر پارٹی پالیسی کی وجہ سے دامن جھاڑ کر الگ کھڑے ہو جاتے۔ پارٹی میں اس خیال کی پذیرائی بھی ہو رہی تھی کہ تلنگانہ کے مسائل سیاسی بات چیت کے ذریعے حل کرائے جائیں نہ کہ مسلح جدوجہد کے ذریعے۔ چنانچہ انھوں نے ڈاکٹر این ایم جے سوریہ کو اختیار دیا کہ وہ کانگریس سے ایسے سمجھوتے کے لیے بات چیت چلائے جس کے نتیجے میں دس لاکھ ایکڑ زمین کو جو بے زمین کاشت کاروں میں پہلے ہی تقسیم کر دی گئی ہے قانونی تحفظ حاصل ہونے کے ساتھ علاقے سے دیش مکھیوں، جاگیرداروں اور ساہوکاروں کے مظالم کا خاتمہ ہو جائے۔ اور بیگار کے ساتھ غریب مریجن قبیلوں کو بھی عام لوگوں کی طرح جمہوری حقوق حاصل ہو جائیں۔ اس خیال کے برعکس کامریڈ بدی ملاوے اور ان کے بعض ساتھیوں کا خیال تھا کہ صدیوں سے قائم جبر کو مسلح جدوجہد ہی کے ذریعے ختم کیا جا سکتا ہے۔

ابتدا میں مخدوم محی الدین اور راج بہادر گوڑ بھی بدی ملاوے اور دوسرے کامریڈوں سے اتفاق کرتے ہوئے مسلح جدوجہد کے

طرف داروں میں تھے۔ تلنگانہ تحریک میں 'نلگنڈہ گروپ' جس کے رہنما مخدوم محی الدین تھے، کا حصہ کسی بھی دوسرے یونٹ سے زیادہ ہی تھا۔ لیکن عالمی سیاست میں رونما ہونے والی تبدیلیوں، ہندوستان میں جمہوری معاشرے کے قیام اور نیشنل بورژوازی کے ساتھ اتحاد و عمل کے ذریعے ملک میں صنعتی معیشت کو جدید خطوط پر منظم کرنے جیسے سیاسی مسائل اور ان کی بابت کمیونسٹ پارٹی کے لائحۂ عمل کی روشنی میں کم وبیش سب ہی کمیونسٹ رہنما تلنگانہ تحریک کے معاملات پر بالاخر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگے تھے۔ چنانچہ راج بہادر گوڑ نے لکھا ہے کہ ۱۹۵۰ء کے وسط سے مخدوم محی الدین اور ان کے ساتھی روی نارائن ریڈی، چودھری راجیشور راؤ وغیرہ کے نکتۂ نظر پر ہمدردی کے ساتھ غور کرنے لگے تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی ایسا سیاسی حل نکالا جائے جس کے تحت تحریک سے حاصل کردہ مقاصد کو نقصان بھی نہ پہنچے اور عوامی توقعات کو نئے سیاسی پروگرام کے تحت روبہ عمل لانے کی صورت باقی رکھی جائے۔

اسی اثنا میں راج بہادر گوڑ راچ کنڈہ کے پہاڑی علاقے سے گرفتار کر لیے گئے۔ اور مخدوم محی الدین، روی نارائن ریڈی اور بعض دوسرے رہنما بمبئی کے آس پاس کے علاقے میں روپوش رہے۔ تحریک کے سرگرم لیڈروں کو شہری آبادیوں سے نکال کر محفوظ گھنے جنگلات کی پناہ گاہوں میں پہنچا دیا گیا تھا تا کہ تحریک کے التوا کی صورت میں کم از کم نقصان اٹھانا پڑے۔ کمیونسٹ پارٹی اس وقت ایک عجیب مخمصے کا شکار تھی اور اس کے لیے اس دوراہے سے پھوٹنے والے کسی ایک راستے کا انتخاب آسان نہ تھا۔ چنانچہ تلنگانہ تحریک کی مسلح جدوجہد کے حق میں اور مخالفت میں ہر طرح کے دلائل پیش نظر تھے۔ اور کسی آخری نتیجے پر پہنچنے کی تگ و دو جاری تھی، اسی دوران مخدوم مئی ۱۹۵۱ء میں گرفتار کر لیے گئے تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں حسن اتفاق سے حیدرآباد سینٹرل جیل میں بی یلا ریڈی، چندرا گپتا، چودھری راجیشور راؤ اور متعدد دوسرے کامریڈ زنج ہو گئے تھے جہاں تلنگانہ کی مسلح جدوجہد کے لیے مستقبل پر زور شور سے مباحثہ جاری تھا۔ بالعموم پارٹی کی سینئر لیڈرشپ مسلح جدوجہد کے التوا کے حق میں تھی جن میں کامریڈ جوالا سوا کامریڈ منظور احمد اور اے کے گوپالن جیسے رہنما بھی شامل تھے۔ جن کے درمیان تحریک کی مسلح جدوجہد کے التوا کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ نلگنڈہ یونٹ سے وابستہ رہنماؤں کو جو اب تک تحریک کے ہراول دستے میں شامل تھے، آہستہ آہستہ علاقے سے تبدیل کر دیا گیا۔ سرگرم کارکنوں کی کثیر تعداد کو گھنے جنگلات کی پناہ گاہوں میں منتقل کر دیا گیا۔ میدانی علاقوں کے سرگرم یونٹ کو وقتی طور پر معطل کر دیا گیا تھا اور ممکن حد تک دیہی علاقے میں خیر سگالی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ہر چند تحریک کی پسپائی کا سفر نہایت احتیاط اور غیر محسوس انداز میں کیا جا رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس عمل میں تحریک ہی نہیں بلکہ کمیونزم کے سیاسی حلقۂ اثر کو غیر معمولی نقصانات اور صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔ گرام راج کمیٹیاں جن کا پورے تلنگانہ میں جال پھیلا ہوا تھا، یک لخت توڑ دی گئیں اور سرگرم کارکنوں کو مدافعتی اقدام اختیار کرنے کی ہدایات جاری کر دی گئیں۔ اتنی وسیع البنیاد اور مؤثر تحریک کو یوں ختم کر دینے کی حکمت عملی عام لوگوں کے لیے قطعی قابل قبول نہ تھی۔ چنانچہ جوشیلے عوام کے اکا دکا جتھے جنگلات میں جا چھپے تھے اور وقت بے وقت انڈین فوج اور ریاستی اداروں پر حملہ کیا کرتے تھے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستان کی فوج نے تلنگانہ سے کمیونسٹ اثرات کے مکمل خاتمے کی مہم چلائی۔ ہندوستانی فوج نے تحریک کے زمانے میں ہونے والی بے زمین کاشت کاروں کی آبادکاری کو جو بیشتر غیر آباد زمین پر کھیتی باڑی کر رہے تھے، جیسے تیسے رہنے دیا اور مزید زمینات کا سروے کر کے ان پر کاشت کاری کی حوصلہ افزائی کی جس سے علاقے میں پھیلی ہوئی بے کاری اور غربت کا کسی حد تک سدباب ممکن ہو سکا۔ ہندوستانی

انتظامیہ پہلے ہی جاگیرداری کے مکمل خاتمے کے عزم کا اعلان کرچکی تھی۔ چنانچہ چھینی زمینیں اور بڑے زمیں داروں، دیش مکھوں سے حاصل کی ہوئی اراضیات کے معاملات بھی نمٹائے گئے اور بڑے زمیں داروں اور دیش مکھوں کی وسیع وعریض لینڈ ہولڈنگ میں مناسب قطع برید کی گئی۔ کمیونسٹ پارٹی کے پاپولر فرنٹ میں شامل بڑے اور متوسط زمیں دار جو نظام کے خلاف تحریک میں CPI کے ساتھ تھے، انھوں نے اپنے مستقبل کی حفاظت کے خاطر ہندوستانی فوج اور سول ایڈمنسٹریشن سے رشتے قائم کرنے شروع کردیے تھے۔

تلنگانہ تحریک کی پسپائی نے دکن میں مجموعی طور پر کمیونزم کے اثرات کو اس قدر مضمحل کردیا تھا کہ مارچ ۱۹۴۹ء میں پارٹی کی منظور کردہ نیشنل ریلوے ہڑتال کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ صورتِ حال تحریک کے زمانۂ عروج سے کس قدر مختلف اور تکلیف دہ تھی جب کمیونسٹ پارٹی کی سینئر لیڈرشپ سوچ رہی تھی کہ تلنگانہ تحریک کی مسلح جدوجہد کو ہندوستان کے دوسرے خطوں یعنی مدراس، ٹراونکور، کیرلہ، بمبئی اور گجرات کے علاقوں میں بھی پھیلا دیا جائے کہ اس وقت کی کمیونسٹ لیڈرشپ (Ranadive) کانگریس کی نیشنل حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کو پارلیمانی طریق کار سے افضل خیال کرتی تھی جس کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان کی بائیں بازو کی سرگرمیوں میں انتہاپسندی کی لہریں پیدا ہورہی تھیں جس نے مجموعی طور پر بائیں بازو کی تحریک کو غیرمعمولی نقصانات پہنچائے ہیں۔

برطانوی مبصر Barry Pavier کے مطابق ''موجودہ لیڈرشپ (ڈانگے، اجے گھوش وغیرہ) پارلیمانی الیکشن میں مؤثر طور پر شرکت کرنے کی خاطر تلنگانہ تحریک کو قربانی کی بھینٹ چڑھا دینا چاہتے تھے جس کے لیے پارٹی کو عوامی انقلاب، پرولتاریت کی ڈکٹیٹرشپ وغیرہ جیسے نعروں سے گریز کرنا پڑا۔ اور غیرطبقاتی انقلاب کی راہ ترک کرکے بورژوازی پارلیمانی نظام کو گلے لگانا پڑا اور تنظیمی اعتبار سے منظم کل وقتی لیڈر پارٹی کو ماس پارٹی میں تبدیل کرنے کی حکمت عملی اختیار کرنی پڑی۔ مسلح جدوجہد کے اچانک خاتمے نے صرف کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم پر منفی اثرات نہ ڈالے تھے بلکہ کمیونسٹوں کے حلقۂ اثر کو بھی بری طرح متاثر کیا تھا۔ وہ لوگ جو ابھی تک گھنے جنگلات میں روپوش تھے اور اکثر چھاپہ مار کارروائی میں مصروف بھی تھے، شدید فرسٹریشن کا شکار ہوئے اور انھوں نے پارٹی کے حکم پر ہتھیار ڈالنے کی بجائے اپنے طور پر جدوجہد جاری رکھنے کو ترجیح دی۔ جو ظاہر ہے زیادہ عرصے جاری نہ رہ سکی۔

دراصل تلنگانہ تحریک ایک اعتبار سے ملٹی کلاس تحریک بھی تھی جو بورژوا جاگیرداریت اور استحصالی نمائندہ کردار اور دیش مکھیوں کے خلاف چلائی گئی تھی اور جس میں معاشرے کے ہر اس طبقے نے حصہ لیا تھا جو کسی بھی انداز میں استحصال کا شکار ہوا تھا۔ چنانچہ نسبتاً خوش حال کاشت کار، متوسط طبقے کا چھوٹا زمیں دار، چھوٹی چھوٹی کاشت کاریوں کے مالک کسان بھی اس جنگ میں شامل تھے لیکن جس بڑے اور مؤثر پیمانے پر بے زمین کاشت کار اور زرعی مزدوروں، محنت کشوں، بیگار، غربت کے مارے ہوئے ستم رسیدوں نے اس تحریک میں حصہ لیا تھا، اس کی مثال دنیا کے دوسرے علاقوں کے کسانوں کی تحریکوں میں کم دیکھنے میں آیا ہے۔ مثلاً بنگال کی کسان تحریک جو عرفِ عام میں ''تیبھاگا'' کی تحریک (Tebhaga Movement) کہلاتی ہے اور جس کا آغاز ۱۹۴۳ء کے لگ بھگ ہوا تھا، تلنگانہ تحریک کے مقابلے میں بہت جلد ناکامی سے دوچار ہوگئی تھی۔ تیبھاگا تحریک کی رہنمائی بنگال کے معروف کسان رہنما ''بھوانی سین'' کررہے تھے اور اس کے بنیادی مقاصد میں کاشت کاروں کو زرعی پیداوار میں ملنے والے حصۂ رسد میں اضافے کے ساتھ ساتھ چند ضروری مراعات کا حصول بھی شامل تھا۔ تلنگانہ تحریک تیبھاگا تحریک کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع البنیاد، بڑی، مؤثر اور پرجوش تھی۔

تیبھاگا تحریک کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ دوسری جنگِ عظیم میں روس کی شمولیت کے بعد پارٹی پالیسی میں تبدیلی تھی کہ ابتدا سے کمیونسٹوں نے اس تحریک میں زبردست سرگرمی دکھائی تھی لیکن بعد میں سیاسی مصلحت اندیشی کی وجہ سے انھوں نے غریب اور مظلوم کاشت کاروں کو تنہا چھوڑ دیا تھا جب کہ تلنگانہ تحریک کے رہنماؤں نے ریاست میں جمہوری معاشرے کے قیام اور جاگیردارانہ معیشت کے خاتمے کو اپنے اوّلین مقاصد قرار دیا تھا اور وہ آخر تک اپنے مقاصد سے وابستہ رہے۔ مزید یہ کہ تلنگانہ تحریک کسی پیشگی سیاسی پلاننگ کے نتیجے میں شروع نہ ہوئی تھی بلکہ صدیوں سے جاری مظالم نے معروضی صورتِ حال کے دباؤ کے تحت اس قدر پُرجوش سریع الاثر اور تیز رفتار کر دیا تھا کہ رہنمائی کرنے والوں کو وقت کے تیز رفتار دھارے کے خلاف تیرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ نلگنڈہ ڈسٹرکٹ کمیٹی جو شروع ہی سے تلنگانہ تحریک کے ہراول دستے میں شامل تھی پارٹی لائن کی پیروی کرنے کی بجائے معروضی حقائق اور بنیادی معاشی و سیاسی اصولوں سے رہنمائی حاصل کرتی تھی اور انڈین کمیونسٹ پارٹی میں شامل وہ عناصر بھی جو اپنی عالمی اور قومی سیاست کے پیشِ نظر تحریک کو قابو میں رکھنے کی خواہش رکھتے تھے، عوامی شعور، جوش اور جذبے کے سامنے بے بس دکھائی دیتے تھے۔ مزید یہ کہ ہندوستان میں ابھرنے والی دوسری کسان تحریکوں کے برعکس تلنگانہ تحریک نے کسانوں کے مسئلے کو مجموعی معاشی، معاشرتی اور سیاسی منظرنامے کا حصہ بنا دیا تھا اور شہری و دیہی علاقوں میں بیک وقت عوامی بیداری پیدا کر کے دونوں کی علاقوں کی سرگرمیوں میں معنی خیز ارتباط پیدا کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلح جدوجہد کے التوا کے باوجود تلنگانہ تحریک کے اثرات آج بھی قائم چلے آتے ہیں۔

مزید برآں اس تحریک کو صنعتی مزدوروں اور بائیں بازو سے ہمدردی رکھنے والے جمہوریت پسند شہریوں سے بھی بالواسطہ اور بلاواسطہ قوت پہنچتی رہی تھی جو بجائے خود ایک اہم تنظیمی طاقت بن کر ابھری۔ چنانچہ تلنگانہ تحریک کا تجربہ خالص کسان تحریک کی بجائے اسے تاریخ کے ایک خاص دور میں عام لوگوں کی سیاسی جدوجہد کے اعتبار سے بھی دیکھنا ہوگا جس نے عوام کے سیاسی شعور اور سماجی انقلاب کی ضرورت کے احساس کو عملی پیرایہ اظہار اختیار کرنے میں مدد دی تھی۔"

Barry Pavier کے تبصرے کے مطابق، اس میں کوئی کلام نہیں کہ ابتدا میں آندھرا مہا سبھا اور کمیونسٹ پارٹی کے کارکن کھاتے پیتے گھرانوں اور اوسط زراعتی خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن یہ بات بھی واضح نظر آتی ہے کہ وقت کے ساتھ تحریک کے کردار میں بھی تبدیلی آتی ہے جو لوگ ۱۹۴۸ء میں تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے ان میں سے اکثریت کا تعلق زراعتی محنت کشوں اور غریب کسانوں سے رہا تھا۔ یہی لوگ تھے جو میدانِ عمل میں سرگرمِ عمل اور مصروفِ پیکار تھے اور تحریک کی رہنمائی بھی کر رہے تھے، ان کے ساتھ ساتھ مختلف طبقے سے تعلق رکھنے والے اور کمیونسٹ پارٹی کے وہ اراکین بھی تھے جنھوں نے عملاً خود کو غیر طبقاتی کردار میں ڈھال لیا تھا اور پوری طرح تحریک کے مقاصد کو اپنا لیا تھا۔ یہ لوگ شروع سے آخر تک تحریک کی کامیابی کے لیے سرگرمِ عمل رہے تھے جب کہ دوسرے سماجی گروپ جو بعد میں تحریک میں شریک رہے تھے یا تو آخری دنوں میں ترکِ تعلق کر گئے تھے یا ۱۹۴۸ء کے بعد بے عملی کا شکار ہو گئے تھے۔

تلنگانہ تحریک ہی کے اثرات تھے کہ کمیونسٹ پارٹی کو تلنگانہ میں ہندوستان کی حکمراں کانگریس پارٹی پر واضح برتری حاصل ہوئی۔ نلگنڈہ ڈسٹرکٹ کی ساری نشستیں کمیونسٹ پارٹی کو ملی تھیں اور اسمبلی کی ایک سو چھتر نشستوں میں سے سینتالیس نشستیں کمیونسٹوں کو ملی

تھیں۔ گولکنڈہ ہی سے روی نارائن ریڈی کو تین لاکھ سے زائد ووٹ ملے تھے جس نے انھیں تمام ممبر پارلیمنٹ پر حتیٰ کہ جواہر لال نہرو پر بھی برتری دلا دی تھی۔

یہ تلنگانہ تحریک اور اس کے وسیع اثرات ہی کا نتیجہ تھا کہ صرف چند برسوں بعد کیرالہ میں دنیا کی سب سے پہلی کمیونسٹ پارلیمانی حکومت انقلاب کی بجائے انتخابی عمل کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی۔

حواشی

۱۔ علامہ ابوالفضل، ''آئینِ اکبری''، جلد اوّل (حصہ دوم)، ترجمہ مولوی محمد فدا علی طالب، مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص۹۱ تا ۱۰۱

۲۔ بیری پیوئر (Barry Pavier) *Talangana Movement* (۱۹۴۴ء۔۵۱)، وینگاس پبلی کیشن، لاہور، انٹروڈکشن ص vii, viii, ix

۳۔ ایضاً، ص۱۵

۴۔ زیڈ اے احمد (ڈاکٹر)، ''میرے جیون کی کچھ یادیں''، (خود نوشت)، ادارۂ یادگار غالب، کراچی ص۱۳۳

۵۔ دکن راج سکسینہ، ''تذکرۂ دنیا رحیدرآباد''، مطبوعہ ترقی اردو بیورو نئی دہلی، اشاعت جنوری ۱۹۸۸ء، ص۲۳۷ تا ۲۴۲

۶۔ چندر گپتا چودھری، *Marhatwara in Anti Nizam Struggle*، مشمولہ *Glorious Talangana Armed Struggle*، مطبوعہ کمیونسٹ پارٹی پبلی کیشن، نیو ایج پرنٹنگ پریس، نیو دہلی، ص۱۲۶ تا ۱۲۹

۷۔ غلام حیدر، *Participation of Muslims in Anti Nizam Struggle*، مشمولہ *Glorious Talangana Armed Struggle*، مطبوعہ کمیونسٹ پارٹی پبلی کیشن، نیو ایج پرنٹنگ پریس، نیو دہلی، ص۱۲۱۔۱۲۳

۸۔ (الف) راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر، *Hyderabad Peoples Revolt Against Nizam Autocracy, Dairy of the Struggle*، مشمولہ *Glorious Talangana Armed Struggle*، مطبوعہ کمیونسٹ پارٹی پبلی کیشن، نیو ایج پرنٹنگ پریس، نیو دہلی، ص۳۶

(ب) غلام حیدر، *Participation of Muslims in Anti Nizam Struggle*، مشمولہ *Glorious Talangana Armed Struggle*، مطبوعہ کمیونسٹ پارٹی پبلی کیشن، نیو ایج پرنٹنگ پریس، نیو دہلی، ص۱۲۹

۹۔ (الف) راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر، *Hyderabad Peoples Revolt Against Nizam Autocracy, Dairy of the Struggle*، مشمولہ *Glorious Talangana Armed Struggle*، مطبوعہ کمیونسٹ پارٹی پبلی کیشن، نیو ایج پرنٹنگ پریس، نیو دہلی، ص۱۵

(ب) غلام حیدر، *Participation of Muslims in Anti Nizam Struggle*، مشمولہ *Glorious Talangana Armed Struggle*، مطبوعہ کمیونسٹ پارٹی پبلی کیشن، نیو ایج پرنٹنگ پریس، نیو دہلی، ص۱۲۹

۱۰۔ (الف) رمن راج سکسینہ، "تذکرہ دربار حیدرآباد" مطبوعہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، اشاعت جنوری ۱۹۸۸ء، ص ۲۹۶ تا ۲۹۸

(ب) راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر، *Hyderabad Peoples Revolt Against Nizam Autocracy, Dairy of the Struggle*، مشمولہ *Glorious Talangana Armed Struggle*، مطبوعہ کمیونسٹ پارٹی پبلی کیشن، نیو ایج پرنٹنگ پریس، نیو دہلی، ص ۶۵ تا ۷۱، ص ۸۳ تا ۸۷

(ج) بیری پیوئر (Barry Pavier)، *Talangana Movement* (۱۹۴۴۔۵۱ء)، وکاس پبلی کیشن، لاہور، دی انڈپنڈنٹ حیدرآباد، ص ۱۲۷ تا ۱۳۰

۱۱۔ (الف) ایضاً، مخدوم اے میموئر، مشمولہ *Glorious Talangana Armed Struggle*، مطبوعہ کمیونسٹ پارٹی پبلی کیشن، نیو ایج پرنٹنگ پریس، نیو دہلی، ص ۲۲ تا ۳۰

(ب) سید سجاد ظہیر، "حیدرآباد میں ترقی پسند ادب کی تحریک اور مخدوم"، مشمولہ مخدوم نمبر "صبا"، حیدرآباد، ص ۳۳۹

(ج) شاذ تمکنت (ڈاکٹر)، مخدوم ترقی پسند ادب کی تحریک، مخدوم محی الدین حیات و کارنامے، مطبوعہ "شعر و حکمت"، حیدرآباد، ص ۳۹

(د) غلام حیدر، *Anti Nizam Struggle, Participation of Muslims*، مشمولہ *Glorious Talangana Armed Struggle*، مطبوعہ کمیونسٹ پارٹی پبلی کیشن، نیو ایج پرنٹنگ پریس، نیو دہلی، ص ۱۴۳

۱۲۔ (الف) رمن راج سکسینہ "تذکرہ دربار حیدرآباد" مطبوعہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، اشاعت جنوری ۱۹۸۸ء، ص ۲۸۹ تا ۲۹۷

(ب) بیری پیوئر (Barry Pavier)، *Talangana Movement* (۱۹۴۴۔۵۱ء)، وکاس پبلی کیشن، لاہور، پولیس ایکشن، ص ۱۲۷ تا ۱۳۲

(ج) راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر، *Hyderabad Peoples Revolt Against Nizam Autocracy, Dairy of the Struggle*، مشمولہ *Glorious Talangana Armed Struggle*، مطبوعہ کمیونسٹ پارٹی پبلی کیشن، نیو ایج پرنٹنگ پریس، نیو دہلی، ص ۷۳ تا ۸۳، ۱۱۷ تا ۱۲۵

۱۳۔ ایضاً، مخدوم اے میموئر، ص ۲۱

۱۴۔ بیری پیوئر (Barry Pavier)، *Talangana Movement* (۱۹۴۴۔۵۱ء)، وکاس پبلی کیشن، لاہور، دی فال آف رجیم، ص ۱۳۹

۱۵۔ سید احمد العیدروس (کمانڈر انچیف میجر جنرل حیدرآباد)، *Hyderabad of the Seven Loaves*، خود نوشت، مطبوعہ لیزر پرنٹس لمیٹڈ، باؤنگی حیدرآباد، ص ۱۵۹۔۱۶۰

۱۶۔ راج بہادر گوڑ (ڈاکٹر)، مخدوم اے میموئر، ص ۲۲ تا ۲۷

Abstract

Tilangana Movement was a public reaction against the feudal system initiated in Tilangana, a large area of the state of Hayderabad Deccan in colonial India. It got momentum by the end of the fourth decade of the twentieth century. Makhdum Muhayyuddin, a popular Urdu poet was the breath and soul of the Comrade Association and along with his other associates, took keen interest in liberating human mind from the intellectual, political and economic slavery. The Comrade Association was not a regular political party and all its young members were inexperienced yet passionate. This movement did not last long but had a long lasting influence on the Indian politics as well as the literatures of the region. This article is based on the study of the development and impacts of Tilangana Movement on the socio literary scenario of the region and time with particular reference to the role of Makhdum Muhayyuddin in this movement.

معیار: علمی و تحقیقی مجلہ، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد [illegible]، شمارہ [illegible]، جولائی۔دسمبر [illegible]

علامہ اقبال اور اتحادِ عالمِ اسلامی

تحسین فراقی*

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اقبال کی تمام شعری و نثری تحریروں اور خود ان کی سراپا دردمند و بے قرار زندگی کا خلاصہ اور ماحصل کیا ہے تو اسے ایک جملے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے: ''ملتِ اسلامیہ سے بے پناہ عشق اور عالمِ اسلام کے اتحاد و یگانگت کی ناتمام آرزو۔'' انھوں نے جس تواتر سے اپنے پہلے شعری مجموعے سے لے کر ارمغانِ حجاز تک اور اپنی نگارشات، خطبات، مکتوبات اور مقالات میں اہلِ اسلام کے تابناک ماضی اور ان کے روشن مستقبل کی پیش قیاسی کی ہے اس میں اردو فارسی کا کوئی دوسرا شاعر یا دانش ور ان کا حریف نہیں۔ خاکِ مدینہ و نجف کے سرمۂ بصیرت افزا سے اپنی آنکھیں روشن کرنے والے فکرِ اسلامی کے اس ان تھک مفسر اور مبصر نے ملتِ اسلامیہ کی بقا اور اس کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے اپنے خیالات و محسوسات کا ایک ایسا ذخیرہ چھوڑا ہے جسے حوادث کے مہ و سال اور زمانے کا تیز رو سیلاب کبھی گزند نہیں پہنچا پائے گا۔ اقبال نے کس قدر سچ کہا تھا:

چشمۂ حیوان براتم کردہ اند　　محرمِ رازِ حیاتم کردہ اند
ذرہ از سوزِ نوایم زندہ گشت　　پر گشود و کرمکِ تابندہ گشت
ہیچ کس رازی کہ من گویم نگفت　　ہمچو فکرِ من درِ معنی نہ سفت
من کہ این شب را چو مہ آراستم　　گردِ پایِ ملتِ بیضا ستم
ملتی در باغ و راغ آوازہ اش　　آتشِ دلہا سرودِ تازہ اش

اپنی کمال دردمندی اور بے مثال مسیحا نفسی کو اپنے کامل ایقان کا حصہ بنا کر اقبال مسلمانوں کی وسیع و عریض سرزمینوں کو لالہ زاروں میں ڈھلتے دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ انھیں بلند نگہی، آسمان پروازی اور ''ثریا را گرفتن از لبِ بام'' کا زندہ و جاوید درس دیتے ہیں:

تا کجا در تہِ بالِ دگران می باشی　　در ہوای چمن آزادہ پریدن آموز

زخاکِ خویش طلب آتشی کہ پیدا نیست　　تجلیِ دگری در خورِ تقاضا نیست

---

* صدر شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، جامعہ پنجاب۔

نوای من بہ عجم آتش کہن افروخت
عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بی خبر است

عرب از سرشک خونم ہمہ لالہ زار بادا
عجم رمیدہ بو را نفسم بہار بادا

نہ بہ جادہ ای قرارش نہ بہ منزلی مقامش
دل من ، مسافر من کہ خداش یار بادا

چو بہ جان من در آیی دگر آرزو نہ بینی
مگر این کہ شبنم تو ، یم بی کنار بادا[۲]

اسلام کی حقانیت اور مسلم کلچر کے حیات بخش عناصر، اقبال کے لیے شنیدہ نہیں، دیدہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے وجدان میں ایک طرح سے حاضر و موجود تجربے کی حیثیت سے جولاں و جنباں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس دین متین کی عظمت کو خوب تر اسالیب میں اور زندہ اور جیتے جاگتے علائم اور استعاروں کے پیرایے میں بیان کرتے تھے۔ ''بکو، خزیدہ ، محکم چو کوہساران زی'' کے حیات خیز درس کے پس پشت دین اسلام کی سمندر کی سی گہرائی اور وسعت کی حامل ابدیت اور ناقابل تسخیر پہاڑوں کی سی صلابت کارفرما تھی۔ اقبال نے صاف لکھا ہے کہ میرے دست نغمہ نواز میں کوئی نیا ساز نہیں، وہی دیرینہ چنگ ہے مگر میں اس کے تاروں کو معمول کے مضراب سے نہیں، شیر کے ناخن سے چھیڑتا ہوں کیوں کہ اس ساز کے تار بھی معمول کے تار نہیں بلکہ پتھر کی رگوں سے وجود میں آئے ہیں۔ ذرا دیکھیے مسلم ثقافت کے رنگارنگ جمال اور اس کے عناصر جلال کو کس پر زور تخلیقی اسلوب میں بیان کرتے ہیں:

بدست من ہمان دیرینہ چنگ است
دگر گون نالہ ہای رنگ رنگ است

ولی ہوا زخمش با ناخن شیر
کہ او را تار از رگ ہای سنگ است[۳]

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوق جمال
عجم کا حسن طبیعت ، عرب کا سوز دروں

شاید یہاں اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ مذہب اور ثقافت ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں اور بقول ٹی ۔ ایس ایلیٹ:

"No culture has appeared or developed except together with a religion."[۴]

''رموز بے خودی'' میں ایک جگہ اقبال نے ''ملت محمدیہ'' کے دوام کو آیات قرآنی کے حوالے سے بڑے تخلیقی انداز سے ثابت کیا ہے۔ اس بحث کا عنوان ''در معنی این کہ ملت محمدیہ نہایت زمانی ندارد کہ دوام این ملت شریفہ موعود است'' درج کرنے کے بعد اقبال لکھتے ہیں کہ فرد تو ایک مشت گل سے پیدا ہوتا ہے اور قوم کسی صاحب دل کے دل سے پیدا ہوتی ہے۔ جب قومیں اپنے اعلیٰ نصب العین ترک کر دیتی ہیں تو موت سے ہم کنار ہو جاتی ہیں۔ رہا یہ سوال کہ ملت محمدیہ اور معمول کی امتوں میں کیا فرق ہے تو اقبال کا جواب یہ ہے کہ قومیں بھی کو افراد کی طرح ایک متعین عمر گزار کر مر جاتی ہیں مگر امت محمدیہ کے مقدر میں حیات ابدی لکھی ہے کیوں کہ اس کے پاس دائمی پیغام کا حامل قرآن حکیم موجود ہے اور

اس امت کا وقتی غروب اس کے ابدی طلوع کا پیش خیمہ ہے:

گرچہ ملت ہم بمیرد مثلِ فرد　　　از اجل فرمان پذیرد مثلِ فرد
امتِ مسلم ز آیاتِ خداست　　　اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ ست
از اجل این قوم بی پروا ستی　　　استوار از نحن نزلنا ستی

سطوتِ مسلم بہ خاک و خون تپید　　　دید بغداد آنچہ روما ہم ندید
تو مگر از چرخِ کج رفتار پرس　　　زان نو آئین کہن پندار پرس
آتشِ تاتاریان گلزار کیست　　　شعلہ ہای او گلِ دستار کیست

شعلہ ہای انقلابِ روزگار　　　چون بباغ ما رسد گردد بہار
درجہان بانگِ اذان بود است و ہست　　　ملتِ اسلامیان بود است و ہست [۵]

اسی حقیقت کو اقبال نے اپنی لافانی نظم ''مسجد قرطبہ'' اور ''طلوع اسلام'' میں بھی بہ رنگِ دگر بیان کیا ہے:

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیمؑ و خلیلؑ

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے ، اُدھر نکلے ، اُدھر ڈوبے ، اِدھر نکلے

اقبال کی یہ رجائیت، اسلام سے عشق اور ملت محمدیہ کے روشن مستقبل اور حیات نو کی پیش گوئیاں اپنی جگہ مگر سوال یہ ہے کہ تمام قوموں میں سے صرف امتِ محمدیہ کو ابدیت کی سند عطا کر دینا کیا ایک طرح کی ملت پرستی نہیں۔ کیا ملتِ اسلامیہ سے اقبال کا محض جذباتی لگاؤ اس کا محرک ہے؟ پھر اس سے بھی اہم سوال یہ ہے کہ کیا اس عہد میں جب پوری دنیا میں گلوبلائزیشن کا صور شدت سے پھونکا جا رہا ہے مغربی استعمار اپنی قوت اور استکبار کے نشے میں مست پوری دنیا کو یک قطبی نظام کے پنجۂ آہنیں میں جکڑنے کے لیے شدت سے تگ و دو کر رہا ہے اہلِ اسلام کو دہشت گرد، تنگ نظر، ظلمت پسند، بنیاد پرست اور جنگ جو اور خود اسلام کو ''اسلامو فاشزم'' (Islamo fascism) کے القابات دیے جا رہے ہیں اور اسلام سے نامنہاد پیدا کردہ دہشت اور خوف کو اسلاموفوبیا (Islamo phobia) سے تعبیر کیا جا رہا ہے، فوکویا اور سموئیل ہنٹنگٹن اپنی کتابوں میں مغرب کی لبرل ڈیموکریسی کو نوعِ انسانی کی آخری منزل اور تہذیبوں کے تصادم کو اس کا مقدر قرار دے رہے ہیں۔ جب ہنٹنگٹن یہ کہہ رہا ہو کہ یوریشیا میں تاریخی فالٹ لائنیں زلزلہ آمادہ ہو کر اپنا روپ دھار رہی ہیں، افغانستان اور عراق آگ اور خون کا جہنم زار بنے ہوئے ہوں اور ایک ایسی فضا میں جب پوری دنیا ظهر الفساد في البر والبحر کا عبرت ناک منظر پیش کر رہی ہو، ''اقبال اور اتحاد عالم اسلامی'' جیسے موضوعات پر اصرار اور مذاکرے بے وقت کی راگنی کے مترادف نہیں؟ اور پھر کیا اتحاد عالم اسلامی کی کوئی ٹھوس

صورت ممکن بھی ہے یا اس کی حیثیت مجذوب کی بڑیا بندگلی کی ہے ایک خیالی عالم اور نصب العینی یوٹوپیا کی ہے؟ اقبال کے افکار کی روشنی میں یہ سنگین سوال اپنا جواب مانگتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کو دین اسلام کی عظمت، حقانیت اور ابدیت کا کامل عرفان تھا۔ وہ اس حقیقت سے بھی پوری طرح آگاہ تھے کہ ادیانِ عالم میں صرف اسلام ہی عصرِ حاضر کے تقاضوں سے پورے طور پر عہدہ برآ ہو سکتا ہے اور فرد اور معاشرے کی نفسیاتی، روحانی، فکری، معاشرتی اور علمی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔ تاریخ اسلام کے عمیق مطالعے نے ان پر اس حقیقت کے اسرار بھی وا کر دیے تھے کہ اپنے عہدِ زریں میں اہلِ اسلام نے علم دوستی، خدا شناسی، احترامِ انسانیت، رواداری اور ایثار کی روشن مثالیں قائم کی تھیں اور تہذیبِ اسلامی نے یورپ کے عہدِ ظلمت کو روشنی اور گرمی مہیا کر کے اس کے احیا کے رستے ہموار کیے تھے۔ جس زمانے میں لندن اور یورپ کی تاریک گلیوں میں لوگ گھٹنوں تک کیچڑ اور غلاظت میں دھنس جاتے تھے، صقلیہ اور سپین میں مسلمانوں نے علم و اکتشاف، تمدن، نظامِ سیاست اور فلسفۂ تاریخ کے چراغ روشن کر رکھے تھے۔ اسلام کے صدرِ اول کی تاریخ نے اقبال کو یہ آگہی عطا کی تھی کہ نبی کریمؐ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں خطبۂ حجۃ الوداع کے توسط سے نوعِ انسانی کو آزادی اور حقوقِ انسانی کی حفاظت کا ایک آفاقی چارٹر مہیا فرما دیا تھا۔ ایک اور موقع پر ایک عیسائی وفد کے سربراہ کو کمال رواداری سے مسجدِ نبوی میں اجازت مرحمت فرمائی تھی کہ وہ اور ان کے رفقا اپنے دینِ عیسوی کے مطابق وہاں عبادت کر لیں۔ حضرت عمرؓ فتح یروشلم کے بعد بنفسِ نفیس وہاں تشریف لے گئے تھے اور انھوں نے وہاں کے عیسائیوں کو ایک چارٹر کے ذریعے امان مہیا کی تھی۔ اس چارٹر میں یہ لکھا تھا کہ عیسائیوں کو جان اور مال کی آزادی ہے۔ ان کے گرجے اور صلیبیں محفوظ ہیں۔ گرجے عیسائیوں کے تصرف ہی میں رہیں گے۔ انھیں کامل مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ اگر ان میں سے کوئی یروشلم سے مہاجرت کرنا چاہے تو اسلامی حکومت اس کو بہ حفاظت سرحد عبور کرانے کی پابند ہوگی۔ جہاں تک یہود کا تعلق ہے انھیں یورپ کی تمام سلطنتیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ عثمانی ترکوں نے انھیں صدیوں تک تحفظ فراہم کیا۔ ''برطانیہ کی یہود نوازی کے خلاف احتجاج'' کے زیرِ عنوان ستمبر ۱۹۲۹ء میں تقریر کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا:

> ''ترک یہودیوں کے ساتھ غیر معمولی رواداری کا سلوک کرتے رہے۔ یہودیوں کی خواہش پر انھیں دیوارِ براق کے ساتھ کھڑے ہو کر گریہ و بکا کرنے کی اجازت عطا کی۔ اس وجہ سے اس دیوار کا نام ان کی اصطلاح میں ''دیوارِ گریہ'' مشہور ہو گیا۔ شریعتِ اسلامیہ کی رُو سے مسجدِ اقصیٰ کا سارا احاطہ وقف ہے۔ جس قبضے اور تصرف کا یہود اب دعویٰ کرتے ہیں وہ قانونی اور واقعی اعتبار سے اس کا حق انھیں ہرگز نہیں پہنچتا۔''[۴۸]

کیا یہ حقیقت نہیں کہ ۶۴۲ء عیسوی سے لے کر ۶۶۲ء عیسوی تک کامل بیس سال تک دمشق کی جامع مسجد میں مسلمان اور عیسائی اکٹھے اپنی عبادت کرتے رہے تا آں کہ عیسائیوں نے اپنا گرجا تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا اور کیا یہ حقیقت نہیں کہ دنیا کا قدیم ترین یہودی معبد اب تک دمشق میں موجود ہے؟ یہ ہیں مذہبی رواداری کی وہ چند مثالیں جو آج بھی مسلمانوں اور تمام اقوامِ عالم کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے سکتی ہیں۔

اسلام کو تنگ نظری اور ظلمت پسندی کا مذہب قرار دینے والوں کو یہ بتانا ضروری ہے کہ دینِ اسلام فی الحقیقت کس قدر وسیع النظر واقع ہوا ہے۔ کیا ستم ہے کہ شہرۂ آفاق اطالوی مصنف دانتے اپنے طربیہ خداوندی میں مجاہدِ اسلام صلاح الدین ایوبی کو تو بہشت میں جگہ عطا کرتا ہے

مگر ہمارے پیغمبر آخر الزماںؐ کو خاکم بدہن دوزخ (Inferno) میں دکھاتا ہے جب کہ اہل اسلام کا اسلام از روئے قرآن اس وقت تک ناقص ہے جب تک وہ انبیائے سابقین اور ان کی کتابوں پر ایمان نہیں لے آتے۔ اقبال نے دانتے کے طرز بیشتر اندازی کے طرز پر "جاوید نامہ" لکھا مگر اسے اول تا آخر پڑھ جائیے، مذہبی رواداری اور کمال وسعت نظر کا ایک شاہکار دکھائی دے گا۔ اس کتاب کے ورق ورق سے مذہبی رواداری اور احترام انسانیت جھلکا پڑتا ہے۔ یہ کتاب انسانوں کی مرگ و حیات کے راز نہاں ہے۔ اس زندگی افروز رزمیے میں اقبال مختلف افلاک کی جانب پیر رومی کی رہنمائی میں رواں دواں ہوتے ہیں مگر وہیں فلک یعنی فلک قمر پر پہلی ملاقات مشہور ہندو صوفی وشوامتر سے ہوتی ہے جسے اقبال نے "جہاں دوست" کہا ہے اور "سخن از عارف ہندی" کے زیر عنوان اُس کی زبان سے عارفانہ حقائق کو منکشف کیا ہے۔ چار طواسین کے بیان میں طاسین گوتم، طاسین زرتشت، طاسین مسیح اور آخر میں طاسین محمدؐ کا ذکر آتا ہے۔ یہ ہے مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے نمائندوں کا وہ رنگارنگ منظرنامہ جس سے جاوید نامے کے قصر رفیع کی تعمیر ہوتی ہے۔ اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی تو ایک موقع پر سر ڈینی سن راس نے گفتگو کرتے ہوئے اسلام کے جمہوری منشائے اصلی کی ان لفظوں میں نشان دہی کی:

> اسلام ڈوگمیٹک (Dogmatic) مذہب نہیں ہے۔ اس کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ نوع انسانی ایک گھرانا اور ایک خاندان بن جائے۔ شعرا اور فلسفی اس اتحاد نوع انسانی کا محض خواب دیکھتے رہے لیکن اسلام نے اس مقصد کے حصول کے لیے ایک عملی اسکیم پیش کر دی۔ کم از کم دنیائے اسلام رنگ، نسل اور قوم کے امتیازات کو بالکل فنا کر چکی ہے۔ آج دنیا میں اسلام کے سوا اور کوئی ایسا طریق نہیں جس پر کاربند ہو کر یہ امتیازات مٹ سکیں۔ اسلام نے جو فرائض و ارکان یا طریق عبادات مقرر کیے ان سب کا مدعا یہ ہے کہ انسانی قلوب کو رنگ، نسل اور قوم کے امتیازات سے پاک کر دے۔"[۸۰]

اہل یورپ کی بدقسمتی یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کو رحمت و رافت اور نوع انسانی کے لیے ایک بے نظیر نعمت سمجھنے کے بجائے اسے اپنے عہد وسطیٰ کے مذہبی تعصبات کی روشنی میں دیکھا اور دیکھ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اہل اسلام اور اسلام کے بارے میں معروضی زاویۂ نگاہ سے یکسر محروم ہیں۔ ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب "Covering Islam" میں بجا طور پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا دنیا کے تمام براعظموں میں پھیلے ایک ارب سے زیادہ مسلمان سب کے سب دہشت گرد اور ظلمت پسند ہیں۔ پھر وہ ہم اور وہ یعنی Us اور Them کی انحو معویت بلکہ تفریق کا سوال اٹھاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس تفریق کے نتیجے میں Us کا علم بردار خود کو لبرل، روشن خیال، علم دوست اور اعلیٰ تہذیب کا حامل اور Them کو تنگ نظر، جاہل، متعصب اور غیر مہذب قرار دیتا ہے گویا اہل مغرب روشن خیال اور ایشیا اور افریقا کے باسی خصوصاً مسلمان تنگ نظر اور ظلمت پسند قرار پائے لہٰذا ان کو مہذب بنانا ضروری ہے یعنی وہی رڈیارڈ کپلنگ کی Whiteman's Burden کی آزار کوش لغویت!

خرد کا نام جنوں رکھ دیا ، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

نام نہاد مہذب سازی کا عمل جو در اصل استعماریت کے چنگیز خانی چہرے پر اوڑھایا گیا ایک نقاب ہے اب تک کروڑوں بے گناہ انسانوں کا

خون کر چکا ہے آٹھ کروڑ سرخ ہندیوں کے قتل عام سے لے کر کم و بیش بارہ لاکھ عراقیوں اور افغانیوں کے سفاکانہ قتل اور ابوغریب اور گوانتاناموبے کی ہولناک خفیہ جیلوں میں انسانیت پر ہونے والے انتہائی بھیانک اور ذلت آمیز تشدد تک، یہ سب مغرب کے مہذب ملکوں کے دامن پر محو اور حلاش نہ ہونے والا شرمناک داغ ہے۔ ''پس چہ باید کرد'' میں مغربی تمدن کی اسی سفاکی، بردہ فروشی اور کاروباری ذہنیت کی شدید مذمت کرتے ہوئے اور سادہ دل ملت اسلامیہ کو خبردار کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا:

آدمیت زار نالید از فرنگ　　زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ
یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد　　زیر گردون رسم لادینی نہاد
علم ازو رسوا است اندر شہر و دشت　　جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت
شرع یورپ بی نزاع قیل و قال　　برہ را کرد بر گرگان حلال
گوہرش تف دار و در لعلش رگ است　　مشک این سوداگر از ناف سگ است
ہوش مندی از خم او می نخورد　　ہر کہ خورد اندر ہمیں مے خانہ مرد
وقت سودا خند خند و کم خروش　　ما چو طفلانیم و او شکر فروش
وای آن دریا کہ موجش کم تپید　　گوہر خود را ز غواصان خرید[۹]

مغربی تہذیب کی مادہ پرستی، استعماری تنگ نظری اور ''ایپ جہانیت'' کے مقابلے میں اقبال مسلم تہذیب کی ہمہ گیری اور انسانیت نوازی کو تمام عمر متنوع اسالیب میں اپنی شعری و نثری تحریروں میں نمایاں کرتے رہے۔ ''پان اسلامزم'' کی اصطلاح کی، جو فرانسیسی صحافت کی شر پسندی کے نتیجے میں وضع ہوئی تھی، تردید کرتے ہوئے اقبال نے ۱۹۳۳ء میں اسلام کے نقطۂ نظر سے مستقبل میں وجود میں آنے والی عالم گیر سلطنت کی پیش قیاسی کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''اسلام ایک عالم گیر سلطنت کا یقیناً منتظر ہے جو نسلی امتیازات سے بالاتر ہوگی اور جس میں شخصی اور مطلق العنان بادشاہوں اور سرمایہ داروں کی گنجائش نہ ہوگی۔۔۔۔غیر مسلموں کی نگاہ میں شاید یہ خواب ہو لیکن مسلمانوں کا یہ ایمان ہے۔''[۱۰۰]

ظاہر بات ہے کہ عالم گیر اسلامی سلطنت کا خواب اتحاد عالم اسلامی کے بغیر ممکن نہیں اور اتحاد عالم اسلامی کے شرائط اور مطالبات اقبال کی نگاہ سے مخفی نہ تھے۔ اس ضمن میں اقبال نے نہ صرف اپنی بے مثال شاعری کے ذریعے بلکہ وقتاً فوقتاً بعض مسلم ممالک کو درپیش مسائل اور مشکلات کے رفع کرنے اور مسلم معاشروں کی اسلام کے محکم اور جاوداں اصولوں کی روشنی میں تعمیر نو کرنے کے باب میں تحریری اور تقریری سطح پر بھی بڑی قیمت اور دل سوزی پر مبنی تجاویز پیش کیں۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں وہ کانپور اور کشمیر کے مظلوم اور آفت زدہ مسلمانوں کے حق میں آواز بلند کر رہے ہیں تو کہیں چینی ترکستان میں برپا ہونے والی شورش، مسئلہ فلسطین، افغانستان، ایران، وسط ایشیا اور امت عربیہ کے مسائل و معاملات پر اپنے حکیمانہ خیالات اور مغربی استعمار کی سازشوں اور خود مسلم ملت کے جسد کو لاحق امراض کی نشان دہی کا فرض بجا لا رہے ہیں۔

۱۹۳۱ء میں مسلمانان لاہور سے خطاب کرتے ہوئے اقبال نے فرمایا:

"تم آج تک اپنی مصیبت کے علاج کے لیے ہزاروں تدبیریں کر چکے ہو۔ اب ایک تدبیر محمد عربی کی بھی آزماؤ۔ حضور فرماتے ہیں اِتِّحادُ اُمَّتِی حُجَّۃٌ قاطِعَۃٌ۔ ایک دفعہ اتحاد کر کے دیکھو..... اتحاد کامیابی کا سرچشمہ ہے اور حصول اتحاد کا راز واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً کی اطاعت میں مضمر ہے۔ اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو"[۱۱]

مسلمانان لاہور سے یہ خطاب دراصل پورے عالم اسلام سے خطاب اور اس کے لیے ایک نسخۂ شفا کی حیثیت رکھتا ہے۔

اقبال جہاں ایک طرف اسلام کے روشن اور انقلاب انگیز ماضی پر مسرور و شاداں تھے وہیں مسلم ملت کی معاصر صورت حال پر ملول و متفکر بھی تھے۔ دیکھیے اپنے عہد کی زوال میں مبتلا حال مست، بیمار ملت کے بارے میں غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے لفظوں میں کس طرح رقم طراز ہیں:

آہ ازان قومی کہ از پا برفتاد　　میر و سلطان زاد و درویشی نزاد
از سر قرن این امت خوار و زبون　　زندہ بی سوز و سرور اندرون
پست فکر و دون نہاد و کور ذوق　　مکتب و ملای او محروم شوق
زشتی اندیشہ او را خوار کرد　　افتراق او را ز خود بیزار کرد
تا نداند از مقام و منزلش　　مرد ذوق انقلاب اندر دلش
بندۂ رد کردۂ مولاست او　　مفلس و قلاش و بی پرواست او
گفت دین را رونق از محکومی است　　زندگانی از خودی محرومی است
دولت اغیار را رحمت شمرد　　رقص ہا گرد کلیسا کرد و مرد[۱۲]

اقبال اپنی استعمار زدہ ملت کو مسلسل خودشناسی، خودانحصاری، ضبط نفس، مرکز سے اٹوٹ وابستگی، اعتماد نفس اور تیز نگاہی کا سبق دیتے رہے کہ یہی عناصر زندہ قوموں کو وجود میں لاتے ہیں اور یہی زندہ قومیں وحدت ملی کا روپ دھار کر ایک ناقابل تسخیر اکائی، ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتی ہیں جس سے استعماری قوتیں خوف کھاتی اور لرزہ بر اندام رہتی ہیں۔ ذرا اقبال کے حکیمانہ ارشادات کے تیور ملاحظہ کیجیے:

نہ کردم از کسی دریوزۂ چشم　　جہان را جز بچشم خود ندیدم

دلا رمز حیات از غنچہ دریاب　　حقیقت در مجازش بی حجاب است
ز خاک تیرہ می روید ولیکن　　نگاہش بر شعاع آفتاب است[۱۳]

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا　　نوای زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز　　حیات جاودان اندر ستیز است[۱۴]

چیست دین؟ دریافتن اسرار خویش — زندگی مرگ است بی دیدار خویش

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر — نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں — سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر[15]

قوموں کے لیے موت ہے مرکز سے جدائی — ہو صاحب مرکز تو خودی کیا ہے، خدائی!

ہر کہ برخود نیست فرمانش رواں — می شود فرمان پذیر از دیگراں

ہو اگر قوت فرعون کی درپردہ مرید — قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللہی

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو — خوف باطل کیا کہ ہے غارت گر باطل بھی تو
بے خبر! تو جوہر آئینہ ایام ہے — تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے[16]

رونق از ما محفل ایام را — او رسل را ختم و ما اقوام را

خدمت ساقی گری با ما گذاشت — داد ما را آخرین جامی کہ داشت[17]

اسرار خودی کی اشاعت اول کے چند برس بعد جب نکلسن نے اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا تو اس پر بعض انگریز مبصروں نے تبصرہ کرتے ہوئے اقبال کو ملت پرست قرار دے کر اس کے خطرناک عواقب کا ذکر کیا۔ یہ ٹھیک وہی اعتراض ہے جس کا ذکر ہم قبلاً کر آئے ہیں۔ اقبال نے اس کے جواب میں نکلسن کو لکھا کہ ان کا مقصود ملت اسلامیہ کی عظمت کے بیان سے یہ نہیں کہ وہ دوسری قوموں کی نفی کر دے یا یہ کہ وہ جنگ جویانہ عزائم رکھتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ نوع انسانی کی مستقبل کی جانب پیش قدمی میں اسلام کے رنگ و نسل سے بالاتر تصورات بڑے معاون اور مدد ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا انہی کی بنیاد پر مستقبل میں وحدت عالم انسانی کی صورت ممکن ہے۔ مغربی ممالک میں مریضانہ حد تک پھیلی جغرافیائی وطن پرستی کا علاج ٹائن بی جیسے سربرآوردہ دانشور بھی اسلام ہی کے تصور انسانیت میں پاتے ہیں۔

اقبال نے اپنے بعض مکتوبات میں بھی کہیں کہیں بعض مسلم ممالک کے استحکام و انجام کے بارے میں اپنی سوختہ دلی کا اظہار بڑی بصیرت سے کیا ہے۔ ۱۴ نومبر ۱۹۲۹ کو اپنے ایک دوست جمیل کے نام خط میں فرماتے ہیں:

''از راہ کرم ہمارے انگ پار کے بھائیوں کی طرف سے جو ذمہ داری ہم پر عاید ہوتی ہے وہ ان حضرات کو یاد

ولا ہے۔ افغانستان کا استقلال و استحکام مسلمانان ہندوستان اور وسطی ایشیا کے لیے وجہ جمعیت و تقویت ہے۔"[۱۹۸]

ایک خط میں وسطی ایشیا کے ضمن میں پروفیسر محمد اکبر منیر کے نام ایک خط میں انتباہ کرتے ہیں:

"مغربی اور وسطی ایشیا کی قومیں اگر متحد ہو گئیں تو بچ جائیں گی اور اگر ان کے اختلافات کا تصفیہ نہ ہو سکا تو اللہ حافظ ہے۔ مضامین اتحاد کی سخت ضرورت ہے۔ میرا ذاتی عقیدہ یہی ہے [کہ] اتحاد ہوگا اور دنیا پھر ایک دفعہ جلال اسلامی کا نظارہ دیکھے گی۔"[۱۹۹]

ملت اسلامیہ کے ماضی، حال اور مستقبل تینوں کے باب میں اقبال کا شعور، اضطراب اور آرزومندی ایک ایسے غیر معمولی طرز فکر کی نشان دہی کرتی ہے جس میں شاعرانہ احساس اور کائناتی بصیرت گھل مل کر ایک ہو گئے ہوں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ عالم اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور وحدت کی آرزو نے اقبال کے پورے وجود کو آتش بجاں کر دیا تھا، ایسی آتش جو خاشاک غیر اللہ کو پھونک کر خاکستر کر دیتی ہے اور "اپنی مٹی سے عیاں شعلۂ سینائی کر" کا نعرۂ مستانہ لگاتی ہوئی روشنی، حلاوت اور سوز و سرور و سرمدی کا اہتمام کرتی ہے جس سے تاب و تواں حاصل کر کے عشق کے قافلے اپنے نئے، نامختتم اور انوکھے سفر کا آغاز کرتے ہیں اور لا مکاں مرکب نہیں راکب ہے۔ قلندری اسی حقیقت کو اقبال شرح کرتے ہیں۔ سچ ہے کہ:

سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

اتحاد عالم اسلامی کا وہ خواب جو اقبال اور ان سے پہلے سید جمال الدین افغانی نے دیکھا تھا اس وقت تک تشنۂ تعبیر رہے گا جب تک معروضی طور پر اس بات کا کھوج پورے طور پر نہیں لگایا جاتا کہ ماضی میں بڑی بڑی عالمی قوتوں کا قیام، عروج اور زوال کن شرائط کا مرہون اور کن اسباب کا نتیجہ رہا ہے۔ علاوہ ازیں جب تک مسلم معاشروں میں بنیادی فکری، ثقافتی اور اقتصادی تبدیلیاں رونما نہیں ہوتیں، جہالت کا خاتمہ نہیں ہوتا، وہ وسعت نظر پیدا نہیں ہوتی جو مسلمانوں کے دور عروج کا طرۂ امتیاز تھی اور اجتہاد کا بند دروازہ وا نہیں ہو جاتا، یہ خواب بے تعبیر رہے گا۔ ایک اب سے زیادہ جمعیت کی حامل دنیائے اسلام آج اپنے اصل اہداف سے بیگانہ اور اپنے اعلیٰ روحانی اور فکری نصب العینوں سے بیزار فرنگ دور ہے۔ تعداد و کثیر ہے مگر معیار پست اور فرومایہ ہے۔ اقبال نے آزادوں کی عید کو شکوہ ملک و دین اور غلاموں کی عید کو فقط ہجوم مومنین سے تعبیر کر کے تعداد و مقدار پر معیار کی برتری کی صداقت کا اعلان کیا تھا۔ رسل نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اس نے براعظم آسٹریلیا کے بعض ایسے وسیع و عریض علاقے بھی دیکھے جہاں انسانی آبادی تو ناپید تھی مگر لاتعداد بھیڑوں کے گروہ در گروہ دکھائی پڑتے تھے۔ رسل کا قول ہے کہ آبادی کی اس غالب اکثریت کی بنا پر بھیڑوں کو انسانوں پر برتری نہیں دی جا سکتی۔ خاک سے رزق تلاش کرنے والے بالآخر خاک کا رزق ہو جاتے ہیں۔ مسلم ممالک کے عیش کوش اور خاک نوش ازدحام کو صحیح معنوں میں ملت میں ڈھلنے کے لیے شب و روز ایک جہاد عظیم کرنا ہوگا اور اپنے وجود کو لاحق خطرات سے نمٹنے کے لیے اپنی ذات کو اسلام کی ابدی صداقتوں سے ہم آہنگ کرنا ہوگا تب جا کر ہی پوری نوع انسانی پر عنقریب مسلط ہو جانے والے ایک قطبی نظام کے بالمقابل کھڑا ہوا جا سکتا ہے اور مغرب کے سفاک استعمار کے آگے بند باندھا جا سکتا ہے جو جہالت جنگ ہر دم میں

۱۹۶۲ء کے آس پاس انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے منصوبوں پر پانچ لاکھ ستر ہزار پاؤنڈ فی منٹ خرچ کر رہا تھا اور جس نے اکیسویں صدی کے پہلے چھٹے سال میں تین کھرب ڈالر افغانستان اور عراق کی بربادی کی آگ میں جھونک دیے۔

خواتین و حضرات! حضرت علامہ اقبال ایک فرد نہیں، ایک دبستان تھے، برکت، خیر، صداقت، ایمان، روشنی، حلاوت اور حرارت کا زندۂ جاوید دبستان۔ تاریخ کے ایک خاص موڑ پر مسلم کلچر کی بساط پر اقبال جیسے نابغہ کا ظہور عطیۂ الٰہی کے مصداق تھا۔ اقبال کے نزدیک اسلام نہ تو زمانۂ انحطاط کے خانقاہ نشینوں کے مراقبوں کا تختۂ مشق ہے، نہ مولویوں کا وسیلۂ رزق، نہ ملوکیت کا معین ہے نہ ژولیدہ مو، آشفتہ مغز سیکولر دانش وروں کی پریشاں خیالی کا مقویہ بلکہ قُم باذن اللّٰہ کی گرمی اور حرارت سے مملو ایک زندہ حقیقت الحقائق ہے جس سے انسانی حیات کے ٹھنڈے چولھے گرم ہوتے ہیں اور دل رزم گہِ حیات میں نئی دھڑکنوں کا امین بنتا ہے۔ باعثِ ننگ ہے ایسے دانش وروں کا وجود جو قلب کے رہزن اور نظر کے ابلیس بن کر دھڑلے سے دن دہاڑے ابنِ آدم کے سکون اور سکینت کے قافلے لوٹ لیتے ہیں اور لائقِ مبارک باد ہے اقبال جیسے رحمتِ ربانی سے الہام یافتہ اربابِ نظر کا وجود جن کے زندہ افکار کے فیض سے انسانیت کو پورے قد سے بڑھنا اور کھڑا ہونا نصیب ہوتا ہے۔

حواشی

۱۔ کلیاتِ اقبال فارسی (۱۹۷۸ء)، (شیخ غلام علی اینڈ سنز)، ص ۱۱۷

۲۔ ایضاً، ص ۳۳۹

۳۔ ایضاً، ص ۱۰۱۵

۴۔ تفصیل کے لیے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی کتاب *"Notes Towards the Definition of Culture"* (mcmlxv) ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ Faber and Faber, London۔

۵۔ کلیاتِ اقبال فارسی، ص ۱۱۸-۱۲۰

۶۔ گفتارِ اقبال (۱۹۸۶ء)، (مرتبہ: محمد رفیق افضل)، ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، لاہور، ص ۹۳

۷۔ *Journey into Islam (Akbar Ahmad)* (۲۰۰۷ء مطبوعہ پنگوئن، انڈیا)، ص ۱۸، ۱۹

۸۔ گفتارِ اقبال، بحوالہ سابق، ص ۲۳۵

۹۔ کلیاتِ اقبال فارسی، بحوالہ سابق، ص ۸۳۹، ۸۲۳

۱۰۔ گفتارِ اقبال، ص ۱۷۸

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۱۲۔ کلیاتِ اقبال فارسی، بحوالہ سابق، ص ۸۱۹، ۸۲۰

۱۳- ایضاً، ص ۲۳۶

۱۴- ایضاً، ص ۳۱۵

۱۵- کلیاتِ اقبال اردو (۱۹۸۲ء)، (شیخ غلام علی اینڈ سنز)، ص ۳۳۹

۱۶- ایضاً، ص ۱۹۲

۱۷- کلیاتِ اقبال فارسی، بحوالہ سابقہ ص ۱۰۲

۱۸- "اقبال نامہ"، جلد دوم ص ۹۳

۱۹- ایضاً، ص ۱۹۳؛ ایسے ہی خیالات کا اظہار اقبال نے برسوں پہلے ۱۹۱۱ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے موقع پر کیا تھا "میرا اعتقاد ہے کہ ہماری قوم ایک شاندار مستقبل رکھتی ہے اور جو مشن اسلام کا اور ہماری قوم کا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ شرک اور باطل پرستی دنیا سے ضرور مٹ کر رہے گی اور اسلامی روح آخر کار غالب آئے گی"۔—— مقالاتِ اقبال، (۱۹۶۳ء)، شیخ محمد اشرف لاہور، ص ۱۳۳

Abstract

Iqbal (1876-1938) was a great poet and philosopher as well as an idealist and reformer. His poetry and prose are aimed at uniting the Muslim world and establishing the rule of peace and humanity. His works clearly show his ideology and give a message of peace, forbearance and unity among all the segments of the humanity at large. His poetry carries a note of love and affection for all the human beings by accepting the universal principles of Islam. Thus he invites the Muslim world to get together under the flag of faith and devotion and strive hard to bring peace to the whole humanity.

معیار: علمی و تحقیقی مجلہ شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد ۲۱، شمارہ ۲۱، جولائی-دسمبر ۲۰۱۹ء

یگانہ کے ایامِ آخریں

نجیب جمال*

یگانہ (۱۸۸۴-۱۹۵۶)[1] کا نام اردو کے ان شعراء میں شمار کیا جاتا ہے جو اپنے مضامین کی انفرادیت اور لہجے کی صلابت کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ یگانہ کا آبائی وطن تو عظیم آباد تھا مگر وہ ۱۹۰۶ء میں لکھنؤ آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ کے معروف حکیم مرزا محمد شفیع [2] کی صاحب زادی کنیز حسین [3] سے ان کی شادی ہوئی۔ ابتداء میں یاس تخلص کیا مگر بعد میں تخلص اور عرفیت میں تبدیلی آتی گئی۔ عظیم آباد میں تھے تو یاس عظیم آبادی کہلاتے تھے۔ لکھنؤ آنے کے بعد کچھ عرصہ یہی نام لکھتے رہے پھر یاس یگانہ ہو گئے مگر جلد ہی یاس کا استعمال ترک کر دیا اور مرزا یگانہ لکھنوی لکھنے لگے اور آخر یگانہ چنگیزی ہو گئے۔ نام اور تخلص کی ان تبدیلیوں سے یگانہ کی ساری زندگی کی جدلیات کا خاکہ مرتب ہوتا ہے۔

یگانہ ''ویسے تو خاندانی اعتبار سے مغل تھے۔ آبا و اجداد فن سپہ گری میں شغف رکھتے تھے۔ لیکن یہ صاحب سیف کے بجائے صاحب قلم بن گئے..... چنگیز خان سے ان کا خون ملتا تھا یا نہیں لیکن اس کا انداز حیات انھیں بہت پسند تھا اور دنیائے ادب میں وہی کردار ادا کرنا چاہتے تھے۔''[4] یہ سب احساس برتری کے سبب تھا یا لکھنؤ والوں کی نظر انداز کرنے کی حکمت عملی کا رد عمل تھا، اس کی تفصیل کا تو یہ موقع نہیں تاہم شعرائے لکھنؤ سے مسلسل معرکہ آرائی کے نتیجے میں یگانہ کو اودھ اخبار کی ملازمت سے جہاں وہ مدیر[5] کی حیثیت سے ذمہ داری نبھا رہے تھے، الگ ہونا پڑا۔ اس کے بعد وہ الہ آباد، اٹاوہ اور علی گڑھ میں اپنا روزگار تلاش کرتے رہے مگر کہیں بھی مستقل بندوبست نہ ہو سکا۔ ''گمان غالب ہے کہ ۱۹۲۷ء کے آخر میں یگانہ حیدر آباد دکن چلے گئے''[6] جہاں سے ۱۹۴۲ء میں وہ ۵۵ برس کی عمر میں ریٹائر ہو گئے''[7] ریٹائرمنٹ کے بعد یگانہ کو ایک مرتبہ پھر بدترین اقتصادی حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ دوارکا داس شعلہ (۱۹۱۰-۱۹۸۳) کے نام لکھے گئے یگانہ کے ایک خط [8] سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی آمدنی کم ہو کر پنشن کے پندرہ روپوں تک محدود ہو گئی تھی۔ ایسے نازک وقت میں شعلہ آڑے آئے اور انھوں نے منہ بولا بیٹا بن کر یگانہ اور ان کے اہل خانہ کی زندگی میں قدم قدم پر نمایاں کردار ادا کیا۔ شعلہ نے اس معاملت کی تفصیل اپنے مضمون ''یہ تیس برس کا قصہ ہے'' میں بیان کی ہے۔[9] نیشنل میوزیم کراچی کے ذخیرۂ مخطوطات میں محفوظ منی آرڈر کی رسیدوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعلہ نے اپریل ۱۹۴۳ء کے بعد گھر کے خرچ کے لیے پچاس روپے ماہوار باقاعدگی سے بھیجے تھے۔ حیدر آباد دکن سے شعلہ کے نام یگانہ کے ایک خط سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے ۱۹۴۳ء کے بعد یگانہ کے گھریلو اخراجات

---

* ڈین کلیہ فنون، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور۔

کی ذمہ داری قبول کی تھی"[۱۰]۔ شعلہ نے قیامِ پاکستان تک اس دستور کو باقاعدگی سے نبھایا۔ وہ ان دنوں لاہور میں مقیم تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور میں ان کا روزوں کا جاجایا کاروبار اجڑ گیا تھا۔ پنشن لینے کے بعد یگانہ لکھنؤ آ گئے تھے اور پھر اس کے بعد سوائے پنشن کے پندرہ روپے ماہوار کوئی بندوبست باقی نہ رہا۔ تقسیم ہند کا اعلان ہوا تو یگانہ روزگار کے حصول کے لیے دکن میں تھے۔ تقسیم کے بعد دکن کے حالات بھی دگرگوں ہوتے گئے۔ اور ریاست حیدرآباد بھی ختم ہو گئی۔ اس اثناء میں یگانہ اور ان کے اہل خانہ نے بڑا کٹھن زمانہ دیکھا۔ ان کے غم گسار اور چارہ گر شعلہ بھی بالکل تباہ ہو کر لاہور سے دہلی آ گئے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد یگانہ کے دو بیٹے، آغا جان اور مرزا حیدر بیگ اور بڑی بیٹی بلند اقبال بیگم لکھنؤ سے کراچی ہجرت کر گئے تھے۔ بلند اقبال کے نام اپنے ایک خط میں یگانہ لکھتے ہیں' اب لکھنؤ ہے اور ہم دونوں میاں بیوی، اصل بات یہ ہے کہ تمام اولادیں ایک ایک کر کے جدا ہو گئیں، اس صدمے نے تمہاری اماں کی صحت پر خراب اثر ڈالا ہے" بیگم یگانہ اپنے بچوں کے پاس پاکستان جانے کے لیے بے قرار تھیں بالآخر یہ مرحلہ بھی طے ہوا اور یگانہ لکھنؤ میں تنہا رہ گئے۔ ادھر یگانہ کی بیماری میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بے بسی اور بے زری کے اس عالم میں انھوں نے بیوی بچوں کے مسلسل اصرار کے باوجود لکھنؤ سے ہجرت کرنا گوارا نہ کیا۔

نومبر ۱۹۵۳ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کی جانب سے یگانہ کی اشک شوئی کا سامان کیا گیا۔ گورنمنٹ نے انھیں پیرانہ سالی کی بنیاد پر جوش ملیح آبادی (۱۸۹۴-۱۹۸۲) کی سفارش پر ایک سو روپیہ ماہانہ "گزارہ الاؤنس" دینا منظور کیا۔ یگانہ کے علاوہ جوش ملسیانی (۱۸۸۴-۱۹۷۶) اور بے خود دہلوی (۱۸۶۳-۱۹۶۰) کو بھی یہ الاؤنس دیا گیا۔ الاؤنس کی منظوری میں جوش ملیح آبادی کی کوششوں کا دخل تھا، جس کی تفصیل جوش ملسیانی کے کالی داس گپتا رضا کے نام ایک خط میں ملتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اب ایک خوش خبری سن لو، مرکزی حکومت نے فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کے لیے ایک فنڈ قائم کیا ہے۔ اس میں سے اُردو کے تین شعراء کے لیے ان کی ادبی خدمات اور پیرانہ سالی کی بنا پر ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ منظور کر لیا ہے۔ یہ یکم نومبر ۱۹۵۳ء سے شروع ہو گا۔ ان میں سے ایک تو حضرت بے خود دہلوی منتخب ہوئے ہیں، ایک میرزا یگانہ چنگیزی ہیں، ایک میں۔ منظوری کا حکم آ چکا ہے۔ اُردو دشمنی کے دور میں یہ ادب نوازی غنیمت ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس انتخاب کے لیے حضرت جوش ملیح آبادی صحیح طور پر سپاس گزاری کے مستحق ہیں۔ کن اصحاب کو منتخب کیا جائے، یہ مشورہ موصوف ہی نے حسبِ استفسار پیش کیا تھا اور وہی منظور ہوا۔ فی الحال یہ ایک سال کے لیے منظور ہوا ہے مگر اس کی بنیاد پیرانہ سالی پر ہے اس لیے امید ہے کہ ایک سال کے بعد بھی اس کی تجدید ہوتی رہے گی۔ یہ فیصلہ صدر جمہوریہ کی منظوری سے ہوا۔ میرزا یگانہ اگرچہ میرے ہم عمر ہیں اور ستر بہتر سے زیادہ کی عمر نہیں مگر ان کا جسمانی انحطاط الواقع ہمدردی کے قابل ہے۔ بے خود صاحب تو بانوے سال کے ہو چکے۔"[۱۲] جوش ملسیانی کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی منظوری دی گئی تھی مگر یگانہ کے اپنے ایک مداح من موہن تلخ کے نام خط سے پتہ چلتا ہے[۱۳] کہ یہ الاؤنس سو روپیہ ماہانہ تھا۔ تلخ ہی کے نام یگانہ کے ایک اور خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یگانہ کو اس الاؤنس کے اجراء میں خاصی تاخیر ہوئی جس کا سبب اکاؤنٹنٹ جنرل الہ آباد کا رویہ تھا[۱۴]۔ دسمبر ۱۹۵۴ء میں الاؤنس کی تجدید کی ضرورت پیش آئی تو یگانہ نے تلخ کو لکھا'' گورنمنٹ آف انڈیا میں میرے الاؤنس کی تجدید کی کارروائی پیش تھی ذرا دریافت کرو کیا فیصلہ ہوا''[۱۵]۔ جوش ملسیانی کے کالی داس گپتا رضا کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ جولائی ۱۹۵۶ء تک یہ الاؤنس انھیں باقاعدگی سے مل رہا تھا۔ وہ لکھتے ہیں'' سرکاری گرانٹ بدستور مل رہی ہے''[۱۶] گویا

یگانہ کو بھی ان کی وفات ۴ فروری ۱۹۵۶ء تک یہ ماہانہ گزارہ الاؤنس ملتا رہا۔

الاؤنس کی منظوری سے قبل ۳۱ مارچ ۱۹۵۳ء کو یگانہ کی سربازار رسوائی کا واقعہ پیش آ چکا تھا۔[17] یگانہ کے خلاف مسلم ہجوم نے جو پُرتشدد کارروائی کی اس کے بعد یگانہ کو وہاں قیام میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ اس وقت وہ کرائے کے مکان واقع منصور نگر میں رہائش پذیر تھے۔ یگانہ کے ایک خط[18] بنام مروارکا داس شعلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۲۲ جولائی ۱۹۵۳ء تک اسی مکان میں مقیم رہے اور وہاں سے اپنے ہم زلف شیخ نثار حسین کے مکان واقع محلہ شاہ گنج چلے آئے جو اپنے بیرونی رنگ و روغن کی وجہ سے 'پیلا مکان' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ پیلا مکان، محلہ شاہ گنج اُٹھ آنے کے بعد یگانہ کو ایک اور دشوار مرحلہ درپیش ہوا۔ یگانہ بیگم عارضی پاسپورٹ لے کر یگانہ سے ملنے کراچی سے لکھنؤ آئی تھیں۔ اب مسئلہ ان کے انڈیا میں مستقل قیام کا تھا اور اس کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا سے اجازت حاصل کرنا ضروری تھی۔ گورنمنٹ آف انڈیا، یوپی گورنمنٹ کی سفارش پر منظوری دیتی تھی۔ یگانہ بیگم کے ویزا کی مدت ۲ جنوری ۱۹۵۵ء کو ختم ہو رہی تھی مگر اس میں ۱۰ مارچ تک توسیع ہو گئی تھی۔ یگانہ نے شعلہ کو خط میں لکھا ''اچھا بھائی گورنمنٹ آف انڈیا منظوری دے گی تو پھر تم اور جوش مل کر جلد منظوری حاصل کرنے کی تدبیر کرو۔ مہلت تو یہاں بہت کم ہے یعنی ۱۰ مارچ کو عذرا خواستہ بیگم کو روانہ ہو جانا چاہیے''۔[19] اسی کشمکش میں ۱۰ مارچ بھی گزر گئی اور اب زائد قیام (Over stay) کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ یگانہ نہایت بے چینی کے عالم میں شعلہ کو لکھتے ہیں'' نہ جانے بیگم کا (Over Stay) کتنی پریشانی کا باعث ہو گا۔ گھر میں کیا کروں اور کوئی کیا کرے''۔[20]

یگانہ کی بیماری میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لکھنؤ کی زمین ان پر تنگ ہو گئی تھی۔ اس عالم میں بھی انھوں نے بیوی بچوں کے مسلسل اصرار کے باوجود لکھنؤ سے ہجرت کرنا گوارا نہ کیا۔ بیگم یگانہ۔ اگرچہ یگانہ کی شرپسندوں کے ہاتھوں ہونے والی تذلیل کے بعد لکھنؤ پہنچی تھیں مگر اس کے بعد پیش آنے والے واقعات میں وہ یگانہ کے ساتھ ساتھ تھیں۔ تمام لکھنؤ کی طرف سے یگانہ کا سوشل بائیکاٹ جاری تھا۔ ان حالات میں یگانہ کی خانگی زندگی بھی متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی، جس کے نتیجے میں یگانہ اکیلے ہی پیلا مکان، شاہ گنج سے نکل کھڑے ہوئے اور چونکی خاص، شاہ گنج میں شہنشاہ حسین وکیل کا مکان کرائے پر لے کر مولانا ناصر حسین کے مکان کے سامنے رہنے لگے۔[21] مولانا ناصر حسین کا تعلق لکھنؤ کے معروف خاندان اجتہاد سے تھا وہ جس گلی میں رہتے تھے اسے ان کے خاندان کی رعایت سے ''جناب کی گلی'' کہا جاتا تھا۔

اس عرصہ میں بیگم یگانہ کا قیام بدستور اپنی ہمشیرہ ذاکی بیگم کے یہاں پیلا مکان شاہ گنج میں رہا۔ تاہم اس صورت حال میں بھی یگانہ نے اپنی بیگم کے مستقل قیام کی کوششیں جاری رکھیں۔ شعلہ کے نام یگانہ کے جو خطوط 'ساقی' کراچی میں جون ۱۹۵۵ء سے ستمبر ۱۹۵۵ء تک چار شماروں میں قسط وار شائع ہوئے ہیں ان سے اس سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کا علم ہوتا ہے۔ یگانہ نے شدید بیماری کے عالم میں اپنے احباب کی مدد سے بالآخر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی۔ اپنے ایک خط میں شعلہ کو لکھتے ہیں'' ۲۱ جون کو خفیہ پولیس کا ایک جوان اِک سرکاری مراسلہ بیگم کے دستخط کے لیے لایا جسے سرسری طور پر دیکھ کر معلوم ہوا کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے انھیں ہندوستان میں رہنے کی اجازت دی ہے۔ شکر ہے'' یگانہ۔[22]

بیگم یگانہ کو مستقل قیام کی اجازت ملنا یگانہ کی آخری عمر میں ایک بڑا مرحلہ تھا جو طے ہوا۔ اس سے فراغت پا کر یگانہ کو اپنے مسودات کی اشاعت کی فکر ہوئی۔ وہ اپنے مسودات شعلہ کو بھیج چکے تھے اور انھیں آکسفورڈ سے چھپوانا چاہتے تھے۔ شعلہ کے نام اپنے

خطوط میں یگانہ بار بار اصرار کرتے ہیں کہ ان مسودات کو آکسفورڈ بھیج دیا جائے۔ اس کتاب کے متعلق قاضی عبدالودود لکھتے ہیں ''انھوں نے ایک ضخیم کتاب اسلام کے خلاف لکھی تھی۔ یہ دو ارکا داس شعلہ کے پاس ہے۔ ان کی وصیت تھی کہ آکسفورڈ بھیج دی جائے مگر شعلہ نے وصیت پر عمل چند سال قبل تک تو نہیں کیا تھا بعد کا حال معلوم نہیں، لچر سی کتاب تھی۔[۲۳] شعلہ نے یگانہ کے انتقال کے بعد یہ مسودہ یگانہ کی منجھلی صاحب زادی مریم بیگم کے حوالے کر دیا تھا جو پونہ میں رہتی تھیں۔ بلند اقبال بیگم کے مطابق مریم بیگم نے اسے تلف کر دیا تھا۔[۲۴]

یگانہ کے کم و بیش تمام مضمون نگاروں نے ان کی دماغی حالت پر شبہ کا اظہار کیا ہے خود یگانہ کے آخری احوال سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ محمد طفیل مدیر نقوش، یگانہ سے ایک ملاقات کے حوالے سے ان کی جسمانی اور دماغی حالت کے بارے میں لکھتے ہیں ''آخری سانسوں میں ہڈیوں کا ڈھانچہ، ایک کمرے میں بند، چند ٹوٹی پھوٹی اور بے ترتیب سی چیزوں کی موجودگی میں میرزا صاحب ایک چارپائی پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اتنے باکمال شاعر کو یوں خستہ حال دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا..... میرا تو خیال ہے کہ وہ مدت سے اپنے حالات کے قطعی ناموافق ہونے کی وجہ سے اپنا ذہنی توازن کھو چکے تھے''۔[۲۵] خود یگانہ نے جو اب شدید بیماری کے باعث ''جناب کی گلی'' سے ایک مرتبہ پھر اپنے ہم زلف شیخ نثار حسین کے گھر منتقل ہو گئے تھے، اپنے ایک خط میں تیغ کو لکھا ''گھڑی بھر میں دل و دماغ کی حالت کچھ سے کچھ ہو جایا کرتی ہے''۔[۲۶] مئی ۱۹۵۵ء میں بلند اقبال والد اور والدہ سے ملنے لکھنؤ گئیں ان کا کہنا ہے ''بھائی ابا کی دماغی حالت متوازن نہیں تھی گھڑی گھڑی میں بگڑ جاتے اور سارا غصہ اماں کی جان پر اتارتے''۔[۲۷]

بلند اقبال ۱۲ جون ۱۹۵۵ء کو لکھنؤ سے واپس ہوئیں اور ۱۵ جون کو یگانہ اپنے دیرینہ دوست پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے گھر ''ادبستان'' (واقع دین دیال روڈ) میں اٹھ آئے[۲۸]۔ ادیب نے انھیں مالی کی کوٹھری رہنے کو دے دی تھی۔[۲۹] یگانہ کا ادیب کی وسیع و عریض کوٹھی میں مالی کی کوٹھری میں قیام کرنا ادیب کے بارے میں بدگمانی پیدا کرتا ہے۔ راقم نے اس سلسلے میں ایک مکتوب کے ذریعے ان کے صاحبزادے ڈاکٹر نیر مسعود سے استفسار کیا تو انھوں نے جواب میں تحریر کیا۔ ''والد مرحوم اپنے مہمانوں کو اپنے کمرے میں ٹھہراتے تھے۔ یگانہ کو بھی انھوں نے وہیں ٹھہرنے کی دعوت دی تھی لیکن وہ راضی نہیں ہوئے۔ لان میں مالی کے کوارٹر کے آگے چھپر ڈلوانے کے پیسے بھی انھوں نے والد صاحب کے سخت انکار کے باوجود خود ادا کیے''۔[۳۰]

نیر مسعود نے اپنے مضمون ''میرزا یگانہ (بحوالہ ادیب)'' میں یگانہ کے ''ادبستان'' میں قیام کے کچھ واقعات بھی تحریر کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں ''وسط جون ۱۹۵۵ء میں یگانہ ''ادبستان'' آ گئے۔ وہ بیمار تھے اور کسی مناسب خدمت گار کے لیے پریشان تھے۔ میں نے اس زمانے میں ان کے پاس دو ملازم دیکھے ایک تو بد رنگ نامی آدمی تھے اور دوسری ایک بوڑھی عورت۔ یہ عورت کبھی کبھی گھر کے اندر آ کر بیگم ادیب سے یگانہ کی تند مزاجی کی شکایتیں کرتی تھی۔ ایک بار وہ روتی ہوئی آئی کہ یگانہ خود ہی اس سے بدن دبانے کو کہتے ہیں اور جب وہ دبانے لگتی ہے تو اسے دور دھکیل کر کہتے ہیں ''بھاگ جا بھاگ جا تو جوان ہے جوان''۔ بد رنگ نے بھی ادیب کے ذاتی ملازم جانی مرزا سے شکایت کی کہ یگانہ ان کی ڈاڑھی پر اعتراض کرتے ہیں''۔[۳۱]

''ادبستان'' میں یگانہ کا قیام ایک ماہ چوبیس دن رہا۔ ۹ اگست کو انھوں نے کوارٹر چھوڑ دیا اور شدید بیماری کی حالت میں پہلا مکان شاہ گنج منتقل ہو گئے جہاں ان کی بیگم مقیم تھیں۔ جاتے ہوئے ادیب کے نام یہ رقعہ لکھا، ''موسم کی سختیوں نے مرض کی شدت کو اور

بڑھا دیا رات بھر آگ جلاتا رہا طبیعت بے حال رہی۔ چلتے وقت آدمی سے کہہ دیا کہ صاحب کو میرے جانے کی اطلاع کر دینا تاکہ اطلاع ہو گئی ہو گی۔ زیادہ اس وقت کیا عرض کروں"۔ [۳۲] شعلہ کو خط میں لکھا "وہاں پروفیسر مسعود حسن کے باغ میں چھپر ڈال کر ایک مہینہ چوبیس دن رہا مگر برسات کا زور بندھا تو پھر میں زمین پر نہ تھا آب و گل میں پڑا تھا اور مرض کی شدت نے اور پریشان کیا تو آخر مجبور ہو کر ۹ اگست کو پھر یہاں چلا آیا۔ کیا کہوں صبح سے شام اور شام سے صبح کیوں کر ہوتی ہے۔ دن میں کئی بار حالت خراب ہوتی ہے۔ وہ تو چالیس برس کا ساتھ چھوڑ کر ۲ ستمبر کو کراچی روانہ ہو گئیں"۔ [۳۳]

یگانہ کو سب سے زیادہ دکھ بیگم کے اس حال میں انھیں یوں چھوڑ کر چلے جانے کا ہوا۔ ان کے ہندوستان میں قیام کے لیے یگانہ نے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے تھے۔ یگانہ نے کرب کی یہ داستان آغا جان کے نام اپنے خط میں رقم کی ہے، خط سے یگانہ کے شب و روز کی حقیقت کا علم بھی ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں۔ "جھونپڑی ڈال کر رہنے کا واقعہ یوں ہے کہ تمہاری اماں نے مجھے اتنا عاجز کیا کہ میں تنگ ہو کر پروفیسر مسعود حسن صاحب کے باغ میں ایک حجرے میں (آگے چھپر ڈال کر) جا کر ٹھہر گیا۔ ۱۴ جون کو حسن بانو یہاں سے روانہ ہو گئیں اور ۱۵ جون کو میں مسعود صاحب کے یہاں چلا گیا۔ آخر جولائی سے بارش کی شدت ہونے لگی اور یہاں طبیعت کا یہ حال کہ دو قدم چل نہیں سکتا، پیٹ میں سانس نہیں سماتی، گھڑی گھڑی نڈھال ہو کر پلنگ پر کروٹیں بدلتا رہتا ہوں۔ ایک بڈھا نوکر مل گیا تھا جو خبر گیری کرتا تھا مگر جب وہ کھانے پینے کے لیے باہر چلا جاتا تھا تو پھر میں اکیلا رہ جاتا تھا پھر خدا یاد آتا۔ آس پاس کوئی نہیں جب حالت زیادہ خراب ہو گئی تو پھر میں یہیں پہلے مکان میں واپس آ گیا۔ نثار حسین صاحب نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ خدا انھیں خوش رکھے مگر تمہاری اماں میری اس چند روزہ زندگی سے اتنی بیزار ہیں کہ میرا ساتھ رہنا انھیں گوارا نہیں تم یہاں کیوں آئے ہو؟ میرے ٹھکانے پر کیوں آئے؟ جب جانتے تھے کہ میں یہاں رہتی ہوں تو کیوں آئے؟ (کرایہ کے مکان سے) میں شہنشاہ حسین وکیل کے مکان میں مولانا ناصر حسین صاحب کے مکان کے سامنے رہتا تھا۔ وہاں سے دوبارہ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی آئیں۔ خیر اب شہر میں سجاد حسین کی بیوی کراچی جانے لگیں تو تمہاری اماں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں اور ہمیشہ کے لیے مجھے تنہا چھوڑ گئیں۔ خدا معلوم ان پر کیا گزری سرحد پر روک لی گئیں۔ قانون کی حدوں میں جو کچھ بھی ہو..... اس سن میں ایسے مریض کو مارنا چاہا کہ پانی دینے والا بھی نہ ہو۔ بار بار فرماتی تھیں کہ اب عزرائیل جائے گا تنہائی کا۔ نہایت کرب و اذیت میں ہوں کیا کہوں۔ یگانہ۔ [۳۴]

اب یگانہ تھے اور انتظارِ مرگ۔ عمر کے آخری سالوں میں ان کے یہاں تمنائے مرگ کا مسلسل اظہار ملتا ہے۔ اقارب کے نام خطوط میں انھوں نے اپنی اس کیفیت کا بیان تو اتر کے ساتھ کیا ہے۔ دیکھیے یگانہ کا خط بنام اپنے دیرینہ دوست مولوی الطاف حسین "کئی سال سے دمہ کا مریض ہوں کئی بار موت قریب آ کر پلٹ گئی مر رہا ہوں مگر مرتا نہیں چکتا"۔ [۳۵] یگانہ کا خط بنام آغا جان "کیا کہوں مر رہا ہوں ہر تیسرے چوتھے مرنے لگتا ہوں مگر مرتا نہیں چکتا"۔ [۳۶] یگانہ کا خط بنام ظہیر یار مرزا۔ [۳۷] "دن رات پڑا رہتا ہوں مگر موت پر کچھ اپنا بس نہیں چلتا"۔ [۳۸] ان تمام خطوط میں یگانہ نارسائی کے شاکی نظر آتے ہیں۔ اسی موضوع پر ان کا ایک شعر ہے:

سانس لیتا ہوں تو آتی ہے صدائے بازگشت کوئی دن ہو گا کہ یہ نالہ رسا ہو جائے گا

ایسے میں دواؤں کا استعمال محض بیماری کی شدت سے ہونے والی تکلیف کو کم کرنے کے لیے تھا۔ شعلہ انھیں Mendaco کی شیشیاں بھیجتے رہے۔ یگانہ یونانی طریقۂ علاج کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ یگانہ کے زیرِ مطالعہ رہنے والے "کلیاتِ صائب" کی جلد

کے اوراق پر یگانہ کے زیرِ استعمال رہنے والے کچھ یونانی نسخہ جات درج ہیں۔

یگانہ کا تین اور چار فروری ۱۹۵۶ء کی درمیانی شب کو انتقال ہوا۔ بلند اقبال، یگانہ کے انتقال کے ایک دن بعد لکھنؤ پہنچیں۔ یگانہ کی خدمت پر مامور ملازم سید صاحب نے جو تفصیل انھیں بتائی اس کے مطابق دو بجے رات تک یگانہ کی حالت قدرے بہتر تھی۔ وہ بہت رات گئے تک انگیٹھی کے پاس بیٹھے آگ تاپتے رہے تھے۔ اسی روز رات آٹھ بجے دوائی کی پڑیا باباصاحب کو دی تھی کہ دوائی لیتے آئیں۔ یگانہ نے اُن سے تاریخ بھی دریافت کی تھی، پانوں کی ڈبیا یگانہ کے سرہانے دھری رہتی۔ کھانسی کا دورہ شدید ہوتا تو پان کھا لیتے۔ اس روز ڈاکیہ بیگم (بیگم یگانہ کی بہن زوجہ شیخ نثار حسین والدہ شیخ انصار حسین، سابق چیئرمین شعبہ طبیعیات، کراچی یونیورسٹی) اور گھر کی خواتین اول شب ہی سے کسی رشتے کی تقریب میں گئی ہوئی تھیں۔ اس لیے پان بھی سرِ شام ہی بھیج دیے گئے تھے۔ کمرے میں یگانہ کے علاوہ باباصاحب (یگانہ کے سسرالی عزیز) اور سید صاحب سوتے تھے۔ رات دو بجے یگانہ نے پانی مانگا۔ یگانہ کی آواز سن کر سید صاحب اور باباصاحب کی آنکھ کھل گئی۔ باباصاحب نے اُٹھ کر انھیں پانی پلایا اور سہارا دے کر پھر لٹا دیا اور خود بھی لیٹ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں پھر غافل ہو گئے اس کے بعد ہی یگانہ کا دم نکلا۔ سید صاحب اور باباصاحب کی عادت تھی کہ ان میں سے کسی کی آنکھ کھلتی تو آواز دے کر یگانہ سے پوچھ لیتے تھے کہ انھیں کسی چیز کی طلب تو نہیں۔ اس شب ساڑھے تین بجے باباصاحب کی آنکھ کھلی تو انہوں نے حسبِ معمول پوچھا ”دولہا بھائی کچھ چاہیے“ کوئی جواب نہ پا کر باباصاحب اُٹھ بیٹھے لحاف اُٹھا کر غور سے دیکھا تو یگانہ ختم ہو چکے تھے۔ انہوں نے سید صاحب کو آواز دی اور بتایا کہ یگانہ کا انتقال ہو گیا ہے اور خود ڈاکیہ بیگم کو بلانے چلے گئے۔[۳۹]

اس روداد مرگ سے یگانہ کے کچھ شعر ذہن میں آتے ہیں:

نگاہِ واپسیں ایسا نظارہ پھر کہاں ممکن	تمام احباب کا پاس سے ایک اک کر کے ٹل جانا
کسے اُمید تھی ظالم کہ ہوگا خاتمہ بالخیر	ترا کروٹ لوٹنا اور میرا دم نکل جانا
ہاں کٹ گئی شاید ترے دیوانے کی بیڑی	پچھلے پہر آئی تھی کچھ آواز اِدھر بھی

یگانہ نے مرنے سے کچھ دن پہلے لکھنؤ کے ذمہ دار لوگوں کی موجودگی میں کلمہ پڑھا اور ان سے اپنے مسلمان ہونے کی شہادت لی۔ ضیا عظیم آبادی کے مطابق انھوں نے احتشام حسین اور مسعود حسن رضوی ادیب کی موجودگی میں کلمہ پڑھ کر دمِ مرگ اپنے مسلمان ہونے کا اقرار کیا۔[۴۰] شعلہ نے اپنے مضمون ”یہ تیس برس کا قصہ ہے“ میں مرزا محمد تقی (باباصاحب) کے حوالے سے لکھا ہے کہ انتقال سے دو دن پہلے شام کے وقت یگانہ نے مرزا محمد تقی کی موجودگی میں کلمہ پڑھا۔[۴۱] یگانہ کے کلمہ پڑھنے کی ایک روایت ان کے بھانجے پروفیسر ڈاکٹر شیخ انصار حسین نے اپنے مضمون ”میرزا یگانہ..... یادیں اور ملاقاتیں“ میں بیان کی ہے۔ جب یگانہ نے انتقال سے ایک شب قبل انصار حسین کی والدہ ڈاکیہ بیگم، خالہ رافیہ بیگم اور بھاوج خورشید بتارت کی موجودگی میں فقہ جعفریہ کے مطابق کلمہ پڑھا اور کہا ”خدا کا شکر ہے یہ دنیا والے تو مجھے کافر، ملحد اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں تم لوگ گواہ ہو کہ میں کس کلمے اور مسلک پر ساری عمر کاربند رہا“۔[۴۲]

وفات کے بعد کفن دفن کا تمام انتظام نہایت خاموشی اور رازداری سے کیا گیا۔ منشی فضل حسین کی کربلا واقع تال کٹورہ میں قبر کے لیے زمین حاصل کی گئی۔ روزنامہ ”قومی آواز“ لکھنؤ کی خبر کے مطابق جنازہ میں شرکت کرنے والوں کی تعداد بارہ تھی۔[۴۳]

یگانہ کی وفات کے کچھ عرصہ کے بعد ان کی منجھلی صاحب زادی مریم بیگم نے پونہ سے آ کر اپنے والد کی قبر پختہ کرادی اور اس پر کتبہ نصب کروایا جس کی عبارت [۴۴] کچھ یوں ہے۔

مرزا واجد حسین یگانہ چنگیزی لکھنوی

تاریخ پیدائش ۱۷ اکتوبر ۱۸۸۴ء

تاریخ وفات ۴ فروری ۱۹۵۶ء

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے

آہ کس دن کے لیے ناحق پرستی کیجیے

حواشی و تعلیقات

۱۔ یگانہ ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۰۱ھ بمطابق ۱۷ / اکتوبر ۱۸۸۴ء کو جمعہ کے دن عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے ان کا اصل نام مرزا واجد حسین اور تاریخی نام مرزا افضل علی بیگ تھا (''آیات وجدانی'' (دیباچہ)، شیخ مبارک علی تاجر کتب، لاہور، بار اول ۱۹۲۷ء، ص ۹)

۲۔ حکیم مرزا محمد شفیع شیرازی، یگانہ کے خسر، لکھنؤ کے محلہ شاہ گنج کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ کے صاحب علم لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ وہ ادبی حوالے سے بھی معروف تھے۔ جس سال یگانہ ان کی دامادی میں آئے اسی سال مطبع نول کشور، لکھنو نے ان کی مرتب کردہ مشہور زمانہ کتاب ''مباحثہ گلزار نسیم یعنی معرکہ چکبست وشرر'' شائع کی، جس کے ساتھ مثنوی گلزار نسیم، کا مکمل متن بھی تھا۔ (مشفق خواجہ ۲۰۰۳ء، ''کلیات یگانہ''، اکادمی بازیافت، کراچی، ص ۴۷)

۳۔ یگانہ کی اہلیہ کا نام کنیز حسین تھا جو اپنے نام سے کم اور یگانہ بیگم کے نام سے زیادہ پہچانی جاتی ہیں۔ یہ نام انھیں یگانہ نے دیا تھا اور وہ اپنی کتب، مضامین اور خطوط میں یہی نام لکھتے تھے۔

۴۔ ضیا عظیم آبادی ۱۹۸۰ء ''مرزا یگانہ چنگیزی، حیات اور شاعری''، اردو پبلشرز، لکھنؤ، ص ۱۳

۵۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

۱) امیر حسین نورانی ۱۹۹۵ء ''سوانح منشی نولکشور''، خدا بخش لائبریری پٹنہ، ص ۱۳۳

۲) نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر ۱۹۸۰ء ''منشی نولکشور کا مطبع''، ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ، نومبر، دسمبر ۱۹۸۰ء، ص ۹۳

''اول الذکر میں ''اودھ اخبار'' کے آخری دور کے مدیروں میں یگانہ کا نام بھی شامل ہے اور ثانی الذکر میں ''اودھ اخبار'' کے ایڈیٹروں کی مکمل فہرست دی گئی ہے اس فہرست میں بھی یگانہ کا ذکر کیا گیا ہے علاوہ ازیں بہر یانہ سے شائع ہونے والے ادبی رسالے ماہنامہ ''تعمیر'' کے منشی نولکشو رنمبر بابت اگست ۱۹۷۹ء صفحہ ۴۲ پر میں مدیران ''اودھ اخبار'' کی فہرست کو ایک چوکھٹے

میں اس طرح درج کیا گیا ہے، ''مدیران اودھ اخبار از ۱۸۵۸ تا ۱۹۵۱ء۔ اس کے نامور اور لائق ایڈیٹروں میں منشی غلام محمد خاں تپش، منشی امیر اللہ تسلیم، منشی ہادی علی اشک، قدر بلگرامی (شاگرد مرزا غالب) مولانا عبدالمجید شرر کاکوروی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، نسیم دہلوی، مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی، مفتی فخر الدین فخر، میرزا حیرت دہلوی، شیو پرشاد، سید احمد علی اشہری، منشی احمد علی کامل، نوبت رائے نظر، دوارکا پرشاد افق، دیبی پرشاد سحر، بشن نرائن در، مرزا یاس یگانہ چنگیزی، مرزا فدا حسین، پیارے لال شاکر میرٹھی، امید امیٹھوی، منشی پریم چند، مرزا عسکری، مولانا عبدالباری لکھنوی، شوکت تھانوی، امین سلونوی اور قاضی نصیر الدین شامل تھے۔ (سید جالب دہلوی، دین دیال شرر بھی ایڈیٹر رہے)''۔

مشفق خواجہ نے یگانہ کے سوانحی خاکہ میں خیال ظاہر کیا ہے کہ ''یگانہ'' کو ''اودھ اخبار'' میں ملازمت اپنے خسر حکیم مرزا محمد شفیع شیرازی کے ذریعے ملی ہوگی، جن کے نول کشور پریس والوں سے گہرے تعلقات تھے۔'' (کلیات یگانہ ص ۴۹)

۶۔ مشفق خواجہ ۲۰۰۳ء ''کلیات یگانہ''، اکادمی بازیافت، کراچی، ص ۴۷

۷۔ ایضاً، ص ۵۶

۸۔ یگانہ بنام شعلہ محررہ ۸ جون ۱۹۳۹ء ''تحقیقی ادب'' شمارہ ۲۵، کراچی، ۱۹۸۰ء

۹۔ ''تحقیقی ادب''، شمارہ ۲، کراچی، ۱۹۸۰ء

۱۰۔ یگانہ بنام شعلہ محررہ ۲۶ ستمبر ۱۹۳۹ء مخزونہ نیشنل میوزیم نمبر کراچی ۱۹۶۳/۲۱۵ یگانہ لکھتے ہیں ''اب مجھے لکھنؤ جانا چاہیے وہاں تنخ کر لیں، مہینے آرام لینے کے بعد میرا قیاس ہے کہ تم پر جو ماہانہ اخراجات کا بوجھ ۱۹۳۳ء سے پڑ رہا ہے وہ شاید بالکل ہلکا تو نہ ہوگا البتہ پچاس سے گھٹ کر تیس روپے ہو جائیں گے۔ یہ میرا اوسط تخمینہ ہے بالغرض ذرا ہمت کر کے مجھے لکھنؤ پہنچا دو۔''

۱۱۔ یگانہ بنام بلند اقبال بیگم محررہ ۲۹ مئی ۱۹۵۰ء غیر مطبوعہ خط مملوکہ بلند اقبال بیگم

۱۲۔ رضا، کالی داس گپتا، ۱۹۷۶ء ''مکتوبات جوش ملسیانی بنام کالی داس گپتا رضا''، مطبوعہ ویل پبلی کیشنز، بمبئی، صفحہ ۱۱۰۔۱۱۱

۱۳۔ یگانہ بنام من موہن تلخ محررہ ۱۷ دسمبر ۱۹۵۳ء (مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی نمبر ۲۷/۲۱۳۔۱۹۶۳ء)

۱۴۔ محررہ ۱۹ جنوری ۱۹۵۴ء ''ساقی'' کراچی، جولائی ۱۹۵۵ء صفحہ ۳۸

۱۵۔ محررہ ۱۹ دسمبر ۱۹۵۳ء، ''نقوش'' لاہور (خطوط نمبر) صفحہ ۲۵۲، مذکورہ خط تحقیقی ادب (۲) کراچی میں صفحہ ۵۲۵ پر بنام شعلہ شائع ہوا ہے۔

اصل خط نیشنل میوزیم پاکستان کراچی میں موجود ہے۔ (مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی نمبر ۳/۲۱۳-۱۹۶۳ء)

۱۶۔ صفحہ ۱۳۵، محررہ ۱۲ جولائی ۱۹۵۶ء ''مکتوبات جوش ملسیانی بنام کالی داس گپتا رضا''

۱۷۔ ۳۱ مارچ ۱۹۵۳ء کا واقعہ ہے۔ یگانہ کی غیر متوازن دماغی حالت نے بالآخر رنگ دکھایا انھوں نے اپنے ایک خط بنام نیاز فتح پوری میں چند ایسی رباعیاں لکھیں جن سے ہندوستان کی مسلم رعیت کے مذہبی جذبات بری طرح مجروح ہوئے جس کے نتیجے میں یگانہ کی سربازار تذلیل کا واقعہ رونما ہوا۔ نیاز نے اس خط کو مطالعہ کی غرض سے مولانا عبدالماجد دریا آبادی (۱۸۹۳-۱۹۷۷ء) کو دکھایا جو اس وقت لکھنؤ سے اپنا ذاتی ہفتہ وار اخبار ''صدق جدید'' نکالتے تھے۔ 'صدق جدید' ان دنوں نیاز فتح

پوری کے مطبع سے چھپتا تھا۔ مولانا دریا آبادی نے یگانہ کے خط کے نزاعی حصوں کو مشتہر کردیا اور اس پر ''صدق جدید'' کی ۲۷ مارچ ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں بہت سخت اداریہ لکھا اور یگانہ پر ایک طویل فرد جرم عائد کی جس میں یگانہ کا بیمار ہونا اور مدت سے لکھنؤ پر مسلط ہونا، مرزا غالب اور عزیز لکھنوی کے خلاف مسلسل خرافات شائع کرنا، اقبال کے خلاف زہر اگلنا، اپنا نسب نامہ چنگیز خاں جہاں سوز سے جوڑنا اور دریدہ دہنی جیسے الزامات شامل تھے۔ مولانا دریا آبادی نے مندرجہ بالا وہ تمام اسباب ایک ایک کرکے گنا دیے تھے جن کی بنا پر اہل لکھنؤ گذشتہ نصف صدی سے یگانہ کی مخالفت کرتے چلے آرہے تھے۔ اگلے روز اخبار 'سرفراز' لکھنؤ جس کی مالی معاونت نواب رام پور کرتے تھے، نے 'صدق جدید' کا اداریہ لفظ بلفظ نقل کیا اور یہ اضافہ بھی کیا کہ ''اگر کسی غیر مسلم کی طرف سے یہ دریدہ دہنی کی جاتی تو مسلمان ایک ہنگامہ برپا کردیتے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ ایک مسلمان کی ایسی فاجرانہ تحریر پر کیا کارروائی عمل میں لاتے ہیں۔'' (بہ حوالہ راہی معصوم رضا کی کتاب ''یاس یگانہ چنگیزی''، شاہین پبلشرز الہ آباد، اگست ۱۹۶۷ء، ص ۵۳)

اخبارات کے اداریوں، اپیلوں اور مہم کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ ۳۱ مارچ کی صبح ایک جم غفیر نے یگانہ کے مکان واقع منصور نگر پر دھاوا بول دیا اور انھیں زبردستی پکڑ کر تا رکول سے منہ کالا کرکے اور گلے میں جوتیوں کا ہار پہنا کر جلوس کے ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔ مجمع اپنے ساتھ ایک گدھا بھی لایا تھا جس پر ان کو بٹھانے کی کوشش کی گئی لیکن جب گدھا ان کو لے کر آگے نہ بڑھا تو انھیں پیدل چلایا گیا۔ جلوس انھیں منصور نگر، کشمیری محلہ، چوک اور نخاس کی سڑکوں پر گھماتا پھرا۔ اس دوران جلوس مسلسل نعرے بازی کرتا رہا۔ نخاس پہنچ کر یگانہ کو ایک رکشا پر بٹھایا گیا جس کو گدھا کھینچ رہا تھا اور جلوس نادان محل ہوتا ہوا امین آباد کی طرف چلا۔ جلوس زیادہ تر لڑکوں پر مشتمل تھا جو نعرے لگا رہے تھے اور یگانہ کو گالیاں دے رہے تھے۔ لوگ اکثر ان کے منہ پر تھوکتے بھی تھے۔ جلوس کے آگے ایک ڈھنڈورچی ڈھول پیٹ کر لوگوں کی توجہ ان کی طرف مبذول کرا رہا تھا۔ یگانہ کو جلوس کے پیچھے سے پولیس نے کوئی ایک گھنٹہ کے بعد اس وقت نجات دلائی جب جلوس مولوی گنج سے گزر رہا تھا۔ (مذکورہ تمام تفصیل راقم نے لکھنؤ کے روزنامہ اخبار ''قومی آواز'' (یکم اپریل ۱۹۵۳ء، صبح ایڈیشن) کی تین کالمی خبر سے اخذ کی ہے۔ راقم کے پاس اخبار مذکور کی نقل موجود ہے)۔

اسی واقعہ کے حوالے سے مشفق خواجہ لکھتے ہیں ''۱۹۵۳ء آیا تو یہ یگانہ کی زندگی کا بدترین سال تھا۔ بڑھاپے، تنہائی اور مسلسل بیماری نے یگانہ کی ذہنی صحت کو بھی متاثر کیا۔ اسی متزلزل ذہنی کیفیت میں انھوں نے کچھ قابل اعتراض رباعیاں لکھیں اور مختلف اخبارات کو بھیج دیں۔ ایک ہفتہ وار اخبار [''صدق جدید'' لکھنؤ] نے یگانہ کی قابل اعتراض رباعیاں جزواً شائع کردیں اور سخت مذمتی اداریہ لکھا۔ ایک روزنامے [''روزنامہ سرفراز'' لکھنؤ] نے اس معاملے کو اچھالا جس کا نہایت افسوسناک نتیجہ نکلا۔ ۷۰ سالہ بوڑھے اور بیمار شخص کو جس کی ذہنی حالت درست نہیں تھی، سربازار رسوا کیا گیا۔ پولیس کی مداخلت سے جان بچ گئی ورنہ رسوا کرنے والوں نے معاملے کو آخری حد تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی'' (کلیات یگانہ، ص ۹)۔

۱۸۔ تحریر ۱۸ جولائی ۱۹۵۳ء مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی، نمبر ۲۱۵/۷۳-۱۹۶۳ء

۱۹۔ محررہ ۱۳ فروری ۱۹۵۴ء، مخزونہ نیشنل میوزیم، کراچی، نمبر ۷۹/ ۲۱۵- ۱۹۶۳ء

۲۰۔ محررہ ۲۸ مارچ ۱۹۵۴ء، ''تخلیقی ادب''، شمارہ ۲، کراچی، ص ۵۱۸

۲۱۔ یگانہ بنام آغا جان محررہ ۲۳ ستمبر ۱۹۵۵ء، مشمولہ ''نقوش''، لاہور (خطوط نمبر)، ص ۲۰۰

۲۲۔ محررہ ۲۴ جون ۱۹۵۴ء، مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی نمبر ۶۲/ ۲۱۵۔ ۱۹۶۳ء

۲۳۔ نیر مسعود، ڈاکٹر، ۱۹۸۵ء، ''یگانہ کے معرکے'' مشمولہ ''شاعر''، بمبئی، صفحہ ۷۸

۲۴۔ بلند اقبال بیگم سے راقم کی ملاقات بتاریخ ۱۰ نومبر ۱۹۸۳ء بمقام بلند اقبال کی صاحب زادی شہناز اقبال کی رہائش گاہ واقع ناظم آباد، کراچی

۲۵۔ محمد طفیل، ۱۹۷۰ء، ''جناب''، ادارہ فروغ اردو، لاہور، صفحہ ۱۲۷

۲۶۔ محررہ ۱۹ دسمبر ۱۹۵۴ء، ''نقوش'' لاہور (خطوط نمبر)، صفحہ ۲۵۳

۲۷۔ بلند اقبال بیگم سے راقم کی ملاقات بتاریخ ۱۰ نومبر ۱۹۸۳ء بمقام بلند اقبال کی صاحب زادی شہناز اقبال کی رہائش گاہ واقع ناظم آباد، کراچی

۲۸۔ 'نقوش' لاہور (خطوط نمبر)، صفحہ ۲۰۰

۲۹۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی، 'مسعود حسن رضوی ادیب، حیات اور کارنامے''، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (ناچھپا مسودہ)، ص ۷۹

۳۰۔ نیر مسعود، ڈاکٹر، بنام راقم بتاریخ ۷ اپریل ۱۹۸۶ء

۳۱۔ دو ماہی ''اکادمی'' لکھنؤ، جنوری، فروری ۱۹۸۵ء، صفحہ ۳۵

۳۲۔ نیر مسعود، ڈاکٹر، ۱۹۸۵ء، 'خطوط مشاہیر بنام مسعود حسن رضوی ادیب''، اتر پردیش، اردو اکادمی، لکھنؤ، صفحہ ۲۵۲

۳۳۔ محررہ ۹ ستمبر ۱۹۵۵ء، مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی نمبر ۲۳/ ۲۱۵۔ ۱۹۶۳ء

۳۴۔ محررہ ۲۳ ستمبر ۱۹۵۵ء، 'نقوش' لاہور (خطوط نمبر) صفحہ ۲۰۰

۳۵۔ محررہ ۳ جولائی ۱۹۵۴ء　ایضاً، صفحہ ۲۵۳

۳۶۔ محررہ ۱۱ ستمبر ۱۹۵۵ء　ایضاً، صفحہ ۲۵۴

۳۷۔ یگانہ کے داماد، بلند اقبال کے شوہر

۳۸۔ غیر مطبوعہ مکتوب محررہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۵ء، مملوکہ بلند اقبال بیگم

۳۹۔ بلند اقبال بیگم سے راقم کی ملاقات بتاریخ ۱۰ نومبر ۱۹۸۳ء، بمقام بلند اقبال بیگم کی صاحب زادی شہناز اقبال کی رہائش گاہ واقع ناظم آباد کراچی

۴۰۔ ضیا عظیم آبادی، ۱۹۸۰ء، ''مرزا یگانہ چنگیزی، حیات اور شاعری''، اردو پبلشرز، لکھنؤ، صفحہ ۳۹، اس امر کی تائید مالک رام کے خط (محررہ ۷ ستمبر ۱۹۸۲ء) بنام راقم سے بھی ہوتی ہے۔

۴۱۔ 'تخلیقی ادب' شمارہ ۲، کراچی، صفحہ ۴۳۳

۴۲۔ ایضاً، صفحہ ۳۱۷۔۳۱۸

۴۳۔ اشاعت بتاریخ ۶ فروری ۱۹۵۶ء یگانہ کی وفات پر چند مضامین بھی شائع ہوئے، تفصیل درج ذیل ہے:۔

(۱) طاہر جمیل، فروری ۱۹۵۶ء "مرزا یاس یگانہ چنگیزی"، مطبوعہ روزنامہ جنگ کراچی

(۲) اعجاز صدیقی، مارچ ۱۹۵۶ء "آہ یگانہ چنگیزی"، مطبوعہ شاعر بمبئی

(۳) آغا جان (ابن یگانہ)، مارچ ۱۹۵۶ء "یگانہ کا دورِ آخریں"، مطبوعہ معیار، کراچی

علاوہ ازیں محسن احسن تلخ کے دو قطعات 'ساقی' کراچی، مارچ ۱۹۵۶ء (ص ۳۴) میں شائع ہوئے۔

اے جورِ جہاں مرگِ یگانہ کی ہے بات
یہ جیت ہے تیری نہ خودی کی ہے مات
آجا کہ نبرد آزما ہو لیں ہم بھی
ہو جائیں پھر اک بار ذرا دو دو ہات

بھارت سے تجھے پرُ کربِ عالم کی قسم
سوزِ غالب کی، میر کے غم کی قسم
ہر لفظ سے مرگِ یاس پہ خوں ٹپکے
اے اردو تجھ کو اپنے دمِ غم کی قسم

۴۴۔ یگانہ کے کتبۂ قبر کی عبارت ڈاکٹر نیر مسعود نے راقم کے نام اپنے مکتوب محررہ ۱۳ جولائی ۱۹۸۸ء میں نقل کر کے بھجوائی۔

Abstract

Yagana was a hermit poet in history of Urdu poetry. His life was full of struggle. He wandered city to city in search of employment. In the last years of his life government of India granted him hundred rupees per month as a living allowance in those days. His wife was in Pakistan so he tried hard that she should stay with him at Lucknow. He succeeded to do so but due to his mental abnormality, she could not stay with him and returned back to Pakistan. In last days of his life Yagana lived in the house of his friend Professor Masood Hassan Rizvi Adeeb but one rainy night he left that place and came to the house of his brother-in-Law, where he died at the midnight of third and fourth February 1956.

معیار: علمی و تحقیقی مجلہ شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد ۲، شمارہ ۳، جولائی - دسمبر ۲۰۰۹ء

کتاب الجواہر: فصلِ اوّل

مصنف: محمد بن احمد البیرونی / اردو ترجمہ: عطش درّانی*

کتاب الجماہر فی معرفۃ الجواہر، محمد بن احمد البیرونی (۳۶۲ھ/۹۷۳ء۔۔۔ ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء) کی وہ معرکتہ الآرا تصنیف ہے جو علم جواہر اور طبعی کیمیا میں آج بھی ایک بے مثل حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا عربی متن حیدر آباد دکن سے ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اس کا انگریزی ترجمہ حکیم محمد سعید نے کیا تھا جو ہجرہ کونسل اسلام آباد سے ۱۴۱۰ھ/۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ اب اس کی فصل اوّل کا اُردو ترجمہ اس کی ادبی اور علمی شان اور اہمیت کے حوالے سے پیش کیا جا رہا ہے۔

بسم اللہ الرحمان الرحیم

الحمدللہ رب العالمین الذی لما توحد بالازل والابد۔۔۔۔۔۔۔۔۔

حمد و ثنا ہے اللہ کے لیے جو کائنات کی تمام اقلیموں کا پروردگار ہے۔ وہ ازل سے ابد تک واحد ہے اور دوام کے ساتھ منفرد ہے۔ وہ دنیا میں فنا کی علت اور بقا کی اساس کے ساتھ قائم ہے[1] اور مصائب اور مشکلات میں سلامتی اور صحت کا مرجع ہے۔ رزق تقسیم کرنے، قسمتیں بنانے اور اسباب مہیا کرنے والا ہے (سبحانہ)[2]۔ وہ اعمال پر اسی طرح محیط ہے جیسے سورج اور چاند مسخر ہیں۔ وہ بادلوں میں پانی کو اٹھائے ہوئے ہے اور جب وہ بھاری ہو جاتے ہیں تو ہوائیں انھیں پیاسی زمینوں کی طرف لے جاتی ہیں اور یوں زمین پر برکتوں والے پانی کا نزول ہوتا ہے۔ جب زمین انواع و اقسام کی کثرت ظاہر کرتی ہے جو انسانوں کے لیے دولت اور حیوانوں کے لیے چارا مہیا کرتی ہے۔ یہ سب کچھ سمندروں کی طرف اور اپنے مستقر کی طرف بہہ نکلتا ہے (وہ اس کے ٹھکانے کو جانتا ہے)۔[3] اسی کو علم ہے کہ زمین کی طرف کیا آتا ہے اور اس میں سے کیا خارج ہوتا ہے اور آسمان سے کیا نازل ہوتا ہے اور اس کی طرف کیا اٹھتا ہے۔ اس کے علم کا احاطہ ہر شے پر ہے۔ اسی نے اپنی قدرت اور حکمت کے ساتھ یہ سب احکام دے رکھے ہیں۔ لاکھوں درود ہوں اس ہستی پر جس نے اندھیروں سے ہمیں نکالا، رسالت اچھی

---

* مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔

۱۔ انگریزی ترجمے میں یہ جملہ موجود نہیں۔

۲۔ انگریزی ترجمے میں "اسلام کو سب" درج کیا گیا ہے۔

۳۔ بعض متون میں یا ساقی مفہوم ہے۔

(محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ختم ہوتی۔ ان پر بھی سلام جو ہدایت پا گئے اور وہ جو ان کی آل سے ہوئے اور جو اہل بیت ہو کر معزز ہوئے اور ان کے تمام نجیب صحابیوں پر بھی۔ یقیناً توفیق اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

فصل اوّل

ہماری تمام حمد و ثنا اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جس نے تمام مخلوقات کو اسی طرح بنایا کہ ہر شے خود کو قائم رکھ سکتی ہے اور ایک مقررہ مدت تک زندہ و قائم رہتی ہے۔ جس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی اور جس کی نشوونما کے لیے اس نے اسباب اور غذا پیدا کی اور تھوڑی سی غذا پر اکتفا کرتے ہوئے ہر قسم کی روئیدگی بڑھتی ہے اور غذا ہضم ہونے کے بعد (مخلوق کو) ثابت اور قائم رکھتی ہے [1]۔ رزق ہر طرف سے ملتا ہے اور عروق میں جذب ہو کر پانی کے ساتھ پودوں کی رگوں میں پہنچتا ہے جو اس کی جڑوں سے آتا ہے اور دھوپ میں ہوا گرم ہو کر شاخوں سے اس کی تبخیر کرتی ہے اور اسے اوپر کی طرف لے جاتی ہے اور جو کچھ نیچے سے حاصل ہوتا ہے شاخوں تک پہنچتا ہے اور ان میں نمو مقصود یعنی پتے، پھول اور پھل پیدا کرتا ہے۔

حیوان کے اعضائے انہضام سرعت کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ حیوان ارادے سے حرکت کرتے ہیں۔ وہ جامد نہیں رہ سکتے۔ پیدائش کے وقت اپنی ماں سے غذا حاصل کرتے ہیں۔ پھر اکناف و اطراف کی جانب حرکت کرنے لگتے ہیں تو اس منبع سے محروم ہونے کے باوجود دیگر ذرائع سے رزق حاصل کر کے اسے کھاتے، چباتے اور ہضم کرتے ہیں۔ اللہ نے ان کے حواس خمسہ کو اس طرح سے پیدا کیا ہے کہ ان کی مدد سے وہ رزق تلاش کرتے اور من پسند چیزیں کھاتے اور خطرناک چیزوں سے بچتے ہیں۔ یہاں بصارت ان کے کام آتی ہے۔ سامعہ سے آوازوں کا ادراک ہوتا ہے اور انھیں تحفظ ملتا ہے۔ شامہ (سونگھنے) کی قوتوں سے اشیاء کے معیار اور ضروریات کا اندازہ ہوتا ہے تا کہ وہ یہ جان سکیں کہ کون سی غذا ان کے موافق ہے اور کیا وہ اسے کھائیں یا چھوڑ دیں۔ لامسہ کی قوت سے گرمی اور سردی، خشک اور تر اور سخت اور نرم کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح حیوان کا قیام دنیا میں یقینی ہوتا ہے اور وہ بھاگتا پھرتا ہے [2]۔

ترجمہ [3]

حواس معتدل اثرات ہی کو محسوس کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ حد سے نہ بڑھ جائیں اور نقصان نہ پہنچائیں مثلاً بصری قوت بصارت کے لیے ہے۔ روشنی مختلف اشیا کو ان کے رنگوں اور خاصیتوں کے ساتھ ظاہر کرتی ہے یعنی ان کے خدوخال اور اشکال و ہیات وغیرہ۔ سماعت آوازوں کو محسوس کرتی ہے جو ہوا کے دوش پر منتقل ہوتی ہیں۔ شامہ سے بُو کا ادراک ہوتا ہے جو بُخارات کی صورت میں عطریات سے نکلتی ہے اور اس کے اجزا ہوا میں پھیل جاتے ہیں۔ ذائقے کی قوت کھانوں کو پہچانتی ہے۔ اس کے لیے زبان، تالو اور حلق رطوبات کا سہارا لیتے ہیں۔ اگر یہ خشک ہوں تو جسم ذائقے کو محسوس نہیں کر سکتا۔

یہ چاروں حواس جسم کے مختلف حصوں سے وابستہ ہیں اور اپنی حد سے نہیں بڑھ سکتے۔ پانچویں حس لامسہ کی ہے جو سارے جسم میں موجود ہوتی ہے اور تمام اعضا سے متعلق ہے اور ان کے ذریعے ہر جگہ ہوتی ہے۔ اس کے لیے کوئی ایک عضو مخصوص نہیں، جیسے ہی کوئی چیز جسم کے ساتھ چھوتی ہے یہ احساس بیدار ہو جاتا ہے اور چونکہ پہلے جلد چھوتی ہے اس لیے جلد ہی سب سے پہلے لمس کی قوت کا اظہار کرتی ہے۔ آہستہ آہستہ اندرونی اعضا متاثر ہوتے ہیں اور پھر جلد پر سے لمس کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب خوراک اندرونی اعضا میں پہنچتی ہے تو اندرونی طور پر ان کا احساس نہیں ہوتا۔

ترجمہ

حیوانوں میں حواس حصول آب و دانہ کا ذریعہ ہیں لیکن انسان اپنی قوتِ تعقل کی بنا پر ان پر تفوق پاتا ہے۔ چنانچہ وہ ان حیوانوں میں افضل ترین ہے۔ اسی لیے وہ خلافتِ ارضی کا اہل ٹھہرتا ہے اور یوں وہ سیادت و قیادت انجام دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ زمین طوعاً کرہاً اس کے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔[۴]

> ''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہماری قدرت نے ان کے لیے کیسے مویشی پیدا کیے ہیں جن کے وہ مالک بن جاتے ہیں اور وہ ان کے مطیع ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض پر وہ سواری کرتے ہیں اور بعض کو خوراک ٹھہراتے ہیں۔ ان سے اُن کے لیے فائدے اور مشروب حاصل ہوتے ہیں۔ کیا وہ شکرگزار نہیں بنتے؟'' (یاسین ۳۶: ۷۱ تا ۷۳)

کیا یہ انسان کے لیے اللہ کی نعمتیں نہیں جبکہ وہ حقیر اشیاء پر بھی قابو پانے کا اہل نہیں۔ اسے تو اتنی بھی قوت حاصل نہیں کہ وہ ان قوتوں سے اپنا دفاع کر سکے جن کو اس نے مسخر کر لیا ہے۔ اللہ سبحانہٗ کا فرمان یہاں منطبق ہوتا ہے کہ:

> ''پاک ہے وہ ذات جس نے اسے تسخیر کر دیا جب کہ ہم اس کا اہل نہ تھے'' (الزخرف ۴۳: ۱۳)۔

جب اسے یہ انعامات عطا ہوئے اور وہ ان مخلوقات میں سے منتخب ہوا کہ وہ سعی و کوشش سے چیزیں حاصل کرے تو وہ حواس سماعت اور بصارت ہی محسوسات سے معقولات کے درمیان واسطہ ٹھہرے۔ بصارت اس امر پر شاہد ہوئی کہ اس سے مخلوقات میں حکمت کے آثار اور مصنوعات سے صانع کا استدلال کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

> ''ہم انھیں آفاق اور ان کے اپنے نفسوں میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے جس سے انھیں باور ہو جائے گا کہ یہ حق ہے''۔ (فصلت ۴۱: ۵۳)

پھر فرمایا:

> ''کس نے سات آسمان تہ در تہ پیدا کیے۔ تم (اے محمدؐ) رحمان کی تخلیق میں کوئی تفاوت نہ دیکھو گے۔ پھر دیکھو! کیا تمھیں کوئی نقص نظر آتا ہے۔ بار بار نظر دوڑاؤ تمھاری نظر مایوس ہو کر لوٹ آئے گی''۔ (الملک ۶۷: ۳-۴)

نیز فرمایا:

> ''کتنے ہی لوگ ہیں جو زمین و آسمان کی نشانیوں سے منہ موڑ کر گزر جاتے ہیں''۔ (یوسف ۱۲: ۱۰۵)

انسان کو حسِ سماعت اس لیے عطا ہوئی ہے کہ وہ امر و نہی کا ادراک کر سکے اور حق و صداقت کی رسی کو مضبوطی سے تھام لے اور اللہ کا قرب حاصل کرے اور اطمینانِ قلب پائے۔ یہ ایسی چیز نہیں جو خاص و عام سے مخفی ہو۔ اعشیٰ بن ربیعہ کا شعر ہے ؎

کان فؤادی بین جنبی عالم
بما ابصرت عینی و ما سمعت أذنی

(کاش میرا قلب وہی کچھ جانتا کہ عالم میں جو کچھ میری آنکھیں دیکھتی اور میرے کان سنتے ہیں)۔[۵]

یہاں شاعر نے اثبات کیا ہے کہ حصولِ علم کے لیے یہ دونوں حواس ہی ذریعہ ہیں لیکن انجمن قلب کے لیے ہے ذہن کے لیے نہیں جیسا کہ عام طور پر کہا گیا ہے اور فرمانِ الٰہی ہے:

> ''بے شک سمع و بصر و فؤاد (قلب)، سب سے پوچھا جائے گا''۔ (الاسراء ۱۷: ۳۶)

ابوتمام کا شعر ہے ؎

وما قالت الحکماء طرًّا
لسان المرء من خدم الفؤاد

(تمام اہلِ دانش کہتے ہیں کہ زبان قلب کی خادمہ ہے)

جمیل بن معمر العذری کا شعر ہے ؎

اذا کنا بمنزلة للھو
یخاف السمع فیه والعیونا

(اپنے کھیلوں میں مشغول ہوتے وقت ہمیں کان اور آنکھ سے خوف ہوتا ہے)

اس کا سبب یہ ہے کہ یہ آلات رقیب ہیں۔ وہ مخل لذت ہوتے اور روانپاتے ہیں۔

نعمت کی قدر اس کے کھو جانے کے بعد آتی ہے اور سماعت کا فائدہ صرف بہرے کو اور بصارت کا اندھے کو معلوم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''کیا تم اندھوں کو ہدایت نہیں دے سکتے خواہ وہ دیکھ نہ سکیں''۔ (یونس ۱۰:۴۳)

نیز اسی سورہ میں فرمایا:

''کیا تم بہروں کو سنا نہیں سکتے خواہ وہ عقل نہیں رکھتے''۔ (یونس ۱۰:۴۲)

اللہ نے منکرین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ اس کے سوا کون ہے جو دن اور رات کو لاتا ہے۔ دیگر حواس نفس سے ملحق اور نفسانیت کی نسبت حیوانیت کے قریب ہیں۔ یہ بجا ہے کہ ان (تمام) حواس کے ذریعے انسان فکر و استنباط کی اعلیٰ سطح پر پہنچ پایا ہے۔

ترویحہ

اُنس متجانس ہونے کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جنس باہم جنس پرواز کرتا ہے۔ پرندے اپنے ہی رفیق کو ڈھونڈتے ہیں۔ گونگے کے نزدیک سب لوگ گونگے ہیں کیونکہ وہ دوسروں سے ایسا کوئی استفادہ نہیں کرسکتا۔ اگرچہ علامات بنانے اور انگلیاں متحرک کرنے سے وہ اپنا مطلب بیان کرسکتا ہے۔ گونگا دوسرے گونگے سے صرف اسی وقت مسرت حاصل کرسکتا ہے جب وہ اسے اس قابل پاتا ہے کہ وہ اسے سمجھ سکے جبکہ عام طور پر دوسرے لوگ اسے سمجھ نہیں پاتے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''وہی ہے جس نے تمھیں نفسِ واحدہ سے پیدا کیا اور اسی سے تمھارے جوڑے بنائے جن سے سکون پاتے ہو''۔
(الاعراف ۷:۱۸۹)

پھر فرمایا:

''اور اس کی نشانیاں یہ ہیں کہ اس نے تمھی میں سے تمھارے ازواج پیدا کیے جن سے تم سکون پاتے ہو اور اس نے تمھارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا''۔ (الروم ۳۰:۲۱)

باہمی الفت خوف اور نفرت کی قیمت پر عشق کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ اسی لیے ان کے مابین کوئی مشترک عنصر موجود ہوتا ہے جو باہمی الفت میں گرفتار رہتے ہیں جس کی بنا پر محبت فزوں تر ہوتی رہتی ہے۔ انسان کی آبادی بڑھنے اور انسانوں کے باہمی اشتراک و تعاون ہی

کے سبب سے بستیاں اور شہر وجود میں آتے اور پھیلتے جاتے ہیں۔

ترویحہ

انسان اپنی جبلت کے لحاظ سے مختلف خصوصیات سے وجود پذیر ہوا ہے جو اپنی مقتضائے فطرت کے ساتھ اس میں جمع ہوتی ہیں۔ نفس یا دم اس کے مزاج بدنی کا ماتحت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فرد منفرد اور مختلف مزاج رکھتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی چیز جو مختلف اشیاء کے ملاپ سے وجود پذیر ہوتی ہے اس وقت فوراً معدوم ہو جاتی ہے جب انھیں جوڑنے والی قوت جاتی جاتی ہے اور ہر مخالف اپنی ضد پر اثر چھوڑتا ہے اس لیے انسان اور حیوان بیماریوں اور آفات و حوادث کا شکار ہوتا ہے کیونکہ بیرونی مخالف اندرونی ضد کے ساتھ ٹکراتا ہے۔

انسان اپنی ذات میں انھیں دفع کرنے کے ذرائع نہیں پاتا۔ چنانچہ بیرونی قوتیں اس پر نحوستوں اور بیماریوں کی صورت میں اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان پر قابو پانے کے لیے وہ بیرونی عناصر اور محرکات پر انحصار کرتا ہے تاکہ وہ اس کی مدد کو آئیں۔ اس لیے وہ ان کا محتاج ہوتا ہے کیونکہ وہ ان سے تحفظ حاصل کرتا ہے۔ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے۔

تموت مع المرء حاجاته
وتبقى له حاجة ما بقي

(انسان کے ساتھ ہی ساری خواہشیں مر جاتی ہیں اور جب تک زندہ رہتا ہے وہ اس کے ہمراہ رہتی ہیں)

یہ تمام نحوستیں اور بیماریاں جنس واحد نہیں، بس وہ ان کا بار برداشت کرتا ہے اور ایک عنصر اس کے لیے کافی ہونا چاہیے۔ ان کی کئی انواع ہیں اور یوں صرف ایک طرح کی مزاحمت ان سب کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ اسی لیے انسان کو تہذیب و تمدن کی ضرورت لاحق ہوئی لیکن اپنی فطرت کے لحاظ سے وہ متکبر خود اور جھگڑالو ہے۔ وہ اپنی طاقت اور اپنے تشکیل کردہ گروہ سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ لیکن جیسا کہ فطرت کا دستور ہے بستیوں میں یہ گروہ مختلف جذبات اور دباؤ کے تحت وجود میں آتے ہیں کیونکہ تمام بنی نوع انسان ایک ہی قوت کی طرف مائل نہیں ہوتے اور افضل اعلیٰ کی پیروی نہیں کرتے اور سب یکسانیت کا شکار نہیں ہوتے۔

چونکہ مختلف گروہوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہوتے ہیں اس لیے مختلف قسم کے پیشے اور صنعتیں وجود میں آتی ہیں۔ با اقتدار گروہ جبر و زور کے ذریعے دوسروں پر قابو پاتا اور ان کی محنت کا معاوضہ ادا کرتا ہے لیکن صرف طاقت کے بل پر کام نہیں کروایا جا سکتا۔ مختلف گروہوں کی مختلف ضروریات اور مختلف توجہ کے باعث انھیں مختلف اوقات پر لاگو کرنا ہے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ ایک گروہ کے پاس ایک جنس کی کثرت ہوتی ہے یا وہ اس کے استعمال سے آگاہ نہیں ہوتا۔ یہ بات لوگوں میں رقم کی بجائے قیمتی اشیاء کے تبادلے کا باعث بنتی ہے۔ چنانچہ لوگوں نے ایسی اشیاء کا انتخاب کرنا شروع کیا جو قیمتی، دلپسند، نادر اور عرصے تک رہنے والی ہوں۔ اسی لیے انسان نے اشیاء کی تقطیع، بہتر مادے کے انتخاب، انھیں چھوٹا بڑا کرنے اور ان پر یکسانیت کا اصول لاگو کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس نے ان پر تصویریں اور نمونے کندہ کرنا شروع کیے لیکن اس طرح کہ ان کی اصل شکل برقرار رہے۔

اللہ عزوجل نے انسان کو تخلیقات کے اسباب پر آلات اور فہم و ادراک کی نشانیوں پر عقل سے کام لینے کی قدرت عطا کی ہے۔ اس نے انسان کی طرف رسولوں کو اس کی عاقبت سنوارنے کے لیے بھیجا۔ بادشاہوں کو اپنے خلیفہ کے طور پر مقرر کیا تاکہ وہ دنیاوی امور میں انصاف اور مساوات قائم کریں۔

پس اللہ نے اپنی وسیع تر رحمت اور محبت کے ناتے انسان کی تخلیق سے بہت پہلے ہی کو ساروں کے ایسے مخفی مادے بکھر دیے جنھیں وہ اپنے فائدے کے لیے کھود کر نکال سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

''یہ زمین جو ہم نے بچھائی ہے، اس میں مضبوط پہاڑ جمائے ہیں اور اس میں موزوں اشیاء پیدا ہونے کا سبب ٹھہرایا ہے''۔ (الحجر ۱۵:۱۹)

اللہ نے انسانوں کے تمام پیشوں اور ہنروں کو چاندی اور سونے پر رائج کیا ہے۔[۹] یہ دھاتیں اشیا کی قیمتیں مقرر کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ اللہ نے انسان کو ان دھاتوں کے حصول کا طریقہ بتایا ہے چنانچہ وہ انھیں معادن سے نکالتا ہے جہاں یہ اشیا نامعلوم مدت سے موجود تھیں۔ وہ انھیں جعل کے دھوکے سے محفوظ رکھتا ہے اور پگھلا کر ساری ملاوٹیں نکال دیتا ہے۔ ہر حق کے مقابل ویسا ہی باطل موجود ہے۔ باطل کا سلیقہ چاہتا ہے کہ باطل کی تبلیغ ہو۔ اس لیے حق کے پیروکاروں پر لازم ہے کہ وہ اٹھ کھڑے ہوں کیونکہ وہ انسانوں میں خلیفہ کے طور پر منتخب ہوئے ہیں تاکہ وہ اللہ کے احکام نافذ کریں، انصاف اور مساوات قائم کریں اور ہر پست و بالا، کمزور و طاقتور کو ایک نظر سے دیکھیں۔ اللہ انھیں یہ غرض و غایت پوری کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ترویجہ

جب اللہ نے معاملاتِ حیات اور تصرفاتِ معاش کو سونے اور چاندی کے ذریعے سہل کر دیا تو انسان ان کے مالک بن بیٹھے۔ ان کے دل ان کی طرف مائل ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ سونا اور چاندی ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے حصول اور ذخیرے کے حوالے سے انسان لالچی اور حریص بن گئے۔ چنانچہ دونوں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو گیا۔ ان کی یہ حیثیت ان کی داخلی خاصیتوں کی بنا پر حاصل نہیں ہوئی بلکہ اس کا باعث انسان کا بنایا ہوا نظامِ مبادلہ ہے اور نہ ہی یہ دھاتیں کسی شرعی حوالے سے بہتر درجے کی مالک ٹھہرتی ہیں۔ دونوں پتھری تو ہیں۔ اپنی ماہیت میں وہ نہ تو بھوک کو مٹا سکتی ہیں اور نہ پیاس کو اور نہ ہی وہ کوئی مصیبت یا خوف دور کر سکتی ہیں۔ ایسی چیز جو نہ تو کسی ذی روح کی غذا بن سکتی ہے اور نہ ہی اس کی بقا کے لیے ضروری ہے اور نہ ہی اسے گرمی سردی سے بچا سکتی ہے اور نہ ہی اسے باطل سے دور رکھ سکتی ہے تو پھر کیوں کر درست قرار دی جا سکتی ہے۔ ان کا جواز صرف استعارۃً اور مجازاً ہی ہو سکتا ہے کیونکہ ایسے عامل کے ذریعے ہی انسان اپنی ضرورتیں پوری کرتا ہے[۷]........... یہی وجہ ہے کہ انھیں عالمی قبولیت حاصل ہے کیونکہ وہ ہر طرح کے معاملات طے کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''یہ مقرر ہو چکا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آن لگتی ہے تو وہ اپنی دولت کے بارے میں وصیت...............'' (البقرہ ۲:۱۸۰)

نیز فرمایا:

''یہ خیر کو روکتی، گناہ کی ترغیب.....'' (القلم ۶۸:۱۲)

اور ایک اور جگہ فرمایا:

''اور وہ اس کی محبت میں شدید ہو جاتا ہے''۔ (العادیات ۱۰۰:۸)

عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ جو شخص دولت خرچ کرتا ہے وہ تمام اچھی چیزیں لے سکتا ہے کیونکہ دولت چیزیں خرید سکتی ہے اور یہ دولت

کی خاصیت ہے۔

ایک بحری مسافر نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے وہ جس کشتی میں سفر کر رہا تھا وہ سمندری طوفان کے باعث کسی نامعلوم جزیرے تک پہنچ گئی۔ وہ اور اس کے ساتھی ساحل پر اترے اور جزیرے کے اندر چلے گئے۔ اس نے اپنے ساتھی کو ایک دینار دیا تا کہ وہ ضرورت کی اشیا خرید سکے۔ اس کے ساتھی نے سکے کو الٹا کیا، اسے سونگھا اور اس پر پھونکا۔ جب اس کے حواس خمسہ سکے سے کچھ حاصل نہ کر پائے تو اس نے اسے واپس کر دیا کیونکہ وہ کسی ایسی چیز کے بدلے میں کوئی اچھی چیز نہیں دے سکتا جو بدلے میں کوئی قابلِ قدر شے نہ لا سکتی ہو۔ دراصل مبادلہ کا یہ اصول تو تمدن کی پیداوار تھا اور اول بدل کا یہ نظام کسی معاشی نظام کی بنا پر قائم تھا لیکن رسم و رواج نے اول بدل کا مفاد دھات کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ اللہ نے دلوں کو دھاتوں کی محبت میں اس لیے مبتلا کیا ہے تا کہ وہ انسان کی بہتری اور بھلائی کے لیے خرچ ہوں اور اس لیے نہیں کہ یہ دھاتیں بذات خود کوئی فضیلت رکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''جان لو کہ اس دنیا کی زندگی مال و اولاد کے حوالے سے صرف کھیل تماشا ہے اور زینت اور تفاخر اور تکاثر ہے''۔

(الحدید ۵۷:۲۰)

نیز فرمایا:

''انسان کے لیے مرغوب بنا دیے گئے ہیں عورتیں اور بیٹے اور چاندی سونے کے ذخیرے اور گھوڑے جو نشان زدہ ہو کر دوڑتے ہیں اور مویشی اور زمینیں۔ یہ صرف دنیاوی زندگی کا سامان ہیں اور اللہ کے پاس بہتر اجر ہے''۔

(آل عمران ۳:۱۴)

چنانچہ اللہ نے ہمیں بتا دیا ہے کہ ثقافت کی بہتری عورتوں میں، آنکھوں کی ٹھنڈک بچوں میں، دل کی قوت دولت سے حاصل ہوتی ہے لیکن دولت جیسے، سلطنت، رہن اور زراعت سے حاصل ہوتی ہے اور جو اسے ذخیرہ کرتے ہیں ان کے بارے میں فرمایا:

''جو لوگ سونے چاندی کا ذخیرہ کرتے ہیں اور انھیں اللہ کے راستے پر خرچ نہیں کرتے تو انھیں (اے محمدؐ) دردناک عذاب کی بشارت دے دو''۔ (التوبہ ۹:۳۴)

''اللہ کی سنت'' یہ ہے کہ ایسے لوگ اس لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ وہ دوسروں کی بھلائی کے لیے کام کریں تا کہ وہ بھی اپنی ضرورتیں پوری کر سکیں، دولت کو ایک سے دوسرے ہاتھ تک جانے دیں لیکن اگر دولت روک لی جائے تو لوگ اس سے فائدہ اٹھانے سے محروم ہو جاتے ہیں اور یہ بات اللہ کے حکم کی خلاف ورزی ہوگی۔ اس لیے ان دھاتوں کو اس حالت میں لوٹا دیا جائے گا جیسا کہ وہ زمین میں دفن کی صورت میں تھیں۔ یہ بات کسی بچے کو رحم مادر میں واپس بھیجنے کی مانند ہے۔ ایک بار جب سونا اور چاندی معدن سے نکال لیے جائیں تو وہ ہل چلاتے ہوئے کھیت یا قربانی کے جانور کی مانند ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کا کوئی اور مصرف اس کے سوا نہیں رہ جاتا کہ انھیں استعمال میں لایا جائے۔ یہی صورت معدن سے نکالی جانے والی دھاتوں کی ہے۔ انھیں درہم و دینار کی شکل میں ڈھالا جائے اور تجارت کے لیے ایک سے دوسرے ہاتھ تک منتقل ہوں اور یوں حقوق پورے ہوں۔

ترویجہ

انسانی خصوصیات مثلاً آدمیت اور حرمت اس کے حالات اور خاندان سے متعلق ہوتی ہیں لیکن قوت نہیں۔ یہ آخری خصوصیت کوئی

متقل نوعیت نہیں رکھتی۔ انسان اپنی ذات اور دولت کی ملکیت کا دعویٰ کر سکتا ہے لیکن جب دوسروں کی ذمہ داریاں اٹھاتا ہے تو مشکل میں پڑ جاتا ہے۔ وہ بخیل بھی ہو سکتے ہیں اور وہ اپنی اس دولت میں خست اور بخل کا مظاہرہ نہیں کرتا جو اس کے لیے مباح اور دوسروں کے لیے حرام ہوتی ہے۔ وہ مہربان ہوتا ہے اور اپنے اثر و رسوخ، تلطف، حلیمی، سنجیدگی، صبر و استقامت، تواضع اور شائستگی کے حوالے سے شہرت پاتا ہے۔ وہ اعلیٰ قدروں کی طرف بڑھتا ہے گو ان کا اہل نہ ہو لیکن ان کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

جعفر برمکی نے بصرہ کے ایک شخص کا ذکر کیا ہے جو پھٹے پرانے کپڑے پہنتا تھا لیکن دوسرے کی ضرورتیں پوری کرنے میں مستعد رہتا تھا۔ جب اس سے یہ پوچھا گیا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے تو اس نے جواب دیا کہ اس نے بہترین شراب سے لطف اٹھایا، اعلیٰ موسیقاروں سے عمدہ موسیقی سنی اور ان خوبصورت لمحوں میں مگن ہوا جب بلبلیں درختوں پر چہچہاتی تھیں، لیکن حقیقی مسرت اسے کبھی حاصل نہ ہوئی جیسی ان لوگوں کے ہونٹوں سے نکلنے والے الفاظ سے ملتی ہے جن کی خدمت میں وہ سرگرم رہتا ہے۔

فتوت مزاج کی حلیمی کا دوسرا متبادل نام ہے جس میں دوسروں پر دولت خرچ کرنا، معروف امور میں مشغول رہنا اور دوسروں کو دکھ اور تکلیف پہنچانے سے باز رہنا ہے۔

جب ایک بار ایک شخص نے اسماعیل بن احمد سامانی کی عدالت میں دعویٰ دائر کیا جس میں اپنے قابلِ فخر معززین کے نام درج کیے تو اسماعیل نے اس کی درخواست پر لکھا۔ "عصام جیسے ہو اور اپنے معززین پر فخر نہ کرو۔ (کن عصامیا لا عظامیا)۔"[۸] پھر کسی شاعر کا یہ شعر لکھا۔

نفس عصام سودت عصاما
وعلمته الكر والاقداما

(عصام کے کردار نے اسے عصام بنایا اور اسے اقدام کرنے اور نقاد بننے کا گُر سکھایا)

اللہ تعالیٰ نے ایسے موقع کے لیے فرمایا ہے:

"مالِ دنیا کا حب تمھیں راستے سے بھٹکا رہتا ہے حتیٰ کہ تم قبر تک پہنچ جاتے ہو"۔ (التکاثر ۱۰۲: ۱-۲)

کسی یونانی کا قول ہے کہ جو اپنے اسلاف پر فخر کرتا ہے مردہ ہے اور جو اپنی صلاحیتوں پر انحصار کرتا ہے زندہ ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

اذا المرء لم ينهض بنفس الى العلى
فليس العظام البالیات بمفخر

(جب کوئی شخص اعلیٰ قدریں ظاہر نہیں کر سکتا تو پرانی ہڈیاں تو اسے کوئی افتخار نہیں دے سکتیں)

بعض افراد ایسے ہیں جنھوں نے فتوت میں بہت حد تک افراط و تفریط سے کام لیا۔ ذلت اور بدنامی سے بچنے کے لیے جبر و استبداد کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور ہمسایوں کے حقوق ادا کرنے کے لیے انھوں نے اپنی زندگی کی پروا نہیں کی۔ عام عربوں کے بارے میں ہم نے سنا ہے کہ وہ اپنے مہمانوں اور پناہ لینے والوں کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جانیں قربان کر دیتے تھے۔ بعض نے اس مردانگی کے اظہار میں جنون کی حد تک عمل کیا کہ وہ ایسے شخص کے قتل کے لیے بھی تیار رہتے تھے جس نے ان کے خیمے کے پاس سکونت پانے والی کسی ٹڈی کو بھی نقصان پہنچایا۔ حاتم طائی جیسے سورما بھی ہیں جنھوں نے فیاضی کی اعلیٰ ترین مثال پیش کی ہے کہ موت کے قریب پہنچ کر بھی وہ اس کے لیے دشمن کے نیزے کو زحمت نہیں دینا چاہتا تھا۔ ایسی ایک اور مثال کعب بن مامہ ایادی کے ایثار کی پیش کی جا سکتی ہے کہ قریب المرگ جب اسے پانی کا

پیالہ دیا گیا تو اس نے یہ پیالہ اپنے تیسری ساتھی کو دے دیا جبکہ وہ خود پیاس کے ہاتھوں مر رہا تھا۔

ایسے موقع کے لیے کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

الجود بالنفس اقصی غایته الجود

اور آخر میں کہا ہے۔

ولیس فتی الفتیان من راح و اغتدی
لشرب صبوح او لشرب غبوق
ولکن فتی الفتیان من راح واغتدی
لضر عدو او لنفع صدیق

(جری وہ نہیں جو صبح کی شراب صبح پیتا ہے شام کو اس سے تین گنا پیئے بلکہ وہ ہے جو صبح و شام دشمن کو ضرر اور دوست کو فائدہ پہنچاتا ہے)

علی بن جہم کا کلام ہے۔

ولا عار ان زالت عن الحر نعمته
ولکن عارا ان یزول التجمل

(کسی نعمت کا ولی نعمت کے ہاتھوں ضائع ہونا ذلت کی بات نہیں بلکہ ذلت کی بات تو یہ ہے کہ کوئی اپنی عزت نفس کھو دے)

پہلا شعر فتوت کو بیان کرتا ہے اس پر وہی شخص قادر ہو سکتا ہے جو غنی ہو اور اس کا تعلق متمول افراد سے ہو۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ دو افراد ایک ہی کوشش کرتے ہیں لیکن تقدیر ان میں سے ایک کے ساتھ یاوری نہیں کرتی لیکن کوئی ایسے شخص کو سو روا نہیں ٹھہراتا جسے قسمت نے شکست دی ہو۔

آخری (علی بن جہم کا) شعر مروت کو بیان کرتا ہے کہ اشراف اپنے قدموں کو پیچھے نہیں ہٹاتے۔ وہ اپنی سوء قسمت کو چھپانے اور لوگوں کے سامنے تونگری ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لوگ ان کی اصل حالت کو نہیں جانتے اور انھیں دولت مند خیال کرتے ہیں اور چونکہ وہ مدد کے طالب نہیں ہوتے، اس لیے وہ جسم و جان سے سفید پوش نظر آتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان پر اللہ کا فضل ہے۔ ان کا یہ فعل اللہ کے اس حکم کے مطابق ہوتا ہے۔

''اپنی خیرات کسی کو تکلیف دے کر یا ملامت پہنچا کر مت دو۔۔۔۔'' (البقرہ ۲:۲۶۴)

اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت دی ہے کہ ایسے لوگوں کی خیرات جو کسی شر انگیز مقصد کے لیے دی گئی ہو بذات خود شر ہے۔ چونکہ وہ کسی خیر کے احساس یا قرب الٰہی کے سبب سخاوت نہیں کرتے، اس لیے وہ کسی ثواب کے مستحق نہیں ٹھہرتے۔

ترویحہ

کوئی عاقل شخص صرف ایسے نفسانی امور سے لذت حاصل کرے گا جو باقی رہ سکیں اور احمق ایسے لذائذ سے بے خبر ہے اور وہ ایسے

مزے کو اپنی حد بصیرت قرار دے سکتا۔ ہم حیوانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ خاک میں لوٹ کر الگ الگ مزے لیتے ہیں۔ پھر اس انسان کا کیا ہوگا جو ان مزوں کی ماہیت سے لطف لیتا ہے۔ عاقل شخص ان سے تعقلی لطف لیتا ہے اور خوبصورت اشیا کا مشاہدہ گہری نظر سے کرتا ہے جس سے اس میں اخلاقیات کی بلند ترین ترجیح پیدا ہوتی ہے۔ احمق ان سے صرف حسی لطف حاصل کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شب و روز شراب و زنبری میں غرق رہتا ہے۔

ان فرحت کی مدت لطف بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ جب لطف اپنی حد کو لوٹتا ہے تو وہ زرد مرجل سے ہو جاتے ہیں۔ ان کی تازگی ختم ہو جاتی ہے اور وہ خشک گھاس کی مانند ہو جاتے ہیں جسے ہوا ادھر ادھر بکھیرتی رہتی ہے اور انھیں ایسی خاک بنا ڈالتی ہے جسے سیلاب بہا کر لے جاتے ہیں۔ وہ بیکار ہو کر رہ جاتے ہیں اور پھر ان کے پاس خالی خولی یادوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ گلاب اور زرد چنبیلی جیسے عارض، نرگسی آنکھیں، گل لالہ اور لالہ رُکی مانند سرخ لب، ما یونہ کی مانند دانت جو اناریں کی طرح چمکتے ہیں، جسے تعقلی اور بخشش کی لڑیوں کا مجاوَر حاصل ہوتا ہے۔ کچھ عبوری عرصے کے لیے یہ وہ انسانی خصائص ہیں، سلسلۂ شب و روز سے جنھیں زوال حاصل ہوتا ہے۔ وہ جنت کی حوروں اور غلمان کی طرح سدا جوان اور خوبصورت نہیں رہتے۔ اللہ نے ان کے لیے جو احترام مذہب کو شعار بناتے ہیں، متحرک سمندروں کی تہ میں سے زمین اور پہاڑوں کے چشموں میں، جنت کے حسن کی مانند موتی اور جواہرات جیسی چیزیں پیدا کی ہیں جن پر وقت کا اثر نہیں ہوتا۔ اللہ کا فرمان ہے:

''ان دونوں سے موتی اور مرجان پیدا ہوتے ہیں۔ تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتیں جھٹلاؤ گے''۔ (الرحمان ۵۵:۲۲،۲۳)

''ان سے وہ زیور نکالتے ہو جو تم پہنتے ہو''۔ (النحل ۱۶:۱۴)

نیز حوروں کی خوبصورتی کو یاقوت اور مرجان سے تشبیہ دی ہے۔ اللہ کا فرمان ہے:

''(حسن میں) یاقوت اور مرجان کی مانند ہیں''۔ (الرحمان ۵۵:۵۸)

موتی اور پتھر صرف آرائش کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور سونے چاندی کی طرح ان کا کوئی اور مصرف نہیں۔ اعلیٰ دھاتوں کی طرح انھیں بھی سکے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ تاہم موتی اور جواہر بعض امراض میں ادویہ کے طور پر بھی اسی طرح استعمال ہوتے ہیں جس طرح ان کی چمک دائمی ہوتی ہے اور آنکھوں کو بھلی لگتی ہے۔ لیکن روح کے جواہر کے مقابلے میں ان کی کوئی قدر نہیں۔ ابوبکر خوارزمی نے ایک شخص کا قول بیان کیا ہے:

''وہ شرافت کا ذرّ ذرّاں ہے، وہ موتی نہیں جو صدف سے نکلتا ہے اور حریت کا یاقوت یا قوتاں ہے جو پتھروں سے حاصل نہیں ہوتا''۔

ترویحہ

ہر مسرت بخش شے وہی ہے جو مستقل استعمال کے باوجود مسرت بخش رہے۔ یہ وہ مسرتیں ہیں جو حواس سے حاصل ہوتی ہیں۔ جب وہ کسی نئی شے کا سامنا کرتے ہیں تو اس سے راحت حاصل کرتے ہیں۔ لیکن یہ انسانی نفس کو متاثر کرتے ہیں اور اگر حواس مختل ہو جائیں تو منتشر نفس راحت نہیں پا سکتا۔ نیند کی حالت میں قوت متخیلہ اقلیم فکر تک محدود رہتی ہے۔ لطف آواز میں نہیں بلکہ اس کے پیچھے موجود معنی کے عرفان میں ہوتا ہے۔ اگر نغمات معنی سے خالی ہو جائیں تو قلب پر گراں گزرتے ہیں چنانچہ طبیعت خاموشی اور سکون کی طالب ہونے لگتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر لذت اپنے انجام پر رنج و غم لاتی اور مرض پیدا کرتی ہے۔ ان کا تسلسل نقصان دہ ہوتا ہے۔ لذیذ خوراک اس کی

ایک مثال ہے بہترین خوراک بھی متواتر کھانے سے اپنی لذت اس حد تک کھو بیٹھتی ہے کہ بالآخر اس کا انجام قے پر ہوتا ہے لطف آگیں ہونے کی بجائے وہ بدن کے لیے ناگوار ہو جاتی ہے۔ میں یہ بیان قارئین کو اس امر کے اثبات میں دے رہا ہوں کہ دنیوی لذات نقصان دہ ہیں اور ان کے ظاہری محاسن ہی درحقیقت ان کے عیوب ہیں۔

جماع کی مثال لے لیں۔ شہوت پرست اس سے کیا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ ہم بستری ہی نہیں کرنا بلکہ چاہتا ہے کہ سارے کا سارا اس کے بدن میں گھس جائے جبکہ وہ اس کی طاقت نہیں رکھتا اور اگر وہ یہ حالت حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوتا اور دم واپس نہیں رکھتا تو ان کی حرکت انھیں سینے سے سینہ، دل سے دل، سانس سے سانس ملاتے اور ساتھی کی روح تک اتر کر دیکھنا چاہتی ہے۔ جو اس میں حد سے گزرنا چاہتے ہیں وہ اپنی زبان دوسرے کے منھ میں یہاں تک ڈال دیتے ہیں کہ وہ حلق تک جا پہنچتی ہے اور اس کے لعاب دہن اور جبڑوں کو چوستے ہیں۔ اسی طرح اندام نہانی کے ساتھ وہی عمل کرتے ہیں جو زبان کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ دبر عمل کر کے دبر لطف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پھر وہ بے دم ہو کر گر جاتے ہیں۔ گویا انھوں نے کسی تکلیف دہ فعل کو انجام دیا ہو۔ ان کی حالت واقعی قابل رحم ہوتی ہے۔ وہ اس کمزوری پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں اور جب وہ دور ہو جاتی ہے تو اپنی لذت کی طرف پھر سے راجع ہو جاتے ہیں۔ انسان اپنی طاقت کی حد تک بہیمیت پر اتر جاتا ہے (عباسی خلیفہ) المتوکل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مستقل جماع نے اس کے بدن کو کھوکھلا اور بھدا کر دیا تھا، پھر بھی وہ باز نہ آتا تھا۔ ایک حوض میں پارہ بھرا جاتا تھا اور اس پر اس کا بستر بچھا ہوتا تھا تا کہ اس کام کے لیے اسے از خود حرکت نہ کرنا پڑے۔ جب وہ اس بستر سے لطف اندوز ہوا تو اس نے پارے کی کانوں کے بارے میں پوچھا۔ اسے بتایا گیا کہ اس کے لیے یہ پارہ آذربائیجان کے علاقے شیز سے آیا ہے۔ اس نے اپنے مقرب اور دوست حمدون کو اس علاقے کا حاکم بنا کر بھیجا تا کہ وہ پارے کی مستقل ترسیل یقینی بنا سکے۔ حمدون نے اپنے تقرر کے بعد یہ شعر پڑھا۔

ولایة الشیز عزل — والعزل عنها ولایه

فولنی العزل عنها — ان کنت بی ذا عنایه

(شیز کا تقرر حاکم کی معزولی سے بدتر ہے۔ اس کی نسبت معزولی سب سے بڑا تقرر ہے۔ اگر واقعی مجھ پر مہربان ہو تو مجھے اس سے معزول کر دو۔)

وہ گڑگڑاتا رہا اور واپسی کی درخواست کرتا رہا حتیٰ کہ اسے دربار میں واپس بلا لیا گیا۔

یہ تمام افعال بالآخر کمزور ہو جاتے ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی خوش کن نظر آتے ہوں۔ وہ درحقیقت تکالیف ہیں جو آرام اور راحت کی صورت اختیار کرتی ہیں۔ وہ انسان کے لیے محض سبز باغ ہیں۔ فطرت نے انھیں انسان کی بقا اور نوع کے تسلسل کے لیے محفوظ کر رکھا ہے۔ لذات محض ایک دام کشش ہیں مگر احمق اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اصل غرض اس امر میں یہ ہے کہ زراعت، نسل اور حیوانات کا تسلسل اس سے قائم رہے۔

انسانی جسم بدبوؤں کا مرکب ہے۔ خواہ وہ صحت مند ہو تب بھی کسی بھی تبدیلی پر اس کا منھ بدبو دینے لگتا ہے۔ کثافتوں کے جمع ہونے پر ایسا ہونا لازم ہے۔ وہ گھٹے اور خالی معدہ ہونے پر اس بدبو کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ عاشق و معشوق کی بوئیں ایک دوسرے کے لعاب کے ساتھ مخلوط ہو کر عجیب صورت اختیار کر جاتی ہیں۔ اس موقع کے لیے ابن رومی نے کہا ہے۔

كذلك أنفاس الرياض بسحرة

تطیب و أنفاس الوری تتغیر

(باغوں سے بو اچھی ہوتی آتی ہے مگر انسانوں کے سانسوں سے متغیر ہو جاتی ہے)

پھر انسان پسینہ بھی خارج کرتا ہے۔ اس کا سبب یا تو یہ ہے کہ ہوائی نمی کا اثر جسم پر ہوتا ہے یا پھر گرم رکھنے کے لیے بدن پر موجود بھاری لباس یا جسمانی ورزش سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے رفتہ رفتہ جلد کے مساموں سے پسینہ خارج ہونے لگتا ہے۔ یہ اجتماع کسی انتشار کے سبب سے ہوتا ہے جو بظاہر نظر نہیں آتا۔ جب پسینہ بغلوں میں جمع ہونے لگتا ہے تو اس سے بدبو پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح ٹانگوں کے بیچ بدبو پیدا ہونے لگتی ہے۔ انگلیوں کے درمیان خاص طور پر جب دستانے چڑھے ہوں بدبو آتی ہے۔ بیرونی اعضا کی حرکت سے بھی جمع ہونے والے میل سے بدبو آتی ہے حتیٰ کہ پورے بدن سے بدبو آتی ہے۔ یہ ہتھیلیوں اور تلووں کے تلنے سے گرم ہونے پر بھی پیدا ہوتی ہے۔ جسم کا کوئی بھی حصہ ہو، پسینہ اور میل کسی نہ کسی صورت موجود ہوتے ہیں خواہ وہ نظر نہ آتے ہوں۔ انسان کا بہترین حصہ اس کا سر ہوتا ہے۔ کسی نے ابن ابی مریم سے پوچھا کہ وہ اپنے سر اور سر کو عمامہ سے کیوں ڈھانپے رکھتا ہے تو اس نے جواب دیا۔

> "میں اپنے جسم کے اس حصے کا دھیان رکھتا ہوں جس میں دنیا کے بارے میں ہر قسم کا علم جمع ہوتا ہے۔ جو اس کے ذریعے مجھے علم تک لے جاتا ہے تو اس کے حق زینت و آرائش کے طور پر اسے آلودہ ہونے اور درد و تکلیف سے بچاتا ہوں"۔

پسینے اور میل کو صرف دیکھنے اور چھونے سے نہیں بلکہ اس کا ذکر کرنے سے بھی کراہت آتی ہے۔ بعض لوگوں کا نفس اتنا رواں انھیں جنونِ عشق میں ان محبوب کو مستحسن بنا کر پیش کرتا ہے۔ وہ عشق میں اندھے ہوتے ہیں۔ وہ آنسوؤں میں بھی حسن دیکھتے ہیں جسے وہ بکھرے ہوئے موتیوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ محبِ محبوب کے لعاب دہن کو بھی شیریں قرار دیتا ہے اور اسے شہد اور شراب سے ملاتا ہے۔ اسے محبوب کے سوختہ سے مشک وعنبر کی خوشبو آتی ہے اور وہ ایک لمحے کو بھی ان چیزوں کو مکروہ نہیں سمجھتا۔ وہ اس وقت تک انھیں پسند کرتا ہے جب تک کہ وہ اس کے بدن کا جزو رہتے ہیں لیکن جیسے ہی وہ بدن سے الگ ہوتے ہیں تو وہی شخص انھیں چھونے یا دیکھنے کو بھی پسند نہیں کرتا۔ جب آنسو گوشۂ چشم میں پہنچتے ہیں تو گرد و غبار میں گم ہو جاتے ہیں۔ جب وہ آنکھ سے بہتے ہیں تو وہ موتیوں جیسے آبدار اور شفاف ہوتے ہیں لیکن جیسے ہی وہ چشم و عارض سے دور ہوتے ہیں تو ان سے کراہت آنے لگتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ محبوب اگر محبّ کے کھانے پر تھوک دے تو وہ اسے کھا نہ سکے گا، خاص طور پر جب اس تھوک میں بلغم بھی موجود ہو جو پھیپھڑوں اور ہوا کی نالی سے آتی ہے اور منہ یا ناک سے خارج ہوتی ہے۔ اگر کوئی اسے گوارا کر لے تو اس کا مداوا ایسے شخص کو کرنا چاہیے جو جنونِ عشق سے محفوظ ہو۔ یہ بات لاریب ثابت ہوگی کہ کوئی شخص خود اسے اس لیے گوارا کرتا ہے کہ وہ خود سے محبت کرتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی ذات سے وابستہ ہر شے سے محبت کرتا ہے۔ اس کی نرگسیت اسے اپنے بارے میں اندھا کر دیتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ کسی شے کی حد سے بڑھی ہوئی چاہت انسان کو اندھا کر دیتی ہے جس کے آگے کوئی دلیل نہیں چلتی۔ اسی لیے حدیث رسول مقبولؐ میں آیا ہے کہ کھانے کے اوپر سانس مت خارج کرو۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ مندرجہ بالا چیزوں کی حقیقت مکروہ ہے اور ان کا ظاہری حسن عارضی ہے۔ عارضی شے ہمیشہ معدوم ہو جاتی ہے اور ہر شے اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔

ترویحہ

انسانی زندگی کے کئی پہلو ہیں۔ بعض قابل تعریف اور بعض قابل نفرت ہوتے ہیں۔ اچھی چیزوں کی برتری ظاہر ہے جیسا کہ کسی

برے شخص کے برے پہلو کا ذکر اس شخص سے بھی کراہت پیدا کرتا ہے اور وہ بھی دوسروں سے جھوٹ بولتا ہے کہ اس میں یہ نقص نہیں ہے۔ وہ اچھی چیزوں کے ذکر سے خوش ہوتا ہے خواہ اس نے کوئی بھی اچھا کام نہ کیا ہو۔ وہ یہ سب کچھ خود کو بڑائی اور دوسرا سے بچانے کے لیے کرتا ہے۔ مستحسن افعال اور اعلیٰ صفات مروّت سے جنم لیتے ہیں اور مروّت تزکیۂ ذات اور نجابت سے پیدا ہوتی ہے۔ شمول اسے کہتے ہیں جو دوسروں کے ساتھ فیاضی اور کریم النفسی کا سلوک کرے۔ غریب آدمی فیاضی کیوں کر دکھا سکتا ہے؟ متوسط طبقے کے فرد کا اخلاص ایک صادق اور خلیق شخص پر منحصر ہوتا ہے جو اچھے اطوار کا مالک ہو اور دونوں یک جان دو قالب ہوں۔ ایک اچھے دوست کے بارے میں مقولہ ہے کہ ''وہ تُو ہے اگرچہ وہ غیر ہے''۔ ایسے دوست ایک جیسی عادات کے مالک ہوتے ہیں اور اپنے دوست کے لیے وہی منتخب کرتے ہیں جو اپنے لیے کرتے ہیں۔ کسی شخص کے لیے دوستوں کی تعداد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ یہ تعداد فرد کی استعداد پر منحصر ہوتی ہے۔ اخلاص کی بنیاد میں احساسِ مروّت موجود ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور سچے دوستوں کی بڑی تعداد کے باوجود شعلۂ مروّت کو روشن رکھا جائے اور اسی کے ساتھ حکمرانی اور رہنمائی کی طرف پیش قدمی کی جائے۔

فرد کو خیر کا علم بلند رکھنا چاہیے۔ اسے ہر وقت یہ دھیان رکھنا چاہیے کہ اس کے لوگوں کے لیے خیر کس میں ہے خاص طور پر اپنے قریبی ساتھیوں کے لیے۔ اسے اپنی خواہش میں منکسر اور کام میں مستعد ہونا چاہیے۔

انسان کی قریب ترین شے اس کا نفس ہوتا ہے پھر وہ اشیاء ہیں جو اس کے نفس، ولد اور بدن کے قریب ہوں۔ مثلاً لبادہ جو اس کے جسم کو ڈھانپتا ہے۔ اس کی بیوی جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ اس کے ملازم جو اس کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ کھانے پینے کے برتن وغیرہ۔ حسین صورت کا استحسان کیا جاتا ہے اور انسان اپنے ملنے جلنے والوں میں سے کسی کو محبوب بناتا ہے۔ حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسے لوگوں کو وفد بنا کر بھیجتے تھے جو حسین صورت اور حسین اسماء کے حامل ہوتے تھے اور لوگوں کے ایسے نام بدل دیتے تھے جو پہاڑوں اور مقامات کے حوالے سے رکھے جاتے تھے اور ان کی جگہ اچھے اور مستحسن نام رکھتے تھے لیکن جسمانی شکل و صورت تو رحمِ مادر میں تشکیل پاتی ہے اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ جہاں تک صورتِ نفس کا تعلق ہے مثلاً عادات اور اخلاق و سیرت وغیرہ، انہیں ضبط و تزکیہ روحانی تربیت اور اخلاق میں بہتری اور صاحبِ ضبطِ نفس ہو کر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اسی سے کوئی شخص اپنے سقم اور برائیوں کو رفتہ رفتہ کم کر کے کتبِ اخلاق میں درج طریقوں کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ پہلی چیز جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ انسان کا چہرہ مہرہ ہے۔ وہ اسے تبدیل نہیں کر سکتا لیکن وہ اسے نجاستوں سے پاک رکھ سکتا ہے۔ انسان کو بے نطق حیوانات سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔ بلی کو دیکھیں۔ جب یہ انسان کے ساتھ رہنا شروع ہوتی ہے تو وہ گھر اور فرش کو اپنی غلاظت سے پاک رکھتی ہے اور بول و براز کے لیے خاص جگہ منتخب کر لیتی ہیں جس طرح کہ انسان بیت الخلا بنا لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ امرِ الٰہی کی پابندی کرتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> ''اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ تو اپنے منھ اور ہاتھ کہنیوں تک دھو لیا کرو اور سر پر ہلکا سا مسح کر لو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو''۔ (المائدہ ٥:٦)

ذرا ملاحظہ کریں کہ بلی اپنی صفائی اور پاکیزگی کے بارے میں کتنی حساس ہے اور اپنے بول و براز کو کس طرح مٹی سے ڈھانپ رہتی ہے تا کہ کوئی بو پیدا نہ ہو اور اپنے اعضا کو اسی طرح سے چاٹتی ہے جیسے انسان وضو کرتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کو چاٹ کر اور اپنی ناک کو نیچے سے رگڑ کر صاف کرتی ہے۔ وہ اسی طرح اپنے نتھنے صاف کرتی ہے جیسے انسان انگلی سے کرتا ہے۔ پھر وہ غرارے کرتی ہے اور ایسی حرکات کرتی ہے گویا وہ ناک کو پانی سے دھو رہی ہو۔ وہ اپنی ہتھیلیوں کو اپنے لعاب سے نم دار کرتی ہے اور انگلی سے اپنے کان ملتی ہے۔

انسان کی طہارت کا انحصار ایسے پانی پر ہے جس کی بو اور خالص پن روح اور نفس کے لیے پسندیدہ ہو اور لطف حیات بخشتا ہو۔ وہ صفائی کا کام کیونکر کرسکتا ہے جو خود ہی گدلا اور دیکھنے میں بُرا ہو؟ شریعت کی رُو سے ایسا صرف صاف ستھرے پانی یا اس کے متبادل کے ذریعے سے ہوسکتا ہے۔ عرب مرد و زن اپنی بیٹیوں کو رخصتی کے وقت جو وصیت کرتے ہیں وہ اسی واحد نقطے پر مرکوز ہوتی ہے۔ عبداللہؓ بن جعفر بن ابی طالب سے روایت ہے کہ انھوں نے اپنی بیٹی کی رخصتی کے وقت فرمایا:

''زیادہ انا پرستی نہ دکھانا کہ یہ طلاق کی کنجی ہے۔ زیادہ اشتعال کبھی نہ دکھانا کہ اس سے بغض جنم لیتا ہے۔ زینت کے لیے اپنے بیرونی لبادے پر توجہ دینا۔ زینت کو بہتر کرنے کی چیز سرمہ اور خوشبوؤں سے محبت ہے اور بہترین خوشبو پانی کی خوشبو ہے''۔

عامر بن ظرب عدوانی نے اپنی بیٹی کو اپنے بھتیجے کے ساتھ بیاہتے وقت اپنی بیوی سے کہا:

''بیٹی کو ہدایت کرو کہ جب بھی وہ جنگل کو (رفع حاجت کے لیے) جائے تو پانی ساتھ لے کر جائے کیونکہ پانی بالائی جسم کے لیے زینت اور نچلے دھڑ کے لیے صفائی کا ذریعہ ہے۔ شہوت کے وقت شوہر کی موافقت کرے۔ خوش قسمتی خود کو سپرد کرنے اور اتصال میں ہے۔ شوہر کے ساتھ زیادہ نہ سوئے کیونکہ بدن کے مطلوب ہونے کے ساتھ دل بھی مطلوب ہوتا ہے''۔

ایک عرب فلسفی نے اپنے بیٹی کو حجلۂ عروسی میں جاتے ہوئے نصیحت کی:

''اپنے شوہر کی کنیز بن کر رہنا تاکہ وہ تمھارا غلام بنے۔ اس کے ساتھ نرم خُو رہنا کیونکہ نرم خوئی جادو سے زیادہ اثر کرتی ہے۔ پانی استعمال کرنا کیونکہ پانی تمام خوشبوؤں کا سرتاج ہے''۔

ایک عورت نے اپنی بیٹی کو یہ نصیحت کی:

''اپنے شوہر کے لیے بستر بن جاؤ تاکہ وہ تمھارے لیے نان و نفقہ کا ذریعہ بنے۔ جب وہ خوش ہو تو اداسی کو نکال دو اور جب وہ پژمردہ ہو تو اسے خوش کرو۔ وہ تم میں کوئی برائی نہ دیکھے اور تمھارے بدن سے اسے خوشبو آئے۔ اس کے راز کبھی فاش نہ کرو۔ اس کی نگاہوں میں بلند ہو کر رہو۔ پانی، تیل اور سرمہ استعمال کرو کہ وہ اچھی خوشبویات ہیں''۔

ایک اور عورت نے اپنی بیٹی سے کہا:

''اپنے بدن کو خوشبو اور روغن سے آراستہ کرو۔ اپنے شوہر کی تابع فرمان رہو اور خوشبویات میں سے پانی کا استعمال زیادہ رکھو''۔

ایک اور نے یہ نصیحت کی:

''خود کو ڈھانپو، اپنے شوہر کا لحاظ رکھو اور پانی کو خوشبو کے طور پر استعمال کرو''۔

ایک اور نے بھی ایسا ہی کہا:

''نہ تو اپنے شوہر کی ہر بات ماننا اور نہ زیادہ نافرمان ہونا۔ کہیں وہ دل برداشتہ نہ ہو جائے۔ اس سے مخلص رہنا اور پانی کو خوشبو کے طور پر استعمال کرنا''۔

یہاں جو کچھ کہا گیا ہے ضروری اور لازم ہے لیکن منہ ہاتھ دھونے اور جسم کو چمکانے اور پانی سے دھونے کے بعد انسان کو چاہیے کہ اپنے چہرے کو ایسے رنگ سے زینت بخشے جو روشنی میں نظر آئیں۔ جسم کو پاؤڈر اور خوشبویات سے آراستہ کیا جا سکتا ہے خاص طور پر جب چہرے پر قدرتی یا مصنوعی زردی موجود ہو۔ دانتوں کو مسواک وغیرہ سے صاف کیا جا سکتا ہے آنکھوں اور پلکوں کو صاف رکھا جائے اور انھیں سرمہ وغیرہ سے آراستہ کرنا چاہیے۔ حسب خواہش بالوں کو رنگا اور گھنگھریالا بنایا جا سکتا ہے اور ان میں کنگھی کرنی چاہیے۔ ناخنوں کی خوبصورتی ان کی باقاعدہ تراش میں ہے۔

اب ان اشیا کا ذکر جو جسم کے ساتھ چپکی رہتی ہیں۔ ان میں سب سے پہلے کپڑے ہیں جو جسم کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ لازم ہے کہ جسم کو صاف ستھرا رکھا جائے تا کہ ان پر گرد وغیرہ جمع نہ ہو۔ موسم اور وقت کے حوالے سے کپڑے پہنے جائیں اور ان کے رنگ موقع محل کی مناسبت سے ہوں تا کہ جسمانی عیوب و نقائص ان سے چھپ جائیں۔ ان کو مزید آراستہ کرنے کے لیے پتھر اور جواہر استعمال کیے جائیں جو اسی مقصد کے لیے تخلیق ہوئے ہیں۔ حضرت عمرؓ (ابن خطاب) سے پوچھا گیا کہ مروّت کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ یہ لباس کی صفائی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ظاہری مروّت لباس کی خوش نمائی میں ہے۔ یہ صحیح ہے کیونکہ ہر وہ شخص جو طہارت پسند ہے پہلے جسمانی طہارت پر توجہ دیتا ہے تا کہ لباس پر جسمانی غلاظتیں جمع نہ ہوں۔ پھر وہ اپنی حرکات پر متوجہ ہوتا ہے۔ پھر گھر کی صفائی تا کہ وہاں موجود گرد سے کپڑے خراب نہ ہوں۔ آپ خود ملاحظہ کریں کہ پوشاک کی صفائی سے ہر چیز کیسے صاف ستھری ہو جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار ان کے لیے کافی ہیں جو اپنی ذاتی طہارت کے لیے احتیاط نہیں برتتے۔

لا یلیق الغنی بوجه ابی الفتح ولا نور بهجته الاسلام

وسخ الثوب والعمامه والبرذون والوجه والقفا والغلام

(ابو الفتح کے لیے نہ تو طاقت نہ نور اسلام موزوں ہے (بلکہ) گندے کپڑے عمامہ اور مکروہ گدھا، میلا کچیلا چہرہ، آلودہ گردن اور اس کے ہمراہ ایک گندہ غلام)

لباس کی صفائی اور تازگی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ نفس اور قلب، لباس، کرتہ پاجامہ کی صفائی ہی اخلاص کی بنیاد ہیں۔ بعض مفسرین نے اس آیت (وثیابک فطهر (المدثر ۴:۷۴)) کے بارے میں کہا ہے کہ تفکر اور کراہت کی طہارت میں تزکیہ قلب اور نیت کی صفائی مقصود ہے۔ ایسی تفسیر ممکن ہے۔ ایسا ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ آیت میں ظاہر و باطن دونوں کے بارے میں بات کی گئی ہو۔ عقل کی رو سے دونوں کا امکان ہے۔ یہ مروّت کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ بعض کے نزدیک مروّت حُبِ ریاست یا مدد کی ہے کیونکہ مدد بے حد سنجیدگی اور شائستگی سے مرشتہ ہے لیکن یہ قوت ہے مروّت نہیں۔ کسی نابغہ کا کلام ہے۔

رقاق النعال طیب حجزاتهم

یحیون بالریحان یوم السباسب

(وہ مقدس اور مطہر ہیں۔ سباسب (عید) کے روز انھیں ریحان کی دھونی دی جاتی ہے)

روز سباسب کو یوم شعانین بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ شعر غسان کے حکمرانوں کے بارے میں ہے۔ غسان کے حکمران عیسائی تھے۔ غالباً وہ ریحان کی دھونی کو اہمیت اس لیے دیتے تھے کہ جب یسوع مسیح کے ساتھ بیت المقدس میں آنے والے لوگ گلاب اور زیتون سے ہاتھوں پر مسح کرتے تھے۔ یہ کوئی موزوں مفروضہ نہیں۔ لیکن اس شعر کا مقصود پھولوں کی اہمیت اجاگر کرنا ہے۔ جب غسان کے شہزادے صحرائی راستوں

پر سفر کرتے تھے تو لوگ ان پر پھولوں کی پھوار (دھوتی) پھینکتے تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ پھول صحراؤں کے لیے نہیں ہوتے لیکن اس علاقے میں لوگ پھولوں سے پیچھے نہیں رہتے تھے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب سلاطین اور امرا فتح کے لیے روانہ ہوتے ہیں تو پھول اور سبزیاں ان کے ہمراہ کر دی جاتی ہیں۔ ہر چیز جاذب ہوتی ہے بطور علامت استعمال ہوتی ہے۔ بکر بن النطاح حنفی کا قول ہے۔

جئتك بالرامش رامشة
أطيب من رامشة الآس
(میں تمھارے لیے ایسا گلدستہ لایا ہوں جو گل حنا کی شاخ سے بہتر ہے)

شاعر نے صرف رامشہ کا لفظ استعمال کیا ہے جو ایسے جڑواں پتوں کو ظاہر کرتا ہے جو درمیان سے جڑے ہوں اور آخر میں منتشر ہوں جیسا کہ مہندی کے پتے ہوتے ہیں۔ ایسے پتے شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے جب بڑوں کو مبارکباد دی جاتی ہے تو ایسے پتے ہاتھوں میں پکڑ کر لائے جاتے ہیں، خاص طور پر حاکم کی مبارکباد کے لیے۔

لباس کے بعد زیب و زینت کے لیے جواہر کی باری آتی ہے۔ ہر ملک کے رسوم و رواج مختلف ہوتے ہیں۔ ہر قوم انگوٹھی، تاج، ہار، طرہ، ٹوپی، پگڑی، دستانوں وغیرہ کے لیے اور درباریوں کی لاٹھی اور عصا میں استعمال کے لیے جواہرات کا مختلف طریقے سے استعمال کرتی ہے۔

جواہرات کانوں کے بُندوں، مکٹ، تاج، کنگھی، انشانہ، لباس، کنگن، چوڑیوں، بازو بند، ہار اور جوتوں کے گلو بند وغیرہ میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ کچھ شوقین جواہرات کو ایسی چیزوں میں بھی استعمال کرتے ہیں جو جسم سے دور ہوتی ہیں۔ مثلاً دیواریں، چھت، دروازے، روشن دان وغیرہ جنھیں وہ خوب سجاتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے کہ گھر میں آنے والا شخص پہلی نظر میں مرعوب ہو جائے۔ ان چیزوں سے دولت اور امارت ظاہر ہوتی ہے لیکن یہ سب کچھ حقیقت سے بعید ہے اور اس میں صاف طور پر تفاخر و غروری نظر آتا ہے۔

ترویحہ

اخلاص کے بعد مروّت کی تکمیل کا سب سے اہم پہلو خوشبویات ہیں۔ خوشبویات دوسروں کو قرب کے لیے ملتفت کرتی ہیں۔ ان سے عیوب اور نقائص کی پردہ داری ہو جاتی ہے۔ مروّت کی تعریف کا واسطہ خاص طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ جب کوئی دوسروں کے لیے وہی منتخب کرے جو اپنے لیے کرتا ہے تو اس بات کا تعلق امروٹی سے ہے۔ ایک اور شخص نے اس کی تعریف یہ کی ہے کہ مروّت سنائی اور تکالیف سے دور رہنے کا نام ہے۔ درحقیقت مروّت ایمان کے راستے پر ثابت قدم رہنے کا نام ہے کیونکہ ایمان انصاف اور مساوات کا طالب ہوتا ہے۔ یہ ظلم کا مکمل استیصال چاہتا ہے کیونکہ ظلم خود غرضی سے جنم لیتا ہے اور مظلوم کی دستگیری مطلوب ہے۔ یہی حق مروّت میں پوشیدہ ہیں یعنی انسان وہ کام چپکے سے بھی نہ کرے جو کھلم کھلا نہ کر سکے۔ جس نے اپنے افعال کو شرافت سے احسن بنایا اور اپنا رزق حلال آمدنی سے کمایا اور اپنے دسترخوان پر دوسروں کو شریک کیا اور خود کو ذکر یہ ذات کے لیے وقف کیا اور اپنی ذات کو خوشبویات سے مزین کیا جنھیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی پسند فرمایا ہے، اپنے شریک دسترخوان کو خوش کیا، اسے اپنے قریب کیا، اسے عزت دی، اسے ابتلا سے محفوظ کیا، اپنے لیے وہی منتخب کیا جو دوسروں کے لیے چاہے، کنجوسوں کے گروہ میں شامل نہیں ہوا جو تنہا کھاتے اور اپنے غلاموں کو مارتے ہیں۔

اگر ۳۷ ویں سورۃ کی پانچویں آیت میں ''شیاب'' کا مفہوم انسان کی نیت اور داخلی فطرت ہے تو ترکیہ ذات فرد کو تسلیم و رضا، قناعت، عمل صالح اور ایسے اعمال کی دعوت دیتا ہے جو صرف اسی دنیا ہی میں نہیں آخرت کا توشہ بھی ہیں۔

معز الدولہ ابن احمد بن بویہ ایک غالی شیعہ تھا۔ اس نے نواح فارس سے ایک شخص کو بلا بھیجا جو حضرت علیؑ کی نسل سے تھا۔ یہ معزز شخصیت اپنے کردار، دیانت اور سنجیدگی کے حوالے سے معروف تھی۔ معز الدولہ نے عباسی خلیفہ مطیع اللہ کے بارے میں کہا کہ وہ ناکارہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ چاہتا ہے کہ حقدار کو اس کا حق ملے۔ معز الدولہ نے مزید کہا کہ اس نے اس فاضل اجل کے سامنے یہ مطالبہ کیا کہ اس کے ذریعے خلافت اور حکومت حقداروں کے پاس چلی جائے گی۔ وہ امت کی ذمہ داریاں بہتر طور پر نبھا سکتا ہے کیونکہ اللہ نے اس میں فضل، عدل اور حسنِ عمل جمع کر دیے ہیں۔

اس فاضل اجل علوی نے معز الدولہ کا شکریہ ادا کیا اور اس حسنِ اعتقاد کے بارے میں اس کی تعریف کی جو وہ اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ بتولؓ کی اولاد کے بارے میں رکھتا ہے اور تقرب الٰہی کے لیے کوشاں ہے اور پھر اس نے اپنے خیالات کے اظہار کی اجازت مانگی۔ اجازت پانے پر وہ یوں گویا ہوا:

> ''اسلامی سلطنت کے عوام نے عباسی دعوت پر لبیک کہا۔ انھوں نے اس کی اطاعت اسی طرح کی جیسے وہ اللہ اور اس کے رسول کی کرتے تھے۔ انھوں نے ان کا امر تسلیم کیا اور ان کے مقرر کردہ حاکموں اور امیروں کو تسلیم کرتے ہوئے انھیں خیر کا منبع ملا۔ انھوں نے علویوں کو قید اور قتل کیا اور یقیناً انھوں نے ایسا اس لیے کیا کہ وہ عباسیوں کے بانی تھے جو زمین پر اللہ کے نائب تھے اور یوں وہ حق اور راستی کے مخالف ٹھہرے۔ اگر آپ عمل کے اندر اپنی نیت شامل کر لیں اور وہی کریں جو دل میں ہے تو آپ دیکھیں گے کہ عوام اپنے مزاج کے خلاف عمل کریں گے۔ وہ آپ کو فوراً تسلیم نہیں کریں گے اور وہ جن کے ذریعے آپ خلیفہ کو پچھاڑ دیں گے، آپ سے حسد کرنے لگیں گے اگرچہ بظاہر وہ آپ کی خلافت کو تسلیم کر لیں گے۔ چنانچہ آپ محض خلافت کو ایک قبیلے سے دوسرے میں منتقل کرنے کا باعث ہوں گے اور آپ اس خون ریز جدوجہد سے رنجیدہ اور کبیدہ خاطر ہوں گے اور اس سارے عمل کا سبب میری ذات ہو گی۔ میں آپ کے نزدیک بہت برا ثابت ہوں گا۔ آپ اپنے کیے پر پچھتائیں گے اور مجھے دکھ اور تکلیف پہنچے گی۔ ایسا آپ کے کامیاب ہونے پر ہو گا اور اگر خدانخواستہ آپ ناکام ہوئے تو آپ اپنی سلطنت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور میں اس وقت امن و سکون میں نہ ہوں گا جب تک کہ میں دارالاسلام میں رہوں گا اور جب مجھے فرار ہو کر دارالحرب میں بت پرستوں کے ساتھ مل جانا ہو گا۔ چنانچہ آپ کیوں کر خود کو اس جہد کے لیے آمادہ کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں آپ کی جناب میں عرض گزار ہوں کہ میں اس عزت و توقیر پر خوش اور قانع ہوں جو مجھے طول و عرض میں حاصل ہے۔ لوگ مجھ سے دعا لیتے ہیں۔ کوئی حاکم یا امیر اس دستگیری سے برتر نہیں جو قدرت نے مجھے عطا کر رکھی ہے۔ ازراہ کرم مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں تاکہ میں بھی زندگی کو اسی طرح خوشی سے گزار سکوں جس طرح کہ آپ اپنی سلطنت کے ثمرات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ حکمران ہونے کے باوجود آپ میری آسائش یعنی کو عار نہیں سمجھتے جو ان گندے ہونٹوں، پیلے دانتوں اور بدبودار سانسوں سے کہیں زیادہ پاک صاف ہے۔ جن سے آپ ہر رات لطف اندوز ہوتے ہیں اور جن کی بوسیدگی آپ کو متنفر نہیں کرتی۔ اللہ

سے دعا کریں کہ وہ آپ کو صراطِ مستقیم دکھائے اور دنیا و آخرت کی خوشیاں اور ایمان کی سلامتی عطا کرے۔ میری دعاؤں کو توشۂ آخرت سمجھیں"۔

معز الدولہ نے اس فاضل اجل کی یہ تقریر بڑی توجہ سے سُنی اور اس کی عزت اس کے دل میں بڑھ گئی۔ وہ روتا ہوا اٹھا۔ اس کے سر آنکھوں کو چوما اور اسے بڑی عزت کے ساتھ گھر بھیج دیا۔ اس واقعے پر کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

اذا کنت فی نعمة فارعها
فان المعاصی تزیل النعم

(اپنی نعمتوں کی اسی طرح حفاظت کرو جیسے گناہ نعمتوں کو زوال دیتے ہیں)

آپ دنیا اور آخرت کی نجات اس شعر کے مفہوم پر عمل پیرا ہو کر حاصل کر سکتے ہیں۔ نعمتیں پانے والے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ اور اللہ کی نعمتوں پر خوش رہتے ہیں۔

ترویجہ

تمام انسانوں کا جد امجد ایک ہے۔ وہ سب ایک ہی جسمانی ساخت کے مالک ہیں لیکن ایک دوسرے کے ساتھ حسد اور خصومت کے باعث مختلف ہو جاتے ہیں۔ یہ بات انسانی فطرت میں ہے کہ سب انسان مزاج اور عادات کے لحاظ سے مختلف ہوں۔ آدم کے زمانے سے یہی طریق چلا آ رہا ہے کہ ایک کی قربانی قبول کر لی جاتی ہے اور دوسرے کی نہیں۔ کیا خدا یا حکمرانوں کا خوف ہی انسانوں کو ایک دوسرے کے جان و مال پر قابض ہونے سے روک سکتا ہے۔

جب بادشاہ اپنے حکم، لفظ اور وعدے پر صادق نہ ہو تو اسے سیاسی طور پر قائم رہنے کا حق نہیں رہ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ حکمرانی بعض قبائل تک نہیں بلکہ خاندانوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے بلکہ صرف خاندان تک ہی نہیں بلکہ ایسے افراد خاندان تک سکڑ جاتی ہے جو دوسروں پر فضیلت رکھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے یہ ان کے خاندان میں آ جاتی ہے خاص طور پر وارثوں میں اور یوں ملک ان کی ملکیت ہو جاتا ہے۔ تائید ایزدی اور حکم الٰہی یہی ہے کہ ایک خاص خاندان کے افراد کو حق حکمرانی دیا جائے جیسا کہ بادشاہانِ فارس و قریش میں خلافت اور امامت کا حق یا پھر ایسے افراد کے لیے جن کی محبت اور الفت مسلمانوں کے لیے فی سبیل اللہ یا پھر تبت کے لوگوں میں جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خاقان اول سورج کا بیٹا تھا اور دنیا کی ابتری کو دور کرنے کے لیے زمین پر آیا۔ یا دورِ جہالت میں کابل کے لوگوں کا معاملہ جن کا عقیدہ ہے کہ برہتگین ترک کی غار میں پیدا ہوا تھا۔ اسے آج بفر اکا نام دیا جاتا ہے اور وہ اس سے باہر تاج شاہی پہنے ہوئے نکلا تھا۔ اس قسم کی کئی روایات موجود ہیں جن میں "رضائے الٰہی" کو رواج دیا گیا تا کہ دوسروں کے ذہنوں میں بادشاہی کے خواب پیدا نہ ہوں اور وہ بادشاہوں کی خدمت کرتے رہیں۔

چونکہ بادشاہوں کو یہ خطاب حاصل ہوئے تھے، اس لیے انھوں نے خود کو اس کے شایانِ شان بنانے کی کوشش کی۔ انھوں نے بڑے بڑے دربار اور قلعے تعمیر کرائے اور عظیم تاج و تخت بنوائے تا کہ وہ آسمانی مخلوق محسوس ہوں اور انسانوں کو دور بلندی سے دیکھ سکیں۔ شاعر بُحتری نے کیا خوب کہا ہے۔[9]

ولیس للبدر الاماحبیت بہ
ان یستنیروان تعلو منازلہ

(جو کچھ تجھے عطا ہوا وہی بادل کو عطا ہوا۔ اپنا کر تو اعلیٰ منزلوں اور آب و تاب کو چھو لے)

انھیں اپنی عظمت ظاہر کرنے کا کوئی اور طریقہ نظر نہیں آتا سوائے اس کے کہ وہ بڑے بڑے تخت اور تاج بنوائیں اور اپنے دست اتنے دراز کریں کہ وہ ستاروں کو چھو لیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے لوگوں نے اپنے ایک بادشاہ کا نام "مہابا ہو" رکھ دیا تھا یعنی "لمبے ہاتھوں والا"۔ اہل فارس نے "دِرِیهٔ دست" کا لقب بہمن اردشیر کو دیا تھا۔ "دریهٔ" کے معنی فارسی میں "ریباس" کی جڑوں کے ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ جب تک وہ پانی کی گہرائیوں تک نہ پہنچ جائیں، پودا باہر نہیں نکلتا، خواہ وہ پہاڑ کی چوٹی پر اُگ رہا ہو۔ یہ تمام باتیں دراصل طاقت اور وسعتِ قدرت کو ظاہر کرتی ہیں۔

بادشاہ اپنی زیب و زینت کے لیے جن سے ان کے عوام کے دلوں میں ہیبت اور رعب طاری ہو، ایسی قیمتی چیزیں استعمال کرتے تھے جن سے وہ حیرت میں مبتلا ہوں اور انھیں حسرت سے دیکھیں۔ اس کے لیے وہ عجیب و غریب کام انجام دیتے تھے۔ چنانچہ وہ شرافت و سوزت کے انوکھے انداز وضع کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے سفارت کے طریقوں میں کشتیاں، گھوڑے، کبوتر وغیرہ استعمال کیے تاکہ ان کے احکامات اور پیغامات کم سے کم وقت میں پہنچ سکیں۔ لوگ ظاہر و باطن میں ان سے ڈرنے لگے اور خیانتوں اور حکم عدولیوں سے اجتناب کرنے لگے۔ ایسے ظالم بادشاہوں کے قصے بہت ہیں۔

ترویجہ

دولت کے زیادہ حریص افراد بادشاہ ہوتے ہیں کیونکہ دولت کے ذریعے وہ تسلط کا اہتمام کر سکتے ہیں۔ خلیفہ منصور نے اپنے محافظ یا حاجب ربیع کو بتایا:

> "ربیع! میں دولت جمع کرتا ہوں۔ لوگ مجھے بند مٹھی والا سمجھتے ہیں۔ اگرچہ اللہ نے اس مذموم عادت سے دور رکھا ہے۔ لیکن میں نے لوگوں کو دینار اور درہم کے بندے پایا ہے۔ میں نے ان کے ذریعے انھیں اپنا مطیع بنایا ہے۔ یہی باعث ہے کہ دینار و درہم میرے پاس جمع ہوتے ہیں اور میں انھیں لوگوں میں تقسیم کرتا ہوں، جب بھی انھیں ان کی ضرورت ہو۔ یہ حقیقت واضح ہونی چاہیے کہ میں نہ تو ان کو ذخیرہ کرتا ہوں، نہ خزانے جمع کرتا ہوں لیکن یہ پانی کی آبنائے کی طرح نیچے کو بہتے ہیں۔ کئی منہ کھلے ہوتے ہیں اور کئی ہاتھ پھیلتے ہیں، انھیں بطور عطیہ یا سخاوت کے طور پر مانگنے کے لیے اور کئی آنکھیں پہلی کا چاند دیکھنے کی طرح انعامات اور تحفوں کی بارشوں کے انتظار میں گڑی ہوتی ہیں اور کئی انگلیاں کھاتوں میں ادھار لکھوانے کی منتظر ہوتی ہیں"۔

یہی وجہ ہے کہ بادشاہ اور سلاطین اپنی دولت کے فتنے کے خوف میں مبتلا ہوتے ہیں جس سے یہ سلسلہ ختم ہو سکتا ہے۔ ہر مجموعہ منتشر ہونے کے لیے ہوتا ہے اور ہر منتشر ہونے والی شے معدوم ہو جاتی ہے۔

امیر مرحوم یمین الدولہ محمود رحمۃ اللہ علیہ کی ایک پختہ عادت مجھے یاد ہے کہ جس نے شکار کا جانور منتخب کیا اور اسے شکار کرتا گیا۔ وہ اپنے شکار کی تلاش میں وادی وادی پھرا۔ خوارزم سے ایک بار روانگی کے وقت وہ بڑا رنجیدہ سا ہو کر بولا:

> "نجومیوں نے مجھے بتایا کہ میری زندگی کے کوئی دس سال رہ گئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ میں نے اپنے قلعوں کو ہر طرح کی دولت سے بھر دیا ہے۔ جو اگر میرے باقی دنوں کے لحاظ سے لوگوں میں صرف کی جائے تو کافی ہو گی خواہ ہاتھ کتنا ہی

کشادہ رکھا جائے"۔

بیان کرتے ہیں: بعد طول ہوا اور جس بارے میں وہ ہمیشہ شاکی رہا کرتے ہیں خطابات کرتا ہوں، میں نے کہا:

"خدا کا شکر ادا کرو۔ اس کا ذکر کرو اور اس سے اپنے خزانے کے محفوظ ہونے کی دعا کرو۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری شہرت اور حکومت کسی نقصان سے دور رہے کہ یہ خزانے انھی کے باعث جمع ہوئے ہیں اور کوئی بھی دن انھیں نقصان پہنچائے بغیر نہ گزرے"۔

بیان کرتا ہوں کہ اس کی یہ بحث ختم ہو گئی۔ میری یہ نصیحت ان کے لیے بھی ایک سبق ہے جو عبرت پکڑتے ہیں۔ امیر مسعود شہید کی قسمت کا حال دیکھیں۔ (خدا اس کے درجات بلند کرے)۔ جب اسے شہید کیا گیا، اس کی حکومت زوال کا شکار ہوئی اور اس نے جو دولت جمع کی تھی خواہ وراثت سے یا کسی طرح حاصل کی گئی تھی، ہواؤں میں بکھر گئی۔ یوم ہروخان کے موقع پر قبیلہ عاد نے جو جمع جتھا کر رکھا تھا ہواؤں میں اڑ گیا۔ یہ ہے قسمت کا کھیل یا امر الٰہی کا جبر۔

ترویجہ

زمین کے دفینے بطنِ ارض میں بیکار پڑے رہتے ہیں۔ عام طور پر یہ خزانے جو مختلف گروہوں سے متعلق ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے سے اتنے ہی مختلف ہیں جتنی کہ دو چیزیں ہو سکتی ہیں۔ یعنی سلاطین اور مساکین۔ مساکین اپنی رقم اور متعلقہ اشیا زمین میں اس خیال سے گاڑ دیتے ہیں کہ وہ مانگنے سے بچے رہیں گے اور ان کا یہ ذخیرہ قوت بن کر قائم رہے گا۔ یہ بات فقرا کے سلسلے میں درست ہے جو بڑی لجاجت اور شدت سے مانگتے ہیں۔ ان کے پاس سامان اکل و شرب خریدنے کے لیے پیسہ نہیں ہوتا، اس لیے وہ دولت، تحائف، جواہر جمع کرنے اور ان کے انبار لگانے میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ چھوٹے سکوں کے بدلے میں بڑے سکے لیتے ہیں اور انھیں اشرفیوں میں بدلوا لیتے ہیں۔ ان کا کوئی امین نہیں ہوتا سوائے زمین کے جو ان کی امانتیں انھیں لوٹا سکتی ہے۔ اس لیے زمین کا یہ اعتبار ضرب المثل کی صورت اختیار کر گیا ہے اور ہر با اعتماد شخص کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ زمین سے بڑھ کر معتبر ہے۔ اکثر فقیر فاقوں کے ہاتھوں مر جاتے ہیں کیونکہ وہ خود پر سختی کرتے ہیں اور خوراک کے حوالے سے سخت ایام میں بھی دولت جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ انھوں نے جو کمایا ہے وہ ان کی بدقسمتی کے باعث دوسروں کے پاس چلا جائے یا وہ کسی دوسرے کے لیے اسے وصیت کریں۔ بہر حال وہ خزانہ چھوٹا ہو یا بڑا زمین میں مدفون رہ جاتا ہے۔

جہاں تک بادشاہوں کا تعلق ہے وہ بھی اکثر خزانے زمین میں دفن کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے قلعوں اور محلوں میں جواہر اور دولت دفن کرتے رہتے ہیں اور وقتاً فوقتاً انھیں اس طرح سے حرکت میں لاتے رہتے ہیں تاکہ یہ جاننا ناممکن ہو جائے کہ خزانے کہاں مدفون ہیں۔ وہ خفیہ جگہیں ڈھونڈتے رہتے ہیں جو کسی دوسرے شخص کے علم میں نہ ہوں۔ ایسے بادشاہ بھی ہیں جنھوں نے ان لوگوں سے ان جگہوں کو نہیں چھپایا جو یہ دولت منتقل کرتے اور یوں خدا پر بھروسا رکھتے ہیں۔ بعض بادشاہ انھیں مزدوروں سے چھپاتے اور ہر قسم کی تدبیریں کرتے ہیں۔ مثلاً مزدوروں کو مدفن کی طرف رات کے وقت صندوقوں میں لے جایا جاتا ہے۔ رات ہی کو وہاں کام کیا جاتا ہے اور انھیں رات ہی کو صندوقوں میں واپس لایا جاتا ہے تاکہ وہ خزانے کے مدفن کا مقام نہ جان سکیں۔ اس تدبیر کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ انھی مزدوروں کو دوبارہ وہاں نہیں لایا جاتا تاکہ وہ مدفن کی جگہ دیکھنے کے لیے بیتاب نہ ہوں۔ اس طرح ان کے مقاصد پورے ہو جاتے ہیں اور ان کا پتا چل جانے کا خدشہ دور ہو جاتا

ہے۔ ایک بادشاہ اس نقل و حمل کے بارے میں زیادہ جانتا نہیں تھا۔ دفینے کے نگران نے صندوق میں سوراخ کر رکھا تھا۔ اس نے اپنے پاس چاولوں کا تھیلا رکھا ہوا تھا اور وہ راستے بھر چاول کے دانے بکھیرتا آیا۔ اگلی صبح وہ اس جگہ پر پہنچا جہاں خزانہ دفن کیا گیا تھا اور اسے نکال لیا۔ بادشاہ کو اس کا پتا نہ چلا۔ اسے بیس سال بعد اس کی ضرورت پڑی تو وہاں کچھ نہ تھا۔

یہ خزانے اسی طرح پڑے رہتے ہیں۔ بعض اوقات اتفاقاً لوگوں کو دفینے کے بارے میں پتا چلتا ہے جب وہاں سیلاب یا دیگر قدرتی آفات آتی ہیں۔ بجکم ماکانی نے بڑی محنت اور محبت سے اپنا خزانہ جمع کیا تھا اور ایک کرد کے نیزے سے اس کے مارے جانے کے باعث وہ زمین ہی میں رہ گیا۔ اسی طرح ابوعلی محمد بن الیاس کے خزانے کرمان کے صحرا میں مدفون ہی رہ گئے جب اسے اپنے بیٹے کے ہاتھوں صغد کی طرف بھاگنا پڑا۔ کسی نے سچ کہا ہے "آرام میں رہنے والوں کو بہت سختی اٹھانا پڑتی ہے"۔

ترویجہ

چونکہ بادشاہ اور حکمران اکثر اپنی مرضی سے یا اضطراری طور پر سفر میں رہتے ہیں، اس لیے انھیں اپنا خزانہ اپنے ساتھ رکھنا ہوتا ہے تاکہ خدام و حشام کے اخراجات پورے ہو سکیں اور وہ سفر کے دوران میں اخراجات کے ہاتھوں محتاج نہ ہوں۔ چاندی اگرچہ وزن میں ہلکی ہے مگر متعلقہ اشیا کی قیمت ادا کرنے کے لیے وزن رکھتی ہے لیکن انھیں کوئی اور قیمتی شے درکار ہوتی ہے اس لیے انھوں نے سونا رکھنے کا فیصلہ کیا جو چاندی سے دس گنا قیمتی ہے۔ ازمنۂ قدیم میں خون بہا اور زکوٰۃ کی ادائگی کے لیے سونے کو چاندی سے دس گنا زیادہ قیمتی ٹھہرایا گیا۔ یہ قدر بعد کے ادوار میں قائم نہ رہ سکی، بعض اوقات اس کی کمیابی اور بعض اوقات چاندی کی نسبت افراط وتفریط کی صورت میں اور چاندی کی تانبے کی نسبت کمیابی کے باعث۔

حیرت کی بات ہے کہ یہ تینوں دھاتیں زرعیان کی کانوں سے نکالی جاتی ہیں لیکن ان کی باہمی نسبت یہی قائم ہے۔ اگر سونا دس درہم وزن میں ہو تو چاندی پچاس درہم اور تانبا پندرہ سیر۔

چاندی اپنے ساتھ رکھنا آسان ہے۔ اسی لیے بادشاہ اور سلاطین سفر میں اسے اپنا ساتھی بناتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ ہے کہ جب کبھی انھیں ان دیکھی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے تو ان کی نجات اس شے میں ہوتی ہے جو وزن اور مقدار میں کم ہو۔ اس لیے وہ جواہرات پر انحصار کرتے ہیں جو حجم میں سونے سے کم ہوتے ہیں، جس طرح کہ سونا حجم میں چاندی سے کم اور یہ سب ان چیزوں سے حجم میں کم ہوتی ہیں جو ان سے خریدی جاتی ہیں۔ اس لیے انھوں نے یہ چیزیں جمع کیں اور اپنے بدن پر پہننا شروع کیں اور جب انھیں روپوش ہونا پڑتا ہے تو وہ اپنے دشمن سے پوشیدہ ہو سکتے ہیں جس طرح کہ اصحاب کہف ہوئے تھے۔ ان کے پاس جو سکے تھے وہ پرانے ہو گئے تھے، اس لیے لوگوں کو خیال گزرا کہ انھیں کوئی پرانا خزانہ ملا ہے۔ حقیقت میں جواہرات بادشاہوں اور سلطانوں کا خاصہ سمجھے جاتے ہیں۔ اگر جواہرات ایسے شخص کے پاس پائے جائیں جو نہ تو بادشاہ ہو اور نہ امیر تو وہ لوگوں میں مشکوک ہو جاتا اور انھیں یقین ہوتا کہ جواہرات چرائے گئے ہیں اور ہر فرد چور کو گرفتار کرنے کا شائق ہوتا ہے یا پھر وہ یہ یقین کرنے پر مجبور ہوتے کہ یہ شخص درحقیقت امیر ہے اور جواہرات کا حقیقی مالک ہے لیکن اس نے بھیس بدل رکھا ہے۔ لوگ ایسے شخص کی تلاش میں ہوتے ہیں۔

بعض حاکم جواہرات مساجد میں رکھتے ہیں اور انھیں مساجد کے محافظوں میں تقسیم کرتے ہیں یا حفاظت کی غرض سے سرحدی محافظوں کی تحویل میں دیتے ہیں۔

خلفائے راشدین یا ان کے پیروکار خلفا مثلاً عمر بن عبد العزیز اور کچھ مروانی خلفا اور چند عباسی خلفا کا طریق کار یہ تھا کہ وہ خلافت کو عیش و آرام کی بجائے بھاری بوجھ سمجھتے تھے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے تھے کیونکہ وہ اس کی مہلک فطرت کو جانتے تھے۔

المغرب کے کسی شہر سے آنے والے ایک شخص نے بتایا کہ اس علاقے کی حکومت لوگوں میں باری باری بدلی جاتی ہے۔ ہر نواب رضا کارانہ طور پر تین ماہ بعد حکومت چھوڑ دیتا ہے اور اس کے بعد وہ خوشی خوشی صدقہ دیتا اور گھر کی طرف واپس لوٹ جاتا ہے جیسے وہ قید سے چھوٹا ہو اور اب روزمرہ زندگی کو واپس ہوا ہو۔ اس کا باعث یہی حقیقت ہے کہ حکومت و ریاست آرام و سکون ترک کرنے اور مظلوموں کو ظالموں سے نجات دلانے کا نام ہے تا کہ وہ انصاف پا کر اپنی جان و مال اور خاندان کا تحفظ پا سکیں۔ اسے ان کے مفادات اور جان و مال کے تحفظ کے لیے انتظام کرنا ہوتا ہے اور سادھوؤں، نجومیوں وغیرہ پر کڑی نظر رکھنا ہوتی ہے مثلاً کسی علاقے سے محافظین یا امیر کارواں وغیرہ کے سادھو تھے۔ اگرچہ امیر کارواں کے سادھو تھے کا معاملہ تو اب روایات کی تبدیلیوں کے باعث ختم ہو چکا تاہم ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں یہ اپنی روایات ہوتی ہیں جنھیں پیش نظر رکھنا پڑتا ہے ورنہ پورا نظام تباہ ہو جاتا ہے۔ حاکم کو مندرجہ بالا تمام روایات ملحوظ رکھنا ہوتی ہیں۔

ترویجہ

چاندی اور سونے کے برتنوں میں کھانا منع کر دیا گیا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے ان دھاتوں کی افادیت ختم ہو جاتی ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔ مزید یہ کہ قول شیطان یہ بیان ہوا ہے:

"......اور یقیناً میں انھیں حکم دوں گا اور وہ اللہ کی تخلیق کو بدل ڈالیں گے"۔ (النساء ۴:۱۱۹)

یہ بھی ممکن ہے کہ ممانعت کے یہ احکام شرعی اس خیال سے ہوں کہ ایسے برتن بادشاہوں کے پاس ہوتے ہیں اور عوام کے ہاں نہیں ہوتے۔ انسان کو ہر وقت قسمت کے زیر و بم کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ کسی وقت غنی اور کبھی محتاج ہو سکتا ہے۔ اگر اپنی دولت کے بل بوتے پر استعمال کی اشیا کو وہ سونے چاندی کے برتنوں میں بدل لے تو قسمت کی تبدیلی انھیں درہم و دینار میں بدلنے پر مجبور کر دے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ لوگ اس بات کو پالیں اور ان کے ارادے بدلنے لگیں اور وہ حوصلہ ہار بیٹھیں۔ دشمنوں کا حرص ایسے ضعف و افلاس کے مواقعات پر جھپٹ پڑے۔ انسان فطری طور پر خود غرض اور حریص ہے اور دوسروں کے حقوق غصب کر سکتا ہے۔

یہ احکام امتناع ممکن ہے مندرجہ بالا نکتے کے پیش نظر ہوں کیونکہ شریعت اچھے لوگوں اور امرا کی دنیا اور آخرت کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو صحیح نیت اور سوچ کی اہلیت عطا کرے تاکہ وہ اپنے اسلاف سے اخلاقی سبق حاصل کر سکیں۔ وہ ہمیں گناہ کے راستے سے بچائے اور اپنے بے پناہ کرم کے باعث غافلوں اور جعل سازوں کے شکنجوں سے محفوظ رکھے۔[19]

حواشی و تعلیقات

۱۔ انگریزی میں اس جملے کا دوبارہ ترجمہ کیا گیا ہے۔

۲۔ زندگی کے لیے حواس خمسہ کی فطری ضرورت کو بیان کیا ہے

۳۔ البیرونی نے مختلف یا فاصلے کو "ترویحہ" کا نام دیا ہے یعنی ایسا وقفہ جس کے بعد نیا تصور بیان کیا گیا ہو گویا یہ ایک ذیلی جز و یا حصہ ہے۔

۴۔ سورتوں کے نام اور آیتوں کے نمبر متن سے زائد ہیں۔

۵۔ اشعار اصل عربی متن سے ہیں۔ اردو ترجمہ اپنا ہے۔

۶۔ سونے اور چاندی کی جو جدید ضروریات کینسر کے علاج کے لیے سامنے آتی ہیں عہد قدیم کی حکمت نے ان کے ورق تقویت غذا کے لیے تجویز کیے تھے۔

۷۔ زیادہ سرمایہ انتہا میں انہی قیمتی دھاتوں کو بڑھا دیتا ہے۔ دورِ جدید میں یہ اہمیت ختم ہو رہی ہے۔

۸۔ عصام عثمان بن مدثر کے حاجب کا نام تھا اور عطائی اسے کہتے ہیں جو پدرم سلطان بود کا نعرہ لگاتا ہے۔

۹۔ دیوان۔ مطبوعہ مصر، جلد ۲، صفحہ ۲۴

۱۰۔ البیرونی ایسے احکامِ شریعت کی روح جاننے کا خواہش مند نظر آتا ہے جن میں بظاہر ان اشیا کی حرمت کا ذکر ہے جو قیمتی ہوتی ہیں جیسے سونا، چاندی، آلاتِ موسیقی، ظروف، ہتھیار وغیرہ۔ کسی اور زمانے میں ہو سکتا ہے کہ ان کی وہ اہمیت نہ ہو جو نزولِ قرآن کے دور میں انھیں حاصل تھی۔ ایسی آیات کی تفسیر میں ان کے مفاہیم مراد لیے جانے کا امکان البیرونی کو بے چین رکھتا ہے۔ چنانچہ سونا چاندی سے مراد دولت اور ذخیرہ کرنے سے مراد مارکیٹ میں گردشِ زر سے روکنے کی ایک کوشش ہو سکتی ہے۔

فہرست اسناد محولہ

۱۔ احمد، ایم آر، بخاری: بی وی سبرامنیا، ۱۹۷۵ء، *Biruni: An Introduction to his Life and Writings on the Indian Sciences "Indian J. History Sci. 10(2)*، انڈین جرنل آف ہسٹری آف سائنس، ۱۰(۲)، ص ص: ۹۸-۱۱۹

۲۔ البیرونی، محمد بن احمد، مرتبہ: فرٹز کرینکو، ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء، **کتاب الجماہر فی معرفۃ الجواہر** (عربی)، عثمانیہ اورینٹل پبلی کیشن، حیدرآباد دکن۔

۳۔ البیرونی، محمد بن احمد، ترجمہ انگریزی: حکیم محمد سعید، ۱۴۱۰ھ/۱۹۸۹ء، *Book on Precious Stones*، **کتاب الجماہر فی معرفۃ الجواہر**، سو عظیم کتب، ہجرہ کونسل، اسلام آباد۔

۴۔ بے الوف، آر بی، ۱۹۷۳ء، *Beruni Great Scientist of the Orient*، ایل زیڈ وی، اے کے اے ڈی، ناؤک تاجک، ریاست سوویت روس ناؤک، *Fiz-Mat-i Geology-Him* ناؤک، (۳) (۴۹)، ص ص: ۵-۱۳

۵۔ بوئیلوٹ، ڈی جے: ایل اورے ۱۹۵۶ء، *Al-Biruni=Essai Bibliographique*، d، *MIDEO*، ii، ص ص: ۱۶۱-۲۵۶، iii، ص ص: ۳۹۱-۳۹۶

۶۔ راشد، رشدی، بہ معاونت ریجس مورلون، ۱۹۹۶ء، *Encyclopedia of History of Arabic Science, 1&3*، روٹ لیج۔

۷۔ روزن فیلڈ، بی اے، ایم ایم روژانسکایا، زیڈ کے سکولوفسکایا، ۱۹۷۳ء، *Abu'-Raphan al-Biruni*، ماسکو (روس)

۸۔ سعید، حکیم محمد، مرتب، ۱۹۷۹ء، Biruni Commemorative Volume: Proceedings of the International Congress held in Karachi, November 26-December 12, 1973، کراچی

۹۔ کولنگمن، ریچرڈ، مئی جون ۲۰۰۷ء، "Rediscovering Arabic Science", Saudi Arab World، ص ص: (۲۔۱۴)

۱۰۔ کینیڈی، ای ایس، ۸۰۔۱۹۷۰ء، "Beruni Abu Rayhan, al-" Dictionary of Scientific Biography، نیویارک: چارلس سکریبنرز سنز

۱۱۔ گلک، تھامس ایف؛ لیویسے، سٹیون جان؛ ویلس، فیتھ، Medieval Science Technology and Medicine: An Encyclopedia، روٹلیج

برقی ماخذ:

۱۔ "On Stones":Biruni'works

(http://www.Farlong.com/gemstones/biruni-book)

مکمل متن مع تبصرات۔

۲۔ البیرونی (www.fantasticasia.net---Alburuni)

۳۔ www.al-qalam.org/index.php

۴۔ www.muslimheritage.com

۵۔ encyclopedia iranica"Biruni" (www.iranica.com)

Abstract

The Book on Precious Stones, Fascicle 1 by Muhammad Ahmed Alberuni (362H/973A.D- 440H / 1048 A.D) is a most valuable book on gemmology and Physical chemistry. Its literary style is also noteworthy. The Arabic Text was edited by Fritz Kren kow and published in 1355 H / 1936 A.D. from Hyderabad/ Deccan. The English Text was Translated by Hakeem M. Saeed (Said) and was published by Hijra Council Islamabad in 1410H/1989. It is now being translated in Urdu with annotation and modern comparative studies. The Urdu Translation of its 1st fascicle is presented here because of its literary worth.

معیار: علمی و تحقیقی مجلہ شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، جلد ۲، شمارہ ۳، جولائی۔ دسمبر ۲۰۰۹ء

تبصراتی مقالہ

اسلام اور مغرب: ماضی، حال اور مستقبل

۱۱/۹ کے بعد مغرب میں مطالعۂ اسلام کی ایک نئی جہت

Following Muhammad: Rethinking Islam in the Contemporary World

By: Carl W. Ernst, 2004 (2003), Delhi: Yoda Press, Pages 344

نجیبہ عارف*

امریکہ میں لفظ 'اسلام' اور اس کے متلازمات کے بارے میں جاننا چاہیں تو کتابوں کی کسی دکان میں داخل ہو جائیں۔ خون خشک کر دینے والے عنوانات اور سرورق فوراً آپ کو اپنی طرف متوجہ کر لیں گے۔ یہ سنسنی خیز، صحافیانہ ادب مسلمانوں کی امریکہ دشمنی اور اس کے خلاف دہشت گردی کے کارزار دینے والے منصوبوں کو طشت از بام کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ الماریوں میں ایسی کتابیں بھی موجود ہیں جن میں نہایت سنجیدہ اور محققانہ انداز میں مسلم تہذیب کی ناکامی اور اسلام اور مغرب کے درمیان تصادم کی پیش گوئیوں کی تصدیق کی گئی ہے وہیں کسی گوشے میں، اسلام کے 'فلسفۂ مذہب' اور 'تاریخ' سے متعلق، بیزار کن اور پیچیدہ نثر میں نصابی مباحث پر مبنی کچھ جائزے اور مطالعات بھی مل جاتے ہیں۔ شاید چند ایک مسلمان مصنفین کی اسلام کے خلاف الزام تراشیوں کے جواب میں دفاعی نقطۂ نظر سے لکھی گئی معذرت خواہانہ انداز کی تحریریں بھی مل جائیں اور آخر میں دو تین تراجم قرآن ۔۔۔ ایک اجنبی زبان کا پراسرار اور ناقابلِ فہم متن۔ تو پھر اسلام سے شناسائی کیسے ہو؟[1]

یہ وہ سوال ہے جو کارل ارنسٹ (Carl Ernst) نے اپنی کتاب 'نقشِ کفِ پائے محمدؐ' (Following Muhammad: Rethinking Islam in the Contemporary World) کے مقدمے میں، اپنی تصنیف کا جواز پیش کرتے ہوئے اٹھایا ہے۔ کارل ارنسٹ کا نام امریکہ میں مطالعات اسلامی کے پروفیسر کی حیثیت سے نیا نہیں۔ وہ کئی برس سے نارتھ کیرولینا یونیورسٹی میں مطالعۂ اسلام کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور کیرولینا مرکز برائے مطالعۂ مشرق وسطیٰ اور تہذیب اسلامی کے ڈائریکٹر ہیں۔ انھیں اہم السنۂ شرقی یعنی عربی، فارسی اور اردو سے خوب واقفیت حاصل ہے اور اپنے تحقیقی منصوبوں کے سلسلے میں وہ ایران، ترکی، پاکستان، ہندوستان، اور افریقی ممالک میں کئی بار سفر کر چکے ہیں۔ ان کی اہم کتابوں میں Sufi Martyrs of Love: Chishti Sufism in South Asia and Beyond (۲۰۰۲ء)، Teachings of Sufism (۱۹۹۹ء)، Ruzbihan Baqli. The Unveiling of Secrets: Diary of a

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

Ruzbihan Baqli: Mystical Experience and the Rhetoric of Sainthood in Persian Sufi Master (۱۹۹۶ء)، Eternal Garden: Mysticism, History, and Politics at a South Asian Sufi Center (۱۹۹۲ء)، Sufism (۱۹۹۷ء۔ یہ کتاب غلام علی آزاد بلگرامی کی معروف فارسی تصنیف "روضۃ الاولیا" کا ترجمہ ہے جو خلد آباد کے صوفیا مشائخ کے حالات پر مشتمل ہے) شامل ہیں۔ حال ہی میں ان کی تازہ کتاب Rethinking Islamic Studies: From Orientalism to Cosmopolitanism (۲۰۱۰ء) شائع ہوئی ہے جسے انھوں نے رچرڈ مارٹن کے ساتھ مل کر مرتب کیا ہے۔ کارل ارنسٹ کی اہم ترین کتاب Following Muhammad: Rethinking Islam in the Contemporary World ہے جو ۲۰۰۳ء میں پہلی بار نارتھ کیرولینا یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی اور عربی، فارسی، ترکی، جرمن اور کورین زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان اور برطانیہ سمیت کئی ممالک میں طبع ہو چکی ہے۔ اس کتاب نے علمی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی اور کئی عالمی ایوارڈ بھی حاصل کیے۔[۲]

کتاب کے مقدمے ہی میں انھوں نے چند ذاتی تجربات کے ذریعے اس پس منظر سے واقف کر دیا ہے جس میں نہ صرف اس کتاب کی ضرورت اور اہمیت اجاگر ہوتی ہے بلکہ ۹/۱۱ کے بعد امریکہ میں تیزی سے ابھرنے اور پھیلنے والے اسلام مخالف جذبات کی شدت اور نوعیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب انھوں نے ۲۰۰۲ء میں تصنیف کی تھی جب ۹/۱۱ کا واقعہ رونما ہوئے ابھی کچھ عرصہ ہی گزرا تھا۔ اس تصنیف کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کی متعصبانہ اور بنیاد پرستانہ تفہیم سے دور رہتے ہوئے اس کی مذہبی روایت اور عصری تناظر کا، ایک مختلف اور ہم دردانہ مگر تجزیاتی اور استدلالی مطالعہ پیش کیا جائے۔ اس بظاہر سہل اور منطقی کوشش کی راہ میں حائل مشکلات کا اندازہ دو واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔

۲۰۰۲ء کے موسم گرما میں جب وہ اس کتاب کا مکمل مسودہ لے کر اس ناشر کے پاس پہنچے، جس سے اس کی اشاعت کا معاہدہ پہلے سے طے تھا تو ناشر نے خاصی تاخیر کے بعد انھیں یہ مژدہ سنایا کہ وہ اس کتاب کی اشاعت سے معذور ہے کیوں کہ ادارتی بورڈ کے کچھ ارکان اس کتاب کی اشاعت کے بارے میں شدید تحفظات رکھتے ہیں۔ یہ تحفظات مسودے کی علمی و تحقیقی نوعیت کے بارے میں نہیں تھے بلکہ ان کا خیال تھا کہ وہ ایک ایسی کتاب کی اشاعت کے منصوبے میں شریک نہیں ہو سکتے جو دہشت گردی کے جواز میں تحریر کی گئی ہو۔

دوسرا واقعہ نارتھ کیرولینا یونیورسٹی کے موسم گرما کے تدریسی پروگرام کے دوران پیش آیا۔ جب پروگرام کے انچارج نے خواہش ظاہر کی کہ موسم گرما کے دوران کوئی ایسا کورس پیش کیا جائے جو ۹/۱۱ کے بعد اٹھنے والے سوالات اور مسائل سے متعلق ہو۔ اس مقصد کے لیے کئی موضوعات زیر بحث آئے۔ مشرق وسطیٰ کی تاریخ، دہشت گردی اور اسی نوع کے کئی دوسرے موضوعات کو رد کرنے کے بعد مصنف سے دریافت کیا گیا کہ کیا سال اول کے طالب علموں کو ترجمۂ قرآن پڑھانا مناسب رہے گا؟ مصنف نے فوراً اس تجویز پر صاد کیا اور مائیکل سیلز (Michael Sells)[۳] کا ترجمہ Approaching the Quran: The Early Revelations تجویز کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ تدریسی پروگرام ملکی اور بین الاقوامی سطح پر زیر بحث آ گیا اور ورجینیا کے ایک عیسائی گروپ نے مسلم دہشت گردوں کی حمایت کا الزام لگا کر یونیورسٹی کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ ریاست کی مجلس قانون ساز کے اراکین بھی اس تدریسی پروگرام پر غضب ناک ہو گئے اور اگرچہ وفاقی عدالت نے مقدمے کا فیصلہ یونیورسٹی کے حق میں کر دیا تاہم ان واقعات سے اس تکلیف دہ حقیقت کا انکشاف ہوا کہ امریکہ میں اسلام کے بارے میں بے لاگ اور منصفانہ بحث کو رواج دینا کس قدر دشوار مگر کتنا ضروری ہے۔ ارنسٹ لکھتے ہیں کہ انھوں نے یہ کتاب شکوک و شبہات، غلط اور گمراہ کن معلومات

اور اسلامی عقائد و تعلیمات کے بارے میں آزادانہ غور و فکر کی غیر موجودگی کے باعث پھیلنے والی دھند میں راستہ بنانے کے لیے تحریر کی ہے۔
یہ کتاب دراصل اس خصوصی دلچسپی کا مظہر ہے جو ۹/۱۱ کے بعد پیدا ہونے والے حالات میں، اسلام اور اس کے عقائد، نظام معاشرت اور فکری اساس کے بارے میں مغرب، بالخصوص امریکہ میں پیدا ہوئی ہے۔ شمالی امریکہ کی دیگر جامعات کے علاوہ نارتھ کیرولینا میں تین یونیورسٹیوں کی ایک مثلث خاص طور پر اس حوالے سے نمایاں ہوئی ہے جہاں اسلام کا سنجیدگی، دلچسپی اور فکری آزادی سے مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ کارل ارنسٹ کا تعلق اسی تکون سے ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں انھوں نے واضح طور پر اعلان کیا ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں[۴] اور اس کتاب کی تصنیف کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے اس انسان دوست تاثر کو اجاگر کیا جائے جو صوفیا کی تعلیمات کا عطر ہے اور انسانیت کے تحفظ کی خاطر، بین المذاہب ہم آہنگی، برداشت اور تحمل کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگرچہ انھیں اپنے اس مقصد کی راہ میں حائل دو طرفہ دشواریوں کا بھی احساس ہے جن کا ایک پہلو تو یورپ اور امریکہ میں اسلامی نظریات و نظام حیات سے لاعلمی کا نتیجہ ہے اور دوسرا خود مسلمانوں کے انتہا پسند عناصر کی سرگرمیوں کا ردعمل ہے جو اسلام کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ تاہم ان کا یہ اعتراف کہ اسلام کا غیر جانب دارانہ مطالعہ اس لیے ضروری ہے تاکہ امریکیوں کو معلوم ہو سکے کہ مسلمان بھی انسان ہیں اور انسانیت کے کل کا ایک جزو ہیں[۵]، اصل صورت حال کا چشم کشا اشارہ ہے۔
کتاب کل چھے ابواب پر مشتمل ہے جس میں اسلام کا بطور مذہب اور نظام حیات مطالعہ کیا گیا ہے۔ کئی مقامات پر یہ مطالعہ اس قدر جامع اور گہرا نہیں مگر مجموعی طور پر مصنف کا نقطۂ نظر بے تعصبی اور غیر جانب داری پر مبنی ہے۔ تاہم اس کتاب کا پہلا باب جسے اس مضمون میں موضوع بحث بنایا گیا ہے کئی حوالوں سے اس لائق ہے کہ اس کے مندرجات کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے اور ان کی روشنی میں مغرب میں پھیلنے والے اسلام کے منفی تاثر کے اسباب و محرکات پر غور کیا جائے۔ اس باب کا عنوان ہے "اسلام مغرب کی نظر میں"۔
ارنسٹ نے مغرب کو امریکہ اور یورپ کا مترادف قرار دیا ہے۔ امریکہ میں پھلنے پھولنے والی تہذیب کا منبع یورپی تہذیب ہی قرار پاتی ہے مگر گزشتہ پانچ سو برس کے دوران خود امریکی روایات بھی پروان چڑھیں۔ مغرب کی جو علاقائی یا جغرافیائی حد بندی ارنسٹ نے اختیار کی ہے اس پر بیشتر مغربی مفکرین متفق ہیں حالاں کہ جغرافیائی اعتبار سے یورپ اور امریکہ میں ہزاروں میل کا فاصلہ ہے۔ موسم اور آب و ہوا کے لحاظ سے بھی دونوں خطے ایک جیسے نہیں۔ ان اصطلاحات کا استعمال اس وقت شروع ہوا جب مغربی یورپ کی حکومتیں غریب ممالک کو غلام بنانے میں مصروف تھیں اور مغربی یورپ کو مرکز مانتے ہوئے اس کے مشرق کی جانب واقع علاقوں کو "مشرق" پکارنے لگی تھیں۔ اب جب کہ امریکہ تمام بین الاقوامی امور میں مرکزی حیثیت حاصل کر چکا ہے اور مغربی یورپ کے علاقے امریکہ کے مغرب نہیں، بل کہ مشرق میں واقع ہیں، امریکہ کے حوالے سے یورپ کو "مغرب" شمار کرنا درست نہیں لیکن اس کے باوجود شمالی امریکہ اور مغربی یورپ کے ممالک خود کو مشترک طور پر مغرب قرار دیتے ہیں۔[۶] ارنسٹ نے بھی اسی خیال کو بنیاد بنایا ہے لیکن ان کی کتاب کے مضامین یورپ سے زیادہ امریکی قوم کے فکری و تہذیبی رویوں کو زیر بحث لاتے ہیں۔

[۱]

اسلام اور مغرب: عصری تناظر

اسلام اور مغرب دو مختلف نوعیت کی اصطلاحات ہیں۔ مغرب ایک جغرافیائی اصطلاح ہے جو کسی خاص خطۂ زمین سے وابستہ ہے جب کہ اسلام

کا تعلق معتقدات و نظریات سے ہے۔ دونوں کے درمیان ایسی کوئی یکسانیت موجود نہیں جس کی بنا پر دونوں کا تقابل کیا جا سکے۔ لیکن یہ تقابل عہدِ حاضر کی فکری جستجو کا اہم محور بن چکا ہے۔ برنارڈ لیوس نے اس تقابلی مطالعے کا جواز پیش کرتے ہوئے "مغرب" کی لسانی اصطلاح کو قرونِ وسطیٰ میں استعمال ہونے والی اصطلاح "عیسائی دنیا" (Christendom) کا متبادل قرار دیا ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ میں مذہبی تشخص نے ثانوی اور سیکولر نظریات نے اولین اہمیت حاصل کر لی تو یورپ، جو پہلے عیسائی دنیا سمجھا جاتا تھا، خود کو مغرب کہنے لگا۔ گویا مغرب سے وہ ممالک مراد ہیں جہاں یورپی نشاۃ ثانیہ کے بعد سیکولرازم کا دعویٰ کیا جانے لگا۔ دوسری طرف اسلام سے وہ خطے یا ممالک مراد لیے جاتے ہیں جہاں اسلامی نظام رائج ہے۔ یہ بھی ایک پیچیدہ معاملہ ہے اور ارنسٹ نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ مذہبی تصورات کی وحدت کے پس پشت تکثیریت کار فرما ہوتی ہے اور انھیں مختلف طرح سے دیکھا، سمجھا اور برتا جاتا ہے لہٰذا پوری اسلامی دنیا کو عصرِ جدید میں ایک یکساں اکائی قرار دینا معاملے کو غیر ضروری طور پر سادہ کر لینے کے مترادف ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ماضی کو رد کرنے اور حال کو حقیقت کی واحد میزان خیال کرنے کا عمل بھی نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔ جدیدیت کی جس مستند دلیل نے ماضی کے مقابلے میں زمانۂ حال کو مغرب کا خیرِ مطلق قرار دے رکھا ہے ارنسٹ نے اس پر تنقید کی ہے کیوں کہ حال ایک نہ ایک دن ماضی ہو جاتا ہے اور اگر ماضی فرسودہ اور بے معنی ہے تو حال بھی اس تہمت سے پاک نہیں رہ سکتا۔ مغرب میں مذہب کو محض حال کی روشنی میں پرکھنے کا عمل جاری ہے اور یہی عمل درست نتائج کے استنباط میں حائل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہبی عقائد و احکامات کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ کی لسانی تاریخ اور مختلف عصری تعبیرات میں ان کا استعمال بھی قابلِ غور ہے جس کے بغیر مذہب کی روح تک نہیں پہنچا جا سکتا۔

[۴]

تہذیبی برتری کا دعویٰ اور تاریخی حقائق

ارنسٹ نے اہلِ مغرب، بالخصوص امریکی قوم کی نفسیات اور احساسِ برتری کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ امریکی بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں مگر وہ اپنے علاوہ دیگر اقوام کی تہذیب و ثقافت کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے یا اسے ضروری نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب (یعنی یورپ اور امریکہ) اور باقی دنیا کے درمیان اجنبیت اور لاعلمی کی ایک گہری خلیج حائل ہے۔ ابلاغ و تفہیم کا عمل اگر ہے بھی تو نامکمل اور یک طرفہ۔ یعنی ایجادات، اشیا اور تصورات و نظریات کا بہاؤ مغرب سے دنیائے دیگر کی جانب ہے۔ اس عمل کو عہدِ حاضر میں عالم گیریت (گلوبلائزیشن) کا نام دے دیا گیا ہے۔ مغرب کے نوآبادیاتی دور میں چند یورپی زبانوں نے، جن میں انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی، پرتگالی اور روسی شامل ہیں، دنیا بھر میں اہمیت اختیار کر لی اور ان کا کلچر پوری دنیا میں ممتاز و محترم سمجھا جانے لگا۔ یہی زبانیں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا ذریعہ بنیں اور ذرائع ابلاغ پر قابض ہو گئیں۔ دوسری دنیا کے لیے ان زبانوں اور ان سے منسلک تہذیب و ثقافت کو اپنانا ناگزیر ہو گیا لیکن امریکی اور یورپی اقوام کے لیے دوسری زبانوں جیسے چینی، اردو، عربی، بنگالی، انڈونیشین زبانوں کو نظر انداز کرنا بالکل فطری معلوم ہونے لگا۔ امریکی اور یورپی ادیب، شاعر اور فن کار دنیا بھر میں معروف و مقبول ہو گئے لیکن ایشیائی، افریقی یا مشرقِ وسطیٰ کے ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کو یہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ امریکہ اور مغرب کی جامعات میں لاکھوں کی تعداد میں نوجوان طالب علم تاریخ، سیاسیات اور کلچر سے متعلق نصابی کتابوں کے ذریعے یہی سبق پڑھتے ہیں کہ تہذیب کی اولین تحریک میسوپوٹیمیا اور عراق سے آغاز ہوئی، مصر سے باقاعدہ صورت اور رفتار یونان میں حاصل ہوئی۔ یونان کے زوال کے بعد یہ شمع روم نے روشن رکھی اور پھر دیگر یورپی ممالک، فرانس، جرمنی اور سپین سے ہوتی ہوئی انگلستان تک پہنچی جہاں سے بالآخر تہذیبی سیادت کی یہ سعادت امریکہ کو نصیب ہوئی۔ ایک نظریے کے مطابق امریکہ میں بھی کیلی فورنیا کا علاقہ وہ مقام ہے جسے

مغربی تہذیب کا نقطہ عروج قرار دیا جا سکتا ہے تاہم نیویارک جیسے علاقوں سے اس آخری نقطہ نظر سے اختلاف کی صدا بلند ہوتی رہتی ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق مغربی تہذیب کے بنیادی مآخذ دو ہیں: اخلاقیات اور مذہبی معتقدات کا سرچشمہ اسرائیلی الہامی مذاہب اور صحائف ہیں اور سائنسی علوم اور جمہوری طرزِ حکومت کا منبع حکمتِ یونان ہے۔ لیکن یہ نقطہ نظر اسلامی تہذیبی سفر کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے۔ ارنسٹ کے خیال میں اسلامی تہذیب بھی انھی دونوں منابع سے کسبِ فیض کی دعویدار ہے۔ اگرچہ ارنسٹ کا یہ خیال ایک طویل بحث کا متقاضی ہے لیکن وہ اس دعوے کا یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ قرآن میں ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ سمیت نبیوں اور رسولوں کی ایک کثیر تعداد کا اثبات موجود ہے اور حکمت یونان کو یورپ سے متعارف کرانے کا سہرا بھی مسلمانوں ہی کے سر ہے۔ لیکن یونانی علوم کے یورپ میں احیا کے بعد مسلم دنیا میں فلسفے اور علوم کا ارتقا ختم نہیں ہو گیا تھا بلکہ ایران اور ہندوستان میں زمانہ حال تک مسلم فلسفہ کئی اہم تبدیلیوں سے دوچار ہوتا رہا ہے۔ بدقسمتی سے ایک مخصوص طبقے کے علاوہ، مغربی علما عام طور پر مسلم فلسفے کے اس ارتقا سے ناواقف رہے ہیں۔ لہٰذا مغرب کا یہ دعویٰ کہ وہ اسرائیلی پیغمبروں کے مذاہب اور حکمتِ یونان کا تنہا وارث ہے درست نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ۱۴۵۳ء میں ترکوں کے ہاتھوں قسطنطنیہ کی فتح کے بعد تہذیب کے دھارے کی ایک لہر روم سے مشرق کی جانب بھی رُخ کر چکی تھی۔ لیکن دوسری طرف یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ تہذیب کے تنہا وارث ہونے کا دعویٰ یک طرفہ نہیں تھا، چودھویں صدی کے اواخر میں، شمالی افریقہ کے ایک عرب مورخ اور فلسفی ابن خلدون (۱۳۳۲ء۔۱۴۰۶ء) نے بھی یہ "افواہ سنی تھی کہ شمالی فرنگستان کے کچھ وحشی یعنی یورپی عیسائی، فلسفے وغیرہ میں دلچسپی رکھتے ہیں لیکن اسے اس امر کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا"۔[۸] بلاشبہ ایسی لاعلمی کا کم از کم موجودہ دور میں کوئی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا اور اہلِ مغرب تہذیبی ارتقا میں مسلمانوں کے کردار کو نظر انداز کر کے خود اپنے تشخص کو مشکوک بنا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ تہذیبوں کے تصادم جیسے نظریات اس مغالطے کو فروغ دے رہے ہیں کہ یورپ کی سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی دراصل اس کی تہذیبی برتری کا ثبوت ہے۔ ادھر اسلام کے حلقے سے بھی کچھ لوگ مغرب اور دنیائے اسلام میں ازلی مخاصمت کا نعرہ لگاتے ہیں۔ اس لیے کوئی بھی نتیجہ قائم کرنے سے پہلے یہ حقیقت ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ عوام الناس سے خطاب کے دوران جو مذہبی زبان استعمال کی جاتی ہے وہ محض معلومات کی ترسیل کے لیے نہیں، بلکہ مذہبی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے وضع کی جاتی ہے۔[۹] یہاں مذہبی زبان سے ارنسٹ کی مراد صحائف کی زبان نہیں بلکہ مذہبی حلقوں کی جانب سے استعمال ہونے والی زبان ہے جس سے عوام کی پسند، ناپسند اور جوش و جذبے کا رُخ مطلوبہ سمت میں موڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مذہبی اصطلاحات اور لسانی اظہارات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے تاریخی تناظر کو مدِنظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ یورپ کا اسلام کے خلاف تعصب نوآبادیاتی نظام کا کوئی قابلِ قبول جواز پیش کرنے کی کاوش ہو سکتا ہے اور معاصر اسلامی حلقوں میں مغرب مخالف رویہ اسی نوآبادیاتی تسلط کے ردِ عمل کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔[۱۰] نیز اس بات سے بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کہ دونوں طرف کے سیاسی حلقے اور حکمران اپنے اقتدار کی حفاظت کے لیے مذہب کو ایک آلۂ کار اور ہتھکنڈے کے طور پر بھی استعمال کرتے آئے ہیں۔ مذہبی جذبات کے اس استحصال کی مثالیں تاریخ کے صفحات سے لے کر زمانہ حال تک موجود ہیں۔

[۴]
مغرب میں اسلام دشمنی: تاریخی تناظر

یہ حقیقت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ مغرب میں کسی مذہب کا ایسا منفی تاثر قائم نہیں ہوا جیسا اسلام کا۔ گاندھی نے ہندومت کا عدم تشدد کا فلسفہ دنیا میں متعارف کروا کے خاصا مثبت تاثر قائم کر لیا اور دلائی لامہ نے تو دنیا بھر میں بدھ مت کا خوش گوار تعارف کروا دیا۔ یورپ اور امریکہ میں

گزشتہ صدی کے دوران یہودیت کے بارے میں بھی بہت مثبت تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ یہود دشمنی اگرچہ بیسویں صدی کے آغاز تک عام تھی لیکن ہولوکاسٹ اور اسرائیلی ریاست کے قیام کے بعد اس میں نمایاں کمی آئی ہے۔ عیسائیت یونہی مغربی اکثریت کا مذہب ہے اور اسے کبھی کوئی خطرہ لاحق نہیں رہا۔ اب رہا اسلام تو ذرائع ابلاغ مسلسل اس کا ایک منفی تاثر قائم کرتے آئے ہیں اور یہ تاثر کم و بیش پورے مغرب میں نفوذ کر چکا ہے۔ یہ منفی تاثر کیوں قائم ہوا؟ مسلمانوں کے ماضی اور حال کا یہ تاثر کس حد تک استوار ہے؟ مسلمانوں کے خلاف یہ معاندانہ جذبات جنھیں مغرب میں قبول عام حاصل ہو چکا ہے کیا جواز رکھتے ہیں؟ یہ وہ سوال ہیں جنھیں اٹھانا اب ناگزیر ہو گیا ہے۔ تعجب خیز امر تو یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ میں سامی النسل یہودیوں سے دشمنی کو کوئی معزز شخص جائز نہیں سمجھتا۔ اس بات پر کم و بیش پوری عوام کا اتفاق ہے کہ یہودیوں کے بارے میں تحقیر آمیز کلمات ادا کرنا یا ان کی توہین کرنا، خواہ یہ جسمانی خصائص کی بنا پر ہو یا رویے کی بنا پر، قابل نفرت اور بد اخلاقی کا مظہر ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسی عوام کا تعلیم یافتہ اور باشعور طبقہ تک اس بات کا قائل نظر آتا ہے کہ اسلام بزدلانہ عورتوں پر ظلم کرنے والا اور تشدد پسند مذہب ہے۔ شماریاتی اعتبار سے بھی اس امر کا تجزیہ دلچسپ نتائج پیش کرتا ہے۔ دنیا میں یہودیوں کی آبادی تیرہ ملین ہے جو سکھوں کی آبادی سے کچھ کم ہے۔ ظاہر ہے یہ سمجھنا مضحکہ خیز ہوگا کہ اتنی بڑی آبادی کا ہر فرد ایک جیسی خصوصیات، عادت و اطوار کا مالک ہوگا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ مسلمانوں کی آبادی ایک بلین سے بھی کچھ اوپر ہے اور اتنی بڑی آبادی کے ہر فرد کو ایک جیسی خصوصیات کا حامل قرار دے دیا جاتا ہے جو یقیناً بہت بڑی غلطی ہے۔

حقیقت یہ ہے، اور جیسا کہ مطالعہ اسلام کے ایک نامور اسکالر، مارشل ہوجسن (Marshal Hodgson ۱۹۶۸ء۔۱۹۹۲ء) نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب *The Ventures of Islam: Conscience and History in the World Civilaiztion* میں کہا ہے کہ گزشتہ ۲۰۰ سال سے کسی علیحدہ اسلامی دنیا کا وجود نہیں ہے۔ نہ سیاسی طور پر، نہ معاشی طور پر، نہ تہذیبی و ثقافتی طور پر اور نہ عسکری اعتبار سے۔ اکثر مسلم ممالک کی تقدیر اس تمام عرصے کے دوران کسی نہ کسی طور پر یورپ اور امریکہ سے وابستہ رہی ہے۔ بین الاقوامی مالیاتی ادارے، کثیر القومی تجارتی ادارے، ذرائع ابلاغ کے ریڈیو اور انٹرنیٹ کی دنیا نے ایک ایسی دنیا کی تشکیل کی ہے جس میں کسی ایک کلچر کو دوسرے کے اثرات سے پاک رکھنا کم و بیش ناممکن ہے۔ دوسری طرف اگر ۵۰ سے زیادہ مسلمان ممالک کی جانب دیکھا جائے تو ان کا تہذیبی و ثقافتی تنوع، لسانی، نسلی اور گروہی اختلافات اور نظریاتی و فرقہ وارانہ اختلافات حیران کن ہیں۔

مغرب اور اسلام یا دوسرے لفظوں میں عیسائی دنیا اور دنیائے اسلام کے درمیان روابط کی تاریخ کھنگالتے ہوئے ارنسٹ نے لکھا ہے کہ یہودیوں کی نسبت عیسائیوں نے مسلمانوں کے بارے میں معاندانہ جذبات و تاثرات نے موجود نفرت انگیز فضا تیار کرنے میں زیادہ بڑا کردار ادا کیا ہے۔ قرون وسطیٰ میں عیسائیوں کی نسبت یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان زیادہ قریبی تعلقات قائم رہے ہیں اور حال ہی میں اسرائیلی ریاست کے قیام تک دونوں ایک دوسرے کے رفیق و معاون رہے ہیں۔ مصنف کا یہ نقطہ نظر نہ صرف اسلامی مؤرخین کے نقطہ نظر سے مختلف ہے جو عیسائیوں کی نسبت یہودیوں کو اسلام کا دشمن قرار دیتے ہیں اور اس کا سرا پہلی اسلامی ریاست مدینہ میں یہودیوں کی اسلام دشمنی سے ملاتے ہیں بلکہ ان کے ہم عصر برنارڈ لیوس بھی مسلمانوں اور عیسائیوں کو ایک دوسرے کا ازلی ہمسایہ اور کئی مشترک اوصاف کا مالک قرار دیتا ہے۔ البتہ ارنسٹ نے قرون وسطیٰ سے لے کر اب تک عیسائیوں کی مسلم دشمنی کا جو اجمالی جائزہ پیش کیا ہے وہ ان کے اس دعوے کو بڑا وزن فراہم کرتا ہے۔ عیسائی راہب بحیرہ (جس نے پیغمبر اسلام کو نبوت کی بشارت دی تھی) کی کردار کشی سے لے کر موجودہ زمانے تک عیسائی دنیا میں

اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں منفی پراپیگنڈے کا سلسلہ جاری رہا ہے۔[۱۲]

۱.۳۔ پیغمبر اسلام کی کردار کشی اور عیسائی پراپیگنڈہ

اسلام عیسائیت کو ایک الہامی مذہب قرار دیتا ہے اور دنیا بھر کے مسلمان بالاتفاق عیسیٰ اور مریم کو لائق تعظیم سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف قرون وسطیٰ سے لے کر آج تک عیسائیوں نے مسلمانوں کی ان کے پیغمبر سے عقیدت اور والہانہ شیفتگی کو ہمیشہ زخم لگانے کی کوشش کی ہے (حضرت) محمدؐ کی وہ تمام صفات، جو مسلمانوں کے نزدیک محترم مثالی اور لائق تقلید ہیں، عیسائی مصنفین نے انھیں منفی انداز میں، خامیوں کے طور پر پیش کیا۔ یہ روایتی نظریہ کہ (حضرت) محمدؐ ''اُمّی'' تھے، مسلمانوں کے لیے اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ ان پر نازل ہونے والی وحی خدا کا کلام ہے لیکن عیسائیوں کے نزدیک یہ جعل سازی کا ثبوت تھا۔ (حضرت) محمدؐ کا ابراہیم کے بیٹے اسماعیل کی نسل سے ہونا بھی ان کے نزدیک غلط دعویٰ تھا (عیسائی اس دعوے کو غلط نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسماعیل کو ایک لونڈی ہاجرہ کی اولاد ہونے کے باعث کم تر خیال کرتے تھے اور اس بنا پر (حضرت) محمدؐ کے دعویٰ نبوت کو بھی پر کذب ثابت کرتے تھے)۔ (حضرت) محمدؐ نے مشرکین مکہ کی، معجزات دکھانے کی فرمائش کے جواب میں قرآن کو اپنا معجزہ قرار دیا تھا۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ بات (حضرت) محمدؐ کی روحانی عظمت کی دلیل ہے مگر عیسائیوں نے اسے اس بات کا واضح ثبوت سمجھا کہ (حضرت) محمدؐ خدا کے نبی نہیں تھے۔

حیات (حضرت) محمدؐ پر اہل مغرب کی سب سے سخت تنقید آپ کی عسکری مہمات اور تعدد ازدواج سے متعلق رہی ہے۔ عیسائیوں کے نزدیک عیسیٰ کی طرح تجرد اور عدم تشدد کی زندگی روحانیت کا لازمی جزو ہے۔ (حضرت) محمدؐ کا جنگوں میں شامل ہونا اور تعدد ازدواج ان کے نزدیک اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ روحانی عظمت کے اس بلند معیار کو نہیں پہنچتے جسے عیسیٰ نے اپنے طرز عمل سے قائم کیا تھا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا ایمان ہے کہ (حضرت) محمدؐ ایک کامل انسان کا نمونہ تھے۔ انھوں نے خود اپنے اسوہ حسنہ کے ذریعے اپنے پیروکاروں کو ایک متوازن اور مکمل زندگی بسر کرنے کی تعلیم دی ہے اور ان کا زندگی کے حقیقی معاملات میں شریک ہونا ان کی پیغمبرانہ شان کو کم کرنا نہیں بلکہ زیادہ کر دیتا ہے۔ وہ عیسیٰ کے تجرد اور عدم تشدد کو انسانی نفسیات اور اس کی باطنی حقیقت کو جھٹلانے کے مترادف سمجھتے ہیں۔ دونوں مذاہب کے درمیان نقطۂ نظر کا یہ اختلاف کئی صورتیں اختیار کرتا چلا گیا۔ ایک طرف کلیسائی اکابرین کے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل تھا کہ کلیسائی دائرے سے باہر کسی کو پیغمبرانہ عظمت حاصل ہو سکتی ہے اور دوسری طرف مسلمان صدق دل سے کلیسائی عقائد، بالخصوص تثلیث کے عقیدے کو، اصل مسیحی تعلیمات سے روگردانی اور گمراہی خیال کرتے تھے۔

مسلمان محمدؐ کو رحمۃ اللعالمین خیال کرتے ہیں اور عیسیٰ کو روح اللہ اور کلمۃ اللہ قرار دیتے ہیں۔ عیسائی مصنفین اس رویے کے بالکل برعکس، مسلمانوں کی (حضرت) محمدؐ سے غیر معمولی عقیدت اور شیفتگی کو ٹھیس پہنچانے اور (حضرت) محمدؐ کی سیرت و کردار کو مسخ کرنے کی کوشش میں مصروف رہے۔ اگرچہ چند ایک مصنفین نے بے تعصبی سے حیات محمدؐ رقم کرنے کی کوشش بھی کی مگر اکثریت کا رجحان منفی تاثر کو ابھارنے کی طرف ہی رہا اور اکثر صورتوں میں اس انتہا تک جا پہنچا کہ بہتان طرازی اور کذب و افترا کی نوبت آن پہنچی۔[۱۳] ارنسٹ نے اس سلسلے میں برس ہا برس تک موثر اور مقبول رہنے والی انگریزی کتاب ہمفری پریڈاکس (Humphery Prideaux) کی *The True Nature of Imposture Fully Displayed in the Life of Mahomet*،[۱۴] کا حوالہ دیا ہے۔ یہاں اس موضوع پر حافظ محمود شیرانی (۱۸۸۰ء۔ ۱۹۴۶ء) کے ایک قدرے غیر معروف انگریزی مضمون، بعنوان *Early Christian Legends and Fables Concerning Islam*

کا ذکر بے جا نہ ہوگا جو ۱۹۱۱ء میں انگلستان سے شائع ہوا۔ اس مضمون میں شیرانی نے بالتفصیل رقم کیا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے ادب اور مذہبی تصانیف میں اسلام، مسلمانوں اور (حضرت) محمدؐ کے بارے میں کیسی کیسی افسانہ طرازی کی جاتی رہی ہے۔ یہ حکایات نہ صرف دروغ گوئی کی بدترین مثال ہیں بلکہ اپنے تخلیق کاروں کی ذہنی سطح اور اخلاقی حالت کا پتہ بھی دیتی ہیں۔ حال ہی میں یورپی اخبارات میں شائع ہونے والے کارٹونوں اور اس امر کو جائز سمجھنے والے یورپی ذہن کو سمجھنے کے لیے ان مآخذ کا مطالعہ ضروری ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے اپنے مضمون میں عیسائی ادب سے متعدد مثالیں پیش کی ہیں جو پیغمبرِ اسلامؐ کی کردارکشی کی مرتکب ہوئیں۔[15]

۲.۳۔ صلیبی جنگیں: محرکات و اثرات:

قرونِ وسطیٰ میں عیسائی اور مسلم دنیا کے درمیان اس مخاصمت کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب صلیبی جنگیں بھی تھیں جن میں عیسائی شہزادوں نے رومن کیتھولک چرچ کی بھرپور اعانت سے ترکوں اور عربوں سے ارضِ مقدس کا قبضہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ کئی صدیوں تک جاری رہنے والی ان جنگوں میں سیاسی اور مذہبی قوتوں کا حیرت انگیز گٹھ جوڑ سامنے آیا اور اس کے نتیجے میں یہودیوں کا قتلِ عام اور عیسائی شہر قسطنطنیہ کا سقوط عمل میں آیا۔ ہسپانوی شہنشاہ نے پوپ کی بھرپور استعانت سے غرناطہ فتح کیا اور ہسپانیہ کی مسلمان آبادی کے انخلا یا انھیں جبری عیسائی بنانے کا حکم دیا۔ ہسپانوی تخت کی یہی مسلم دشمنی بالواسطہ طور پر امریکہ کی دریافت کا سبب بھی بنی۔ کولمبس (۱۴۵۱ء۔۱۵۰۶ء) کی مہم کو ہسپانوی شاہی تائید اس لیے حاصل ہوئی تھی کیوں کہ وہ مشرقِ بعید سے مصالحہ جات کی تجارت کے راستوں پر مسلم اجارہ داری سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ تاہم جنوب مشرقی یورپ میں عثمانی ترکوں کی پیش رفت، ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کی فتح، بلقان ریاستوں پر قبضے اور وسطی یورپ کے لیے سترھویں صدی تک ایک خطرے کی صورت جاری رہی اور سترھویں صدی کے اوائل تک انگریز مصنفین عثمانیوں کو پورے یورپ کے لیے خطرہ قرار دیتے رہے۔[16]

[۴]

جدید دور میں اسلام اور مغرب میں کشمکش: اسباب و محرکات

۱.۴۔ نوآبادیاتی نظام کا ردِعمل:

اگرچہ صلیبی جنگوں کے اثرات دیرپا اور دوررس تھے لیکن جدید دور میں اسلام اور مغرب کی کشمکش کی بنیاد محض صلیبی جنگوں کی یادیں نہیں۔ ارنسٹ نے واضح طور پر نوآبادیاتی استعمار پسندی اور اس کے ردِعمل کو اس جدید تر کشمکش کی جڑ قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں امریکی قوم نوآبادیاتی نظام کی ستم رانیوں سے پوری طرح واقف نہیں۔ فرانسیسی اور برطانوی استعمار نے انیسویں صدی میں ٹیکنالوجی میں مہارت، نسل پرستانہ نظریات اور سازشی ذہنیت کے ہتھیاروں کی مدد سے ایشیا اور افریقہ میں ظلم و استحصال کا جو بازار گرم کیا اس کی صرف ایک مثال الجیریا کی جنگِ آزادی (۱۹۵۴ء۔۱۹۶۲ء) ہے جس کے دوران دس لاکھ الجیرین باشندے اور تیس ہزار فرانسیسی مارے گئے۔ خود امریکہ کا اسلام سے اولین تعارف نوآبادیاتی دور میں افریقہ سے آنے والے حبشی غلاموں کے ذریعے ہوا جن میں سے پندرہ فی صد مغربی افریقہ کے مسلمان تھے اور جو اپنے دورِ غلامی میں نہ صرف اپنی تہذیبی روایت کے پابند رہے بلکہ ان میں سے کچھ نے تو عربی تصانیف بھی چھوڑی ہیں۔ امریکہ کا مسلمانوں سے دوسرا رابطہ فلپائن پر اس کے نوآبادیاتی دورِ حکومت میں ہوا جب زیادہ تر فوجی مہمات فلپائنی مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کو کچلنے کے لیے بھیجی جاتی تھیں (۱۸۹۹ء۔۱۹۰۲ء)۔ حال میں بھی ایران اور عراق میں امریکہ کے استعمار پسندانہ عزائم بروئے کار آتے رہے ہیں۔ غرض یہ کہ اسلام اور

مغرب کی اس کشمکش کی کئی جہات نوآبادیاتی نظام کی تاریخ میں پیوست نظر آتی ہیں۔

۴۔۳۔ سائنس، ٹیکنالوجی اور نسلی و تہذیبی برتری کا دعویٰ

عثمانی ترکوں کے زوال کے بعد جب یورپی اقوام نے سائنسی برتری اور ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کرنے کے بعد ایشیا اور افریقہ کی طرف رُخ کیا تو یورپی روشن خیالی مذہب کو قدیم اور فرسودہ قرار دے کر رد کر چکی تھی۔ لہٰذا صلیبی جنگوں کی طرح مذہب کو اپنے استعماری نظام کا جواز قرار دینا ممکن نہ رہا تھا۔ اس نئی صورت حال میں سائنس اور عقلیت پرستی کو فوجی مہمات کا جواز بنا کر پیش کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے نسلی برتری کی سائنسی توجیہات پیش کی گئیں۔ آگسٹس کامٹ (۱۷۹۸ء۔۱۸۵۷ء) جیسے مفکرین نے یہ دعویٰ کیا کہ دنیا کی پانچ ترقی یافتہ ترین قومیں، یعنی انگریز، فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی اور جرمن، انسانیت کا ہراول دستہ ہیں اور نسلی اعتبار سے دیگر اقوامِ و ملل پر فائق ہیں۔ چارلس ڈارون (۱۸۰۹ء۔۱۸۸۲ء) کے نظریۂ ارتقا کو استعمال کرتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا کہ سفید فام نسلیں دیگر نسلوں کی نسبت زیادہ ارتقا یافتہ اور اسی لیے ان پر حکمرانی کی سزاوار ہیں۔ برطانیہ میں اسے "سفید فاموں کا بوجھ" (White Man's Burden)[17] اور فرانس میں "تہذیب کا عمل" (Civilizing Mission) قرار دیا گیا۔ کارل مارکس (۱۸۱۸ء۔۱۸۸۳ء) اور فریڈرک اینگلز (۱۸۲۰ء۔۱۸۹۵ء) نے Oriental Mode of Production[18] کے نام سے جو نظریہ پیش کیا اس کے تحت یہ بات مسلّمہ حقیقت سمجھی جانے لگی کہ مشرق کے باشندوں کی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ ان پر آمرانہ طرزِ حکومت مسلط رہے۔[19]

نسلی برتری کے اس تصور کی شدت اور ہمہ گیری کا اندازہ معروف فرانسیسی مفکر، ارنسٹ رینان (۱۸۲۳ء۔۱۸۹۲ء) کے پیرس میں دیے جانے والے ایک لیکچر (۱۸۸۳ء) سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے یہ استدلال پیش کیا کہ اسلام سائنس اور ٹیکنالوجی کے حصول کے لیے موزوں نہیں کیوں کہ اسلام ایک عربی مذہب ہے اور عرب، سامی النسل ہونے کے باعث اس وقتِ نظری اور باریک بینی ذہن سے محروم ہیں جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے لازمی ہے۔ ان دنوں معروف مسلم مصلح جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ء۔۱۸۹۷ء) بھی عارضی طور پر پیرس میں مقیم تھے۔ انھوں نے رینان کے اس دعوے کو چیلنج کر دیا اور یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ تمام مذاہب بنیادی طور پر آمرانہ اور غیر سائنسی ہوتے ہیں، یہ دلیل پیش کی کہ چوں کہ اسلام عیسائیت کی نسبت ایک نوعمر مذہب ہے اس لیے اس کے تحت سائنس اور عقلی روح کے کارفرما ہونے میں کچھ اور وقت لگے گا۔ اس تردید کے بعد رینان نے فراخ دلی سے اعتراف کیا کہ افغانی اعلیٰ درجہ کے فلسفیانہ تفکر کا مالک ہے لیکن اس کی وجہ یہ بتائی کہ افغانی کا تعلق سامی النسل عربوں سے نہیں بلکہ آریائی نسل سے ہے۔[20] نسلی برتری کا یہ نظریہ انیسویں صدی میں عام ہی نہیں بلکہ فیشن بھی سمجھا جاتا تھا۔

عیسائی مشنری سرگرمیاں بھی نوآبادیاتی دور میں بھرپور طریقے سے کارفرما رہیں۔ مذہبی مناظرے اور منظم تبلیغی جماعتوں نے متعدد علاقوں پر گہرے اثرات مرتب کیے اور مسلمانوں کے مذہبی مناظروں میں استعمال ہونے والی زبان، اسلوب، تکنیک اور طرزِ استدلال پر بھی ان مشنریوں کا واضح اثر نظر آتا ہے۔ تاہم نوآبادیاتی انتظامیہ کے اراکین، مذہبی اثرات سے بھی زیادہ جس محرک کے زیرِ اثر نظر آتے ہیں وہ یورپ کی تہذیبی اور سائنسی برتری اور عظمت کا یقین ہے۔ مثلاً لارڈ میکالے (۱۸۰۰ء۔۱۸۵۹ء) کی رپورٹ Minute on Indian Education میں انگریزی کو برطانوی ہندکی سرکاری اور تعلیمی زبان قرار دینے کے حق میں جو دلائل پیش کیے گئے وہ نوآبادیاتی طاقتوں کی ذہنیت کی خوب عکاسی کرتے ہیں۔[21] اسی طرح سر ولیم میور (Sir William Muir) (۱۸۱۹ء۔۱۹۰۵ء) کی کتاب Life of

Mahomet[۲۲] میں نہ صرف پیغمبر اسلام کو شیطانی اثرات کا حامل ظاہر کیا گیا ہے بلکہ جرمن طبیب سپرنگر (۱۸۱۳ء-۱۸۹۳ء) کی پیروی میں آپؐ کے الہامی تجربات کو سائنسی حوالوں سے مرگی کا مرض ثابت کیا گیا ہے۔

۳.۳۔ مستشرقین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیاں:

اسی زمانے میں، جب یورپی نوآبادیاتی نظام اپنے عروج پر تھا، یورپی جامعات میں ایشیا اور افریقہ کے بارے میں علمی و تحقیقی مطالعات کا رواج ہوا جسے بعد ازاں اورینٹل ازم کی تحریک قرار دیا گیا اور بیسویں صدی کے مابعد نوآبادیاتی دور میں ایڈورڈ سعید (۱۹۳۵ء-۲۰۰۳ء) جیسے مفکرین نے اس علمی تحریک کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس تنقید کے نتیجے میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی مستشرقین نوآبادیاتی استعمار کے آلۂ کار کے طور پر ان علمی مشاغل میں منہمک تھے؟ نیز انھوں نے مشرق، خصوصاً مسلم ممالک کے بارے میں جو اثرات پیش کیے کیا ان کا اصل مقصد محض ان ممالک پر قبضے کا جواز پیش کرنا تھا؟ ارنسٹ کا خیال ہے کہ ایسا سمجھنا مبالغے اور مغالطے پر مبنی ہوگا۔ اس بارے میں عہد حاضر کے دیگر محققین بھی ان کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔[۲۳] ارنسٹ سمجھتے ہیں کہ اکثر مستشرقین علمی لگاؤ کے باعث ان مطالعات میں مصروف ہوئے اور انھیں اندازہ تک نہیں تھا کہ ان کے پیش کردہ نظریات و خیالات اس قسم کے سیاسی نتائج کی بنیاد ثابت ہوں گے۔

البتہ یہ ضرور ہوا کہ مستشرقین کے اس مطالعے کے نتیجے میں مشرق، بالخصوص اسلام کے بارے میں چند بندھے ٹکے نظریات رواج پا گئے جو آج تک مطالعات مشرق میں رہنما اصول کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک نظریہ مشرق کی مابعد الطبیعیاتی فضا کے بارے میں ہے جس کے تحت یہ فرض کیا گیا کہ مشرقی ممالک کی تہذیب و ثقافت اور زندگی کا ہر پہلو مذہب سے گہرے طور پر منسلک ہے اور اس کی تمام جہات کو محیط ہے۔ "پراسرار مشرق" کا یہ نقطۂ نظر یورپی رومانویت کی پیداوار تھا اور اس نے مشرق کے حقیقت پسندانہ مطالعے کی راہ میں رکاوٹ پیدا کیے رکھی۔ مستشرقین کی ایک اور مشترک خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے نسلی برتری کے تصور کو قبول کیے رکھا اور اسی کے زیر اثر مشرقی اور ایشیائی تاریخ کو سامی اور آریائی نسل کے درمیان تصادم کی صورت میں دیکھا اور سمجھا۔ تیسری بڑی غلط فہمی مستشرقین کو یہ تھی کہ مذہب اور تہذیب و ثقافت کا زبان سے گہرا اور بنیادی تعلق ہے اور محض اس کی زبان کا علم حاصل کر کے کسی قوم کے مذہب اور تہذیب سے مکمل شناسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

چناں چہ مسلمانوں کے تاریخی ارتقا، عصری حقائق، بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار اور تہذیبی و ثقافتی تنوع کو نظر انداز کر کے، چند عربی متون اور ایک لغت کی مدد سے اسلام کو سمجھنے اور بیان کرنے کا عمل عروج پر پہنچ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ نوآبادیاتی نظام کے خلاف اٹھنے والی ہر بغاوت کو اسلامی شدت پسندی پر محمول کیا گیا اور اس سامنے دھری حقیقت کو سرے سے نظر انداز کر دیا گیا کہ یہ سیاسی غلامی کے خلاف فطری انسانی ردعمل تھا۔

۴.۳۔ عرب اسرائیل تنازعہ:

زمانہ حال میں صیہونیت کی تحریک اور عرب اسرائیل تصادم نے مسلمانوں کے بارے میں دہشت گردی اور شدت پسندی کے اس روایتی تاثر کو گہرا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ کس قدر متعجب خیز بات ہے کہ صیہونی تحریک جو ابتدا میں ایک سوشلسٹ اور سیکولر تحریک تھی، بعد ازاں یہودیت کا مذہبی تشخص حاصل کر گئی۔ صیہونیت کا بانی موسز ہس (Moses Hess) (وفات: ۱۸۷۵ء) کارل مارکس کا معتمد رفیق کار تھا۔ اس تحریک نے ابتدا میں ارض موعود کی طرف نقل مکانی کو اپنا مقصد قرار دیا۔ بعد ازاں، پہلی جنگ عظیم کے بعد، جب برطانیہ نے عثمانی سلطنت کے کچھ حصوں پر قبضہ کر لیا تو یورپ اور روس سے بڑے پیمانے پر یہودیوں کی نقل مکانی کا عمل شروع ہوا۔ برطانوی قبضے کے دوران، یہودیوں کی فلسطین میں آبادکاری کی مثال فرانس کے الجیریا پر تسلط کے مماثل ہے۔ ہولوکاسٹ کے نتیجے میں، دوسری جنگ عظیم کے بعد صیہونیت

کی تحریک نے زور پکڑا اور ۱۹۴۸ء میں اسرائیلی حکومت کا قیام عمل میں آیا جو آج تک عرب اسرائیل تنازعے کی بنیاد ہے۔ امریکہ کی جانب سے اسرائیل کی سرپرستی اور پشت پناہی کی جاتی رہی ہے اور امریکیوں کی اکثریت اس معاملے میں، فلسطینی عربوں کی اکثریت کو نظر انداز کر کے یہودیوں کی فلسطین پر حکومت کو حق بجانب سمجھتی ہے۔ دوسری طرف تحریک آزادیِ فلسطین (PLO) جو فلسطین پر حقِ حکمرانی حاصل کرنے کے مقصد کے تحت جدوجہد کرنے والی ایک سیکولر تنظیم تھی، مغرب کی نظر میں اسلامی شدت پسندی کی ترجمان سمجھی جاتی رہی ہے اور فلسطینیوں کے جانب سے ہونے والے حملوں کو مسلم دہشت گردی قرار دیا جاتا رہا۔ یہ خیال اس حد تک جڑ پکڑ چکا ہے کہ عرب، مسلم اور دہشت گرد تینوں الفاظ ہم معنی سمجھے جاتے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ تمام مسلمانوں کو بلاتفریق دہشت گرد خیال کرنے میں کوئی عقلی دلیل مانع نہیں آتی۔

۵.۳۔ مسلمان عورت کا پردہ اور اس کی معاشرتی حیثیت:

مسلمانوں کے بارے ایسے بندھے ٹکے تصورات میں ایک اور کلیشے، مسلمان عورت کا پردہ بھی ہے جسے تاریخی اعتبار سے پیغمبر اسلام کی ایک سے زیادہ شادیوں کے مسئلے کے ساتھ جوڑ کر اسلام میں عورت کے نام نہاد استحصال اور اس کے حقوق کی پامالی کی ایک طویل داستان تراشی جا چکی ہے۔ اٹھارھویں صدی میں عربی ادب کے ایک شاہکار ''الف لیلہ و لیلہ'' کا فرانسیسی ترجمہ[۴۴] عربوں (یعنی مسلمانوں) کی جنسی دلچسپیوں کے بارے میں یورپ کی توجہ کا مرکز رہا اور انیسویں صدی میں مسلمانوں کے ''حرم'' کی ہیجان انگیز کہانیوں کو فرانسیسی مصوروں نے برہنہ یورپی طوائفوں کی مدد سے تصویر کیا۔ مسلمان عورتوں کے روایتی لباس اور معاشرے میں مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط کے مواقع نہ ہونے کے باعث مغربی سیاحوں کی قوتِ متخیلہ نے بھی خوب کرشمے دکھائے اور جدید یورپی اور امریکی عوام و خواص اس مفروضے پر مکمل یقین رکھتے ہیں کہ مسلمان عورت اپنے انسانی حقوق سے بالکل محروم ہے۔ یہ فرض کرتے ہوئے وہ مسلمان اور عیسائی عورتوں کی حالت زار کو تاریخی تناظر میں دیکھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔ مغرب میں عورت کو جتنی بھی آزادی حاصل ہوئی ہے تاریخی اعتبار سے وہ بالکل کل کی بات ہے۔ ۱۸۷۰ء تک انگریز عورتوں کو جائداد کی ملکیت کا حق حاصل نہ تھا جب کہ مسلمان عورت کو شریعت اسلامیہ کی رو سے یہ حق ساتویں صدی سے حاصل رہا ہے۔ ۱۷۱۶ء میں جب لیڈی میری وارٹلی مانٹیگ[۴۵] نے برطانوی سفیر کی بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کے ساتھ قسطنطنیہ کا سفر کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ عثمانی امرا کی بیگمات بڑی بڑی جاگیروں کی مالک تھیں اور اپنی جائداد کی دیکھ بھال تنہا، کسی مرد کی معاونت کے بغیر کر سکتی تھیں۔ انھیں تو یہ بھی محسوس ہوا کہ مسلمان عورتوں کے نقاب نے عورتوں کو مردوں کی چبھنے والی نگاہوں سے محفوظ کر کے ایک نوع کی آزادی کا احساس دے رکھا ہے۔

اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مذہب کی آڑ لے کر عورت کے حقوق کی پامالی کا سلسلہ شمالی افریقہ، مشرق قریب اور ایشیا کے کئی مسلمان معاشروں میں عام رہا ہے لیکن کیا یہ بات پورے یقین اور اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ یورپ اور امریکہ میں اس رویے پر پوری طرح قابو پا لیا گیا ہے؟ یہ انتہائی منافقانہ عمل ہے کہ مسلمان معاشروں کو اس عدم مساوات پر مطعون کیا جائے جس پر ابھی تک یورپ اور امریکہ خود پوری طرح قابو نہیں پا سکے۔

[۵]

مغرب میں غیر جانب دارانہ مطالعۂ اسلام: مستقبل کی ناگزیر ضرورت

ارنسٹ نے اسلام اور مغرب کے درمیان کشمکش کی پوری تاریخ بیان کرنے کے بعد چند بہت معنی خیز سوال اٹھائے ہیں۔ انھوں نے اس ضمن

حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ عہدِ حاضر میں مسلمانوں کے متعلق صرف اور صرف منفی تاثرات کو ذرائع ابلاغ کے ذریعے مسلسل نشر کیا جا رہا ہے۔ پروپیگنڈے کی طاقت کا یہ عالم ہے کہ پوری کی پوری مسلم تہذیب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے پر کوئی بھی معترض نہیں ہوتا۔ حالاں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی ایسی تہذیب جو ایک ہزار برس سے زیادہ کی مدت تک، دنیا کے تقریباً نصف حصے میں پھلتی پھولتی رہی ہو، پوری کی پوری منفی عوامل پر مبنی ہو؟ اور دوسری طرف اس کے مدِ مقابل تہذیب ان تمام برائیوں اور الزامات سے ہمیشہ پاک رہی ہو جو مسلمانوں کے سر ڈالے جا رہے ہیں؟ مثلاً تمام مسلمانوں پر بلکہ مذہب اسلام پر تشدد پسندی کا الزام لگایا جاتا ہے تو کیا انیسویں صدی کی مغربی استعمار پسندی اور ناجائز تسلط کو عیسائیت کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا ہے؟ اسی طرح حالیہ تاریخ میں ۱۹۹۶ء میں راسخ العقیدہ عیسائی سربوں کے ہاتھوں ایک دن میں چھ ہزار مسلمان مردوں اور بچوں کا قتل کیا پوری عیسائی دنیا کا عمل قرار دیا جانا چاہیے؟ مسلمان معاشروں پر عورتوں کو مناسب مقام نہ دینے کا الزام ہے لیکن مغربی ٹیکنالوجی کے شاہکار انٹرنیٹ پر موجود پورنوگرافی کی لاکھوں ویب سائٹس، اور مغرب میں ٹیلی ویژن، اخبارات اور اشتہارات کے ذریعے عورت کو ایک جنسی کھلونے کی حیثیت سے پیش کرنا کیا عورت کے احترام پر مبنی عمل ہے؟

ارنسٹ کی تجویز ہے کہ آج ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ خود کو ذرائع ابلاغ کے ایک بالغ نظر نقاد کی حیثیت سے تربیت دے کیوں کہ معلومات کی ترسیل کی بجائے تجارتی اور دیگر مقاصد کے لیے اسے مسخ کرنا ذرائع ابلاغ کا پسندیدہ مشغلہ بن چکا ہے۔ خاص طور پر اسلام کے معاملے میں منفی تاثر ابھار کرنا ایک آسان اور مقبول حربے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔[۲۶] یورپ اور امریکہ کے عوام اپنی رائے کی بنیاد زیادہ تر ذرائع ابلاغ کے وسائل پر ہی رکھتے ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کے بارے میں مسلسل ایک منفی تاثر قبول کیے جاتے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس سے آگے بڑھ کر مسلمانوں کو انسان سمجھنے کا عمل شروع کیا جائے اور تاریخی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی تناظر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے کردار و اعمال کا تجزیہ کر کے انھیں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

اس مقصد کے لیے ارنسٹ نے اپنے مطالعۂ اسلام کی بنیاد اس مفروضے پر قائم کی ہے کہ تمام مسلمان یکساں نہیں۔ وہ دنیا کے مختلف خطوں میں آباد ہیں اور اپنے اپنے معاشی، معاشرتی اور جغرافیائی حقائق کے مطابق اپنے تہذیبی طرزِ عمل کو ترتیب دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ایسا سوچنا مسلمانوں کو انسانیت کے دائرے سے خارج کرنے کے مترادف ہے کیوں کہ انسان انفرادی اور قومی سطح پر تنوع کا وصف رکھتے ہیں۔ پھر ان کے طرزِ عمل کو ان کے تاریخی تناظر میں سمجھنے کی بجائے محض ایک ہی گھسے پٹے رجحان کے تابع سمجھنا بھی بہت بڑی غلطی ہے اور اس سے بھی بڑی غلطی یہ ہے کہ اگر مسلمان تشدد پسند ہیں تو اس عمل کا جواب بھی تشدد ہی کے ذریعے دیا جانا چاہیے۔

اگرچہ اس معاملے میں ارنسٹ کا مشاہدہ مسلمان تہذیب کی روح تک نہیں پہنچتا۔ دراصل مسلم تہذیب مسلمان معاشروں کی باطنی روح کے مترادف ہے جب کہ اسلامی دنیا کا جغرافیائی اور ثقافتی تنوع تہذیب کی ظاہری سطح پر نمودار ہوتا ہے۔ اس کی مثال کسی جدید سکائی سکریپر کی سی ہے جس کی بنیاد مشترک ستونوں پر قائم ہوتی ہے لیکن عمارت کی ظاہری شکل و صورت میں تنوع پایا جاتا ہے۔ ایک ہی عمارت میں دفتر بھی قائم ہیں، رہائشی مکان بھی اور بازار اور دکانیں بھی۔ بہ ظاہر ایک دوسرے سے جدا مگر درحقیقت ایک ہی کل کا جزو ہے۔ اسلامی تہذیب بھی کچھ مشترک بنیادی عقائد اور مسلمات کی بنا پر تعمیر ہوتی ہے مگر دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے مسلمان اپنے اپنے جغرافیائی حقائق، موسم، آب و ہوا اور تاریخی تناظر کے مطابق جزوی تفصیلات مرتب کر لیتے ہیں اور یوں ایک روح کا اظہار مختلف پیکروں کے ذریعے ہوتا ہے۔ تاہم ارنسٹ کا یہ تجزیہ بالکل درست ہے کہ دنیا بھر کی ثقافتیں ایک دوسرے پر مسلسل اثر انداز ہو رہی ہیں اور یہ بھی کہ مسلمان حکمرانوں کی سیاسی نااہلی

کے باعث کم و بیش تمام مسلمانوں کی تقدیر مغربی ممالک کے ہاتھ میں ہے۔ معاشی، سیاسی اور تاریخی اختلافات اپنی اپنی جگہ لیکن مغربی خطوں کی پالیسیوں پر یقیناً اثر انداز ہوتے ہیں اور انھیں نظر انداز کر دینا خلافِ فطرت ہوگا۔

ایک اور اہم سوال یہ ہے کہ اگر اہلِ مغرب کے لیے مسلمانوں کو سمجھنا ضروری ہے تو کیا مسلمانوں پر یہ لازم نہیں کہ وہ بھی دیگر تہذیبوں اور معاشروں کو سمجھیں اور انھیں یکسر رد کر دینے کی پالیسی پر عمل پیرا نہ ہوں۔ ارنسٹ نے اس سوال کے جواب میں یاد دلایا ہے کہ نوآبادیاتی دور میں جب کم و بیش نوے فی صد مسلمان آبادی مغربی استعمار کے زیرِ اثر آ گئی تھی، مغرب کی عیسائی طاقتوں نے جبراً اپنی زبانیں، نظامِ تعلیم اور تہذیب ان پر نافذ کر دی تھی اور انھی میں سے ایک ایسا طبقہ تیار کر دیا تھا جو نہ صرف ان کی پالیسیوں پر عمل درآمد کے لیے آلۂ کار بنا بل کہ ان کی تہذیبی و معاشرتی روح کو بھی اچھی طرح سمجھ گیا۔ اصل مسئلہ امریکہ اور یورپ میں رہنے والے اہلِ مغرب کا ہے جن کی خود پسندی انھیں آئینہ دیکھنے کی فرصت تک نہیں دیتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی نظریات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اسلامی اصطلاحات اور نظریات کے تاریخی ارتقا کو پیشِ نظر رکھا جائے اور جدید اسلامی معاشروں کا مطالعہ کھلے ذہن اور لحظہ بہ لحظہ بدلتی ہوئی اقدار کے تناظر میں کیا جائے۔

حواشی

۱۔ ارنسٹ، کارل ڈبلیو، ۲۰۰۵ء (۲۰۰۳ء) *Following Muhammad: Rethinking Islam in the Contemporary World*، دہلی: یودا پریس، ص xiii-xv

۲۔ سوانح اور تصانیف کی تفصیل کے لیے: http://www.unc.edu/~cernst/

۳۔ پروفیسر اسلامی تاریخ و ادبیات، یونیورسٹی آف شکاگو اور درج ذیل کتابوں کے مصنف: *Early Islamic Mysticism*، نیو یارک ۱۹۹۶ء، *Approaching the Qur'an: the Early Revelations*، ایش لینڈ ۲۰۰۷ء (۱۹۹۹ء) اور *The New Crusades*، نیو یارک ۲۰۰۳ء

۴۔ ارنسٹ، ص xix

۵۔ ایضاً، ص xvii

۶۔ عزیز الاسلام، ڈاکٹر، ۲۰۰۵ء، *Islam, 9/11 and Global Terrorism: A Study of Perceptions and Solutions*، نئی دہلی، وائیو ایکس، ص ۴۳

۷۔ لیوس، برنارڈ، ۱۹۹۳ء، *Islam and the West*، نیو یارک، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ص ۳

۸۔ ارنسٹ، ص ۶

۹۔ ایضاً، ص ۸

۱۰۔ یورپ کا اسلام کے خلاف تعصب نوآبادیاتی تسلط سے بہت پہلے قرونِ وسطیٰ کی یادگار ہے جس کا سرا صلیبی جنگوں، بل کہ اس سے بھی پہلے تک جاتا ہے اور خود ارنسٹ نے آگے چل کر ان کا مفصل ذکر کیا ہے تاہم ان واقعات کو بھی محض مذہبی تصادم کی بجائے سیاسی مفادات کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

۱۱۔ لیوس، ص viii

۱۲۔ نوآبادیاتی دور میں مسلم علما، خصوصاً ہندوستانی مسلم علما نے اس کے برخلاف عیسائیت اور اسلام کے درمیان چپقلش پر بہت زور دیا تھا تاہم اس کے محرکات بھی مذہبی نہیں تھے۔

۱۳۔ مثلاً بارھویں سے چودھویں صدی تک انتہائی مقبول رہنے والی قدیم ترین فرانسیسی رزمیہ (epic) نظم *La Chanson de Roland* جس میں معروف دیومالائی شخصیت شارلیمین کی ہسپانوی مسلمانوں سے جنگ کا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ نظم چار ہزار سے زیادہ مصرعوں پر مبنی ہے اور اس کا قدیم ترین نسخہ آکسفورڈ میں ہے۔

۱۴۔ پہلی مرتبہ ۱۶۹۷ء میں لندن سے شائع ہوئی۔

۱۵۔ شیرانی، حافظ محمود ۱۹۱۱ء *Early Christian Legends and Fables Concerning Islam*، لندن: لوزاک اینڈ کمپنی۔

۱۶۔ مصنف نے یہ بات رچرڈ نولز (Richard Knolles) کی کتاب، *The General Histories of the Turks, from the first beginning of that nation to the rising of the Othoman familie; with all the notable expeditions of the Christian princes against them.* لندن: اے سلپ ۱۶۳۸ء کے حوالے سے بیان کی ہے

۱۷۔ رڈیارڈ کپلنگ *Rudyard Kipling* کی معروف نظم، جو ۱۸۹۹ء میں فلپائن پر امریکی حملے کے آغاز میں، ایک رسالے *McClures'* میں شائع ہوئی اور جس کی توجیہ یہ کی گئی کہ سفید فام نسلوں پر باقی کی دنیا کو تہذیب سکھانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور یوں یورپی استعمار پسندی کو اخلاقی جواز دینے کی کوشش کی گئی۔

۱۸۔ کارل مارکس نے کہا تھا: *"Asia fell asleep in history"* ایشیا اس وقت تک بیدار نہیں ہو سکتا جب تک کوئی بیرونی طاقت (مثلاً مغربی اقوام) اس کی اصلاح احوال کی ذمہ داری نہیں اٹھاتی۔

۱۹۔ ارنسٹ، ص ۳۰

۲۰۔ ایضاً، ص ۳۰تا ۳۱

۲۱۔ میکالے کی رپورٹ کے یہ الفاظ جو ارنسٹ نے بھی نقل کیے ہیں، قابل غور ہیں:

I have no knowledge of either Sanscrit or Arabic- but I have done what I could do to form a correct estimate of their value. I have read translations of the most celebrated Arabic and Sanscrit works. I have conversed both here and at home with men distinguished by their proficiency in the Eastern tongues. I am quite ready to take the Oriental learning at the valuation of the Orientalists themselves. I have never found one among them who could deny that a single shelf of a good European library was worth the whole native literature of India and Arabia. The intrinsic superiority of the

Western literature is indeed, fully admitted by those memebers of the Committee who support the Oriental plan of education.

ارنسٹ، ص ۲۲

۲۲۔ ولیم میور، ۱۸۵۸ء، *The Life of Mahomet and History of Islam to the era of the Hegira*، چار جلدیں لندن: اسمتھ ایلڈر اینڈ کمپنی۔

۲۳۔ لیوس، ص ۹

۲۴۔ اس ترجمے کے فرانسیسی مترجم ژاں انطوان گالاں (Jean Antoine Galland) تھے اور یہ ۱۷۰۴ء سے ۱۷۱۷ء کے درمیان شائع ہوا۔

۲۵۔ لیڈی میری ورٹلی مانٹیگ (Lady Mary Wortly Montague، ۱۶۸۹ء۔۱۷۶۲ء) برطانوی طبقۂ اشرافیہ کی نمائندہ خاتون ادیب، جن کی پہچان ان کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے ترکی میں اپنے قیام کے دوران لکھے۔ ان خطوط کی بنا پر انھیں پہلی مغربی خاتون ادیب کہا جاتا ہے جنھوں نے مسلم شرق کے بارے میں سیکولر انداز میں تبصرہ کیا۔

۲۶۔ یہ مباحث اس سے پہلے ایڈورڈ سعید اپنی کتاب *Covering Islam* (۱۹۸۱ء) میں تفصیل سے پیش کر چکے ہیں۔

Abstract

Islam and West are not two similar terms and a comparison between the two does not seem reasonable. However, in the past history, the medieval term of Christendom was replaced by the term "West" after the secularization of Europe which gradually included America as well; while Islam has been considered a synonym of Muslim world and most of all Arabs. The image of "Islam" in West has been negative right from the medieval ages till today. The colonization of almost 90% of the Muslim countries in the nineteenth century played a significant role in creating awareness among Muslims of the oppression of their political and human rights and thus causing a widening gulf between the two. Carl W. Ernst in his book Following Muhammad: Rethinking Islam in the Contemporary World has discussed in detail the conflict between Islam and west in the

historical as well as contemporary context. He has suggested rethinking Islam in the cotemporary world after forgetting the pre-conceived notions and images given by the authors of the Crusades period or the Orientalists of the period of colonization. The article gives a review of a part of the book.

معیار: علمی و تحقیقی مجلہ، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، جلد ۲، شمارہ ۴، جولائی۔دسمبر ۲۰۱۰ء

استدراکات

"معیار"، جلد:۱، شمارہ:۲

''اردو اسلوبیات کی تشکیلِ نو'' از سہیل عباس بلوچ، ص ۲۷۵۔۲۸۵

سہیل بلوچ کا آرٹیکل بنیادی طور پر شعر میں نئے آہنگ کی گنجائش اور پرانے متن میں پوشیدہ آہنگ کی دریافت کی نشان دہی پر مشتمل اہم اشارے فراہم کرتا ہے۔ اُن کے مطابق پرانے متون کی نئی قرات کا محور مشرقی اور مغربی محسناتِ شعری کا ادغام بھی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں: ''اس گفتگو سے میرا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ مشرقی محسناتِ فن کے نام سے ہی ناک بھوں چڑھاتے ہیں شاید انھیں معلوم نہیں کہ بیشتر مغربی محسناتِ فن میں مشرقی محسناتِ فن کی روح پوشیدہ ہے۔'' اپنے آرٹیکل میں انھوں نے اس قضیے کا کوئی حل پیش نہیں کیا۔ مثلاً مغربی اور مشرقی محسناتِ فن کی حدود کیا ہیں۔ اگر مغربی محسنات میں مشرقی محسنات کے بہت سے عناصر موجود ہیں تو مشرقی محسنات سے فن پارے کا جمالیاتی و تجزیاتی مطالعہ ادھورا کیوں ہے؟

مشرقی اور مغربی محسناتِ شعری کے مباحث کو تقابلی طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے مگر دیکھنا یہ چاہیے کہ ہم دونوں کی صفات سے ایک فن پارے کی جمالیاتی تفہیم میں کہاں تک مدد لے سکتے ہیں۔ روسی فارملزم اور انور حسین آرزو کا زمانہ تو ایک تھا مگر دونوں کے کام میں بہت فرق تھا۔ روسی ہیئت پسندوں سے کچھ عرصہ پہلے سوسیئر بھی اپنے شہرۂ آفاق لیکچرز پیش کر چکا تھا بلکہ روسی ہیئت پسندوں کے دور میں یہ لیکچرز اس کے طالب علموں کی تدوین سے کتابی صورت میں بھی دستیاب ہو چکے تھے۔ یہ اور بات کہ یہ فرانسیسی زبان میں ہونے کی وجہ سے اہلِ یورپ کے مطالعہ میں بہت دیر بعد آئے لہٰذا ہم زمانہ ہونا ہی کافی نہیں۔ یورپ میں تو پے در پے لسانی تحریکات کا ظہور ہو رہا تھا۔ ''علم مقدار الحروف''، روسی ہیئت پسندوں یا سوسیئر کا مسئلہ نہیں تھا وہ فن پارے کی تشکیل Construction کو گزی اور پیمانوں سے ماپ رہے تھے۔

مجھے خوشی ہوئی کہ سہیل صاحب نے شعر کے وزن کو میوزک کے متبادل کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ انھوں نے شعر کو Total Music Effect کے طور پر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ بہت خوش آئند تبدیلی ہے کہ شعری پرانی تشریحات سے نکل کر نئے مباحث کو چھیڑا جا رہا ہے۔ شعر کے اندر میوزک کی کارفرمائی اصل میں اُس کا Effect ہی ہوتا ہے۔ آنند وردھن کے نظریہ صوت کو پیش کرتے ہوئے انھوں نے بہت خوبصورت بات لکھی ہے:

''شاعری دال اور مدلول دونوں کا قطعۂ اتصال ہے۔''

مگر آگے جا کے انھوں نے Signifiers اور Signifieds کے اس اتصال کی جو تشریح ''آہنگ'' میں تلاش کی ہے وہ کسی طرح بھی مکمل نہیں۔ اسی تعریف کی روشنی میں انھوں نے ''ردیف'' پر زور دیتے ہوئے ''باغ و بہار'' کا تجزیہ بھی پیش کیا۔

''آہنگ کا پتہ لگانے کے لیے اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ کلام کس طرح ادا کیا جائے اور وہ کون سی ادائیگی ہے جس کے ذریعے کلام کی روانی پوری طرح جلوہ گر ہو سکتی ہے اور واضح ہو سکتی ہے۔ روانی کی تین شرائط ہیں۔ ۱) کلام کا ہر جزو یعنی ہر لفظ ایک دوسرے سے اس طرح ہم آہنگ ہو کہ کوئی لفظ صوتی اعتبار سے اجنبی نہ محسوس ہو، بلکہ ہر لفظ کا آہنگ دوسرے لفظ کے آہنگ کی پشت پناہی کرے ۲) کلام پر بحر حاوی نہ ہو، بلکہ بحر پر کلام حاوی ہو۔۔۔۔ روانی کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ وہ بحر کے مشینی آہنگ کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتی ہے یعنی شاعر جس قدر روانی پر قادر ہوگا، اسی قدر وہ بحر کے مشینی آہنگ کا تابع ہوگا ۳) کلام میں اصوات نہ زیادہ معلوم ہوں نہ کم معلوم ہوں۔۔۔۔''

کیا ان تینوں نقاط کی روشنی میں شعر میں آہنگ پیدا کیا جا سکتا ہے؟ جیسے بحر کے استعمال سے شعر میں کلی طور پر روانی نہیں آ جاتی بالکل اسی طرح یہ نقاط بھی شعر میں روانی یا آہنگ کی تشکیل میں معاون تو ہو سکتے ہیں کلی طور پر انھی کی مرہون ''آہنگ'' تعمیر نہیں ہو پاتا۔ اصل میں مسئلہ شعر کے Texture میں نہیں بلکہ اس شعری ''فضا'' کی دریافت میں ہے جو کسی تخلیقی سرگرمی کے ماقبل اور بعد ازاں تخلیقی مراحل میں بافت سازی کرتے ہوئے ایک فن پارے کی فن کارانہ تشکیل کا باعث بنتا ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جو دال اور مدلول کا نقطۂ اتصال ہے۔ ہمیں چاہیے کہ شعر کی اس تخلیقی فضا کا کھوج لگانے کا اہتمام کریں۔ ظاہری بات ہے یہاں مشرقی محسنات شعری ناکافی تصور ہوں گے جہاں بحر کے بغیر شعر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ شعری تخلیقی ''فضا بندی'' اپنے اندر وہ تمام صفات سمیٹے ہوتی ہیں جن کو مشرقی محسنات فن میں ایک کے بعد ایک لازمی عنصر کے طور پر شعر پر لاگو کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میر نے جب ''بھوڑا'' جیسے قبیح امیج والے لفظ کو (دال اور مدلول دونوں سطحوں پر) خوبصورت انداز سے استعمال کیا تو یہ کمال بحر کا نہیں، نہ ہی شعر کے موضوع کی مناسبت میں جگہ پانے کا عمل تھا بلکہ اس تخلیقی فضا کا مرہون تھا جس نے بھوڑے کو الم ناک کیفیت کا حسین مرقع بنا دیا۔ لسانی تھیوری نے اس عمل کو ''شعریات'' کا نام دیا ہے۔ لسانی تھیوری میں ہم کسی فن پارے کی تشکیلاتی بافتوں کو دھاگا دھاگا کر کے اس کے اس عمل پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں جہاں یہ فضا اپنی نقش بندی میں مصروف عمل ہے۔

آگے چل کے سہیل بلوچ صاحب نے آہنگ کو ''سٹائل'' کے معنوں میں لے کے سٹائلسٹک تنقید کی آمیزش سے فن پارے کی گرہ کشائی شروع کر دی جس سے اُن کا مقالہ بہت مبہم اور اپنے ہدف سے دور ہٹ گیا ہے۔ ''سٹائلسٹکس'' لفظ شماری نہیں ہے۔ انھوں نے ''باغ و بہار'' کے تجزیہ میں ہمیں سب کچھ کھول کے بتایا ہے کہ اس تحریر میں اتنے قافیے، اتنے افعال معطوف اور اتنے حروف عطف آئے ہیں۔ وہ تخلیقی عمل کے پیچھے بھی اعداد و شمار کی اہمیت دیکھتے ہیں:

''اعداد و شمار میں ایک جملے کے پیچھے کتنی ریاضت ہوتی ہے اس کا اندازہ اس مثال سے کیا جا سکتا ہے کہ میر تقی میر کے چھ دواوین میں 1916 غزلیں اور 13908 اشعار ملتے ہیں۔''

فرض کریں ایک اور شاعر کے ہاں بھی 1916 غزلیں ہیں، ایک اور مصنف نے بھی باغ و بہار کے مذکورہ پیرے کی طرح ''رنگیں، بریں، شگفتیں'' قافیے استعمال کیے ہیں۔ اس ہاں بھی افعال معطوف میں ''کے'' کی بیس مثالیں مل جائیں۔ تو کیا اس کا سٹائل میر امن کے اسلوب تحریر سے مل جائے گا؟ انھوں نے یہی عمل کلام داغ کے مطالعے میں بھی دہرایا ہے۔

قافیے اور افعال کا استعمال زیادہ اہمیت کے قابل نہیں ہوتا بلکہ ان کی وجہ سے جو فضا بنائی گئی ہے اس کی دریافت سٹائل کی دریافت ہے۔ ظاہری بات ہے یہ تمام عناصر یا صفات امدادی طور پر ہی عمل آرا نظر آئیں گی۔ بلکہ کئی جگہ غیر ضروری بھی۔ جیسے بحر کا مشینی آہنگ بعض

اوقات شعر کے تخلیقی آہنگ کو خراب کر رہا ہوتا ہے۔ یوں ''تخلیقی فضا'' ہمیں ہر اس مسائل کو کھوجنے میں مدد دے گی جس میں کوئی قافیہ نہیں اور نہ اس تحریر میں کوئی تشبیہ، استعارے نظر آ رہے ہیں۔ غالب کے اس شعر کا بھی گہرا ''سٹائلسٹک'' مطالعہ کیا جا سکتا ہے جس میں کوئی شعری صفات استعمال نہیں کی گئیں سوائے بحر کے۔۔۔

روک لو گر برا چلے کوئی

بخش دو گر غلط کرے کوئی

گویا ضرورت اس چیز کی ہے کہ شرقی محسنات فن کی یک دامانی کا اعتراف کرتے ہوئے اس کو ان علوم سے جوڑا جائے جو لسانی تجویدی اور مغربی محسنات فن کے نام سے دنیا بھر کے فنون کو متاثر کر رہی ہیں ورنہ روائتی اور آہنگ کی کھوج میں ہم دائرے کے سفر پر چلتے وہیں آ نکلتے رہیں گے۔

قاسم یعقوب

☆☆☆

''معیار''، جلد: ۲، شمارہ: ۱

''عبدالرحیم خان خاناں کی مہر اور یادداشت سے مزین تاریخ محمود شاہی کا ایک مخطوطہ'' از عارف نوشاہی، صفحات ۳۵-۳۹

محولہ بالا مضمون میں، میں نے نسخۂ مدینہ سے ایک یادداشت نقل کرتے ہوئے تواریخ سلاطین گجرات کے سلسلے میں ایک مصنف، مولانا عبدالکریم کی نسبت مکانی سوالیہ نشان کے ساتھ ''نیمردی'' یا ''نیمر دی'' لکھی تھی۔ ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ یہ لفظ تحقیق طلب ہے اور استوری نے بھی شک کا اظہار کرتے ہوئے یہ نسبت ''الہمدی'' اور ''ہمدانی'' لکھی ہے۔ چارلس ریو نے فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم میں ''مآثر محمود شاہی'' معروف بتاریخ محمود شاہی از عبدالکریم ہمدانی کا ذکر کیا ہے۔ مذکورہ مضمون کی اشاعت کے فوراً بعد راقم السطور کو تہران جانے کا اتفاق ہوا (اگست ۲۰۱۰ء) اور وہاں **تاریخ فرشتہ** کے جدید ایرانی ایڈیشن (ناشر: انجمن آثار و مفاخر فرہنگی، تہران، ۲۰۱۰ء؛ ۲ جلدیں طبع ہو چکی ہیں، مزید ۲ جلدیں زیر طبع ہیں) کے مرتب ڈاکٹر محمد رضا نصیری سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ گجرات کی ایک تاریخ **طبقات محمود شاہی** بھی مرتب کر رہے ہیں۔ اس مناسبت سے میں نے کتاب کے مصنف عبدالکریم کی مشکوک نسبت کا ذکر چھیڑا تو انھوں نے بتایا کہ یہ نسبت ''نیمدہی'' ہے۔ نیمدہ ایران کے صوبہ فارس میں واقع ہے اور **طبقات محمود شاہی** کے مصنف وہیں سے منسوب ہیں۔ بعد میں ڈاکٹر نصیری کی مرتبہ **تاریخ فرشتہ**، جلد دوم میں خود فرشتہ کے قلم سے مولانا عبدالکریم نیمدہی کا ذکر مل گیا اور ڈاکٹر نصیری کا لکھا ہوا تعلیقہ بھی نظر سے گزرا۔ محولہ بالا مضمون کے ساتھ مذکورہ یادداشت کا جو عکس چھپا ہے اسے دوبارہ غور سے دیکھا تو صاف ''نیمدہی'' پڑھا جاتا ہے۔

فرشتہ نے خواجہ محمود گاوان کے قتل کے ضمن میں یوں لکھا ہے: ''ملا عبدالکریم نیمدہی صاحب **تاریخ محمود شاہی** کہ از شاگردان بلکہ

مریدان خواجہ بود" (تاریخ فرشتہ، ج۲، ص۳۵۹)

ڈاکٹر نصیری نے بیسدہ کا محل وقوع فرہنگ جغرافیائی ایران، ج۷ کے حوالے سے یوں لکھا ہے: تیر سے جنوب میں، ونج کے راستے میں، صوبہ فارس میں واقع ہے (تاریخ فرشتہ، ج۲، ص۵۷۵)

ڈاکٹر نصیری نے تاریخ فرشتہ کی تعلیقات (ج۲، ص۵۷۵-۵۷۶) میں ملا عبدالکریم بیسدی کے بارے میں جو مفید معلومات ہم پہنچائی ہیں، اس کا فارسی سے تلخیص اردو ترجمہ پیش خدمت ہے:

ملا عبدالکریم بن محمد بیسدی کی نسبت تاریخ فرشتہ کے نولکشوری ایڈیشن، ج۱، ص۳۵۸؛ بمبئی ایڈیشن، ج۱، ص۶۹۳ اور اردو ترجمہ، ج۱، ص۴۰۲ میں غلطی سے ہمدانی درج ہوئی ہے۔ وہ ۸۴۳ھ/۱۴۳۹ء میں بیسدہ میں پیدا ہوئے۔ وہ ملا عبدالعزیز بیسدی کے بڑے بھائی ہیں۔ توران شاہ حاکم ہرمز کی مالی مدد سے ملا عبدالکریم نے شیراز میں سعید نورالدین احمد ایجی اور مولانا شمس الدین محمد لاری سے علم حاصل کیا اور بظاہر ۳۳ سال کی عمر میں کسب معاش کے لیے دکن کا رخ کیا اور شادی آباد مندو میں سکونت پذیر ہوئے۔ وہاں کوئی کام نہ ملا تو احمد آباد بیدر روانہ ہو گئے اور محمد شاہ سوم بہمنی کے دربار میں جگہ پائی۔ بہت جلد ملا عبدالکریم نے محمود گاوان ملک التجار کی توجہ حاصل کر لی اور دس سال تک اس کے منشی کے طور پر کام کیا۔ محمود گاوان کے قتل [۶ صفر ۸۸۶ھ] کے ساتھ ہی ملا عبدالکریم کی مشکلات کا دور شروع ہو گیا۔ اگرچہ وہ سلطان محمود سوم بہمنی کی تخت نشینی تک دربار میں رہے لیکن محمود گاوان سے وابستگی کی وجہ سے دربار سے فارغ کر دیے گئے۔ کچھ مدت غربت اور عسرت میں گذری۔ ذیقعدہ ۸۸۷ھ/دسمبر ۱۴۸۲ء میں احمد آباد گئے اور دو سال تنگ دستی میں گذارے۔ ۸۸۹ھ میں واپس ہرمز چلے آئے۔ حاکم ہرمز سلغر شاہ نے ۸۹۲ھ/۱۴۸۷ء میں انھیں محمود بیگڑہ کے پاس بطور ایلچی بھیجا تا کہ دونوں حکمرانوں کے درمیان جو اختلافات ہیں انھیں حل کیا جا سکے۔ ملا عبدالکریم احمد آباد پہنچ کر وہیں سکونت پذیر ہو گئے اور ۹۰۶ھ سے ۹۱۵ھ تک **طبقات محمود شاہی** (**تاریخ محمود شاہی**) لکھنے میں مصروف رہے[1]۔ اس کے بعد ان کی حیات کا سراغ نہیں ملتا۔ ان کی دیگر تصانیف میں سے ایک **کنز المعانی** ہے جسے اپنے بیٹے مولانا نجیب الدین عبدالسمیع کی فرمائش پر مرتب کیا۔ اس کتاب میں وہ خطوط جمع ہوئے ہیں جو مولانا عبدالکریم نے حاکمان وقت اور دیگر افراد کو لکھے تھے۔ مزید حالات کے لیے **طبقات محمود شاہی** اور **کنز المعانی** کے علاوہ دیکھیے:

Jean Aubin: *Indo Islamica* I, La vie et L'Ceuvre De Nimdihi, Revue Des Islamiques XXXIV, Paris, 1966

ڈاکٹر نصیری کا بیان یہاں ختم ہوتا ہے۔

ستیش چندر مصرا نے تاریخ محمود شاہی کے نام سے جو کتاب شعبۂ تاریخ مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی بڑودہ سے ۱۹۸۸ء میں شائع کی ہے اس میں مولف کا نام مذکور نہیں ہے۔

مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی بڑودہ ہی کے ایک اور استاد ڈاکٹر محمود حسین صدیقی نے رسالہ بیاض، دہلی، شمارہ۲ (۱۹۸۳ء) میں **طبقات محمود شاہی** کا وہ حصہ جو تاریخ گجرات سے متعلق ہے شائع کیا ہے۔ وہاں مصنف کا نام شرف الدین محمد بن احمد لکھا ہے۔

۱۔ ڈاکٹر نصیری نے غالباً بے دھیانی میں یہ لکھ دیا ہے کہ کتاب کی تصنیف ۹۱۵ھ میں شروع ہوئی اور ۹۰۶ھ تک مصنف اس میں مصروف رہا!!

عارف نوشاہی

''ادب کا نومزاحمتی رجحان: پاکستانی اُردو افسانے پر ۱۱/۹ کے اثرات'' از نجیبہ عارف، ص ۳۶۹۔۳۹۶

مذکورہ اختلافی رائے سے قطع نظر درج ذیل نکات بھی شاید قابلِ توجہ ہوں:

۱۱/۹ کے بعد وجود میں آنے والی دنیا محض 'مابعدیت' کا حاصل نہیں (پوسٹ ماڈرن ازم پوسٹ ہیومن ازم پوسٹ سوشلزم) بلکہ اس واقعے سے پہلے یک قطبی دنیا کی تشکیل کے لیے باقاعدہ نئے فکری تناظر، مباحث اور پیراڈائم قائم کیے گئے تھے۔ چنانچہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد عالمی وسائل کی بندر بانٹ میں کیپٹل ازم اور سوشلزم کے درمیان جہاں بہت سے معاشی، سیاسی اور انتظامی بندوبست (adjust ment) کیے گئے تھے، وہاں بعض فکری و فلسفیانہ موشگافیوں کے سلسلے بھی شروع ہوئے اور اس طرح مابعدیت کی دنیا وجود میں آئی۔ دس برس سے زائد مدت پر محیط کولڈ وار (Cold War) میں مغربی کیپٹل ازم کو برتری حاصل تھی۔ چنانچہ نتائج بھی اس کے حق میں نکلے۔ سائنس، ٹیکنالوجی اور ارتکازِ دولت پر امریکی گرفت کو اس غیر معمولی وسعت اور استحکام اور فوقیت (domination) حاصل ہوئی جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ سوشلسٹ ورلڈ کی شکست و ریخت اس مقابلے کا آخری واک اوور (walk over) تھا جو بیسویں صدی کے آخری دہائی میں مکمل ہو گیا تھا۔ اس پوری مدت میں امریکی دانش گاہوں اور ان سے وابستہ اداروں میں فیوچر شاک (۱۹۷۰ء)، دی تھرڈ ورلڈ (۱۹۸۰ء)، پاور شفٹ (۱۹۹۲ء)، تاریخ کا خاتمہ اور آخری آدمی (۱۹۹۲ء)، تہذیبوں کا تصادم (۱۹۹۳ء) جیسی کتابوں اور مباحث کے سلسلے جاری رہے جن کے ذریعے ایک ایسی فکری تحریک چلائی گئی جس کا مقصد عالمی وسائل کو ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے تابع کر کے کیپٹل ازم کے زیرِ نگیں کرنا تھا جو امپیریل ازم کی نئی شکل تھی۔ گلوبل ویلج میں صرف ڈالر کی حکمرانی ہے اور جس قوم اور نسل نے اس کی حاکمیت پر بیعت کرنے کی سعادت حاصل نہیں کی انھیں 'نئی دنیا' میں آؤٹ سائیڈر قرار دے دیا گیا ہے۔ ان فکری اور فلسفیانہ مباحث میں ایلون ٹافلر، سیموئیل پی ہنٹنگٹن، فرانسس فوکویاما اور متعدد دیگر مفکرین نے خوب خوب حصہ لیا ہے۔ سائنسی، ٹیکنیکل، معاشی اور ایڈمنسٹریٹو ماہرین نے بھی اس جہت میں کما حقہ حصہ بٹایا تھا۔ اس طرح ایک منظم تحریک وجود میں آئی۔ جس نے ۱۱/۹ کے بعد کی دنیا کو فکری اساس فراہم کی۔ چنانچہ ۱۱/۹ کے اثرات کو محض ردِ عمل کا حاصل قرار دینا شاید مکمل سچائی نہ ہو۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ۱۱/۹ کا واقعہ ہیروشیما اور ناگاساکی کی ہلاکت سے فزوں تر نہیں تھا لیکن اپنے مابعد اثرات میں وہ مذکورہ ایٹمی دھماکوں سے زیادہ ہلاکت خیز ثابت ہوا۔ کیوں کہ اس المناک واقعے کو یک قطبی دنیا کی برتری اور عالمی وسائل پر مکمل استعمار کے لیے استعمال کیا گیا اور کیا جا رہا ہے۔

فاضل مضمون نگار نے ابتدا میں بعض امریکی ناولوں کا تذکرہ کیا ہے جن میں ۱۱/۹ کے بعد امریکی سوسائٹی پر پڑنے والے اثرات دکھائے گئے ہیں۔ اس حصے نے مضمون کی اہمیت و افادیت میں اضافہ کیا ہے لیکن کیا ہی خوب ہوتا اگر پاکستان میں شائع ہونے والے بعض دوسرے افسانوں کا بھی ذکر آ جاتا۔ اس ضمن میں رضیہ فصیح احمد کے ناول ''ادھوری سچائیاں'' اور ساجد سلطان مرزا کے ناول ''دشتِ خواب'' کے

مسافر" کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔ جس کا موضوع ہی ۱۱/۹ کے بعد کی دنیا میں انسانی اور سماجی رشتوں کی شکست وریخت ہے۔ ثانی الذکر ناول کی ماجرائیت امریکا، مشرقِ وسطیٰ، عراق، افغانستان، مصر، اردو اور ہندو پاکستان کے گرد بنی گئی ہے۔ مذکورہ ناول ۲۰۰۹ء میں (رائل بک کمپنی، BG-5، ریکس سینٹر، فاطمہ جناح روڈ) کراچی سے شائع ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں ۱۱/۹ کے موضوع پر کوئی دوسرا ایسا ہمہ گیر ناول ہنوز نہیں لکھا گیا ہے جو موضوعاتی اور فنی لحاظ سے بلند مقام پر فائز کیا جا سکتا ہے۔ گمان غالب ہے کہ مذکورہ ناول پنجاب کے باذوق قارئین تک نہیں پہنچ سکا ہے!

حیف ہے جان سخن گر بہ سخنداں نہ رسد

یہ درست ہے کہ افسانے کا کوئی بھی جائزہ حرف آخر نہیں ہو سکتا اور ایک ہی مضمون میں سب ہی کہانیوں کا احاطہ بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ طویل ترین جائزے کے بعد بھی "ھل من مزید" کا نعرہ لگتا ہی ہے۔ چنانچہ زیر نظر مضمون میں بھی بعض اچھی کہانیاں مطالعے میں شامل نہ ہو سکیں مثلاً حسن منظر (غیرت)، نیلم مرزا (وحشت) کی بعض کہانیاں مطالعے کا حصہ بننے سے رہ گئی ہیں۔

سید مظہر جمیل

☆☆☆

For Contact:

Department of Urdu,
International Islamic University,
H-10, Islamabad
Telephone: 051-9019547, 051-9019304
E-mail: meysm@iiu.edu.pk

Available at:

I.R.I. Book Centre, Faisal Mosque Campus,
International Islamic University, Islamabad
Telephone: 051-9261761-5 (307)

Layout & Designing: Asma Nazir **Title Design:** Zahida Ahmad

ISSN: 2074-675X

Contents

English Section

Urdu Section

Review Article:

Review Article:

Rectifications:

Archival Annexure (Urdu):

The articles included in Me'yar are approved by referees. The Me'yar and International Islamic University do not necessarily agree with the views presented in the articles.

Me'yar: Academic and Research Journal, Department of Urdu, IIUI, Vol: 2, No: 2, Jul Dec 2010

A Report on the State of Urdu Literacy in India, 2010

*Omar Khalidi**

Introduction:

What is the status of Urdu literacy in India at the turn of the twenty first century as gauged through school education? Or how many students in primary schools in various states of India are studying through Urdu as the language of instruction? How many students are learning Urdu as one of the subjects under the three (or four) language formula in various levels of schools? Have the various levels of government—central, state, and local—facilitated or obstructed learning of Urdu in various states since independence? To what can we attribute the uneven levels of Urdu literacy and education in various states? Besides schools run by the state, who are the other institutions involved in promoting Urdu literacy? This Report thus asks five critical questions as noted earlier, and answers to these questions will enable reasonable projections about the future of literacy (as opposed to orality) in and education through Urdu. Essentially, then, this Report quantifies and measures Urdu literacy in India since the 1950s. For the purposes of this Report, literacy is defined as the ability to read and write elementary Urdu in its own script of Perso-Arabic origin. The term "education through Urdu," is defined as education through the medium of Urdu from primary to secondary level in most, if not all subjects. In answering these questions, this Report will concentrate on the question of Urdu literacy and its higher stage, education through Urdu, in the states of Uttar Pradesh, Bihar and Delhi in northern India, and Andhra Pradesh,

_____This Report is an abridged version of its detailed unpublished text. In this abridged version, statistical tables showing the growth or decline of Urdu medium instruction have been omitted.

* *Agha Khan Programme of Islamic Architecture, MIT.*

Karnataka, and Maharashtra in southern India. The role of institutions outside the formal schools system—in particular the Madarsas will be discussed through a quantitative exercise to gauge the number of students involved in this stream of education through Urdu. The Report concludes with a summary of key findings and a set of immediate action proposals for reversing the decline of Urdu literacy.

The Report is based on four primary sources. These are: statistics on Urdu literacy and education provided by the Union Government's Commissioner of Linguistic Minorities located in Allahabad, U.P.; data available from the District Educational Officers of the ministries of education in various states, interviews with the officials of public organizations/NGOs, and information available from State Madarsa Boards, both official and non-official. It is surprising that previous official committees on Urdu, weather that chaired by I.K. Gujral or Ali Sardar Jaafari did not bother to collect detailed statistics running over years to get a clear picture of Urdu literacy as measured by number of pupils, schools, and teachers in the nation. Neither did the well-funded National Council for the Promotion of Urdu Language run by the Ministry of Human Resource Development.[1]

Before the advent of British rule on the subcontinent at the dawn of the nineteenth century, Indians received education through two patterns. One, shaped by vocational relevance was given in locally dominant languages to cope with the day-to-day needs of society. The other pattern was to provide education to the elites sons of literati, the ruling class and high officials—by readings of scriptures and historical texts through classical language such as Sanskrit, Arabic and Persian in Pathshalas, Gurukul, Maktabs and Madarsas. During the Mughals and its immediate successor states in the subcontinent, the language of the royal courts, diplomacy, higher levels of administration, judiciary, and revenue collection was Persian.[2] With the consolidation of the colonial rule, the British abolished Persian (in 1836) as the language of judiciary and administration, replacing it with English. The British administration could not resolve or was not interested in resolving the three basic issues of education: the content, the spread, and the medium or

[1] Interview with Director Hamidullah Bhatt, New Delhi 9 December 2005; interview with Ali Jawid, New Delhi May 14, 2010. Jawid was director from April 2007 to January 2009.

[2] A summary of education in medieval India is by Aziz Ahmad, *An Intellectual History of Islam in India*, (Edinburgh: University Press, 1969), pp. 52-65.

language of instruction. While sons of the Indian elite were educated in English schools in urban areas, right from the primary level, the large masses of the population went to schools imparting education through regionally dominant languages in eastern, southern and western India. However, in large chunks of British territories of Punjab, Northwest Frontier, Oudh, United Provinces (modern UP), the princely states of Hyderabad and Kashmir were exceptions to the rule, where Urdu became the language of instruction in schools, and remained so until the late 1940s. During the long years of struggle for independence, nationalist leaders such as Gopal Krishna Gokhale, (1866-1915), Mohandas Gandhi, (1869-1948) and intellectuals like Muhammad Iqbal, (1876-1938), Rabindranath Tagore, (1861-1941) and Mawlawi Abdul Haq (1870-1961) saw the need for universal elementary education through mother tongue. They hoped that education through mother tongue would be the agent and catalyst for liberation from the European intellectual hegemony, which they thought was as much necessary as political freedom from the colonial power. In Hyderabad, in his Dominions, the enlightened Nizam, Mir Osman Ali Khan (reigned 1911 to 1948) established a full-fledged, well-funded Osmania University in 1917 that imparted higher education through Urdu given that it was the language of instruction throughout the state.[3]

Language Issues and the Constitution

Given the immense linguistic diversity of India, it is unsurprising that there are constitutional provision governing the use of languages in education and administration.[4] The national constitution adopted in January 1950, divides power to enforce decisions on language between the center and the states. Education is primarily a state subject. Article

---

[3] Haroon Khan Sherwani, "Osmania University: First Phase, Urdu Medium" pp. 237-247, in *Studies in Indian Culture: Ghulam Yazdani Commemoration Volume*, edited by H.K. Sherwani, (Hyderabad, 1962). It is ironic that one of the first acts of the Indian Military Governor J.N. Chaudhuri was to forcebly change the language of instruction at Osmania from Urdu into English after the Operation Polo of September 1948.

[4] For the question of "official," language status, meant for communicating matters of state administration, see Omar Khalidi, ""Politics of Official Language Status for Urdu in India." *Journal of South Asian and Middle Eastern Studies* 28, 3 (Spring 2004): 53-77.

345 of the Constitution gives the states the power to adopt whatever languages they choose for official purposes within their territory. However, state powers with regard to language policies are not limitless. The Constitution guarantees certain rights to linguistic minorities, which the state are obliged to provide. Article 20 guarantees the right of citizens in any part of India to preserve their distinct language, script or culture. Article 30 guarantees minorities "whether based on religion or language…their right to establish and administer educational institutions of their choice," and to receive state aid for such institutions without discrimination. Article 350A obliges every state and local authority to "provide adequate facilities for instruction in the mother-tongue at the primary stage of education to children belonging to linguistic minority groups." Article 350B establishes a "Special Officer for Linguistic Minorities," to be appointed by the President to report on "all matters relating to the safeguards provided for linguistic minorities under the constitution. These reports are then placed before parliament and sent to the state governments. By any measure, the Indian constitutional provisions appear liberal and fair to the minorities. But Indian constitution, like constitutions everywhere is not a self-enforcing document. It requires the executive branch of the government to implement that which is promised in the constitutions. A series of education ministers' conference decisions, memorandums of Indian government, chief ministers' conference decisions since 1949 clearly and unambiguously provide safeguards to the linguistic minorities as detailed in almost every annual report of the Commissioner for Linguistic Minorities since 1956. Most recently, in 2007, the National Commission for Religious and Linguistic Minorities in a report compiled by a former Chief Justice Ranganath Mishra, unambiguously recommended that "the three language formula should be implemented everywhere in the country making it compulsory for the authorities to include in it the mother tongue of every child—including especially Urdu and Punjabi." [5]

In other words, every state in India is under obligation to provide primary education in mother tongue. For instruction in mother tongue at the secondary stage of education, "a minimum strength of 60 pupils in the last four classes and 15 pupils in each class will be necessary,

[5] *Report of the National Commission on Religious and Linguistic* Minorities, (New Delhi: Ministry of Minority Affairs, 2007), available on http://www.imc-usa.org/files/NCRLM_Ranganath_Misra_Report.pdf

provided that for the first four years, strength of 15 in each class will be sufficient."[6] In other words, this liberal regime is the framework for providing education at primary and secondary level for children of linguistic minorities throughout the nation. But are constitutional guarantees and executive decisions actually implemented? In order to examine the implementation of constitutional guarantees to the linguistic minorities, each state merits separate treatment given the wide variation in the attitude of governing political parties in various states. As discussed earlier, we will examine literacy in and education through Urdu in six states, beginning with Uttar Pradesh as it contains the largest number of Urdu speakers.

Uttar Pradesh

Shortly after independence in mid August 1947, while almost all Indian languages took their rightful place in education, administration and as the medium of mass communication, Urdu did not. It did not for two reasons. First, unlike the speakers of most languages, the speakers of Urdu were not concentrated in one compact geographic region or state to enable political support for the language. They were a minority of speakers everywhere. That situation remains unchanged. The second reason was political, particularly in Uttar Pradesh. Unlike the liberal and secular vision of the Congress Party faction led by Mohandas Gandhi, Jawaharlal Nehru and C. Rajagopalacharya, the Hindutva faction of Congress Party led by Sardar Vallabhbhai Patel and provincial leaders in Uttar Pradesh opposed Urdu as they perceived it synonymous with Muslim culture. Puroshottamdas Tandon, a senior leader of the Congress Party fulminated in a speech on 15 June 1948, warning "Muslims must stop talking about a culture and civilization foreign to our country and genius. They should accept Indian culture. One culture and one language will pave the way for real unity. Urdu symbolizes a foreign culture. Hindi alone can be the unifying factor for all the diverse forces in the country."[7] Pundit Govind Ballabh Pant, a Congress leader, (UP Chief Minister 1946 to 1954), speaking in the Constituent Assembly implicitly denied that Urdu was a language distinct from Hindi, characterizing the demand for teaching of Urdu as

[6] Commissioner of Linguistic Minorities in India, 17th *Annual Report*, for the year 1974-1975 (Allahabad: CLM, 1976), p. 5.
[7] *National Herald* (Lucknow) 15 June 1947, p. 7.

an "idea of separatism," and a "bogey," raised by proponents of "two nation theory."[8] In October 1947, the Congress-dominated UP Legislative Assembly voted a Hindi-only policy in the state over the objection of the Opposition Muslim League. The Leaguers walked out in protest, to the sounds of Congress Partly legislators calling out, "Don't come back; go to Pakistan."[9]

Another Congress leader Sampurnanand (UP Chief Minister from 1954 to 1960), arrogated to himself the role as a definer of Urdu, declaring it "not … a separate language but merely a style of Hindi in which words of Arabic and Persian derivation form a high percentage."[10] Echoing the views of the Congress leaders, the Central Working Committee of the Bharatya Jana Sangh (BJS, the earlier incarnation of Bharatya Janata Party, BJP), declared Urdu to be "the language of no region in India, it being only a foreign and unacceptable style of Hindi with a foreign script and foreign vocabulary imposed on India during a period of foreign domination." [11] Writing in *Organizer*, the BJS mouthpiece, the Party President Deen Dayal Upadhyaya, supported the Congress Chief Minister's notion that Urdu was a foreign imposition.[12] The views of the UP political leaders --whether of Congress or otherwise-- remained the same over several decades. Chaudhuri Charan Singh, who started out as a Congressman and later formed a party of his own, and eventually became a prime minister, believed that "Urdu was imposed by Turks or Mongols (sic) who came from outside; and Urdu was one of the principal causes of India's partition."[13] Banarasi Das (chief minister from 1979 to 1980) and Sripat Misra (1982-1984) both simply denied that Urdu was a language distinct from Hindi. In their respective terms of office, both claimed UP to be a monolingual state and rejected demand for Urdu education as they claimed it would lead to another partition. When Muslim leaders pleaded for simultaneous development of Hindi and Urdu shortly after independence, Banarasi Das, "opposed this idea, arguing that Urdu was the product of conquest and that

---

[8] *Constituent Assembly Debates, Official Report* 7, New Delhi, 1949), pp. 913-916.

[9] *Pioneer*, Lucknow, 5 November 1947, p. 1.

[10] Sampurnanand, *Memories and Reflections*, (Bombay: Asia, 1962), pp. 92-93.

[11] *Central Working Committee of BJS Documents*, V, 8 May 1954. pp. 21-22, as cited in B.D. Graham, *Hindu Nationalism and Indian Politics*, (Cambridge: Cambridge University Press, 1990), p. 118.

[12] Deen Dayal Upadhyaya, "The Politics of Urdu," *Organizer* (26 May 1958), p. 4.

[13] Khushwant Singh, "Charan Singh and Urdu," *The Illustrated Weekly of India* (11 December 1977), pp. 15-16.

support for it showed that the theory of two nations survived partition."[14]Congress Chief Minister from 1985-1988, Vir Bahadur Singh's first order upon assuming charge was to "remove the name plaque in Urdu from his office."[15] In an intemperate attack on Urdu speakers, a Congress minister Vasudev Singh "wanted Urdu supporters to be paraded in the streets on the back of donkeys," during a debate on official language status in UP Legislative Assembly in July 1985, according to press reports.[16] Although widely and often regarded as sympathetic to minorities, a former chief minister Mulayam Singh insensitively suggested Urdu speakers to change the script of their language.[17] During the tenure of his ministry, the official examination papers for the Fifth class of schools run by Anjuman-i Tarraqi-i Urdu were given in Hindi alphabets despite protest.[18] To their credit, the Nehru faction of the Congress Party, the Communist Parties of India, and a broad spectrum of intelligentsia supported Urdu's teaching. But they proved no match for Urdu's detractors in Uttar Pradesh both within and without the ruling Congress Party.
The position of Urdu speaking population and Muslim population over the decades can be seen in the table noted below.

Table I Urdu Speaking Population & Muslim Population in U.P.

Year	Percentage of Urdu Speakers to total population	Percentage of Muslims	Coefficient	Total Urdu Speakers in millions
1951	6.8	14.28		
1961	10.70	14.62		
1971	10.49	15.48		
1981	10.50	15.93	67	9.27

[14] *Statesman* (New Delhi) 20 September 1951, p. 5.
[15] Salamat Ali Mahdi, "Without Comment," *Muslim India* (November 1985), p. 525.
[16] *Northern India Patrika* (Lucknow) 16 July 1985, as cited in Selma K. Sonntag, "The Political Saliency of Language in Bihar and Uttar Pradesh," *Journal of Commonwealth and Comparative Politics* 34, 2 (July 1996): 1-18, citation on p. 16, footnote 48.
[17] D. Gidwani, "Wrong Script: War of Words over Urdu," *India Today* (28 February 1994), p. 20.
[18] Statement of Sultana Hayat, President of the Anjuman as published in *Nida-yi Millat* (Lucknow) 19 May 1991, p. 18.

1991	9.15	17.3	51.8	12.49
2001	8.98	18.5		13.3

What does the ideological pronouncement of UP leaders opposed to Urdu suggest? The political and cultural leaders of Uttar Pradesh see India in general and their state in particular as a monolinguistic and monocultural entity. In their thinking it is not enough to promote Hindi, but it also necessary to demote and deny Urdu in order to fulfill the aim of a homogeneous India, captured in the slogan, "Hindi, Hindu, Hindustan," coined by Pratap Narayan Mishra.[19] Thus it is unsurprising that the state governments of UP whether dominated by the Congress Party, or run by coalitions, or controlled by BJP, Samajwadi Party, Bahujan Samaj Party, all have consistently denied the simple, straightforward, constitutional demand of Urdu speakers for primary school education through the mother tongue. What Urdu speakers were asking was nothing more than a continuation of the right to learn their own language, a right that was not denied during the colonial era. In U.P. during the colonial era, "the media of instruction were both Urdu and Hindi. Those who took Urdu as a first language subject had to read Hindi as a second language and vice versa…There was no question of Urdu or Hindi teachers as no teacher was confirmed in service unless he showed his competence to teach through both Urdu and Hindi by passing a prescribed examination."[20] It changed swiftly after independence. How did the UP administration go about denying Urdu speakers' their basic right? Brushing aside any claims of Urdu speakers, the UP Government declared Hindi in Devanagari letters as the sole language of civil and criminal courts on 8 October 1947. Two years later the UP Board of High School and Intermediate Education decided that only Hindi would be the medium of examination for high schools from 1951 onwards and for Intermediate classes from 1953.[21]

The first subject prescribed in primary school syllabus is Hindi and is called as *Matra Bhasha* mother tongue, regardless of whether it happens to be or not in every case. These measures struck at the root of literacy in and education through Urdu at the primary and secondary levels.

[19] Cited in Omar Khalidi, "Hinduising India: Secularism in Practice." *Third World Quarterly* 29, 8 (2008): 1545-1562.

[20] Qazi Mohammad Adil Abbasi, *Aspects of Politics and Society: Memoirs of a Veteran Congressman*, (New Delhi: Marwah, 1981), p. 145.

[21] *Report of the Uttar Pradesh Language Committee*, August 1962, chaired by Acharya Kripalani, (Lucknow: Government of Uttar Pradesh, 1963), p. 38.

Furthermore, the UP Education Code 80(4) makes it mandatory for any recognized secondary school to have Hindi as the language of instruction. Anti-Urdu ideology of the UP Congress led to draconian measures struck at the core issue of Urdu literacy: the right to primary education trough mother tongue. Throughout the 1950s, supporters of Urdu speaker led by Anjuman-i Tarraqi-i Urdu (Association for the Promotion of Urdu) and numerous other organizations petitioned the President of India, met the successive chief ministers and education ministers of UP, wrote memorandums to appropriate authorities at various levels of government, but to no avail. One major instance of Urdu struggle of the 1950s, was the memorandum signed by two and a half million people which was presented to the head of state, seeking presidential intervention to safeguard their mother tongue. Zakir Husain submitted the memorandum in 1954. The memorandum, among other demands, asked for no more than the implementation of the constitutional rights for instruction at primary and secondary levels in mother tongue. The President would of course not intervene, unless requested by the Prime Minister. The state authorities in Lucknow remained adamant in obstructing literacy in and education through Urdu in UP. The annual reports of the Commissioner of Linguistic Minorities are replete with specific examples by which the UP administration denied learning of Urdu: limiting facilities for Urdu-speakers only to classes where there are ten such students or schools where there are forty Urdu-speaking students; failure to provide such facilities in some schools even where the requisite number of pupils existed. Even when the Urdu-speaking parents met the difficult conditions imposed by the state, authorities failed to provide mother tongue education.[22] All that the Urdu speakers' struggle of the 1950s produced was a "press note," directly addressed to no one in particular and certainly without the threat of a punitive measure if the recommendations were not put in practice. At the suggestion of Congress Party, the Union Ministry of Home Affairs, through a press note on 14 July 1958, recommended:[23]
Facilities should be provided for instruction and examination in the Urdu language at the primary stage to all children whose mother tongue is declared by the parent or guardian to be Urdu.

[22] *Report of the Commissioner of Linguistic Minorities,* VI (Delhi: Manager of Publications, 1961), pp. 9-10; 135.
[23] *Report of the Committee of Parliament on Official Language, 1958,* (New Delhi, 1959), Annexure IV, pages, 115-117.

Arrangements should be made for the training of teachers and for providing suitable textbooks in Urdu.
Facilities for instruction in Urdu should also be provided in the secondary stage of education.
Oddly, it was the Ministry of Home Affairs, not the Ministry of Education that issued the "recommendations." Regardless, the UP administration was not moved. While admitting of certain administrative lapses in the provision of Urdu's teaching, it persisted in the view that Urdu was not a distinct language in the first place, that there was a certain percentage of Urdu speakers in the state, but not a whole community of its speakers whose rights needed to be respected, and finally that Urdu could not be promoted as it would interfere with the projection of Hindi as the sole official language in the state.[24] In fact, in 1963, the UP Government amended the Three Language Formula which substituted mother tongue—regardless of what it happened to be—by Hindi as the first language, classical Sanskrit along with other modern Indian languages as a second language, and English as the third. Sanskrit, a classical, not a modern language was lumped together with "modern," languages with a purpose. Given the lack of teachers in "other modern Indian languages," it was impractical to impart them, so by default Sanskrit was introduced. The third language choice was English, which no pupil or parent wanted to ignore. Thus Urdu was eliminated through a seemingly innocuous mechanism, though it was clear to all and sundry what the intent was. Although even with this amendment Urdu could still qualify as a modern Indian language, yet facilities for teaching Urdu were deliberately not made available, thus forcing students to learn Sanskrit.[25] Evidently, subsequent amendments introduced twenty years later further curtailed learning of Urdu.[26] The decade of the 1960s passed without any ameliorative measure by the center or the state, despite a litany of complaints, memorandums, deputations and petitions to the appropriate authorities at the center and state. Nearly a quarter century passed and a

---

[24] Paul Brass, *Language, Religion and Politics in North India*, (Cambridge: Cambridge University Press, 1974), pp.204-207.
[25] "How Urdu Was Killed in Uttar Pradesh Through Bracketing it With Sanskrit," *Muslim India* (August 1983),, p. 357, which reproduces the text of UP Government Order dated 16 March 1963.
[26] Khalilur Rab, "Last Nail in the Coffin of Urdu in UP: New School Syllabus Banishes Urdu Even as a Third Language," *Muslim India* (October 1984), p. 462.

full generation of Urdu speaking pupils lost their birthright to learn their language before the union government appointed a *non-statutory* advisory committee headed by Inder Kumar Gujral on 5 May 1972. Gujral was then a Minister of State for Works and Housing in the union cabinet. Officially called Committee for the Promotion of Urdu, but unofficially as Gujral Committee, "it was requested to advise the Government on the measures to be adopted for the promotion of Urdu language, and the steps required to be taken to provide adequate facilities for Urdu speaking in educational, cultural and administrative matters."[27] It must be noted that the Committee was merely advisory in nature, not statutory in character, whose recommendations would be binding on the state. The Committee presented its report to the Union Ministry of Education on 8 May 1975. Soon after the Reports' presentation, in a political measure unrelated to the Report, Prime Minister Indira Gandhi declared a state of emergency in June 1975, effectively suspending democratic rights in the nation. According to Gujral, when the Report was presented in the Cabinet "Indira Gandhi was keen to accept and implement the Report in its totality…To her surprise and my dismay, Jagjivan Ram [the then minister for Irrigation and Agriculture], opposed it vehemently. He was not objecting to a particular recommendation or any other—he just did not want to look at the Report. "You want to equate Urdu with Hindi by the back door," he said. Both Nurul Hasan [the then Minister for Education] and I tried to explain that the Report had in no way to tried to resurrect the old rivalry syndrome…But Babuji [i.e. Jagjivan Ram] was unrelenting. "No, no, he said, forcefully, while others [in the Cabinet meeting] chose not to intervene. Mrs. Gandhi watched quietly. Those were the early days of the Emergency and she was not too sure about Babuji's latent attitude. Instinctively, she felt that he was seeking an issue to embarrass her. She therefore thought it expedient to close the discussion and told Nurul Hasan, "We will look at it later." This evasive instruction consigned the laboriously worked Report to the dark dungeons of the Ministry's archives."[28] The end of the Emergency, and the Congress Party's defeat

[27] Available online on the website of Ministry of Human Resource Development, Government of India,
http://www.education.nic.in/cd50years/u/47/3Y/toc.htm
Accessed on 2 January 2010.

[28] I.K. Gujral, "Report on Urdu," *Seminar* 332 (April 1987): 26-29, citation on page 27.

in 1977 national general elections brought a new government at the Center. The Report was nearly forgotten when the new government presented it to the parliament on 21 February 1979. There was nothing original or revolutionary in the Report. It merely presented the legitimate, basic, constitutional, and fundamental linguistic rights of a minority group. Among other measures, the Report recommended the teaching of Urdu in primary education for those who claim it to be their mother tongue. At secondary level of education, it suggested amendment to the Three Language Formula that would allow teaching of Urdu as one subject in various states. [29] What action did the first non-Congress Central government and the various state governments including UP took on the recommendations of the Report? None whatsoever! When she returned to power a second time in 1980, Indira Gandhi had forgotten the Gujral Report. Just as the Congress government under Indira Gandhi had taken no action on the Report, so also the government under her son and successor Rajiv Gandhi took no action to implement Gujral's recommendations. On 30 July 1987, the Central government issued a bland statement in the parliament: "The Cabinet decided that since most of the recommendations of the Report would have to be implemented by the states, copies of the Report may be sent to the state governments for their views. Accordingly copies of the Gujral Committee Report were made available to all the state governments…for consideration and comments."[30] Instead of acting on the recommendations of Gurjal Report, the central government constituted yet another Committee to Examine Implementation of the Recommendation of Gujral Committee for Promotion of Urdu, on 15 February 1990 chaired by Ali Sardar Jaafari, (1913-2000), a Bombay-based leftist poet. The Committee headed by Jaafari found that "education has been brought to the Concurrent list as a result of the 42nd Amendment to the Constitution in 1976. Although it was a far reaching step with regard to the sharing of responsibility between Union government and the States, no benefits have accrued to the Urdu speaking population by this measure. The Gujral Committee's recommendation to set up Urdu primary schools where there are 10 percent or more of Urdu speaking people has not been implemented by any of the States. In Uttar Pradesh, for example, *there is not a single*

[29] Ibid.

[30] "Government Statement on the Implementation of Gujral Committee's Recommendation on Urdu," *Muslim India* (September 1987), p. 416.

Government Urdu medium secondary school.[31] The Gujral Committee's recommendation regarding the Three Language Formula has not been implemented in any of the States in its true spirit."[32] Ironically, when I.K. Gujral became the Prime Minister in April 1997, he took no steps to implement his own recommendations on Urdu. In doing so, he was not alone. He was merely emulating his predecessors. Zakir Husain similarly forgot his earlier passion for Urdu in 1967 upon elevation as President of India. Even earlier, Jawaharlal Nehru, despite his liberal outlook did not pressure the state government of Uttar Pradesh on his government's advocacy for teaching Urdu in primary education. By not coming down hard on the Uttar Pradesh government's anti-Urdu policy, a manifest violation of the constitutional provisions, the Nehru administration and every successive union government is complicit in the state-directed culturecide, as can be seen from the statistics of Urdu speakers' declining number over the decade in various states.

Speakers of Languages 1971, 1981, 1991 & 2001: Comparative Statistics

Year	Percentage of Urdu Speakers to total population	Percentage of Muslims	Coefficient	Total Urdu Speakers in millions
1951	6.8	14.28		
1961	10.70	14.62		
1971	10.49	15.48		
1981	10.50	15.93	67	9.27
1991	9.15	17.3	51.8	12.49
2001	8.98	18.5		13.3

1,2,3,4** Figures not available for 1981 for Tamil. Source is Census of India.

1, 2, 3, 4** Figures not available for 1981 for Tamil. Source is Census of India

[31] Yet it does not prevent the Government from claiming their existence, as noted in CLM reports cited up to 1980s.

[32] http://www.education.nic.in/cd50years/u/47/3X/toc.htm
Accessed on 3 January 2010

How can we interpret this data? It appears that the absolute number of almost all major languages is decreasing compares to Hindi. In the absence of direct, verifiable evidence, one can infer that the number and percentage of Hindi speakers is growing on account of three reasons. One is that the administration has aggressively pursued a policy of monologingualism in Uttar Pradesh by denying school instruction in Urdu since more than half a century. Two generations of Urdu speakers have passed with no opportunity to learn their mother tongue. Consequently, it is fair to infer that those educated—and educated for the first time—in any language happened to be literate only in Hindi, and consequently enumerated that language in census as mother tongue.[33] In number of instances, the census enumerators have deliberately enumerated Hindi as the language of Urdu speakers as illustrated in numerous instances.[34] Hindi is also growing at the expense of Punjabi in Delhi, Haryana and Punjab and among Punjabis living in other states. The sorry state of Urdu literacy is can be seen through the statistics for instruction at the primary and secondary stages of education in Uttar Pradesh from 1955-56 to 2005-2006.
CLM/Brass= Paul Brass, *Language, Religion and Politics in North India,* (Cambridge: Cambridge University Press, 1974), p. 208.
No data in CLM Report July 200-June 2001, July 2002-June 2003; or CLM Report July 2004-June 2005. The CLM Report for July 2005-June 2006, the UP Government reported "that there are 422 schools were Urdu is the medium of instruction. There are 422 teachers and about 8,000 students. Another 6, 974 schools are mentioned where Urdu…is taught as a subject. The number of teachers is 3,900 and that of students about 3.88 lakhs. It appears that detailed information about the number of students is not gathered and hence, approximate figures are given. The number of Urdu teachers is, prima facie, short of requirements. It is pertinent to mention that on an earlier occasion during the visit of Deputy CLM, it was found that there were no Urdu schools in Varanasi,

[33] M. Ishaq, "Levels of Language Retention among Muslims in Bihar and Uttar Pradesh," pp. 117-126, in *Muslims in India Since Independence: A Regional Perspective*, edited by M. Hashim Qureshi, (New Delhi: Institute of Objective Studies, 1998), based on 1981 census.
[34] Dr. A.J. Faridi, Paul Brass, op. cit., p. Sayyid Hamid, "Mardum Shumari Ya Mardum Bizari," *Nida-yi Millat* (24 March 1991), pp. 11-12.

Mau and Azamgarh and no statistics were available even at the district level. CLM has not been aware of any improvement in the situation."[35]
The CLM data as shown in Paul Brass's study reveals that in the decade of 1956-1966, less than three percent of total enrollment in primary schools of UP enrolled in Urdu medium schools.[36]
No statistics about UP in any subsequent CLM Reports about Urdu medium secondary schools in UP or statistics about number of secondary schools in which Urdu is taught as a subject and teachers involved. In 1990, the Jaafari Report noted that "in Uttar Pradesh…there is not a single Government Urdu medium secondary school."[37] Thus it is unsurprising that there are no statistics to report.

Situation since the 1990s

In the absence of official statistics maintained by the appropriate authority in the relevant department, one is forced to depend on other sources such as surveys. Aijazuddin Ahmad did one such survey in early 1990s. According to this survey only 16.47 percent of all Muslim literates in UP (which are in poor numbers) were educated through Urdu.[38] The Aligarh Muslim University runs 7 high and secondary schools, some of which are Urdu medium. But the quality of education is evidently so poor.[39] The consequences of no-Urdu in education policies of the successive UP administrations have borne fruit. Fully two generations of Urdu-speakers have passed without being able to study their mother tongue. Consequently, a large number of Uttar Pradesh Muslims are unable to identify Urdu as their mother tongue in the census returns as shown in M. Ishtiaq's study.[40] The Hamdard Education Society's 1991-1993 survey conducted in four urban centers—Sambhal, Firozabad, Ghazipur and Zamania—shows that of

---

[35] CLM Report, July 2005-June 2006, p. 45.
[36] Paul Brass, *Language, Religion and Politics in North India*, (Cambridge: Cambridge University Press, 1974), p.
[37] Jaafari Report, p. 12.
[38] Aijazuddin Ahmad, *Muslims in India: Their Educational... Survey*, IV (New Delhi: Inter-India Publications, 1996)p. 159.
[39] Muhammad Mahmud Fayzabadi, "Muslim University ke Schooli Nizam main Urdu," *Urdu Duniya* (July 2000), pp. 33-34.
[40] M. Ishtiaq, "Levels of Language Retention among Muslims in Bihar and Uttar Pradesh," pp. 117-126, in *Muslims in India Since Independence*, edited by M. Hashim Qureshi, (New Delhi: Institute of Objective Studies, 1998).

all the Muslim literates, only 26.64 received primary education through Urdu which dwindles to 8.84 percent at middle level, shrinks to a further 2.87 percent at high school level, dipping at a mere 2.55 percent at junior college (10+2) stage.[41] Unlike UP, Ishtiaq shows that retention of Urdu as enumerated in census is marginally better in Delhi where there are more schools teaching Urdu.

Delhi

For those who know Urdu's literary history, it is hard to imagine Delhi without the central figures of Mir, Mumin, Zawq, Ghalib, and Bahadur Shah Zafar in the eighteenth and nineteenth centuries respectively. So is the case with twentieth century institutions such as Anjuman-i Tarraqi-i Urdu and Jamia Millia Islamia to name the most obvious. However erroneously, for a long time many considered Urdu as spoken by the Delhi elite as the model to be emulated by others. This attitude ignored a large number of Dehlawis who spoke Karkhandari dialect.[42] Until 1947, Delhi was a major center of Urdu literary production if not of population. In that year, the partition related violence and pogroms drastically reduced Urdu speaking population. Subsequent migration to Pakistan that continued until 1971 further curtailed Urdu speakers' numbers. Migration from Bihar, UP and other states has no doubt increased Urdu speakers' population from what it was in the first two decades of independence, yet Urdu instruction in schools remains poor. As the table noted below shows, Urdu medium schools or schools where Urdu may be taught as a subject are fewer than what they ought to be. Humorist Mujtaba Husayn aptly captured the decline of Urdu literacy in Delhi in an article captioned "Jamia se Zamia tak," showing gross errors in the transcription of Urdu in street names in the national capital.[43]

Obtaining accurate information about the number of schools, students, and teachers instructing Urdu are routinely lacking in common with other states. A survey of Okhla, a south Delhi neighborhood in early

---

[41] Aijazuddin Ahmad, *Muslims in India: Their Educational ... Survey*, IV (New Delhi: Inter-India Publications, 1996)p. 159.

[42] Gopi Chand Narang, *Karkhandari Dialect of Delhi*, (New Delhi: Munshiram Manoharlal, 1961)

[43] Mujtaba Husayn, "Jamia se Zamia tak," *Kitab Numa* (March 2000), pages 44-47. As far back as 1974, I overheard a conversation at a concert in which a woman called Ghalib's lyrics as Galib ka gajal!

1990s revealed that of the surveyed population of literate Muslims, 34.17 percent received education through Urdu, certainly better than compared to neighboring Uttar Pradesh.[44]

Urdu Medium Enrollment in Secondary Schools in Delhi, 1958-2010

The social composition of the Urdu students is clear, most are children of carpenters, hawkers, imams, muazzins, and other poor people. A survey in 1986, found that a school that was identified as Urdu medium, "turned out to be one that had switched over to Hindi medium."[45] Most of the buildings housing Urdu schools are in poor condition, forcing closure of some schools.[46] Noxious fumes from in-house factories and high decibels of noise in most schools makes for a poor learning environment.[47] Outright lack of or inadequate number of teachers is a perennial problem.[48] There are insufficient number of 8teachers because, "out of 1640 seats [in elementary school teachers' training centers]…only 20 are available for Urdu medium…"[49] State "government official claim that there is no dearth of books in Urdu medium",[50] but "a majority of principals of government and government-aided schools claim the contrary. Books become available but very late, when almost half the academic year is over. Most of these

---

[44] Aijazuddin Ahmad, *Muslims in India: Their Education..Survey*, III, (New Delhi: Inter-India Publications, 1995), p. 211. The survey was carried out under the auspices of Hamdard Education Society, New Delhi.

[45] "Urdu Education in Delhi: DSEB Survey of Primary Schools," *Muslim India* (February 1986), p. 82.

[46] Marooshfa Muzaffar, "Building Crumbling, Govt. Says Close Urdu-Medium School," *Indian Express* (11 July 2009), internet edition; Firoz Bakht Ahmad, "56-Year Old Urdu School Faces Closure," *The Milli Gazette* (16-31 July 2004), p. 5.

[47] "Delhi Schools: Saga of Truancy, Apathy and Negligence," *Feature & News Analysis* (September 1992), pp. 1-2.

[48] Chinki Sinha, "Urdu Schools Lack Qualified Teachers," *Indian Express* (2 September 2009), internet edition.

[49] "Delhi Government's Love for Urdu," Khabrein.info June 21 2009; "Petition on Appointment of Urdu Teachers in Schools," *The Milli Gazette* (16-31 December 2009), p. 21.

[50] "NCERT to Provide Urdu Textbooks," *The Times of India* (28 May 2005), internet edition.

textbooks are translated from English and are not up to standard."[51] It is not clear if Delhi Bureau of Textbooks is involved in the preparation, publication and distribution of Urdu textbooks. With this state of affairs, it is unsurprising to read captions such as "Dismal Showing of Urdu Schools," or "Urdu Medium Schools Put Up a Very Poor Show," or "Languishing Urdu Medium Schools of Delhi," written by Firoz Bakht Ahmad in press.[52] Ather Farouqui, a Delhi activist describes Bakht's statistics as "fake data," indicating—unsurprisingly-- rivalries between Urdu promoters.[53] Occasionally, the gloomy picture of Urdu literacy is relieved by stray reports—not systematic survey—of improvement.[54] Regardless, the quality of education in Urdu is low as confirmed by a veteran educational activist Ahmad Rashid Shervani.[55]

Bihar

Table 1 Urdu Speaking Population & Muslim Population in Bihar

Year	Percentage of Urdu Speakers	Percentage of Muslims	Coefficient	Total Urdu Speakers in millions
1951	6.82	11.58		
1961	9.83	12.45		

[51] "Urdu Education in Delhi: Status and Problems: A Survey by National Council for the Promotion of Urdu," *Muslim India* (August 2002): pp. 368-369. The textbooks were published by the NCERT, according to Jaafari Report, p. 82.

[52] These reports are written by Firoz Bakht Ahmad "Dismal Showing of Urdu Schools in India," *Indian Express* (Bombay 6 July 1993), p. 8; "Urdu Medium Schools Put Up a Very Poor Show," *Radiance* (11-17 July 1999), pp. 13-14; "Languishing Urdu Medium Schools of Delhi," *The Milli Gazette* (16-30 June 2002), pp. 8-9; and most recently Ahmad sent statistics of examination results of Urdu medium schools of Delhi and other states for the years 2001-2008 by email dated 23 December 2009 without attributing source of the information.

[53] Ather Farouqui, "Fake Data on Urdu Education—one More Fraud," *The Milli Gazette* (1-15 October 2007), p.15; and C.M. Naim's letter to the editor of *The Annual of Urdu Studies* 14 (1999), p. 347; and the letter of Syed Shahabuddin in the same journal on pages 347-350.

[54] Chinki Sinha, "Urdu Schools Turn Around," *Express India* (31 May 2009) internet edition. Sinha reports about improving results in schools in Jaafarbad, Ballimaran, and other areas.

[55] Ahmad Rashid Shervani, "Plight of 4 Muslim-Managed Delhi Schools," *Radiance* (31 July-6 August 2006), p. 14; and in numerous conversations with him from 2005-2010.

1971	9.00	13.48		
1981		14.13	65	4.99
1991	9.9	14.80	66.8	8.54
2001	9.89	13.7		9.5

If the core of Bihar is recognized as the capital city of Patna, then Mughal Patna called Azimabad qualifies as a major center of Urdu literacy and literary production. Unlike Uttar Pradesh, literacy in and education through Urdu is better provided in Bihar. At least two reasons account for the better situation of Urdu. One is the relative absence of anti-Urdu prejudice among the ruling elite of Bihar as represented by the Congress and other parties. While anti-Urdu sentiments were not entirely absent, as exemplified by the violent anti-Urdu agitation of August 1967 in Ranchi, and burning of Urdu textbooks in 2008 in Saharsa,[56] their intensity does not compare to the deep-seated, rabidly anti-Urdu pronouncements of the Hindutva wing of the UP Congress and the BJS/BJP. Secondly, Bihar is more heterogeneous than Uttar Pradesh. Whereas the only significant linguistic minority in UP are the Urdu speakers, in Bihar the government has to contend with the demands of the Bengali and Maithili speakers as well. Until the formation of Jharkhand in 2000, Bihar also had to be sensitive to the demands of Oriya and tribal languages. The state of Bihar could ill-afford to antagonize the neighboring state government of West Bengal and Orissa by not providing instruction in Bengali and Oriya respectively. A close scrutiny of the statistics provided by the Commissioner of Linguistic Minorities from 1955 reveals that while Urdu is taught in various primary and secondary schools, and the situation is better than in UP, but nonetheless far from satisfactory.

The position of Urdu speaking population and Muslim population over the decades can be seen in the table noted below.

Through an Official Languages (Amendment) Act, the Bihar administration declared Urdu as the second official language in the state in 1980. Though the Act is not related to education, it still created a political environment conducive to the promotion of Urdu. Significantly, the Amendment took place during the tenure of chief

[56] "Thousands of Urdu Books Burn and Thrown in Gutters," *The Milli Gazette* (1-15 September 2008), p. 6.

minister Jagannath Mishra, a Maithili speaker. Bihar is one of the poorest states in India, often lawless, misgoverned and mismanaged. Facilities for instruction in Urdu have also suffered due largely to administrative inefficiency, though some instances of discriminatory attitude is also documented. In a document prepared in 1990, the state Anjuman-i Tarraqi-i Urdu lists a number of familiar issues: irregular payment of salaries to teachers, reduction of reservation of Urdu teachers from an agreed upon 10 percent to 6 percent in Training Colleges; lack of provision of Urdu instruction under the central schemes of New Education Policy, 1986; imposition of Sanskrit in schools through a manipulation of the Three Languages Formula; disregard for the implementation of policy to allow Urdu wherever wanted at primary level; appointment of insufficient number of Urdu teachers; and unavailability of Urdu text books in a number of subjects in time for classes.[57] A decade later, in 2000, Rizwan Ahmad repeats the same issues.[58] Muhammad Badiuzzaman, a retired additional district magistrate of Phulwari Sharif claims that, "there is no such post of an *Urdu teacher* in Bihar. In the immediate post-independence era, upon retirement or death of an Urdu teacher the post was abolished. Later on, in 95 percent of the cases, there never was a post of an Urdu teacher."[59] However, Lalu Prasad Yadav, claimed in 2000 when his wife Rabri Devi was the chief minister, that "when appointing 25,000 primary schools teachers, 10 percent were reserved for Urdu teachers, and the appointments were made. Two thousand teachers are being appointed for secondary schools."[60] Only an independent verification can get to the truth.

The Bihar State Textbook Committee with the help of SCERT prepares the textbooks and publishing is done by the Bihar State Textbooks Publishing Corporation established in 1966.

---

[57] "Bihar Newsletter: Problems Faced by the Urdu Speaking People," *Radiance* (2-8 July 1990), p. 8; "Urdu Academy Lax in Publishing Textbooks," *Radiance* (24-30 October 1993), p. 4; Jaafari Report, p. 82.

[58] Rizwan Ahmad, "Bihar main Urdu Taalim ki Surat-i Hal," *Urdu Duniya* (August 2000), pp. 21-22.

[59] Muhammad Badiuzzaman, "Bihar main Urdu ka Maujudah Manzar Namah," *Afkar-i Milli* (July 2000), pp. 130-131.

[60] Lalu Prasad Yadav, "Bihar main Urdu... ke Liye Sarkari Iqdamat," *Afkar-i Milli* (July 2000), p. 135, which comes from a speech he delivered to the Urdu editors' conference.

The Commissioner Linguistic Minorities data cited from Paul Brass's book shows that the percentage of Urdu students' enrollment to the total enrollment was a mere 4.11 percent in 1956-77, which fell to 2.06 in 1963-64. What is the percentage of Urdu enrollment at primary and secondary schools since 1964? Unfortunately, the relevant educational authorities in Bihar have not provided Commissioner of Linguistic Minorities relevant data for the years 1967-1972. Data is available for the year 1972-73 which notes that there are 30 secondary schools with 24395 students and 502 teachers. There is data about Urdu as subject students.[61] Then it is not available for the years 1973-85, as noted in the annual reports. [62] For the rest of 1980s, there is no data. According to Jaafari Report there were 5500 Urdu medium primary schools in 1989. For the 1990s, there is no data, not in the CLM Report July 2000-01 or subsequent ones. In the CLM Report July 2004-June 2005, the Commissioner blandly notes, "no statistics have been given regarding the schools either [where] minority language is a medium or is taught as a subject. Nor are there any details about the teachers or the students."[63] An exactly identical report—word by word—is given in the CLM Report for the subsequent, 2005-2006.[64] In a survey conducted in Kishanganj in 1991 to 1993, Aijazuddin Ahmad found that among "Muslims, the proportion of those who received education through the Urdu medium was as high as 84 percent."[65] However, according to a Bihar State Minorities Commission- sponsored study on the socio-economic status of Muslims, "the large majority of students are divided between Hindi (56.8 percent) and Urdu medium schools (40.3 percent). The proportion of rural Muslim students receiving Urdu medium education includes students both from Madarsas as well as from a number of private educational institutions. In the urban areas, however, only 18.7 percent of the students are found to receive Urdu-medium education…A large majority of urban Muslim students (71.2) go to Hindi medium institutions. English medium institutions, which are

[61] CLM Report, July 1974-June 1975, p. 253.

[62] CLM Report, July 1969-June 1970, p. 123; CLM Report, July 1972-June 1973, p. 220; CLM Report, July 1973-June 1974,p. 212; CLM Report July 1976-June 1977, p. 214; CLM Report, July 1982-June 1983, p. 353; CLM Report July 1983-June 1984, p. 451; CLM Report July 1984-June 1985, p. 388.

[63] CLM Report July 2004-June 2005, p. 140.

[64] CLM Report July 2005-June 2006, p. 97.

[65] Aijazuddin Ahmad, *Muslims in India: Their Educational... Survey*, 1, (New Delhi: Inter India Publications, 1993), p. 161

usually perceived as better ones account for only 10 percent of the urban Muslim students.[66] Although Bihar has the second largest number of students either studying through Urdu medium or studying it as a subject, yet it seems that a majority of Muslim children are not receiving their education in it.

Andhra Pradesh

Table I Urdu Speaking Population & Muslim Population in A.P.

Year	Percentage of Urdu Speakers to total population	Percentage of Muslims	Coefficient	Total Urdu Speakers in millions
1961	7.10	7.55		
1971	7.77	8.09		
1981		8.47	91	3.68
1991	8.37	8.9	93.9	5.56
2001	8.36	9.2		6.6

The Qutb Shahi sultanate of Golconda held sway over much of the Telugu speaking territories of southeastern India in medieval times, comprising much of modern Andhra Pradesh. In turn the Mughals and the Asaf Jahi rulers of Hyderabad controlled much of the same area, until 1750s, when the Nizam was compelled to cede the Ceded Districts (of Rayalaseema) and the Circars that is the Northern Sarkars or coastal Andhra. For the most part, the political formations of the time did not interfere in the learning of Telugu even when the language of higher levels of law courts and administration was Persian (up to 1884) and Urdu from 1884 to 1948. Under the Nizams, Urdu flourished as the language both of public instruction and state administration. The crowning achievement of the last Nizam was unquestionably the establishment of Osmania University, where Urdu was the language of

[66] *Socio-Economic Status of Muslims in Bihar*, (Patna: Asian Development Research Institute, 2005?), pp. 105-106. The Report has evidently gone missing, see, "Govt Report on Status of Bihar Muslims Goes Missing," The *Times of India*, (15 March 2006), p. 15.

instruction for three decades, 1918-1948. A large number of Urdu medium high schools were the base from which students entered Osmania for higher education. The Urdu phase in old Hyderabad state ended with the Indian army's bloody Operation Polo of September 1948. A number of government and private schools met the same fate as the new administration sought to remove Urdu from its preeminent status in the educational system.[67] But opposition to Urdu at the highest political level was minimal, and bears no comparison to the UP Congress leadership's open hostility to it. In fact, the chief minister of then Andhra state donated a thousand rupees, without solicitation when Jawaharlal Nehru inaugurated Urdu Hall in December 1955.[68]
However, the formation of Andhra Pradesh in 1956 changed the situation for Urdu. Ten years after the formation of the state, Andhra Pradesh declared Urdu as the second official language in 1966. Even though the second official language status is unrelated to the question of the medium of instruction in schools, Urdu's elevation as second official language signaled official acknowledgement that there is a significant community of Urdu speakers.
The position of Urdu speaking population and Muslim population over the decades can be seen in the table noted below.
Mawlawi Habiburrahman (1898-1991), the doyen of Urdu struggle in Andhra Pradesh for three decades, 1950s to 1980s, acknowledges that the political leadership of the Congress Party generally supported legislation seeking official status for Urdu with the sole exception of P.V. Narasimha Rao, (1921-2004) the then minister for Education in the state.[69] However, Rao seems to have been a loner, as the then cabinet of Chief Minister K. Brahmananda Reddy supported the move to make

[67] Sayyid Mustafa Kamal. *Hyderabad main Urdu ki Tarraqi: Taalimi aur Sarkari Zaban ki Haysiyat se*, (Hyderabad: Shugufa Publications, 1990); Ravinder Kaur & T. Vijayasri, "Development and Growth of Primary Education;" V. Elizabeth, "The Growth and Expansion of Secondary Education," unpublished papers presented at the Seminar on Management of Education in State of Hyderabad, Hyderabad: Department of Public Administration, Osmania University, December 1985.
[67] Habiburrahman, *Chand Yad Dashtain*, (Karachi: Bahadur Yar Jang Academy, 1986), identifies Phool Chand Gandhi, the then minister for education as the moving spirit behind Urdu's displacement as the language of instruction in many instances, see, pp. 78-79
[68] The chief minister of the then Andhra state was B. Gopala Reddy, 1907-1997.
[69] Habiburrahman, *Chand Yad Dashtain*, (Karachi: Bahadur Yar Jang Academy, 1986).

Urdu as a second official language. Narasimha Rao actually went a step forward, he instigated 24 Hindi, Kannada, and Marathi school administrators to go on strike on 26 Mach 1966 to protest what they called as the "privileged position," given to Urdu in the official language act. [70] However, thirty five years later, when the second official language status of Urdu was being extended to many more districts in the state in 2001, the vote in the AP Legislative Assembly was unanimous in approval. [71] In other words, the political leadership in Andhra Pradesh weather those of the Congress Party or the Telugu Desham, both secure in the predominant Telugu identity of the state, felt no problem in accommodating to the wishes of Urdu speaking minority for official status. Like other states, Andhra Pradesh is also bound by the constitutional rights and executive decisions governing instruction of minority languages in education from primary to secondary levels. However, there are numerous problems in implementation, which are mainly of administrative and financial nature. A series of memorandums that the Anjuman-i Tarraqi-i Urdu and other organizations submitted to the AP chief minister centers around demands for (a) donations asked by the authorities for parallel Urdu classes or higher levels in the same institution, a rule that was imposed in 1950s, abolished in 1963, and then re-imposed in 1973; (b) implementation of three language formula in a way that does not eliminate Urdu; (c) shortage of Urdu teachers in Urdu as a subject as well as for other courses; (d) lack of textbooks in Urdu and other subjects; and (e) lack of Urdu Inspector of Schools. [72]

Karnataka

Table 1 Urdu Speaking Population & Muslim Population in Karnataka

[70] As noted by Habiburrahman in *Chand Yad Dashtain,* op.cit., and reported in *Radiance* (10 April 1966).

[71] Omar Khalidi, op. cit.

[72] "Andhra Pradesh: Demands of Urdu-Speaking Minority," *Muslim India* (July 1985), p. 326."Memorandum to A.P. Education Minister," *Muslim India* (July 1985), p. 327; "Anjuman Tarraqi Urdu, Andhra Pradesh Memorandum of 8 February 1983 to the NTR Government," *Muslim India* (March 1984): pp 127-128; J.S. Iftekhar, "No Books for Intermediate Urdu Medium Students," *The Hindu* (9 August 2003), internet edition.

Year	Percentage of Urdu Speakers to total population	Percentage of Muslims	Coefficient	Total Urdu Speakers in millions
1961		9.87		
1971		10.63		
1981		11.05	85	2.64
1991		11.06	85.7	4.48
2001	9.96	12.2		5.5

Unlike the neighboring states of southern India, such as Kerala, Tamilnadu and Andhra Pradesh where the speakers of respective majority languages—Malayalam, Tamil and Telugu—feel secure in their own state territories, such is not the case with Kannada in Karnataka. At least two reasons account for the insecurity of Kannada speakers. One is that within the state, only 65 percent of the population speaks the state/official language, unlike the neighboring states where the percentage is often 80 percent or more. Although the princely state of Mysore was the core of the Kannada speaking population and promoted Kannada language and culture, nationalist historians saw the "rise and fall," of Kannada in starkly anti-Muslim terms. In nationalistic terms, thus, the battle of Talikota in 1565 resulting in the defeat of Vijayanagar kingdom at the hands of the Deccani Muslim sultanates was the "end of Karnataka's glory," and the early twentieth century was the time for "the recovery of past glories."[73] When the states were reorganized in 1956, Kannada-majority districts in neighboring Bombay and Hyderabad merged with Mysore to form Karnataka as it stands today. Kannada became the state's official language in 1963. But insecurity about Kannada's status persists manifesting in various ways, sometimes in violence. For examples, when Doordarshan, the national television's Bangalore station began to broadcast a *10-minute* Urdu news bulletin on 2 October 1994, violence broke out in the state capital,

[73] Janaki Nair, "Memories of Underdevelopment: Language and its Identities in Contemporary Karnataka," *Economic and Political Weekly* (12-19 October 1996), p. 2813.

killing 25 people.[74] The man leading the anti-Urdu campaign was the BJP leader B.S. Yediyurappa who called introduction of Urdu broadcasts as a threat to Kannada.[75] He became the chief minister of Karnataka in May 2008. Even though the news bulletin was being introduced as part of the Gujral Committee's recommendations, the union government at the time headed by an anti-Urdu Prime Minister P.V. Narasimha Rao chose not to continue with the broadcast, and hastily recalled Bangalore Doordarshan director Aneesul Haq. What was disturbing in the anti-Urdu campaign was, in the words of a journalist, "the active participation of the literary community and such institutions as Kannada Sahitya Parishad. Just how the introduction of a 10-minute Urdu bulletin can injure the interests of the Kannada language is beyond sane comprehension."[76] Urdu alone is the not the victim of Kannada chauvinism.[77] Anti-Hindi and anti-Tamil expressions, often violent, are common.[78] But despite hundreds of government orders for its promotion, Kannada has not made the headway, mainly due to competition with English, not with Urdu, Tamil, Telugu, Tulu or Marathi, the main minority languages.

There is a long history of Urdu medium from the nineteenth century to the 1950s as documented through state reports by Habibunnisa Waliullah.[79] The position of Urdu speaking population and Muslim population over the decades can be seen in the table noted below.

Up to 1980, the state government's attitude toward mother tongue as the language of instruction at primary level was fair, but the following year, it changed.[80] A state-appointed commission headed by V.K. Gokak in 1981 sought primacy for Kannada education at secondary level education in violation of the constitutional right of the minorities. But

---

[74] S. Rai, "Mind Your Language: An Urdu News Bulletin on Bangalore Doordarshan Sparks off Riots," *India Today* (11 October 1994), p. 14.

[75] S. Rai, op. cit, p. 13.

[76] "Inevitable Distortion," *Economic and Political Weekly* (15 October 1994), p. 2704.

[77] K.s. Dakshina Murthy, "Rajkumar and Kannada Nationalism," *Economic and Political Weekly* (13 May 2006), pp. 1834-1835, for the role of actor Rajkumar in fanning the flames of chauvinism.

[78] Stephen David, "Hate Thy Neighbor: Kannada Belligerence..." *India Today* (23 April 2007), p. 7.

[79] Habibunnisa Begum Waliullah, *Riyasat-i Mysore main Urdu ki Nashw wa Numa,* (Mysore, 1962), pp. 385-425.

[80] AbdulWahhab Anadalib, "Karnatak main Urdu ki Ibtidayi Taalim," *Urdu Duniya* (November 2001), pp. 15-116.

in early 2001, the state government accepted the recommendation of a high-level committee headed by the then education minister H. Vishwanath that mother tongue should be the medium of instruction from class I to VII.[81]
Geographically, within the state, most of the Urdu-medium primary and secondary schools or schools teaching Urdu as a subject are found in the Bombay Karnatak and Hyderabad Karnatak regions. Urdu schools in Bombay Karnatak is the legacy of multilingualism education followed in the multi-lingual Bombay province, and in Hyderabad Karnatak, it is the legacy of the Nizam's rule. Contrary to conventional wisdom (stereotype?), attachment to Urdu is not confined to urban areas. It is widespread in rural Karnataka as Professor Mumtaz Ali Khan's study found.[82] In Msyore city, a study shows that there is support for Urdu medium instruction at primary level, less so at the secondary stage.[83] Thus it is not surprising that the region comprising the old Mysore region lags behind the rest of the state in Urdu education, with the exception of Shimoga, where there has been a notable success through private nursery schools.[84] A similar report comes from the historic town of Bidar, where the Shaheen School established in 1991 "has been producing 100 percent success at the SSLC exams for the last five years.[85] A startling discovery is the number of Scheduled Caste and Tribes students learning Urdu in Bidar, through Social Welfare schools. The issues that face literacy in and education through Urdu in Karnataka are somewhat similar to those in other states, namely the violation of letter and spirit of the three language formula, the lack of teachers, textbooks and infrastructure. In 2005, for instance, according to the President of Karnataka State Urdu Teachers' Association, the state did not extend the satellite-based distance education system called EDUSAT to Urdu medium schools…and that there are no Urdu *anganwadis* (neighborhood

[81] "Mother Tongue Medium up to Class VII," *Deccan Herald* (4 June 2001), internet edition.
[82] Mumtaz Ali Khan, *Muslims in the Process of Rural Development in India: A Study of Karnataka*, (New Delhi: Uppal, 1984). Sociologist Mumtaz Ali Khan, who joined the BJP in 2004, became a minister in 2008.
[83] Hans R. Dua, *Language Use, Attitudes and Identity among Linguistic Minorities: A Case Study of Dakkhini Urdu Speakers in Mysore*, (Mysore: Central Institute of Indian Languages, 1985), pp. 33-40.
[84] "Shimoga Shows the Way," *Islamic Voice* (November 2000), online edition.
[85] "Bidar School Shows the Way Forward," *Islamic Voice* (July 2007) internet edition.

schools) among the 45,000 such schools.[86] According to Maqbool Siraj 'S findings, "1146 Urdu primary schools do not have water facility; 1162 do not have toilets; 1288 lack compound walls; 1265 without electricity; 1714 schools without buildings of their own, and 2000 Urdu-speaking villages or habitations do not have Urdu primary schools within one kilometers."[87]

The textbooks in Karnataka are prepared by State Textbooks Committee and published by Government Textbook Press in Mysore, though it is not clear what role the Press plays in publishing Urdu texts. The State Minorities Commission noted that the "supply of textbooks is not made in time. The Director of Text Books D.E.S.E.R.T. should walk watch the supply of textbooks of all categories including Urdu."[88] The following table shows the enrollment in Urdu medium schools in Karnataka.

Maharashtra

Table I Urdu Speaking Population & Muslim Population in Maharashtra

Year	Percentage of Urdu Speakers to total population	Percentage of Muslims	Coefficient	Total Urdu Speakers in millions
1961		7.67		
1971		8.40		
1981		9.25	87	
1991		9.7	75.2	
2001	7.81	10.6		6.9

Until 1960, the Bombay state comprised both the present state of Gujarat and Maharashtra. Given that the state as a whole was multi-lingual also meant the general acceptance of the notion of multilingualism in education. Within the state, Bombay was the state capital and the icon of modern India, as the most cosmopolitan city in

[86] "Urdu Education Neglected in Karnataka," *Radiance* (18-24 December 2005), p. 33.
[87] Email from Maqbool Ahmed Siraj, 6 June 2010, based on research in 2006. Karnataka State Minorities Commission expresses an identical complaint, except that it also notes similar conditions in other schools than Urdu medium, see *Minorities in Karnataka: Vision 2025,* (Bangalore: Minorities Commission, 2005), p. 8.
[88] *Minorities in Karnataka: Vision 2025,* (Bangalore: Minorities Commission, 2005), p.12.

the nation. The cosmopolitan character of Bombay has significant implications for the question of language choice in primary through higher secondary education. In addition to the numerous caste and community schools established and sustained by voluntary organizations, the municipal authorities are involved in the education of various language groups resident in the city: Gujaratis, Hindi speakers, Kannada, Marathi, Sindhi, Telugu, and Urdu, to name the most obvious since the nineteenth century. The advent of independence, linguistic reorganization of 1950s, bifurcation of the composite state in 1960, the rise of Hindu/Marathi chauvinist Shiva Sena since 1966, none could change the basic structure of primary through secondary education in the state as far as the language question is concerned. Like other states, Maharashtra also follows the fundamental principal of primary education through mother tongue and inclusion of mother tongue in the secondary education as a subject, if the language does not happen to be the medium of instruction.

The position of Urdu speaking population and Muslim population over the decades can be seen in the table noted below.

The state is divided into several regions, each with its own distinct recent and distant past, and each with differing legacies of association with Urdu. Until 1956, the eastern region of Marathwada was a part of the old Hyderabad state, where Urdu was the language of instruction in many urban areas. The region called Vidarbha known until 1950s as Berar was also a part of the Hyderabad state until 1853, and nominally thereafter until independence. It also inherited a legacy of Urdu schools among Muslims. Similar is the case with the former region called Central Provinces with the capital in Nagpur.[89] Urdu has made inroads in the coastal belt of Konkan, and communities hitherto speaking Gujarati. Since the late nineteenth century, Konkani Muslims, Memons, and the tiny sect of Sulaymani Bohras, both speakers of various Gujarati dialects, have adopted Urdu as the language of primary education, formal communication, and religious discourse.[90] In the Desh region too, Muslims now increasingly use Urdu as the medium of

---

[89] Muhammad Sharaf al-Din Sahil, *Nagpur ka Muslim Maashirah*. 3 vols.(Nagpur: Aleem Printers, 200)

[90] Omar Khalidi, *Muslims in the Deccan: A Historical Survey*. (New Delhi: Global Media, 2006).

primary school instruction.[91] Unlike many parts of India, where Muslims have not established their own schools, Bombay and Pune are exemplary in community's voluntary effort in establishing and sustaining schools. Anjuman-i Islam, established in 1874, is the premier organization, with a string of schools and institutions spread over the state. A similar organization, started in 1927, is Anjuman-i Khairul Islam with its own schools imparting Urdu. Twenty years later, in 1947, Haji Ghulam Muhammad Azam, a Gujarati Muslim, donated land to build an educational institution in Pune. By the dawn of the twenty first century, the land is now the site of a host of institutions run by a Trust.[92] Together with the Kokan Muslim Education Society, (established in 1928 in Bhiwandi, barely 15 miles northwest of Mumbai) the schools run by these voluntary organization have clearly contributed to the rapid Urduization of the disparate groups of Muslims through literacy in standard Urdu. According to Malik Tase, prior to the founding of Kokan Muslim Education Society's first school, "a very large chunk of Muslim population had nothing like a language. Their only vehicle of communication was a dialect that did not function as a language. The school gave them a language (Urdu) which has become the mother tongue of the entire post-1930 generations and Bhiwandi has now become a recognized center of Urdu."[93] Tase's assertion finds corroboration in Nashtar's work on education in Konkan region.[94] There is even an unprecedented Tanzim-i Walidayn-i Urdu Madaris, a parents association of children in Urdu schools. Established in 1991 in Pune, the purpose of the Tanzim is to run Urdu schools to promote education in all groups, as indicated in its annual reports.[95] While a systematic quality assessment of Urdu literacy is lacking, journalistic writings certainly present a positive picture as exemplified by the writings of

---

[91] Veronique Benei, *Schooling Passions: Nation, History and Language in Western India*, (Stanford, CA: Stanford University Press, 2008), see chapter V, From Becoming to Being Muslim: Urdu Education, Affects of Belonging and the Indian Nation, pp. 175-207.

[92] Jyoti Punwani, "Changing Face of Pune Schools," *The Hindu* (18 March 2003), internet edition.

[93] Malik Tase, "Kokan Muslim Education Society, Bhiwandi," *The Milli Gazette* (16-30 September 2006), p. 13.

[94] Abd al-Rahim Nashtar, *Kokan main Urdu Taalim*, (Nairobi: Urdu Writers Guild, 1996).

[95] Tanzim-i Walidayn-i Urdu Madaris, *15th Annual Report*, Pune, 2006, p. 2.

Hanif Mohammed,[96] Anis Chishti[97], and Muhammad Hasan Faruqi.[98] Jawid and Unaiza Parekh, parents of one student even did a SWOT (Strengths, Weakness, Opportunities, and Threats) Analysis to determine the consequences of Urdu medium education for their child. It became evident that most of the merit students in Maharashtra came from schools teaching through Indian languages. That test resulted in a positive decision in favor of an Urdu school.[99] At least two Urdu medium students—Tanwir Maniar in 1997 and Bilal Iqbal Mistri in 1999-- have topped Maharashtra Secondary School Certificate examinations. According to a press report, in Mumbai "apart from English, now Urdu and Hindi appear to be the favored medium of instruction, the capital of a Marathi-speaking state."[100] However, some school administrators have noted cases of discriminatory practices against Urdu institutions on a number of occasions.[101]

Urdu Literacy: State Report Cards, 2004-2008

The State Report Cards (SRCs) is a database of statistics on elementary education, i.e. primary through secondary schools received from all states and union territories of India. Among other datasets, the SRCs provide data on examination results, teachers, mediums of instruction, among other parameters on which information is not available in other sources. Extracting data on medium of instruction, this Report presents statistics on Urdu enrollment in 6 states over four years, 2004-2008. The tables noted below are arranged in order of largest number of students in each state, thus Maharashtra tops the list and UP is at the bottom.

---

[96] M.H. Lakdawala, "Urdu Medium School Give Tough Competition to Christian Missionary Schools," *The Milli Gazette* (1-15 October 2003), p. 7; the same writer, "Urdu Medium Schools Luring New Converts," *Radiance* (4-10 April 2004), pp. 18-19;

[97] Anis Chishti, "Maharashtra main Urdu Zariya-i Taalim ki Kam Yabi," *Urdu Duniya* (October-December 1999): 35-37;

[98] Muhammad Hasan Faruqi," Maharashtra main Urdu Taalim," *Urdu Duniya* (March 2006): 15-19.

[99] M.H. Lakdawala, "Urdu Medium Schools Luring New Converts," *Radiance* (4-10 April 2004), pp. 18-19.

[100] Mahesh Vijapurkar," Declining Enrollment for Marathi Medium," *The Hindu* (12 May 2004) electronic edition.

[101] Fatima Anis, *Maharashtra ke Taalimi Masail aur Urdu Schools*, (Bombay, 1982).

CBSE Exams and Urdu Literacy

Central Board of Secondary School Education, CBSE is a national organization with a history dating back to 1921. Its purposes are

To prescribe conditions of examinations and conduct public examination at the end of Class X and XII. To grant qualifying certificates to successful candidates of the affiliated schools.

To fulfill the educational requirements of those students whose parents were employed in transferable jobs.

The results of students who appeared through Urdu medium for CBSE exam for the year 2005 [?] as cited in Sachar Report (page 82, Fig. 4.29) show that performance in CBSE examination is poor. A report compiled by M. Hanif Lakdawala shows that in 2007, the "All India Urdu result in class 10 stands at 50 percent while the non-Urdu result is 78 percent. In class 12, the overall non-Urdu result is 85 percent while in Urdu it is 66 percent. Last year [2006], it was 57 percent and in 2005 it was 35 percent…this is the best Urdu result in two decades."[102] The Delhi schools in the past did poorly. But evidently there is a marked improvement, as the 2010 result shows. The pass result has shot up to nearly 90 percent, compared to a sorry 31 percent a decade ago.[103] The Urdu Model Schools located in Vatepalli, Hyderabad, Darbhanga, Bihar, and Mewat, Hyderabad successfully completed first year of education based on CBSE syllabus. The results, according to a report in *Etemad* have been encouraging.[104]

Role of Madarsas in Urdu Literacy

Madarsas have a long and distinguished history in India. They have existed since the early days of Islam in the subcontinent. While the histories of major institutions such as Deoband, Nadwat al-Ulama and others are available, there are no reliable statistics of for madarsa students and teachers in the past to measure their extent, geographic

---

[102] M. Hanif Lakdawala, "Urdu Schools: Much Distance to Travel," *Islamic Voice* (July 2007), internet edition.

[103] "Delhi CBSE Results: At 89.12 Percent Urdu Schools Race Ahead," Ummid.com 23 May 2010, http://www.ummid.com/news/2010/May/23.05.2010/delhi_cbse_results_urdu_schools.htm

[104] "Pahle Urdu Model School ki Kamyab Takmil," *Etemad* (28 June 2010) internet edition.

location and influence.[105] For more recent times, there are some statistics. The Hamdard Education Society in New Delhi conducted a survey of 576 madarsas between 1989 to 1991. It reveals an expansion of madarsas from 1, 06, 678 in 1989 to 1, 47, 011 two years later.[106] Citing unnamed, undated surveys conducted by National Council of Applied Economic Research (NCEAR) and National Council for Educational Research and Training (NCERT), the Sachar Report claims "that only about 4% of all Muslim students of the school going age group are enrolled in the Madrasas. At the all-India level this works to be about 3% of all Muslim children of school going age. The NCAER data is supported by estimates made from school level NCERT (provisional) data; which indicates a somewhat lower level of 2.3 % of Muslim children aged 71-9 years who study in Madrasas. The proportions are higher in rural areas and amongst males."[107] According to India Human Development Survey data of 2005, enrollment figures in Madarsas are only about one percent of the overall population. This calculates to about 5% of the Muslim children.[108]

Regardless of exact numbers, the madrasas play a major part in Urdu literacy. The language of instruction in most madarsas has been Urdu in most states of India. In some madarsas of Kerala, Tamilnadu and West Bengal, the language of instruction is naturally Malayalam, Tamil, and Bengali respectively.[109] But these are exceptions; the rule still is that

---

[105] Statistics for enrollment at Deoband and Nadwa from 1945-71 in Mushirul Haq, "Religious Education," pp. 22-42, in his *Islam in Secular India,* (Simla: Indian Institute of Advanced Studies, 1971); and more recent research in *Islamic Education: Diversity and National Identity, Dini Madaris in India Post-9/11,* edited by Jan-Peter Hartmut and Helmut Reifeld, (New Delhi: Sage, 2006).

[106] Qamaruddin, *Hindustan ki Dini Darsgahen.* (New Delhi: Hamdard Education Society, 1996), as cited in Qamaruddin, "Status of Madrasa Education in India," *Radiance* (10-16 August 1997), pp. 33-34.

[107] *Social Economic and Educational Status of the Muslim Community of India,* (New Delhi: Prime Minister's High Level Committee, Government of India, 2006), pp. 75-77, citation on p. 77.
http://minorityaffairs.gov.in/newsite/sachar/sachar.asp

[108] http://www.ihds.umd.edu/
Accessed 30 June 2010. I am indebted to Prof. Solande Desai for this reference.

[109] B.M. Idinabba, from the Beary ethnic group of Muslims in Karnataka made what must be characterized as a highly eccentric statement calling upon Madarsas in his native state to adopt Kannada instead of Urdu, see Jaideep Shenoy, "Idinabbad Keen on Madarsas Adpopting Kannada," *The Hindu* 7 March 2005, internet edition;

Urdu is the language of instruction in madarsas. It is not the purpose of madarsas to specifically promote Urdu, but given that literature on Islam in it is unrivalled by any Indian language, Urdu is the natural choice as the medium of madarsa education. The curriculum, content, "relevance," and standard of education at the madarsas, is irrelevant to the purposes of this Report, which is to gauge the status of literacy in and education through Urdu. How many madarsas there are in the country? The Union Ministry of Human Resources Development estimates the nationwide total as around 27, 500, according to a 2006 press report, though it does not tally with other figures attributed to it.[110] The following table gives both HRD and other estimate of number of madarsas.
Source: Regulatory Mechanisms for Textbook and Parallel Textbooks Taught in Schools outside the Government System: A Report, by Committee of the Central Advisory Board of Education, Ministry of HRD, 2005, p. 39.
How many students are there in the madarsas? The Sachar Committee's estimate is 4 percent of the total Muslim student enrollment. This is still a sizeable number.

Beyond Formal Schools and Madarsas: the NGOs

Besides the madarsas, there are a number of other institutions involved in imparting preschool and elementary education through Urdu. The most recent example is that of Pratham, which means beginning or start in Sanskrit. Pratham is the largest non -governmental organization working to provide quality education to the underprivileged children of India. Pratham was established in 1994. See its website
http://www.pratham.org/
Basing on the widely accepted estimate that nearly 90 percent of all Indian students receive primary education through mother tongue, Pratham started a program of preprimary education run in the poorest *bastis,* or slums run by teachers—mostly female—coming from the same community as the students.[111] Pratham runs several specific

---

"Kannada Camps in Madarsas and Mosques," *The Hindu* (12 June 2010), internet edition.
[110] "Number of Madarsas in the Country," *The Milli Gazette* (16-31 March 2006), p.20.
[111] See MIT's Jameel Poverty Action Lab Policy Brief, no 2 on Pratham at

programs: The first is Balwadi, literally meaning "baby sitting," but which provides preschool education to children from ages 3 to 5 years. The Balwadi classes build the social, emotional, motor and cognitive skills of the children, thereby preparing them to adjust to the school atmosphere. This also helps the problem of retention and achievement at a nascent age. Since most parents in slums are illiterate and unable to help their children, the Balwadis are a big help. The second program Balvachan, "child's promise," is for pupils from ages 5 to 6, is designed for children who are attending Balwadis and Anganwadis. It seeks to build their language and math skills to quip them to enter schools. Working children pose a barrier to Pratham 's mission of "every child in school and learning well." To end this barrier, the Pratham set up a number of residential schools to teach children who have been rescued from work. Through Residential Bridge Course the children are mainstreamed into schools. Non Residential Bridge Course Centers is another program meant for children between the ages 3-14 years. The centers are established to target the dropout and the children who have never been to schools. The Centers are run in partnership with Sarva Shiksha Abhyan, (SSA) "education for all," a state-run initiative. Mother Literacy Program of Pratham aims at imparting literacy skills to females of age 15 and up. This program helps make the students literate with basic math and imparts self-confidence in them to assume active role in the education of children of their families. There is also a Pratham 's pilot program of 30 madarsas in Hyderabad in partnership with SSA. Finally, the Pratham has School-Community Linkage Program in partnership with SSA, whose main goals are to make students identify alphabet and numbers; proficiency in reading fluently; writing paragraphs; and to do arithmetic appropriate to their respective standards. The parents will be involved in improvement of learning quality, to mainstream children to schools, to increase attendance rate and retention of children, and to activate libraries.

It has began an Urdu literacy program as well, as documented on its Urdu report website,

http://www.prathamap.org/Urdu%20Report.html

Pratham has produced some quality storybooks inaugurated in 2009 by Vice President Hamid Ansari, see

---

http://www.povertyactionlab.org/evaluation/teaching-pre-schoolers-read-randomized-evaluation-pratham-shishuvachan-program-india
Accessed on July 20 2010

http://www.indiaeducationdiary.in/showCD.asp?newsid=1821

The Maktabs, as distinct from madarsas, for instance, merit study. One example is found in Jamilur Rahman's thesis on Delhi maktabs.[112] The Deeni Taleemi Council of Uttar Pradesh (DTC) is another such institution. Began in 1959 under the leadership of Mawlana Abulhasan Ali Nadwi (1913-1999) and Qazi Adil Abbasi (1898-1980), among the functions of the DTC is to "popularize Urdu as the medium of instruction in schools."[113] By late 1970s, Abbasi claimed that there were "about nine thousand primary maktabs," spread over "46 districts," with "a total student population of about 5 lakhs."[114] The DTC "prepared and published the textbooks," for the students.[115] In 1998, the DTC Superintendent H.U. Azmi estimated "20,000 independent and self-supporting maktabs (primary schools) all over the state," of UP.[116] Ten years since Azmi's statement, a much lower figure has been given by a DTC official, "almost 12,000 maktabs," according to Masudulhasan Usmani.[117] Mostly recently, there are a mere 1000 maktabs in the state. The students obtain basic education through Urdu in science, math, Hindi, and Islamic studies. At the fifth grade, the students go through an entrance exam. If the students pass, they can then enter either government schools or go to the higher grades of madarsa education.[118] Some 10, 000 students are enrolled in 2010 in the maktabs.[119]

Jamia Urdu is an examination body formed as Bazm-i Iqbal in Agra in 1939. It changed the name to Jamia and moved to Aligarh in 1949. The Jamia's purposes, among others are, "to promote Urdu as mother

---

[112] Jameelur Rahman, *A Study of the Role of the Maktabs in the Total Literacy Campaign in the Muslim Areas of Walled City of Delhi*, M.Ed dissertation, Dept. of Education, Jamia Millia Islamia, 1995).

[113] H.U. Azmi, "Contribution of Deeni Taleemi Council to Muslims' Education in Uttar Pradesh," p. 149, in *Education and Muslims in India Since Independence*, edited by A.W.B. Qadri, (New Delhi: Institute of Objective Studies, 1998), pp. 147-150. Azmi was the superintendent of DTC in 1998.

[114] Qazi Mohammad Adil Abbasi, *Aspects of Politics and Society: Memoirs of a Veteran Congressman*, (New Delhi: Marwah, 1981), p. 161.

[115] Qazi Mohammad Adil Abbasi, *Aspects of Politics and Society: Memoirs of a Veteran Congressman*, (New Delhi: Marwah, 1981), p. 163.

[116] Azmi, op. citi. 148.

[117] Omair Anas, "Deeni Taleemi Council," *Radiance* (30 October-5 November 2005): 82-85.

[118] Interview with Dr. Masudulhasan Usmani over the phone May 23, 2010.

[119] Interview with Dr. Masudulhasan Usman over the phone May 23, 2010.

tongue," and "to establish examination centers."[120] Correspondence course and long distance learning is also among the purposes of the Jamia, though not accomplished. The name *Jamia* Urdu is inaccurate. In Urdu, *jamia* means university. Jamia Urdu is not a university. It is an examination body, pure and simple. The Jamia provided an opportunity for a large number of indigent students who could not afford the cost of formal education to obtain certificates of various levels based on home learning. The number of candidates appearing for the Jamia's examinations shows an impressive increase from 1949 to 1989 in various states.[121] The Jamia established its own curriculum and a book depot for distribution of textbooks. It owns a purpose-built building and paid staff—numbering 135 in Aligarh in June 2010. The Jamia's brochure available in June 2010 informs that its examinations (therefore its certificates) are recognized by 16 universities, 4 boards/directorates of education in 3 states as well as three governments. Annually, it holds five examinations, namely Ibtidai, Adib, Adib-i Mahir (first and second years); Adib-i Kamil, and Muallim-i Urdu (first and second years). Muallim-i Urdu certificate holders are able to qualify for Basic Training Certificate, (BTC) enabling them to obtain jobs in primary schools in UP.

At the close of the twentieth century, the Jamia was at the threshold for further progress, but those at the helm of its affairs took a different course. According to journalist Ubaidur Rahman, "Jamia, where around 1.4 lakh students appeared in different examinations in 1998, has seen a steady decline ever since. Only 64 thousand students appeared in different examinations in 1999 and the strength declined further to a meager 35 thousand last year."[122] Evidently the then registrar of Jamia Anwar Saeed, (d. 2009) was responsible for a major embezzlement, as "all the money in different accounts of the Jamia has been emptied, rather stolen. Its Rs 15 million deposit with Steel Authority of India (SAIL) has been withdrawn and squandered

[120] *Tarikh-i Jamia Urdu: Bayadgar-i Jashn-i Zarrin*, edited by Masud Husain et al, (Aligarh, 1990), p. 84.
[121] *Tarikh-i Jamia Urdu: Bayadgar-i Jashn-i Zarrin*, op. cit, pp, 134,192-93.
[122] Ubaidur Rahman, "Jamia Urdu Thrown to the Wolves," *The Milli Gazette* 01/08/2001, posted on
http://www.milligazette.com/Archives/01082001/07.htm
Accessed on June 8, 2010.

away."[123] A new registrar Saba Khan took over the job in 2005.[124] Since then she and the Officer on Special Duty, OSD Farhat Ali Khan have steadily worked for restoring Jamia to its earlier role, and advance its mission. Thus in 2009 as many as 70,000 candidates appeared for the five exams it held. While the numbers dipped to 68,000 in 2010 for various reasons beyond the control of Jamia, OSD Farhat Ali Khan estimates that a 100, 000 candidates will appear for exams in 2011. In the 2010 exams, 10,000 belonged to the Muallim-i Urdu category who are likely to get jobs as teachers in UP. [125]

The Jamia Millia Islamia's Center for Distance and Open Learning runs an Urdu correspondence course through English and Hindi since 1970, as gleaned from its website

http://www.jmi.ac.in/cdol/ucc.syllabus.htm

The present writer was unable to obtain any statistics showing the performance of this course over the years.

In Andhra Pradesh, there are two examples of efforts to teach Urdu outside the formal, state-funded school system. One is run by the Anjuman-i Tarraqi-i Urdu. The summer school began in 1975. Consisting of six weeks of classes in which students ranging in age from 6 to 22 take part, the summer school is designed for those who want to learn basic Urdu. Each year about 150 pupils enroll, according to Ghulam Yazdani.[126]

The daily *Siyasat*, a family-run newspaper launched a basic Urdu literacy program in June 1994, under one of its unit, the Abid Ali Khan Educational Trust. It devised three basic, progressive levels for learning to read and write basic Urdu. They are called Urdu Dani, Urdu Zaban Dani, and Urdu Insha. The first two levels concentrate on reading, the third on writing. The Trust supplies the Urdu primers, pencils,

---

[123] Ubaidur Rahman, "Jamia Urdu Thrown to the Wolves," *The Milli Gazette* 01/08/2001, posted on
http://www.milligazette.com/Archives/01082001/07.htm
Accessed on June 8, 2010.

[124] "Saba Khan New Registrar of Jamia," *The Milli Gazette* (1-15 April 2005) **posted on**
http://www.milligazette.com/Archives/2005/01-15Apr05-Print-Edition/011504200555.htm

[125] Interview with Farhat Ali Khan, Aligarh June 10, 2010.

[126] Conversation with Ghulam Yazdani of Anjuman-i Tarraqi-yi Urdu, AP, June 6, 2010.

notebooks and the blackboards. Each course is programmed for six months, weekly duration consisting of one hour per day of teacher/learner interaction. The students are both adults and children. The literacy program is very popular among women as documented by UNESCO.[127] By 2010, over a million students had gone through the program. The Abid Ali Khan Trust's Urdu literacy program has spread beyond Andhra Pradesh to a number of other states. In 2010, the newspaper claimed that 13, 580 students took part in the examination for three diplomas of Urdu Dani, Zaban Dani and Urdu Insha.[128] Idarah-i Adabiyat-i Urdu is the examination body for Siyasat's literacy program. The decadal figures for Urdu literacy program of the Abid Ali Khan Trust can be seen from the following Table.

Distinct from the Abid Ali Khan Trust's exams are another set of examinations conducted by the Idarah-i Adabiyat-i Urdu, an organization for the promotion of Urdu established in 1938. Besides a possessing an important library, a museum, and a collection of archival materials, the Idarah is active in advancing Urdu literacy. To this end it conducts three progressive levels-- Urdu Fazil, Alim and Mahir-- of examination leading to award of diplomas. The following table shows the statistics of the three exams conducted by the Idarah from 2000-2009.

Year	Appeared	Passed	Appeared	Passed	Appeared	Passed	Total	Total
	Urdu Fazil		Urdu Alim		Urdu Mahir		Appeared	Passed
2000	3460	2091	1486	1086	544	441	5490	3618
2001	3900	2371	2167	1650	616	499	6683	4520
2002	6430	2605	3706	2193	626	393	10762	5191
2003	7448	2847	3631	2163	342	231	11421	5241
2004	7025	2779	2739	1487	227	135	9991	4401
2005	4595	2447	1933	1382	155	110	6683	3939

[127] *Education Initiative for Women by The Siyasat Daily*, Paris: Unesco, 2006. available on http://unesdoc.unesco.org/Ulis/cgi-bin/ulis.pl?catno=147090&set=4B16362B_2_73&database=ged&gp=0&mode=e&lin=1&ll=f

[128] *Siyasat*, online edition 31 January 2010, internet edition.

2006	1781	1251	1048	827	107	83	2936	2161
2007	2130	1678	1220	1021	96	81	3446	2780
2008	1824	1404	1204	1075	46	42	3074	2521
2009	1705	1263	991	886	46	35	2742	2184

In 1999, the AP Board of Intermediate Education recognized the Fazil course as equivalent to Intermediate in Humanities for all those students who studied English as one of the subjects. However, the BIE derecognized the Fazil degree in 2004.[129] Despite recognition by several universities, the decision of the BIE put thousands of students in uncertain conditions, as many were appearing for District Selection Committee (DSC) exams, upon passing which they would have qualified to obtain jobs as School Assistants in secondary schools and as Secondary Grade Teachers, SGT. The Idarah is working to get the recognition restored in order to ensure students' continued interest in the diplomas. The Hyderabad-based Foundation for Educational and Economic Development, FEED, established in 1993, runs 57 Urdu medium schools across Telangana, according to its 2010 report.[130]

Beyond Formal Education: State-Funded Institutions

The union government established a well-funded central organization called Tarraqi Urdu Board in 1969 funded by the Ministry of Education. The union government reconstituted the Board as the National Council for the Promotion for Urdu Language, NCPUL in 1996 under the Ministry of Human Resource Development. The foundation stone for a dedicated office building for the Council was laid on 27 March 2010 in Jamia Nagar's Okhla Vihar area in New Delhi. It runs a scheme for the

[129] J.S. Iftekhar, "DSC-2003: Urdu Fazil Students in Quandary," *The Hindu* (26 February 2004), internet edition, idem, "DSC Notification Baffles Urdu Medium Students," *The Hindu* (7 December 2003), internet edition; and "DSC Candidates in a Fix," *The Hindu* (2 July 2006) internet edition.
[130] Report on http://www.feed-hyd.org/aboutus1.htm
Accessed January 11 2010; according to the Foundation newsletter, there were 9, 350 students in its 57 schools, while its only 5 English medium schools enrolled , 2660 students located in Adilabad, Mahboobnagar, Medak, Nizamabad and Rangareddy district, see *FEED Newsletter* 4 (2009-2010), p. 4.

establishment of Urdu study centers to run one year diploma course.[131] What have been the successes, lessons or failures of this scheme? It is yet to be disclosed, though Vice-Chairman of NCPUL Chandrabhan Khayal claimed that "there were around 350 centers to teach Urdu till a few years ago. Now [in 2010] we have 662 centers around the country…Each center has at least 30 or more students."[132]

However, allegations of fraudulent schemes in the NCPUL led to the arrest of its director Hamidullah Bhatt in 2005.[133] But, using his clout with Kashmiri members of parliament, Bhatt managed to come back to the same post in April 2009, despite demand for his removal by academics, activists, and scores of parliamentarians cutting across party lines.[134] Bhatt eulogized Urdu-hating BJP's union minister for Human Resource Development during 1999-2004 and initiated schemes clearly injurious to Urdu.[135]

In 2006, the Ministry of Human Resource Development established three centers professional development of Urdu teachers at Maulana Azad National Urdu University in Hyderabad, which is called Center for Professional Development of Urdu Teachers, see its website
http://www.manuu.ac.in/cpdumt.html
And at Jamia Millia Islamia, it is called Academy of Professional Development of Urdu Medium Teachers
http://www.jmi.ac.in/apdumt/majorareas_apdumt.htm
and at Aligarh Muslim University in Aligarh it is called Urdu Academy, see
http://www.amu.ac.in/uacademy.htm

---

[131] http://www.urducouncil.nic.in/
Accessed on May 10 2010.

[132] Mohammed Wajihuddin and Anahita Mukherji, "Urdu and Sanskrit Hold Fort," *The Times of India* (27 March 2010) internet edition.

[133] Athar Farouqui, "The Great Urdu Fraud," *The Milli Gazette* (1-15 May 2005), inter edition; "CPUL's Hamidullah Bhatt in CBI Net," *The Milli Gazette* (16-31 October 2005), p. 20; Andalib Akhtar, "Committee to Probe Activities of Urdu Council," *The Milli Gazette* (1-15 August 2005), p. 17; "NCPUL and Hamidullah Bhatt: Fall of the Invincible," *The Milli Gazette* (1-15 November 2005), pp. 16-17.

[134] Anita Joshua, "MPs Demand Removal of NCPUL Director," *The Hindu* 18 August 2009, internet edition.

[135] Bikramajit De, "Abuse of Urdu," *Economic and Political Weekly* (27 November 2004), pp. 5085-5088.

The websites indicates various programs and courses that the centers offer, though an independent assessment of their activities so far is unknown.

Governments in AP, Bihar, Delhi, Karnataka, Maharashtra, and UP established Urdu academies between 1972 to 1981 with the objective of advancing the cause of Urdu. However, many of the Academies have become dens of corruption and malpractices exemplified by the case of financial scandal that rocked the UP Urdu Academy in November 2005 involving illegal withdrawal of funds.[136] Issues other than finances also plague Urdu academies. Evidently, "less than one third of the 45 board member of the Andhra Pradesh Urdu Academy know the language," [137] in 2002. Six years later, a *Deccan Chronicle* report headlined "Urdu, Greek to Academy Staff," quotes the Academy President Rahimuddin Ansari saying that the director does not know how to read or write Urdu."[138]

The A.P. Academy's website claims that there is a scheme of Open Urdu Schools, "meant for the Urdu mother tongue drop outs at primary level in 8 districts, [through which] 100 Urdu Open Schools [have been] established---(Hyderabad 40, Ranga Reddy 10, Medak 08, Nizamabad 08, Kurnool 10, Guntur 08, Cuddapah 08, Anantapur 08).[139] It also awards "best" Urdu teachers and students.

The Delhi Urdu Academy runs several programs related to literacy, such as Urdu adult education program, Urdu coaching classes, Urdu Certificate course centers; a part time Urdu teaching program in schools and scholarship and prizes for students in Urdu medium schools or students opting for Urdu as one subject in schools.[140] There are no

---

[136] "Financial Scandals," *The Milli Gazette* (1-15 February 2005), http://www.milligazette.com/Archives/2005/01-15Feb05-Print-Edition/011502200559a.htm
Accessed on May 10, 2010.

[137] "Urdu Panel Does not Know Urdu," *Deccan Chronicle* (8 October 2002), internet edition.

[138] "Urdu, Greek to Academy Staff," *Deccan Chronicle* (28 January 2008), internet edition.

[139] There is no indication of what year this scheme began, see http://www.aponline.gov.in/apportal/departments/departments.asp?dep=25&org=168&category=about#openSchools
Accessed on May 14, 2010.

[140] http://artandculture.delhigovt.nic.in/urdu/scheme.htm
Accessed on May 14, 2010

statistics about the number of students involved in each of the schemes nor any information on when each program began.
The Central Institute of Indian Languages (CIIL) was set up on the 17 July 1969 to assist and co-ordinate the development of Indian Languages in Mysore. The Institute is charged with the responsibility of serving as a nucleus to bring together all the research and literary output from the various linguistic streams to a common head and narrow the gap between the basic research and development; research in the field of languages and linguistics in India.
The CIIL also runs seven Regional Centers in the various linguistic regions of the country to help and meet the demand for trained teachers to implement the three-language formula and thereby provides assurance to linguistic minorities. It has published a few books on Urdu, see its website
http://www.ciil.org/
The CIIL runs an online course for learning Urdu, though it would be good to know how many people have used it since the year it began, which is not indicated. There are two Urdu Research and Teaching Centers that CIIL runs in Lucknow and Solan, Himachal Pradesh. An independent assessment of their scientific output in the development of Urdu pedagogy is needed, though the one page devoted to it in Jaafari Report is not encouraging.[141]

Major Findings

The major findings of the Report based on the statistics state education authorities provided to the CML and to the State Report Cards establish the state of Urdu literacy in India. The most recent statistics available through the State Report Cards are shown in the following table. The states are noted in order of highest Urdu enrollment, which are compared with Urdu population in each state. If the enrollment figures are compared with Muslim population in each state the results will be even more revealing.

Urdu Literacy in Six States: Comparison of Urdu Enrollment in Six States in 2007-08

[141] Jaafari Report, p. 93.

State	Urdu mother tongue Population in millions per Census 2001	Urdu Medium Enrollment in Primary-Secondary Schools	Source
Maharashtra	6.9	953028	State Report Cards
Bihar	9.5	874529	Ditto
Karnataka	5.5	473384	Ditto
Andhra Pradesh	6.6	311017	Ditto
Uttar Pradesh	13.3	128892	Ditto
Delhi	1.0*	25894	Ditto

*Delhi Urdu population in 2001 is 872, 581, and 94 & rounded off to a million for 2010.

In light of the statistics shown above, it is clear that

1. Urdu literacy in India is highest in Maharashtra as measured by the number of schools, students, and teachers imparting education through Urdu medium or as a subject. It compares very well considering that its Urdu population is roughly the same as in neighboring Andhra Pradesh. Maharashtra's record is of course hugely better than Uttar Pradesh with twice larger Urdu population.
2. Bihar comes second, with the largest number of schools, students and teachers. But it does not compare as well when its larger Urdu population is taken into account. Perhaps it is due to the general poverty of population known as "backwardness," in Indian parlance.
3. Karnataka comes third. Despite its slightly smaller Urdu population with neighboring Andhra Pradesh, it has done better. This is surprising and calls for further investigation into this matter.
4. Andhra Pradesh is fourth. Despite, or because of the Nizams' legacy, it has not done as good as one would expect. It is perhaps because in the Nizams' era, the medium of instruction in government schools was predominantly Urdu, which changed after 1948 Operation Polo, as the new administration switched the medium to Telugu in most schools.
5. The combined literacy figures of the three states of AP, Karnataka and Maharashtra conclusively establish that Urdu

literacy is now highest in the Deccan states. It is hardly a coincidence. Literary Urdu in the form of Deccani or pre (or proto)-Urdu began fully two centuries before Urdu literacy began in the plains of northern India.

6. Delhi and UP combined come a distant fifth, firmly blasting the myth that *wadi-i Gang-o jaman*, Indo-Gangetic plains is the heartland of Urdu. In the post-colonial state-sponsored culturecide, Urdu literacy is nearly wiped out in UP. Ideological opposition to the teaching of Urdu is harshest in Uttar Pradesh, regardless of political parties in power. In this regard there is no difference between the BJP, Congress and other parties. The removal of Urdu from state schools happened in the heyday of Nehru, not that of Vajpayee. There was nothing left for BJP to do in UP as the UP Congress had successfully wiped Urdu from government schools.
7. Madarsas play a pivotal role in the perpetuation of Urdu literacy. Indeed they are the fortresses of those faithful to Urdu. Madrasas have made inroads into regions hitherto considered outside the traditional areas of Urdu literacy.
8. State-funded institutions with enormous funds have done poorly in the spread and perpetuation of Urdu literacy. Absence of accountability and transparency is at the heart of such failure.

Immediate Action Proposals

1. The statistics collected in the Report are based on those supplied to the Commissioner of Linguistic Minorities and other sources. NGOs, voluntary organizations and those concerned with the promotion of Urdu should double check the statistics. For example, using Right to Information Act, RTI, an attempt should be made to find out the physical location of schools, sections/parallel classes identified by the governments in order to ascertain their actual existence. Part of the inquiry should be to verify the number of students and ascertain the exact degree to which Urdu in its own script is part of the curriculum.
2. Using RTI, a census should be undertaken to verify the actual number of teachers identified as Urdu teachers currently employed. Part of this inquiry should also include the total number of vacancies of Urdu teachers so far sanctioned and

actually at work. A related item of inquiry should be to find out the appointment of inspecting staff for Urdu schools in each state. The Gujral Committee had recommended the creation of a Joint Directorate (Urdu) in each education department.

3. Appropriate authorities of Urdu Academy, NCERT, SCERT, and others should be asked to report on the state of the affairs about preparation, publication and distribution of Urdu textbooks in a timely fashion every year. If the authorities fail to furnish a report, recourse must be made to RTI.
4. The present Report is quantitative. Other researchers should undertake a study to report quality of Urdu literacy in schools weather run by the state at various levels, private organizations and madarsas.
5. The financial irregularities in all state-funded agencies such as NCPUL, Maulana Azad National Urdu University, and Urdu academies should be investigated to ensure accountability. The same applies to nongovernmental Urdu organizations that receive public funds.

Abstract

What is the status of Urdu literacy in India at the turn of the twenty first century as gauged through school education? Or how many students in primary schools in various states of India are studying through Urdu as the language of instruction? How many students are learning Urdu as one of the subjects under the three (or four) language formula in various levels of schools? Has the state facilitated or obstructed learning of Urdu? To what can we attribute the uneven levels of Urdu literacy and education in various states? Besides schools run by the state, who are the other institutions involved in promoting Urdu literacy? This Report thus asks five critical questions as noted earlier, and answers to these questions will enable reasonable projections about the future of literacy (as opposed to orality) in and education through Urdu. The role of institutions outside the formal schools system in particular the Madarsas will be discussed through a quantitative exercise to gauge the number of students involved in this

stream of education through Urdu. The Report concludes with a summary of key findings and a set of immediate action proposals for reversing the decline of Urdu literacy. It is based predominantly on two sources, statistics available through National Commissioner for Linguistic Minorities and State Report Cards. The statistics used in this abridged version of Report are only from the State Report Cards, while the longer version published elsewhere contains statistic from both sources.